مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اسلامیات

پانچواں پرچہ

اسلام ہندوستان میں

(ایم۔اے، سال دوم)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Maulana Azad National Urdu University
(A Central University established by an Act of Parliament 1998)

پروفیسر خواجہ محمد شاہد
وائس چانسلر (انچارج)

پروفیسر کے۔آر۔اقبال احمد
ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم

خود اکتسابی مواد برائے

اسلامک اسٹڈیز (سال دوم)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032

EPABX : 040-23008402/03/04

www.manuu.ac.in

طبع: ستمبر 2015ء

تحریری معاونین

مصنفین	اکائی
• مولانا عمر عابدین مدنی	1-4
• ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی	5-8
• ڈاکٹر غضنفر علی	9-13
• ڈاکٹر محمد عرفان احمد	14-15
• ڈاکٹر عمر فاروق	16-18
• مفتی محمد مشتاق تجاروی	19-21
• پروفیسر اقتدار محمد خاں	22-23
• ڈاکٹر صفیہ عامر	24

مدیر

• مولانا سید عبدالرشید
شعبہ اسلامک اسٹڈیز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر محمد فہیم اختر
اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

فہرست مضامین

پیش لفظ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1998ء میں قائم ہوئی، ملک کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے، جہاں اردو زبان کے ذریعہ مختلف مضامین کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم و تدریس کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے جہاں روایتی تعلیم کے تحت، سائنس اور سماجی علوم، لسانیات، انتظامیہ و کامرس، تعلیم و تربیت، انفارمیشن ٹکنالوجی اور صحافت وغیرہ کے مختلف مضامین میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح سے لے کر ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک متعدد کورسز چلائے جارہے ہیں، وہیں فاصلاتی تعلیم کے تحت انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، سرٹی فیکیٹ اور ڈپلومہ کی سطحوں پر مختلف مضامین کے کورسز چلائے جارہے ہیں، جن کے ذریعہ پورے ملک کے طلبہ و طالبات کی ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہورہی ہے۔ روایتی تعلیم کے تحت جاری کورسز میں ایم۔اے 'اسلامیات' کا کورس بھی شامل ہے۔ جس کی دو سالہ تعلیم یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس واقع حیدرآباد میں دی جارہی ہے۔

یونیورسٹی نے چند برسوں قبل فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔اے کے تین سالہ کورس میں اختیاری مضمون کے طور پر 'اسلامیات' (Islamic Studies) کو شامل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار ملک کے اندر اردو زبان میں اسلامیات کا نصابی مواد فاصلاتی تعلیم کے نہج پر پیش کیا گیا تھا۔ بی۔اے کا یہ کورس کامیابی کے ساتھ جاری ہے، اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد 'اسلامیات' کے ساتھ بی۔اے کی تعلیم مکمل کر چکی ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ فاصلاتی تعلیم کے تحت 'اسلامیات' میں ایم۔اے کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس کے مطالبے بھی کیے جارہے تھے۔ چنانچہ اسی ضرورت اور طلبہ و طالبات کے تقاضوں کے پیش نظر 2014ء میں ایم۔اے 'اسلامیات' کا آغاز کیا گیا۔ زیر نظر کتاب اسی کورس کے لیے تیار کیے گئے 'خود تدریسی مواد' (Self Learning Material) برائے سال دوم کا مجموعہ ہے۔

ایم۔اے اسلامیات کورس کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا اور جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اور اس نصاب کے مطابق اسلامیات کے ماہرین کی مدد سے درسی مواد تیار کرائے گئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اس حوالہ سے دوبارہ یہ اعزاز حاصل ہورہا ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایم۔اے اسلامیات کا درسی مواد (آٹھ پرچوں پر مشتمل آٹھ کتابوں کی شکل میں) پیش کیا جارہا ہے اور اس سے طلبہ و طالبات کی ایک بڑی ضرورت مکمل ہورہی ہے۔

اسلامیات کا موضوع بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار برس کے طویل دورانیہ پر مشتمل اور ہندوستان کے بشمول دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلی اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت اور علوم و فنون کے میدانوں کی سرگرمیوں کا احاطہ شامل ہے۔ اس لیے اسلامیات کا موضوع نہ صرف سماج کے ایسے متعدد پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا ربط

رکھتے ہیں، بلکہ انسانی سماج کے گوناگوں مسائل کے بارے میں گہری بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

ایم۔اے اسلامیات کا یہ کورس آٹھ پرچوں پر محیط ہے، جسے دوسال کی تعلیم کے دوران مکمل کیا جائے۔ سال اول کے چار پرچوں میں اسلام کا تعارف اور بنیادی تعلیمات، علوم اسلامیہ، مسلم تہذیب وثقافت کی تاریخ، نیز اسلامی افکار ونظریات کے جدید تناظر پر مواد پیش کیا گیا ہے۔ سال دوم کے لیے بھی چار پرچے ہیں۔ چنانچہ پانچواں پرچہ '**اسلام ہندوستان میں**' کے عنوان سے ہے، جس کے پانچ بلاک میں ہندوستان میں اسلام کی آمد واشاعت پر گفتگو کی گئی ہے۔ پھر دہلی سلطنت کے قیام اور اس کے تین سو سالہ دور کے تمدنی وتہذیبی کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے، علاقائی حکومتوں کے ضمن میں دکن کی بہمنی سلطنت اور اس سے نکلنے والی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ دیگر علاقائی چھوٹی حکومتوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ پھر مغل حکومت کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں جدید ہندوستان کے عنوان سے برطانوی دور اور اس کے بعد کی مسلم ریاستوں نیز ہندوستان کی مسلم شخصیات، تحریکات اور اداروں پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے پرچہ میں '**علوم وفنون میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی خدمات**' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں اسلام اور سائنس، علوم وفنون میں مسلمانوں کا حصہ، استشراق ومستشرقین اور اسلامی علوم میں غیر مسلموں کی خدمات کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ساتواں پرچہ '**مسلمان عالمی گاؤں میں**' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مسلم دنیا کے علاوہ، یورپ وامریکہ اور افریقہ وایشیا وغیرہ کی مسلم اقلیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے عالمی گاؤں کی موجودہ مسلم تحریکات وادارے اور مسلم مفکرین ومصلحین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ آٹھواں پرچہ '**مسلم فلسفہ، کلام، مسلم فرقے اور تجدید دین**' کے موضوع پر ہے، جس میں مسلم فلاسفی، علم کلام ومتکلمین اسلام، متعدد مسلم فرقے اور تجدید دین کے حوالے سے ہونے والے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اس نصاب کی تیاری میں ممتاز ماہرین اسلامیات اور دانشوران فن سے استفادہ کیا ہے جنہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اسے تیار کر کے یونیورسٹی کو اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ضرورت بہتر طور پر پوری کرے گی، ساتھ ہی اسلامی مطالعات کے باب میں قابل قدر استفادہ کا باعث بنے گی۔

پروفیسر خواجہ محمد شاہد

شیخ الجامعہ (کارگذار)

بلاک:1 ہندوستان میں اسلام کی آمد اور اشاعت

فہرست

اکائی 1 :عرب و ہند تعلقات اور ابتدائی مسلم آبادیاں

اکائی کے اجزاء

1.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ واقف ہوجائیں گے کہ عرب و ہند کے تعلقات کتنے قدیم اور گونا گوں ہیں۔اس کے ساتھ ہی ان کو معلوم ہوجاگا کہ سمندر کے آمنے سامنے بسنے والی ان دونوں عظیم قوموں کے روابط کیسے تھے۔عرب و ہند کے تعلقات کی کئی جہتیں تھیں۔ایک جانب اگر عرب و ہند کے درمیان تجارتی تعلقات تھے تو دوسری جانب علمی اور مذہبی تعلقات بھی تھے اور اسی کے ساتھ فروغ اسلام کے ساتھ سیاسی تعلقات کو بھی جلا ملی۔

1.2 تمہید

ہندوستان سے عربوں کا تعلق آریوں سے بھی زیادہ قدیم ہے کیونکہ آریوں کو ہندوستان آئے محض چند ہزار سال گزرے ہیں جب کہ عربوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت آدم جنت سے ہندوستان میں اتارے گئے تھے، اس تعلق سے کتب تفسیر وحدیث میں متعدد روایتیں موجود ہیں،اس لئے بقول مولانا سید سلیمان ندوی ہندوستان عربوں کا "پدری" ملک ہوا۔ اور ہندوستان گرم مصالحوں اور خوشبو وعطریات میں جس طرح پوری دنیا میں قدیم زمانے سے ممتاز ہے کہا جاتا ہے کہ یہ چیزیں حضرت آدم جنت سے لے کر آئے تھے۔اس کے علاوہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ مجھے ہندوستان سے ربانی خوشبو آتی ہے جس کو اقبال نے کہا ہے "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے"۔ یہ روایتیں سند کے اعتبار سے مضبوط نہیں لیکن ان روایات کا مجموعی مطالعہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ہندوستان کو اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ کچھ نہ کچھ اختصاص ضرور ہے۔

1.3 عرب و ہند کے تعلقات کی بنیاد

ہندوستان وسائل سے مالا مال ملک ہے اور عرب وسائل سے یکسر تہی دامن ہے۔ایسے میں ضروری ہے کہ ان دو ممالک کے درمیان تجارت، لین دین اور برآمد ودرآمد کا تعلق ہو،اس کے علاوہ یہ دونوں ممالک سمندر کے کنارے بسے ہیں یعنی ان کے درمیان سمندر حائل ہے۔ ایک طرف ہند ہے اور دوسری طرف عرب ہے۔سمندر کے کنارے بسنے والے ممالک اور شہر فطری طور پر تجارتی ہوتے ہیں۔عرب کے تجارت پیشہ افراد ہزاروں برس سے ہندوستانی پیداوار کو مصر وشام بلکہ یوروپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔

1.4 عرب و ہند تعلقات کتنے قدیم ہیں

جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے عرب و ہند کے آپسی تعلقات قدیم تاریخ کے ہر دور میں قائم رہے۔چنانچہ سندھ وعراق کے تعلقات سومیری عہد (250-3000 قبل مسیح) کادی عہد (2400-2100 قبل مسیح)، بابلی تہذیب (1800 قبل مسیح) میں موہنجوداڑو اور ہڑپا سے قائم تھے۔اسی طرح فینون (1200 قبل مسیح) حتیوں اور آریوں میں، پھر عہد سکندری وبطلیموس میں وعرب ومصر کے درمیان گوناگوں تعلقات استوار رہے۔ لینورڈ کوٹیرل نے اپنی کتاب لوسٹ سٹیز میں اور کورڈن چالڈ نے اپنی کتاب واٹ ہیپن ان میں زمانہ ماضی میں عرب و ہند تعلقات پر تفصیل سے لکھا ہے۔

انڈس ویلی تہذیب کی عمر 2000 قبل مسیح بتائی جاتی ہے۔اسی طرح ہند وعرب تعلقات کی عمر چار ہزار سال ہوتی ہے۔جدید ہندوستانی مورخین تاریخی شواہد کی بناء پر اب یہ لکھنے لگے ہیں کہ وادی انڈس کے قدیم ترین ہندوستانی اور قدیم عرب ایک دوسرے سے متعارف اور باہم تجارت کرتے تھے۔وہ لکھتے ہیں۔

"اس بات کی واضح شہادت موجود ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بلکہ مغربی ایشیاء کے دور دراز ممالک سے بھی

تجارت کرتے تھے۔انڈس ویلی تاجر عراق سے بری اور بحری دونوں راستوں سے تجارت کرتے تھے۔

اس سلسلے میں تاریخ ادبیات، مسلمانان پاکستان و ہند کے مصنف ممتاز احمد پٹھان لکھتے ہیں:

"سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات خصوصاً عراق، یمن اور عمان سے تاریخ کی ابتدا سے چلے آرہے تھے۔بعض مورخین کا خیال ہے کہ سمیر لوگ جنہیں نے بعد میں بابل کی سامی تہذیب کی بنیاد رکھی، وادی سندھ سے ہجرت کرکے چلے گئے تھے۔سندھ، بلوچستان، فارس اور خورزستان کے بعض علاقوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ سے لیکر فرات تک سمیریوں کی بہت بڑی سلطنت تھی، انہوں نے مغربی ایشیاء کو تہذیب سکھائی اور دوسری چیزوں کے علاوہ لکھنے کا فن خط کوفی سے متعارف کرایا، ہل اور پہیہ سب سے پہلے ان ہی لوگوں کی وجہ سے ان دو دریاؤں کی سرزمین میں ہوئے"۔

1.5 عرب و ہند کے مابین تجارتی تعلقات

عرب تاجروں کا ہندوستانی اشیاء کو مصر وشام اور یوروپ تک اور یوروپ و مصر وشام کی اشیاء کو ہند و چین تک پہنچانے کا راستہ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے خطبات میں یہ بتاتے ہیں۔"عرب تاجر مصر وشام کے شہروں سے چل کر خشکی بحر احمر (ریڈسی) کے کنارے کنارے حجاز کو طے کرکے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں پر بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ کو چلے جاتے تھے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضر موت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کرکے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ 'تیز' میں اترتے تھے یا پھر آگے بڑھ کر سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے اور پھر اور آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ تھانہ (مہاراشٹرا) کھمبایت چلے جاتے تھے۔پھر آگے بڑھتے بڑھتے سمندر کے کنارے کنارے کالی کٹ اور راس کماری پہنچتے تھے اور پھر کبھی مدراس کے کسی کنارے پر ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ، انڈمان، ہو کر پھر سیدھے مدراس (چنئی) کی مختلف بندرگاہوں پر چکر لگاتے ہوئے خلیج بنگال میں داخل ہوتے اور بنگال کی ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے برما اور سیام ہو کر چین چلے جاتے تھے اور پھر اسی راستہ سے لوٹ جاتے تھے۔اس نقشہ سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے ہند میں جہاز رانی کی تاریخ، تاریخ کی یادداشت سے پہلے سے ہے۔

1.5.1 تجارتی اشیاء کی مختصر فہرست

عرب تاجر ہندوستان سے کیا کچھ لے کر جاتے تھے اس کے تعلق سے عرب سیاحوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ہندوستان کو قدرت نے معدنی وسائل کے علاوہ نباتاتی وسائل یعنی مسالے اور عطریات، ہندوستانی فولاد اور ہیرے موتی سے بڑی فیاضی سے نوازا تھا اس لئے عرب تاجر یہ اشیاء لیکر شام و مصر اور پھر یوروپ تک پہنچاتے تھے۔واضح رہے کہ یوروپ گرم مسالوں کا شوقین ہے اور اسی گرم مسالے کی کھوج میں کولمبس نے امریکہ کی خاک چھانی اور واسکوڈی گاما ہندوستان کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔

ابن خردازبہ (متوفی سنہ 250 ہجری) جس کا زمانہ اٹھویں صدی ہجری کے بعد کا ہے۔وہ ہندوستان کی ان پیداواروں اور سامان تجارت کی جو عرب اور عراق جاتی تھیں، ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔خوشبودار لکڑیاں، صندل، کافور، لونگ، جائے پھل، کباب چینی، ناریل اور سن کے کھوے اور روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی، اور سراندیپ سے ہر قسم کے یاقوت، موتی، بلور، اور سنباذج جس سے جواہرات کی تراش

خراش کی جاتی ہے اور ملیبار سے سیاہ مرچ اور گجرات سے سیسہ، اور دکن سے بکم اور سندھ سے بانس اور بید۔

مشہور عرب مورخ مسعودی جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے اور بشاری جو تقریباً اسی کا ہم عصر ہے، دونوں نے کھمبایت (کاٹھیاواڑ) کے جوتوں کی تعریف کی ہے جو یہاں سے بن کر باہر جاتے تھے۔ تھانہ (ممبئی سے متصل) کے کپڑے مشہور تھے۔ ان دونوں کے ہم عصر ایک اور سیاح مسعر بن مہلہل نے جنوبی ہندوستان کے ٹراونکور (چینئی) کی سیاحت کی تھی وہ اس بارے میں لکھتا ہے "یہیں وہ مٹی کے برتن تیار ہوتے ہیں جو ہمارے ملک میں چینی کر کے بکتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ چینی نہیں ہوتے۔ کیونکہ چین کی مٹی کولم کی مٹی سے زیادہ سخت ہوتی ہے اور آگ پر زیادہ دیر ٹھہر سکتی ہے۔......... یہاں ساگون کی لکڑی اتنی لمبی ہوتی ہے کہ کبھی کبھی 100 ہاتھ تک پہنچ جاتی ہے۔ نیز بقم (بکم) بید، نیزہ کی لکڑی بھی وہاں بہت ہے اور ریوند چینی، تیز پات جو نہایت کمیاب ہے اور جو آنکھوں کی بیماری میں بہت مفید ہے اور یہیں سے عود، کافور اور لوبان بھی تاجر لے جاتے ہیں۔ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہندوستان سے صرف ان ہی چیزوں کو تاجر نہیں لے کر جایا کرتے تھے بلکہ زہر بھی ہندوستان سے عرب جایا کرتا تھا۔

1.5.2 ہندوستانی جانوروں کی تجارت

جانوروں میں ہندوستان سے ہاتھی عراق کو جایا کرتے تھے، دوکوہان والے سندھی اونٹ کی بہت مانگ تھی، اسی سندھی اونٹ کی نسل سے مصر و فارس کے عمدہ بختی اونٹ تیار کئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ مور کی خوبصورتی بھی مشہور عالم ہے۔ ہندوستان سے مور یمن اور مصر و شام لے جائے جاتے تھے اور پھر وہاں ان کی افزائش نسل ہوتی تھی مگر بقول عرب سیاح ان میں ہندوستانی موروں والی خوبصورتی نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستانی گینڈوں کے سینگوں کی مانگ بھی بہت زیادہ تھی۔ گینڈوں کے سینگوں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں جو نہایت بیش قیمت فروخت ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک جانور جس کے پسینہ سے خوشبو کشید کیا جاتا تھا اس کو عرب تاجر ہندوستان سے مراکش تک لے جاتے تھے۔

1.5.3 ہندوستان میں کیا چیزیں درآمد ہوتی تھیں

ان اشیاء کے بدلے ہندوستان میں کس چیز کی درآمد ہوتی تھی؟ اس کی تفصیلی اطلاعات نہیں ہیں لیکن متفرق معلومات اور عرب سیاح جو تاجروں کے ساتھ سفر کرتے تھے ان کے چشم دید مشاہدات کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ بعض جزیرے والے تو ان سے کپڑے لیتے تھے، کچھ جزیرے ایسے تھے جہاں کے لوگ کپڑے نہیں بلکہ لوہا لیتے تھے۔ تیسری صدی ہجری یعنی نویں صدی ہجری میں سندھ کے طلائی سکوں کی مانگ ہندوستان میں بہت زیادہ تھی۔ ایک سندھی طلائی سکے کے بدلے تین ہندوستانی طلائی سکے ملتے تھے۔ مصر سے زمرد کی انگوٹھی آتی تھی جو ڈبیوں میں رکھی جاتی تھی۔ شراب بھی مصر سے یہاں آیا کرتی تھی۔ روم سے ریشمی کپڑے، سمور اور پوستین اور تلواریں آتی تھیں۔ فارس سے عرب گلاب عرب تاجر لے کر آتے تھے۔ بصرہ سے دیبل (سندھ) کی بندرگاہ میں کھجوریں آتی تھیں، کارومنڈل میں عرب سے گھوڑے آتے تھے۔

معلومات کی جانچ

1. عرب و ہند تجارتی تعلقات کتنے قدیم ہیں؟

2. ہندوستان سے کیا چیز عرب تاجر درآمد اور برآمد کرتے تھے؟

1.6 عرب میں ہندوستانی افراد کی موجودگی

عرب اور ہند کے تعلقات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہنشاہ ایران کا قبضہ سندھ اور بلوچستان پر بھی رہا، اسی نسبت سے سندھ کے جنگجو قبیلے بالخصوص جاٹ اور میدوغیرہ ایران کی فوج میں شامل ہوگئے۔ جب عرب مسلمانوں نے ایران پرحملہ کیا تو ہوا کا رخ دیکھ کر جاٹ بھی بعض شرائط کے ساتھ مسلم فوج میں شامل ہوگئے۔ سپہ سالار نے ان کو مختلف قبیلوں میں شامل کرادیا۔ اس کے علاوہ یہ واضح رہے کہ نچلی ذاتوں کے افراد کو ہندوستانی راجا مسلمانوں کے پاس رکھ کر کشتی رانی اور ملاحی کا فن سکھاتے تھے تاکہ ان کی تجارت اور بحری بیڑے پر کوئی فرق نہ پڑے جب کہ اونچی ذات کے ہندو سمندری سفر کو گناہ خیال کرتے تھے۔ بہر حال وجہ یہ ہو یا وہ، عرب میں ہندوستانی بھی آباد تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ ہندوستانی شکل وصورت والوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ امام ترمذی امثال کے باب میں روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ نے آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ اجنبی شکل والوں کو دیکھا تو فرمایا: ان کا چہرہ تو جاٹوں کی طرح ہے۔ جاٹوں نے کچھ ہی دنوں میں اپنی وفاداری سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اعتماد حاصل کرلیا تھا چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل جیسے نازک موقع پر بصرہ کے خزانہ پر انہیں جاٹوں کو نگراں متعین کیا تھا۔ پھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو رومیوں کے مقابلہ کیلئے شام کے ساحلی شہروں میں بسایا اور ولید بن عبدالملک نے ان کی انطاکیہ میں بازآبادکاری کی۔

1.7 عربی شاعری میں ہند سے مشتق الفاظ

اس کے علاوہ یہ بات بھی حیرت کی ہے کہ لفظ ہند سے مشتق ہندہ عربوں کو اتنا پیارا معلوم ہوا کہ عرب خواتین کے نام کا نہ صرف جزو بنا بلکہ عرب کی شاعری میں یہ نام ایسا ہی کثیر الاستعمال ہے جیسے ہندوستان میں ہیر، فارسی میں لیلیٰ اور شیرین ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہو اور جیسا کہ عرب مورخین اور سیاحوں نے بھی لکھا ہے کہ اہل ہند عربوں کے نزدیک شروع سے ہی معزز اور محترم تھے اور وہ ان کو حکمت ودانائی میں چینیوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے عطریات اور خوشبودار لکڑیاں اور ہیرے جواہرات کے جانے سے خوش ہوکر اپنے یہاں کی صنف نازک کا نام ہی ہندہ رکھ دیا ہو کہ جس کے اندر یہ تمام خوبیاں موجود ہوں یعنی خوشبو، قیمتی اور حکمت ودانائی۔

عرب جس قدر جنگجو اور بہادر تھے اور بات بات پر طیش میں آنے والے اور اپنی آن پر کٹ جانے والے تھے ایسے میں ان کی سب سے زیادہ محبوب چیز تلوار ہی ہوسکتی تھی۔ لیکن جس تلوار کو وہ پسند کرتے تھے اور جس پر جان دیتے تھے وہ ہندوستانی تلوار تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی تلوار کی تعریف وتوصیف سے عرب کی شاعری بھری ہوئی ہے۔

1.8 عرب وہند کے مابین علمی تعلقات

عرب اور ہند کے یہ تعلقات کتنے قدیم تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر

پانڈووں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹر کو عربی میں بتایا اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا، یہ بات سوامی دیانند نے لکھی ہے۔ دوسری جانب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم میں ہندی کے تین الفاظ موجود ہیں جسے ہندوعرب تعلقات کی وسعت اور گہرائی ثابت ہوتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں "اس مسئلہ میں اچھا خاصا علما میں اختلاف رہا ہے کہ قرآن پاک میں کسی غیرزبان کا لفظ ہے یا نہیں لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ غیرزبان کے ایسے الفاظ موجود ہیں جو عربوں کی زبان میں آکر مستعمل ہوگئے تھے اور وہ اپنی پہلی صورت بدل کر عربی زبان کے لفظ ہی بن گئے۔ حافظ ابن حجرؒ اور حافظ سیوطی نے ایسے الفاظ جمع کئے ہیں۔ ہم ہندیوں کو بھی فخر ہے کہ ہمارے دیس کے بھی چند لفظ (تین) ایسے خوش نصیب ہیں جو اس پاک اور مقدس کتاب میں جگہ پاسکے.......................اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنت کی تعریف میں اس جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ضرور ہے۔ یعنی مسک (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور)"۔

عرب ہندوستانی علوم وفنون کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہاں کے علماء نے اس کا جابجا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ جاحظ لکھتا ہے:

> "رہے ہندوستان کے باشندے تو ہم نے ان کو پایا ہے کہ وہ جیوتش (نجوم) اور حساب میں بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک خاص ہندی خط ہے۔ طب میں بھی وہ آگے ہیں اور طب کے بعض عجیب بھید ان کو معلوم ہیں اور سخت بیماریوں کی دوائیں خاص طور سے ان کے پاس ہیں۔ پھر مجسموں اور اسٹیچو بنانا، رنگوں سے تصویر پیدا کرنا اور تعمیر وغیرہ میں ان کو بڑا کمال ہے۔ پھر شطرنج کے وہ موجد ہیں جو ذہانت اور سوچ کا بہترین کھیل ہے................. ان میں رائے اور بہادری ہے اور جو بعض خوبیاں ان میں ہیں چینیوں میں بھی نہیں، ان میں صفائی اور پاکیزگی کے بھی اوصاف ہیں"۔

مشہور مورخ اور سیاح یعقوبی (متوفی 278 ہجری) نے بھی ہندوستان کی عظمت کا گن گایا ہے۔

> "اور ہندوستان کے لوگ عقل اور غور والے ہیں اور وہ اس حیثیت سے سب قوموں سے بڑھ کر ہیں۔ جیوتش اور نجوم میں ان کی باتیں سب سے زیادہ درست نکلتی ہیں۔ سدھانت انہیں کی ذہانت کا نتیجہ ہے۔ جس سے یونانیوں اور ایرانیوں تک نے استفادہ کیا۔ طب میں ان کا فیصلہ سب سے آگے ہے۔ اس فن میں ان کی کتاب "چرک اور ندان" ہے...................اور بھی طب میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ منطق اور فلسفہ میں ان کی تصنیفات ہیں۔ اور بہت سی ان کی تصنیفات ہیں جن کی بڑی تفصیل ہے"۔

ہندوستان سے ایک بڑی تعداد میں ویداور پنڈت بغداد بلائے گئے لیکن جیسا کہ عموماً ہوتا ہے کہ ایک زبان کے نام دوسری زبان میں کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں جیسے عربوں کے نام لاطینی اور انگریزی میں بالکلیہ بدل گئے ہیں اسی طرح ان ویدوں اور پنڈتوں کے نام بھی اس طرح بدل گئے ہیں کہ اب اصل نام کی تلاش وجستجو مشکل ہوگئی ہے۔ پھر اس میں ایک اور پیچ یہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ بودھ مذہب کے پیروکار تھے اور ان کے نام برہمنی یا ویدک ناموں سے الگ ہوتے ہیں اس ان کے اصل ناموں کا سراغ لگانا وہ بھی بارہ صدیوں بعد آسان نہیں۔

1.8.1 ہندوستان طبیبوں اور ویدوں کی بغداد آمد

عہد عباسی میں خاندان برامکہ نے بڑا نام پیدا کیا تھا ان کی شان وشوکت اور چمک دمک کے آگے قصر خلافت کا رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا، مشہور عام یہ ہے کہ برامکہ آگ کے پجاری یعنی مجوسی تھے لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک مفصل بحث کے بعد لکھا ہے کہ برامکہ درحقیقت بودھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور بدھوں کی کسی بڑی مندر کے پجاری تھے۔ جب ان کو خلافت عباسیہ میں عروج حاصل ہوا تو انہوں نے ہندوستانی علوم وفنون کی جانب توجہ دی اور ہندوستان سے متعدد پنڈت اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو بغداد بلایا گیا اور ان کو علمی کتابوں کے ترجمہ اور تصنیف وتالیف کا کام سونپا گیا۔

منکہ

ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ یہ طب اور علاج میں بہت ماہر تھا۔ ہارون رشید کے بیمار پڑنے پر جب اطباء علاج سے عاجز آ گئے تو اس کو ہندوستان سے بلایا گیا اور اس کے علاج سے ہارون رشید کو افاقہ ہوا تو ہارون رشید نے اسے کثیر مال ودولت سے نوازا۔ اس کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے اسے دارالترجمہ میں سنسکرت کی کتابوں کے ترجمہ کے کام پر مقرر کیا گیا۔

صالح بن بہلہ

یہ بھی ہندوستانی طبیب تھا اور ہارون رشید کے چچازاد بھائی کو جب سکتہ لاحق ہوا اور شاہی طبیب جبرئیل بخت یشوع نے اس کی موت کا اعلان کردیا تو جعفر برمکی نے اس کو ہارون رشید کی خدمت میں پیش کیا اور اس نے علاج کر کے سکتہ ختم کرایا اور ہارون رشید کا چچازاد بھائی گویا دوبارہ زندہ ہو گیا جس سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔

ابن دہن

برامکہ نے خلافت عباسی میں اپنی فیاضی سے رفاہ عام کے کئی کام انجام دیئے تھے ان میں سے ایک شفاخانہ کا قیام ہے۔ ابن دہن برمکیوں کے شفاخانہ کا افسر اعلیٰ تھا جس کو ہم آج کی اصطلاح میں چیف میڈیکل افسر یعنی سی ایم او کہتے ہیں۔ پروفیسر زخاؤ کا کہنا ہے کہ اصل نام دھنیا یا دھنن ہوگا، اور یہ نام رکھنے کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ منوشاستر میں دیوتاؤں کے طبیب کا نام دھنونتری ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد ہندوستانی طبیب اور حکیم دربار عباسی اور بغداد میں موجود تھے لیکن تطویل کے خوف سے ان کے نام کو ہم نظرانداز کرتے ہیں۔

1.8.2 طبی کتابوں کے ترجمے

عربی زبان میں سنسکرت اور ہندی کی متعدد طبی کتابوں کا ترجمہ ہوا ایک نظر ہم ان کتابوں پر ڈالتے ہیں۔ ششرت کی کتاب دس باب میں تھی اس میں بیماریوں کی علامات اور ان کے علاج ودوا کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ چرک نام کے ہندوستانی رشی اور مشہور طبی ماہر کی کتاب اولاً فارسی میں منتقل ہوئی پھر عبداللہ بن علی نے اس کو فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ سندھشان نام کی طبی کتاب کا ترجمہ شفاخانہ بغداد کے افسر اعلیٰ

ابن دہن نے کیا تھا۔ ندان نام کی طبی میں چار سو بیماریوں کی پہچان بتائی گی ہے اس کا بھی ترجمہ ہوا تھا۔ ایک طبی کتاب جو جڑی بوٹیوں کے نام پر مشتمل تھی اس کو منکہ پنڈت نے سلیمان بن اسحاق کیلئے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک کتاب جس میں ہندی اور یونانی طبیبوں کی دواؤں کے سرد وگرم مزاج، دواؤں کی کیا قوت ہے؟ اور موسم کے اعتبار سے اس کی قوت میں کیا کمی اور زیادتی ہوتی ہے، کی تفصیل تھی عربی میں ترجمہ ہوئی۔ طب ہندی کی کتاب استانگر کو ابن دہن نے عربی کا جامہ پہنایا تھا، ایک وید کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا گیا جس میں 100 بیماریوں اور 100 دواؤں کا ذکر تھا اور دوسری کتاب میں بیماریوں کے وہم اور اسباب کا بیان تھا۔

علاج کا وہ طریقہ جس میں مریض کو جڑی بوٹیوں کو ملا کر یا ان کا عرق کشید کر کے مشروب تیار کیا جاتا ہے ایسی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی گئیں، ابن ندیم نے کتاب کا نام اطر لکھا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ اتری نام کے وید کی طرف منسوب ہو اسی طرح ایک اور پنڈت کا ذکر ابن ندیم نے کیا جس کا نام ساوبرم لکھا ہے۔ ایک پنڈتہ کی کتاب کا ترجمہ ہوا جس میں عورتوں کی بیماریوں کے علاج بیان کئے گئے تھے۔ ایک اور کتاب حاملہ عورتوں کی بیماریوں اور علاج کے سلسلے میں ترجمہ کی گئی۔

1.8.3 عربی زبان میں ہندوستانی دوائیں

عربی میں جب اس قدر ہندوستانی طبی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ غیر ممکن تھا کہ عربی میں ہندی دواؤں کے نام رواج نہ پا جاتے۔ بعض دوا کے نام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیا رشاد گرامی میں ہے یعنی قسط ہندی کا ذکر خود صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ زنجبیل یعنی سونٹھ کا ذکر تو قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ عربی میں اطریفل نام کی دوا مشہور ہے۔ محمد خوارزمی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ ہندی لفظ تری پھل ہے کہ یہ تین پھلوں، ہلیلہ، بلیلہ اور آملہ سے بنتا ہے۔ خورازمی نے مفاتح العلوم میں ایک اور دوا انجات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "انبہ (آم) ہندوستان کا ایک پھل ہے اس کو شہد، لیموں اور ہلیلہ میں دیگر انجات تیار کیا جاتا ہے، شاید یہ گڑمبہ یا آم کا کسی قسم کا اچار ہو۔ الہ آباد اکیڈمی میں دیئے گئے خطبات کے مجموعہ "عرب وہند کے تعلقات" میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک منفرد تحقیق یہ پیش کی ہے کہ عرب کی دوائی میں جس کا نام خوارزمی نے بہطہ لکھا ہے اور اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ بیماروں کی غذا کی قسم ہے۔ یہ لفظ سندھی ہے۔ یہ دودھ اور گھی میں چاول کو پکا کر تیار کیا جاتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

" آپ سمجھے؟ یہ ہمارا ہندوستانی بھات ہے جو عربوں کے نزدیک بیماروں کیلئے ایک نرم اور ہلکی غذا ہوگی اس کو اب کھیر سمجھئے یا فیرنی"۔

1.9 حساب وریاضی علوم

حساب کی اہمیت سے کوئی ناواقف نہیں، اس کے بغیر زندگی کا کارخانہ اور لین دین سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہر زبان میں حساب وکتاب کیلئے کچھ الفاظ ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ بات حیرت کی ہے کہ ارقام یا نمبرات جو کہیں وہ عربوں نے ہندوستانیوں سے اخذ کئے اس لئے عربی میں ان کو ارقام ہندیہ یعنی ہندوستانی نمبرات سے تعبیر کرتے ہیں اور جب یہ نمبرات عربوں کے ذریعہ یوروپ پہنچے تو اہل یوروپ نے ان کو عربک فیگرز یعنی عربی نمبرات کہا۔ اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ عربی میں تحریر دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے لیکن نمبرات بائیں سے دائیں لکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس ضمن میں قدیم کتبات اور کتابوں سے جو ثبوت وشواہد بہم پہنچائے

ہیں اسے دیکھ کر ایک نگاہ میں ہی اندازہ ہو جاتا ہیکہ یہ اعداد و شمار ہندی ہیں اور یہیں سے وہ عرب اور پھر یوروپ پہنچے۔

اندازہ ہے کہ سنہ 156 ہجری میں منصور کے عہد اقتدار میں جو پنڈت سدھانت لے کر بغداد آیا تھا اسی نے عربوں کو یہ نمبرات بتائے ہوں گے۔ علاوہ ازیں سدھانت کی کتاب میں خود ایک باب نمبرات اور اعداو وشمار پر موجود تھا جس سے عربوں نے استفادہ کیا اور اسے اپنایا۔ نمبرات کو عربی قالب میں ڈھالنے کا کام محمد بن موسیٰ خوارزمی (780-840 عیسوی) نے انجام دیا ہے۔ یوروپ میں حساب کے ایک خاص شعبہ کو الگارتھم اور الکاریتم اور الکورزم کہتے ہیں جب کہ یہ یہ تمام نام الخوارزمی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ الخوارزمی کے بعد ہندی حساب کو علی بن محمد نسوی (980-1040 عیسوی) نے فروغ دیا۔ اس نے المقنع فی الحساب الہندی (ہندی حساب میں کفایت کرنے والی) نامی کتاب لکھی، اس کے بعد دیگر مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی۔ ہندی حساب کو خواص سے گزر کر عوامی مقبولیت بھی حاصل ہو چکی تھی چنانچہ ابو علی سینا کے ذکر میں آتا ہے کہ بچپن میں اس نے ہندی حساب سیکھا تھا۔

1.10 نجوم اور ہیئت

نجوم اور ہیئت ہندوستان کے خاص علوم ہیں۔ سنہ 154 ہجری میں سندھ سے جو وفد بغداد روانہ ہوا تھا اس میں سے ایک پنڈت ہیئت کی کتاب لے کر گیا تھا۔ سنسکرت میں اس کتاب کا نام برہمپت سدھانت تھا، اس کا عربی ترجمہ السند ہند کے نام سے مشہور ہوا۔ سنسکرت کی دوسری کتاب جو عربی میں ترجمہ ہوئی اس کا نام ارجہند بتایا جاتا ہے۔ سنسکرت کی اصل کتاب کا نام آریہ بھٹ تھا۔ اس کے بعد آرکند نام سے سنکسرت کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس کا نام سنسکرت میں کھنڈ اکھدیک ہے۔

ہندی پنڈت جس نے بغداد میں پہلی مرتبہ سدھانت عربی میں ترجمہ ہوئی اس کے دو عرب شاگرد ابراہیم فزاری اور یعقوب بن طارق ہیں۔ ان دونوں نے اپنے اپنے طور پر سدھانت کو عربی میں منتقل کیا۔

عربی زبان میں ہیئت اور نجوم کی کتابوں کے ترجمہ کا اثر یہ ہوا کہ سنسکرت کے الفاظ عربی مین راہ پا گئے اور عربوں نے اسے معرب کر کے اپنی زبان کا ہی لفظ بنالیا۔ جیسے قدیم عربی ہیئت میں کردجہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جب کہ اس کی اصل سنسکرت کر مجھا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ ریاضی میں استعمال ہونے والا جیب کا لفظ عربی کے گریبان کے معنی سے مشتق نہیں بلکہ یہ سنسکرت کے لفظ "جیوا" کا معرب ہے۔

متفرقات

اس کے علاوہ متفرق طور پر دیگر فنون پر مبنی ہندوستانی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا، جیسے سانپوں کی اقسام اور ان کے جھاڑ پھونک اور منتر ہندوستان میں مشہور ہیں اور اس فن کا نام سرپ ودیا ہے۔ رائے نام کے ایک پنڈت کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس میں سانپوں کی اقسام اور ان کے زہروں کا بیان تھا۔

شاناق پنڈت کی کتاب جو سیاست اور بادشاہت ک آداب پر مبنی تھی کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا، شاناق پنڈت ہوسکتا ہے کہ

چانک یا چانکیہ ہو جس کا ایک باب کھانا اور زہر تھا، اس کے علاوہ اسی پنڈت کی ایک کتاب خاص زہر کے بارے میں بھی تھی اور یہ تو مشہور عالم ہی ہے کہ ہندوستان میں راجہ اپنے حریف راجہ کو زہر دے کر مارنے میں کمال رکھتے تھے اور اس غرض سے "بس کنیائیں" تیار کی جاتی تھیں۔ یہ بچیاں بچپن سے ہی منتخب کر لی جاتی تھیں اور ان کی خوبصورتی پر خاص دھیان دیا جاتا تھا اور ان کو بچپن سے ہی تھوڑا تھوڑا زہر کھانے کی تربیت دی جاتی تھی جس کی وجہ سے زہر ان کے پورے جسم میں رچ بس جاتا تھا اور یہ حریف راجہ کو اپنے حسن کا شکار کر کے بآسانی موت کے منہ مین ڈھکیل دیتی تھیں۔ زکریا قزوینی نے بھی" آثار البلاد" میں زہر دیکر راجاؤں کو مارنے کا ذکر کیا ہے۔

ان کے علاوہ جیوتش، جفر اور رمل وغیرہ پرمبنی سنسکرت کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا، خلافت عباسیہ میں پہلے ایرانی ستارہ شناسوں کا غلبہ تھا لیکن بعد ازاں ہندوستانی منجموں نے اپنا عمل دخل بڑھالیا۔ خلافت عباسیہ میں جو منجم یا ستارہ شناس پنڈت رہتے تھے اس میں کنکہ نامی پنڈت بہت مشہور تھا، ابن ندیم نے اس کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے۔(1) کتاب فی الاعمار، یعنی عمروں کے بیان میں کتاب (2) کتاب اسرار المواليد، پیدائش اور ولادت کے اسرار کے بیان میں (3) کتاب القرانات الكبير، بڑے قران یا لگن کے بیان میں، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ایک ہی وقت میں دو ستارے ایک برج یا ایک مقام میں ہوں (4) کتاب القرانات الصغیر، چھوٹے لگن کے بیان میں۔ اسی پنڈت کی دو کتابوں کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے۔(1) کتاب فی التوہم، مسمریزم یا خیال بندی کے بیان میں (2) کتاب فی احداث العالم والدور فی القران، دنیا کے واقعات اور ستاروں کے لگن میں گردش کے بیان میں۔ اس کے علاوہ دیگر پنڈتوں کی بھی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا جس میں پیدائش کے وقت زائچہ کھینچنے وغیرہ کی باتیں ہیں۔ ہندوستان کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس کا موضوع ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر حال بتانا تھا۔

معلومات کی جانچ

1. ہندوستان کے طبیبوں اور ہندوستانی طبی کتابوں کے ترجمہ پر اظہار خیال کیجئے؟
2. ہندوستان اور عرب کے مابین علمی تعلقات کے اثرات کیا رہے ہیں؟

1.11 عرب و ہند کے مذہبی تعلقات

سندھ کو جب عربوں نے فتح کیا تو ان کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ سندھ کے بودھوں اور ہندوؤں کو کیا مقام دیا جائے، اس سلسلے میں عرب فاتحین نے یہ فیصلہ کیا کہ سندھ کے عربوں کو مشابہ اہل کتاب کا درجہ دیا جائے یعنی ان سے نکاح کے سلسلہ کو چھوڑ کر بقیہ تمام دیگر معاملات میں ان کیساتھ اہل کتاب یہود ونصاریٰ جیسا سلوک کیا جائے۔ بودھوں اور برہمنوں کے مندروں کے سلسلہ میں محمد بن قاسم نے کہا کہ "ہندوستان کا بت خانہ عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوس کے آتشکدوں کی طرح ہے۔ جب کہ چچ نامہ کے مصنف نے اس سلسلے میں یہ لکھا ہے:" محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے لوگوں کی درخواست قبول کی اور ان کو اجازت دی کہ سندھ کی اس اسلامی سلطنت میں اسی حیثیت میں رہیں جس حیثیت میں عراق اور شام کے یہودی عیسائی اور پارسی رہتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کے جن شہروں کو فتح کیا وہاں کسی مندر کو نہ منہدم کیا اور نہ کوئی تبدیلی کی بلکہ بودھوں اور برہمنوں کو پوری آزادی دی کہ وہ اپنے طریقہ سے عبادت کریں۔

عربوں کی اس رواداری کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑا چنانچہ سندھ کے ایک مقام پر جب غیر مسلم قابض ہو گئے تب بھی انہوں نے مسجد کو ہاتھ نہیں لگایا مسلمان اس میں حسب سابق نماز پڑھتے رہے تھے۔ نیز متعدد عرب سیاحوں نے نقل کیا ہے کہ جنوبی ہند اور گجرات کے شہروں میں جہاں کے راجہ غیر مسلم تھے وہاں مسلمان مذہبی اعتبار سے آزاد تھے، ان پر کوئی دارو گیر نہیں تھی، ان کی اپنی مسجدیں تھیں جن میں وہ بلا روک ٹوک عبادت کرتے تھے۔ ان کے معاملات کا فیصلہ شرعی اعتبار سے ہوتا تھا اور ان کیلئے قاضی مقرر تھا۔ حد یہ ہے کہ تجارتی اغراض سے ملیبار کے راجہ تو اپنی رعایا کے افراد کے مسلمان ہونے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ چھوٹے بچوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دیتے تھے اور وہ ان کی اسلامی طور پر تربیت کرتے تھے اور پھر آگے چل کر ان کو جہاز راں بنایا جاتا تھا۔

اس میل جول اور اختلاط کا اثر یہ ہوا کہ عربوں میں ہندوؤں کے مذہب کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ یحیی برمکی نے ایک شخص کو خاص طور پر ہندوستان اس لئے بھیجا کہ وہ وہاں جا کر مذہب کی تحقیق کرے، جو شخص اس غرض سے بھیجا گیا اس کی بعینہ روداد محفوظ نہیں ہے مگر ابن ندیم نے اپنی کتاب میں یعقوب بن اسحاق کندی کے ہاتھ کی لکھی ایک تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے ہندو مذہب کے کچھ فرقوں اور ان کے عقیدوں کا حال بیان کیا ہے۔

ابن ندیم کے ہم عصر اور بیت المقدس کے ایک عرب مورخ مطہر نے اپنی کتاب میں ہندوستانی فرقوں کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کتنی گہرائی سے ہندو مذہب کی واقفیت حاصل کی تھی۔ مطہر البدء والتاریخ میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں نوسو فرقے ہیں لیکن ان میں صرف ننانوے کا حال معلوم ہے۔ اور یہ سب 45 مذہب کے اندر ہیں اور یہ بھی چار اصول کے اندر محدود ہیں اور انکی اصل موٹی تقسیم دو ہے۔ سمنی (بودھ) اور برہمنی۔ سمنی یا تو خدا کے قائل نہیں یا ایسے خدا کے جو بے اختیار ہے۔ برہمنی مذاہب والوں میں تین فرقے ہیں: ایک توحید اور جزا و سزا کا قائل ہے مگر رسالت کا قائل نہیں، دوسرا تناسخ کے اصول پر جزا و سزا کو مانتا ہے لیکن نہ تو توحید کا قائل ہے اور نہ رسالت کا۔"

مصنف مذکور مسلمانوں کے تعلق سے ہندوؤں کے طرز عمل کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

"مسلمان ان کے نزدیک ناپاک ہیں۔ وہ ان کو اور جس چیز کو وہ چھولیں اسکو نہیں چھوتے، اور گائے ان کے نزدیک ماں کی طرح ہے۔ اس کی جان لینے کی سزا ان کے یہاں قتل ہے اور غیر عورت سے ہم بستری کرنا، بے بیوی والوں کیلئے ان کے ہاں جائز ہے تاکہ نسل کم نہ ہو۔ اور بیوی والا اگر برا کام کرے تو اس کی سزا قتل ہے اور جب ان میں سے کوئی مسلمانوں کے ہاتھ پڑ کر ان کے یہاں واپس جاتا ہے تو اس کو مارتے نہیں بلکہ اس کے بدن کے تمام بال مونڈ کر اس کو پراش چیت کرتے ہیں۔ قرابت میں وہ نکاح نہیں کرتے، برہمنوں کے نزدیک شراب حرام ہے اور ذبیحہ بھی"۔

اس کے بعد مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرنے والوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور ہر دیوتا کی صورت بتاتے ہوئے مہادیو، کالی، مہا کالیا اور لنگ پوجا وغیرہ کا حال لکھا ہے۔

1.12 ابتدائی مسلم آبادیاں

یہ ایک حقیقت ہیکہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر یورش کا آغاز کیا اور شہاب الدین غوری نے ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی؛ لیکن اس سے بہت قبل جنوبی ہندوستان اور ملک کے دیگر خطوں میں مسلم آبادیاں بس چکی تھیں اور اسلام کی اشاعت تجارت اور تصوف کے ذریعہ ہوئی۔ ہندوستان کی ابتدائی اسلامی آبادی کے تعلق سے جنوبی ہند خصوصاً گجرات اور کیرالہ و مدراس وغیرہ کو یہ شرف حاصل ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ سندھ بھی اس اشرف میں ان کے ساتھ شریک ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تھانہ تک اسلامی فوج نے یلغار کیا تھی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ نے سپہ سالار عثمان بن ابوالعاص کی اس روش پر ناراضگی ظاہر کی کیونکہ وہ دربار خلافت سے اجازت کے بغیر کیا گیا تھا اور اس میں اسلامی فوج کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اس کے بعد حضرت عثمان نے ہندوستان کے تعلق سے تحقیق کیلئے ایک شخص کو بھیجا جس نے ہندوستان کی منفی صورت حال بیان کی جس کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہندوستان پر فوج کشی کا خیال ترک کردیا۔ محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے ہندوستان کے مختلف ساحلی علاقوں میں مسلم آبادیاں قائم ہو چکی تھیں۔

سراندیپ

سب سے پہلے بستی کہاں قائم ہوئی، اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے لیکن عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ دیار ہند میں اولین مسلم بستی سراندیپ میں قائم ہوئی، مشہور مورخ فرشتہ اس سلسلے میں لکھتا ہے:

"چونکہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے تھے اور یہاں کے لوگ عرب جایا کرتے تھے۔ اس لئے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہی زمانہ میں سنہ 40 ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کی تائید مشہور سیاح اور ناخدا بزرگ بن شہریار کی تصنیف عجائب الہند سے بھی ہوتی ہے۔ وہ سراندیپ کے بیان میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے پجاریوں، سنیاسیوں اور جوگیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک " بیکور" ہوتے ہیں جن کی اصل سراندیپ سے ہے۔ یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ وہ گرمی کے موسم میں ننگے رہتے ہیں۔ صرف چار انگل کی لنگوٹی، کمر میں ایک ڈوری لٹکا کر باندھ لیتے ہیں اور جاڑوں میں گھاس کی چٹائی اوڑھ لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ایسا کپڑا پہنتے ہیں جس کو مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جوڑ کر سی لیتے ہیں اور بدن پر مردوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ مل لیتے ہیں اور سر اور ڈاڑھی مونچھ کے بال منڈاتے ہیں اور دوسرے بال بڑھاتے ہیں۔ گلے میں انسان کی ایک کھوپڑی لٹکاتے رہتے ہیں اور عبرت اور خاکساری کیلئے اسی میں کھاتے ہیں۔

سراندیپ اور آس پاس والوں کو جب پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کیلئے عرب روانہ کیا۔ وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے تھے، ابوبکر صدیق کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی

اورحضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ وہ ان سے ملا اور رسالت مآب صلعم کے حالات دریافت کیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتفصیل بیان کیئے۔ جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان) کے پاس پہنچ کر مر گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا۔ وہ صحیح سلامت سرانديپ پہنچ گیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سارا حال بیان کیا اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں۔ اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے۔

فرشتہ کی بیان کردہ روایت کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ امویوں کی طرف سے مشرقی ممالک بشمول عراق کا گورنر حجاج تھا اور جزائر ہند کی طرف سے عراق کی بندرگاہ پر ہی جہازوں کی آمد ورفت ہوتی تھی۔ سرانديپ کے راجہ نے مسلمانوں سے یگانگت اور اور محبت کے اظہار کے طور پر ایک جہاز میں تحفوں کے ساتھ ان مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو عراق روانہ کیا جن کے باپ وہاں تجارت کرتے تھے اور وہیں ان کی مسافرت میں بے والی ووارث چھوڑ کر مر گئے تھے۔ اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل سرانديپ میں مسلم آبادی قائم ہو چکی تھی۔

سندھ کی مسلم آبادی

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ مشہور ہے لیکن اس سے بھی قبل سندھ میں مسلم آبادی کا ثبوت ملتا ہے۔ راجہ داہر کے ہی دور اقتدار میں پانچ سو عربوں نے محمد علافی کی ماتحتی میں بغاوت کی تھی اور عبدالرحمٰن بن اشعث کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد روپوشی اختیار کی اور پھر پوشیدہ طور پر عبدالرحمٰن کو مار ڈالا۔ اور اپنے قبیلہ کے پانچ سو آدمیوں کو لیکر عمان کی راہ سے سندھ پہنچا، وہ راجہ داہر کے زیر حکومت امن کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ راجہ داہر کے خلاف راجہ رنمل بڑی فوج لیکر حملہ آور ہوا، راجہ داہر نے گھبرا کر وزیر سے مشورہ کیا، وزیر نے کہا: سب سے بہتر بات تو یہ ہیکہ لڑ کر غنیم کو شکست دینی چاہئے، اور نہ ہو سکے تو صلح اچھی ہے اور مال سے کام چل سکے تو بھی ٹھیک ہے کہ بادشاہ اسی دن کیلئے خزانہ بھر ارکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ آج کل کچھ عرب آئے ہوے ہیں ان سے بھی مشورہ لینا اچھا ہے کیونکہ یہ لوگ اچھے جنگجو اور سیاست داں ہوتے ہیں۔ راجہ داہر ان کے پاس گیا اور مشورہ دریافت کیا اس نے کہا کہ اول تو تم یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک خندق کھود کر ٹھہرو اور مجھے کچھ فوج دو تا کہ ان کا حال معلوم کر کے کوئی تدبیر کروں، راجہ داہر نے اس پر عمل کیا، علافی فوج لے کر دشمنوں کے حالات معلوم کرنے گیا اس کو یہ معلوم ہوا کہ رات کے وقت یہ کوئی احتیاط نہیں کرتے اور غافل رہتے ہیں پس محمد علافی نے اپنے ماتحت پانچ سو سواروں کو لیکر رات کے وقت شب خون مارا اور اس شدت سے حملہ کیا کہ رنمل کی فوج بے تاب ہو کر بھاگ نکلی، ہزاروں مارے گئے اور ہزاروں گرفتار ہوئے، پچاس ہاتھی بھی عربوں کے ہاتھ لگے۔

راجہ داہر کو ان سے غیر متوقع مدد ملی تو بہت خوش ہوا اور ان عربوں کی بڑی عزت افزائی کی۔ محمد علافی کی بغاوت کا واقعہ سنہ 75 ہجری کا ہے۔ پانچ سو افراد سے ایک چھوٹی بستی بسائی جاسکتی ہے اور یہ لوگ سندھ میں رہتے تھے تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی اولین آبادیاں جو قائم ہوئیں اس میں سے ایک سندھ بھی ہے۔ پھر اس کے بعد محمد بن قاسم کے حملہ کے بعد جب سندھ مکمل طور پر خلافت اموی کے زیر نگیں آ گیا تھا تو محمد بن قاسم نے ہر اہم قلعہ میں مسلم فوجیوں اور عہدہ داروں کو حفاظتی نکتہ نظر سے رکھ چھوڑا تھا ایسے میں اس کو بھی اولین مسلم آبادی شمار کرنا چاہئے۔

مکران

مکران کافی عرصہ تک سندھ کا مقبوضہ رہا ہے اس لئے اس کو بھی سندھ میں شامل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مکران کے تعلق سے علامہ حموی کہتے ہیں کہ یہ لفظ عجمی ہے۔ عربی کے اعتبار سے یہ ماکر کی جمع ہوسکتی ہے۔ جیسے کہ فارس کی جمع فرسان، جب کہ ایک دوسرے لغوی حمزہ کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ماہ کرمان تھا بدلتے بدلتے مکران ہوگیا۔ مکران کے اولین فاتح کے سلسلے میں اختلاف ہے کچھ نے زیاد بن ابوسفیان کو مکران کا فاتح بتایا ہے اور کچھ نے حکیم ابن جبلہ عبدی کو، مکران میں مختلف ادوار میں بغاوتیں ہوتی رہیں اور ان کو فرو کیا جاتا رہا لیکن اسی کے ساتھ اس میں ایک معتدبہ مسلم آبادی ہمیشہ برقرار رہی۔

ملتان

محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا حاکم امیر داؤد نصر بن ولید عمانی کو بنایا اور پھر بعد میں جب محمد بن قاسم کو اچانک معزول کر دیا گیا اور سندھ انتظامی اعتبار سے طوائف الملو کی کا شکار ہوا تو امیر داؤد نصر بن ولید نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس کے افراد خاندان یہاں ایک طویل یعنی تیسری صدی ہجری تک حکومت کرتے رہے، اور پھر بعد میں اسماعیلی شیعہ یہاں قابض ہوئے جن کا اقتدار سلطان محمود غزنوی نے ختم کیا۔ اتنے طویل عرصہ تک حکومت کا قیام یہ بتا تاہیکہ یہاں پر ایک اچھی خاصی مسلم آبادی ہوگی کیونکہ اس کے بغیر مسلم حکومت کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

منصورہ

منصورہ کے تعلق سے علامہ حموی کہتے ہیں کہ منصورہ ہند کے ایک علاقہ کی راجدھانی ہے۔ یہ ایک بڑا اور انتہائی سرسبز و شاداب شہر ہے۔ یہاں کی مسجد کے ستون ساگوان کے ہیں۔ متصل دریائے سندھ ہے۔ حمزہ کہتے ہیں کہ قدیم برہمن آباد ہی منصورہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ منصورہ نام کے شہر کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر نے اس وقت رکھی تھی جب وہ سندھ کے باغیوں کی سرکوبی کرکے آرہا تھا، اسی خوشی میں اس نے سندھ کے دوآبہ کے مقام پر یہ اس شہر کی بنیاد رکھی، یہ شہر برابر ترقی پذیر رہا، اس کو اصل شہرت تب ملی جب منصورہ کو ہباری خاندان نے اپنا پایہ تخت بنایا اور طویل عرصے تک یہاں سے سندھ پر حکومت کی، منصورہ پر بھی اسماعیلی قابض ہوگئے تھے لیکن ان کے اقتدار کی مدت زیادہ نہیں رہی، ملتان کی طرح منصورہ بھی سلطان محمود غزنوی نے اسماعیلیوں سے چھین لیا۔ منصورہ مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل شہر تھا بالخصوص یہاں پر عربوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔ عربوں کے بڑے گروہ دو تھے، ایک حجازی (نزاری) اور دوسرا قحطانی (یمنی) ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ چپقلش ہوتی رہتی تھی، حجازی خلافت عباسیہ میں اتنے طاقتور ہوگئے کہ سندھ کے والی تک ان سے دبنے لگے اور وہ سندھ کے والی کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے لگے، اس کے ساتھ روزانہ یمنیوں اور حجازیوں میں جھگڑے ہونے لگے جس کی وجہ سے پورے سندھ میں بدامنی پھیل گئی تھی۔ بالآخر ہارون رشید نے اس فتنہ کے سدباب کیلئے داؤد مہلبی کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا اور اس نے حالات کا جائزہ لے کر محسوس کیا کہ بدامنی اور فتنہ وفساد کی جڑ حجازی ہیں لہذا وہ فتنہ فساد برپا کرنے والوں کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آیا اور ان کی قوت وشوکت ختم کردی۔ اس نے جب دیکھا کہ سخت کارروائی کے بعد بھی حجازی اپنی شرارت سے باز نہیں آرہے ہیں تو اس نے منصورہ میں حجازیوں کے محلات اور مکانات کو منہدم کرادیا، حجازیوں میں سے کچھ قتل

ہوئے، کچھ بھاگ گئے اور کچھ کو جلاوطن اور ملک بدر کر دیا گیا۔اس طرح منصورہ میں آباد حجازی عربوں کی بڑی تعداد ختم ہوگئی۔

محفوظہ

خلافت اموی میں تمیم کے سندھ کے والی رہتے ہوئے انتہائی بدامنی ہوگئی تھی ایسے میں خالد قسری جو مشرقی ممالک کا گورنر جنرل تھا اس نے حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا،اس نے دیکھا کہ آس پاس کی تمام ریاستیں غیر مسلم ہیں اور مسلمانوں کیخلاف حملہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کیلئے جائے پناہ کہیں نہیں ہے ایسے میں اس نے مناسب محسوس کیا کہ ایک ایسا شہر بسایا جائے جہاں حملوں کی صورت میں مسلمان پناہ لے سکیں۔اس شہر کیلئے اس نے مشیروں سے نام تجویز کرنے کیلئے کہا،کسی نے حمص اور کسی نے کچھ کہا،ایک نے تدمر نام رکھنے کی جانب اشارہ کیا تو اس کی زبان سے نکلا، دمرک اللہ (اللہ تمہارے برباد کرے) اور واقعتاً ایسا ہی ہوا کہ محفوظہ کچھ عرصہ بعد ہی غیر محفوظ یعنی ختم ہوگیا۔لیکن ایک عرصہ تک وہاں مسلم آبادی رہی تھی۔

ملیبار کی مسلم آبادی

متعدد روایتیں اس امر کی ملتی ہیں کہ اسلام اور عربوں کا ایک بڑا مرکز وہ تھا جسے ملیبار کہتے ہیں۔ملی کے معنی پہاڑ اور بار کا معنی ملک کا ہے۔تحفۃ المجاہدین میں ملیبار میں مسلم آبادی اور اشاعت اسلام کے تعلق سے لکھا ہے۔

"سلام سے پہلے اور اسلام کے بعد یہودی اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے۔اور یہاں بودوباش اختیار کر چکے تھے جب اسلام پر دو سو برس گزرے،عرب اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم کی زیارت کیلئے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں جارہی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کدنکلور کے کنارے آ کر لگا۔شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آ گیا، راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر اور مذہب کا حال سنا ہے اب تم خود سناؤ! درویشوں نے اسلام کی حقیقت اس موثر انداز سے بیان کیا کہ راجہ کا دل موہ لیا۔راجہ نے ان سے وعدہ لیا کہ واپسی میں بھی وہ ادھر سے ہی گزرتے جائیں۔ چنانچہ وعدہ کے مطابق وہ آئے۔راجہ نے سب امرا کو بلا کر کہا کہ اب میں خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کر دیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا اور ان درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام کے پھیلانے کی صورت یہ ہیکہ تم لوگ ملیبار سے تجارت شروع کر دو اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اور اس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو۔اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے اور رہنے لگے۔تحفۃ المجاہدین کی ایک روایت کے مطابق راجہ کا واقعہ پیغمبر اسلام کے عہد کا ہے لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کو غلط مانا ہے۔تحفۃ المجاہدین کی تیسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ:

"ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں۔ یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے

سے پرہیز کرتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ سردار اوران کی سپاہ بت پرست ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اوران کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں.......... بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے۔ کیونکہ انکے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہوجانا انہیں مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے۔"

ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن آگے چل کر نائط اور موپلا کے نام سے مشہور ہوئے اور پرتگیزوں سے پہلے ان کے ہاتھوں میں جہازرانی کی باگ ڈور تھی۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہوگئے یا شادی بیاہ کے ذریعہ برادری میں شامل ہوگئے ہیں۔

کولم

عرب جہازراں بہت قدیم زمانے سے اس کا نام لیتے آئے تھے اور اس کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ مسالوں والے ملک کا آخری شہر ہے۔ یہاں سے جہاز عدن کو جاتا تھا اور یہاں مسلمانوں کا ایک محلّہ آباد ہوگیا تھا اور یہاں ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی۔

گجرات

سنہ 107ہجری میں عراق کے حاکم خالد نے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی حکومت سے الگ کر کے جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ کا حاکم بنایا، جنید جے پور (سندھ) سے براہ ریگستان خرد مد (ماڑواڑ) میں پہنچا، معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ راستہ بڑا بارونق تھا۔ یہاں سے چل کر عربی فوج مانڈل پہنچی، یہ مقام آج بھی ویرگام کے پاس چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ممکن ہے اس عہد میں شہر کی حیثیت رکھتا ہو۔

نقشہ دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہاں پہلی جنگ ہوئی کیونکہ مرمد پہنچنے کے بعد یقیناً حریف نے مدافعت کی پہلی کوشش کی ہوگی اور پھر مانڈل میں دونوں عربی فوجوں کا تصادم ہوا ہوگا اور فتح پانے پر ہی جنید آگے بڑھا ہوگا۔ یہاں سے چل کر جنید دھنج پہنچا جو نہروالا پٹن اور پنچاسر کے پاس ہے۔

پنچاسر چوڑا (چاوڑا) راجہ کا پایہ تخت تھا جو گجرات کاٹھیاواڑ اور کچھ کے رن کے درمیان رادھن پور کے پاس تھا۔ سولنکی (گوجر) کے عہد میں وہی پایہ تخت رہا۔ عربوں سے شکست کھانے کے بعد یہ شہر بے رونق ہوگیا۔ لیکن اصل ویرانی کا سبب یہ ہوا کہ عربوں نے جب سولنکیوں کی طاقت توڑ دی تو چاوڑا خاندان کا شہزادہ پھر اٹھ کھڑا ہوا، اور آخر بن راج نے اپنے باپ کی کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کرلی اور سیاسی مصلحت کی بنیاد پر انہل واڑہ (نہروالا پٹن) آباد کر کے پایہ تخت بنایا جس کے سبب پنچاسر ویران ہوگیا۔

پنچاسر اس عہد میں شمالی گجرات کا پایہ تخت تھا اور چاوڑا خاندان سے چھین کر سولنکی کے قبضہ میں آچکا تھا۔ سولنکی خاندان تمام کاٹھیاواڑ، کچھ، شمالی اور جنوبی گجرات اور دکن کے بڑے علاقے پر قابض تھا۔ اس خاندان کے حکمراں بڑے مغرور تھے۔ فقط اتنی سی بات پر کہ ایک برہمن شاعر نے اس کے دربار میں چاوڑا راجہ کی بڑی تعریف کی اور اس کے سوال کرنے پر وزیر نے کہا کہ وہ اپنے ماتحت راجاؤں میں سے نہیں ہے اس ملک پر حملہ آور ہوکر اس ملک کو چھین لیا۔ اس کا پایہ تخت کلیان تھا جو آج بیدر ضلع میں ایک گاؤں کی شکل میں ہے۔

جنید کے حملہ کرنے کی وجہ کیا تھی اس تعلق سے مورخوں نے وضاحت نہیں کی ہے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی بات پر سولنکی راجہ نے سخت اور مغرورانہ رویہ اختیار کیا ہوگا اور بات یہاں تک پہنچی ہوگی کہ جنید کو یہاں آنا پڑا۔ دھنج کے مقام پر دونوں فوجیں جنگ آزما ہوئیں اور گجراتی فوج شکست کھا کر بھاگی اور جنید نے آگے بڑھ کر پایہ تخت گجرات پنچاسر پر قبضہ کرلیا اور ایک ہی جنگ میں سولنکی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سولنکی فوج کیساتھ یہاں سے بھاگ کر برائے امداد جنوبی گجرات پہنچا اور بھروچ میں جنگی تیاری کرنے لگا پھر جنید کو معلوم ہوا کہ اجین (مالوہ) میں جنگی تیاریاں کی جارہی ہیں تو اس نے اپنے ایک افسر حبیب نامی کو اس طرف بھیج دیا جس نے اجین اور مالوہ کو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روندڈالا۔ فاتح اپنے ملک سے بہت دور نکل آئے تھے۔ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھیلمان میں ایک بڑے معرکہ کی حریفوں نے تیاری شروع کردی۔ جنید کو بھی اس کا احساس تھا کہ بھیلمان میں اگر گوجروں کی زیادہ طاقت جمع ہوگئی تو واپسی میں دشواری ہوگی اس لئے بھروچ سے خود بھی بھیلمان کی طرف واپس ہوگیا اور دوسری جانب سے حبیب نے بھی مالوہ سے ماڑواڑ اور شہر پناہ پر حملہ آور ہوکر آگ لگادی اور فتح یاب ہوکر جنید سے جاملا۔

تمام فوجیں مجتمع ہوکر بھیلمان پہنچیں اور پرزور حملہ سے غنیم کو شکست دینے میں جنید کامیاب رہا، اس کے بعد گوجروں نے جہاں کہیں مقابلہ کیا شکست کھائی جنید ان فتوحات کے بعد سندھ واپس ہوگیا۔ ان فتوحات کی تائید ان کتبوں سے بھی ہوتی ہے جو اثری تحقیقات کے تحت دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ چالوکیہ راجہ کے عہد کا نوساری سے دستیاب ہوا ہے۔ چنانچہ پول کیشی جناشر کے عہد کا ایک کتبہ ہے جس میں لکھا ہے:

"عرب لشکر نے سندھ، کچھ، سوراسٹھ، چاوڑا، موریا (ماڑواڑ یا مالوہ) اور بھیلمان کی سلطنت کو حیران کیا"۔

یہ کتبہ پول کیشی کے عہد یعنی 738 عیسوی کا ہے گویا اصل واقعہ سے دس بارہ برس بعد کا ہے۔ ان فتوحات کینتیجہ میں جنید کو اس قدر مال و دولت ہاتھ آیا کہ ملنے والوں اور دوستوں کو دے دلا کر بھی چار کروڑ درہم اس کے پاس بچا رہا اور اسی قدر اس نے پایہ تخت کے خزانہ میں داخل کیا۔ جنید نے غنیمت میں ملنے والے مال کو بڑی فیاضی سے خرچ کیا چنانچہ عرب شاعروں نے جنید کی بڑی تعریف کی ہے۔

جنید کے حملہ کے تقریباً 30 یا 32 برسوں تک گجرات کی طرف عربوں نے رخ نہیں کیا۔ دوسری صدی ہجری میں اموی حکومت کا ورق الٹا اور عباسی خلافت برسر اقتدار آئی، عباسیوں نے دمشق کے بجائے بغداد کو دارالخلافہ بنایا۔ اس انقلاب نے ہندوستان کو عرب کے بہت قریب کردیا۔ ابوجعفر منصور نے ہشام بن عمرو التغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، ہشام نے آتے ہی سندھ کے اندرونی حالات کو درست کیا اور اس کے بعد گجرات کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ گجرات کے ایک مرکزی مقام باربد (بھاربھوٹ، ضلع بھروچ) کی طرف عمرو بن جمل کی سرکردگی میں ایک بحری فوج روانہ کی۔ غالباً اس وقت اس کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اس لئے جلد واپس چلا گیا اور بہت ممکن ہے کہ صرف حالات کا جائزہ لینے آیا ہو۔ کچھ عرصہ بعد ہشام نے فوجی تیاری کرکے جہازوں کا ایک بڑا بیڑا لے کر گندھار (ضلع بھروچ) پر حملہ کیا اور فتحیاب ہونے کے بعد کچھ دنوں یہاں قیام کیا اور اپنی فتح کی یاد میں ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ سندھ کے علاوہ ہندوستان میں پہلی مسجد تھی۔

سندان

تیسری صدی ہجری میں خلیفہ مامون کے دور میں بنوسامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ہامان نے سندھ سے ہٹ کر گجرات کے ایک مشہور اور مرکزی شہر سندان پر قبضہ کیا، اس نے یہاں اپنی خودمختار حکومت قائم کرنے کے بعد دوراندیشی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر

خلافت عباسیہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کرلئے اور مامون کی خدمت میں ایک ہاتھی روانہ کیا اور مامون کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔اس نے سندان میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی، اگرچہ گجرات میں اس سے پہلے ایک مسجد تعمیر ہوچکی تھی لیکن یہ مسجد اپنی وسعت اور دیدہ زیبی میں اپنی مثال آپ تھی۔ فضل کے انتقال کے بعد تخت کا وارث اس کا بیٹا محمد بن فضل ہوا،اس نے ستر کشتیاں مہیا کر کے سمندری قزاقی کا پیشہ اختیار کرنے والی میدقوم پر حملہ کردیا اور کالڑی نام کے شہر کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ خبر آئی کہ اس کے بھائی ہامان نے سندان پر قبضہ کرلیا ہے۔ یہ سن کر وہ واپس ہوا جب سندان کے نزدیک پہنچا تو خبر سچ ثابت ہوئی، بھائی کی بے وفائی سے وہ بہت غمزدہ ہوا،اس نے خلافت عباسیہ میں مدد کی اپیل کی ،اس وقت معتصم برسراقتدار تھا اور اپنی عرضی کے ساتھ ساگوان کا ایک اتنا بڑا ٹکڑا بطور تحفہ بھیجا جیسا عراق والوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔معتصم کی جانب سے مدد آنے والے سے پہلے ہامان نے سندھیوں کو اپنی طرف کرلیا اور محمد کے فوجی سرداروں کو بھی توڑ لیا اور جب محمد بن فضل کے پاس بہت کم فوج رہ گئی تو اس نے سندان کے قلعہ سے باہر نکل کر حملہ کر دیا۔ محمد کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار کر کے سولی دے دی گئی۔ ہامان سندھ اور خلافت عباسیہ دونوں سے بے نیاز تھا لیکن اس کی یہ بے نیازی زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کچھ دنوں بعد ہندوراجاؤں نے اس پر حملہ کردیا اور بے تعلقی کی وجہ سے سندھ اور خلافت عباسیہ کہیں سے بھی اس کی مدد نہیں ہوئی۔شہر پر ہندوراجاؤں کا قبضہ ہوگیا لیکن انہوں نے مذہبی رواداری سے کام لیتے ہوئے مسجدوں کو محفوظ رکھا جس میں مسلمان نماز پڑھتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خلیفہ بغداد کیلئے دعا کرتے تھے۔

قدیم مسلمان آبادیوں کے تعلق سے ہندوستان کے کسی بھی گوشہ اور خطہ سے کتبات جیسے ثبوت نہیں ملے صرف گجرات ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں سے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے بارہویں صدی کے مجموعی طور پر 9 کتبے تلاش کئے ہیں۔ یہ اس دور کے ہیں جب گجرات میں چالکیہ اور واگھیلا خاندان برسراقتدار تھا۔ یہ تمام کتبات کھمبایت، ویراول، جوناگڑھ، انہل واڑ پٹن اور سومناتھ سے ملے ہیں جو 1218ء سے لے کر 1291 عیسوی کے ہیں۔شعبہ تحقیق آثار قدیمہ کچھ بھوج کے تعاون سے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کو جولائی 1961ء میں صرف بھدریسور سے ہی 8 کتبات ملے۔اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلم آبادیاں کچھ میں اور بطور خاص بھدریسور میں زیادہ تعداد میں بڑھی ہوگی۔

معلومات کی جانچ

1. ابتدائی مسلم آبادی سندھ و ہند میں کہاں کہاں تھی؟
2. سندھ میں ابتدائی مسلم آبادی کی وجوہات کیا تھیں؟
3. گجرات کی ابتدائی اسلامی فتوحات پر روشنی ڈالئے۔

1.13 خلاصہ

ہزاروں سال قبل مسیح سے ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات تھے۔ عرب تاجر ہندوستان کی پیداوار جس میں خوشبودار لکڑیاں، عطریات، گرم مسالے، ہیرے جواہرات اور یہاں کی خاص چیزیں جیسے کپڑے اور جوتے اور بانس و بید وغیرہ مصر وشام اور وہاں سے روم یعنی یوروپ پہنچاتے تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کی کرنوں نے اپنے اردگرد کے ماحول

کو روشن کرنا شروع کیا تو دھیرے دھیرے اس کی پرامن شعاعوں نے جزائر ہند کو بھی منور اور روشن کیا۔

سراندیپ، کولم، ملیبار اور گجرات کے کچھ علاقوں میں مسلمانوں کا بطور تاجر اور درویش پرامن داخلہ ہوا اور انہوں نے وہاں بود و باش بھی اختیار کر لی، ان علاقوں میں قبول اسلام پھیلنے کی مختلف روایتیں ہیں لیکن ایک بات واضح ہے کہ شمالی ہند کے برعکس یہاں اسلام کی ابتدائی آمد پرامن طور پر اور تجارت پیشہ افراد اور صوفیاء کرام کے ذریعہ ہوئی۔ دوسرے چونکہ یہ عرب جہاز رانی میں ماہر تھے اور ساحلی حکمرانوں کو ان کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ ان کے دم قدم سے ان کی ریاستیں بارونق تھیں لہذا انہوں نے ان عربوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔

سندھ کے راجہ داہر کی جانب سے باغیوں کو پناہ دینے، قزاقوں کی سرکوبی نہ کرنے کی وجوہات کی بناء پر خلافت اموی میں ولید بن عبدالملک کے دور میں حجاج نے جو مشرقی ممالک کے مقبوضات کا گورنر تھا، سندھ کے خلاف فوج کشی کی اور اپنے داماد محمد بن قاسم کی قیادت میں فوج روانہ کی۔ محمد بن قاسم نے جلد ہی پورا سندھ فتح کیا اور اس کے ارادے پورے ہندوستان کو اسلامی جھنڈے تلے کرنے کے تھے لیکن قضا و قدر کا فیصلہ غالب آیا۔

جب دو قوموں کا ایک دوسرے سے میل ملاپ اور اختلاط ہوتا ہے تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ ایسا ہی عربوں اور ہندیوں میں بھی ہوا اور پھر مختلف گونا گوں تعلقات عربوں اور ہندیوں کے درمیان قائم ہوئے، تجارتی تعلقات دونوں کے درمیان زمانہ قدیم سے اہم رابطہ تھا۔ اس تجارت سے جنوبی ہند اور گجرات کے علاقے مال مال ہو گئے تھے کیونکہ زیادہ جہازوں کی آمد کا مطلب زیادہ محصول اور زیادہ مالی فراوانی تھی۔ اس لئے جنوبی ہند کے حکمرانوں بالخصوص ملیبار کے حکمرانوں نے مسلمانوں کی عزت افزائی اور آؤ بھگت کی۔

تعلقات کی ابتدا تجارت سے ہی ہوئی تھی لیکن دھیرے دھیرے علمی اور مذہبی تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبہ کیلئے کچھ بت ہندوستان سے بھی روانہ ہوئے تھے اور سسلی کی فتح کے بعد وہاں سے ایک بیش قیمت بت ملا تھا جسے حضرت امیر معاویہ ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم جو مسلمانوں کے مصالح پر خرچ ہو بہتر سمجھتے تھے لہذا اس بت کو سندھ بھیج دیا جہاں اس کی فروخت سے بڑی رقم ملی (دیگر مورخین نے اس کی تردید کی ہے صرف بیرونی نے سندھ میں بت بھیجے جانے کی بات کہی ہے)۔

ہندوستان ابتدائے زمانہ سے ہی علوم و فنون میں شہرت رکھتا تھا اور اسی لئے دنیا کی دیگر تمام قومیں ان کے نزدیک حقیر اور جاہل تھیں عربوں نے ہندوستان سے ریاضی، ہیئت کے ساتھ جیوتش، جفر اور رمل بھی سیکھا اور اسی کے ساتھ متعدد طبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان تراجم اور ہندوستان طبیبوں کی بغداد میں بود و باش نے عربی زبان و ادب کو متاثر کرنے کے ساتھ عرب طبیات کو بھی متاثر کیا۔

چونکہ برامکہ خاندان خود ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق ہے اور خلافت عباسیہ میں ان کا بڑا زور تھا تو انہوں نے ہندوستان سے مختلف علوم و فنون کے ماہرین کو بغداد بلایا اور ان کو دار الترجمہ میں مختلف علوم و فنون کی ہندوستانی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت سونپی جسے انہوں نے پوری جانفشانی سے انجام دیا۔

بعد کے ادوار میں ہم دیکھتے ہیں کہ البیرونی اور دیگر سیاح ہند آتے ہیں وہ یہاں کی کچھ چیزوں کی تعریف بھی کرتے ہیں اور کچھ چیزوں پر تنقید بھی کرتے ہیں، ہندوستان کے افراد بالخصوص براہمن البیرونی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اس کے علاوہ ہندوستان میں ذات پات کی جو

سخت بندش تھی اس کو بھی اسلام کے تصور مساوات نے ڈھیلا کیا۔

1.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. عرب و ہند تجارتی تعلقات کی قدامت اور درآمد برآمد پر مفصل لکھیے۔
2. ابتدائی مسلم آبادی کہاں کہاں قائم ہوئی، تفصیل سے لکھیے۔
3. عرب و ہند کے علمی تعلقات کی نوعیت بیان کیجیے۔

حسب ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. عرب تاجر ہندوستان سے کیا کچھ لے کر عرب اور پھر یوروپ جاتے تھے۔
2. گجرات کی فتح اور سندان کی مسلم ریاست کا حال بیان کیجیے۔
3 سراندیپ میں اشاعت اسلام کے اسباب بیان کیجیے۔

1.15 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. عرب و ہند تعلقات کے تعلقات — علامہ سید سلیمان ندوی
2. عرب ممالک اور صوبہ گجرات کے تعلقات — مولانا اقبال محمد ٹنکاروی
3. عرب و ہند عہد رسالت میں — قاضی اطہر مبارک پوری
4. عربوں کی جہاز رانی — علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 2 : سندھ کی فتح اور حکومت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزاء

2.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر ہم سندھ کی جغرافیائی اہمیت' وہاں مسلمانوں کی آمد اور اس سرزمین پر قائم ہونے والی پہلی اسلامی حکومت کے حالات وواقعات سے آگہی حاصل کریں گے' نیز اس حکومت کے نظم ونسق اور عدل وانصاف کے طریقہ کار سے بھی واقف ہوں گے۔

2.2 تمہید

برصغیر ہند میں دعوت اسلامی کی گونج عہد نبوی ﷺ سے ہی سنی گئی' چنانچہ عرب تاجروں کے قافلے سامان تجارت کے ساتھ ساتھ

''متاع دین'' بھی لے کر جنوبی ہند کے ساحلوں پر خیمہ زن ہوئے اور اسلام کی باد بہار سے اس خطہ کو روشناس کیا۔ البتہ سندھ کی تاریخ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ اسلامی شہ سواروں کا قافلہ سب سے پہلے یہیں فروکش ہوا۔ ہند کے اسی خطہ پر مسلمانوں کی پہلی حکومت قائم ہوئی' اور ایک ہزار سال سے زیادہ وہ یہاں کے حکمراں رہے' اس قیادت وسیادت کا گہرا اثر یہاں کی تہذیب وتمدن اور تاریخ وثقافت پر پڑا اور اس فتح سندھ کے نتیجہ میں جنوبی ایشیاء اسلام سے روشناس ہوا۔

2.3 سندھ نام رکھنے کی وجہ

''سندھ'' یہ دراصل آرین زبان کا لفظ اور آریہ قوم کا دیا ہوا نام ہے۔ آرین جب وادی سندھ میں وارد ہوئے تو انہوں نے دریا کی مناسبت سے اس علاقہ کو ''سندھو'' اور پھر ''سندھ'' کا نام دیا۔ واضح ہو کہ آریہ قوم نے سندھ کے آس پاس جتنے علاقے فتح کیے ان سب کو سندھ ہی کے نام سے موسوم کیا۔

یہی لفظ جب ایرانیوں کے زیر استعمال آیا تو انہوں نے سندھ کو ''ہند'' بنا دیا' اور یونانیوں نے ھند کی ''ھ'' کو حرف ہمزہ سے بدل کر ''اند'' کر دیا اور یہی لفظ رومن میں جا کر ''اند'' سے ''انڈیا'' ہو گیا اور چونکہ انگریزی میں ''دال'' نہیں ہے تو انڈیا بن گیا۔ اس طرح ہند وانڈیا کی اصل سندھ ہی ہے جو کہ بنیادی طور پر آرین زبان کا لفظ ہے۔

2.4 سندھ کا محل وقوع

موجودہ دور میں سندھ سے ایک محدود علاقہ کو مراد لیا جاتا ہے' مگر ماضی میں یہ ایک کشادہ خطہ کے لیے کہا جاتا تھا' یا بالفاظ دیگر سندھ کے حاکموں کے زیر قبضہ جتنا علاقہ ہوتا وہ سب سندھ کہلاتا' گویا کہ سندھ کی حدود میں زمانہ بہ زمانہ تبدیلی آتی رہی۔ سندھ کا آخری حکمراں راجہ داہر تھا' اسی کے دور میں سندھ کی حدیں اس طرح تھیں۔

> شمال میں دریائے جہلم کا منبع' جس میں کشمیر کے نشیبی اضلاع شامل تھے' اور کوہ کابل کا سلسلہ اس کی حد بندی کرتا تھا' پھر شمال مغرب تک دریائے ہل مند پر جا کر وہ ختم ہوتا۔ اور جنوب مغرب میں ایران وسندھ کی سرحد اس مقام پر تھی جہاں ساحل کے سامنے مکران کا جزیرہ منشور واقع ہے' جنوب کی طرف بحر عرب اور جنوب مشرق میں خلیج کچھ' مشرق میں راجپوتانہ اور جیسلمیر کی سرحدیں آ کر ملتی تھیں۔

گویا کہ ایک بہت ہی وسیع وعریض خطے کا نام سندھ تھا' اور یہ برصغیر ہند کی اہم حکومت سمجھی جاتی تھی۔ حکومت سندھ کا پایہ تخت شہر ''اروڑ'' تھا اسے ''الور'' بھی کہتے ہیں۔ یہ دریائے سیحون پر واقع تھا۔ سندھ کی یہ حکومت پانچ صوبوں پر مشتمل تھی' (1) برہمن آباد (2) سوستان (3) اسکلند (4) ملتان (5) الور' آخر الذکر پایہ تخت تھا۔

2.5 سندھ کی قومیں

فتح سندھ کے وقت جو قومیں وہاں آباد تھیں اور تاریخ کے حوالے سے جن قدیم قوموں کا وہاں ذکر ملتا ہے۔ وہ اس طرح ہیں:

جاٹ: انہیں عربی زبان میں ''زط'' کہا جاتا ہے۔ یہ سیاہ رنگ کے خالص ہندوستانی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آبادی ہندوسندھ کے باہر عرب میں بھی پائی جاتی تھی۔ یہ قوم خود سندھ کے علاوہ منصورہ کے گردونواح سے لے کر مکران تک پھیلی ہوئی تھی' نیز بلوچستان اور پنجاب میں بھی اس کی آبادی تھی۔

مید: یہ لوگ زیادہ تر دریائے سندھ کے کنارے آباد تھے' اس طرح دریائے سندھ کے ساحلی مقامات سے لے کر ملتان تک ان کی آبادی تھیں' بلکہ گجرات اور کوکن کے ساحل میں بھی یہ قوم بکثرت آباد تھی۔ یہ لوگ دراصل بحری قزاق اور لیٹرے تھے' علاقے کے راجے مہاراجے تک بھی ان سے عاجز تھے۔

سیابچہ: یہ بھی ہندوستان کی ایک مشہور قوم تھی' ان کا وطن بھی سندھ تھا۔

بیاسرہ: اس قوم کا تعلق بھی سندھ سے تھا اور بمبئی کے حدود چمبور تک یہ آباد تھے۔ پیشہ سے لوگ جہازوں کی حفاظت کا کام کیا کرتے تھے۔

ٹھاکر: یہ قوم بھی سندھ سے تعلق رکھتی تھی' اپنی بہادری کے لیے شہرت رکھتی تھی' راجہ داہر کی فوج کا ہراول دستہ بن کر انہی لوگوں نے محمد بن قاسم سے مقابلہ بھی کیا۔

عامل: یہ سندھ کے مقامی لوگ تھے اور ہندوؤں میں ممتاز مقام وحیثیت کی حامل قوم سمجھے جاتے تھے۔ علم سے انہیں خاص شغف تھا۔ اسلامی دور حکمت میں بھی یہ لوگ اونچے منصبوں پر فائز کیے گئے۔

غرض کہ تسخیر سندھ سے پہلے یہ سب قومیں سندھ میں آباد تھیں اور مختلف پیشوں سے وابستہ تھیں۔

دین کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس وقت سندھ میں ہندو' بدھ مذہب کے پیرو اور مسلمان بھی موجود تھے' حقیقت یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں بہت سے مسلمان سندھ میں آباد ہو چکے تھے' ان میں وہ پناہ گزیں بھی تھے' جنہوں نے اسلامی خلافت سے بغاوت کر کے سندھ میں پناہ لے لی تھی' چنانچہ محمد علافی اور اس کے ہمراہ پانچ سو فوجی اسی سندھ میں پناہ گزیں تھے۔ محققین کا کیا خیال ہے کہ فتح اسلامی کے وقت سندھ میں اکثریت بدھوں کی تھی۔ ہندو کم تھے اور مسلمان تو بہت کم مگر اس کے باوجود حکومت برہمنوں کی رہی۔

2.6 سندھ میں ہندوؤں کی آخری حکومت

سندھ کا آخری ہندو حکمران راجہ داہر تھا۔ معروف سندھی راجہ چچ برہمن (متوفی 40ھ مطابق 660ء) کا چھوٹا بیٹا تھا۔ داہر سے پیشرو حکمران راج چندر کا انتقال (48ھ مطابق 668) میں ہوا' چنانچہ اس کے مرنے کے بعد سندھ میں طوائف الملو کی شروع ہو گئی' اور الور کے تخت پر راجہ داہر بیٹھ گیا' نیز حکومت سندھ کی ایک ریاست برہمن آباد میں چندر کا لڑکا ''راج'' تخت نشین ہوا۔ ایک سال گزرتے گزرتے راج دنیا

سے رخصت ہوگیا' تو راجہ داہر کے بڑے بھائی دھر سنگھ نے برہمن آباد کے تخت پر قبضہ کرلیا' گویا کہ اب داہر و دھر سنگھ دونوں سندھ کے دوحصوں کے حکمراں ٹھرے۔شمال پر داہر اور جنوب پر دہر سنگھ قابض رہے۔

2.6.1 راجہ داہر کا بہن سے نکاح

ان ہندو حکمرانوں میں علم نجوم پر بہت ایمان و یقین ہوا کرتا تھا' وہ اپنے بیشتر فیصلے نجومیوں کے مشورہ سے کیا کرتے تھے' چنانچہ راجہ داہر ایک موقع پر نجومی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے حالات اور مستقبل کے بارے میں دریافت کیا' نجومی نے بتایا کہ:

''خوش قسمی کے سارے ستارے طالع کی طرف دیکھ رہے ہیں اور کوئی بھی نحس ستارہ خلاف نہیں۔ یہ قلعہ اور بادشاہی سالہا سال کے لیے تیرے واسطے مقر اور مستحکم ہے۔ پھر بادشاہ نے پوچھا' ہماری بہن ماہین کا طالع کیسا ہے؟ نجومی نے کہا کہ یہ اروڑ کے قلعہ سے باہر نہ جائے گی اور اس کا رشتہ وہ راجہ طلب کرے گا جس کے قبضے میں ہندوستان کی بادشاہت ہوگی اور یہ لڑکی اس کے عقد میں آئے گی۔

راجہ داہر نے اپنی سلطنت بچانے کے لیے اپنی سگی بہن سے نکاح کرلیا۔ البتہ ازدواجی تعلقات سے گریزاں رہا' اس شرمناک اقدام نے راجہ داہر کے بھائی دھیر سنگھ کو برانگیختہ کردیا اور ان میں باہم جنگ تک نوبت آ پہنچی' کچھ ہی عرصہ بعد دھیر سنگھ کا انتقال ہوگیا اور راجہ داہر نے برہمن آباد کو بھی اپنے زیر اقتدار لے لیا' نیز بھائی کی بیوہ کو اپنے نکاح میں لایا۔

2.6.2 رمل کے بادشاہ کی داہر کے خلاف بغاوت

59ھ میں رمل کا بادشاہ ایک ہزار لشکر جرار' ہاتھی سوار اور بہادر پیادے لے کر راجہ داہر سنگھ جنگ کے لیے روانہ ہوا' یہ فوج راوڑ پر حملہ آور ہوئی اور راجہ داہر کے بعض علاقوں پر قابض ہوگئی' اس افتاد سے نجات پانے کے لیے راجہ داہر نے مشورہ کیا' بدھیمن وزیر نے کہا کہ جنگ کا طریقہ جیسا کہ عرب جانتے ہیں' کوئی نہیں جانتا' اس لیے اروڑ میں موجود عرب پناہ گزینوں سے مدد لی جائے' چنانچہ بادشاہ نے عربوں سے مدد طلب کی۔

2.6.3 عربوں کی راجہ داہر کو مدد

بنی آسار میں ایک جنگجو محمد علافی تھا' جس نے ماتحت اسلامی ملکوں سے بغاوت کی تھی اور پانچ سو فوجیوں کے ہمراہ بھاگ کر سندھ میں پناہ لی تھی۔ راجہ داہر نے محمد علافی سے مدد کی درخواست کی' چنانچہ ان عرب جنگجوؤں کی عسکری حکمت عملی کام آئی اور رمل کی فوج شکست خوردہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ راجہ داہر اس فتح کامرانی سے بڑا خوش ہوا اور ان عرب پناہ گزینوں کی بہت عزت افزائی کی۔ اس طرح راجہ داہر کی حکومت کو سیاسی استحکام حاصل ہوا' تا آنکہ 43 برس حکومت کے بعد 10 رمضان 93ھ مطابق 714ء میں راجہ داہر مارا گیا اور محمد بن قاسم نے سندھ پر فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس طرح یہ خطہ عرب مسلمانوں کے زیر قبضہ آ گیا اور برصغیر ہند میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

1.7 سندھ اور عہد خلفاء راشدین

---

11 ہجری میں رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا' حضرت ابوبکر خلیفہ مقرر ہوئے' 13ھ میں آپ نے وفات پائی اور حضرت عمرؓ جانشین ہوئے

'آپ کے عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ فتح ایران کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ اس کی نوآبادیات کو بھی زیر قبضہ لایا جائے۔ چنانچہ مکران و بلوچستان پر ان کی نگاہ پڑی' اور ظاہر ہے سندھ کی سرحد ان علاقوں سے قریب تھی۔

دوسری طرف عرب و ہند کے قدیم تجارتی تعلقات تھے' اسلام کی آمد سے قبل بھی یہ دوطرفہ تجارت اپنے عروج پر تھی' چنانچہ عرب مسلمانوں کو اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ کی تلاش تھی' اس وجہ سے بھی حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عرب بحری بیڑے ہندوستان کے ساحلوں پر چکر لگانے لگے۔ 15ھ مطابق 636ء میں عربوں نے بحرین کے گورنر کے حکم سے "تھانہ" بندرگاہ پر پہلا حملہ کیا' یہ بندرگاہ عروس البلاد ممبئی کے قریب اب بھی موجود ہے۔ اس کے بعد گجرات کے شہر بھروچ (بروص) پر بھی فوج کشی کی گئی' اسی زمانے میں سندھ کی بندرگاہ دیبَل (جو اصل میں دیول کا معرب ہے) پر بھی حملہ کیا گیا۔ اس بندرگاہ کا جائے وقوع موجودہ کراچی کے قریب تھا۔ ظاہر ہے یہ حملے بہت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے اور نہ ہی اس کے لیے باضابطہ کوئی تیاری کی گئی تھی' بلکہ حضرت عمرؓ کے دور میں کیے گئے تھانہ و دیبل کے حملوں پر امیر المومنین نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان و سندھ پر عربوں کے اصلی حملے خشکی کے راستے کئے گئے اور وہ مفید و ثمر آور ثابت ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ان بندرگاہوں کی نگہداشت کے لیے دریائی دستہ بھیجا جاتا تھا' حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں 39ھ مطابق 660ء میں باضابطہ ایک سردار اس علاقے کی نگرانی کے لیے معین کیا گیا' جو 42ھ مطابق 663ء میں مارا گیا۔ امیر معاویہ کے دور میں ایک مستقل منصب کا اضافہ کیا گیا' جو کہ سندھ کی سرحد کا نگران قرار دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے میلب نامی سردار کو اس عہدے کے لیے نامزد کیا۔

گویا کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت ہی سے سندھ پر خلافت اسلامیہ کی نگاہ تھی' اور اس کی بنیادی طور پر دو وجوہات تھیں' ایک تو سیاسی دسرے تجارتی۔ اور خلافت راشدہ کے فوراً بعد امیر معاویہ کے دور میں سندھ کے نگران کا باضابطہ ایک عہدہ مقرر کیا گیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے سندھ خلافت اسلامیہ کے دائرہ میں آتا چلا گیا۔

ذیل میں خلافت راشدہ کے عہد میں سندھ پر خشکی کے راستوں سے جو حملے کیے گئے ان کی تفصیلی ذکر کی جارہی ہے۔

2.7.1 حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں سندھ پر پہلا بری حملہ

سندھ کی سرحد پر ایک مشہور شہر واقع ہے' جسے مکران کہا جاتا تھا' مکران پر سب سے پہلے ابوموسیٰ اشعری نے اپنی حکومت کے ایام میں ربیع بن زیاد کے ذریعہ فوج کشی کروائی۔ چنانچہ اس شہر پر قبضہ بھی کر لیا گیا۔ مگر مکمل اقتدار اور انتظام و استحکام کے بغیر ہی فوج واپس آگئی' جس کے نتیجہ میں بغاوت اور خودمختاری کا اعلان کر دیا گیا۔

اس فتوحات کا دائرہ جب وسیع ہوا' اور 22ھ میں پورا ایران خلافت اسلامیہ کے زیرنگیں آگیا' تو عبداللہ بن عامر بن ربیع نے کرمان و سیستان فتح کرتے ہوئے مکران کی جانب پیش قدمی کی اور اہل مکران کی سرکوبی کرنا چاہا' اس موقع پر مکران والوں نے سندھی حکومت سے فوجی مدد حاصل کی' مگر عبداللہ بن عامر نے ان متحدہ فوجوں سے مقابلہ کیا اور انہیں شکست سے دوچار کیا' اس طرح مکران و دیگر ممالک کو زیرنگیں بنایا۔ لیکن اس بار بھی عبداللہ بن عامر حکومتی انتظام و استحکام نہ کر سکے' جس کے نتیجہ میں یہ تمام ممالک خودمختار ہو گئے' چنانچہ 23ھ میں اس جانب توجہ کی

گئی اور سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عبدالہ بن عتبان نے خود مختار حکمرانوں کی سرکوبی کی اور کرمان کو فتح کیا' نیز حکومتی انتظام و انصرام کو پورا کیا۔

دوسری طرف حکم بن عمر تغلبی نے مکران کا رخ کیا' مکران کے راجہ نے پھر سندھ کے بادشاہ سے مدد طلب کی اور متحدہ فوج کے ساتھ میدان جنگ میں آ پہنچا' اس صورت حال کے پیش نظر حکم بن عمر تغلبی کے تعاون کے لیے پڑوسی ریاستوں سے شہاب بن مخارق' سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان بھی آ گئے۔ دونوں فوجوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی' آخر کار مکران کا راجہ کام آیا اور سندھ و مکرانی فوج پسپا ہوئی' اس فتح و کامرانی کی خبر دربار خلافت میں مال غنیمت کے ساتھ بھیجی گئی' حضرت عمرؓ خوش ہوئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔

2.7.2 حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں سندھ پر حملے

حضرت عثمانؓ اسلامی تاریخ میں تیسرے خلیفہ کی حیثیت سے منصب خلافت پر فائز ہوئے یہ ہجرت کا 24 واں سال ہے' آپ کے حکم سے 25 ھ میں کابل کو فتح کیا گیا' اسی طرح 29 ھ میں عبداللہ بن عامر کو تمام مشرقی ملکوں کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا' ابن عامر نے اپنے عہدہ کا جائزہ لیا اور جب مفتوح ممالک کی صورت حاصل دیکھی تھی ششدر رہ گئے' کیوں کہ وہ تمام مفتوح علاقے باغیوں اور خود مختاروں کے زیر قبضہ تھے' ان ملکوں کی بازیافت کے لیے عبداللہ بن عامر نے عبداللہ بن معمر کو مکران' عبدالرحمٰن بن عبیس کو کرمان اور عبیداللہ بن عمیر لیثی کو سیستان کا گورنر بنا کر بھیجا' ان حضرات نے سرکشوں کی سرکوبی کی اور ان علاقوں کو خلافت اسلامیہ کے زیر نگیں کر لیا۔ بعض وجوہات کی بناء پر ابن عامر نے بعد میں سیستان کی حکومت ربیع بن زیاد کو اور کرمان کی حکومت مجاشع بن مسعود کے سپرد کر دی تھی۔ ایک سال بعد باغیوں نے پھر سے سر اٹھایا' چنانچہ ابن عامر نے صحابی رسول ﷺ عبدالرحمٰن بن سمرہ بن حبیب کو والی مقرر کیا' آپ نے بغاوت کو فرو کیا اور اس پورے خطہ کو زیر کر لیا۔ گویا کہ ہندوستان کا یہ علاقہ ایک صحابی رسول ﷺ کے ہاتھوں فتح یاب ہوا۔

2.7.3 حضرت علیؓ کے دور خلافت میں سندھ پر حملے

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد 35 ھ میں حضرت علیؓ کی بیعت لی گئی اور وہ اسلامی تاریخ کے چوتھے خلیفہ بنائے گئے' آپ نے 38 ھ میں ثاغر بن دعوار کو سرحدی حملوں کے لیے روانہ کیا' چنانچہ انہوں نے حارث بن مرہ نامی ایک نہایت تجربہ کار سردار کو اپنے ساتھ شامل کیا اور بڑی فوج لے کر روانہ ہوئے وہ جہاں پہنچتے فتح مند اور کامیاب ہوتے' تا آنکہ آپ کا لشکر 42 ھ میں کوہ قیقان تک آ پہنچا' یہاں سخت معرکہ پیش آیا' کیوں کہ بیس ہزار فوجی تمام دروں کی ناکہ بندی کیے بیٹھے تھے' یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ اسلامی لشکر کے ہزاروں افراد نے بہ یک آواز نعرہ تکبیر بلند کیا' اس بلند آواز اور صدائے بازگشت نے خوف و ہراس طاری کر دیا' افراتفری مچ گئی' اور اس طرح مسلمان فتح یاب ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد 40 ھ میں حضرت علیؓ شہید کر دیے گئے۔

2.8 امیر معاویہ کے دور میں سندھ پر حملے

40 ھ میں حضرت معاویہ نے اپنی امارت کا اعلان کیا اور زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد آپ نے عبداللہ بن سوار العبدی کو حکم دیا کہ چار ہزار سواروں کے ساتھ سندھ کا رخ کرو اس طرح ان کو سندھ کا والی مقرر کیا' سخت معرکہ ہوا' دشمن کو شکست ہوئی' یہ فتح 43 ھ میں ہوئی۔

43ھ مہلب بن ابی صفرہ نے جو عبدالرحمٰن بن سمرہ کی فوج کے ایک سردار تھے' اپنی فوج لے کر بند کی طرف روانہ ہوئے' اور ''درۂ خیبر'' سے داخل ہوئے' مہلب کابل' پشاور سے گزرتے ہوئے سرزمین ہند پہنچے' واپسی میں ملتان وغیرہ کو زیر کیا۔ حضرت معاویہ کے مقرر کردہ والی عبداللہ بن سوار کاتر کی جنگجوؤں سے مقابلہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے رفقاء کے ساتھ شہید ہوگئے' ان کے بعد سنان بن سلمہ ہذلی کو مکران و سندھ کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ ان تمام علاقوں کو دوبارہ سنان سے زیر کیا۔ پھر' متعدد فتوحات حاصل کیں' دو سال وہیں قیام کیا' مزید علاقوں کو فتح کرنے کے لیے ''بدھا'' جا پہنچے' یہاں سخت جنگ ہوئی' اور اسی میں سنان بن سلمہ شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کے بعد 61ھ میں ابوالاشعث منذر بن جارود عبدی سندھ کے حاکم مقرر کئے گئے' انہوں نے آتے ہی بوقان پر حملہ کیا' نیز کئی علاقوں پر فوج کشی کی اور ہر طرف فتح یاب ہوئے۔

2.9 عبدالملک بن مروان کا عہد اور سندھ پر حملے

65ھ میں عبدالملک تخت نشین ہوا۔ اس کی زیادہ تر توجہ اسلامی مملکت کے انتظام و استحکام پر رہی' 75ھ میں عبدالملک نے عراق اور سندھ و ہند حجاج بن یوسف کے سپرد کیا' چنانچہ حجاج نے سعید بن اسلم کلابی کو مکران اور سندھ کا حاکم مقرر کیا' سعید نے مکران پہنچ کر ایک شخص الحمامی سے کہا کہ ''میں جہاں بھی منزل انداز ہوں' تم میرے ساتھ رہو اور مددگار بن کر رہو' الحمامی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کردیا' چنانچہ سعید کلابی نے اسے قتل کردیا' اس خون کا بدلہ لینے کے لیے محمد علامی نے سعید پر حملہ کردیا اور قتل کر کے خود مکران کا حاکم بن بیٹھا۔ علافی نے اپنے پانچ سو سواروں کے ساتھ سندھ کے راجہ داھر کی بھی مدد کی تھی' حجاج بن یوسف کو جب سعید کے قتل کی خبر ملی تو وہ بہت برہم ہوا اور ابن سحر تمیمی کو مکران کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ علافیوں کی سرکوبی ضرور کی جائے' مگر یہ لوگ پہلے ہی بھاگ کھڑے ہوئے اور سندھ جا کر پناہ لی۔ ایک سال تک ابن سحر تمیمی نے مکران ہی میں قیام کیا اور 76ھ میں انتقال کر گیا۔ حجاج نے ان کی جگہ محمد بن ہارون بن ذراع نمری کو مامور کیا اور خاص تاکید کی کہ علافی باغیوں کو بہرصورت نیست و نابود کردیا جائے۔ چنانچہ محمد بن ہارون نے 86ھ کی ابتدا میں ایک علافی کو گرفتار کیا اور اس کا سر قلم کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا اور بذریعہ خط وضاحت بھی کردی کہ اگر عمر نے وفا کی اور بخت نے یاوری کی تو دوسروں کو بھی گرفتار کیا جائے گا۔ محمد بن ہارون نے 91ھ تک اس عہد پر فائز رہے اور ملک کی ترقی و خوشحالی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ گویا کہ آپ نے عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک دونوں کے عہد کو پایا اور حسن کارکردگی کا ثبوت دیا۔

2.10 ولید بن عبدالملک کا زمانہ اور سندھ کی فتح

یہ ولید بن عبدالملک کا دورِ خلافت تھا' اور پوری دنیا میں اسلامی خلافت کی قوت و شوکت کا چرچا تھا' یہی وجہ تھی کہ مختلف ممالک کے بادشاہ اور راجے مہاراجے خلیفۃ المسلمین سے اچھے راہ و رسم بنانے کی کوشش میں رہے اور اگر کسی کی طرف سے اسلامی خلافت کو کوئی گزند پہنچتی تو اس کا سخت نوٹس بھی لیا جاتا تھا' چنانچہ ولید بن عبدالملک کے دور میں سندھ کے علاقے میں بعض ناخوشگوار واقعات پیش آئے' جس کے نتیجہ میں حجاج بن یوسف نے بدلے کی ٹھانی اور محمد بن قاسم کے زیر کمان سندھ کو مکمل فتح کرنے کا عزم مصمم کرلیا۔ ان واقعات کو ذیل میں ذکر کیا جا رہا ہے۔

2.10.1 پہلا واقعہ

مسلمانوں اور عربوں نے ابتداء ہی سے تجارت میں خوب دلچسپی لی تھی' اور دور دراز ملکوں سے ان کی بڑے پیمانے پر تجارت ہوا کرتی تھی۔ ہندوستان سے لے کر چین تک اس تجارت کا دائرہ وسیع تھا' اور خاص طور پر لنکا بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ عرب اسے ''سیلان'' کہتے تھے۔ یہاں بہت سے عرب تاجر بھی آباد ہو گئے تھے' اتفاق سے ایک مسلمان تاجر یہاں انتقال کر گیا اور اپنے پیچھے بیوہ اور یتیم لڑکے لڑکیاں چھوڑ گیا' لنکا کے بادشاہ نے اظہار یگانگت کے لیے چند جہازوں پر ان پسماندگان کو اور ان کے ساتھ خلیفہ ولید کے لیے قیمتی تحفے روانہ کیے' ان میں انواع و اقسام کے موتی و جواہر' حبشی غلام شامل تھے اور کچھ مسلمان مرد و خواتین حج کا ارادہ رکھتے تھے تو بادشاہ نے انہیں بھی جہاز پر سوار کر دیا' یہ بحری بیڑا سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل کے قریب پہنچا تو سندھی قزاقوں نے اس کو لوٹ لیا' مورخین کے مطابق آٹھ جہازوں پر پورا سامان لدا ہوا تھا' اس گروہ نے لدے ہوئے سامان پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو قیدی بنا لیا' ان میں ایک خاتون قبیلہ یربوع کی تھیں' وہ پکار اٹھیں: ''فریاد اے حجاج''۔ اس حادثہ اور فریاد کی خبر جب حجاج کو ہوئی تو وہ غصہ کے مارے بے تاب ہو گیا اور جوش و جلال میں کہہ اٹھا: ''ہاں میں آیا' ہاں میں آیا''...... ان قزاقوں کی جرأت اور خواتین و قیدیوں کی بے بسی نے حجاج بن یوسف کے تن بدن میں آگ لگا دی' اور اس نے طے کر لیا کہ سندھ کو مکمل فتح کر کے باضابطہ اسلامی خلافت کے زیر نگیں لاتا ہے۔

2.10.2 دوسرا واقعہ

مذکورہ حادثہ کے بعد حجاج نے راجہ داہر کی طرف ایک قاصد روانہ کیا' اور سندھ کے حکمراں محمد بن ہارون کو بھی خط لکھا کہ کوئی قابل اعتماد آدمی اس قاصد کے ساتھ داہر کے پاس بھیج دے' تاکہ راجہ سے کہے کہ مسلمان عورتوں کو چھوڑ دے' دار الخلافہ کے تحفہ واپس کر دے اور عورتوں کی حالات بھی دریافت کرے' نیز حجاج نے ایک خط داہر کے نام بھی لکھا اور اپنے مطالبات رکھے' جب یہ قاصد داہر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: '' یہ لوگ قزاق ہیں' ان سے زیادہ کوئی طاقتور نہیں ہے اور وہ ہماری اطاعت بھی نہیں کرتے ہیں۔'' حالانکہ دیبل داہر کی بادشاہت کی حدود میں آتا تھا۔ اس ردعمل کے بعد حجاج نے دوبارہ خلافت میں ایک عرضداشت داخل کی' اور سندھ پر فوج کشی کی اجازت چاہی۔ ولید نے اسے قبول نہیں کیا' حجاج نے دوبارہ اجازت طلب کی اور وعدہ کیا کہ خزانۂ عامرہ سے جو اخراجات اس جنگ پر خرچ ہوں گے' اس کا دوگنا خزانہ میں داخل کیا جائے گا۔ خلیفہ نے بالآخر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

2.11 فتح سندھ

یوں تو عربوں نے حضرت عمر بن خطابؓ ہی کے دور سے سندھ کے علاقے پر نظر رکھ رکھی تھی' مگر باضابطہ فوج کشی نہیں کی' اور اس خطہ کو خلافت اسلامیہ کے دائرہ میں داخل کرنے کی منظم کوشش نہیں کی' مگر مختلف اسباب و عوامل پیش آتے گئے' تا آنکہ حجاج بن یوسف کے عہد میں اوپر ذکر کیے گئے چند سنگین واقعات پیش آئے۔ اب پہلی بار ولید بن عبد الملک کے دور خلافت میں سندھ پر فوج کشی کی ٹھانی گئی' چنانچہ' اس پورے عرصہ میں بہت سے اسباب بنے جس نے فتح سندھ کی راہ ہموار کی' ذیل میں ان ہی اسباب پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

2.11.1 فتح سندھ کے اسباب

فتح سندھ کے رفتہ رفتہ جو اسباب بنے وہ حسب ذیل ہیں:

1. سندھ ساسانی حکومت کا صوبہ ہونے کی وجہ سے عرب مسلمانوں کی یلغار کا قدرتی ہدف تھا۔
2. جنگ نہاوند میں سندھ کے فوجی دستے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے تھے۔
3. سندھ کے معاندانہ رویے کی وجہ سے مکران و بلوچستان کی سرحد پر اس کے سپاہیوں سے مسلمانوں کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔
4. حکومت سندھ نے اموی حکومت کے باغیوں کو جو محمد علافی کی سرکردگی میں تھے پناہ دی تھی۔
5. راجہ داہر کا شدید تعصب سندھ کی مقامی بدھ آبادی کے لیے انتہائی درجہ کے مظالم کا بعث بن گیا۔
6. سندھ کے بحریہ نے لنکا سے عرب جانے والے جہازوں کو لوٹنا اور غلام بنانا شروع کر دیا تھا۔

2.12 سندھ پر فوج کشی

حجاج بن یوسف نے اپنے خاکہ میں رنگ بھرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم بن محمد ثقفی کو ہند کا گورنر مقرر کیا' چنانچہ حکم کی تعمیل میں محمد بن قاسم نے سندھ کا رخ کیا' شیراز میں چھ ماہ قیام کیا' ادھر ابوالاسور جہم کے ماتحت چھ ہزار شامی نوجوانوں کی فوج شیراز پہنچی تو ابن قاسم سندھ کی طرف روانہ ہوئے اس لشکر میں تمام ضروریات کا سامان موجود تھا' بلکہ سوئی دھاگا بھی سامان رسد میں موجود تھا۔

محمد بن قاسم شیراز سے مکران آیا' پھر مکران کی سرحد سے چل کر پہلے قز پور پر حملہ کیا' اس شہر کے فتح ہونے میں کئی ماہ لگ گئے' آگے چل کر ارمن بیلہ کا محاصرہ کیا' اس شہر کو فتح کر کے وہیں چند ماہ قیام پذیر ہوا' یہیں محمد بن ہارون والی مکران بھی حجاج بن یوسف کی ہدایت پر اپنی فوج کے ساتھ آملا۔ اتفاق سے محمد بن ہارون وفات پا گئے۔ اب دونوں فوجوں کی قیادت محمد بن قاسم کر رہے تھے۔ فوج نے مغربی سندھ کے سب سے مشہور شہر دیبل کا رخ کیا' یہاں کی بندرگاہ بڑی اہمیت کی حامل تھی' چنانچہ ایران' عراق' عرب اور افریقہ کے جہاز یہیں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔

2.12.1 فتح دیبل

محمد بن قاسم جمعہ کے روز 92 ھ میں دیبل پہنچا' یہاں کے لوگوں نے قلع بند ہو کر لڑنا مناسب سمجھا' مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کر لیا' اتفاق سے اسی روز سمندری راستے سے آنے والا جنگی ساز و سامان بھی پہنچ گیا۔ چنانچہ منجنیق لگا دی گئی' جنگ شروع ہو گئی' طول پکڑتی گئی' اسی دوران محمد بن قاسم کے پاس ایک برہمن آیا اور اس نے مشورہ دیا کہ اس دیول میں ایک طلسم ہے' جب تک یہ نہ ٹوٹے گا شہر فتح نہ ہوگا' اسی طرح حجاج بن یوسف نے بھی نقشہ جنگ دیکھ کر منجنیق کی پوزیشن بدلنے کا مشورہ دیا' بہر حال اس طرح اس گنبد کو تسخیر کیا گیا' ساتھ ہی پورے شہر میں کہرام مچ گیا' دیبل والے حصار بند قلعہ سے باہر آ کر لڑنے لگے' دونوں فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ عربوں نے بھی پامردی سے مقابلہ کیا'

بالآخر عربوں کو فتح نصیب ہوئی۔ شہر میں تین روز تک قتل کا بازار گرم رہا' تین دن کے بعد حالات قابو میں آئے' محمد بن قاسم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کے چار ہزار گھر آباد کیے۔

2.12.2 فتح نیرون

دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نیرون کی جانب روانہ ہوا' جو دیبل سے 75 میل پر واقع ہے۔ سات روز مسلسل سفر کر کے یہ قافلہ نیرون پہنچا' یہاں کا حکمران بدھ مذہب کا پیرو تھا' اس نے پہلے ہی سے حجاج بن یوسف سے معاملہ طے کر لیا تھا' چنانچہ یہاں کا حاکم شمنی بے شمار نذرانوں اور بے انداز تحفوں کے ساتھ محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اطاعت و رضامندی کا عہد و پیماں کیا اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور خوب ضیافت کی۔ نیرون میں بھی محمد بن قاسم نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی' امام مقرر کیا اور پنج وقتہ نمازوں کے قیام کا فرمان جاری کیا۔ نیز محمد ذہلی بصری کو شہر کا کوتوال مقرر کیا۔

2.12.3 فتح سیستان

محمد بن قاسم نے سیستان کا رخ کیا۔ یہ نیرون سے 90 میل واقع ہے۔ سیستان شہر کے تابع ایک شہر ''بہرج'' تھا' یہاں کے لوگ بدھ مت کے پیرو تھے' ان لوگوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی' اسلامی سپہ سالار کی اطاعت قبول کر لی اور سیستان کے حاکم بجے رائے کو ایک عرضداشت بھیجی کہ ''ہم لوگ بودھی ہیں' ہمارے مذہب میں خونریزی روا نہیں ہے' آپ کی طرح ہم لوگ بھی محفوظ نہیں ہیں' عربوں کے متعلق جہاں تک علم ہے وہ یہ ہے کہ امان مانگنے سے وہ شہر کو نہیں لوٹتے' بلکہ وعدہ کے مطابق ہر طرح شہر کی حفاظت کرتے ہیں' اس لیے مجبور ہو کر ہم لوگ اطاعت قبول کر لیتے ہیں' اس معاملہ میں آپ ہم کو معذور سمجھیں۔

سپہ سالار نے اب خاص قلعہ' سیستان کا رخ کیا' وہاں کا حاکم راجہ داہر کا بھتیجا تھا' شمنیوں نے اس شہزادہ کو بہت سمجھایا کہ اس لشکر سے نمٹنا تیرے بس کا نہیں ہے' خود سپردگی کر دے' تاکہ تمام رعایا کی جان و مال بھی محفوظ رہے' مگر سیستان کے حاکم نے مان کر نہ دی۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے منجنیق ایستادہ کرنے اور جنگ شروع کرنے کا حکم دیا۔ قلعہ کے اندر صورت حال یہ تھی کہ کسان اور دستکار' تاجر اور عام رعایا بجے رائے سے الگ ہو گئے' اور تقریباً ایک ہفتہ کی مدت میں سب ہی جنگ سے دست کش ہو گئے' حاکم نے جب یہ حالات دیکھے تو رات کے وقت شمالی دروازہ سے دریا پار کر کے چھپ کر بھاگ گیا۔

محمد بن قاسم قلعہ کے اندر داخل ہوئے' اپنے عامل اور نائب مقرر کیے' عہد و پیمان کو پورا کیا' اس طرح سیستان بھی فتوحات اسلامی کے دائرہ میں آ گیا۔

2.12.4 سیسم کی فتح

سپہ سالار نے اپنی پیش رفت جاری رکھی' اور دیگر علاقوں کا رخ کیا' چنانچہ سیسم یا سیوی کی جانب بڑھے' یہ علاقہ سندھ کے راجہ کے ماتحت تھا' اور اس کا حاکم ''کاکا'' تھا۔ اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ محمد بن قاسم سے نبرد آزما ہونا گویا کہ خود کو ہلاک کرنا ہے۔ اس لیے کاکا اپنے تمام ماتحت سرداروں اور احباب کو ساتھ لے کر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا' اطاعت و فرمانبرداری کا یقین دلایا' چنانچہ محمد بن قاسم نے اس کا خیر

مقدم کیا' اور دونوں میں دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ سپہ سالار نے اگلے جنگی محاذوں پر کاکا سے مشوروں سے بھی فائدہ اٹھایا' نیز کاکا کو بعد میں اعزاز خلعت سے بھی نوازا گیا۔ واضح رہے کہ عرب فوج کے اخلاق اور عدل وانصاف کی خبر ملک کے گوشہ گوشہ میں گشت کر رہی تھی' اسی وجہ سے حکام پہلے ہی اسیر ہوجایا کرتے تھے اور بآسانی اطاعت قبول کی جاتی تھی۔

2.12.5 راجدھانی کی جانب

حجاج بن یوسف نے محمد قاسم کو خط لکھا کہ اب سندھ کے پایہ تخت کیطرف پیش قدمی کی جائے اور براہ راست راج داھر سے مقابلہ کیا جائے' خط میں یہ نصیحت بھی کی کہ:

''بھروسہ ہمیشہ خدا پر رکھو' اور اسی کی طرف سے مدد کے امیدوار رہو' جن شہروں اور قلعوں پر قبضہ کرو اس کو خوب مضبوط کرلو' پختہ انتظام کرکے آگے بڑھو' تاکہ دشمنوں کو پیچھے سے ستانے کا موقع نہ ملے۔''

چنانچہ ابن قاسم نے اب راج داھر کی راجدھانی کے لیے تیاری شروع کردی' اس موقع پر سپہ سالار نے مناسب سمجھا کہ ایک وفد راج داھر کے پاس روانہ کرے' چنانچہ شام کے ایک معزز شخص کے ہمراہ ایک سندھی نومسلم ''مولانا اسلامی'' کو بھیجا گیا' یہ سفارت کار دربار میں پہنچے اور پیغام پہنچایا' راجداھر نے جنگ کی ٹھان لی اور جنگ کی تیاری شروع کردی۔ ادھر حجاج بن یوسف نے درمیان میں آنے والی دریا مہران کو عبور کرنے کی اجازت بھی دے دی' رات کی تاریکی میں عرب فوج نے دریا عبور کرلیا۔ جنگ مختلف مرحلوں سے گزرتی رہی' بالآخر 10/ رمضان بروز جمعرات 93ھ کو راج داھر اور محمد بن قاسم کے درمیان جے پور کے مقام پر جنگ ہوئی' مسلمانوں نے بھرپور مقابلہ کیا' اور اسلحہ میں بطور خاص آگ لگانے والے تیروں کے ذریعہ سندھی ہاتھیوں میں بھگدڑ مچادی' اس طرح راجہ داھر کا ہاتھی اپنے سوار سمیت دریا میں ڈوب گیا۔ اور محمد بن قاسم نے مکمل سندھ کو تسخیر کرلیا۔

عسکری وجنگی لحاظ سے یہ جنگ حیران تھی' میدان جنگ کی صورت حال' افرادی قوت کے اعتبار سے یہ جنگ جیتنا دشوار گزار تھا' مگر محمد بن قاسم کی عسکری حکمت عملی' جنگی تجربات اور مسلم فوجیوں کے بلند حوصلوں نے فتح وکامیابی سے ہم کنار کیا۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے خوب لکھا کہ:

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ تاریخ کی رومانی داستانوں میں سے ایک ہے' اس کی ابھرتی جوانی' آزادانہ اور جرأت مندانہ کردار اور شریفانہ رویہ سندھ کے سفر میں بھی اس کے ساتھ رہا اور اس کا المناک زوال اس کی شہادت پر ختم ہوا۔

2.13 فتح سندھ کے نتائج

اس جنگ اور سندھ کی تسخیر کے نتیجے میں جو نتائج سامنے آئے وہ حسب ذیل ہیں:

1. جنوبی ایشیاء اسلام سے روشناس ہوا۔

2. مسلمانوں نے عدل وانصاف اور مساوات واخوت پر مبنی نظام حکومت کی بدولت مقامی آبادی نے کثیر تعداد میں اسلام قبول کرلیا۔

3. سندھ کی تسخیر نے اسلام کی فتح کا راستہ کھول دیا۔

4. سندھ مستقل طور پر اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز بن گیا۔

5. لاتعداد مبلغ اور بندگان خدا نے سندھ سے آگے بڑھ کر ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ شروع کردی۔

6. عرب مسلمانوں نے سنسکرت زبان سیکھ کر ہندوؤں کے علم نجوم پر کتابیں تحریر کیں' کہاں جاتا ہے کہ الجبراء کا ارتقاء اس کے بعد شروع ہوا۔

7. بودھ مذہب کے پیروجو برہمنوں کے جوروستم کا شکار تھے' انہیں آزادی نصیب ہوئی۔

2.14 حکومت کا نظم ونسق

فتح سندھ کے بعد محمد بن قاسم نے ہندوستان میں تقریباً چار سال قیام کیا' یہاں انتظام واستحکام پر خوب توجہ دی' بلکہ بعض محققین کا یہ خیال بجا ہے کہ'' سندھ کا نظم ونسق شاید ترکوں اور افغانوں کی بہ نسبت زیادہ رواداری اور رعایا پروری پر مبنی تھا۔''

چنانچہ محمد قاسم نے اہل سندھ کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا۔ اطاقت قبول کرنے والوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا' ہندوؤں کو تمام تر مذہبی مراعات دیں' بلکہ انہیں اہل کتاب کے درجہ میں رکھا۔ اسی طرح بدھ مذہب کے ماننے والے خود کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔ انہیں ان کے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی۔

محمد بن قاسم نے سندھ کے تاجروں' دست کاروں اور عام آدمیوں کو امان عطا کیا۔ ان کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کیا۔ اسی طرح ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کی اجازت دی نیز زمینداروں کو اجازت دی گئی کہ وہ برہمنوں اور مندروں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں' مندر کی خدمت کرتے رہیں۔

سندھ میں سپہ سالار نے ایک قانون نافذ کیا کہ کسی آبادی میں جب کوئی نووارد مسلمان آئے تو ایک دن ایک رات اس کو مہمان سمجھا جائے اور ذمہ دار حکام اس کا انتظام کریں' اور اگر بیمار ہو تو تین دن تین رات مہمان ہو۔

تمدنی انتظام کے حوالے سے محمد بن قاسم نے یہ کیا کہ چار معزز تاجروں کی ایک کمیٹی بنائی اور دیوانی مالی عدالت اس کے سپرد کردی جائے تاکہ تمام مالی مقدمے ہر مذہب کے رسم ورواج کے مطابق فیصل کئے جائیں۔

شہر میں چوکیدار' سپاہی اور کمشنر مقرر کیے گئے۔ تاکہ بدامنی اور فساد سے لوگوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔

محمد بن قاسم نے پرانے نظام کو بقدر امکان تبدیل نہیں کیا' بلکہ داجہ داھر کے وزیر اعظم کو وزارت پر برقرار رکھا' اور اسی کے مشورے سے تمام نظام حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں رہنے دی' عرب فقط فوجی اور حکومتی انتظام میں شریک رہتے۔

مسلمانوں کے مقدمات حل کرنے کے لیے قاضی مقرر کیے گئے' اور یہ شریعت اسلامی کے پابند ہوتے۔ ہندوؤں کے لیے بدستور ان کی پنچایتیں قائم رہیں۔

2.15 خلاصہ

اس اکائی کو پڑھ کر ہم نے جانا کہ:

سندھ دراصل آرین زبان کا لفظ ہے، سندھ میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کئی قومیں آباد تھیں، مثلاً جاٹ، مید، سیا بچہ، بیاسرہ، ٹھاکر وغیرہ، سندھ کی طرف مسلمانوں کے فوجی دستے حضرت عمر کے زمانہ سے پیش قدمی کرتے رہے، سندھ کا بادشاہ راجہ داہر تھا، جس کی غیر اخلاقی صورتحال سے خود اس کی عوام اور رشتہ دار ناخوش تھے، اس نے خلافت کے باغیوں کو پناہ دی تھی، نیز ان قزاقوں سے درگذر کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے مسلمانوں کے قافلہ کو لوٹا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر حجاج نے محمد بن قاسم کو سندروانہ کیا، جنہوں نے اس علاقہ کو فتح کیا، اور امن وامان قائم کیا، حکومت میں ہندوؤں کو شریک کیا، اور اس طرح برصغیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

2.16 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1. سندھ کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے اس کے جائے وقوع سے بحث کیجیے۔
2. خلفائے راشدین کے عہد میں عرب وسندھ تعلقات پر روشنی ڈالیے۔
3. محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے اسباب سے بحث کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4. فتح سندھ کے نتائج قلم بند کیجیے۔
5. سندھ کی فتح میں محمد بن قاسم کے کردار سے بحث کیجیے۔

2.17 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. فتح نامہ سندھ معروف بہ چچ نامہ   نبی بخش خان بلوچ' مترجم اختر رضوی' مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ' پاکستان
2. تاریخ سندھ' جلد اول و دوم ۔ از مولانا سید ابوظفر ندوی' مطبوعہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی۔ اتر پردیش
3. عرب و ہند کے تعلقات' از سید سلیمان ندوی' مطبوعہ دارالمصنفین 'شبلی اکیڈمی' اتر پردیش
4. آب کوثر' از شیخ محمد اکرام علی' مطبوعہ' ادبی دنیا دہلی'
5. محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک' از محمد سعید الحق' مطبوعہ اریب پبلکیشنز' دہلی
6. برصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ' از محمد مشتاق تجاوری' مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی

اکائی 3- سندھ میں عربوں کی حکومتیں

اکائی کے اجزاء

3.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ سندھ کی قدیم تاریخ، اسلامی دور حکومت، اموی اور عباسی دور خلافت میں سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں حکمرانی کی تاریخ اور سلطنت ہباری وسومرہ کے دور حکومت کی تاریخ سے بھی واقف ہو جائیں گے۔

3.2 تمہید

سندھ کی تاریخ بہت قدیم ہے اور زمانہ قدیم سے اس پر تاخت وتاراج ہوتا رہا ہے۔سکندر اعظم نے بھی سندھ کے بعض علاقوں کو تاخت وتاراج کیا تھا،عرب کا سندھ سے قدیم تعلق تجارت کا تھا لیکن جب عرب اسلام کی روشنی سے منور ہوا اور منتشر عرب یکجا ہو کر ایک بڑی سیاسی طاقت بنے اور ایران وروم کی حکومتوں کو زیر کرنا شروع کیا تو آس پاس کی سلطنتیں اس نئی طاقت سے چوکنی ہوگئیں۔عرب شاید کافی طویل عرصہ تک سندھ کی جانب پیش قدمی نہ کرتے اگر راجہ داہر اپنی طاقت کے غرور میں آکر بار بار عربوں کو للکارنے کی جرأت نہ کرتا،اس نے کبھی اسلامی حکومت کی مخالف قوتوں کی فوجی مدد کی تو کبھی اسلامی حکومت کے باغیوں کو پناہ دیا اور پھر سراندیپ سے آنے والے جہازوں کے حشر کا جوردعمل ہوا وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔سندھ کا پورا علاقہ محمد بن قاسم نے تقریباً فتح کر لیا تھا اور اگر اسے مہلت ملتی تو شاید پورا ہندوستان وہ اکیلا فتح کر لیتا لیکن قضاوقدر کو یہ منظور نہیں تھا۔سندھ کی حکومت عمومی طور پر خلافت اموی یا خلافت عباسی کے ماتحت رہی ہے بیچ بیچ میں کچھ ایسے وقفے ضرور آئے جب سندھ کے والیوں نے بغاوت کردی یا بدامنی سے فائدہ اٹھا کر حکام اور قلعہ داروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا لیکن جلد یا بدیر ان سب کو پھر سے حلقہ اطاعت میں پرو دیا جاتا تھا۔لیکن جب خود ہی خلافت عباسیہ کمزور پڑنے لگی تو سندھ میں ہباری خاندان نے اولاً خلافت عباسیہ کی اطاعت کی اور اپنی طاقت اور خلافت عباسیہ کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بعد میں خودمختاری کا اعلان کر دیا۔اس کے بعد سومرہ اسماعیلی شیعہ کی حکومت کا دور آتا ہے۔اسماعیلی حضرات ہمیشہ ایسی جگہ ڈھونڈتے رہے ہیں جہاں وہ لوگوں کو اپنی جانب مائل کریں اور پھر حکومت پر قبضہ کرلیں۔ملتان میں اسماعیلی شیعوں کی حکومت تھی۔جسے بعد میں محمود غزنوی نے ختم کیا اور سندھ میں سومروں کی حکومت طویل عرصہ تک قائم رہی۔

3.3 سندھ کی قدیم تاریخ

سندھ کی تاریخ بہت قدیم ہے،وادی سندھ کی قدیم تہذیب کا پتہ موہن جوڈاڑو،عامری اور کوٹ ڈیجی کی تاریخی تحقیقات اور دریافت سے ہوتا ہے۔اس تہذیب 175-3200 ق م کے بعد ایک ہزار سال کے حالات پر تاریکی اور گمنامی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔سندھ کی حقیقی تاریخ کا آغاز شہنشاہ داریوش اول (515-520 ق م) کے تحت اس کے ایران سے تعلقات قائم ہونے سے ہوتا ہے جب سندھ کو فتح کر کے ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا گیا،تقریباً دو صدیوں کے بعد (325-326 ق م) نے سندھ پر حملہ کیا،سکندر شمال کی جانب سے سندھ میں داخل ہو کر اروڑ (موجودہ روہڑی کے قریب) کے علاقہ سے گزرا اور آگے بڑھ کر موجودہ لاڑکانہ ضلع کے زرخیز خطہ کو فتح کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے سیوہن (سہون) کی قدیم بستی سے گزرتا ہوا وسطی ڈیلٹائی شہر پٹالا سے گزرا اور جنوب میں ساحلی بندرگاہ بابریکان میں لنگر ڈالا،پھر سندھ سے گدروشیا (مکران) کے راستے بابل روانہ ہوا۔سکندر کی وفات کے بعد سندھ سلیوکس نکیتر،چندر گپت موریا (305 ق م)،باختری یونانیوں، پارتھیوں (دوسری وتیسری صدی ق م) ستھیوں اور کوشانوں (100 ق م تا 200 عیسوی) کے زیر تسلط رہا۔ستھیوں نے سیستان اور سیوی کی طرح سندھ میں سیوہن اور سیوستان پر اپنے نام کی مہر ثبت کر کے ایک مستقل نشان چھوڑا۔بھنبھور (کراچی سے ۳۹ میل جنوب مشرق) کی کھدائی نے ستھیائی مواد پر روشنی ڈالی ہے جس سے سندھ کے ساحلی خطے تک ان کے قبضے کی تصدیق ہوتی ہے۔کوشان فرمانروا کنشک (

78-100 عیسوی) کے زیر اثر سندھ نے بدھ مت قبول کر لیا۔ تیسری سے ساتوین صدی تک سامانی ایران کی سیاسی برتری کے زیر اثر رہا (اگرچہ ہیاطلہ اور سفید ھنوں نے پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک مختصر عرصہ کیلئے اقتدار قائم کیا) چھٹی صدی عیسوی میں سندھ میں مقامی سمہ قبائل کے رائے خاندان کی مستقل حکومت قائم ہوئی۔ رایان سمہ غالبًا ایرانی شہنشاہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ روسائے سمہ کا قدیم روایتی لقب ''جام'' اسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ بالآخر ساتویں صدی میں ایک برہمن پنڈت چچ نے سندھ میں رایان سمہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سندھ پر برہمنوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ جس میں بدھ مت کے بھکشوؤں کے ساتھ سختی برتی گئی اور رعایا پر منو کے قوانین عائد کئے گئے جو ذات پات پر مبنی تھے، چھوت چھات کی سختیوں کی وجہ سے رعایا ناراض ہو گئی اور جب محمد بن قاسم کی برہمن راجا داہر سے 711 عیسوی میں مزاحمت ہوئی تو بودھوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور اس طرح سندھ میں اسلامی اقتدار کی راہ ہموار ہوئی۔

3.3.1 سندھ کا جغرافیہ، موسم اور معدنیات

زمین: سندھ کی زمین کا وصف یہ ہے کہ یہاں زمین میں ریت زیادہ ہے جس کی بناء پر یہ ناقابل زراعت ہے۔ سندھ کے محض کچھ ہی ایسے حصے ہیں جہاں کی زمین قابل زراعت ہے۔ شمال سے جنوب ایک لمبی پٹی گئی ہے جس کے ایک جانب دریائے سندھ اور دوسرے پہلو پر مغربی نارو ہے جو دریائے سندھ سے ایک جداگانہ شاخ کی طرح نکل کر ایک سو میل تک بہتا چلا گیا ہے۔ یہاں دوآبہ ہونے کی وجہ سے زمین بہت زرخیز ہے۔ چھوٹے چھوٹے کوہسار بھی ہیں۔

موسم: یہاں سردی میں سخت سردی اور گرمی میں سخت گرم پڑتی ہے، مثل مشہور ہے کہ یہاں کی گرمی گورے کو کالا کر دیتی ہے۔ دھوپ کی تپش بے حد زیادہ ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ گرمی جیکب آباد میں ہوتی ہے وسط علاقہ میں آب و ہوا معتدل ہے بالخصوص حیدر آباد کا موسم بہت اچھا رہتا ہے۔ دریا کی طغیانی کی موسم میں مچھروں اور پسوؤں کی بن آتی ہے۔

ساحل: سندھ کے مقابل خشکی سے دو میل ہٹکر ایک ٹکڑا زمین جو کراچی سے کچھ تک پھیلا ہوا ہے یہی سندھ کا ساحل ہے۔۔ زمین کا یہ ٹکرا تین میل چوڑا ہے یہ اتنے نشیب میں ہے کہ سمندر کے چڑھاؤ میں پانی میں غائب ہو جاتا ہے اور جب پانی اترتا ہے تو نمایاں ہو کر جزیرہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پیداوار: زیادہ تر جوار ہوتا ہے، مکئی اور باجرہ کی بھی فصل ہوتی ہے پھلوں میں کھجور فراوانی س ہوتا ہے۔ لاڑکانہ اور لار ضلع میں سفید اور لال چاول کی فصل ہوتی ہے۔ گنا کی پیداوار حیدر آباد میں جب کہ گیہوں کی پیداوار دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر، تل تھرپاکر ضلع میں، جیکب آباد میں تربوز، سنگترہ، پپیتا، ناریل وغیرہ میں کی پیداوار ہوتی ہے۔

معدنیات: معدنیات میں لوہے اور کوئلے کی کانیں ہیں۔ پہاڑوں سے تعمیرات کیلئے پتھر نکالے جاتے ہیں۔ جنوبی پہاڑوں سے گچی مٹی نکالی جاتی ہے جب کہ کچھ کے رن اور تعلقہ کھپرو جھیل سے نمک کی پیداوار ہوتی ہے۔

قومیں: تاریخ کی روشنی میں اس ملک کی قدیم آبادی جاٹ اور مید تھے۔ یہ دونوں ہی دریائے سندھ کے کنارے آباد تھیں، اب بھی بڑی تعداد ان میں جاٹوں اور بلوچیوں کی ہے اور شہروں اور گاؤں میں آباد ہیں۔ ایک تیسری قوم یہاں حبشیوں کی بھی ہے جو بطور غلام یہاں

آئے تھے۔اس وقت یہاں مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی آباد ہیں۔

زبان: یہاں کی موجودہ زبان سندھی ہے جس میں قدیم زبان کے ساتھ عربی اور فارسی کے لفظ ملے ہوئے ہیں۔ یہ زبان عربی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ لہجہ کے اعتبار سے شمال اور جنوب میں فرق ہے۔ خط خداآدادی نام ایک مزید خط ہے جس کا استعمال عموماً غیر مسلم بالخصوص ہندو کرتے ہیں۔ سندھ کی حدود جہاں دیگر ریاستوں سے ملتی ہیں تو سرحدی علاقوں میں ان علاقوں کی زبان جیسے بروہی، بلوچی، گجراتی، کچھی، مکرانی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

3.4 اسلامی دور سے قبل کے حالات

سندھ میں چھٹی صدی عیسوی میں راجہ ساہسی کا بیٹا شری ہرش راجہ بنا، اس کا دارالحکومت الورنام کا شہر تھا۔ شری ہرش ایک عرصہ تک اطمینان سے حکومت کرتا رہا کہ اچانک ایرانیوں (حاکم نیمروز) نے حملہ کر دیا۔ راجہ کو حملہ کی اطلاع ملی تو اس نے پہلے سمجھا کہ یہ معمول کی سرحدی جھڑپ ہے لیکن جب نیمروز فتح کا ڈنکا بجاتا ہوا مکران تک پہنچ گیا تو راجہ کو تنبیہ ہوئی اور اس نے بھی ایک زبردست لشکر تیار کیا اور نیم روز سے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا۔ ایرانیوں اور سندھیوں میں خونریز جھڑپ ہوئی، دوپہر کے وقت ناگاہ ایک تیر شری ہرش کو لگا اور وہ مر گیا، راجہ کے مرنے سے سندھی فوج حواس باختہ ہوگئی اور جس کا منہ جدھر اٹھا بھاگنے لگا، بہت سارے سندھی سپاہیوں کو ایرانیوں نے تعاقب کر کے قتل کیا اور پھر فتح کا علم لہراتا ہوا نیم روز واپس چلا گیا۔ راجہ کے مرنے کی خبر الور پہنچی تو دارالحکومت میں کہرام مچ گیا اور لوگ رونے پیٹنے لگے۔ ارکان دولت نے راجہ کے بیٹے کو جو ولی عہد تھا راجہ بنایا اور اس کو رائے ساہسی کا خطاب دیا۔

رائے ساہسی نے ابتداء میں ایک سال تو حکومت کے انتظامات پر توجہ دی اور ملک میں امن وامام قائم کیا لیکن پھر اس کے بعد اس نے سارا انتظام اپنے وزیر رام کو سونپ دیا۔ یہ وزیر بہت ہوشیار اور عقل مند تھا اس نے سندھ کے سارے انتظامات بخوبی سنبھالے اور راجہ کی عدم توجہ کا کسی کو احساس ہونے نہیں دیا۔

چچ کی آمد: اسی دوران ایک دن ایک برہمن جس کا نام چچ تھا رام کے پاس آیا اور کہا کہ اس کا والد الور کا شہری اور ایک مندر کا پجاری ہے، رام نے اس کی لیاقت وصلاحیت اور اس کی شیریں زبانی سے متاثر ہو کر اس کو دیوانی کا عہدہ سونپ دیا۔ ایک دن رام غائب تھا اور کچھ سرکاری کاغذات لکھے جانے تھے کہ چچ نے راجہ سے کہا کہ وہ بھی ان کاغذات کو لکھ سکتا ہے۔ راجہ نے یہ ذمہ داری دی اور اس نے بہترین انداز میں سرکاری فرامین تحریر کئے۔ راجہ اس کی لیاقت سے خوش ہوا اور اپنے وزیر رام سے اس کا تذکرہ کیا، رام نے اس کو اپنا نائب بنالیا۔ کچھ مدت کے بعد رام کی موت ہوگئی اور چچ راجہ کا وزیر بن گیا۔ اہم کاغذات پر راجہ کا دستخط لینے کیلئے رام محل سرا کے اندر جاتا رہتا تھا۔ ایک دن چچ بھی محل سرا میں گیا۔ رانی نے یہ سوچ کر پردہ نہیں کیا کہ یہ تو برہمن ہے۔ اس کی شیریں زبانی سے راجہ تو متاثر تھا ہی، اس نے رانی کا دل بھی موہ لیا۔ دھیرے دھیرے رانی کو اس سے عشق ہو گیا اور اس نے چچ سے اظہار محبت کیا، چچ نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ راجہ کا فادار ہے۔ اس دوران کئی لوگوں نے راجہ کو چچ اور رانی کے بارے میں باخبر کیا لیکن راجہ اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا اس نے اسے حاسدین کا حسد سمجھا اور کوئی تحقیق وتفتیش نہیں کی۔

انہوں دنوں راجہ ایک سخت مرض میں مبتلا ہوا، اطباء اور حکما اس کے علاج سے عاجز آ گئے، رانی نے یہ دیکھ کر چچ کو پیغام بھیجا کہ راجہ کی کوئی اولاد نہیں ہے اگر تم مجھ سے شادی پر آمادہ ہو جاؤ تو میں تمہیں سندھ کا راجہ بنوادوں گی۔ چچ نے اس پیغام کو قبول کرلیا۔ رانی نے تمام اراکین حکومت کا اجلاس طلب کیا اور راجہ کے ہاتھ سے اس کی خاص انگوٹھی نکال کر خفیہ طور پر چچ کو دیدی اور کہا کہ راجہ نے چچ کو اپنا قائم مقام بنایا ہے اور یہ انگوٹھی جو چچ کے پاس ہے اس کا ثبوت ہے۔ اراکین دولت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چند دنوں بعد راجہ مر گیا تو رانی نے ایسے تمام افراد کو تنہا تنہا بلایا جو حکومت کے دعویدار ہو سکتے تھے ان کو کہا گیا کہ راجہ آپ کیلئے وصیت کرنا چاہتے ہیں اور سبھی کو دھوکے سے قتل کرا دیا، چنانچہ ایک طرف راجہ کی لاش جلائی گئی اور دوسری طرف چچ سندھ کی حکومت پر براجمان ہوا۔

راجہ بننے کے بعد چچ نے سابق راجہ کی رانی سوبھن دیوی سے شادی کرلی اور خزانہ سے روپیہ نکال کر عوام اور رعایا میں تقسیم کیا، چچ کی فیاضی سے عوام اور فوج خوش ہوگئی۔

راجہ رائے ساہسی کے مرنے اور اس کے مرنے کے بعد چچ کے راجہ بننے کی خبر جب جے پور کے راجہ کو ملی جو رائے ساہسی کا رشتہ دار ہوتا تھا (چچ نامہ کی روایت کے مطابق جے پور کا راجہ رائے ساہسی کا بھائی تھا، جے پور سے مراد بھی آج کا جے پور نہیں جو راجستھان میں ہے کیونکہ یہ شہر تو مغل دور میں بسایا گیا ہے بلکہ وہ شہر ہے جو جیسلمیر اور سندھ کی سرحد پر تھا) ایک لشکر جرار لے کر سندھ کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے چچ کو پیغام بھیجا کہ تم تو برہمن ہو، تمہیں حکومت سے کیا کام، کہیں تنہائی میں کچھ علمی اور دینی کام کرو۔

چچ نے رانی سوبھن دیوی سے اس صورت حال میں مشورہ لیا تو رانی نے اسے طعنہ دیا کہ بہتر ہے کہ تم میرے زنانہ کپڑے پہنو اور اپنے کپڑے مجھے دے دو، پھر رانی سے اسے مشورہ دیا کہ فوج کو روپے پیسے دے کر خوش کیا جائے، چنانچہ ایک بڑا لشکر تیار کر کے وہ جے پور کے راجہ سے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا۔

چچ کی مکاری: جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو جے پور کے راجہ مہرت نے کہا کہ فوج کو لڑانے اور ہزاروں کی جان گنوانے سے کیا فائدہ، بہتر ہے کہ ہم تم آپس میں لڑیں، جو جیت جائے اسی کی فتح تسلیم کی جائے، چچ نے مجبوراً اور اپنی شرم رکھنے کیلئے یہ شرط منظور کرلی۔ شرط میں یہ بھی شق شامل تھی کہ دونوں پا پیادہ مقابلہ کریں گے۔

چچ نے اپنے خاص غلام کو کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی ہم میدان میں پہنچیں تو تم گھوڑا لے کر پہنچ جانا، چنانچہ راجہ مہرت بغیر گھوڑے کے تھا اور مقابلہ کا وقت آتے ہی چچ کا غلام گھوڑا لے کر پہنچ گیا، گھوڑے پر سوار ہو کر چچ نے ایسی تلوار ماری کہ راجہ مہرت کا سر گردن سے الگ ہو گیا اور اسی دوران چچ کی فوج نے مہرت کی فوج پر حملہ کر دیا، راجہ مر ہی چکا تھا فوج تتر بتر ہو گئی اور چچ اپنی فتح کا جشن مناتا ہوا الور پہنچ گیا۔

چچ کو اب فتح کا مزہ مل چکا تھا اس نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس نے ارد گرد کی حکومتوں کو بھی زیر کرنے کی سوچی اور ایک جرار فوج لے کر اور دارالحکومت میں اپنے بھائی چندر میر کو اپنا نائب بنا کر نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اولاً قلعہ پابیا فتح کیا پھر چچ اسکلندہ کی جانب متوجہ ہوا اور اس کو فتح کیا اور اس کے بعد سکہ کو بھی فتح کیا۔ ان سب فتوحات کے بعد چچ ملتان کی جانب متوجہ ہوا اور ایک بڑی جنگ کے بعد ملتان فتح کیا اور دارالحکومت الور آ گیا۔ ایک سال بعد وہ مغربی سندھ کو فتح کرنے کیلئے نکلا اور برہمن آباد کو فتح کرلیا۔ اس نے کرمان کو بھی فتح کیا اور پھر دارالسلطنت الور آ گیا۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۴۰ ہجری، مطابق ۶۶۰ عیسوی میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

راجہ چندر: چچ کی موت کے بعد چندر کو سندھ کا اقتدار ملا، یہ بدھ مذہب کا پیرو تھا، اس نے لوگوں کو بدھ مذہب کے قبول کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا۔ اس وقت سندھ میں عام افراد بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن حکومت کے دروبست پر قابض افراد برہمن تھے۔ چندر کے دور حکومت میں یہ واقعہ رونما ہوا کہ سیوستان کے حاکم مہتہ نے قنوج کے راجہ سری ہرشار (متوفی ۲۷ ھجری مطابق ۶۴۷ء) کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ سندھ کی حکومت پر قبضہ کرے، قنوج کا راجہ اس ترغیب سے متاثر ہوا اور ہر ہاس بن کسایس کی سپہ قیادت میں ایک فوج روانہ کی، چچ کا نواسہ جو کشمیر کے سرحدی علاقوں کا خودمختار حاکم تھا وہ بھی قنوج کے راجہ کی فوج سے مل گیا۔ ہر ہاس نے جے چندر کو ایک دھمکی آمیز خط لکھ کر اطاعت قبول کرنے کیلئے کہا، چندر کیلئے یہ ذلت موت سے بھی بدتر تھی اس نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دی اور اسی کے ساتھ قلعوں کے استحکام پر پوری توجہ دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آور فوج ناکام و نامراد واپس چلی گئی، اس افتاد کے بعد مزید ۷ سال چندر نے حکومت کی اور ۴۸ ہجری مطابق ۸۶۶ء میں اس دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہو گیا۔

3.4.2 خانہ جنگی اور راجہ داہر کی تخت نشینی

عام طور پر جیسا کہ ہوتا ہے ایک بڑی سلطنت کے حکمراں کے مرنے کے بعد حکومت پر دعویٰ کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت پر خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے، یہاں بھی یہی صورت حال پیش آئی، ارور (الور) کے تخت پر چچ کا چھوٹا لڑکا راجہ داہر گدی نشیں ہو گیا اور برہمن آباد مین چندر کے لڑکے 'راج' نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ایک سال بعد جب راج کی موت ہوئی تو راجہ داہر کے بڑے بھائی دھر سنگھ نے برہمن آباد پر قبضہ کر لیا۔ راجہ دھر سنگھ نے برہمن آباد کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد پہلے مشرقی اطراف پر قبضہ کیا، پھر اس نے برہمن آباد کے جنوبی علاقہ کی طرف توجہ کی اور وہاں چھ ماہ مقیم رہ کر راور کے قلعہ کو مضبوط کیا۔ راجہ داہر اور دھر سنگھ میں سندھ کی حکومت تقسیم ہو گئی اور شمالی سندھ پر راجہ داہر اور جنوبی سندھ پر دھر سنگھ قابض ہو گئے۔

3.4.3 راجہ داہر کی شادی

راجہ داہر کی بہن رانی بائی جوان ہو گئی اور اس سے شادی کی درخواست راجہ بھاٹیہ نے کی تھی۔ لیکن اسی دوران ایک درباری نے نجومی کی پیش گوئی اسے بتائی کہ جو رانی بائی سے شادی کرے گا وہ سندھ کا راجہ ہو گا، یہ پیش گوئی سن کر داہر متفکر ہو گیا، وزیر نے بہن سے شادی کا مشورہ دیا، راجہ نے عوامی چہ میگوئیوں کا عذر کیا، وزیر نے ایک تدبیر سے بکری کے بالوں میں سے گھاس پیدا کی اور اس کو شہر میں گھمایا اولاً تو خوب چرچا ہوا پھر تین دن بعد لوگ اس کے عادی ہو گئے، وزیر نے اس تدبیر سے راجہ داہر کو بتایا کہ عوام جلد ہی کسی بات کو بھول جاتے ہیں اس کو بھی بھول جائیں گے۔ راجہ داہر نے اپنی بہن پر چادر ڈال دی، مطلب یہ کہ وہ اس کی بیوی بن گئی، لیکن اس سے بیوی والے تعلقات قائم نہیں کئے بلکہ صبح ہوتے ہی اسے واپس بھیج دیا۔

داہر کے بڑے بھائی کا ردعمل: جب اس کی خبر داہر کے بڑے بھائی دھر سنگھ کو ملی تو اسے بہت صدمہ ہوا اور ملاقات کیلئے طلب کیا لیکن وزیر نے اسے جانے سے باز رکھا، اس پر دھر سنگھ ایک بڑا لشکر لے کر الور کی جانب بڑھا، راجہ داہر بھی فوج لے کر الور سے نکلا، کچھ معززین نے دونوں کے درمیان صلح صفائی کرائی اور راجہ داہر کی ماں نے دھر سنگھ کو شادی کی حقیقت سے آگاہ کیا کہ یہ محض ستارہ کی نحوست کے ازالہ کیلئے اٹھایا گیا قدم ہے، دھر سنگھ نے بظاہر اس کا قصور معاف کر دیا لیکن بباطن وہ داہر کی اس حرکت پر مشتعل تھا اور اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ

خفیہ تدبیر کی کہ راجہ داہر سے کہا کہ تم قلعہ سے میرے ساتھ باہر چلو تاکہ ہم دونوں کو یکجا دیکھ کر سبھی کو ہمارے اتحاد کا یقین ہو جائے۔ راجہ داہر مان گیا لیکن جیسے ہی قلعہ کے دروازہ کے قریب پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ وہ پھنس چکا ہے اس نے وزیر سے مشورہ مانگا، وزیر نے قلعہ کے دروازہ میں لٹک جانے کا مشورہ دیا، اس نے ایسا ہی کیا اور خالی ہاتھی بغیر دروازہ کے قلعہ سے نکل گیا جب دھر سنگھ نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو دوسرے ہاتھی پر راجہ داہر نہیں تھا اور قلعہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اپنے فریب کی حقیقت کھلنے پر اسے بہت صدمہ ہوا۔ وہ بخار میں مبتلا ہو گیا اور اس کے بدن پر بڑے بڑے آبلے نکل گئے اور تیسرے دن سنہ ۵۲ ہجری مطابق ۶۷۰ء مر گیا۔ دھر سنگھ کے مرنے کے بعد راجہ داہر نے برہمن آباد کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا، دھر سنگھ کی بیوہ سے شادی کر لی اور دھر سنگھ کے بیٹے چچ کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آیا۔ یہ تمام تفصیل سندھ کی تاریخ چچ نامہ سے لی گئی ہے۔

3.4.4 رنمل کی بغاوت اور عربوں کی امداد:

۵۹ ہجری مطابق ۶۷۷ء میں بھاٹیا کے راجہ رنمل نے داہر پر حملہ کر دیا۔ داہر پر حملہ کرنے کے اسباب کیا ہوئے وہ واضح نہیں ہے۔ (قیاس کیا جا سکتا ہے کہ راجہ بھاٹیا نے اولا داہر کی بہن رانی بائی سے شادی کا رشتہ بھیجا تھا اور اسے منظور بھی کر لیا گیا تھا لیکن نجومی کی پیش گوئی کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی اور قانونی طور پر راجہ داہر نے اسے اپنی بیوی بنا لیا، داہر کی اس حرکت کو اس نے اپنی توہین خیال کیا اور اسی بناء پر داہر پر حملہ آور ہوا) رنمل کے پاس بڑی زبردست فوج تھی اور وہ داہر کی سلطنت کے علاقوں کو لگا تار فتح کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ داہر رنمل سے نمٹنے کے سلسلے میں فکر مند تھا کہ وزیر نے اسے مشورہ دیا کہ ان دنوں کچھ عرب آپ کی حدود سلطنت میں موجود ہیں، یہ لوگ بڑے جنگجو اور جنگی داؤ پیچ سے ماہر ہوتے ہیں، ان سے مشورہ لیا جائے۔ (اس وقت محمد علافی حجاج کے ایک فوجی سردار کو قتل کر کے سندھ بھاگ آیا تھا اور اس طرح وہ عملی طور پر خلافت امویہ کا باغی تھا، اس کے ساتھ اس کے پانچ سو ساتھی بھی تھے، اس طرح سندھ میں ایک چھوٹی موٹی بستی مسلمانوں کی آباد ہو گئی تھی جسے ہندوستان میں سندھ کی اولین مسلم آبادی سمجھنا چاہئے) محمد علافی نے داہر کو مشورہ دیا کہ وہ یہاں سے ایک میل دور ٹھہرے اور اپنی فوج کے گرد خندق کھود لے اور اپنی فوج کا کچھ حصہ اس کے حوالہ کر دے تاکہ موقع دیکھ کر کوئی کارروائی کی جا سکے، علافی کو پتہ چلا کہ یہ لوگ رات کو کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کرتے، اس نے پانچ سو سواروں کیساتھ رنمل کی فوج پر شب خون مارا، اس اچانک افتاد سے رنمل اور اس کی فوج حواس باختہ اور تتر بتر ہو گئی، ہزاروں قتل اور ہزاروں گرفتار ہوئے، پچاس ہاتھی بھی محمد علافی اور اس کے عرب ساتھیوں کے ہاتھ لگے۔

محمد علافی کے اس کارنامہ سے راجہ داہر بہت خوش ہوا اور اس نے محمد علافی اور اس کے ساتھیوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور بعض روایات کے مطابق اس کو سندھ کی حکومت کا وزیر اعظم بھی بنا دیا۔ اس کے بعد داہر پورے اطمینان سے حکومت کرتا، یہاں تک کہ ۳۳ رسال کے بعد راجہ داہر کی خلافت امویہ سے ان بن ہوئی اور بالآخر محمد بن قاسم نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ واضح رہے کہ اس موقع پر محمد علافی اور اس کے ساتھی راجہ داہر کی حمایت میں محمد بن قاسم اور اس کی فوج سے لڑے تھے اور داہر کی سلطنت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

معلومات کی جانچ

1. سندھ کی قدیم تاریخ بیان کیجئے۔

2. اسلامی دور سے قبل سندھ کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالیے۔

3. رانی سوبھن دیوی کی پیچ سے اور راجہ داہر کے بہن سے شادی کرنے کا پس منظر کیا تھا۔

3.5 عربوں کے ہند اور سندھ پر حملہ کی تاریخ

عربوں کے سندھ پر حملہ کرنے کی تاریخ عام طور پر محمد بن قاسم کے وقت سے بیان کی جاتی ہے لیکن درحقیقت سندھ اور ہند پر حملہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ہی ہوا تھا۔ سنہ 15 ہجری میں عثمان بن ابی عاص ثقفی بحرین اور عمان کے گورنر ہوئے انہوں نے ایک بحری بیڑا تیار کر کے ہندوستان پر حملہ کرنے کیلیئے روانہ کیا، یہ بیڑا ممبئی سے متصل تھانہ تک پہنچا، حضرت عمرؓ نے عثمان بن ابی العاص ثقفی کی اس حرکت پر ناراضگی کا اظہار کیا، عثمان بن ابی العاص ثقفی نے دوبارہ بحری بیڑا تیار کر کے فوج کو روانہ کیا، اس بار یہ بحری بیڑا سندھ کے ساحلی شہر دبیل تک پہنچا اور دشمنوں کو شکست دے کر مال غنیمت کے ساتھ واپس آیا۔ حضرت عمر کے دور میں ہی مکران پر عبداللہ بن عامر بن ربیع نے قبضہ کر لیا، خلافت عثمانی میں کابل فتح ہوا لیکن یہ فتح وقتی تھی۔ ہندوستان پر پہلا حملہ بھی خلافت عثمانی میں ہوا جب کہ ربیع بن زیاد نے زرنج کو فتح کر لیا۔ زرنج کو فتح کرنے کے بعد ربیع بن زیاد آگے بڑھے اور زرنج اور کش کا درمیانی علاقہ جو اب بلوچستان میں شامل ہے اس کو فتح کر لیا، بلوچستان نام کا اس وقت کوئی صوبہ نہیں تھا بلکہ اس کو ہندوستان کا علاقہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ خلافت مرتضویہؓ میں زیادہ وقت آپسی خانہ جنگی اور خارجیوں کے فتنے کو فرو کرنے میں گذرا، سنہ 38 ہجری میں ثاغر بن دعور ایک بڑی فوج لے کر سیستان پہنچے اور سرحدی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے قیقان تک پہنچے اور ایک زبردست لڑائی کے بعد قیقانیوں کو شکست دی، (قیقان سندھ کا وہ حصہ ہے جو خراسان سے متصل ہے اور آج کل اس کا نام قلات ہے یہ بلوچستان صوبہ کا ایک حصہ ہے اور پاکستان میں ہے)۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد زمام اقتدار حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں مفتوحہ علاقوں پر جو ہاتھ سے نکل گئے تھے ان پر دوبارہ فوج کشی کی گئی، کوئی نیا علاقہ قبضہ میں نہیں آیا۔ سنہ 44 ہجری میں مہلب بن ابی صفرہ درہ خیبر کے راستے سے کابل اور پشاور کی پہاڑی گھاٹیوں کو عبور کر کے ہندوستان پہنچے اور جب واپس ہونے لگے تو ملتان اور پشاور کے درمیانی علاقوں پر حملہ کیا۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مہلب پہلا عرب سپہ سالار تھا جس نے سرزمین ہند پر فاتحانہ قدم رکھا، عبدالملک سنہ 65 ہجری میں سریر آرائے خلافت ہوا لیکن اس کا زیادہ وقت اندرونی امن اور استحکام میں گزرا۔

3.6 ولید بن عبدالملک کے دور میں سندھ پر حملہ کے اسباب:

سندھ پر حملہ کی چار وجوہات تھیں (۱) پہلی تو یہ کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں عبداللہ بن عامر بن ربیع نے مکران پر حملہ کیا تو مکران والوں نے سندھ کے راجہ سے مدد مانگی اور اس نے مدد کی، کچھ عرصہ کے بعد حکم بن عمر تغلبی مکران کی طرف بڑھے مکران کے راجہ نے پھر سندھی راجہ سے مدد مانگی اور اس نے پھر مدد کی۔ (۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ محمد علافی نے خلافت امویہ کے خلاف بغاوت کی تھی اور ایک فوجی افسر کو قتل کر کے بھاگا تھا، اس کو سندھ کے راجہ نے پناہ دے کر خلافت امویہ کو مشتعل کرنے کا کام کیا تھا۔ (۳) سراندیپ سے لاوارث مسلمانوں اور سراندیپ کے راجہ کے تحائف پر مشتمل جہاز کو دبیل کے قریب جو راجہ داہر کے علاقہ میں تھا لوٹا گیا اور اس نے اس سلسلے میں کوئی بھی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا، اگر کسی ملک کے شہری پر کسی دوسرے ملک میں کوئی ظلم ہو اور وہ ملک اس ظلم کے سدباب کیلیئے تیار نہ ہو تو پھر ایک خوددار حکومت وہی

کرتی ہے جو حجاج نے ولید کے نائب ہونے کی حیثیت سے کیا۔ (۴) عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو بغاوت کے جرم میں ساتھیوں سمیت قتل کردیا گیا لیکن ان کے گروپ کے ایک بارسوخ شخص عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بھاگنے میں کامیاب رہا اور وہ سندھ میں آکر پناہ گزیں ہوگیا۔

3.7 محمد بن قاسم کی آمد اور سندھ کی فتح

محمد بن قاسم سے قبل حجاج نے دو فوجی مہم روانہ کی لیکن دونوں مہم ناکام رہی، اب حجاج نے نہایت سوچ بچار کر کے سنہ 92 ہجری مطابق 711ء میں محمد بن قاسم نام کے سپہ سالار کی قیادت میں روانہ کی۔ ''تاریخ سندھ'' کے مولف مولانا سید ابوظفر صاحب دسنوی اور ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مولفین نے محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف ثقفی کا داماد بتایا ہے اور کہا ہے کہ جب اسے ہندوستان پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت سونپی گئی تھی تو وہ 17 سال کا نوجوان تھا لیکن ''برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش'' کے مصنف اسحاق بھٹی نے ان دونوں باتوں کو غلط بتایا ہے اور عربی کی تاریخی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ نہ حجاج کا داماد تھا اور نہ ہی سندھ پر حملہ کرنے کے وقت اس کی عمر 17 سال تھی بلکہ اس وقت اس کی عمر 30-27 سال کے درمیان تھی۔

سنہ 93 ہجری مطابق 712ء میں محمد بن قاسم مکران کے راستہ سے چل کر دیبل کے سامنے جا پہنچا اور تقریباً 6 ماہ تک دیبل کا محاصرہ کئے رہا اور بالآخر اسے فتح کیا، شہر میں چار ہزار عرب بسائے گئے اور حمید ان زارع نجدی کو حاکم مقرر کیا گیا۔ بعض مورخین کا یہ کہنا ہے کہ کراچی ہی کا گزشتہ نام دیبل ہے۔ اس دوران میں سندھ کے جنوبی حصے کا شہر نیرون فتح ہو چکا تھا۔ دریائے سندھ کے مغرب میں شمالی صوبہ سیوستان کی بستیوں پر بھی مختصر مدت میں قبضہ ہوگیا۔ مغربی سندھ کے بیشتر رئیس محمد بن قاسم کے عدل وانصاف اور مہربانی سے متاثر ہوکر اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ اس کے بعد عربوں نے جھم پیر کے مقام سے دریا پار کیا۔ راور کے قریب راجہ داہر سے مقابلہ ہوا، کئی دنوں کی چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد 10 رمضان المبارک کو زبردست جنگ ہوئی، دونوں فریقوں نے پورے طور پر داد شجاعت دی، اس جنگ میں راجہ داہر مارا گیا اور یوں سندھ کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ مورخین میں اختلاف ہے کہ آیا محمد بن قاسم نے سندھ میں راجہ داہر کی بیوی سے شادی کی تھی یا نہیں لیکن تاریخ سندھ کے مصنف مولانا ابوظفر دسنوی کا رجحان شادی کرنے کی جانب ہے اور چچ نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ محمد بن قاسم نے یہ شادی سیاسی مصالح کے سبب کی تھی کیونکہ اس وقت محمد بن قاسم بھرپور جوان تھا اور رانی لاڈھی اس کے مقابلہ میں عمر دراز تھی۔ راجہ داہر کی موت سے سندھ میں برہمن اور بودھ حکمرانوں کا سلسلہ ختم ہوا اور اسلامی دور شروع ہوا۔ محمد بن قاسم نے جگہ جگہ اپنے عمال متعین کئے اور مفتوحین سے اس نے اتنا بہتر سلوک کیا کہ لوگ دور دراز سے آکر اس کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ ماہ ذوالحجہ میں سندھ کا ایک اہم علاقہ برہمن آباد بھی فتح ہوگیا۔ بعد میں جس کے کھنڈرات پر منصورہ نامی سلطنت کی تعمیر ہوئی۔ محمد بن قاسم نے سال ڈیڑھ سال کی مدت میں دارالحکومت الور یا ارور (موجودہ دور میں روہڑی کے قریب ایک علاقہ ہے) اسکلندہ (موجودہ وقت میں اچ کے نام سے مشہور ہے) قلعہ بھاٹیہ (موجودہ بہاول پور کے قریب یہ مقام واقع ہے) اور ملتان کو فتح کرلیا۔ اس طرح اس نے مختصر مدت میں پوری سندھ کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اب اس کا ارادہ آگے بڑھ کر قنوج کی حکومت سے جو فوجی اعتبار سے بہت زبردست تھی، دو دو ہاتھ کرنے کا تھا، قنوج کے راجہ کے پاس اطاعت قبول کرنے کا خط سفیر کی معرفت بھیج دیا گیا تھا جس پر قنوج کا راجہ بہت برہم ہوگیا اور جنگ میں ہار جیت پر فیصلہ موقوف کیا، لیکن اسی دوران قضا وقدر کا فیصلہ غالب آیا اور خلافت اموی کے پایہ تخت دمشق میں ولید بن عبدالملک کے بعد سلیمان بن عبدالملک نیا خلیفہ بنا۔

سلیمان بن عبدالملک کو حجاج اور اس کے متعین کردہ عمال اور رشتہ داروں سے بہت عناد تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کی معزولی اور گرفتاری کا پروانہ بھیج دیا، محمد بن قاسم کے پاس اتنی جمعیت تھی کہ اگر وہ چاہتا تو بغاوت کر سکتا تھا لیکن اس نے محض اپنی انا کیلئے ہزاروں کی جان خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کیا بلکہ جان کو خطرہ ہوتے ہوئے بھی سلیمان بن عبدالملک کے ظالمانہ حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں، ٹاٹ کے کپڑے پہنائے گئے اور مجرموں کی طرح دمشق روانہ کیا گیا اور پھر اسے قید خانہ میں ڈال دیا گیا جہاں اس پر اتنی ظلم و زیادتی کی گئی کہ قید خانے میں ہی اس کی موت ہوگئی۔ محمد بن قاسم کی اچانک معزولی سے سندھ میں فتوحات کا سیلاب یکدم نہ صرف رک گیا بلکہ سمندر جس طرح چڑھاؤ کے بعد اترتا ہے اسی طرح اس کی فتوحات سمٹنے لگیں اور مفتوحہ علاقے خود مختار ہونے لگے۔

3.8 ہندوستان میں عربوں کی حکومت کے چار دور

ہندوستان بلکہ صحیح لفظوں میں کہیں تو سندھ اور اس کے ساحلی علاقوں میں عربوں کی حکومت کی چار دور رہے ہیں۔ (۱) خلافت امویہ، (۲) خلافت عباسیہ (۳) خاندان ہباری (۴) سومرہ خاندان۔ سومرہ خاندان کے بارے میں مورخین کی آراء میں اختلاف ہے کوئی ان کو غیر مسلم کہتا ہے تو کوئی ان کو ہندوستانی نومسلم کہتا ہے اور کوئی ان کو نومسلم یہودی قرار دیتا ہے۔ تاریخ سندھ کے مولف مولانا ابوظفر ندوی نے بڑی تحقیق اور تفتیش سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ لوگ اصلاً شیعہ تھے اور فاطمی خلافت کے زیر اثر تھے اور عرب تھے لیکن پھر یہاں کر مخلوط النسل ہو گئے۔

3.9 سندھ خلافت اموی میں

سندھ میں اموی خلافت کا دور ولید بن عبدالملک سے شروع ہوتا ہے۔ خلافت امویہ میں سندھ میں رونما ہونے والے واقعات اختصار کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں۔ یزید بن ابی کبشہ سکسکی جس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے دربار خلافت روانہ کیا تھا، محض اٹھارہ دن کے بعد اس کی موت ہوگئی۔ اس کے بعد حبیب بن مہلب کو سندھ کی ذمہ داری دی گئی۔ 20 صفر 99 ہجری میں سلیمان بن عبدالملک کی موت ہوئی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے، انہوں نے یزید بن مہلب کو عراق و خراسان سے اور اس کے بھائی حبیب بن مہلب کو سندھ کی گورنری سے معزول کیا اور خیانت کے جرم میں قید کر دیا۔ وقت کی الٹ پھیر کا اس سے بہتر کیا نمونہ ہوگا کہ کل جو یزید بن مہلب محمد بن قاسم کو ہر قسم کی ایذا دے رہا تھا آج خود قید ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد سندھ اور اطراف کے تمام راجوں اور جاگیرداروں کو اسلام قبول کرنے کا دعوتی خط روانہ کیا، اکثر نے اسلام قبول کیا اور بعض نے جزیہ دینا منظور کیا، جن راجون نے اسلام قبول کیا ان کو ان کے علاقے پر برقرار رکھا گیا۔ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی ان میں سے ایک تھا جس نے اسلام قبول کیا تھا اور اس کا علاقہ اس کی تحویل میں ہی دے دیا گیا۔ ۱۰۱ھ میں آل مہلب نے بغاوت کی لیکن یہ بغاوت ناکام رہی، قندابیل کی جنگ میں آل مہلب کے خاندان کے تمام مرد مقتول ہوئے۔ مقتولین میں معاویہ بن یزید بن مہلب بھی تھا جس نے محمد بن قاسم کو قید خانہ میں ایذا پہنچائی تھی، وہ اسے زنجیروں سے جکڑ کر رکھتا تھا اور طرح طرح کی تکلیفیں دیتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک 105 ہجری میں اموی خلیفہ بنا، اس نے خالد القیسری کو عراق کا گورنر بنایا۔ خالد القیسری نے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی ولایت سے ہٹایا اور جنید بن عبدالرحمٰن کو اس کی جگہ سندھ کا والی بنایا۔ جنید نے اپنی فتوحات سے محمد بن قاسم کی یاد دلا دی۔ جنید کی سندھ

آمد میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ جو برہمن آباد پر قابض تھا اپنی مملکت سے گزرنے سے روک دیا۔ جنید نے محتاط انداز میں تیاری شروع کردی بالآخر دونوں میں جنگ ہوئی اور جے سنگھ شکست کھا کر بھاگا لیکن گرفتار کر کے اسے قتل کر دیا گیا۔ جنید نے کیرج کو فتح کیا اور جب سندھ میں امن واطمینان ہوگیا تو اس نے سرحدی علاقوں گجرات، کاٹھیاواڑ اور مارواڑ پر حملہ کیا اور سولنکی حکومت کو اپنے پرزور حملہ سے ختم کردیا، اس کے افسر حبیب نے اجین اور مالوہ کو فتح کرلیا، بھیلمان میں شکست خورہ افراد کی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی اور وہ فوجی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جنید یلغار کرتا ہوا ایک جانب سے اور دوسری جانب سے حبیب پہنچا اور بھیلمان میں بھی گوجروں کو شکست ہوئی۔ جنید کی فتوحات کی تائید اثری کتبوں کی تحقیقات سے بھی ہوتی ہے۔ اس حملہ میں جنید کو کثیر مال دولت ہاتھ لگا اندازہ کے اعتبار سے بیس کروڑ درہم، پانچواں حصہ دمشق بھیجا گیا، فوج اور احباب میں تقسیم کے بعد بھی تین کروڑ درہم بچ گیا، اس حملہ کی عرب میں بڑی دھوم مچ گئی حتی کہ مشہور عربی شاعر جریر تک نے جنید کی تعریف میں اشعار کہے۔

سنہ 111 ہجری میں جنید کے بعد تمیم بن زید سندھ کا والی بنا، اس میں حکمرانی کے اوصاف نہ تھے، اس کی وجہ سے سندھ کا شیرازہ منتشر ہوگے اور سردار باغی ہوگئے اور بالآخر تمیم کو قتل کر دیا گیا۔ تمیم کے بعد حکم بن عوانہ سندھ کا والی بنا، اس نے محفوظہ نامی شہر بسایا اور وہی تھا جو محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم کو اپنے ساتھ لیتا آیا اور تمام اہم اموراس کے سپرد کردیئے۔ عمر بن محمد ثقفی نے تمام خودمختار علاقوں کو دوبارہ فتح کیا اور واپسی میں دریائے سندھ کے قریب ایک شہر آباد کیا جس کا نام منصورہ رکھا۔ حکم بن عوانہ کے ساتھ منذر بن زبیر ہباری بھی آیا تھا جس کے پوتے نے آگے چل کر ہباری سلطنت کی بنیاد رکھی جو چوتھی صدی تک قائم رہی۔

جنید کے بعد حکم بن ابی عوانہ کلبی کو سندھ کی ذمہ داری ملی، وہ اپنے ساتھ عمر بن محمد بن قاسم ثقفی اور منذر بن زبیر ہباری کو لیتا آیا۔ اس وقت سندھ میں مضبوط حکومت نہ ہونے سے ہر طرف بدامنی تھی، حکم نے محفوظہ نام کا ایک شہر بسایا۔ عمر بن محمد بن قاسم ثقفی نے اردگرد کے علاقے فتح کیے، سندھ کے مقبوضات میں سے جو علاقے خودمختار ہوگئے تھے ان کو پھر سے اطاعت گزار بنایا، سندھ کے علاقوں کو فتح کرکے جب عمر بن محمد لوٹ رہا تھا تو اس نے دریائے سندھ کے دہانے پر ایک شہر آباد کیا جو آگے چل کر منصورہ کے نام سے ایک مستقل حکومت کا پایہ تخت بنا۔

حکم کی موت کے بعد سندھ کے والی بننے کے دعویدار دو تھے ایک عمر بن محمد بن قاسم ثقفی اور دوسرے یزید بن عرارہ، خلافت اموی نے محمد بن قاسم کی مظلومانہ موت پر نگاہ کرتے ہوئے عمر کے حق میں فیصلہ سنایا۔ عمر بن محمد بن قاسم نے سندھ حکومت کے مقبوضات کا دائرہ بڑھایا۔ پانچ سال کے بعد عمر بن محمد بن قاسم کو معزول کردیا گیا اور اس کی جگہ یزید بن عرارہ سندھ کا والی بنا، یزید بن عرارہ ایک بہتر سپہ سالار تھا لیکن وہ معاملات کی گہرائی سے پرکھ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا یہی وجہ ہے کہ ایک عباسی خلافت کے قیام کیلئے کوشاں منصور بن جمہور کلبی کے ہاتھوں اسے نہ صرف سندھ کی حکومت گنوانی پڑی بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ منصور نے یزید بن عرارہ کو دیوار میں چنوادیا۔

معلومات کی جانچ

1. عربوں کے سندھ پر حملہ کرنے کے اسباب کیا تھے؟

2. محمد بن قاسم کے بعد خلافت عباسیہ تک سندھ کے والیوں کا جائزہ لیجئے۔

3.10 خلافت عباسیہ کے دور میں سندھ میں عربوں کی حکمرانی

132 ہجری میں امویوں کا تختہ پلٹ گیا اور خلافت عباسیہ قائم ہوگئی۔منصور بن جمہور کلبی نے خلافت عباسیہ سے بغاوت کا اعلان کر دیا،اس کی سرکوبی کیلئے کی گئی کوششیں ناکام رہیں تو ابومسلم خراسانی نے موسیٰ بن کعب کو روانہ کیا۔موسیٰ بن کعب کے ہاتھوں شکست کھا کر منصور بھاگا،غلطی سے ریگستان میں پھنس گیا،موسی بن کعب کی فوج اس کی تلاش میں تھی اس کو پکڑ کر قتل کر دیا۔موسی بن کعب کے بعد 140 ہجری میں عیینہ بن موسی کو سندھ کا والی بنایا گیا،اس کے دور میں اہل یمن اور اہل حجاز اس کی بدعنوانی پر معترض ہوئے اس نے سبھی کو قتل کرادیا،پھر اس نے کچھ عرصہ بعد خلافت عباسیہ سے بغاوت اختیار کی،اس کی سرکوبی کیلئے ابوجعفر منصور نے عمر بن حفص کو روانہ کیا اور اس کے ساتھ عقبہ بن مسلم کو مشیر کے طور پر روانہ کیا۔142 ہجری میں یہ دونوں بڑی فوج کے ساتھ سندھ پہنچے،عیینہ نے پہلے مقابلہ کیا لیکن جب شہر اور باہر کے لوگ عمر بن حفص کے ساتھ شریک ہونے لگے تو اس نے صلح کرلی،عمر بن حفص نے اس کو بغداد روانہ کر دیا،وہ راستے میں ہی بھاگ نکلا اور بجستان کی راہ پکڑی لیکن یمنیوں نے اس کو باغی سمجھ کر گرفتار کر یا اور قتل کر دیا۔

اس دور کا ایک بڑا واقعہ یہ ہے کہ عباسیوں کو خلافت ملی تو ان میں آپس میں علویوں اور عباسیوں میں چپقلش شروع ہوگئی اور علویوں نے عباسیوں کے خلاف بغاوت شروع کر دی جس کے نتیجے میں علویوں کے خلاف خلافت عباسیہ نے سخت دار و گیر شروع کر دی۔خلافت عباسیہ کے اہلکاروں سے چھپتے چھپاتے عبداللہ الاشتر علوی اپنے چند جانثاروں کے ساتھ سندھ آئے اور خود کو گھوڑے کا تاجر مشہور کیا لیکن یہ بات کھل گی کہ وہ کون ہیں،عمر بن حفص سادات کا طرفدار تھا اس نے عبداللہ الاشتر کو کسی قریبی راجہ کے یہاں مامون کر دیا۔اس کی خبر جب پھیلی تو ان کے مزید خیر خواہ ان کے پاس آتے گئے یہاں تک کہ چارسو افراد جمع ہوگئے۔عبداللہ الاشتر نو دس سال تک راجہ کے یہاں اطمینان سے رہے۔151 ہجری میں عبداللہ الاشتر کے بارے میں منصور کو خبر ہوئی اس نے عمر بن حفص سے جواب طلب کیا۔ایک شخص نے کہا کہ ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دیجئے،ایسا ہی کیا گیا اور خلیفہ نے اس آدمی کو بغداد بلالیا۔لیکن عمر بن حفص کی اس کوتاہی کو دل سے معاف نہ کیا اور اس کو افریقہ کا گورنر بنا کر سندھ کا والی ہشام بن عمر تغلبی کو بنایا اور اس کو تاکید کی کہ دیکھو جیسے بھی ہو عبداللہ الاشتر کو گرفتار کرو،لیکن یہ بھی دل سے سادات کا طرفدار تھا اس نے مشہور تو کیا کہ اس سلسلے میں راجہ سے خط و کتابت ہو رہی اور معاملہ حل ہونے والا ہے لیکن اندرون خانہ معاملہ کو ٹالتا رہا،قضا و قدر سے ایسا ہوا کہ ایک دن ہشام کا بھائی سفیح کسی بدامنی کو دور کرنے کیلئے جا رہا تھا کہ عبداللہ الاشتر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔سفیح کے ساتھیوں نے سادات کے خون سے دامن بچانا چاہا لیکن سفیح نے سخت کارروائی کی دھمکی دی اور پھر دونوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور عبداللہ الاشتر مارے گئے۔منصور کی تاکید پر ہشام نے آخر 151 ہجری میں راجہ پر حملہ کر دیا ایک زبردست جنگ کے بعد راجہ مارا گیا اور اس کا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آیا،عبداللہ کے ساتھی مارے گئے اور جو بچے وہ ادھر ادھر منتشر ہوگئے اور عبداللہ کے بیٹے محمد اور ان کی ماں جو لونڈی تھیں کو بغداد روانہ کر دیا۔منصور نے ماں اور بیٹے کو مدینہ روانہ کر دیا۔

ہشام کو ان سب امور سے فارغ ہو کر توسیع مملکت کا خیال آیا،اس نے منصورہ میں اپنے بھائی بسطام کو حاکم بنایا اور خود ایک بڑی فوج لے کر روانہ کیا اور بالائی کشمیر کو فتح کرتا ہوا لوٹا اور ملتان پہنچا،جنگ کے بعد ملتان پر بھی قبضہ ہوا،قندابیل کو بھی سندھ کے تابع کیا،اس کے بعد پھر بحری راستہ سے بھروچ پر حملہ کیا اور اس کو فتح کرلیا۔ہشام نے گندھار پر قبضہ کیا اور ایک مسجد تعمیر کی،اس مسجد کو گجرات کی اولین مسجد ہونے کا شرف حاصل

ہے۔اس کے بعد اس نے بڑی قابلیت کے ساتھ سندھ میں حکومت کی اور پورا سندھ پرامن ہوگیا۔اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے منصور نے مکران کی حکومت بھی اس کے سپرد کردی۔ کچھ سالوں پانچ یا چھ سال بعد اس کو وطن کی یاد ستانے لگی اور یہ خلیفہ کی اجازت سے بغداد گیا۔اس نے منصور کو بیش قیمت تحائف پیش کئے اور بغداد یا عراق میں ہی اس کی موت ہوگئی۔ ہشام کے بعد منصور نے معبد بن خلیل تمیمی کو سندھ کا والی بنایا،159 ہجری میں معبد خلیلی کی موت کے بعد روح بن تمیم کو سندھ کا والی بنایا گیا۔

تبلیغ اسلام: اس درمیان عباسی خلیفہ منصور کی موت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ اس کا بیٹا مہدی تخت نشیں ہوا تھا،اس نے عمر بن عبدالعزیزؒ کے نقش قدم پر اکثر حکمرانوں کے نام جو اس کے ماتحت تھے قبول اسلام کی ترغیب دی،ان میں سے پندرہ راجہ مسلمان ہوگئے ان میں سے ایک سندھ کا راجہ تھا اس راجہ کو رائے کہا جاتا تھا اور ایک راجہ وہ تھا جو پورس کے خاندان سے تھا۔

بھروچ پر حملہ:159 ہجری میں مہدی نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کی قیادت میں ایک بحری بیڑہ گجرات بھیجا،یہ بیڑا 160 ہجری میں بھاڑ بھوت پہنچا عربوں نے زمین پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی حملہ کردیا، گجراتی قلعہ بند ہوئے لیکن عربوں کے پر جوش حملوں کو قلعہ کی دیواریں سہار نہ سکیں، واپسی میں سمندر کی طغیانی کی وجہ سے انتظار کرنا پڑا اور اسی درمیان وبا پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے ایک ہزار افراد شہید ہوئے۔ان شہیدوں میں سے ایک ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی جلیل القدر تابعی بھی ہیں۔مہدی اور ہارون رشید کی خلافت تک میں سندھ میں کئی والی مقرر ہوئے جیسے لیث بن طریف،سالم یونسی طیفور بن عبداللہ بن منصور،جابر بن اشعث طائی،سعید بن سلم بن قتیبہ۔لیکن ان سے سندھ میں امن وامان قائم نہیں ہوسکا۔حجازیوں اور یمنوں کی آویزش بڑھتی چلی گی۔حجازی طاقتور ہوگئے اور انہوں نے سندھ کے والیوں کو اپنے اشارہ پر چلانا شروع کردیا۔بالآخر ہارون رشید نے 184 ہجری میں داؤد مہلبی کو سندھ کا والی بنا کر روانہ کیا۔

داؤد مہلبی کا دور حکومت: داؤد مہلبی نے اپنا نائب اپنے بھائی مغیرہ کو بنا کر بھیج دیا۔حجازیوں نے مغیرہ کو منصورہ میں داخل نہیں ہونے دیا اور ایسے شرائط پیش کئے جو مانے نہیں جاسکتے تھے بالآخر لڑائی ہوئی اور مغیرہ کو شکست ہوئی،مغیرہ نے سارے واقعہ کی رپورٹ داؤد کو دی۔داؤد غصے سے بھر گیا اور ایک فوج لیکر نکل پڑا۔سندھ پہنچتے ہی اس نے نزاریوں (حجازیوں) کی بیخ کنی شروع کردی اور نزاریوں کے خلاف سخت کارروائی شروع کی۔جب داؤد منصورہ پہنچا تو ان لوگوں نے قلعہ بند کردیا اور جنگ شروع کردی لیکن داؤد نے نزاریوں کی بڑی تعداد کو تہہ تیغ کردیا۔کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد منصورہ فتح ہوا لیکن نزاری اپنی شرارت پر قائم رہے اور روز ایک نیا ہنگامہ برپا کرتے رہے۔داؤد نے بالآخر منصور ہیں ان کے محلے اور مکانات کو مسمار کردیا اور باغیوں کو قتل،قید اور جلاوطن کیا جس کی وجہ سے منصورہ میں امن ہوگیا۔داؤد نے نزاریوں کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا اس سے سندھ میں امن تو قائم ہوا لیکن عربوں کی ایک بڑی آبادی فنا ہوگئی۔اس نے اپنے حسن تدبیر سے چند ہی سالوں میں پورے سندھ کی کایا پلٹ دی اور بدامنی اور شورش کی جگہ امن وامان قائم ہوگیا۔داؤد کا دور حکومت بیس برس رہا،اتنی طویل مدت تک سندھ میں کوئی والی اس سے قبل نہیں رہا اور اسی دور میں ہارون رشید کی موت ہوئی،امین و مامون کی خانہ جنگی ہوئی اور مامون عباسی حکمراں بنا،داؤد کی چونکہ کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے مامون نے بھی اس کو برقرار رکھا۔

مامون الرشید کے دور میں داؤد مہلبی کا انتقال ہوگیا تو مامون نے دس لاکھ درہم یعنی ڈھائی لاکھ روپے سالانہ خراج کے وعدہ پر اس کو سندھ کا حاکم بنادیا، کچھ عرصہ یہ ٹھیک رہا لیکن پھر یہ لاپرواہ ہوگیا اور مامون کو خراج بھیجنا بند کردیا۔مامون نے غسان مہلبی کو اس کی سرکوبی کیلئے

بھیجا، جب غسان منصورہ پہنچا تو بشر نے بغیر جنگ کے اس کی اطاعت کرلی، غسان نے اس کو نظر بند کردیا اور مامون کے حکم کے مطابق سندھ کا والی موسیٰ برمکی کو بنادیا۔ غسان کی بالا یا بالا چندر نام کے ایک راجہ نے توہین کی تھی موسی برمکی نے اس پر حملہ کردیا اور راجہ گرفتار ہوا، راجہ نے بڑی کوشش کی کہ کثیر زر فدیہ ادا کر کے خلاصی کرلے یہاں تک کہ پانچ لاکھ درہم تک ادا کرنے کی پیش کش کی لیکن موسیٰ نہیں مانا اور راجہ قتل کردیا گیا۔ موسی برمکی کی موت کے بعد 231 ہجری میں اس کے بیٹے عمران برمکی کو سندھ کا والی بنایا گیا، عمران برمکی نے پوری مستعدی کے ساتھ بدامنی اور جاٹوں اور میدوں کی بغاوت اور سرکشی کو ختم کیا۔ قیقان کے افراد ہمیشہ شورش برپا کرتے تھے اس کے سدباب کیلئے بوقان میں ایک فوجی چھاؤنی بنائی۔ میدوں کی بغاوت کا بالکلیہ استیصال کرنے کیلیا س نے کمر باندھا اور میدوں پر حملے شروع کئے تھ کہ یمنیوں اور حجازیوں میں جھگڑے شروع ہوگئے۔ عمران نے کمزور یمنیوں کی طرفداری کی جس پر حجازی عمران کے خلاف سازش کرنے لگے اور اپنے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری کی قیادت میں عمران برمکی پر حملہ کر کے قتل کردیا۔

236 ہجری میں عمران کے قتل کے بعد عنبسہ بن اسحاق ضبی سندھ کا والی ہوا، عنبسہ نے بدامنی کا فائدہ اٹھا کر خود مختاری کا دعویٰ کرنے والوں امراء اور حکام کو سندھ حکومت کا پابند بنایا، قیدیوں کیلئے دیبل کے عالیشان مندر کا گنبد توڑ کر چھت دے کر ایک بڑی جیل بنائی۔ 235 ہجری میں خلیفہ متوکل نے عنبسہ کو معزول کر کے ہارون بن ابی خالد کو سندھ کا والی بنایا، اس نے یہاں آکر حجازیوں اور یمنیوں کے حالات دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ حجازی یمنیوں پر زبردستی کرتے ہیں تو اس نے یمنیوں کی طرفداری کرنی شروع کردی جس کی وجہ سے حجازی گروہ اس سے ناراض ہوگیا اور بالآخر 240 ہجری میں حجازیوں نے اس کا قتل کردیا۔

عمر بن عبدالعزیز ہباری نے سندھ کی حکومت سنبھالی اور خلیفہ متوکل کو اپنی اطاعت کا خط لکھا، متوکل پے در پے ہونے والی بغاوتوں سے پریشان تھا اس نے اس اطاعت گزاری کو بھی غنیمت جانا اور باوجودیکہ کی حجازی گروہ اس کے متعین کردہ والی کا قاتل تھا اس نے حجازیوں کو سندھ کی ولادت سپرد کردی اور یہیں سے سلطنت خاندان ہباری کا آغاز ہوتا ہے۔

3.10.1 سندان پر عربوں کا قبضہ

مامون الرشید کے دور میں جب کہ سندھ کا والی موسی برمکی تھا بنی سامہ کے غلام فضل بن ہامان نے سندان پر قبضہ کرلیا (سندان گجرات اور سندھ کی سرحد پر گجرات کا ساحلی علاقہ تھا) فضل نے مامون الرشید کو اپنی اطاعت گزاری کا خط لکھا، ایک ہاتھی نذر کیا اور سندان میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ فضل کی موت کے بعد اس کا بیٹا محمد بن فضل سندان کا حاکم ہوا، اس کی طبیعت میں ملک گیری تھی، کشتیوں کا بیڑا لیکر مید قوم پر حملہ کیا اور مزید فتوحات کیلئے قدم آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ خبر آئی کہ سندان میں اس کے بھائی نے بغاوت کردی اور شہر پر قبضہ کرلیا ہے۔ یہ سن کر وہ سندان لوٹا، یہاں پہنچے پر خبر کی تصدیق ہوئی، محمد بن فضل نے مامون سے مدد کی درخواست کی لیکن اس کے بھائی ہامان نے سندھیوں اور دیگر فوجی افسران کو ورغلا کر اپنے حق میں کرلیا اور مامون کی جانب سے مدد آنے سے پہلے محمد پر حملہ کردیا، اس جنگ میں محمد کو شکست ہوئی، گرفتار کر کے محمد بن فضل کو سولی دے دی گئی۔

ہامان کے اندر چالبازی کی صفت ضرور تھی لیکن دور اندیشی اور پیش بینی نہیں تھی، وہ سندھ کی اسلامی مملکت اور خلافت عباسیہ دونوں سے بے پرواہ ہوگیا اور کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد اس پر ہندو راجوں نے حملہ کردیا اور اس کسی نے مدد نہیں کی اور اس طرح

سندان کی اس چھوٹی سے عرب حکومت کا بہت قلیل مدت میں خاتمہ ہوگیا۔

معلومات کی جانچ

1. سندھ کے والی داؤد مہلبی کا کارنامہ کیا تھا؟

2. سندان میں عرب حکومت پر روشنی ڈالیے۔

3.11 سندھ میں ہباری خاندان کی حکومت

سندھ میں ہباری خاندان کے سلسلے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھا ہے:

''اگرچہ ہارون رشید نے کے عہد میں داؤد مہلبی نے نزاریوں کی طاقت کا خاتمہ کردیا تاہم المتوکل کے دور میں حجازیوں کے سرگروہ عبدالعزیز ہباری نے عباسی عامل خالد کو قتل کر کے خودمختار حکومت قائم کرلی اور منصورہ کو اپنا صدر مقام قرار دیا''۔

ہباری خاندان قریش کی ایک شاخ بنو اسد کے ہبار بن اسود سے چلا ہے۔ ہبار بن اسود 8 ہجری میں مسلمان ہوگئے تھے۔اسی خاندان کا ایک فرد منذر بن زبیر حکم بن عوانہ کے ساتھ سندھ آگیا، منذر بن زبیر کا ہی پوتا عمر بن عبدالعزیز ہوا جو ہباری سلطنت کا موسس تھا۔سنہ 240 ہجری میں سندھ کی ولایت ملنے کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے زیریں سندھ کو فتح کیا،اس نے رفتہ رفتہ پورے سندھ کو فتح کیا لیکن اس نے منصورہ کو پایہ تخت نہیں بنایا بلکہ منصورہ سے تھوڑے فاصلہ بانیہ میں رہا۔اس نے کبھی خلافت عباسی کی اطاعت کا جوا گردن سے نہیں اتارا،خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا رہا۔اس کے دور میں خلیفہ عباسی بھی سندھ کو اپنے مقبوضات میں شمار کرتے تھے۔چنانچہ یعقوب بن لیث صفاری کے نام خلیفہ معتمد نے ترکستان،سجستان اور کرمان کا والی بنایا تو اس میں سندھ کا بھی ذکر کیا ہے۔اس عرصہ میں جب کہ عمر بن عبدالعزیز سندھ پر حکمرانی کرر ہا تھا مشرق میں روزانہ نئے نئے ہنگامہ برپا ہوتے رہے لیکن وہ سندھ کی حکمرانی پر بدستور قائم رہا،یہ اس کی لیاقت اور حسن تدبر کی دلیل ہے۔اس کی موت کب ہوئی تاریخ کتابیں اس سلسلے میں خاموش ہیں لیکن اندازہ ہے کہ 270 ہجری کے آس پاس اس کی موت ہوئی ہوگی۔عمر بن عبدالعزیز ہباری کے زمانہ میں یعنی 264 ہجری میں مشہور مورخ اور سیاح ابوزید سیرافی ہندوستان آیا تھا۔

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی موت کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ بن عمر ہباری 270 ہجری میں سندھ کا حاکم بنا۔اس کی سیرت اور کارناموں کے بارے میں بھی تاریخ خاموش ہے لیکن اس کے دور کا ایک واقعہ یہ ہے کہ بنوکندہ کے آزاد کردہ غلام ابوالصمہ کے لڑکے صمہ نے بغاوت کر کے منصورہ پر قبضہ کرلیا،عبداللہ ہباری نے بعد میں فوجی طاقت جمع کر کے منصورہ واپس لے لیا اور اسی وقت سے منصورہ کو پایہ تخت بنالیا۔

270 ہجری میں ایک پڑوسی راجہ نے عبداللہ ہباری سے سندھی زبان میں اسلام کی تعلیمات لکھ کر بھیجنے کی درخواست کی،عبداللہ نے یہ کام ایک ایسے شخص کو سونپا جو اصل میں عراقی تھا لیکن اس کی پرورش منصورہ میں ہوئی تھی اور مقامی زبان سے وہ اچھی طرح واقف تھا،اس نے اسلامی تعلیمات کو نظم کی صورت میں لکھ کر راجہ بھیجا،راجہ بہت خوش ہوا اور درخواست کی کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے،عبداللہ ہباری نے شاعر کو راجہ کے پاس بھیج دیا وہ تین سال وہاں مقیم رہا اور راجہ کو اسلامی تعلیمات سے واقف کراتا رہا۔273 ہجری میں اس شاعر نے عبداللہ

ہباری کو بتایا کہ راجہ نے سچے دل سے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن اس کے اظہار سے ڈرتا ہے اور یہ کہ اس نے ایک مکان تیار کیا ہے جہاں وہ تنہائی میں رہتا ہے اور عوام میں مشہور کر رکھا ہے کہ وہ امور سلطنت پر غور و فکر کیلئے وہاں جاتا ہے جب کہ دراصل وہ وہاں جا کر اسلامی طریقہ پر عبادت کرتا ہے، عبداللہ ہباری کے دور میں شوال 280 ہجری میں دیبل میں زبردست زلزلہ آیا جس میں پورا شہر تباہ ہو گیا اور ملبہ کے نیچے سے تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار کو مردہ نکالا گیا۔ اس بڑے حادثہ کی خبر پرچہ نویسوں نے خلیفہ معتضد باللہ کو روانہ کی۔ اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ عباسی خلفاء کا سندھ میں اثر و رسوخ باقی تھا۔

عبداللہ بن عمر ہباری کی حکومت 30 رسال رہی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے بڑی لیاقت اور حسن تدبر کے ساتھ حکومت کی ہوگی اور عوام اس کے اقدامات سے خوش رہی ہوگی ورنہ عوامی اطمینان کے بغیر اتنے عرصے تک حکومت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

3.12 سلطنت خاندان بنوسامہ

ملتان میں حکمران خاندان بنوسامہ کا تھا۔ بنوسامہ کا سلسلہ قریش میں لوی بن غالب پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ لوی کی اولاد میں سامہ تھا اسی نسبت سے اس خاندان کو بنوسامہ کہا جانے لگا۔ اس خاندان کے افراد نے ملتان پر کب قبضہ کیا، کتب تاریخ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ملتان کو محمد بن قاسم نے فتح کیا اور امیر داؤد بن نصر بن ولید کو ملتان کا حاکم بنایا۔ محمد بن قاسم کی اچانک معزولی اور گرفتاری سے سندھ میں ابتری پھیل گئی تھی، شاید اس کا فائدہ اٹھا کر امیر داؤد ملتان کا خود مختار حکمران بن گیا۔ اس کے بعد ہمیں 151 ہجری میں جا کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہشام بن عمر تغلبی نے ملتان فتح کیا، مورخین کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ملتان میں کسی مسلم خاندان کی ہی حکومت تھی اگر غیر مسلموں کی حکومت ہوتی تو پھر مورخین اس کا ذکر ضرور کرتے۔ پھر 184 ہجری میں ابن عدی والی سندھ نے ملتان کو فتح کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ تقریباً سو سال بعد ابن رستہ لکھتا ہے کہ اب (290 ہجری) میں ملتان پر بنومنبہ کی حکمرانی ہے (بنومنبہ بھی بنوسامہ کو ہی کہا جاتا ہے)۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ 375 ہجری تک ملتان میں بنومنبہ کے افراد خاندان ہی حکمران تھے۔ ابن حوقل اور اصطخری نے بھی اپنی کتابوں میں ملتان کے احوال میں ذکر کیا ہے کہ یہاں کے حکمران بنومنبہ ہیں مگر حاکموں کے نام نہیں لکھے، لیکن جب 375 ہجری میں بشاری مقدسی نے سندھ کی سیاحت کی تو اس سلسلے میں لکھا کہ ملتان کے حکمران اسماعیلی ہیں۔

3.13 ملتان میں اسماعیلی حکومت:

ملتان میں اسماعیلی دعاۃ کافی عرصہ سے انقلاب کی کوشش کرتے رہے۔ منصورہ میں ان لوگوں کو کامیابی نہ مل سکی لیکن ملتان میں ان کے ہم خیال افراد کی تعداد کافی ہوگئی پھر اسماعیلی امام العزیز قاہر باللہ متوفی 386 نے 372 ہجری میں جلم بن شیبان کو فوج کے ساتھ سندھ بھیجا، سندھ کی آمد کا راستہ کیا تھا، مکران کا یا پھر خراسان، یہ واضح نہیں ہے اور ملتان پر حملہ کر کے قبضہ کیا گیا یا پھر ملتان میں اندر سے بغاوت ہوئی اور کامیاب ہوئی، اس بارے میں کچھ بھی واضح نہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ جلم بن شیبان ملتان پر قابض ہو گیا۔

جلم بن شیبان نے ملتان پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی فاطمی خلفاء کا سکہ اور خطبہ جاری کیا، اسی نے ملتان کے اس قدیم مندر کو تباہ کیا جس

کو محمد بن قاسم نے شہر کی آمدنی کے خیال سے رکھ چھوڑا تھا۔ جلم بن شیبان کی حکومت کتنے عرصے رہی، کچھ پتہ نہیں چلتا، اس کے بعد تاریخی کی کتابوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ سبکتگین کا جب راجہ جے پال سے مقابلہ ہوا تو اور ہندوستان کے راجاؤں نے اس کی مالی اور فوجی مدد کی لیکن پھر بھی سبکتگین غالب رہا تو اس نے امیر ملتان شیخ حمید سے باز پرس کی کہ اس نے جے پال کی مدد کیوں کی۔ شیخ حمید نے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ سالانہ خراج دے گا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ شیخ حمید نے اسلام کا واسطہ دیا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں لیکن میری حکومت سے ہندو راجاؤں کی حکومت ملتی ہے ملتان کی حفاظت کیلئے کچھ دستے متعین کر دیں۔ امیر سبکتگین نے اس کو منظور کر لیا۔ پھر تقریباً 16-15 سال خاموشی رہی اور اس دوران شیخ حمید کا انتقال ہو گیا اور ملتان کا نیا امیر شیخ ابوالفتوح داؤد بن نصر بنا۔ غیر مسلم راجا بھاٹیہ سے لڑائی میں سلطان محمود کا ساتھ نہ دیا اور جب انند پال کی حمایت میں پورے ہندوستان کی فوجیں آ گئیں تو یہ سوچ کر کہ سلطان محمود انند پال کی متحدہ فوج سے نہیں جیت سکے گا، انند پال کا ساتھ دیا، اس جنگ میں شور و غل اور نفط اندازوں کی آگ سے انند پال کا ہاتھی بھاگنے لگا، اس امر کو انند پال کی فوج نے شکست پر محمول کیا اور بھاگنے لگی اور یہ دیکھ کر متحدہ فوج جو ہندوستان سے مدد کیلئے آئی تھی وہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ سلطان محمود نے 401 ہجری میں اولاً تو غوریوں کو شکست دی پھر اچانک تیزی سے آگے بڑھ کر ملتان پر حملہ کر دیا اور ملتان سلطان محمود کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سلطان محمود نے باغیوں کو سخت سزا دی اور شیخ داؤد بن نصر بن حمد کو گرفتار کر کے غزنہ لے گیا اور تاحیات نظر بند رکھا۔ اس طرح ملتان سے اسماعیلی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ فرشتہ نے بھی لکھا ہے کہ:

> ''شیخ حمید کے تعلقات سبکتگین کے ساتھ بڑے خوشگوار رہے لیکن اس کا پوتا ابوالفتح داؤد بن نصیر بن حمید جو ملاحدہ (اسماعیلیہ) میں سے تھا ابتداء میں اس کا طرز عمل اپنے باپ دادوں کے قدم بقدم رہا لیکن 395 ہجری میں اس نے غیر وفادارانہ حرکت کی''۔

منصورہ کے اسماعیلی: منصورہ میں 375 ہجری تک ہباری خاندان برسر اقتدار تھا کیونکہ بشاری مقدسی انہی تاریخوں میں سندھ آیا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ منصورہ کے قاضی اہل حدیث ہیں اور عوام زیادہ تر حنفی ہیں اور حکمران خاندان ہباری کو بتایا ہے اسی کے ساتھ ابن اثیر نے 416 ہجری کے حالات میں لکھا ہے کہ منصورہ کے حکمران قرامطہ (اسماعیلی) تھے۔

مولانا ابوظفر ندوی مصنف تاریخ سندھ کی رائے یہ ہے کہ منصورہ میں اسماعیلی سلطنت کی دو صورت ہو سکتی ہے:

> ''پہلی صورت تو یہ کہ 376 ہجری سے لے کر 396 ہجری کے پرامن زمانہ میں اسماعیلیوں نے منصورہ میں بھی ملتان کی طرح انقلاب برپا کیا ہو لیکن منصورہ کی اسماعیلی حکومت اب بھی ملتان سے الگ رہی ہو، پس اسماعیلیوں کی گویا دو حکومتیں علیحدہ علیحدہ تھیں ایک ملتان میں اور دوسری منصورہ میں۔ اس لئے سلطان محمود غزنوی کے ملتان پر حملہ کا منصورہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ 401 ہجری میں جب سلطان محمود نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور داؤد کو گرفتار کر کے غزنہ بھیجا تو اسماعیلیوں نے اپنی منتشر طاقت جمع کر کے اچانک منصورہ پر قبضہ کر لیا ہو کیونکہ ہباری خاندان اس وقت بہت کمزور ہو رہا تھا اور اس کے مقبوضات کے کچھ حصے پر دوسرے قابض تھے۔ ان دونوں نظریوں کے متعلق اس وقت تک کوئی علمی شہادت دستیاب نہیں ہوئی البتہ قیاس سے دوسری صورت کو ترجیح دی جا سکتی ہے''۔

منصورہ میں 416ہجری تک اسماعیلیوں کی خودمختار حکومت تھی۔منصورہ پر حملہ کی وجہ یہ ہوگی کہ جب سلطان محمود نے انند پال کا ساتھ دینے والے راجوں کی گوشمالی کرنی چاہی تو اس نے دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کرنے کا سوچا لیکن منصورہ کے والی کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں محمود اس کی حکومت پر قبضہ نہ کرلے،ایسا قیاس ہے کہ منصورہ کے حکمرانوں نے جاٹوں اور میدوں کو سرکشی کی شہہ دی ہوگی جس کی بناء پر جاٹوں نے سلطانی فوج کو بہت تنگ کیا جب سلطان محمود برہمن آباد پہنچا تو اس نے منصورہ کے حکمراں کی گوشمالی کرنی چاہی چنانچہ اس نے فوراً منصورہ والوں پر حملہ کردیا،منصورہ کا حکمراں جھاڑیوں میں جاکر چھپ گیا لیکن سلطان محمود نے جھاڑیوں کو گھیر لیا اور پھر چھپنے والے اکثر مارے گئے یا دریا میں غرق ہوئے اور بہت کم اپنی جان بچاسکے۔ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں لکھا ہے۔

سلطان نے منصورہ کا قصد کیا،یہاں کا والی اسلام سے پھر گیا تھا۔تو جب اس کو سلطان کی آمد کی خبر ہوئی تو شہر سے نکل گیا اور اپنے آدمیوں کو لے جاکر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔سلطان محمود نے اس کا تعاقب کیا اور دوطرف سے اس پر حملہ آور ہوا،اس میں بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب گئے،تھوڑے بچ گئے''۔

3.14 سومرہ حکمراں

جیسا کہ ماقبل میں لکھا جاچکا ہے کہ سومرہ کے تعلق سے اختلاف ہے۔انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے سومرہ کو نومسلم راجپوت بتایا ہے جب کہ مولانا عبدالحلیم شرر ان کو نومسلم یہودی لکھتے ہیں اور تاریخ ہند کے مصنف الیٹ ان کو راجپوت ہندو بتاتے ہیں علامہ سید سلیمان ندوی نے''عرب وہند کے تعلقات''اور مولانا ابوظفر ندوی نے''تاریخ سندھ''میں ان کو عرب مانا ہے ایسے عرب جنہوں نے یہاں شادی بیاہ کا سلسلہ قائم کرلیا ہے۔مولانا ابوظفر ندوی سومریوں کو راجپوت ہندو اور نومسلم راجپوت قرار دینے والوں کی مدلل طور پر غلطی ثابت کرنے اور ایک تفصیلی بحث کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

> ''پس ان حالات کی موجودگی میں یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سومرہ ہندو راجپوت نہ تھے بلکہ عرب تھے جو ہندوستان میں آباد ہوگئے تھے اور پشت در پشت یہاں رہ کر ہندی نژاد بن گئے جس کی صحیح مثال ہندوستانی سادات ہیں''۔

علامہ سید سلیمان ندوی راجپوت اور عرب میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ جنہوں نے ان کو عرب کہا ہے انہوں نے ایک جانب کا لحاظ کیا اور جنہوں نے ان کو راجپوت کہا،انہوں نے دوسرے جانب کا لحاظ کیا۔

سومرہ حکمرانوں کو راجپوت قرار دینے یا راجپوت نومسلم سمجھنے والوں کو شاید ان کے غیر مسلموں جیسے نام سے اشتباہ ہوا ہوگا حالانکہ دیکھا جائے تو عرب سے دور بسنے والی کچھ قوموں نے قبول اسلام کے بعد بھی عربی ناموں کو اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی زبان کے نام ہی استعمال کرتے رہے جیسے الپ تگین،سبکتگین،الپ ارسلان،ایلتتمش،بلبن وغیرہ حالانکہ یہ تمام لوگ پورے طور پر مسلمان تھے لہذا نام کی مشابہت ان کے غیر مسلم یا غیر مسلم سے نومسلم ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

سومرہ حکمران مذہب کے اعتبار سے اسماعیلی شیعہ تھے۔اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ دروزی شیعوں کا امام سلطان محمود کا ہم عصر

تھا،اس نے سلطان محمود کے ملتان اور منصورہ پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کے ایک طاقتور زمیندار کو خط لکھا جس کے مندرجات یہ ہیں۔

''ملتان اور ہندوستان کے موحدوں کے نام عموماً اور شیخ ابن سومرہ راجہ پال کے نام خصوصاً۔اے معزز راجہ پال! اپنے خاندان کو اٹھا، موحدین اور داؤ داصغر کو سچے دین میں واپس لا کہ مسعود نے جو اسے حال ہی میں قید اور غلامی سے آزاد کیا ہے۔وہ اس وجہ سے ہے کہ تو اس فرض کو انجام دے سکے جو تجھ کو اس کے بھانجے عبداللہ اور ملتان کے تمام باشندوں کے خلاف انجام دینے کیلئے مقرر کیا گیا ہے تا کہ تقدیس اور توحید کے ماننے والے جہالت، ضد، سرکشی اور بغاوت والی جماعت سے ممتاز ہو جائیں۔''

اردو دائرۃ المعارف کا مقالہ نگار سندھ کے مقالہ میں لکھتا ہے۔

''ادھر سندھ میں بھی ان دونوں سومرہ خاندان زور پکڑ رہا تھا۔یہ لوگ بھی عقیدتاً اسمٰعیلی تھے۔''

سومروں کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اقتدار سندھ میں کافی عرصے تک رہا لیکن کسی ایک جگہ انہیں مستقل طور پر حکومت کرنے کا نصیب نہیں ہوا، ادھر ڈوبے ادھر نکلے کے مصداق جس علاقہ میں ان کی حکومت کا سورج غروب ہوتا، وہ کچھ دوری پر اپنا مرکز بنا کر پھر سے طاقت حاصل کر لیتے تھے۔

مصری ائمہ فاطمیین کا طریقہ تھا کہ دور دراز کے علاقے جو ان کے اقتدار کی دسترس سے باہر ہوتے وہاں ایک داعی بھیج دیتے جو ان کا مذہبی اعتبار سے ذمہ دار ہوتا تھا۔سندھ کی دوری کا خیال کرتے ہوئے فاطمیوں نے ایک مقامی شخص کو مذہبی ذمہ داری سونپنا مناسب سمجھا جو سومرہ اپنی قوم میں ممتاز ہوگا اس لئے اس کو یہ ذمہ داری دی گئی۔بیس سال تک سومرہ حکومت کے قیام کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر سلطان عبدالرشید (متوفی 444 ہجری) کے دور میں جب کہ غزنی حکومت خانہ جنگی سے کمزور ہو چکی تھی، کامیاب ہو گئے اور سومرہ نام کے ایک شخص کو سندھ کا والی مقرر کر دیا۔اس وقت سے خاندان سومرہ کی حکومت مستقل طور سے تمام سندھ میں قائم ہو گئی۔سلطان عبدالرشید کے دور سے لے کر سلطان شہاب الدین غوری تک جو وقفہ ہے اس دوران تمام سندھ اور ملتان پر سومرہ خاندان حکمران رہا اور انہی سومرہ خاندان سے ملتان کا علاقہ سلطان شہاب الدین غوری نے چھینا تھا۔سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سومرہ خاندان کے اقتدار کی حالت یہ رہی کہ سندھ کے مختلف اضلاع پر مختلف اوقات میں حکومت کرتے رہے ان میں سے بعض خود مختار تھے اور بعض دہلی یا ملتان کی مرکزی حکومت کے زیر نگرانی تھے۔

سومرہ خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ: سمہ خاندان نے کیا اور اس کے بعد پھر ان کی سیاسی طاقت کا ظہور نہیں ہوا، اب یہ عام افراد کی طرح رہتے ہیں اور کاشتکاری کا شغل رکھتے ہیں لیکن مرکز کے ماتحت رہنا ان کی اب بھی خصوصیت ہے۔اردو دائرۃ المعارف میں مذکور ہے۔

''مغلوں کے مسلسل حملوں سے سندھ میں جو طوائف الملو کی پھیلی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر سومرہ دوبارہ برسر اقتدار آ گئے۔وہ بظاہر سلطنت دہلی کی اطاعت کا دم بھرتے تھے لیکن موقع پاتے ہی خود مختاری کا اعلان کر دیتے اور جب مرکزی فوج ان کی تادیب کیلئے روانہ ہوتی تو پھر اطاعت قبول کر لیتے، یہ صورت حال 1324ء تا 1351ء رہی، اور بعد ازاں جنوبی سندھ کے ایک راجپوت قبیلہ سمہ نے سومروں کو شکست دے کر ان کی جگہ لے لی''۔

معلومات کی جانچ

1. سلطنت ہباری خاندان کی ابتداء اور انتہا بیان کیجئے۔

2. سندھ میں اسماعیلی حکومت کے قیام اور زوال کا جائزہ لیجئے۔

3.15 خلاصہ

سندھ کا علاقہ تاریخی طور پر بہت قدیم ہے۔اس علاقہ نے بہت سارے انقلابات دیکھے ہیں۔اسلامی دور حکومت سے قبل چچ نامی ایک برہمن سندھ کے راجا کی رانی کی بے وفائی سے سندھ کا راجہ بنا،اس نے باغیوں کا مقابلہ کیا اور سندھ کے علاقہ کو وسعت دی،اس کی موت پر خانہ جنگی ہوئی اور بالآخر راجہ داہر جو اس کا چھوٹا بیٹا تھا سندھ کا حکمراں بنا،اس نے بلاوجہ خلافت اموی سے عداوت مول لی جس کے نتیجہ میں محمد بن قاسم کو حجاج نے ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا اور محمد بن قاسم نے جنگی تدبیروں سے سندھ کے علاقے کو یکے بعد دیگر فتح کرنا شروع کیا تو دوسری جانب اپنے حسن اخلاق اور مہربانی سے سندھ کے عوام کے دلوں کو بھی موہ لیا۔محمد بن قاسم کی موت کے بعد فتوحات کا سیلاب رک گیا اور اکثر و بیشتر سندھ کے والی سندھ سے آگے بڑھ کر ہندوستان پر کوئی کارگر حملہ کرنے میں ناکام رہے، زیادہ ہوا تو سندھ کو مکمل طور پر مطیع کرلیا اور اس سے زیادہ ہوا تو گجرات کے سرحدی علاقے کاٹھیاواڑ، ماڑ واڑ، بھروچ وغیرہ پر حملہ کیا۔اموی خلافت میں جنید۔محمد بن عمر بن قاسم اور داؤد مہلبی نے سندھ میں بہتر انداز سے حکومت کی۔مرکز میں خلافت امویہ کا تختہ پلٹ گیا اور عباسی حضرات کو اقتدار ملا لیکن سندھ کا حال جوں کا توں رہا۔

جب خلافت عباسیہ کمزور ہوگئی تو ہباری خاندان کی حکومت سندھ میں قائم ہوگئی۔ہباری خاندان نے برائے نام خلافت عباسی کی اطاعت گزاری کی درحقیقت وہ سندھ کے معاملے میں خود مختار تھے لیکن خلافت عباسیہ اپنی کمزوری سے اس برائے نام اطاعت پر بھی شکر گزار تھی۔خاندان ہباری کے بعد اسماعیلی شیعہ حضرات نے منصورہ اور ملتان کی حکومت کا باگ ڈور سنبھالا لیکن سلطان محمود غزنوی نے دونوں کا ہی خاتمہ کردیا۔اسماعیلی شیعوں کے ہی دوسرے گروہ سومروں نے غزنوی سلطنت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اقتدار حاصل کیا اور ان کی یہ حکومت کئی صدیوں تک قائم رہی۔سومرہ عرب تھے لیکن یہاں کے ماحول میں رچ بس گئے تھے اور نام تک ہندوانہ اختیار کرلیا تھا۔ان کا اقتدار سندھ کے مختلف علاقوں میں طلوع اور غروب ہوتا رہا اور وہ کبھی ادھر نکلتے اور ادھر ڈوبتے رہے۔سومرہ خاندان سے سندھ اور ملتان اولاً شہاب الدین غوری نے چھینا پھر جب شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد مملوک خاندان میں حکومت کیلئے چپقلش شروع ہوئی تو سومرہ خاندان نے پھر سندھ کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اس کے بعد ان کا معاملہ یہ رہا کہ دہلی سلطنت کے مضبوط ہونے کی صورت میں وہ دہلی کے اطاعت گزار ہوتے اور کمزور ہونے کی صورت میں خود مختار ہوجاتے۔ان کا یہ حال برابر قائم رہا یہاں تک کہ 1351 ہجری میں جنوبی سندھ کے ایک راجپوت قبیلہ نے ان کو شکست دے کر ان کی جگہ لے لی۔

سمہ قبیلہ سے ان کو ایسی شکست ملی کہ اس کے بعد وہ سیاسی طور پر کبھی طاقتور نہیں ہوسکے اور انہوں نے بھی سیاسی آویزش چھوڑ کر تجارت اور کاشتکاری کو اپنالیا لیکن مرکز سے جڑے رہنے کی جو عادت ان میں پڑگئی تھی وہ تا حال باقی ہے۔

3.16 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. سندھ کی قدیم تاریخ اور اسلامی دور سے قبل کے حالات بیان کیجئے۔
2. سندھ پر حملہ کے اسباب اور محمد بن قاسم کی فتوحات اور وجوہات تحریر کیجئے
3. چچ کے راجہ بننے اور راجہ داہر کے اپنی بہن سے شادی کرنے کا پس منظر اور منظر بیان کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. اسماعیلی شیعوں کی حکومت کا قیام اور زوال لکھئے۔
2. ہباری خاندان اور سومرہ خاندان کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟
3. سندان میں قائم عرب حکومت کا زوال کیسے ہوا؟

3.17 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. فتح نامہ سندھ معروف بہ چچ نامہ بنی بخش خان بلوچ، مترجم اختر رضوی، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، پاکستان
2. تاریخ سندھ، جلد اول و دوم ۔ از مولانا سید ابوظفر ندوی، مطبوعہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی۔ اتر پردیش
3. عرب و ہند کے تعلقات، از سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اتر پردیش
4. آب کوثر، از شیخ محمد اکرام علی، مطبوعہ ادبی دنیا دہلی،
5. محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک، از محمد سعید الحق، مطبوعہ اریب پبلکیشنز، دہلی
6. برصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ، از محمد مشتاق تجاوری، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

اکائی: 4 شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد

اکائی کے اجزاء

4.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ واقف ہو جائیں گے کہ شمالی ہند میں مسلمان کب داخل ہوئے اور مسلمانوں کا اثر ونفوذ یہاں کیسے شروع ہوا۔ اسی کے ساتھ اس باب میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ شمالی ہند میں اسلام کی نشر واشاعت کا کام فاتحین کی تلواروں سے نہیں بلکہ صوفیائے کرام کے نرم اور میٹھے بولوں سے ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ مسلم فاتحین سے نفرت کرتے ہیں لیکن صوفیائے کرام کے خلاف کوئی ہندو خواہ وہ کتنا ہی متعصب کیوں نہ ہوں، زبان نہیں کھولتا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صوفیائے کرام کی تبلیغ وتوسیع اسلام کی کوششوں کو مسلم فاتحین سے ایک گونہ مدد ضرور ملی۔

4.2 تمہید

اسلام ایک ابرکرم تھا جو ساری دنیا کو سیراب کرنے اور ہر خطے کو چمن زار بنانے آیا تھا، اس کا فیض جہاں چین وروما پر برسا، ایران وتوران کو اس نے اپنا حلقہ بگوش بنا اور ایشیا سے گزر کر افریقہ ویوروپ تک اپنا دست کرم دراز کیا وہیں اس کے کرم کی برسات گنگ وجمن کی زرخیز وادی پر بھی ہوئی اور یہاں بھی اسلام نے اپنے شاندار نقوش ثبت کئے جو یادگار زمانہ ہیں اور یادگار رہیں گے۔

رہے اس سے محروم خاکی نہ آبی

ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد پہلی صدی ہجری میں ہی ہوگئی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مکران جو سندھ و ایران کا علاقہ ہے فتح ہوگیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہی اسلامی لشکر کا سیل رواں ممی کے تھانے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد جب راجہ داہر نے فتنہ انگیزی کی تو اس کی سرکوبی کیلئے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنے داماد محمد بن قاسم کو سندھ کے راجہ کی گوشمالی کیلئے بھیجا۔ محمد بن قاسم نے راجہ داہر اور اس کی فوج کو ہر معرکے میں شکست دی اور بالآخر وہ مارا گیا اور پھر محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر پنجاب کا علاقہ ملتان فتح کرلیا اور پھر دمشق میں اقتدار کی تبدیلی یعنی سلیمان بن عبدالملک کی خلافت کے ساتھ ہی ہند میں اسلامی فتوحات کا سیل رواں رک گیا اور تقریباً دو ڈھائی سو سالوں تک رکا رہا۔ سندھ اور ملتان میں مختلف مسلم خاندان برسر اقتدار آئے لیکن وہ آگے نہیں بڑھ سکے بلکہ جتنا محمد بن قاسم فتح کر کے گیا تھا اسی کے دائرے میں محصور رہے اور پھر اسلامی فتوحات کا دور سلطان محمود غزنوی کے والد امیر سبکتگین کے دور سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے پشاور اور کابل کو فتح کر کے شمالی ہند میں فتوحات کی بنیاد رکھی۔ پھر اس کے لائق فرزند سلطان محمود غزنوی نے تو ہندوستان کو اپنے پے در پے حملوں سے دہلا دیا لیکن سلطان محمود غزنوی کا مقصد محض حملہ اور مال غنیمت ہوا کرتا تھا اس نے کبھی پائیدار سلطنت ہندوستان میں قائم کرنے کے بارے میں نہیں سوچا اتنا ضرور ہوا کہ اس نے اپنے حملوں سے ہندوستانی راجاؤں کی آپسی چپقلش اور کمزوری کو ظاہر کر دیا اور سلطان شہاب الدین غوری کیلئے راستہ ہموار کر دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی میں اپنے گورنر قطب الدین ایبک کو قائم کر کے شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی اور پھر یکے بعد دیگر مختلف خاندان دہلی کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوتے رہے اور اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے رہے۔ پہلے خاندان غلاماں آیا، پھر خلجی خاندان آیا، پھر تغلق خاندان آیا، پھر لودھی خاندان آیا پھر مغلیہ خاندان آیا اور مغلیہ خاندان کے دور حکومت میں ہی ایک قلیل عرصے کیلئے شیر شاہ شوری اور اس کی اولاد برسر اقتدار ہوئی، شیر شاہ شوری کا دور حکومت اگرچہ مختصر تھا لیکن اس کے حکومت کے بعض کارنامے پوری مغلیہ سلطنت پر بھاری پڑتے ہیں۔

4.3 موجودہ ہندوستان کی چار خطوں میں تقسیم

موجودہ ہندوستان کی اگر خطوں کے اعتبار سے تقسیم کی جائے تو وہ چار خطوں مین بٹا ہوا ہے۔ جنوبی ہندوستان، شمالی ہندوستان مغربی ہندوستان، مشرقی ہندوستان ، ہر خطہ کی اپنی الگ اہمیت ہے اس کے باوجود شمالی ہندوستان کو ایک علاحدہ امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ مسلم دور حکومت سے مراد شمالی ہندوستان ہی عموماً ہوتا ہے اور دہلی کے شمالی ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے بیشتر عسکری تگ و تاز یہیں ہوئی، مسلم علم وفن، تہذیب وثقافت کا زیادہ تر ظہور یہیں ہوا۔

4.4 شمالی ہندوستان سے کیا مراد ہے:

شمالی ہندوستان سے مراد ہندوستان کا وہ خطہ ہے جو دہلی سے قریب ہے یعنی پنجاب، اتر پردیش، بہار، بنگال اور آسام، اس میں سے بھی زیادہ تر مسلم فاتحین کی تگ وتاز پنجاب اور اتر پردیش اور بنگال میں رہی ہے۔ بہار کو بھی اگرچہ مسلم فاتحین نے ابتدائی دور میں ہی فتح کر لیا تھا لیکن بنگالہ پر جس قدر مسلم فاتحین نے یورش کی، اس قدر بہار پر یورش نہیں ہوئی اور آسام تو مسلم فاتحین کے دست رس سے اور بھی زیادہ دور تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آسام پر مسلم فاتحین نے شہاب الدین غوری کے دور حکومت میں ہی یورش کی تھی اور کامروپ کو فتح کر کے وہ تبت پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے تھے۔

4.5 پنجاب

اس نام کا اطلاق برصغیر پاک وہند کے اس علاقے پر ہوتا ہے جو دریائے ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم اور سندھ کے درمیان واقع ہے۔ اس کی حدود مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں۔ آج کل اس کا مغربی حصہ پاکستان کے موجودہ صوبہ پنجاب پر مشتمل ہے۔ اور مشرقی حصہ بھارت کے تین صوبوں ہماچل پردیش، صوبہ پنجاب اور صوبہ ہریانہ میں منقسم ہو چکا ہے۔ مختلف زمانوں میں اس کی حدود مختلف رہی ہیں، پنجاب کی وجہ تسمیہ کیا ہے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، مفتی سرور نے مخزن پنجاب میں لکھا ہے کہ پہلے اس کا نام پنج دوآب تھا، بعد میں دو کا لفظ زبان سے حذف ہو گیا اور پنجاب کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کی حدود میں پنجاب دریا بہتے ہیں۔

4.5.1 پنجاب میں مسلم فاتحین کی آمد

پنجاب میں مسلمانوں کی آمد آٹھویں صدی کے اوائل میں ہی محمد بن قاسم کی فوج کشی کے وقت سے ہی ہو گئی تھی اور ملتان کو محمد بن قاسم نے فتح کر لیا تھا لیکن عربوں کی فتوحات مشرق میں ملتان اور شمال میں پنج ندی سے آگے نہیں بڑھیں، پنجاب میں مسلمانوں کا داخلہ صحیح معنوں میں غزنویوں کے زمانے میں ہوا، ان دنوں ملتان میں قریشی امیروں کی ریاست قائم تھی جو جو مذہبا باطنی تھے۔

1001ء میں محمود غزنوی نے پشاور میں جے پال کو شکست دے کر دریائے جہلم کے کنارے تندنہ کے مضبوط پہاڑی قلعے پر قبضہ کر لیا اور یوں پنجاب کی پہلی گھاٹی اس معرکے میں سر ہو گئی۔ اس کے بعد محمود غزنوی کی فتوحات کبھی جنوب اور کبھی مشرق کی طرف بڑھتی گئیں۔ ان میں سومنات، نگر کوٹ، اور قنوج کی کشور کشائیوں کو اہمیت حاصل ہے۔ سنہ 413 ہجری مطابق 1022ء میں سلطان محمود نے پنجاب کا الحاق کر لیا اور لوہور یا لہاوور میں ایاز کو اپنا نمائندہ (صوبہ دار) مقرر کیا۔ اس کے بعد غزنوی حکومت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور جالندھر، جہلم، ملتان اور سندھ وغیرہ غزنی سلطنت کے مختلف اضلاع قرار پائے، پھر کشور کشائی کا یہ سلسلہ تھانیسر، میرٹھ اور بنارس تک جا پہنچا۔

اس دور میں پنجاب میں وارد ہونے والوں میں البیرونی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں فرخی اور عنصری نے اپنے قصائد میں محمود غزنوی کی فتوحات ہند پر روشنی ڈالی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے اس زمانے میں جو تین دیوان مرتب کیے ان میں ایک فارسی آمیز ہندی میں تھا جسے اردو کا نقش اول سمجھا جا سکتا ہے۔

582 ہجری مطابق 1186 میں شہاب الدین محمد غوری نے لاہور فتح کیا اور پنجاب کی حکومت غزنویوں کے ہاتھ سے نکل کر غوریوں کے قبضے میں آ گئی۔ ایبک کی تخت نشینی کے بعد اسلامی سلطنت کا مرکز دہلی منتقل ہو گیا لیکن پنجاب اور سرحد کو اپنے حریفوں کی دست برد سے بچانے کیلئے سلطان کا قیام زیادہ تر لاہور میں ہی رہا اور یہیں اس نے 607 ہجری مطابق 1210 میں شہادت پائی۔

خاندان غلاماں اور خلجیوں کے عہد میں سیاسی حالات کے تحت پنجاب کو بڑی سیاسی اہمیت ملی، اس کی ایک وجہ شمال سے مغول کے پے در پے حملے بھی تھے، جن کا مقابلہ کرنے کیلئے ان سلاطین کو لاہور، دیپال پور اور ملتان وغیرہ میں فوجی استحکام کے خاصے اقدامات کرنے پڑے تھے۔ ان حملوں میں لاہور اور ملتان مغول کی خاص زد میں رہے اور لاہور کو کئی بار سخت بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے التمش نے اپنے فرزند رکن الدین فیروز شاہ کو اور ناصر الدین محمود نے شیر خان کو لاہور کا اور بلبن نے اپنے شہزادے سلطان محمد شہید کو اور جلال الدین خلجی نے اپنے ولی عہد ارکلی خان کو لاہور اور ملتان کا صوبے دار بنایا۔

سلطنت دہلی کے اس دور میں پنجاب سے متعلق کئی مقتدر اشخاص، مشائخ اور مشاہیر اہل علم کے نام ملتے ہیں، مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی، قاضی رکن الدین اور مولانا ضیا الدین، لاہور سے مولانا علا الدین، قصور سے مولانا سراج الدین اور مشائخین عظام میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت پنجاب سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھا، ایک حصہ براہ راست مغلوں کی عملداری میں تھا لیکن یہاں کی صورت حال اطمینان بخش نہ تھی۔ دوسرا حصہ زیادہ شمالی جانب تھا جو خود مختار کوہستانی راجاؤں اور سرداروں کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں کانگڑہ، جموں، کشمیر، مظفر آباد، راجوری، پونچھ، بھمبر اور کوٹلی وغیرہ قابل ذکر ہیں، اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ پوری طرح مغلیہ حکومت کے زیر نگیں آ گیا۔ اس عہد میں پنجاب کے مختلف حصے دہلی، لاہور ملتان اور کابل کے صوبوں میں شامل تھے۔ اس خاندان کے شہنشاہ اکثر لاہور میں طویل عرصہ تک قیام کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے عہد میں دہلی کی طرح لاہور بھی ایک علمی اور ثقافتی مرکز بنا رہا۔ دور مغلیہ کے دوسرے حصے میں بالخصوص یہاں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی۔

4.5.2 پنجاب میں اشاعت اسلام میں صوفیا کرام کا کردار

برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کا سہرا صوفیہ کرام کے سر ہے جن کی مساعیءِ جمیلہ سے دیارِ ہند میں ہر سو صدائے لا الہ الا اللہ گونجنے لگی، اس خطہ ارض میں قدم رنجہ فرمانے والے صوفیہ عظام نے اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعے یہاں کے باسیوں کے دل موہ لیے اور وہ جوق در جوق دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہونے لگے۔ یہ انہی بزرگانِ دین کے قدوم میمنت لزوم کا اثر ہے کہ آج یہاں کروڑوں مسلمان موجود ہیں۔ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ (T.W.Arnold) نے اپنی کتاب "The Preaching of Islam" میں لکھا ہے:

Among the .... millions of Indian Musalmans there are vast numbers of converts or descendants of converts, in whose conversion force played no part and the only influences at work were the teaching and persuasian of peaceful missionaries.

ترجمہ: ہندوستان میں آباد لاکھوں مسلمانوں میں سے اکثر ایسے نومسلم یا نومسلموں کی نسل سے ہیں جن پر مسلمان ہونے کے لیے کسی طرح کا جبر یا تشدد نہیں ہوا بلکہ پرامن دعاۃ اسلام کی تعلیم وہدایت سے انہوں نے بخوشی اسلام قبول کیا۔

سلطان محمود غزنوی نے یوں تو عسکری طور پر لاہور کو فتح کیا تھا لیکن لاہور کو اسلامی رنگ میں رنگنے کا کام صوفیا کرام نے انجام دیا سب سے قبل جن بزرگؒ نے لاہور میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا وہ شیخ اسماعیل بخاری ہیں۔ وہ اس زمانے میں جب کہ لاہور باقاعدہ طور پر محمود غزنوی کی سلطنت میں شامل نہیں تھا بلکہ وہاں کا راجہ سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا۔ شیخ اسماعیل بخاری لاہور میں میں آئے۔ وہ علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ وہ یہاں آکر وعظ وتبلیغ کرنے لگے۔ ان کی مجلس میں ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے اور ہر روز صدہا لوگ اسلام قبول کرتے تھے۔ تذکرہ علمائے ہند میں ان کی بابت لکھا ہے وہ گراں قدر محدث اور مفسر تھے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم حدیث اور تفسیر سے لاہور کو منور کیا، ہزاروں لوگ ان کے وعظ میں شریک ہوتے تھے اور ان کا وعظ سن کر اسلام قبول کرتے تھے۔ خزینۃ الاصفیا کے مولف لکھتے ہیں کہ جب شیخ اسماعیل لاہور تشریف لائے اور جمعہ میں وعظ کہا تو ایک ہزار افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

دوسرے بزرگ جنہوں نے لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا وہ شیخ علی بن عثمان ہجویری معروف حضرت داتا گنج بخش لاہوری ہیں۔ مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے علما ومشائخ سے کسب فیض کیا اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے اخیر عہد حکومت میں لاہور آئے اور یہاں آکر تصنیف وتالیف اور تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا، کء لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے جس میں خاص طور پر قابل ذکر لاہور کا رائے راجو ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اس کا نام شیخ ہندی رکھا۔ آپ نے تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں جس میں سے کشف المحجوب بطور خاص مشہور ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی ہے جب ابن عربی کی فصوص اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف ابھی نہیں لکھی گئی تھی اس لئے اس کی خاص اہمیت ہے اس کے علاوہ اپنی دل آویز زبان کی وجہ سے فارسی ادب میں بھی اس کی خاص اہمیت ہے۔

ان کے علاوہ دیگر بزرگوں میں سید احمد المعروف سلطان سخی سرور یا لکھ داتا ہیں آپ ملتان میں پیدا ہوئے اور زبان زد خلق روایت کی بنیاد پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے کسب فیض کیا اور پھر موضع سودھرہ) پنجاب (میں اقامت اختیار کی اور خلقت آپ پر پروانے کی طرح ٹوٹ پڑی، غیر مسلم بطور خاص آپ سے عقیدت رکھتے ہیں بلکہ غیر مسلموں کی اس علاقے میں ایک نئی قوم بستی ہے جسے سلطانی کہتے ہیں اور وہ کئی باتوں میں مسلمانوں سے مشابہ ہیں اور ان کا سب سے بڑا تہوار سلطان سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے۔

ان کے علاوہ دیگر مشائخ میں سید احمد توختہ ترمذی ہیں آپ ترمذ سے لاہور تشریف لائے اور ہزاروں مخلوق خدا کو فیض پہنچایا۔ ان ے علاوہ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی ہیں، آپ ترکستان سے لاہور آئے۔

4.5.3 حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور اشاعت اسلام

شیخ فریدین الدین گنج شکر کے آبا واجداد چنگیزی حملے کے دوران کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ملتان کے کھوتوال میں

ان کے دادا قاضی مقرر ہوئے۔ یہیں شیخ فریدالدین جن کا اصل نام مسعود تھا، پیدا ہوئے، کھوتوال میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے اور حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں اٹھارہ برس کی عمر میں خواجہ قطب الدین سے ملاقات ہوئی۔ان کے ساتھ آپ دہلی کی طرف چلے۔خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ان کو نصیحت کی کہ وہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کرلیں اور پھران کے پاس دہلی آئیں۔ پانچ سال تکمیل تعلیم کیلئے قندھار میں گزارے اور پھر دہلی آئے۔تھوڑے ہی دنوں میں شیخ قطب الدین نے آپ کو نعمت ہائے روحانی سے مالا مال کردیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ دہلی میں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے یکسوئی نہیں ہوتی تو مرشد کی اجازت سے ہانسی چلے گئے،آپ کے روحانی استعداد سے خواجہ معین الدین اجمیری بھی متاثر تھے، سیر العارفین میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے مرید خواجہ بختیار کاکی سے کہا: بابا بختیار، شہباز عظیم بقید آوردہ کہ جزبہ سدرالمنتہی آشیاں نگیرد، این فرید شمعیست کہ خانوادہ درویشان منور سازد، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔خواجہ بختیار کاکی کی وفات کے بعد آپ پاک پٹن چلے گئے، وہاں آپ جنگل میں رہتے، پھٹے پرانے کپڑے پہنتے، پیلو اور جنگل کے پھل پھول پر گزارہ کرتے بلکہ زیادہ تر روزہ سے رہتے۔ جہاں آپ رہتے وہ جگہ وحوش وحشرات الارض کا مسکن تھا فوادالفواد میں متعدد مقامات پر سانپ سے مختلف درویشوں کے ڈسے جانے کا ذکر ملتا ہے، خود وہاں کے لوگوں کی نسبت بھی لکھا ہے کہ وہ زیادہ ترکج طبع اور درشت مزاج اور بداعتقاد تھے۔آہستہ آہستہ آپ کی عبادت وریاضت کی شہرت عام شروع ہوئی اور پھر تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے حتی کہ شاہان وقت بھی آپ سے ملاقات کے متمنی رہنے لگے۔

آپ کی حیثیت سلسلہ چشتیہ میں موسس ثانی کی ہے کیونکہ آپ کے خلفا میں بڑے نامی گرامی حضرات شامل ہیں جیسے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جو محبوب الٰہی اور سلطان الاولیا کے نام سے معروف ہیں اسی طرح حضرت علاالدین صابر کلیری ہیں۔

بیعت وارشاد کے ساتھ ہی آپ کی توجہ اشاعت اسلام کی بھی جانب تھی چنانچہ راجپوتوں کی کئی برادریاں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئیں، اس سلسلے میں ضلع ملتان اور ضلع منٹگمری کے گزیٹر میں درج ہے کہ اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی ہے۔حضرت خواجہ بختیار کاکی کو شاید ہی ہوئی ہو۔مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔مثلاً سیال، راجپوت، وغیرہ۔شیخ فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کے دست حق پرست پر 16 قوموں (برادریوں) نے اسلام قبول کیا۔

4.5.4 حضرت شیخ بہاالدین زکریا ملتانی اور اشاعت اسلام

شیخ بہاالدین زکریا سہروردی ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے موسس اعلی ہیں۔شیخ بہاالدین ملتان میں پیدا ہوئے۔آپ بارہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا، اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور سات برس تک علوم ظاہری وباطنی کی تمیل کی، پھر بخارا میں یہ سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد حج کیلئے تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک روضہ نبویؐ کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث کی سند لی۔ پھر بغداد گئے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے۔خلعت خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے کہا اب آپ ملتان جائیں اور وہاں اقامت اختیار کرکے وہاں کے لوگوں کو مقصود تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ ملتان آئے اور جلد ہی وہاں آپکو بڑا اعتبار اور وقار حاصل ہوگیا۔آپ کے درگاہ کے خادمان نے ایک کتاب انوار غوثیہ کے نام سے شائع کی ہے جس میں خاندانی اور سینہ بہ سینہ روایات بھی جمع کی گئی ہیں۔

حضرت بہاالدین زکریا کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ کے خلفا نے سلسلہ سہروردیہ کی ترویج کے ساتھ ساتھ اشاعتِ اسلام کا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دیا۔ آپ نے حضرت سید جلال الدین سرخ بخاری کو خرقہ خلافت عطا فرما کر روحانی علوم کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ وہ تیس برس تک آپ کی خدمت میں رہے پھر حضرت صدرالدین عارف (فرزندِ اکبر وسجادہ نشین درگاہ زکریا) کے حکم پر اوچ تشریف لے گئے ۔ان دنوں اوچ کے گردونواح میں ہندوؤں کا تسلط تھا۔ سید جلال الدین نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ دینِ اسلام کی تبلیغ کی اور کفار کو راہِ راست پر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

محمد دین کلیم مورخ لاہور نے لکھا ہے کہ:

حضرت بہاوالدین ملتانی علیہ الرحمہ مختلف ممالک اور شہروں کی سیر و سیاحت کے بعد ملتان تشریف لائے، یہاں آ کر آپ نے سلسلہ عالیہ سہروردیہ کا ایک بڑا زبردست مرکز قائم کیا جس کا کام مبلغ پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے آپ کے تبلیغی دوروں کے حوالے سے یہ بتایا کہ عام طور پر گرمی کا موسم کشمیر، بلخ، بخارا، دمشق، نیشاپور اور افغانستان کی طرف گزرتا اور سردی کے ایام راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقہ میں وعظ وتبلیغ پر جاتے ۔ساون بھادوں کے مہینوں میں دیبل، ملہیر اور سہوان کی طرف نکل جاتے۔

غیر مسلموں کا اعتراف عظمت

حضرت بہاوالدین زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کی تبلیغی مساعی اور سلسلہ عالیہ سہروردیہ کی ترویج کے لیے خدمات کا اعتراف غیر مسلم قلمکاروں نے بھی کیا۔ ان کا ذکر متعدد مستشرقین کی کتب میں ملتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ بعض غیر مسلم مصنفین کی کتب سے حضرت شیخ الاسلام سے متعلق اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

سر تھامس آرنلڈ (Sir Thomas W. Arnold) سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اپنی تصنیف ''دعوتِ اسلام'' میں رقم طراز ہیں:

پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے بہاوالحق ملتانی (جو شیخ بہاوالدین زکریا کے نام سے بھی معروف ہیں) اور بابا فرید پاک پتنی کی تعلیم و تلقین سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرہویں صدی کے قریب خاتمہ اور چودہویں صدی عیسوی کے شروع میں گزرے ہیں۔

معروف مستشرق اے۔ جے۔ آربری (A.J.Arbery) اپنی کتاب تصوف "Sufism" میں حضرت زکریا ملتانی علیہ الرحمہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

شیخ شہاب الدین (سہروردی) نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن میں سب سے معروف اور اثر انگیز ''عوارف المعارف'' ہے جو اس سلسلے بنیادی درسی کتاب بن گئی ہے۔ ان کی تعلیمات ہندوستان میں بہاوالدین زکریا ملتانی کے ذریعے پہنچیں۔ اس لیے فوری قبولیت پائی۔

ایل بی ون جونز (Bevan L. Jones) جو پٹسٹ مشنری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، سلسلہ سہروردیہ کا تعارف کرواتے ہوئے شیخ بہاوالدین زکریا علیہ الرحمہ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

ترجمہ: اس سلسلے کی بنیاد ضیاء الدین ابونجیب سہروردی نے رکھی جن کا 1167ء میں انتقال ہوا۔ ہندوستان میں اسے ملتان کے شیخ بہاو الدین زکریا نے متعارف کرایا جو بانی سلسلہ کے جانشین شیخ شہاب الدین کے مرید تھے۔ بہاء الدین نے 1266ء میں وفات پائی۔ ملتان میں ان کے مزار کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ ان کی روحانی اولاد نے اسلام کی اشاعت کا کام مستعدی اور کامیابی سے سرانجام دیا۔

معلومات کی جانچ

1. پنجاب میں اسلامی دور حکومت کی تاریخ بیان کیجئے
2. شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ فریدالدین گنج شکر کی پنجاب میں تبلیغی مساعی کا کیا اثر ہوا؟

4.6 بنگال: نام اور سرحد

بنگال یا بنگالہ کا نام بنگا یا ونگا سے نکلا ہے۔ یہ ایک غیر آریائی قوم تھی جس کا ذکر سنسکرت کی قدیم رزمیہ کتابوں اور دھرم شاستروں نیز بودھی ادب (میلند اپنہو) میں ملتا ہے۔ آئین اکبری اور توزک جہانگیری میں بنگال کی تقریباً وہی حدود ملتی ہیں جو برطانوی ہند کے صوبہ بنگال کی تھیں یعنی شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک اور مغربی میں راج محل کی پہاڑیوں سے مشرق میں گارو، کھاسی اور چاٹگاؤں تک۔ اس کی طبعی سرحد نے اسے تبت، چین اور برما سے علاحدہ کیا ہے۔

لفظ بنگالہ پہلے پہل بلبن کے زمانے میں استعمال ہوا، جسے ضیاء الدین برنی نے "فاتح اقلیم لکھنوتی و عرصہ بنگالہ" لکھا ہے۔ بنگال کے یہ دو مختلف حصے (لکھنوتی اور بنگالہ) سلطان الیاس شاہ کے عہد میں متحد ہوئے اور دونوں حصوں کا نام بنگالہ ہوا، چنانچہ سلطان الیاس شاہ نے شاہ بنگالہ (یا شاہ بنگالیاں) کا لقب اختیار کیا، اس زمانے سے بنگالہ سے وہ وسیع جغرافیائی خطہ مراد لیا جانے لگا جو تلیا گڑھی سے چاٹگاؤں تک ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے اور یہاں کے لوگ فارسی ادب اور چینی اور ترکی کی کتابوں میں بنگالی کے نام سے موسوم ہوئے۔

4.6.1 اسلامی دور:

1199 عیسوی میں قطب الدین ایبک کے ترک سپہ سالار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کی توسیع کرنے کے بعد بنگالہ کی طرف کوچ کیا اور اپنی فوج کو پیچھے چھوڑ کر صرف 1800 سواروں کے ساتھ 1201 عیسوی میں سین راجہ کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہوا۔ لکشمن سین کو جب خبر ملی تو وہ کھانا چھوڑ کر محل کے پچھلے دروازے سے بھاگ گیا اور ندیا پر بغیر جنگ وجدال کے مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور جلد ہی وریندرا اور گور بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس کی قائم کردہ حکومت لکھنوتی کی وسعت شمال میں پورنیا سے دیوکوٹ اور رنگپور تک، مشرق میں ٹیسٹا اور کروتیا تک، جنوب میں گنگا تک اور مغرب میں کوسی سے راج محل کی پہاڑیوں تک تھی۔ وندھیاچل سے راج محل کی پہاڑیوں تک جنوبی بہار اور گنڈک کے دھانے سے کوسی تک کے علاقے بھی لکھنوتی میں شامل کر لیے گئے۔ یہ چھوٹی سی سلطنت بعد میں گوڑ کی ایک بڑی خود مختار حکومت بنی۔ کچھ عرصے بعد محمد بن بختیار خلجی دس ہزار فوج لے کر تبت پر حملہ کرنے کیلئے روانہ ہوا لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور نیم وحشی قبائل کی لڑائیوں نے فوج کو بددل کردیا اور وہ مراجعت پر مجبور ہوگیا جب وہ اپنی حدود میں پہنچا تو تین چوتھائی فوج ضائع

ہو چکی تھی۔ فوج کے جانی نقصان کا اسے سخت صدمہ ہوا اور اسی صدمہ میں لکھنوتی کے راستے ہی میں دیوکوٹ کے مقام پر 1205 عیسوی میں فوت ہو گیا۔ بختیار خلجی فوج کے ضیاع اور اپنی ناکامی پر بار بار یہ کہتا تھا کہ خدانخواستہ کہیں شہاب الدین غوری کا انتقال تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے ہم جو اس کی برکت سے ہمیشہ فتح مند ہوتے تھے ناکام ہو گئے، اور واقعہ ایسا ہی تھا کہ انہی ایام میں سلطان شہاب الدین غوری کا انتقال ہوا تھا۔

1211 عیسوی میں حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بن گیا۔ اس کے زمانے میں بنگال نے بڑی ترقی کی۔ حدود سلطنت میں توسیع ہوئی۔ اڑیسہ، کامروپ اور وکرم پور کے راجا خراج دینے لگے اور دارالحکومت دیوکوٹ سے گور (لکھنوتی) میں منتقل ہو گیا۔ 1219 عیسوی میں اس نے جہازوں کا ایک بڑا بیڑا بنایا، 1225 عیسوی میں سلطان التمش بہار و بنگال پر حملہ آور ہوا تو اس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔

سلطان بلبن (عہد حکومت 1265ء تا 1286ء) میں اس کے غلام صوبیدار نے بلبن کی موت کی افواہ اڑنے کے بعد خودمختاری کا اعلان کر دیا، بلبن نے اس کی سرکوبی کی اور اس صوبے کی گورنری اپنے بیٹے بغرا خان کے سپرد کر دی۔ 1287ء میں خاندان غلامان کے ہاتھ سے دہلی کی سلطنت جاتی رہی اور 1290 میں خلجیوں اور پھر 1320ء میں تغلقوں کا اس پر قبضہ ہوا تاہم بنگال میں بلبنی خاندان بدستور حاکم رہا اور سلاطین دہلی نے بھی ان پر کسی طرح کا جبر کرنا پسند نہیں کیا۔

آزاد مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بنگال نے بڑی آسودگی پائی، ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری عمارات، قلعے، مسجدیں، مدرسے، اقامت خانے، سرائیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں، تالاب کھودے گئے اور سڑکیں تیار ہوئیں، اس عہد میں دو شاہی خاندان حکمراں رہے۔ ایک حاجی الیاس کا اور دوسرا علاء الدین حسین کا۔

بنگال کو مسلم حکمرانوں نے اتنا وسیع کر دیا کہ مغربی آسام (کامروپ) کوچ بہار اور جاج نگر (اڑیسہ) کے اقطاع اور شمالی و جنوبی بہار کا علاقہ پٹنہ تک ان کے زیر حکومت رہا۔ اسی دور میں مسلم فوجوں نے دریائے میگھنا کو عبور کیا جو پہلے ان کی پیش قدمی میں سد سکندری بنتا رہا تھا اور سلہٹ، مغربی پٹرہ اور نواکھلی (بشمول چاٹگاؤں) تک مسلط ہو گئیں۔ اس مملکت کے مرکزی شہر تین تھے۔ غوریا گور جو قدیم لکھنوتی کا نیا نام تھا اور وسط بنگال (موجودہ ضلع مالدہ میں گنگا کے کنارے واقع اور چند وقفوں کے ساتھ بہت عرصہ تک پایہ تخت رہا۔

1342ء میں حاجی (ملک) الیاس مغربی بنگال کے حاکم علی مبارک کو قتل کر کے تخت پر قابض ہوا اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس نے مغرب میں اپنی سلطنت ترہٹ سے آگے چمپارن، گورکھپور اور بہرائچ تک بڑھالی۔ دوسری جانب اس نے اپنی سلطنت کو بڑھاتے بڑھاتے کامروپ، ناگرا، اور ورندا (راج شاہی اور دیناپور کے اضلاع) تک بڑھالی۔

1442 سے 1459 تک ناصر الدین محمود شاہ نے بھاگلپور، سات گاؤں، باگرہاٹ، فرید پور اور نصرت آباد سے اپنے سکے جاری کر دیئے۔ اس کے لڑکے رکن الدین بارک شاہ نے اڑیسہ کے راجا سے جنگ کی اور قلعہ مندارن پر دوبارہ قبضہ کیا، اس کے فوجی افسر اسماعیل نے کامروپ کے راجا کو ماہی سنتوش (ضلع دیناجپور) کے قریب شکست دے کر اپنی سرحد دریائے کروتیا تک بڑھالی، باربک اور اراکان کے راجا کے درمیان چاٹگاؤں کیلئے بھی جنگ ہوتی رہی۔ جیسور اور کھلنا کا علاقہ جنوب میں فتح کیا گیا۔ اس کے بعد بھی بنگال میں یکے بعد دیگر افراد اور خاندان برسر اقتدار آتے رہے اور جاتے رہے۔

اس مختصر تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ دور سے 600 سو سال قبل ہی مسلمانان ہند بنگال کے بیشتر مواضع میں پہنچ چکے تھے۔لیکن یہ فاتحانہ پیش قدمی تھی سپاہیوں سے قلعے فتح کئے جاتے ہیں لیکن سپاہیوں کی چاہے جتنی بھی زیادہ ہو وہ عوام کے مقابل میں کم ہوتی ہے،ضرورت اس بات کی تھی کہ عوام کو اسلام کے حلقہ بگوش کیا جائے اور یہ کام علماء اور صوفیاء حضرات کا تھا اور صوفیاء حضرات نے اس کام کو بخوبی انجام دیا،اب ہم ذیل میں حضرات صوفیاء کی بنگال میں تبلیغ و توسیع اسلام کیلئے کاوشوں اور جانکاہیوں پر مختصر روشنی ڈالیں گے۔

4.6.2 بنگال میں تبلیغ وتوسیع اسلام میں صوفیاء کرام کی کاوشیں:

سب سے پہلی جو بزرگ شمالی ہند کے راستے بنگال تشریف لے گئے، شیخ جلال الدین تبریزی تھے۔آپ ایرانی نسل سے تھے، پہلے پہل شیخ ابوسعید تبریز کے مرید ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی سے کسب فیض کیا۔شیخ جلال الدین گھومتے گھومتے دہلی تشریف لائے، یہاں ان کی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے اچھی دوستی ہوگئی۔

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ جب آپ بنگالہ پہنچے تو وہاں مخلوق خدا پروانہ وار آپ کے گرد نثار ہونے لگی وہاں آپ انہوں نے آپ کیلئے ایک خانقاہ تعمیر کی اور کئی باغ اور بہت سی زمین خرید کر لنگر کیلئے وقف کی۔اس جگہ کو بندر دیو محل کہتے ہیں، یہاں ایک بڑا تالاب تھا جس کے قریب ایک ہندو راجہ نے زر کثیر صرف کر کے ایک بت خانہ تعمیر کیا تھا۔آپ نے اس جگہ بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا اور بت خانے کو اپنی جائے قیام بنایا،اب آپ کا مزار اسی جگہ ہے اور اس مندر کی نصف آمدنی آپ کے لنگر کیلئے وقف ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کا خیال ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی بنگالے میں 1195ء اور 1200ء کے درمیان کسی ایسے وقت میں پہنچے جب وہاں لکشمن سین کا راج تھا اور مسلمانوں نے ابھی بنگالہ کو فتح نہیں کیا تھا۔بنگالہ میں تبلیغ اسلام کی وجہ آپ کی یہ کرامت بنی کہ شیخ جلال الدین جب دیوہ محل آئے تو ایک کمہار یا مالن کے یہاں قیام کیا، دیکھا کہ اس کے گھر میں آہ و شیون کا طوفان برپا ہے، پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے شہر میں ایک رسم یہ تھی کہ راجا کے حکم کے مطابق ہر روز ایک نوجوان دیو کے سامنے بھیجا جاتا تھا اور وہ اسے کھا لیتا تھا۔اس روز شیخ کے میزبان کے بیٹے کی باری تھی، شیخ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو نہ بھیجو مجھے بھیجو،لیکن وہ نہ مانا کہ اگر دیو نے تمہیں قبول نہیں کیا تو راجا مجھے قتل کرا دے گا۔چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو نہلایا، دھلایا، نئے کپڑے پہنائے اور اسے بت خانے میں لے گیا، شیخ بھی ساتھ تھے، بت خانے میں پہنچ کر شیخ نے نوجوان کو تو رخصت کر دیا اور خود دیو کا انتظار کرنے لگے، جب دیو اپنے معمول کے مطابق ظاہر ہوا تو شیخ نے اسے اپنے عصا کی ضرب سے ہلاک کر دیا، صبح کو راجا پنے لشکریوں کے ساتھ بت کی پرستش کو آیا تو دیکھا کہ اس بت خانے میں ایک آدمی سیاہ کپڑے اور سیاہ ٹوپی پہنے کھڑا ہے اور لوگوں کو بلا رہا ہے ،لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے، راجا خود آگے بڑھا، شیخ نے کہا کہ تم بلا کھٹکے آگے آؤ، دیو کو میں نے ہلاک کر دیا ہے۔لوگوں نے دیکھا تو واقعی ایسے ہی تھا، چنانچہ سب لوگ ایمان لائے اور مسلمان ہوئے، شیخ جلال الدین کی وفات کب ہوئی اس تعلق سے مختلف روایات ہیں سیر العارفین اور آئین اکبری کے مطابق آپ کی وفات 642 ہجری یعنی 1244ء میں ہوئی، یہی تاریخ خزینۃ الاصفیاء میں بھی درج ہے لیکن مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس نے سنہ 746 ہجری مطابق 1345ء میں شیخ کی زیارت کی ہے۔چنانچہ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے

"سات گام سے میں نے کامروپ کے پہاڑوں کی طرف کا راستہ اختیار کیا جو یہاں سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہے، میرا ارادہ اس ملک میں جانے سے یہ تھا کہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی جو مشہور اولیاء اللہ تھے، زیارت کروں، یہ۔ان کے ہاتھ پر اس ملک کے

اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے۔اس ملک کے ہندو مسلمان سبھی شیخ کی زیارت کرتے ہیں اور ان کے واسطے تحفے لاتے ہیں۔"

پروفیسر گب کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ نے جس شیخ جلال الدین کی زیارت کی تھی وہ شیخ جلال الدین تبریزی نہیں بلکہ جلال الدین سلہٹی تھے،لیکن اس نظریہ کو ماننے میں بھی الجھن ہے کیونکہ شیخ جلال الدین کی اس نے جو صفات بیان کی ہیں یعنی بغداد کی زیارت،خلیفہ مستعصم کا تاتاریوں کے ہاتھ قتل وغیرہ تو وہ شیخ جلال الدین تبریزی پر صادق آتی ہیں۔

شیخ سراج الدین عثمانی: شیخ سراج الدین عثمان کا وطن بنگال کا دارالخلافہ لکھنوتی تھا لیکن وہ عہد طفولیت سے ہی دہلی آگئے تھے اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا دامن پکڑ لیا تھا شیخ نے ان کو تحصیل علم کی ہدایت کی اور پھر ان کو خلافت سے نوازا، شیخ نظام الدین اولیاء کے بعد اپنی تکمیل کا احساس انہیں حضرت چراغ دہلی کے یہاں لے گیا انہوں نے ان کی مزید تربیت کی اور پھر ان کو بنگال کی جانب روانہ کیا، بنگال میں ایک بزرگ شیخ علاء الدین پہلے سے موجود تھے لیکن ان کی روحانی برتری کا شیخ علاء ل الدین نے برملا اعتراف کیا اور اپنی مشیخت در کنار کرتے ہوئے ان کے مرید ہو گئے اور اپنے شیخ کی بڑی خدمت کی۔شیخ سراج الدین کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے اور مخلوق خدا کی رہبری کی بالخصوص آپ کا لنگر ہر ایک کیلئے عام تھا اور جود وسخا کی گرم بازاری تھی یہاں تک بادشاہ وقت اس پر معترض ہوا اور آپ کو لکھنوتی چھوڑ کر سنار گاؤں جانے کا حکم دیا۔آپ کی وفات 1398ء میں ہوئی۔مزار مبارک پنڈوہ میں ہے۔شیخ علاء الحق سے بھی زیادہ فروغ ان کے صاحبزادے نور الحق المعروف نور قطب عالم نے پایا جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں

"شیخ نور الحق والدین رحمۃ اللہ علیہ المشہور بہ شیخ نور قطب عالم فرزند و مرید خلیفہ علاء الحق است از مشاہیر اولیائے ہندوستان و صاحب عشق ومحبت وذوق وشوق وتصرف وکرامت۔

جب بنگال کے راجہ غیاث الدین کو راجا گنیش نے قتل کر کے تخت سنبھالا تو گنیش نے مسلمانوں اور علماء ومشائخ کا قتل شروع کیا اس کا ارادہ تھا کہ بنگال سے اسلام کا نام ونشان مٹا دے، یہ دیکھ کر شیخ قطب عالم نے جونپور کے حکمراں ابراہیم شاہ شرقی کو مدد کیلئے خط لکھا،اس نے بڑی فوج بھیجی، گنیش نے فوج کے آنے کی خبر سن کر معافی مانگی شیخ نے کہا کہ تم کافر ہو تمہاری ہم مدد کیسے کر سکتے ہیں، گنیش نے کہا کہ میں دنیا ترک کرتا ہوں اور حکومت سے علاحدہ ہوتا ہوں، آپ میرے بیٹے جدو کو مسلمان کر لیں چنانچہ جدو کو جلال الدین کا نام دیا گیا، فوج کے واپس جانے کے بعد گنیش نے بیٹے کو پھر سے غیر مسلم بنانا چاہا تو جدو نے انکار کر دیا اور سلطان جلال الدین کے نام سے تخت بنگالہ پر رونق افروز ہوا۔

شیخ جلال الدین سہلٹی: آپ کا مزار مسلمانان بنگلہ دیش کی بڑی اہم زیارت گاہ ہے۔ضلع سہلٹ کے سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے "گوڑ یا سہلٹ کو مسلمانوں نے 1384ء میں فتح کیا آخری ہندو راجا کو سکندر غازی کی فوجوں سے زیادہ شاہ جلال کی کرامات نے بے بس ردیا،شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہ علاقہ صوبہ بنگالہ میں داخل کیا گیا اور نظم ونسق کیلئے ایک علیحدہ صوبیدار مقرر ہوا، اس ضلع کے تقریباً 53 فیصدی باشندے گزشتہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق مسلمان ہیں۔1303ء میں سلہٹ فتح ہوا اور 20 ذی قعدہ 740ء کو شاہ جلال نے وفات پائی، قیام سلہٹ کے 37 سال میں کچھ وقت تو شیخ جلال نے ظاہری انتظامات میں گزارا اور باقی عبادت اور ارشاد وہدایت میں۔ضلع سہلٹ میں چار ایسے مقامات مشہور ہیں جہاں شیخ جلال نے اپنے ساتھی پیروں کو بسایا اور ان سے ارشاد وہدایت کا کام لیا یعنی سلہٹ، لاتو، ہاپنیہ ٹیلہ، ہمنگ ٹیلہ۔

4.6.3 بنگال کے غازی بابا

بنگال میں اشاعت اسلام کی ایک بڑی وجہ بنگال کے "غازی اولیاء ہیں جن کی اصل دلچسپی تو خدا اور دوسری دنیا سے تھی لیکن جنہیں حالات کے تحت عسکری مہمات میں حصہ لینا پڑا اور جن کی مدد سے اسلامی حکومت کی توسیع کے ساتھ اسلام کی اشاعت بھی ہوئی۔ مثلاً ہگلی میں ایک مقام پنڈوہ اہل علم اور اشراف مسلمانوں کی بستی ہے۔ اس بستی کی تاریخی روایتیں یہ ہیں کہ یہ چھ سات سو سال قبل یہاں شاہ صفی الدین رہتے تھے۔ انہیں مقامی راجے نے تنگ کیا تو انہوں نے مسلمان بادشاہوں کے پاس جا کر شکایت کی اور فوج بلا کر پنڈوہ کو فتح کیا، ایک دوسرے اسلامی مرکز بنگل کوٹ ضلع بردوان کے پیر راہی کی نسبت بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ سات گاؤں میں ظفر خان اسی قسم کے مجاہد ولی تھے جو مقامی روایات کے مطابق ہندو راجا کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوئے لیکن ان کے بیٹے نے یہ مقام فتح کرلیا۔ شاہ اسماعیل غازی کے تعلق سے ایک مخطوطہ میں یہ ملتا ہے کہ راجا کامروپ کے ساتھ لڑائی میں گوڑ کے مسلمان بادشاہ نے شاہ اسماعیل غازی سے مدد لی اور فتح کے بعد اس علاقے کی حکومت ہی ان کے سپرد کردی۔ اسی طرح ڈھاکہ (بنگلہ دیش کا صدر مقام) بابا آدم شہید کا مزار ہے جن کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ہندو راجا کے ساتھ کشمکش میں شہید ہوئے۔ مزار کے قریب ایک مسجد ہے جو 1483ء میں بادشاہ بنگالہ نے تعمیر کرائی تھی۔

4.6.4 بنگال میں اشاعت اسلام کی وجوہات

بنگال میں صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام میں جو کار ہے نمایاں انجام دیئے ان کے متعلق ڈاکٹر کالی راجن قانون گو بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں

"بلبنی سلاطین کے عہد حکومت میں نہ صرف بنگالے میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ اس کی بنیادیں بھی گہری ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا جب اولیائے کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے عملی پارسائی، قوت عمل اور دوراندیشی میں بڑھ کر تھے، وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی۔ جس کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی بلکہ ان کا مذہبی جوش اور ان کی عملی زندگی۔ وہ نچلے طبقہ کے ان ہندوؤں میں رہتے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جو اس وقت بھی توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے پنجے میں گرفتار تھے۔ دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہوکر اسلامی حکومت کیلئے ایک نئی تقویت کا ذریعہ ہوگئے۔ بنگالے کی عسکری اور سیاسی فتح کے سو سال بعد صوفیانہ سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے۔ اس سرزمین میں اخلاقی اور روحانی غلبے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مندروں اور ہندو خانقاہوں کو تباہ و برباد کر کے ابتدائی مسلمان فاتحین نے صرف ان کے زر و جواہر پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن تلوار کے زور سے تاریخی روایات ختم نہ ہوسکتی تھی اور ان ہی ان غیر فانی روحانی خزائن کا خاتمہ ہوسکتا تھا جن پر ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی بنیادیں قائم تھیں۔ مسلمان اولیاء نے اخلاقی اور روحانی فتح کے عمل کو مکمل کیا اور اس مقصد کیلئے ہندو دھرم اور بدھ مذہب کے پرانے استھانوں پر (جواب برباد ہوگئے تھے) ایک پالیسی کے مطابق درگاہیں اور خانقاہیں قائم کردیں۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو بت پرستی کے ان قدیم استھانوں سے ہندومت کے احیاء کا امکان جاتا رہا اور دوسرے عوام الناس میں ایسے قصے کہانیاں رائج ہوگئیں جن کے مطابق یہ نو وارد قدیمی مقدس ہستیوں کے جانشیں ہوگئے۔ ہندو عوام صدیوں سے ان مقامات کو مقدس مانتے آئے تھے وہ ان کی پرانی تاریخ کو بھول گئے اور بڑی آسانی سے انہوں نے اپنی ارادات کا سلسلہ ان پیروں اور غازیوں سے وابستہ کردیا جو ان مقامات پر قابض ہوگئے.......... ہندو سوسائٹی بالخصوص نچلے طبقے کے ہندو اولیاء اور غازیوں کی کرامات کے ایسے قصوں کی بدولت

جو بسا اوقات قدیم ہندو اور بودھی روایتوں پر مبنی تھے۔ آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ شاید ہندو تیرتھوں پر اس اثر کی سب سے نمایاں مثالیں دو ہیں۔ ایک راجگیر میں سرنگی رشی کنڈ کا مخدوم کنڈ بن جانا اور دوسرے دیوا وتار روایات کے معجزہ باز بدھ کا ایک مقدس مسلمان مخدوم ولی بن جانا۔

بنگال کے ممتاز مورخ سر جادو ناتھ سرکار کا خیال یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت زیادہ تر ان علاقوں میں ہوئی جہاں ہندو مذہب کی تعلیمی حالت اچھی نہ تھی اور نہ وہی وہاں برہمن اور ہندوؤں کو تعلیم دینے والے موجود تھے لہذا مسلم مبلغین کو میدان خیالی ملا اور انہوں نیا شاعت اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جب کہ ایک انگریزی مورخ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ بنگال میں اشاعت اسلام کو نمایاں کامیابی ملنے کی وجہ اسلام کا "درس مساوات" ہے جس کی وجہ سے ذات کے چکر میں جکڑے کم تر ذات کے لوگوں نے اسلام میں اپنی ہر قسم کی محرومی کا مداوا دیکھا اور اسے قبول کر لیا۔

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں

> "ان لوگوں کیلئے جن میں مفلس، ماہی گیر، شکاری قزاق اور ادنیٰ قوم کے کاشتکار لوگ تھے۔ اسلام ایک ایسا اوتار تھا جو ان کیلئے آسمان سے اترا تھا۔ وہ حکمراں قوم کا مذہب تھا۔ اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے۔ جنھوں نے توحید و مساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا جس کو سب ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔ اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اخوت کا بلند تر تخیل پیدا کر دیا اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہو کر بڑی ذلت وخواری کے دن کاٹ رہی تھیں۔ اسلام نے بلا تامل اپنی اخوت کے دائرے میں شامل کر دیا۔

معلومات کی جانچ

1. بنگال میں اسلامی دور حکومت کب سے تک رہا؟
2. بنگال میں اشاعت اسلام کی وجوہات کیا رہیں؟

4.7 بہار

ہندوستان کا ایک صوبہ جس کے مغرب میں اتر پردیش، شمال میں نیپال، مشرق میں بنگال اور جنوب میں اڑیسہ ہے۔ اس صوبے کا نام "شہر بہار" کے نام سے موسوم ہوا۔ گو خود یہ شہر جس کے اردگرد بدھ مت کی خانقاہیں (سنسکرت vihara) تھیں، اب کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ بہار سلطنت دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے کبھی ہائی لائٹ میں نہیں رہا جس طرح کے اتر پردیش کے علاقے دہلی سے قریب ہونے وجہ سے مورخین کی نگاہ میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تاریخ بطور صوبہ مکمل کرنا ایک مشکل کام ہے بس کچھ شہر ایسے ہیں جن کی تاریخی حیثیت ہے اور اسی بناء پر اس کا ذکر آجاتا ہے۔

4.7.1 اسلامی دور

بہار میں اسلام کے قدم تب پڑے جب اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی کے بہار پر حملہ کے دوران 589 ہجری مطابق 1193ء میں مونگیر فتح ہوا۔ اور وہ قطب الدین ایبک سلطان دہلی کے زیر سیادت اسی اختیار الدین کے قبضے میں رہا۔ 730 ہجری مطابق 1330ء میں محمد بن تغلق نے اسے دہلی میں شامل کرلیا۔ 799 ہجری مطابق 1397ء میں یہ جونا پور سے ملحق ہوا۔ 893 ہجری مطابق 1488ء میں سکندر لودھی کے حملہ کے بعد پھر دہلی میں شامل کرلیا گیا اور کچھ مدت کے بعد جب تک کہ بنگال پر مغلوں کا تسلط نہیں ہوگیا یہ شاہان بنگال کے قبضے میں رہا۔ ساتویں صدی ہجری مطابق تیرہویں صدی عیسوی میں بہار کے کچھ حصوں کو انتظامی وحدت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ 626 ہجری مطابق 1225ء میں شمس الدین التتمش نے بہار میں ایک صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ اکبری عہد میں 990 ہجری مطابق 1582ء میں یہ ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ جس میں آٹھ "سرکاریں" تھیں اور یہ صوبہ بنگال کے ماتحت تھا۔ اس کا صدر مقام شہر بہار ہی رہا۔ یہاں تک کہ شیر شاہ نے نویں صدی ہجری مطابق پندرہویں صدی عیسوی میں اس کے بدلے پٹنہ مقرر کیا۔ یہ علاقہ سلطنت مغلیہ کے قیام سے قبل اودھ اور بنگال کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا۔ لیکن جب مغل آئے تو اسے اودھ اور بنگال کے درمیان ذریعہ مواصلات ہونے کی اہمیت حاصل ہوگئی، جسے مغلیہ شاہان کے بنائے ہوئے بہت سے نفیس پل ثابت کررہے ہیں۔

جس طرح پنجاب یا بنگال میں صوفیاء کرام کی تبلیغی کوششوں کی تاریخ ملتی ہے بہار میں اس طرح کی تاریخ عام طور پر دستیاب نہیں ہے اور شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بہار کے اہل علم نے پتہ نہیں کس بناء پر خود کو تصنیف وتالیف سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔ بہار میں اہل علم بہت گزرے ہیں لیکن ان کی نسبت سے ان کی تصنیفات دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہوگی کہ تصنیف وتالیف کیلئے جو ذرائع اور وسائل اور ماحول چاہئے وہ سلطنت دہلی سے دور ہونے کی بناء پر اہل علم کو میسر نہیں آیا۔

4.7.2 اشاعت اسلام میں صوفیائے کرام کا کردار

مسلم فاتحین کے فتوحات کا سیل بہار کے تمام شہروں تک نہیں پہنچا اس کے باوجود بہار میں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی ہے جو یہ بتا رہی ہے کہ صوفیاء کرام کی تبلیغی کوششیں یہاں از حد بار آور ثابت ہوئیں، بہار کا کوئی ضلع اور کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں مسلم نہ بستے ہوں۔

سیمانچل کا علاقہ یعنی کشن گنج، ارریہ، کٹیہار، پورنیہ، دیناجپور کا علاقہ جو بنگال میں یا بنگال سے قریب ہے وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اگرچہ معاشی اور تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں لیکن بطور مذہب اسلام کے ماننے والے اکثریت میں ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس علاقے میں بنگال کے صوفیاء کرام جن کا ذکر بنگال کے باب میں ہو چکا ہے نے اشاعت اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پٹنہ اور اس سے ملحقہ علاقے چونکہ صوبائی راجدھانی میں یا اس کے قریب رہے ہیں لہذا اسلامی ہلچل اور صوفیائے کرام کی خانقاہیں یہاں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں، بطور خاص شیخ شرف الدین یحیی منیری علیہ الرحمہ کا ذکر کرنا بیجا نہیں ہوگا جنہوں نے اس علاقے میں اسلام کی شمع روشن کی اور وہ بھی شمالی ہند میں اسلام کے ابتدائی دور میں۔ اللہ نے انہیں طویل عمر دی تھی جس کا انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے راج گیر کے جنگل میں شدید ریاضتیں کیں اور پھر ایک متروک ہندو سادھو کے استھان کو اپنا مقام بنایا اور آج یہ جگہ مخدوم کنڈ کے نام سے ہی روشن ہے۔ شیخ

شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کے خلفاء کی بڑی تعداد نے بہار میں اشاعت اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا ہے جنہوں نے حکومت وسلطنت کی اعانت کے بغیر محض تزکیہ قلب اور بلند کرداری کی بناء پر مقامی آبادی کو متاثر کیا۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے اندر اشاعت اسلام کا جذبہ اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا لیکن اس کی تبلیغی کوششوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ تذکروں میں کچھ متفرق واقعات ملتے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک جوگی نہایت حسین وجمیل تھا، اس کو دیکھ کر شیخ مخدوم کے مریدوں کے دل میں خیال آیا کہ ایک کافر کتنا حسین وجمیل ہے۔ چونکہ جوگی صفائے باطن کا حامل تھا اس لئے ان کے خیال سے آگاہ ہوگیا اور ان کو اس طرح کے وساوس پر تنبیہ کی اور پوچھا کہ تمہارا گروکون ہے لوگوں نے بتایا کہ شرف الدین یحییٰ۔ جوگی ان کے گرو کو دیکھنے ان کے ساتھ چلا لیکن جوں ہی اس کی نظر حضرت مخدوم پر پڑی، بے تحاشا بھاگا، لوگوں نیپوچھا کہ کیوں بھاگتے ہو، اس نے جواب دیا کہ مخدوم تارروپ ہوگئے ہیں یعنی متصف بصفات حق ہیں (یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے) اگر میں ان کے قریب گیا تو جل جاؤں گا۔ حضرت مخدوم کو اس کی خبر ملی تو مسکرائے اور ان کو بلوایا۔ یہ دیر تک مجلس میں بیٹھا رہا۔ حضرت مخدوم نے اسلام نے تلقین کی۔ تین دن تک اپنی صحبت میں رکھا اور خلافت عطا کر کے رخصت کیا۔

حضرت شیخ شرف الدین کی اولاد میں شاہ دولت نامی ایک شخص بڑے پائے کے صوفی اور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے یہاں امراء اور صلحاء کی آمد رہتی تھی۔ ان کے اندر اشاعت اسلام کا بڑا جذبہ تھا۔ جس کا اندازہ مآثر الامراء کے اس اندراج سے ہوتا ہے۔

''راجہ مان سنگھ بنگال جاتے ہوئے منیر میں شاہ دولت سے ملے، انہوں نے راجہ کو اسلام کی تلقین کی، راجہ اسلام کی طرف مائل تھا اور اسی غرض سے اس نے ایک ماہ وہاں قیام کیا تھا لیکن نہ جانے کیا چیز مانع ہوئی کہ اسلام قبول نہیں کیا''۔

شیخ شرف الدین کے والد تاج فقیہہ کے اندر اشاعت اسلام کا بڑا جذبہ تھا اور آپ ہی کی بدولت منیر اور اس کے اطراف میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے سوانح نگار سید ضمیر الدین لکھتے ہیں

"مولانا تاج فقیہ کی ذات سے منیر اور مضافات میں اسلام کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں اذان وتکبیر کی آواز نہ سنائی دیتی ہو۔ مولانا کے باعث منیر میں ایک باوقعت اور باقوت جماعت مسلمانوں کی پیدا ہوگئی تھی۔"

4.8 دہلی اور اتر پردیش

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دہلی کے تخت پر مسلمانوں کا قبضہ شہاب الدین غوری کے دور میں ہوا پھر جب اس نے اپنا نائب دہلی میں قطب الدین ایبک کو بنایا تو یہاں سے خاندان غلاماں کی ابتداء ہوتی ہے۔ قطب الدین ایبک کا دور حکومت 1206 عیسوی تا 1210 عیسوی رہا۔ بنارس اور دہلی قطب الدین ایبک نے فتح کیا تھا، پھر قطب الدین ایبک کے غلام التمش نے اس میں موجودہ اتر پردیش کے کے راجاؤں کی سلطنت کا خاتمہ کر کے ان کی ریاست کا الحاق دہلی سلطنت سے کیا، التمش کا دور حکومت 1211 عیسوی تا 1236 عیسوی رہا۔ رضیہ سلطانہ کو امراء کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملی اور رضیہ سلطانہ کے بعد دہلی کے تخت پر بیٹھنے والے اس کے بھائی امراء کے ہاتھ میں بے دست وپا تھے جب ناصر الدین کو حکومت ملی اور اس نے بلبن کو سیاہ وسفید کا مالک بنایا تو بلبن کو نصیحت کی کہ کوئی ایسا کام نہ کرنا جس کی وجہ سے مجھے کل قیامت میں شرمندگی ہو، ناصر الدین کا عہد اقتدار 1246 تا 1266 عیسوی رہا۔ ناصر الدین کی وفات کے بعد امراء نے بلبن کو بادشاہ منتخب کیا۔ بلبن کا

دور بطور بادشاہ 1266 عیسوی تا 1286 عیسوی رہا۔ بلبن نے فتوحات سے زیادہ مقبوضات کے استحکام پر زور دیا، اس کے دور میں مغل بار بار لاہور پر حملہ کر رہے تھے۔ بلبن نے مغربی علاقوں کو فوجی اعتبار سے مستحکم کیا اور وہاں اپنے بیٹے اور جانشیں سلطان محمد کو تعینات کیا۔ مغلوں سے لڑتے ہوئے سلطان محمد کی موت ہوگئی جس کے غم میں کچھ عرصہ بعد بلبن بھی مر گیا۔

خلجی خاندان میں سے سلطان علاء الدین ان پڑھ ضرور تھا مگر اس کے اندر سلطنت کرنے کی پوری لیاقت تھی، مغلوں کی یورش کم ہو چکی تھی اب اس نے فتوحات کی جانب توجہ دی اور اس نے کشمیر اور نارتھ ایسٹ کو چھوڑ کر تقریباً پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا، اس کی فتوحات کا علم گجرات، دکن، راس کماری جیسے دور دراز مقامات تک لہرانے لگا۔ موجودہ یوپی جو دہلی سے متصل ہے تقریباً پوری کی پوری اس نے فتح کر لی تھی۔ سلطان علاء الدین کا عہد حکومت 1299 عیسوی تا 1319 عیسوی رہا۔ یہ بات واضح رہے کہ بعض شہر جیسے جونپور، فیروز پور وغیرہ بعد میں سلطان فیروز شاہ تغلق نے بسائے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی موجودہ یوپی کے کچھ حصے مزید بعد میں بسے ہیں۔

4.8.1 دہلی سلطنت کے قیام سے قبل اتر پردیش میں اسلامی آبادی

یہ ایک حیرت کی بات ہے لیکن حقیقت ہے کہ شہاب الدین غوری کے حملہ سے قبل موجودہ یوپی کے کچھ علاقوں میں مسلم آبادی کا ثبوت ملتا ہے۔ شمالی ہند کے اندرونی علاقوں جیسے قنوج، بنارس، بدایوں وغیرہ میں بھی مسلمان آباد تھے۔ مسعودی نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ قنوج میں مسلمانوں کا ایک محلہ تھا۔ بنارس میں مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد تھی بلکہ بنارس کے راجہ کی فوج کافی مسلمان شامل تھے۔ اس کا تذکرہ ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں کیا ہے۔ بدایوں، بہرائچ، بلند شہر اور بلگرام میں بھی مسلمانوں کی موجودگی کے شواہد ملتے ہیں۔

سلطان محمود کی معاصر شخصیت سید سالار مسعود غازی کی ہے۔ 421 ہجری مطابق 1031 عیسوی میں سید سالار نے اپنا سفر شروع کیا اور بہت کم وقفہ میں متعدد فتوحات حاصل کیں۔ اجمیر اور دہلی کے درمیان دھندہ گڑھ، ریواڑی کے قریب راجا کرن پال نے ان پر شب خون مارا، اس کا بدلہ لینے کیلئے انہوں نے راجہ کرن پال کا تعاقب کیا اس نے تجارہ کے راجا تیج پال کے یہاں پناہ لی، لیکن راجہ تیج پال کو بھی شکست ہوئی، راجہ تیج پال مسلمان ہوگیا، اس کا نام جلال خان رکھا گیا۔

نواح دہلی میں میواتیوں کی بستیاں قدیم زمانہ سے آباد ہیں اور سالار کی قسم، سالار کا جھنڈا وغیرہ ان کے یہاں معروف ہیں۔ جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بھی ان سے ہی متاثر ہو کر مسلمان ہوئے ہوں گے۔ سید سالار نے ستر کی (بارہ بنکی) کو اپنا مستقر قرار دے کر گرد و نواح میں اشاعت اسلام کیلئے اپنے ماتحتوں کو بھیجا، خود بھی جہاد کرتے رہے اور 424 ہجری مطابق 1035 عیسوی میں ان کی شہادت ہوئی۔

محمود غزنوی کے بعد غوری حکومت کے قیام سے قبل شمالی ہند میں مسلمانوں کی خاصی تعداد کی موجودگی کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً بہرائچ میں سالار مسعود غازی شہید ہوئے لیکن ان کا پختہ مزار دہلی سلطنت کے ابتدائی ایام میں تعمیر ہوا۔ اس سے قیاس ہے کہ اس وقت بہرائچ میں یقیناً کچھ مسلم آبادی رہی ہوگی جنہوں نے مزار بنایا۔ بعض دیگر مقامات پر بھی اس عہد کے مسلم مزار کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً میران ملہم کا مزار بدایوں میں، خواجہ مجد الدین کا بلگرام میں، گوپامئو میں لال پیر کا مزار، اناؤ میں گنج شہیداں، منیر (بہار) میں امام تقی فقیہہ کا مزار، یہ تمام مزار غوری حملہ سے قبل

کے ہیں۔سید سالار کے تعلق سے مشہور ہیکہ وہ اس علاقہ سے گزرے اور بہرائچ جا کر راجابالادت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔سلطان مسعود کے حملہ سے قبل سرستی نام کی ہندوستانی ریاست میں مسلمان موجود تھے۔

بلندشہر جس کا قدیم نام برن ہے اس کو سلطان محمود غزنوی نے 1019 عیسوی میں فتح کیا تھا، یہاں کا راجہ ہردت مسلمان ہوگیا تھا اوراس کیساتھ دس ہزار مزید افراد مسلمان ہوگئے تھے۔قطب الدین ایبک (متوفی 607 ہجری مطابق 1210 عیسوی) نے 1194 عیسوی میں علی گڑھ فتح کیا اور یہاں کے متعدد لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

فیروزشاہ تغلق ایک مرتبہ نواح دہلی میں شکار کھیل رہا تھا کہ شیر نے اس پر حملہ کیا، شیر کو رائے چھجمل نے ماردیا۔اس کو ناہر بہادر کا خطاب ملا۔بعد میں ناہر بہادر مسلمان ہوگیا۔اس کے اخلاف آج بھی ملک اور خان زادہ کے ام سے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔چوہان راجپوتوں کی ایک شاخ جوالور کے قریب قبصہ منڈ اوراس کے نواح میں آباد تھی وہ بھی فیروزشاہ کے ذریعہ مسلمان ہوئی۔مراۃ الانساب میں مولوی ضیاءالدین علوی نے لکھا ہے کہ راؤ حاجی چاند بکری سمیت 1499 میں فیروشاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے اور شاہی خاندان سے اس کے مصاہرتی تعلقات قائم ہوئے۔بابر کے ساتھ ایک جنگ میں اودھ کا بڑاز مین دار قید ہوگیا، اس نے اسلام قبول کرلیا تو بابر نے اعزاز میں اسکو رہا کردیا۔آرنلڈ نے لکھا ہیکہ یہ خاندان اس وقت اودھ کا سب سے زیادہ بااثر راجپوت مسلم خاندان ہے۔شاہ جہاں کے عہد میں لال خانی مسلمان ہوگئے تھے۔لال خانیوں کے مسلمان ہونے کے بارے میں کئی روایتیں ہیں لیکن معتبر اور صحت سے قریب روایت وہی ہے کہ لال خانی حکمراں سالباھن اپنی اولاد کیساتھ شاہ جہاں کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا تھا۔شاہ جہاں کے دور کا اہم واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہندو مسلمانوں کی آپسی شادی کی ممانعت کردی تھی اس فیصلہ کے بعد چار تا پانچ ہزار ہندجن کی بیویاں مسلمان تھیں مسلمان ہوگئے۔یہ واقعہ بھدنور کا ہے۔

4.8.2 اشاعت اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ

خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ (متوفی 633 ہجری مطابق 1236 عیسوی) کا قیام اگرچہ بنیادی طور پر اجمیر میں رہا لیکن ان کی روحانی فتوحات کا دائرہ پورا ہندوستان تھا۔خواجہ اجمیر کی تبلیغی مساعی کے سلسلے میں آرنلڈ نے لکھا ہے کہ

''خواجہ اجمیر آئے، جہاں کا راجہ ہندو تھا۔اور ملک میں ہرطرف بت پرستی پھیلی ہوئی تھی۔یہاں پہنچنے کے بعد جس ہندو کو آپ نے سب سے پہلے مسلمان کیا وہ راجہ کا جوگی گرو تھا، رفتہ رفتہ اس کی مریدوں کی ایک جماعت آپ کے پاس جمع ہوگئی۔جنہوں نے آپ کی تعلیم وتلقین سے بت پرستی چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیا۔آپ کی شہرت سن کر بہت سے ہندو اجمیر آئے اور آپ کی ترغیب سے مسلمان ہوگئے۔روایت ہے کہ اجمیر جاتے ہوئے دہلی کے مقام پر ٹھہرے تو وہاں آپ کے ہاتھ پر 700 ہندوؤں نے اسلام قبول کیا''

سیرالاولیاء کے مولف امیر خورد کرمانی (متوفی 770 عیسوی) جس نے خواجہ کی وفات کے محض 100 برس بعد حالات کا بچشم خود معائنہ کیا وہ آپ کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"ان (خواجہ اجمیری) کی دوسری کرامت یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے پورے ہندوستان میں کفر وبت پرستی کا راج تھا اور ہند کا ہر ایک سرکش انا ربکم الاعلی کا دعوی کرتا تھا۔اور اپنے آپ کو اللہ تعالی کا شریک سمجھتا تھا اور وہ سب پتھر، ڈھیلے، درخت، چوپایوں اور گائے اور اس

کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر کی تاریکی سے ان کے دلوں کے تالے مضبوط ہو رہے تھے۔"

داراشکوہ نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ اجمیری کی آمد کی وجہ سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اگر صوفیانہ خوش اعتقادی کو راہ دی جائے تو بعض روایتوں کے بقول 90 لاکھ افراد آپ کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔

خواجہ بختیار کاکی کے ہاتھوں پر قبول اسلام کے سلسلے میں روایتیں نہیں ملتی ہیں۔ ان کے مرید حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے ہاتھوں راجپوتوں کی کئی برادریوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن ان کا دائرۂ عمل پنجاب کا علاقہ تھا۔ حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے مرید حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھوں پر بھی تبلیغ اسلام کے واقعات نہ کے برابر ملتے ہیں لیکن ان کے دل میں اس کی تڑپ ضرور تھی کہ غیر مسلم مسلمان ہو جائیں، ان کا تجربہ اور احساس یہ تھا کہ کہنے سننے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا ہاں اگر ان کو کسی مرد صالح کی صحبت نصیب ہو جائے تو اس کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے گا۔

شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی متوفی (1140 ہجری مطابق 1727 عیسوی) کی فکر کا محور اشاعت اسلام تھا۔ انہوں نے خود بھی اس کیلئے کوشش کی اور اپنے مریدوں کو اس جانب متوجہ کیا۔ ان کے مکتوبات اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کی نصیحت سے بھرے پڑے ہیں۔ ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں

"ہر حال میں کلمۃ الحق کی سربلندی کیلئے کوشش کیجئے اور مشرق سے مغرب تک ہر جگہ اسلام حقیقی قائم کیجئے" ایک دوسرے مکتوب میں وہ لکھتے ہیں "اب یہ ضروری ہے کہ جہاں رہیں، اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جدوجہد کریں اور اس راہ میں جان و مال کی قربانی دیں۔ اپنے ایک مرید کو تاکید کرتے ہیں کہ جو لوگ پوشیدہ طور پر مسلمان ہو گئے ہیں اب وہ اپنے اسلام کا اظہار بھی کریں۔

"بھیا یادرام اور دوسرے بہت سے ہندو اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن اپنے اہل قبیلہ سے اسلام پوشیدہ رکھتے ہیں۔ میرے بھائی اس کا اہتمام کیجئے کہ یہ عظیم الشان کام ظاہر ہو جائے"۔ ان کے علاوہ بھی بہت سارے صوفیائے کرام نے یوپی میں دعوت اسلام کا اہتمام کیا اور ان کی کوششوں سے مقامی آبادی مسلمان ہوئی۔

4.9 خلاصہ

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی شہرت یوں تو فاتحانہ ہے لیکن بعض تاریخی مصادر یہ بھی بتاتے ہیں کہ محمود غزنوی کے حملوں سے قبل شمالی ہند میں متعدد مسلم آبادی موجود تھی۔ محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کے دوران ملتان بھی فتح کیا تھا جو پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد سندھ میں متعدد حکومتیں قائم ہیں لیکن شمالی ہند کی طرف ان میں سے کسی نے توجہ نہیں دی، سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر متعدد حملے ضرور کئے لیکن اس کا مقصد سلطنت کا قیام نہیں بلکہ انند پال کا ساتھ دینے والے راجوں کی گوشمالی اور ہندوستان کی دولت سے اپنے خزانے کو بھرنا تھا۔ غزنی سلطنت کے زوال کے بعد شہاب الدین غوری نے شمالی ہند کی جانب توجہ کی اور لاہور کو فتح کرنے کے بعد دہلی کو بھی فتح کیا۔ دہلی فتح کرنے کے بعد شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو دہلی میں اپنا گورنر مقرر کیا، یہاں سے دہلی اور شمالی ہند میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی اور خاندان غلاماں سے ہوتے ہوئے مختلف خاندان دہلی کے تخت پر جلوہ گر ہوئے۔ ان حکمرانوں نے نہ صرف دہلی بلکہ

آس پاس کے علاقے کی فتوحات پر بھی پوری توجہ دی۔ شہاب الدین غوری کے ایک غلام سپہ سالار بختیار الدین خلجی نے نہ صرف بہار پر جو دہلی سے کافی دور ہے چڑھائی کر کے فتح حاصل کی بلکہ اس نے اپنی فتوحات کا علم آسام تک لہرایا اور کامروپ کو بھی زیرنگیں کیا، اس کا حوصلہ تو یہ تھا کہ وہ اس راستے سے تبت پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن مرکز سے دوری، دشوار راستے اور جنگلی قبائل کی آویزش جیسی وجوہات نے اس کو ناکام کیا لیکن اس کے باوجود اس کی ہمت مردانہ کی داد انگریز مورخین نے بھی دی ہے۔

پنجاب پر تو پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا، بہار بھی شہاب الدین غوری کے دور میں ہی فتح ہو گیا اور بختیار الدین خلجی نے ہی بنگال پر بھی دھاوا بولا اور بنگال کے کچھ حصوں کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد مختلف سلاطین کے دور میں فتوحات کا دائرہ بڑھتا رہا۔ ان فتوحات کا دائرہ بڑھنے سے بڑا کام یہ ہوا کہ جہاں بھی کوئی قلعہ یا شہر فتح ہوا تو کچھ مسلمانوں کو انتظامی اور سپاہیانہ ذمہ داری انجام دینے کیلئے رکھا گیا اس طرح وہاں گویا ایک مسلم آبادی بس گئی، ان فتوحات کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ صوفیائے کرام کیلئے راہ ہموار ہو گئی کہ وہ بلاخوف وخطر تبلیغی خدمات انجام دیں۔

صوفیائے کرام نے پنجاب، بنگال، بہار میں زبردست تبلیغی خدمات انجام دیں، آج ان علاقوں میں جو مسلمان ہمیں نظر آتے ہیں یہ سب ان کی ہی کاوشوں اور جانکاہیوں کا ثمرہ ہے۔

پنجاب میں شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پیمانے پر اشاعت اسلام کا کام انجام دیا اور متعدد برادریاں مکمل طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔ بنگال میں شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ جلال الدین مجرد نے بھی زبردست انداز میں تبلیغی خدمات انجام دیں، اس کے علاوہ بنگال کے غازی بابا حضرت نے بھی متعدد مقامات پر اشاعت اسلام کا نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ بہار میں یوں تو صوفیائے کرام کی تبلیغی مساعی کا کوئی بڑا نمونہ ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن بنگال کی اشاعت میں جہاں مورخین نے لکھا ہے کہ بدھ مذہب وہاں کا عوامی مذہب تھا اس لئے وہاں اشاعت اسلام کے کام میں صوفیائے کرام کو زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، یہی بات بعینہ بہار کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ بہار تو بدھ مذہب کا علمی فکری اور مذہبی مرکز تھا ایسے میں بہار کے بودھوں نے بنگالی حکمرانوں کے ظلم وستم سے نجات پانے کیلئے اور اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر بڑے پیمانہ پر اسلام قبول کیا ہوگا۔

اتر پردیش کو دہلی سے قربت کا بڑا فائدہ حاصل ہوا، متعدد بزرگوں نے جو بخارا، سمرقند، ماوراء النہر اور شام ومصر سے ہندوستان آئے، دہلی سے قربت کی وجہ سے یوپی کے علاقوں میں سکونت اختیار کی۔ ان بزرگوں نے بھی اشاعت اسلام کا کام بڑے پیمانہ پر انجام دیا جس کی وجہ سے آج یوپی میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد ہمیں نظر آتی ہے۔

4.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1. بہار اور اتر پردیش میں اشاعت اسلام میں صوفیاء کا کیا کردار تھا؟

2. بنگال میں اسلام کی تبلیغ میں صوفیاء کرام کی مساعی کیا رہیں؟

3. پنجاب میں اسلامی دور اور صوفیائے کرام کی تبلیغی مساعی پر اپنی معلومات تحریر کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے:

1. دہلی سلطنت کے قیام سے قبل اتر پردیش میں مسلم آبادی کہاں کہاں تھی؟

2. بنگال کے غازی بابا کون تھے اور ان کی کیا خدمات رہیں؟

3. یوپی میں اشاعت اسلام میں صوفیاء کے کردار پر روشنی ڈالئے۔

4.11 سفارش کردہ کتابیں

1. آب کوثر — شیخ محمد اکرام

2. دعوت اسلام — آرنلڈ، ترجمہ عنایت اللہ

3. ہندوستان اسلام کے سائے — شیخ عابد علی وجدی

4. تاریخ اشاعت اسلام — شیخ اسماعیل پانی پتی

5. دائرۃ المعارف الاسلامیہ اردو — زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور

6. برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ — اشتیاق حسین قریشی

بلاک:2 دہلی سلطنت

فہرست

کچھ اس بلاک کے بارے میں

عہد وسطی کے اندر ہندوستان میں ایک مضبوط اور وسیع سلطنت قائم ہوئی جو تاریخ میں دہلی سلطنت کہلاتی ہے۔ تقریبا سوا تین سو برس یہ سلطنت باقی رہی۔ اس دوران پانچ خاندانوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ ہندوستان کے اندر سینکڑوں برس کے بعد ایسی مضبوط اور اتنی بڑی حکومت قائم ہوئی تھی جس سے ہندوستانی عوام کو امن وسکون حاصل ہوا اور ملک کے اندر خوشحالی عام ہوئی۔ دہلی سلطنت کے دوران تمدنی ترقیات کے بڑے بڑے کام انجام پائے، خوبصورت اور مضبوط عمارتیں تعمیر کی گئیں، نئے نئے شہر بسائے گئے، طرح طرح کی صنعتوں کو فروغ دیا گیا، علم وادب کے ادارے قائم ہوئے، مختلف موضوعات پر اہم کتابیں تصنیف ہوئیں، کاشتکاری اور آب پاشی پر بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ عوام کی اخلاقی تربیت اور سماجی برائیوں کے خاتمہ کے لئے کوششیں کی گئیں۔ مالگذاری اور بازار کی نرخ بندی کے نئے نئے تجربات کئے گئے۔ فوجی اور دفاعی نظام کے میدان میں کافی بہتری لائی گئی، عدالتی نظام کو آسان اور پختہ بنایا گیا۔ شاہراہیں بنائی گئیں، سرائے خانوں اور مسافر خانوں کی تعمیر کر کے عوامی سہولیات کا انتظام کیا گیا، ڈاک کے نظام کو تیز رفتار اور چست بنایا گیا، حکومتی نظم ونسق میں پختگی اور بہتری لائی گئی۔ غرض ہندوستان کے اندر یہ پہلی ایسی متحدہ حکومت تھی جو اشوک اور ہرش کے بعد اتنی مضبوطی اور وسعت کے ساتھ قائم ہوئی تھی اور جس نے زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے نقوش ثبت کئے اور تہذیب وتمدن کی نئی تاریخ رقم کی۔

دہلی سلطنت کا یہ دور تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس وقت عالم اسلام کے اندر تہذیب وتمدن کے قدیم مراکز ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ بسے شہر ویران اور گھنی آبادیاں سنسان بنادی جارہی تھیں، بغداد اور مشرق کے دوسرے بارونق شہروں پر منگولوں کے حملہ سے سینکڑوں برس کی تہذیب وتمدن کی عالیشان عمارتیں زمین بوس اور علمی وفنی ترقیات کے خزانے دریا برد اور نذر آتش ہو رہے تھے۔ ایسے ہمت شکن حالات میں دہلی کی سرزمین پر ایک مضبوط حکومت کا قیام امید اور روشن مستقبل کی ایسی شمع بن گئی تھی جس کی روشنی کی طرف ہر چہار جانب سے اہل علم وفن اور ماہرین کھنچے چلے آرہے تھے، اور دہلی اور ملک کے دوسرے شہر رشک ارم بنتے جارہے تھے۔

اسلامی مطالعات کے طالب علموں کے لئے بھی دہلی سلطنت مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔ گو کہ ہندوستان کی سرزمین کے ساتھ اسلام اور دیگر مسلم عربوں کا تعلق بالکل ابتدائے اسلام میں یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں قائم ہو گیا تھا، مغربی اور جنوب مشرقی ساحلی علاقوں میں مسلم آبادیوں کے علاوہ شمال مغرب کے علاقے سندھ اور اس کے اطراف میں مسلم حکومت قائم ہو گئی تھی، جو سیاسی نشیب وفراز کے ساتھ تین صدیوں تک باقی رہی، لیکن شمالی اور مشرقی ہند نیز جنوب کے علاقوں تک اسلام کی آمد میں پانچ صدیاں لگ گئیں۔ اس دوران کچھ طالع آزما افراد ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں آندھی طوفان کی طرح آئے لیکن اسی طرح واپس چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور ٹکڑیوں میں بٹی اور آپس میں لڑتی بھڑتی چھوٹی ریاستوں کو ایک متحدہ ومضبوط ہندوستان کی شکل دی اور پھر اس کی تعمیر وترقی اور خوشحالی کے لئے تن من دھن لگا دئے وہ محمد شہاب الدین غوری اور اس کے وہ وفادار وجانباز غلام تھے جن سے ہندوستان کی غلام حکومت یعنی خاندان غلاماں کا

آغاز ہوتا ہے۔اور جو دہلی سلطنت کے پرعظمت نام اور شہرت کے بقائے دوام سے مزین ہے۔اس سلطنت کے زیر سایہ امن و عافیت کے ماحول میں علم وادب،شعروشاعری،فنون وحکمت،تصوف اور صنعت وحرفت کے ماہرین نے اپنی بہترین خدمات سے ہندوستان کو مالا مال کیا۔ طلبائے اسلامیات کے لئے اس سلطنت میں دلچسپی کا ایک خصوصی میدان یہ بھی ہے کہ یہاں غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے رہن سہن کی ایک نئی روش قائم ہوئی۔مسلمان اگرچہ حاکم تھے لیکن عوام کی اکثریت ہندوؤں کی تھی اور حکومت وسلطنت میں اشتراک کے ساتھ مختلف معاملات میں ان کے ساتھ میل جول،رہن سہن اور قانونی معاملات میں نئے موقف طے ہوئے۔سندھ میں اگرچہ ایسا ایک تجربہ ہو چکا تھا،لیکن ہندوستان کے وسیع علاقے میں یہ پہلی مثال قائم ہو رہی تھی۔یہ بات قابل فہم ہے کہ باہر سے آنے والی چھوٹی سی اقلیت کے لئے یہاں حکومت قائم کر کے صدیوں تک امن وامان سے رہنا اور ملک کی خوشحالی میں کامیابی کی تاریخ رقم کرنا مقامی غیر مسلموں کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے،محبت وملاپ اور حسن رواداری نیز انصاف وتعاون کی جو خوبصورت مثالیں دہلی سلطنت کے اندر ملتی ہیں،ان سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ تکثیری سماج کے اندر اسلام کے روادارانہ موقف کا بہترین اظہار یہاں ہوتا رہا ہے۔

زیرنظر بلاک میں دہلی سلطنت کی ان ہمہ جہتی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس موضوع پر انگریزی اور دوسری زبانوں میں کافی کچھ لکھا گیا ہے،اس زمانہ میں چونکہ فارسی زبان رائج تھی اور اہل علم فارسی کے علاوہ عربی زبان میں تصنیفی کام انجام دے رہے تھے،ان دونوں زبانوں میں اس دور کی تاریخ اور ادب کا سرمایہ موجود ہے۔خوشی کی بات ہے کہ ان میں سے بعض کا اردو زبان میں ترجمہ بھی دستیاب ہے۔زیرنظر بلاک گو کہ درسی مواد کے طور پر تیار کیا گیا ہے،لیکن امید کی جاتی ہے کہ اس سمت میں یہ ایک مفید نقش ثابت ہوگا۔

اکائی۔5   دہلی سلطنت کا قیام اور سلاطین

اکائی کے اجزاء

5.1 مقصد

1206 میں قطب الدین ایبک کے ذریعہ دہلی میں قائم ہونے والی سلطنت بتدریج ہندوستان کے بیشتر علاقوں تک وسیع ہوگئی اور

پہلے غلام خاندان پھر خلجی پھر تغلق، پھر سید خاندان اور آخر میں لودھی خاندان نے اس ملک پر حکومت کی۔ سوا تین سو برس تک قائم رہنے والی اس دہلی سلطنت نے ملک کو ایک مضبوط اور مستحکم حکومت دی۔ امن و امان عام کیا، اور عوام کی خوشحالی کے لئے طرح طرح کے منصوبے نافذ کئے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ دہلی سلطنت کے نام سے قائم ہونے والی یہ حکومت کس پس منظر میں اور کن لوگوں کے ذریعہ قائم ہوئی۔ مختلف خاندانوں کے وہ کون کون سے سلاطین رہے جنھوں نے یہاں حکمرانی کی۔ ان کے عہد میں ملک کی کیا صورت حال تھی اور کہاں کہاں تک دہلی سلطنت کے دائرے پہنچ گئے تھے۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دہلی سلطنت میں حکومت کی منتقلی کس طور پر انجام پاتی تھی، اور سلطنت کی پوری مدت میں حکومت کن نشیب و فراز سے گذرتی رہی۔ آپ کو مطالعہ کے دوران اس بات کا بھی اندازہ ہوگا کہ سلطنت دہلی کے سلاطین نے ہندوستان کو کیا کچھ عطا کیا اور یہاں کی عوام اس سلطنت سے کس طرح مستفید ہو پائی اور ان کی خوشحالی و ترقی کے لئے کیا کیا اقدامات کئے گئے۔

5.2 تمہید

افغانستان کے شہر غزنہ کے قریب علاقہ غور میں غوری حکومت قائم ہوئی جس نے بتدریج غزنوی حکومت کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے مشرق کی جانب قدم بڑھائے۔ اس حکومت کا ایک فرمانروا غیاث الدین محمد ہوا ہے، اس کا چھوٹا بھائی اس کا شریک سلطنت ہوا، جو محمد شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ملتان اور لاہور سے آگے بڑھ کر اجمیر اور دہلی کے آس پاس تک کے علاقوں کو فتح کیا اور اپنے وفادار غلام جرنیلوں کو وہاں مقرر کیا، ان ہی غلام فوجی سپہ سالاروں میں ایک کا نام قطب الدین ایبک تھا جسے شہاب الدین غوری نے اندر پرست دہلی کا گورنر مقرر کیا تھا۔ 1206 میں غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اس طرح دہلی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ ایبک کے بعد کئی غلام سرداروں اور ان کے خاندان کے افراد نے حکومت کی۔ 85 برس کی حکومت کے بعد 1290 میں اس خاندان کی جگہ خلجی خاندان نے لے لی اور جلال الدین فیروز خلجی کے ذریعہ خلجی خاندان کی حکومت شروع ہوئی جو 1320 تک 30 برس رہی۔ اس خاندان کے زوال کے بعد غیاث الدین تغلق کے ذریعہ تغلق خاندان کی حکومت شروع ہوئی، 93 برس کی حکومت کے بعد 1413 میں تغلق خاندان کا خاتمہ ہوا اور سید خاندان نے اس کی جگہ لے کر 1451 تک یعنی 37 برس حکومت کی۔ دہلی سلطنت کا آخری حکمراں خاندان لودھی تھا جسے بہلول لودھی نے قائم کیا اور 75 برس کی حکومت کے بعد آخری لودھی حکمراں ابراہیم لودھی کی بابر کے ہاتھوں شکست کے بعد 1526 میں یہ حکومت ختم ہوگئی، اور اس طرح پانچ خاندانوں کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ دہلی سلطنت ختم ہوگئی، اور مغلیہ سلطنت نے اس کی جگہ لے لی۔

زیر نظر اکائی میں دہلی سلطنت کے قیام کی تفصیل اور یہاں حکومت کرنے والے اہم حکمرانوں کی سیاسی و تمدنی کارکردگیوں کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

5.3 سلطنت کا قیام

غزنوی خاندان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جب غوریوں نے طاقت حاصل کر لی تو وہ اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کرنے لگے، غور کے علاء الدین حسین جہاں سوز کے بعد سیف الدین حکمراں ہوا، اس کے بعد اس کا چچا زاد بھائی غیاث الدین اس کا جانشین ہوا، شہاب الدین محمد

غوری جواس کا چھوٹا بھائی تھا شریک سلطنت بنا۔ شہاب الدین غوری نے اپنی ترک تازیوں کا میدان مشرق کو بنایا، پہلے اس نے 1175 میں ملتان پر حملہ کیا، پھر اوچ کو فتح کیا۔ 1177 کے گجرات پر حملہ میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، 1186 میں اس نے لاہور کو فتح کیا اور 1189 میں بھٹنڈہ پر بھی قبضہ کرلیا، یہاں سے وہ غزنی واپس لوٹ رہا تھا تو دہلی کا راجہ پرتھوی راج چوہان مزاحم ہوا۔ ترائین کے میدان میں 1191 میں چوہان کے ساتھ غوری کا مقابلہ ہوا جس میں غوری نے شکست کھائی۔ اگلے سال 1192 میں وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا اور اسی ترائین کے میدان میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دی۔ اس طرح دہلی اور اطراف کا علاقہ شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گیا۔ اس جنگ میں چوہان کی قوت بالکل ختم ہوگئی اور غوری نے اس کے بعد ہانسی، کہرام اور سرستی وغیرہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ غوری اس کے بعد غزنیں واپس چلا گیا، البتہ اس نے دہلی پر اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک کو مقرر کیا، جس نے 1194 میں علی گڑھ کو بھی فتح کرلیا۔ 1195 میں غوری دوبارہ ہندوستان آیا، اس بار قنوج کے راجہ جے چند سے اس کا مقابلہ ہوا، اٹاوہ کے پاس راجہ نے شکست کھائی، اور بنارس تک کا ملک غوری کے قبضہ میں آ گیا۔ 1206 میں شہاب الدین غوری کھوکھروں کا فساد ختم کر کے غزنیں واپس جارہا تھا کہ راستہ میں کسی اسماعیلی کھوکھر نے اس پر حملہ کر کے شہید کر ڈالا۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد قطب الدین نے 1206 میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اس نے پہلے دہلی کو اپنا مرکز بنایا، پھر جلد ہی لاہور منتقل ہوگیا، اور اسے اپنا پایہ تخت بنالیا۔ اور اس طرح دہلی سلطنت کی بنیاد پڑ گئی' اور قطب الدین ایبک دہلی سلطنت کا بانی قرار پایا۔ 1210 تک ایبک نے اپنے چار سالہ دور میں سلطنت کے استحکام اور وسعت پر توجہ دی۔ ساتھ ہی اپنے آقا شہاب الدین غوری کی طرح خود اس نے بھی اپنے وفادار اور قابل غلاموں کی عمدہ تربیت کی، جنھوں نے دہلی سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے میں بہترین کارنامے انجام دئے۔

دہلی سلطنت کا پہلا حکمراں خاندان قطب الدین ایبک کا خاندان تھا، اسکے بعد ایبک کے غلام شمس الدین التمش اور اس کے افراد خاندان نے حکومت کی، اس خاندان کے بعد التمش کے غلام غیاث الدین بلبن اور اس کے خاندان کے افراد نے حکومت کی۔ ان غلاموں کی وجہ سے دہلی سلطنت کے اس پہلے حکمراں خاندان کو خاندان غلاماں بھی کہتے ہیں۔ غلام خاندان کے بعد یکے بعد دیگرے خلجی، تغلق، سید اور لودھی خاندانوں نے تین سو برس تک اس حکومت کو برقرار رکھا۔ یہ سارے حکمراں سلطان کہلاتے تھے، اسی لئے یہ پوری حکومت سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی، اور شہر دہلی جو اس سلطنت کا پایہ تخت رہا، اس کی نسبت سے دہلی سلطنت کہلاتی رہی۔

5.4 غلام خاندان

دہلی سلطنت کا پہلا حکمراں خاندان غلام خاندان کہلاتا ہے۔ شہاب الدین غوری کا وفادار اور قابل اعتماد جرنیل قطب الدین ایبک نہ صرف دہلی سلطنت کا بانی ہے، بلکہ غلام خاندان کی حکومت کی بنیاد بھی رکھنے والا وہی ہے۔ چونکہ یہ غلام سلطان شہاب الدین سے وابستہ تھے جو معزالدین نام رکھتا تھا، اس لئے یہ معزی بھی کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے 1206 سے 1290 تک تقریباً ایک صدی ہندوستان پر حکومت کی، اور اس قابلیت کے ساتھ حکمرانی کی کہ آئندہ دو صدیوں تک دہلی سلطنت برقرار رہی۔ اس خاندان کے پہلے حکمراں قطب الدین ایبک نے اور اس کے جرنیلوں نے تقریباً پورے شمالی ہندوستان یعنی لاہور، سندھ، سرستی، کہرام، ہانسی، دہلی، اجمیر، قنوج اور بنارس سے لے کر بہار و بنگال تک

کے علاقوں پر مسلم سلطنت کا پرچم لہرایا۔ ان علاقوں میں حکومت کا مستحکم نظام اور امن وامان قائم کردیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غیر مسلم اکثریت کے دلوں کو فتح کرلیا۔ ایبک نے ہی علم وادب کی شاندار محفلیں آراستہ کیں اور اس کا اس قدر اہتمام کیا کہ دنیا بھر کے باکمال اور اہل فن لاہور اور دہلی کی طرف کھنچ کر آنے لگے۔ اس خاندان میں کل دس سلاطین ہوئے، جن میں زیادہ شہرت وناموری اور سلطنت کے استحکام میں حسن کارکردگی ایبک، التمش، رضیہ سلطانہ اور غیاث الدین بلبن کے حصہ میں آئی۔ ذیل کی سطروں میں ان کا مختصر تعارف دیا جارہا ہے۔

5.4.1 قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک ترکستان میں پیدا ہوا تھا، بچپن میں اسے غلام کے طور پر نیشاپور میں فروخت کردیا گیا تھا۔ یہ قطب الدین کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بچپن میں ہی علم وفضل سے آراستہ گھرانہ ملا۔ نیشاپور کے قاضی فخر الدین کوفی نے قطب الدین کو خریدا، قاضی صاحب امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے تھے اور اپنے علاقہ کے حاکم بھی تھے، ان کا گھرانہ علم وفضل سے معمور تھا، انھوں نے ایبک کو بھی اچھی دینی تعلیم دی، اور اپنے بچوں کی طرح اس کی تربیت پر توجہ دی۔ ایبک نے کلام پاک کی ایسی تعلیم پائی کہ قرآن خواں کے نام سے مشہور ہوگیا، اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا اور دوسرے آداب وکمالات میں اچھی مہارت حاصل کرلی، نیز سواری اور تیراندازی کی بھی تعلیم پالی۔ قاضی فخر الدین کی وفات کے بعد ان کے لڑکوں نے قطب الدین کو کسی تاجر کے ہاتھ فروخت کردیا، جس سے سلطان معز الدین غوری نے اسے بڑی قیمت دے کر خرید لیا۔ اس کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی، اس لئے وہ قطب الدین ایبک شل (ٹوٹی انگلی) کہلانے لگا، اور آگے چل کر صرف ایبک سے مشہور ہوگیا۔ قطب الدین ابتداء سے فیاض طبیعت کا مالک تھا، اپنے آقا سے ملنے والے انعامات کو بھی ادنی غلاموں میں تقسیم کردیا کرتا تھا۔ اس کی بلند حوصلگی اور فیاضی سے خوش ہوکر سلطان شہاب الدین نے اسے اپنے امراء میں شامل کرلیا، پھر بتدریج ترقی کرتا ہوا وہ امیر آخور کے عہدہ پر فائز ہوگیا، اپنے آقا کے ساتھ فوج کشی میں بھی وہ اپنی شجاعت کی خوب داد دیا کرتا تھا۔

1192ء / 587ھ میں جب شہاب الدین اجمیر اور دہلی کو فتح کرنے کے بعد 1193 میں غزنی واپس ہونے لگا تو اس نے قطب الدین کو کہرام اور سامانہ کا اقطاع دار اور ہندوستانی مقبوضات کا نائب مقرر کردیا۔ ہندوستان میں قطب الدین کی انتظامی اور فوجی سرگرمیوں کا یہیں سے آغاز ہوتا ہے۔ اس نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور نہ صرف مقبوضہ علاقوں کا اچھا انتظام کیا اور ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا، بلکہ آگے بڑھ کر میرٹھ اور علی گڑھ کو بھی فتح کرلیا۔ 1193 میں شہاب الدین نے اسے غزنین بلا کر اس کے کارناموں کی داد دی، اور انعامات سے نوازا، غزنین سے واپس آکر قطب الدین نے اپنی انتظامی اور فوجی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ 1194 میں سلطان شہاب الدین غوری قنوج اور بنارس کے راجہ جے چند سے مقابلہ کے لئے ہندوستان آیا تو قطب الدین نے اس موقع پر نہ صرف فوجی ساز وسامان بہم پہنچائے بلکہ غوری کی فوج کا پیشرو لشکر بن کر اس مقابلہ میں بہترین کارنامے انجام دئے۔ سلطان شہاب الدین نے اس جانبازی سے متاثر ہوکر اسے اپنا فرزند بنایا اور فرمان فرزندی عطا کیا۔ بنارس اور قنوج کی فتح سے شمالی ہند کا بڑا علاقہ غوری کے ماتحت آگیا۔ اس کے ساتھ ہی قطب الدین کے ایک فوجی سالار محمد بن بختیار خلجی نے بہار اور بنگال میں اپنی فتوحات کا پرچم لہرایا اور 1202 میں اس نے تبت کے پہاڑی علاقوں تک اپنی ترک تازیاں پہنچادیں۔ گوکہ تبت کے دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں اسے کافی فوجی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا لیکن بہار اور بنگال کے علاقے تک اس کی بلند ہمتی نے دہلی سلطنت کی وسعت قائم کردی اور تقریبا تمام شمالی ہندوستان پر مسلم سلطنت کی عملداری قائم ہوگئی۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد غزنیں میں سلطان محمود بن غیاث الدین تخت کا وارث بنا تو اس نے قطب الدین کو سلطان کا خطاب، امارت بادشاہی اور آزادی کا فرمان بھیجا۔ قطب الدین اپنے آقا کے خاندان سے ملنے والی اس خلعت اور فرمان آزادی کو حاصل کرنے کے لئے دہلی سے آگے بڑھ کر لاہور آیا اور اس اعزاز کا استقبال شایان شان انداز سے کیا۔ پھر لاہور میں ہی وہ آزاد سلطان کے طور پر ذی قعدہ 602ھ مطابق جون 1206ء میں تخت نشین ہوا۔ اور ہندوستان کی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

قطب الدین ایبک نے لاہور کو مرکز بنا کر چار برس حکومت کی، اس مختصر مدت میں اس نے اپنی مقبوضات کے اندر بہترین نظم و نسق قائم کر دیا۔ ایبک جس طرح حوصلہ مند فوجی تھا، اسی طرح دور اندیش اور قابل منتظم بھی تھا۔ اپنی سلطنت میں اس نے امن و امان قائم کر دیا، ڈاکہ اور لوٹ مار کا خاتمہ کر دیا، وہ بڑا منصف مزاج اور عطا پرور تھا۔ مظلوموں کی دادرسی اور انصاف کا قیام اس نے اپنا فرض منصبی سمجھا اور عدل نوازی کی بہترین روایت قائم کر دی۔ داد و دہش اور انعامات دینے میں وہ بڑا فراخدل واقع ہوا تھا۔ اپنی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے وہ لکھ بخش سے مشہور ہو گیا تھا، علمی اور ادبی سرپرستی اس نے دل کھول کر کی۔ چنانچہ اس کے دربار سے کئی بڑے شعراء وابستہ رہے اور اہل فضل و کمال کی قدردانی ہوتی رہی۔ قطب الدین ایبک اوصاف حمیدہ کا حامل تھا۔ مذہب کا احترام اور شریعت نوازی اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ تخت نشیں ہونے کے بعد غیر شرعی وصولی بند کرا دی، مسلمانوں کی زندگی کی تشکیل شرعی نہج پر کرنے کی کوشش کی، سنت کی پیروی کرنے کا ماحول بنایا اور تمام نامشروع بدعتیں دور کر دیں۔ اس نے اجمیر اور دہلی میں مسجدیں بنوائیں۔ دہلی کا قطب مینار اسی کی یادگار ہے، جو دراصل مسجد قوت الاسلام کے مینارہ کے طور پر بنوایا گیا تھا۔ قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑا اور 1210 میں وفات پائی۔

5.4.2 شمس الدین التمش

صرف چار سال کی حکومت کے بعد اچانک قطب الدین ایبک کی وفات ہو گئی تھی، اس کے انتقال پر امراء نے اس کے لڑکے آرام شاہ کو تخت نشیں کیا۔ یہ وقت حکومت کے لئے بڑا مشکل اور چیلنجز سے بھرا تھا، ہندوستان میں ابھی نئی حکومت کے قیام پر مختصر عرصہ ہی گذرا تھا۔ آرام شاہ نئی صورت حال کو پوری طرح قابو میں نہیں رکھ سکا، اور جگہ جگہ علاقائی امیروں نے خود مختاری کے خواب دیکھنے شروع کر دئے۔ داخلی اور بیرونی دونوں سطحوں پر کئی چیلنجز پیدا ہو گئے تھے۔ قطب الدین ایبک کا ایک قابل اور با اعتماد غلام شمس الدین التمش تھا، اپنی فوجی صلاحیت، اعلی انتظامی قابلیت اور جرأت و حوصلہ مندی کی وجہ سے قطب الدین ایبک نے اسے اپنا داماد بنایا تھا، اور اس کے کارناموں سے خوش ہو کر اسے پروانہ آزادی بھی عطا کر چکا تھا۔ وہ گوالیار کا امیر، پھر برن پھر بدایوں کا مقطع رہ چکا تھا۔ ملک کی نئی صورت حال میں وہ امیروں کے مشورہ پر جلد دہلی آیا اور اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ لاہور کی شاہی فوج کے ساتھ مقابلہ میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک برس سے کم مدت میں ہی آرام شاہ معزول کر دیا گیا۔ التمش بہت سی خوبیوں کا مالک تھا، تاریخوں اور تذکروں میں اسے بہادر سپاہی، بیدار مغز حکمراں، برگزیدہ ولی اللہ اور جلیل القدر اہل علم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ سیاسی ہوشمندی اور سپہ گری کے ساتھ عشق الہی اور علم نوازی میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ وقت کے بزرگوں کی خدمت اور قدم بوسی اس نے اپنا وطیرہ بنائے رکھا، مشائخ کبار نے بھی اس کی شان میں اونچے کلمات ارشاد فرمائے ہیں۔ خواجہ بزرگ اجمیری، خواجہ بختیار کاکی، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ بہاؤ الدین ملتانی، قاضی حمید الدین ناگوری جیسے مشائخ کبار کے ساتھ اس نے گہرے عقیدت مندانہ مراسم رکھے۔ عالم اسلام کے دگرگوں حالات کی وجہ سے وقت کے بڑے بڑے علماء اور اصحاب فضل ہندوستان کا رخ

خاں ہی کے ہاتھوں وہ مارا گیا۔نومسلم خسرو خاں کی اسلام دشمن حرکتوں سے تنگ آکر دیپال پور کے گورنر غازی ملک نے اس کا خاتمہ کردیا۔ خاندان خلجی کا کوئی فرد موجود نہ بچا تھا، نتیجہ حکومت غازی ملک کے خاندان یعنی تغلق خاندان میں منتقل ہوگئی۔ خلجی خاندان میں کل چار بادشاہ ہوئے، اور انھوں نے 1290-1320 تک کل تیس برس حکومت کی۔ جس میں اصل حکومت علاء الدین خلجی کی تقریباً بیس برس رہی۔ اس خاندان میں یہی ایک نامور سلطان گذرا ہے، بلکہ یہ اپنی ناموری میں نہ صرف دہلی سلطنت بلکہ ہندوستان کے چند بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ ذیل کی سطروں میں اس نامور سلطان کے بارے میں پڑھئے۔

5.5.1 سلطان علاء الدین خلجی

علاء الدین خلجی خاندان خلجی کے اولین فرمانروا جلال الدین خلجی کا بھتیجہ اور داماد تھا، اپنے چچا کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا، اور پورے کروفر کے ساتھ طویل عرصہ تک حکومت کی، اس نے حکومت کا مستحکم نظام بنایا، نئے نئے معاشی تجربے کئے، سلطنت کے دائرے کو وسیع کیا اور نئے نئے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کئے، دکن کے علاقہ میں پہلی مرتبہ علاء الدین نے ہی فتوحات کا پرچم لہرایا، فوجی محکمہ کو ترقی یافتہ اور مضبوط بنایا، سامان خوردونوش کی ارزانی کا زبردست انتظام کیا، گو وہ ان پڑھ تھا لیکن اپنی دور اندیشی اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ کامیاب حکمراں ثابت ہوا۔

علاء الدین، جلال الدین کے ایک بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کا بیٹا تھا، اس کی تاریخ پیدائش متعین طور پر معلوم نہیں ہے، بچپن اور جوانی کے ابتدائی حالات پر بھی اخفاء کا پردہ پڑا ہے۔ بچپن میں اسے لکھنے پڑھنے کی تعلیم نہیں مل سکی، البتہ شہسواری، اسلحہ کے استعمال اور کھیلوں کی باقاعدہ تربیت حاصل ہوئی تھی۔ اس کا چچا جلال الدین غیر متوقع طور پر بادشاہ ہوگیا تھا، جب کڑہ میں ملک چھجو نے بغاوت کی تو علاء الدین ہی نے اس بغاوت کو فرو کیا، اور اپنے چچا کو راضی کرکے کڑہ کا گورنر مقرر ہوگیا۔ علاء الدین آٹھ ہزار سواروں کا دستہ لے کر دکن کے دیوگیر پر حملہ آور ہوا، شمالی ہند کی جانب سے دکن کے علاقہ پر یہ پہلا حملہ تھا، علاء الدین نے اس کے لئے زبردست تیاریاں کی تھیں اور پورے عزم و ہمت کے ساتھ دشوار گذار راہوں کو طے کرتا ہوا یہاں پہنچا اور اسے فتح کرنے کے بعد بے انتہا مال و دولت کے ساتھ واپس ہوا۔ دولت کی کثرت اور فوجی قابلیت نے اس کے دماغ پر حکمرانی کا نشہ چڑھا دیا، اس نے تدبیر سے اپنے چچا کو کڑہ بلا کر طے شدہ منصوبہ کے تحت اس کا کام تمام کردیا، اور دولت کا منہ کھول کر امراء کو رام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اس کے سامنے کئی اہم چیلنجز ہیں۔ مغل حملہ آوروں سے ملک کی حفاظت، طاقتور امراء پر غلبہ، ہندو سرداروں کی طرف سے مقابلہ کا خطرہ اور مرکزی اقتدار کی شوکت کی بقاء، چنانچہ اس نے ان چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لئے مستحکم نظم ونسق، طاقتور فوج، مضبوط معیشت، اور اپنے ماتحت قابل اعتماد امراء کی جماعت تیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ دیوگیری پر 1296 میں حملہ اور فتح سے اسے بے اندازہ دولت و مال مل گیا، اور جلال الدین کی حکومت سے غیر مطمئن امراء کا تعاون بھی اسے حاصل ہوگیا، علاء الدین نے اپنے چچا کی نرمی کے نتائج دیکھے تھے کہ نرمی کی وجہ سے کس طرح نظام حکومت درہم برہم ہوگیا' علاء الدین نے اس کے برعکس طریقہ اپنایا۔ 1297 سے 1306 تک اس نے پانچ مرتبہ مغلوں سے مقابلہ کیا اور ان کی یورش و بربادی سے ملک کی کامیاب حفاظت کی اور منگولوں نے علاء الدین کے خوف سے ہندوستان کی طرف رخ کرنے کی جرأت بند کردی۔

علاء الدین نے سلطنت کے استحکام وتوسیع کی طرف توجہ کی، چنانچہ 1299 میں اس نے گجرات پر قبضہ کیا، 1301 میں رنتھمبور کی تسخیر کی، پھر راجستھان کی طرف متوجہ ہوا، 1303 میں چتوڑ کو فتح کیا، 1305 میں مانڈو کو زیر بنایا، 1308 میں سیوان اور 1312 میں جالور کو دہلی

سلطنت میں شامل کیا۔اس طرح راجستھان میں اسے وسیع کامیابی حاصل ہوئی۔

علاء الدین کے سپہ سالار ملک کافور نے 1309 میں دوبارہ دیوگیری پر حملہ آور ہوکر بقیہ خراج کی ادائیگی پر اسے مجبور کیا۔ پھر دو برس کے بعد اس نے تلنگانہ کی کاکتیہ حکومت کو دہلی کے تابع کیا۔ 1311-1310 میں وہ جنوب کے دور دراز مقام رامیشورم تک اپنا پرچم لہراتا چلا گیا۔ اس طرح علاء الدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ وسطی اور جنوبی ہندوستان کی چھوٹی ریاستوں کو دہلی سلطنت کے زیر تسلط بنالیا۔

علاء الدین مذہبی انسان نہیں تھا، اس نے اصول حکومت اپنے خود بنائے۔اس کے دربار میں علماء کو وہ مقام حاصل نہیں تھا جو سابق حکمرانوں کے یہاں انھیں ملتا رہا تھا، لیکن وہ علماء کا احترام کرتا اور ان سے مسائل بھی پوچھتا اور ان کے مشورہ کو قبول بھی کرتا تھا۔ قاضی مغیث سے اس نے غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ، بیت المال کی حیثیت اور اپنی سزاؤں کے بارے میں شرعی احکام پوچھے۔ وہ شیخ محبوب الٰہی کا معتقد تھا اور خواجہ نظام الدین اولیاء سے ملنے کا خواہش مند رہا۔اس نے اپنی حکومت میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا۔ علاء الدین نے یہ محسوس کر کے کہ امراء اپنی نجی محفلوں میں شراب پیتے ہیں اور بے عقلی میں حکومت کے خلاف سازشیں کر سکتے ہیں، اس نے خود بھی شراب چھوڑ دی اور اپنی سلطنت میں شراب ونشہ آور اشیاء کی صنعت اور فروخت پر پابندی لگادی اور لوگوں کو شراب پینے سے منع کر دیا۔

علاء الدین نے معاشی اصلاحات میں بھی دلچسپی لی، اس نے زمینوں کی پیائش کرائی، پیداوار کے تخمینے لگوائے اور اسی حساب سے زمینوں پر ٹیکس مقرر کیے، اس نے مدد معاش دینے کا سلسلہ بند کر دیا، اور ایسی زمینیں سرکاری تحویل میں لے لیں جس سے سرکاری زمینیں جو خالصہ کہلاتی تھیں بڑی تعداد میں حاصل ہوگئیں۔ پیداوار کا ٹیکس غلہ اور اناج کی شکل میں اصول کرایا اور اسے سرکاری گودام میں رکھوا کر قحط کے موقعوں پر اور دوسرے مواقع پر کم قیمت میں فراہم کرایا۔اس نے بازار کے نرخ کی تعیین کرائی اور نہایت سختی سے اس کی پابندی کرائی، جس کی وجہ سے غلے اور اناج بے انتہا سستے ہوگئے۔نرخوں کی نگرانی کے لئے اس نے ایک مارکٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا جو اپنی ٹیم کے ساتھ نرخ پر نظر رکھتا، اور خلاف ورزی کرنے والوں کو نہایت ظالمانہ سزائیں دلواتا۔

علاء الدین ایک کامیاب فوجی تھا، اس نے یہ محسوس کر لیا کہ ایک مستحکم حکومت کی برقراری کے لئے مضبوط اور طاقتور فوج کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ اس نے سرکاری فوج تیار کی، جس کی تقرری براہ راست مرکزی حکومت کرتی اور اسے نقد تنخواہ ادا کی جاتی۔ نقد تنخواہ کا یہ طریقہ بھی علاء الدین کا اختراع تھا، اس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ بھی جاری کیا تا کہ ان کی شناخت رہے، کہا گیا ہے کہ سرکاری رجسٹر میں درج سرکاری فوج کی تعداد چار لاکھ پچھتر ہزار تھی، جن کو تنخواہیں اور غلہ جات کی ادائیگی حکومت کرتی تھی۔

علاء الدین ایک کامیاب بادشاہ اور مدبر منتظم تھا، اس نے ملک کو وسیع اور مستحکم بنایا، سری شہر بسایا، قطبی مسجد میں توسیع کرائی، اور اس میں ایک دروازہ کی تعمیر کرائی جو علائی دروازہ کہلاتا ہے، قطب مینار کے مقابل ایک اور مینار کی تعمیر شروع کرائی جو نامکمل رہ گئی۔ وہ اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن اس کے دربار سے اہل کمال وشعراء وابستہ رہے، امیر خسرو بھی اس دور میں تھے۔

5.6 تغلق خاندان

ملک کی ابتر صورت حال اور بالخصوص خسرو خاں کے اقدامات نے دہلی سلطنت کے امراء کو بے چین کر دیا تھا۔ دیپال پور کے گورنر غازی

ملک نے اس صورت حال میں اقدام کا فیصلہ کیا، کئی ہم خیال امراء کو ساتھ لے کر اس نے دہلی پر حملہ کیا اور خسرو خاں کو شکست دی، ملک کافور، قطب الدین خلجی اور پھر خسرو خاں نے خلجی خاندان کا کوئی فرد زندہ باقی نہ رکھا تھا۔ ناچار غازی ملک نے غیاث الدین تغلق کے لقب سے عصائے سلطنت اپنے ہاتھ میں لی، اور ملک کے انتظامات درست کئے، ایک سال میں امن وامان قائم ہوگیا، اس نے مالگذاری کم کر کے رعایا کو خوشحال بنادیا، اپنے بیٹے محمد جونا کے ذریعہ دکن کی بغاوت ختم کرائی، اور جونا کو ہی دہلی میں نائب بنا کر بنگال کی بغاوت ختم کرنے گیا، واپسی میں دہلی کے باہر استقبال کے لئے بنائے گئے عارضی خیمہ میں اترا تھا کہ خیمہ گرنے سے دب کر مرگیا۔ اس کی صرف چار برس کی حکومت کے بعد محمد جونا بادشاہ ہوا جس نے طویل حکومت کی، اس کا دور بھی نت نئے تجربات اور سرد وگرم حالات سے پر رہا ہے۔ 25 برس کی حکومت کے بعد جب وہ مرا تو اس کا بھتیجہ فیروز شاہ تغلق سریرآرائے سلطنت ہوا اور اڑتیس برس تک امن وسکون کے ساتھ حکومت کر کے رعایا کی خوشحالی اور زیر کنٹرول ملک کے لئے ترقی کے بڑے بڑے اقدامات کئے۔ 1388 میں فیروز تغلق کے انتقال کے بعد 25 برس کے عرصہ میں تخت سلطنت پر اس خاندان تغلق کے چار بادشاہ آئے۔ آخری سلطان محمود شاہ نے ہی کسی قدر طویل دس برس حکومت کی۔ اسی سلطان کے عہد میں تیمور نے دہلی پر حملہ کیا اور شہر کو تباہ کر کے بڑی تعداد میں دولت وغلام لوٹ کر لے گیا۔ 1413 میں خضر خان نے حکومت چھین کر سید خاندان کی حکومت قائم کر دی۔

تغلق خاندان کے سات بادشاہوں نے 93 برس ملک پر حکومت کی۔ اس خاندان کی حکومت اس اعتبار سے یادگار ہے کہ اس دور میں پایہ تخت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کیا گیا، لیکن تجربہ کی ناکامی کے بعد پھر دہلی پایہ تخت بنایا گیا، اسی دور میں وسیع وعریض دہلی سلطنت سے کئی علاقے اس طرح نکلے کہ وہاں خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں، جو ہندوستان کی تاریخ میں اہم رول اور اپنی شاندار روایات رکھتی ہیں۔ ان میں گجرات کی حکومت، دکن کی بہمنی سلطنت، بنگال کی حکومت، جونپور کی شرقی حکومت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تغلق خاندان کے تین بادشاہ غیاث الدین تغلق، محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے بارے میں ذیل کی سطروں میں پڑھیئے۔

5.6.1 غیاث الدین تغلق

غیاث الدین تغلق اسلامی ہندوستان کی مایہ ناز ہستیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے، اس نے ایسی حالت میں اقتدار سنبھالا جب ملک کے حالات انتہائی نازک ہوگئے تھے، نومسلم خسرو خاں اپنے آقا قطب الدین مبارک شاہ خلجی کو قتل کر کے بادشاہ بن بیٹھا تھا، اس نے اپنی قوم کے غیر مسلموں کو بڑی تعداد میں دہلی بلا لیا تھا جنھوں نے اسلامی شریعت اور شعائر کی بے حرمتی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ شیخ محمد اکرام نے آب کوثر میں کیمبرج ہسٹری کا یہ اقتباس اس صورت حال کے بارے میں نقل کیا ہے: ''خسرو کی ساری جماعت میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا اسلام برائے نام نہ ہو اور بعض نے تو اسلام اختیار ہی نہ کیا تھا، دربار میں علانیہ بت پرستی ہوتی اور مذہب اسلام کی توہین کی جاتی، مسلمان مؤرخین ان واقعات کا بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ اظہار کرتے ہیں، مسجدوں کی بے حرمتی ہوتی''۔ معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی نے خسرو کا مقصد شمالی ہند میں نئے سرے سے ہندو اقتدار قائم کرنا لکھا ہے۔ ان حالات میں غازی ملک فخر الدین جونا نے خسرو خاں کی اسلام کش پالیسی اور اپنے آقا کے خاندان پر زبردست مظالم کی روک تھام کرنی چاہی۔ تھانیسر کے قریب مقابلہ میں غازی ملک نے خسرو کی فوج کو شکست دی، دہلی کے باہر دوسری لڑائی میں بھی خسرو کو شکست فاش ہوئی، حالانکہ اس نے شاہی خزانے کا منہ کھول دیا تھا، اور سپاہیوں کو کئی برسوں کی پیشگی تنخواہ کے علاوہ مشائخ کو بھی رقمیں تقسیم کی تھیں۔ چونکہ خاندان خلجی کا کوئی بچہ باقی نہ رہا تھا، غازی ملک علماء کے اصرار پر تخت نشین ہوا۔

غازی ملک غریب خاندان کا فرد تھا، اپنی ذاتی قابلیت پر ترقی کرتا ہوا علاء الدین کے بھائی الغ خاں کے پاس پیادوں میں بھرتی ہوا، پھر ترقی پا کر امیر آخور (سوار فوج کا افسر اعلیٰ) مقرر رہا، پھر منگولوں کی مہم کی روک تھام کی عظیم مہم اس کے سپرد ہوئی، اور تاتاریوں کے ساتھ انتیس دفعہ لڑا جس کی وجہ سے غازی ملک کے لقب سے مشہور رہا۔

تخت نشین ہونے کے بعد اس نے بیت المال کو درست کیا، خسرو خاں کی بے جا تقسیم کردہ دولت کی بازیابی کا فرض اسے انجام دینا پڑا، انتظام سلطنت پر توجہ دے کر ایک سال میں اسے درست کر دیا، پولیس اور عدلیہ کے نظام کو از سر نو درست کیا، فوج کو منظم اور مرتب کیا، اس کا انتظام سلطنت میانہ روی پر مبنی تھا، مالگذاری کے نئے اصول وضع کئے جس سے ملک کی مالی حالت درست ہوگئی، کاشتکاروں سے اچھا سلوک کیا، اور بدعنوان افسروں پر سختی کی جس سے ملک کے دور دراز حصوں میں بھی بہترین امن وامان قائم ہوگیا۔ غیاث الدین نے ڈاک کا انتظام بھی عمدہ بنایا، پیدل اور سوار دونوں قسم کی ڈاک کا انتظام کیا۔ اندرونی انتظامات کے بعد وہ بیرونی محاذ کی طرف متوجہ ہوا، دکن میں ورنگل کے حاکم نے خراج کی ادائیگی بند کر دی تھی، تغلق نے ورنگل کے راجا کو شکست دے کر ورنگل کو دہلی سلطنت میں شامل کر لیا، پھر بنگال پر فوج کشی کی اور وہاں بغاوت کو ختم کیا۔

غیاث الدین تغلق ایک قابل منتظم اور انصاف پسند ہونے کے ساتھ دیندار بادشاہ تھا، خود شریعت کا پابند اور دین کی حمایت میں پیش پیش رہا۔ دکن اور بنگال کی بغاوتوں پر قابو پا کر سلطنت کا استحکام اسی طرح برقرار رکھا جو علاء الدین خلجی کے زمانہ میں تھا۔ بنگال سے دہلی واپسی کے بعد حادثاتی طور پر دہلی کے قریب عارضی خیمہ میں دب کر وہ انتقال کر گیا، اس کی موت ہندوستان کے لئے ایک عظیم نقصان تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ علاء الدین کی وسیع مفتوحات اب تک دہلی کے تابع تھیں، مشرق میں بنگالہ، مغرب میں سندھ اور جنوب میں معبر تک علاقے سلطنت دہلی کے تحت تھے۔ لیکن غیاث الدین کی وفات کے بعد وہ منتشر ہوگئے، اور سلطنت دہلی کمزور ہونی شروع ہوگئی، البتہ مرکز کی اس کمزوری کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے مرکز اب صرف دہلی نہ رہ کر گجرات، بنگال، احمد نگر، اور گلبرگہ وغیرہ بھی بن گئے، اور ان صوبوں میں خود مختار حکومتوں کے قیام سے یہاں بڑے پیمانہ پر تہذیبی ترقی ہوئی۔

5.6.2 محمد بن تغلق

باپ کی وفات کے بعد محمد جونا محمد بن تغلق کے نام سے تخت نشیں ہوا، وہ بے شمار خوبیوں اور متضاد صفات کا مالک شخص تھا، اس کی ذہانت اور جدت طبع اس کے زمانہ سے بہت آگے کی تھی، اس لئے اس نے نظم ونسق، معاشی اصلاحات اور فوجی تدابیر میں جو جو تجربات کئے وہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکے اور نتیجہ میں جانی اور مالی نقصان بڑھتا گیا۔ عوام بددل ہوگئی اور بڑھتی بغاوتوں پر قابو پانا اس کے لئے ممکن نہیں رہ گیا، محمد بن تغلق انتہائی تعلیم یافتہ اور ذہین وطباع انسان تھا، قرآن کا حافظ، نماز وشعائر اسلام کا پابند، عربی، فارسی اور سنسکرت کا ماہر، فلسفہ اور ریاضی پر دسترس رکھنے والا، شعر وشاعری اور خطاب کا ماہر، بحث ومباحثہ کا دھنی اور اچھا صاحب قلم تھا۔ بڑے بڑے اہل علم وذہانت اس سے مباحثہ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ محمد بن تغلق کے زمانہ آغاز میں دہلی سلطنت اپنے عروج کی انتہاء پر تھا، لیکن اسی دور میں زوال شروع ہوا تو کئی علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں، جن میں سے کچھ ہندو ریاستیں بھی قائم ہوئیں۔ اور دہلی کی حکومت کو ایسی وسعت پھر تب ہی نصیب ہوسکی جب مغلیہ دور میں اورنگ زیب تخت نشین سلطنت ہوا۔

محمد بن تغلق نے تخت نشین ہونے کے بعد معاشی اصلاحات پر توجہ دی، اس کے لئے اس نے ایک مستقل دیوان امیر کوہی قائم کیا جس کے افسران نے دوآبہ کے زرخیز علاقہ میں اچھی فصل تیار کرنے کے لیے کسانوں کو قرض فراہم کئے، اور اس وجہ سے ٹیکس کی رقم کافی زیادہ مقرر کردی، لیکن شدید قحط کی وجہ سے اچھی فصل تیار نہ ہوسکی اور سرکاری مطالبات سے مجبور ہوکر کاشتکار مخالف ہوگئے۔ سلطنت کی وسعت اور منگولوں کے حملوں سے تحفظ کے پیش نظر محمد بن تغلق نے پایہ تخت کو دہلی سے دیوگیری منتقل کرنے کا حکم دیا جس کا نام دولت آباد رکھا گیا، اس کے پیچھے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں سے پورے جنوب پر نظر رکھنا ممکن ہوگا، نیز ساحلی علاقوں کی تجارت پر بھی اس کا کنٹرول رہے گا، وہ اشاعت اسلام کا جذبہ بھی رکھتا تھا، اور دولت آباد کے مرکزی مقام میں رہ کر وہ جنوب کے خطہ میں اسلام کی تبلیغ کے مواقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنا یہ منصوبہ اتنی سختی سے نافذ کیا کہ دہلی کی پوری آبادی کو دولت آباد منتقل ہوجانے پر مجبور کردیا، اس منتقلی میں بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا، ادھر شمال کے علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی، اور اسے اپنے منصوبہ کی ناکامی کا احساس ہوا تو پھر پایہ تخت اور لوگوں کو دہلی واپس آنے کا حکم دیا، اس میں مزید جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور عوام بددل ہوگئی۔ محمد بن تغلق کو اپنے نئے نئے منصوبوں کے لئے وسائل کی ضرورت تھی، اور قحط کی شدت کی وجہ سے سرکاری آمدنی گھٹ گئی تھی، اس صورت حال میں اس نے سونے اور چاندی کے سکوں کو اپنی تحویل میں لے کر تانبہ کے علامتی سکے جاری کئے۔ اس کی یہ سوچ اس زمانہ کے لحاظ سے ناقابل عمل تھی۔ بنیوں نے تانبہ سکے ڈھالنے کے کارخانے گھروں میں بنالئے اور بازار نقلی سکوں سے بھر گیا، لوگوں کے پاس سونے اور چاندی کے سکے نہ رہے، نتیجہ میں پوری معیشت بیٹھنے لگی، یہ دیکھ کر محمد بن تغلق نے تانبہ کے سکے واپس لئے اور پرانے درہم و دینار جاری کردئے، تب تک حکومت کو بے انتہا مالی خسارہ ہوچکا تھا۔

محمد بن تغلق اپنی سلطنت کو مزید وسیع کرنا چاہتا تھا، اس نے نہایت دور دراز کے دو علاقوں میں اپنی فوجیں بھیجیں، خسرو ملک کی ماتحتی میں ایک لاکھ کی فوج تبت اور چین کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا، لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور برسات کی شدت میں فوج تباہ ہوکر رہ گئی۔ اسی طرح اس نے تین لاکھ کی فوج خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ فوج بھی لٹی پٹی واپس آئی، جس سے حکومت کو شدید مالی خسارہ اور فوجی نقصان ہوا۔

اس صورت حال میں ملک کے اندر بے چینی بڑھتی گئی اور جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہوگئیں، محمد بن تغلق اپنے ارادوں میں پختہ ہونے کے ساتھ اپنی سزاؤں میں بھی بے انتہا سخت تھا، ان بغاوتوں پر قابو پانے کے لئے اس نے آہنی ہاتھ استعمال کئے اور بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، لیکن وہ ایک بغاوت کو فرو کرتا تو دوسری جگہ بغاوت ہوجاتی، چنانچہ معبر کے مسلم گورنر نے بغاوت کر کے 1335 میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی، ہندو سرداروں نے بھی بغاوت کی، اور وجے نگر کی مضبوط سلطنت دکن میں قائم ہوگئی، گلبرگہ، ورنگل اور دولت آباد میں بغاوتوں نے ان علاقوں کو دہلی سلطنت سے علاحدہ کردیا، اور 1347 میں بہمنی سلطنت قائم ہوگئی۔ پھر گجرات میں بغاوت ہوگئی، ان کی سرکوبی کے لئے محمد بن تغلق روانہ ہوا، سندھ پہنچ کر ٹھٹھ کا محاصرہ کئے ہوا تھا کہ آب وہوا کی وجہ سے اس کی طبیعت بگڑ گئی اور اسی علالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

محمد بن تغلق بڑا مدبر و منتظم اور انصاف پرور تھا، نظام عدل کی مضبوطی پر اس نے بہت توجہ دی، سماجی برائیوں کے خاتمہ کی بھی اس نے کوشش کی، چنانچہ ستی کی رسم پر پابندی لگائی، البتہ وہ سزائیں دینے میں بڑا سخت واقع ہوا تھا، اپنے نظریات اور فیصلوں کو بھی پوری سختی سے نافذ کرتا تھا، جس کی وجہ سے بسا اوقات لوگوں پر زیادتی ہوجاتی تھی۔ 1351 میں محمد بن تغلق نے وفات پائی۔

5.6.2 فیروز شاہ تغلق (1351-1388)

محمد بن تغلق لاولد مرا تو امراء نے اس کے چچازاد بھائی فیروز شاہ تغلق کو تخت نشین کیا گیا۔ فیروز تغلق کی تربیت اس کے چچا غیاث الدین تغلق نے کی تھی۔ محمد بن تغلق کے دور میں بھی وہ انتظام حکومت میں شریک رہا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا دور رعایا کی بہبود اور امن وامان کا تھا، اس کی رعیت پروری اور فلاحی کام بڑے مشہور ہیں۔ غریبوں کی اعانت، بے روزگار لوگوں کی ملازمت، علم وادب کی اشاعت، کاشتکاروں پر نرمی، سزاؤں میں ظالمانہ سزاؤں کی برخاستگی، پانی کی فراوانی، علاج معالجہ کی فراہمی اور ظلم وزیادتی کے خاتمہ کے لئے فیروز کا دور یادگار رہے۔ خان جہاں مقبول تلنگی فیروز کا وزیر اعظم تھا۔

فیروز تغلق نے بادشاہ بننے کے بعد سب سے پہلے ان قیدیوں کو رہا کیا جنھیں محمد بن تغلق کے زمانے میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا، قتل ہونے والوں کے پسماندگان کو خون بہا دئے، اور جن لوگوں کی زمینیں چھین کر سرکاری تحویل میں دے دی گئی تھی وہ ساری زمین مالکوں کو واپس کردیں۔ فیروز نے عام اعلان کردیا کہ جو بھی شرعی عدالت کے سامنے اپنے حقوق ثابت کرسکے اسے اس کی جائداد واپس مل جائے گی۔ کاشتکاروں پر سرکاری لگان کی سخت شرحیں عائد تھی، ان کو فیروز نے ختم کردیا اور لگان وصول کرنے والے افسران کے ظلم پر روک لگادی، بہت سارے ٹیکس بالکل ختم کردئے گئے۔ کاشتکاری کی بہتری کے لئے کثرت سے نہریں جاری کیں اور کنویں کھدوائیں، ان سب کی وجہ سے قابل زراعت اراضی میں اضافہ ہوا، فصلیں بڑھ گئیں اور کسان خوشحال ہوگئے۔ فیروز تغلق نے کمزور لوگوں کے لئے چھوٹے سکے یعنی نصف اور چوتھائی جیتل بھی جاری کئے جس سے غریبوں کو بہت سہولت ہوگئی۔

فیروز تغلق نے بغاوتوں پر قابو پانے کی خاص کوشش نہیں کی، بنگال پہلے ہی آزاد ہوگیا تھا، گوکہ فیروز نے دومرتبہ اسے تابع بنانے کی کوشش کی، اسی طرح اس نے جاج نگر اور نگر کوٹ نیز ٹھٹھ پر حملے کئے، لیکن اسے اندازہ ہوگیا کہ ان حملوں سے عوام کی بہبودی نہیں ہوگی، چنانچہ اس نے سلطنت کے بچے ہوئے حصوں کے نظم ونسق اور رفاہ عام کے کاموں پر توجہ دینی شروع کردی، فیروز نے کثرت سے باغات لگوائے، صرف شہر دہلی اور اس کے اطراف میں 1200 باغات تھے جن سے نہ صرف ماحولیاتی مناظر میں حسن پیدا ہوتا تھا بلکہ آمدنی بھی حاصل ہوتی تھی۔ بے شمار کنویں کھدوائے اور نہریں نکلوائیں تاکہ لوگوں تک آسانی سے پانی پہنچ سکے۔ اس نے کئی اسپتال قائم کئے جہاں ناداروں کے مفت علاج معالجہ کا انتظام کیا۔ فیروز کو غریبوں کا بڑا خیال رہتا تھا۔ غریب بچیوں کی شادی کے لئے علاحدہ سے مدد کا انتظام کیا، نوجوانوں کو ملازمت کی فراہمی کے لئے محکمہ قائم کیا، بیرونی سیاحوں کی مدد اور تعاون کے لئے الگ سے فنڈ مخصوص کیا، فیروز تغلق گوکہ خود زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا، لیکن اس نے تعلیم کے فروغ سے بہت دلچسپی لی، کثرت سے اسکول اور کالج کھولے، دہلی میں مدرسہ فیروز شاہی بہت مشہور تھا، تعلیم گاہوں اور اساتذہ و طلبہ کی مدد کے لئے وظائف اور اوقاف مقرر کئے، صرف دہلی میں ایک ہزار ایسے مدرسے تھے، اس نے علماء وفضلا، اور شعراء ومشائخ کی سرپرستی کی۔ اس کے دور میں فقہ وشریعت کا عروج زیادہ ہوا، اسلامی قانون اور علوم اسلامیہ پر متعدد اہم کتابیں اس دور میں تصنیف ہوئیں، جن میں فتاوی فیروز شاہی اور فتاوی تاتارخانیہ وغیرہ مشہور ہیں۔ فیروز کے عہد میں سلطان المشائخ کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی تھے جن کی بڑی قدردانی فیروز کرتا تھا، اس زمانے کے مشہور علماء میں مولانا احمد تھانیسری، مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر دہلوی تھے۔ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ اسی علم پرور بادشاہ کے نام منسوب کرکے تاریخ فیروز شاہی رکھا، شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی بھی اسی دور کی یادگار

ہے۔ فیروز نے سنسکرت کے فروغ سے بھی دلچسپی لی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کے ترجمے فارسی میں کروائے، ان میں قابل ذکر باراہ سنکتا ہے، جسے فیروز کے حکم سے عبدالعزیز شمس تھانیسری نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

فیروز شاہ کا دور دہلی سلطنت میں عوامی فلاح و بہبود کے لئے بہت عمدہ تھا، لیکن اس کی نرمی کی پالیسی کے نتیجہ میں حکومت اور امراء پر گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ اور 1388 میں فیروز شاہ کی وفات کے بعد کوئی ایسا قابل جانشیں نہیں رہا جو حکومت کو اس کی ڈگر پر جاری رکھتا، چنانچہ آپسی رسہ کشی ہونے لگی، یکے بعد دیگرے تین بادشاہ آئے اور گئے۔ 1394 میں محمود شاہ تخت پر بیٹھا، اس کے دور میں 1398 میں دہلی پر تیمور کا مشہور حملہ ہوا جس نے قتل وغارت گری اور بربادی کی مثال قائم کردی۔ تیمور کا حملہ تباہی کی ایک آندھی تھی جو بربادی پھیلاتی گذر گئی۔ دہلی جو عظمت، تقدس اور تمدن کی نشانی تھا مٹ گیا، ملتان، پنجاب، جون پور، دکن، گجرات اور بنگال کے علاقے خود مختار ہوگئے۔ دہلی کی دگرگوں حالت میں ایک افغان سردار اقبال خاں حکومت کی باگ سنبھالے رہا، پھر دولت خاں لودھی کاروبار سلطنت پر قابض ہوگیا، اور 1413 میں محمود شاہ تغلق نے کسمپرسی کے عالم میں وفات پائی اور تخت سلطنت پر تغلق خاندان کی حکمرانی ختم ہوگئی۔

معلومات کی جانچ

1. علاء الدین خلجی نے کس عالم سے مسائل شرعی پوچھے تھے؟
2. اشیاء کی نرخ بندی کس بادشاہ نے سختی کے ساتھ نافذ کی ہے؟
3. فیروز شاہ کے عہد میں دہلی میں کتنے مدارس تھے؟

5.7 سید خاندان (1414-1451)

لٹی پٹی اور سمٹی دہلی سلطنت کے تخت پر ملتان کا حاکم خضر خاں 1414 میں دولت خاں کو ہٹا کر قابض ہوگیا، یہ سید تھا، ہر طرف بغاوت تھی، پوری زندگی باغیوں سے لڑنے میں گذر گئی، 1421ء میں اس کا لڑکا مبارک شاہ حاکم ہوا، اس نے اپنی ہمت سے پنجاب اور ملتان پر بھی قبضہ برقرار رکھا، لیکن درباریوں نے سازش کر کے 1435 میں اسے قتل کردیا، اور خضر خاں کا پوتا محمد شاہ بادشاہ بنادیا گیا، جونپور کے حکمراں سے اس کی جھڑپ چلتی رہی، پنجاب کے حاکم بہلول خاں لودھی کی مدد سے یہ دہلی کے تخت پر قابض رہا۔ 1445 میں اس نے وفات پائی تو اس کا لڑکا علاء الدین حاکم ہوا، اب صرف دہلی باقی بچی تھی، اطراف کے علاقے بھی دہلی کی تابعداری سے نکل گئے تھے، جب علاء الدین سے دہلی بھی نہ سنبھل سکی تو وہ بدایوں جا کر گوشہ نشیں ہوگیا، اور 1451 میں بہلول لودھی نے حکومت دہلی پر قبضہ کرلیا۔

5.8 لودھی خاندان (1451-1526)

بہلول لودھی کے تخت سلطنت پر قبضہ سے دہلی سلطنت میں لودھی خاندان کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ دہلی سلطنت کا یہ آخری خاندان ہے۔ تغلق خاندان کے آخری دور سے دہلی سلطنت کی وسعت سمٹتی چلی گئی تھی۔ بیشتر علاقے خود مختار و آزاد ہوگئے تھے۔ سید خاندان کی حکومت

کے زمانہ میں دہلی سلطنت کا رقبہ صرف دہلی اور اس کے اطراف تک محدود رہ گیا تھا، اور اس چھوٹے دائرہ میں بھی حکومت پر امن نہ رہی تھی، جب لودھی خاندان میں حکومت منتقل ہوئی تو گو کہ اس خاندان کے تین بادشاہوں نے تقریباً 75 برس حکومت کی، اور متعدد علمی وتمدنی کارنامے بھی انجام پائے، اسلام کی اشاعت سے بھی دلچسپی لی گئی، لیکن حکومت کو پہلی سی وسعت نصیب نہ ہوسکی، اندرونی انتشار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کابل کے بادشاہ بابر نے اپنی چھوٹی لیکن منظم فوج سے دہلی کی شاہی فوج کی بھیڑ کو شکست دے کر دہلی سلطنت کا خاتمہ کردیا اور مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھ دی۔

5.8.1 سکندر لودھی

لودھی خاندان کا پہلا فرمانروا بہلول لودھی ہے۔ یہ افغانستان کے پٹھان خاندان کا فرد تھا، محمود شاہ نے اسے پنجاب کی صوبیداری پر مقرر کیا تھا، طاقتور حکمران تھا، علاء الدین کی مدد کرکے دہلی سلطنت کو بچائے رکھا، اور اسکے بعد تخت دہلی پر قابض ہوگیا، اس نے پنجاب تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس نے جونپور کو فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ 38 برس حکومت کی، اس دوران مختلف بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔ 1488 میں وفات پائی۔ 1479 میں اس کے بعد اس کا لڑکا سکندر لودھی باشاہ ہوا، اس نے دوسرے صوبوں کو دہلی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں دہلی سلطنت کی سرحد ایک طرف مالوہ اور دوسری طرف بنگال تک پہنچ گئی۔ اس علاقہ میں عام طور پر امان بھی قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ غلے ارزاں ہوگئے اور تجارت کو فروغ ملنے لگا۔ سکندر نے 1506 میں آگرہ شہر کی بنیاد رکھی، اس کے دربار سے اہل علم بھی وابستہ رہے، اور اس نے علمی قدردانی کی، 29 برس کی حکومت کرکے 1517 میں اس نے وفات پائی۔ ابراہیم لودھی اس کا لڑکا تھا، باپ کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا، جونپور پر قبضہ کے لئے اپنے بھائی سے لڑتا رہا، اس نے گوالیار کا قلعہ بھی وہاں کے راجہ سے چھین لیا، وہ بہادر اور مضبوط ارادوں کا مالک تھا، دربار کی سازشوں پر کنٹرول کرنے کے لئے سختی کی روش اختیار کی، سازش کرنے والے بعض امیروں کو سخت سزائیں دیں، دوسرے ڈر کر بھاگ گئے، وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجاتا اور دہلی سلطنت میں آیا استحکام مزید آگے بڑھتا، لیکن لاہور کے حاکم دولت خاں لودھی نے کابل کے مغل بادشاہ بابر کو دہلی فتح کرنے کی دعوت دے دی، جب بابر کابل سے ہندوستان روانہ ہوا تو دولت خاں کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا، اور اس نے بابر کو روکنا چاہا، لیکن بابر نے پہلے لاہور پر قبضہ کرلیا، پھر دہلی کی جانب بڑھا، پانی پت کے میدان میں 1526 میں دہلی کی شاہی فوج سے مقابلہ ہوا، بابر کی فوج مختصر تھی، لیکن وہ منظم اور تجربہ کار تھی، ابراہیم لودھی کی منتشر سی بڑی فوج نے شکست کھائی اور ابراہیم مارا گیا اور دہلی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا۔

5.9 دہلی سلطنت کا کردار اور زوال

1206 میں قائم ہونے والی دہلی سلطنت اپنی عظمت کے نقوش ہمیشہ کے لئے نقش کرتے ہوئے 1526 میں مغلیہ سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔ ہندوستان میں یہ پہلی وسیع وعریض اور مستحکم مسلم حکومت تھی جس نے زندگی کے ہر میدان کو متاثر کیا، ملک کو مضبوط اور متحدہ حکومت دی۔ عوام کو امن وامان حاصل ہوا۔ بیرونی دنیا کے ساتھ تجارتی روابط مضبوط ہوئے، معاشی اصلاحات اور زراعت کے فروغ نے عوام کو خوشحال بنایا، نئے نئے شہر بسے، یادگار عمارتیں اور قلعے تعمیر ہوئے، فن تعمیر میں نت نئے تجربات کئے گئے۔ شاہراہوں اور سڑکوں کی تعمیر اور ان پر سرایوں اور مسافر خانوں کی فراہمی نے آمدورفت کی سہولت بہم پہنچائی، ڈاک کے سواری اور پیدل نظام نے روابط بحال کئے۔ دہلی اور متعدد شہروں میں علم

کے مراکز قائم ہوگئے، بادشاہوں نے دل کھول کر علم وادب اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی، جس کے نتیجہ میں پوری دنیا سے اہل فن واہل کمال یہاں جمع ہونے لگے، شعروشاعری، زبان وادب، حکمت وتاریخ اور اسلامی علوم پر وقیع کتابیں تصنیف ہوئیں، سنسکرت سے فارسی اور فارسی سے سنسکرت میں کتابوں کے ترجمے ہوئے، مدارس واسکول اور کالج قائم ہوئے، عوام کی اخلاقی اصلاح اور مذہبی رواداری کے لئے صوفیا اور مشائخ نے خانقاہیں قائم کیں جو بلاتفریق مذہب عوام کے لئے امن واخلاق کی آماجگاہیں تھیں، وقت کے اکابر مشائخ نے اس سرزمین کو اپنی برکتوں سے فیضیاب کیا، عدل وانصاف کا پختہ نظام قائم کیا گیا، پولیس اور خفیہ محکمہ کے ذریعہ سخت نگرانی رکھ کر ظلم پر بندشیں لگائی گئیں۔ فوجی محکمہ کو مضبوط تر بنایا گیا، کہ منگولوں کی غارت گری ہندوستان جنت نشان کو نقصان پہنچانے کی ہمت نہ کرسکی، اور نہ اسے کامیابی ملی۔ مذہبی آزادی نے ملک میں امن وامان اور بھائی چارہ کی فضا کو مضبوط بنایا اور اتنی وسیع مملکت میں مذہبی بنیادوں پر فرقہ وارانہ فسادات واقع نہ ہوسکے۔ سواتین سو برس کی اس دہلی سلطنت نے ہندوستان کو دنیا کے نقشہ پر انتہائی ترقی یافتہ، مضبوط ومستحکم، خوشحال اور مہذب ملک بنا کر پیش کیا۔

تغلق خاندان کا آخری دور ہندوستان کی دہلی سلطنت کی قوت وعظمت اور وسعت کا نقطہ عروج تھا۔ بنگال (بشمول موجودہ بنگلہ دیش) سے لے کر سندھ تک اور کشمیر سے لے کر جنوب کی انتہاؤں تک دہلی سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا، تغلق خاندان کے بعد پھر تخت دہلی پر ایسے قابل حکمراں نہ آسکے، تخت حکومت کے لئے رسہ کشی ہوتی رہی، اتنی وسیع سلطنت پر نظر رکھنے اور اس کو متحد بنائے رکھنے میں آمدورفت اور ربط و اتصال کی دشواری تھی۔ تغلق حکومت کے آخر میں فوجیوں اور امیروں کو تنخواہ میں نقد کی جگہ اراضی دئے جانے کا سلسلہ شروع ہوا جس سے علاقائی امراء مضبوط ہونے لگے، اس دور میں غلاموں کی بڑی تعداد میں خریداری ہوئی، اور وہ اسلام قبول کر کے فوج میں بھرتی ہوئے، ان کی اندر حکومت کے ساتھ جذباتی وابستگی نہ تھی۔ ان سب اسباب نے مل کر دہلی کی مرکزی سلطنت کو کمزور کر دیا اور علاقائی حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار ہونے لگی۔ سید خاندان کی حکومت آتے آتے دہلی سلطنت صرف دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں تک محدود رہ گئی ، گجرات، ملتان، مالوہ، جونپور، دکن اور بنگال وغیرہ میں آزاد حکومتیں قائم ہوگئیں۔ راجستھان اور جنوب بعید میں چند ہندو ریاستیں بھی آزادانہ طور پر وجود میں آگئیں۔ لودھی خاندان کے حکمرانوں نے سلطنت دہلی کو طاقت پہنچانے کی کوشش کی اور کسی حد تک اسے وسعت دینے میں کامیابی حاصل کی، لیکن ٹوٹتی بکھرتی دہلی سلطنت کو عظمت رفتہ کی طرف وہ بھی واپس نہ لاسکے، اور 1526 میں یہ ختم ہوکر رہی۔

5.10 علاقائی حکومتوں کا قیام

دہلی سلطنت کی کمزوری اور بکھراؤ اور بالآخر اس کے زوال نے جہاں مرکزی حکومت کی عظمت کو ختم کر دیا، اور مغلیہ سلطنت کے لئے تاریخ شروع کرنے کی راہ ہموار کردی، وہیں اس سے ملک اور یہاں کی تہذیب ومعیشت کو بے شمار فوائد بھی حاصل ہوئے، جو مرکز کی متحدہ حکومت کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر وجود میں آئے۔ علاقائی حکومتوں کے قیام سے ان علاقوں میں نظم ونسق زیادہ بہتر ہوگیا۔ علاقائی خصوصیات اور تہذیب کی زیادہ بہتر سرپرستی ہوئی، ان علاقوں میں چھوٹی حکومتوں نے اسلامی تہذیب کے فروغ میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔ علم و ادب کی سرپرستی صرف ایک شہر دہلی کے بجائے جونپور، مالوہ، اڑیسہ، دکن، بنگال، ملتان، سندھ اور کشمیر وغیرہ کئی جگہوں پر ہونے لگی۔ ان علاقوں میں صنعت وحرفت اور زراعت کو فروغ ملا۔ گجرات میں کئی صنعتوں کی بنیاد رکھی گئی جس سے علاقہ میں خوشحالی آگئی۔ گجرات اور بنگال میں بحری تجارت میں کافی ترقی ہوئی۔ دور دراز سے اشیاء تجارت کی برآمد درآمد ہونے لگی، اور یہ تجارت کی مشہور منڈیاں بن گئیں، بہت سے نئے نئے شہر

تعمیر ہوئے اور ہند اسلامی فن تعمیر میں علاقائی خصوصیات آمیز ہوئیں۔ بنگال میں الیاس شاہی حکومت نے 1348 سے 1489 تک تہذیب وتمدن اور علم وادب کو فروغ دیا۔ 1347 میں دکن کی بہمنی سلطنت قائم ہوئی جو 1527 تک باقی رہی اور اس کی کوکھ سے پانچ چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں۔ بیجاپور میں عادل شاہی حکومت (1490-1686)، احمد نگر میں نظام شاہی حکومت (1490-1686)، گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت (1518-1687)، برار میں عماد شاہی حکومت (1490-1568) اور بیدر میں برید شاہی (1480-1609)۔ ان حکومتوں نے تہذیب وتمدن، تعمیر وفنون لطیفہ اور زبان وادب کو فروغ دینے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ 1336 میں جنوب بعید میں وجے نگر کی ہندو سلطنت قائم ہوئی جو دو سو برسوں سے زائد تک باقی رہی۔ یہاں تک کہ دکن کی مسلم حکومتوں نے باہم متحد ہو کر 1564 میں تالی کوٹ کی مشہور جنگ میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ کشمیر کے اندر اسی دور میں دہلی سے آزاد حکومت قائم ہوئی جسے 1586 میں مغل بادشاہ اکبر نے دہلی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس نے کشمیر کی علاقائی ترقی کو فروغ دیا۔ جونپور میں شرقی حکومت نے بھی 1394 سے 1479 تقریباً ایک صدی سے کچھ کم تک ملک کے مشرقی حصہ میں تہذیب وتمدن کو فروغ دیا جس کے اثرات بہت زمانے تک برقرار رہے۔ اسی دور میں کالی کٹ کے ساحل پر تگیز آئے، 1498 میں واسکوڈی گاما نے مالا بار کے ساحل پر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ انھوں نے بحری تجارت پر قبضہ کر لیا، سمندری راستوں اور تجارت پر ان کی اجارہ داری قائم ہوگئی، اور دیو، دمن اور گوا پر اپنا قبضہ قائم کر دیا، اس سے پہلے ساحل کے ان علاقوں اور سمندر پر بحری تجارت پر مسلمانوں کی برتری قائم تھی، پرتگیزیوں کے اس بحری تسلط کو پہلے ڈچ قوم نے پھر انگریز اور فرنچ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ملک کی آئندہ تاریخ پر اس ساحلی سرگرمی کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

5.11 خلاصہ

دہلی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی پہلی مسلم حکومت تھی جس نے سوا تین سو برس تک ایک وسیع وعریض علاقہ پر حکومت کی اور ہندوستان کو ایک مضبوط اور متحدہ حکومت فراہم کیں۔ اس حکومت کا بانی قطب الدین ایبک ہے جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا' 1206 سے 1290ء تک دہلی پر غلام خاندان نے حکومت کی۔ ایبک کے بعد التمش اور بلبن غلاموں میں بڑے بادشاہ ہوئے' ایبک نے نظام حکومت قائم کیا۔ عدل وانصاف فراہم کیا' مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار اس کی یادگار ہے۔ التمش صحیح معنوں میں ہندوستان کا پہلا خود مختار بادشاہ ہے جس کی سلطنت ملتان اور پنجاب سے لے کر بنگال تک تھی۔ اس نے منگولوں کے حملوں کو روک کر ہندوستان کو امن وامان کا گہوارہ بنایا۔ اس کے دور میں بے شمار اہل علم وکمال دہلی آئے تھے جن کی اس نے بڑی قدردانی کی وہ خود بھی بڑا دیندار تھا۔ بلبن کا دور حکومت بڑا عظیم الشان رہا' منگولوں کے اندر اس نے سلطنت کی ہیبت بٹھا دی۔ حکومت کی شان وشوکت کا اونچا معیار قائم کر دیا۔ بلبن علماء وصلحاء کا قدرداں تھا۔ التمش کی بیٹی رضیہ سلطان ہندوستان کی پہلی خاتون حکمراں تھی وہ قابل اور علم نواز تھی۔ غلام سلاطین کے دور میں دہلی کے اندر مشائخ کبار اور فقہاء وعلماء کی کثرت تھی۔

1290ء سے 1320 تک خلجی خاندان نے دہلی پر حکومت کی۔ اس خاندان کا بانی جلال الدین فیروز ماہر فن' سیاسی اور بہادر انسان تھا۔ دہلی سلطنت کمزور ہوئی تو تخت شاہی پر بیٹھا۔ لیکن جلد ہی اس کے بھتیجے علاء الدین نے حکومت پر قبضہ کر لیا' جس نے بڑی شان اور دبدبہ کے ساتھ بیس برس حکومت کی' علاء الدین نے ہی پہلی مرتبہ دکن کے علاقہ کو سلطنت میں شامل کیا۔ اس کے دور میں دہلی سلطنت کی وسعت اپنی انتہا

کو پہنچ گئی تھی ۔ علاء الدین نے فوج کو مضبوط بنایا' اور اسے نقد تنخواہ دینے کا رواج شروع کیا۔ بازار سے سامانوں کی اس نے نرخ بندی اور سستے داموں پر فروخت کرنے کا حکم دیا' اس نے زمینوں کی پیمائش کرا کے پیداوار کے تخمینہ سے لگان مقرر کی ۔ علاء الدین نے جاسوسی کا بڑا پختہ نظام بنایا تھا اور مجرموں کو سزائیں دیتا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کے اندر ظلم' رشوت اور حکم کی خلاف ورزی ختم ہوگئی تھی ۔ اسی نے شراب وغیرہ پر بھی پابندی لگادی تھی اس نے حکومت میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا۔اس کے دور میں سب سے زیادہ اہل علم وفضل دہلی میں جمع ہوگئے تھے ۔

خلجی خاندان کے بعد تغلق خاندان نے 1320ء سے 1413 تک حکومت کی' غیاث الدین تغلق اس خاندان کا پہلا فرمانروا تھا جس نے انتہائی نازک صورت حال میں حکومت سنبھالی تھی اور اسلامی شعائر پر ہونے والے حملوں کو روکا تھا' لیکن بہت جلد ہی وہ ایک حادثہ میں انتقال کر گیا۔ اس کے بیٹے محمد بن تغلق نے طویل حکومت کی ۔ یہ بڑا عالم وفاضل اور مختلف اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے دہلی سے دیوگیری کو پایۂ تخت منتقل کیا جس کا نام دولت آباد رکھا' لیکن شمال پر گرفت ڈھیلی ہونے لگی تو پھر دہلی کو پایہ تخت بنایا تاکہ وہاں سے دکن پر نظر رکھی جائے اور پورے ملک میں اسلام کی اشاعت ہو سکے ۔

ایک طرف اس نے تبت وچین اور دوسری طرف ماوراء النہر کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجیں لیکن ناکامی اور نقصان ہاتھ آیا' قحط کی وجہ سے مالی تنگی ہوئی تو اس نے تانبہ کے سکے چلائے' لیکن بنیوں کے نقلی سکے چلانے کی وجہ سے اسے تانبے کے سکے واپس لینے پڑے ۔ ان سب منصوبوں کی وجہ سے ملک میں بغاوتیں شروع ہوگئیں اور دہلی کی مرکزی حکومت سے علاحدہ ہو کر دکن' بنگال' گجرات اور جونپور وغیرہ میں علاقائی حکومتیں قائم ہوگئیں ۔ فیروز شاہ تغلق کا دور دہلی سلطنت کے بچے ہوئے حصوں کے لیے خوشحالی اور امن وامان کا دور تھا' اس نے نہریں اور کنواں بنوائے ۔ ٹیکس کا بار ختم کیا۔ غریبوں کی مدد پہنچائی' بچیوں کی شادی کا انتظام کیا اور مفت علاج کے اسپتال کھولے' اس نے بہت سے مدرسہ بھی بنوائے' ان سب سے عوام بے حد خوش حال ہوگئی۔ تغلق دور میں ہی تیمور نے دہلی پر حملے کر کے اسے تباہ وبرباد کر دیا۔

تغلق کے بعد مختصر مدت کے لیے سید خاندان نے حکومت کی ۔ اب دہلی سلطنت کا رقبہ بہت گھٹ گیا اور حکومت ان سے نہ سنبھلی تو بہلول لودھی نے تخت سلطنت پر قبضہ کیا۔ اس سے لودھی خاندان کی حکومت شروع ہوتی ہے ۔ اس کا بیٹا سکندر لودھی بڑی خوبیوں کا بادشاہ ہوا ہے ۔ اس نے عدل وانصاف کی روشن مثال قائم کردی' سامان بے انتہا سستے ہوگئے' علم وادب کی ترقی ہوئی اور امن وامان قائم ہوا۔ سلطنت کا رقبہ بھی کچھ وسیع ہوا' لیکن افغان امراء کی باہمی رسے کشی کی وجہ سے اس کے بیٹے ابراہیم لودھی کے زمانہ میں کابل کے حکمراں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور پانی پت کے میدان میں ابراہیم کی شاہی فوج کو بابر نے شکست دے کر دہلی سلطنت کی جگہ مغلیہ حکومت قائم کر دی ۔

5.12 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے

1 ۔ شمس الدین التمش کی فتوحات پر روشنی ڈالیے ۔

2 ۔ غیاث الدین بلبن کے طرز حکومت پر ایک مضمون لکھیے

3 ۔ عوام کی فلاح وبہبود کے لئے فیروز شاہ تغلق کے اقدامات کا تذکرہ کیجیے

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجئے

4۔اشیاء کی نرخ بندی کے لئے علاء الدین خلجی نے کیا اقدامات کئے

5۔محمد بن تغلق کے ذریعہ پایہ تخت کی تبدیلی کے مقاصد پر روشنی ڈالئے

6۔لودھی خاندان کی حکومت کا تعارف کرائیے

5.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. آب کوثر — شیخ محمد اکرام' فرید بک ڈپو' دہلی
2. عہد وسطی کا ہندوستان' حصہ اول — پروفیسر ستیش چندر' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی 2003ء اردو ترجمہ: عزیز الدین حسین
3. ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک — سید صباح الدین عبد الرحمٰن' دار المصنفین 'شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ — سید صباح الدین عبد الرحمٰن' دار المصنفین 'شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان — کے ایس لال' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی 1998 'اردو ترجمہ' یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند — سید ابوظفر ندوی' دار المصنفین 'شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011

اکائی 6 : دہلی سلطنت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزاء

6.1 مقصد

دہلی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی پہلی مسلم حکومت تھی، یہاں انھوں نے حکومت کی بنیاد رکھی اور نظم ونسق کے میدان میں نئی روش اختیار کی۔ تین سو سال کے عرصہ میں سلاطین دہلی نے کئی تجربات بھی کئے۔ یہ نظم ونسق مرکزی سطح سے لے کر صوبائی اور ضلعی سطح تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں سلطان کی مرکزی شخصیت کے ساتھ امراء، صوبہ کے سربراہان یا صوبیدار، وزراء اور مختلف محکموں کے ذمہ داران ہوتے جو انتظام حکومت کے ساتھ ملک کی حفاظت اور عوام کی معیشت کی بہتری کے لئے کام کرتے تھے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ دہلی سلطنت کا یہ نظم ونسق کن بنیادوں پر استوار تھا۔ اس کے عناصر کون کون تھے، ذمہ داریوں اور عہدوں کی تقسیم کیسی تھی اور مرکز کی اوپری سطح سے لے کر گاؤں کی نچلی سطح تک نظم وانتظام کے کیا طریقے تھے۔ اسی طرح اکائی کا مطالعہ آپ کو اس بات سے بھی روشناس کرائے گا کہ بادشاہ اور اس

کے وزراء کے اختیارات کیا تھے اور یہ اختیارات کس طرح حاصل ہوتے تھے۔ عہدوں پر تقرری کے کیا اصول تھے۔ پھر حکومت کے دو اہم عنصر فوج اور اقتصادیات سے کس طرح کام لئے جاتے تھے، اور ان دونوں میدانوں بالخصوص مالی ضوابط اور معاشیات کے میدان میں کیا کیا تجربات کئے جاتے رہے اور عوام کی زندگی پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

6.2 تمہید

دہلی سلطنت جن حالات میں ہندوستان کے اندر قائم ہوئی وہ افغانستان کے غوری حکومت کی مشرقی فتوحات کا نتیجہ تھی۔ شہاب الدین غوری نے ہندوستان میں اپنی شاندار فتوحات کا پرچم تو لہرایا اور ترائن کی دوسری جنگ میں پرتھوی راج چوہان کو زبردست شکست دے کر اس کی طاقت ختم کر دی اور دہلی کو اپنے قبضہ میں کر لیا، لیکن خود اس نے یہاں حکومت نہ کی اور اپنے وفادار فوجی سپہ سالار قطب الدین ایبک کو دہلی کا گورنر بنا گیا۔ 1206ء میں شہاب الدین کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے اپنی سلطنت کا اعلان کیا تو اس وقت ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت ماحول میں مسلمانوں کی انتہائی محدود تعداد تھی۔ غور سے آنے والے ان فوجیوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، لیکن یہاں انتظام حکومت اور نظم ونسق چلانے کے لئے وہ یہاں پہلے سے موجود نظام حکومت اور اس کے کل پرزے کو اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے ساتھ مسلم حکومتوں کی سینکڑوں برس کی شاندار روایات رکھتے تھے، وسط ایشیا میں انھیں حکومت کا تجربہ بھی تھا، لیکن ہندوستان کی نئی سرزمین پر انھیں یہ افرادی وسائل اور تجربہ کار مشنری میہا نہ تھی۔ پھر قیام حکومت کے ابتدائی عرصہ میں انھیں فوجی مقابلے اور فتوحات در پیش تھیں، اور مفتوحہ علاقوں پر اپنے قبضہ کو مستحکم کرنا تھا۔ انھوں نے اس موقع پر نظم نسق میں کسی نئے تجربہ کے بجائے پرانے نظام پر ہی اپنی انتظامیہ کی عمارت اٹھائی، ملک میں امن وامان کے قیام، عوام کی خوشحالی اور عدل وانصاف کی فراہمی پر انھوں نے توجہ دی، اور حتی الامکان دین وشریعت اور علم وادب کے فروغ نیز تمدنی ترقیات اور تعمیرات سے دلچسپی لی۔ شمس الدین التمش کے 26 سالہ طویل دور حکومت میں ایک مضبوط اور متحدہ ہندوستان وجود میں آیا، جس کا دائرہ شمالی ہند کے بڑے حصہ پر محیط تھا، چنانچہ نظم ونسق کے میدان میں نئے طور طریقے وضع کئے گئے، بلبن کا چالیس سالہ دور دہلی سلطنت کے استحکام اور شان وشوکت کا دور ہے۔ بلبن حکومت کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتا تھا اور اس کے عکس نظام حکومت پر مرتب ہو رہے تھے۔ غلام خاندان کے بعد خلجی دور میں نظم ونسق بالخصوص فوج اور اقتصادیات کے میدانوں میں بڑے پیمانہ پر نت نئے تجربات کئے گئے۔ نئی نئی پالیسیاں بنائی اور جاری کی گئیں، جن کے مخصوص نتائج سامنے آئے، تغلق دور میں بھی نئے تجربات کا سلسلہ جاری رہا، خلجی دور کی پالیسیوں میں کئی جگہوں پر تبدیلیاں کی گئیں، محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق کا زمانہ آتے آتے پالیسیوں میں کافی فرق دیکھنے کو ملتا ہے، اب فتوحات کی وسعت اور بغاوتوں پر کنٹرول کے بجائے دہلی سلطنت کے بچے کھچے حصوں پر بہتر نظم ونسق اور عوام کی خوشحالی کے اقدامات پر توجہ مرکوز کر دی گئی، چنانچہ اس زمانہ میں زراعت میں بڑی ترقی ہوئی، اشیاء ارزاں اور عوام خوشحال ہوگئی، تعلیم وتمدن کو بڑا فروغ ملا۔ تغلق دور کا آخری زمانہ دہلی سلطنت کے بکھراؤ اور نئی نئی علاقائی حکومتوں کے قیام کا دور ہے۔ اب علاقائی حکومتوں میں نظم ونسق کے اپنے مخصوص طور طریقے اختیار کئے جانے لگے۔ سید خاندان اور لودھی خاندان کی حکومتوں کے زمانوں میں مرکزی حکومت میں مشکل سے استحکام آتا اور جلد ہی وہ سازشوں اور رسہ کشیوں کا شکار ہوجاتی۔ اس سیاسی صورت حال کا اثر نظم ونسق پر بھی مرتب ہورہا تھا، حکمراں اور وزراء کے اختیارات میں اب پہلے کی بہ نسبت بہت فرق آچکا تھا۔ سکندر لودھی کے دور حکومت میں ایک بار پھر امن وامان قائم ہوا۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں اشیاء کے دام گھٹے اور خوشحالی آگئی، جس کی وجہ

سے علم وادب کو بھی فروغ ہوا، لیکن یہ دہلی سلطنت کے بڑھتے زوال کا آغاز تھا جلد ہی مغلیہ حکومت نے اس کی جگہ لے لی، اور دہلی سلطنت کے ہی نظم ونسق کی بنیاد پر مغلیہ حکومت نے اپنی عمارت استوار کرلی۔

6.3 انتظام سلطنت

دہلی سلطنت اپنے ابتدائی دور میں فوجی نوعیت کی تھی، چونکہ حکمرانوں کو استحکام حکومت پر توجہ دینی تھی، اور بغاوتوں کے خطرات پر بندش لگانی تھی، ان کی بیشتر توجہ فوج کی تیاری اور عمدگی پر رہتی تھی۔ اور فوجی قوت پر ہی حکومت کی بقاء منحصر تھی۔ حکمراں کے انتخاب کا بھی کوئی طریقہ متعین نہیں تھا، پہلے فرمانروا قطب الدین ایبک کو تو شہاب الدین غوری نے گورنر مقرر کیا تھا، جس نے غوری کی وفات کے بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا تھا، بادشاہ کی حمایت کے لیے اس کے ماتحت امراء تھے۔ امراء کے مختلف مرتبے اور درجات تھے، کچھ خان کہلاتے، کچھ ملک اور کچھ امیر۔ چونکہ حکومت کی بنیاد رکھنے والے ترک نسل کے تھے، غلام خاندان کی حکومت میں یہ امراء اور معاونین بھی ترک ہی ہوتے تھے۔ بادشاہ ان ہی میں سے اپنے وزراء کو مقرر کرتا تھا، بیشتر حالات میں حکومت پر بادشاہ کا مطلق العنان اختیار ہوتا، اور وہی پورے نظام سلطنت کا مرکزی محور ہوتا۔ زیر حکومت علاقوں کو صوبوں اور پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اور پرگنہ گاؤں پر مشتمل تھے۔ بادشاہوں نے حکومت کی انتظامی مشنری کی بحالی کے ساتھ عوام کی خوشحالی، امن وامان کے قیام اور عدل وانصاف کی فراہمی پر توجہ دی تھی۔ چونکہ حکومت کا پورا نظم ونسق بادشاہ کی ذات سے جڑا تھا، اور اس کی بہتری یا ابتری بنیادی طور پر بادشاہ سے ہی وابستہ تھی، اس لئے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا تھے، اور وہ کس طرح نظام حکومت پر نظر رکھتا تھا۔

6.3.1 سلطان یا بادشاہ

عہد وسطی کی دہلی سلطنت بنیادی طور پر بادشاہ مرکوز تھی۔ بادشاہ پوری طرح بااختیار اور بڑی حد تک مطلق العنان ہوتا تھا۔ تمام انتظامی قوتوں کا مرکز اعلی اسی کی ذات تھی، فوج کا سربراہ اعلی بھی وہی ہوتا تھا اور عدلیہ کی آخری اتھاریٹی بھی بادشاہ ہی کی شخصیت تھی۔

بادشاہ کی تقرری کا کوئی باضابطہ نظام اور اصول طے نہیں تھا، بنیادی طور پر اعلی فوجی قابلیت اور حکومت پر کنٹرول کی صلاحیت تخت سلطنت کو حاصل کرنے کی راہ تھی۔ کچھ خاص حالات میں ایک بادشاہ اپنے بعد کے لئے کسی کو بادشاہ مقرر کردیتا تھا، لیکن اس کی تخت نشینی اور بقاء بھی اس کی فوجی صلاحیت اور امراء کے ساتھ تال میل پر منحصر رہتی تھی۔ امراء بادشاہ کے دست وبازو ہوتے تھے، ان کے تحت بڑی بڑی فوجیں ہوتی تھیں، بادشاہ ان کا تعاون حاصل کرنے پر مجبور ہوتے تھے، التمش نے ایسے چالیس امراء کی جماعت بنائی تھی جو امراء چہلگانی کہلاتے تھے۔ حکومت کو چلانے میں ان کا بڑا رول تھا، التمش کے بعد کے سیاسی اتھل پتھل میں ان امرائے چہلگانی کی علاحدہ وابستگیوں اور اختلاف رائے کو کافی دخل تھا۔ التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے زمانہ میں بلبن جو وزیر اعظم یا نائب الملک مقرر ہوا، وہ بھی امرائے چہلگانی میں سے تھا۔ لیکن بلبن نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے امراء کا زور توڑ دیا اور چہلگانی جماعت ختم کردی۔ علاء الدین اور محمد تغلق نے بھی اپنے امراء کو وہ اہمیت نہیں دی اور مطلق العنانی برقرار رکھی۔ لودھیوں کے زمانہ میں افغان امیروں نے پھر قوت حاصل کرلی تھی، اور ان ہی کے انتشار کے نتیجہ میں حکومت دہلی ان کے ہاتھوں سے چلی گئی۔

بادشاہ کا اقتدار اگرچہ خودمختارانہ تھا، اوراس کے اوپر کوئی طاقت نہ تھی، لیکن حکمرانوں کو بہت سارے مواقع پر اپنے امیروں کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ علاء الدین خلجی نے بغاوتوں پر قابو پانے کے لئے اپنے خاص امراء کے ساتھ تین دنوں تک مشورہ کیا اور کافی غور وخوض کے بعد جو تجاویز مرتب ہوئی تھیں ان کو سختی کے ساتھ اس نے نافذ کیا۔ دہلی سلطنت مسلم حکومت تھی، اس لئے بادشاہ سے اس بات کی توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ دین و شریعت کا محافظ اور پناہ گاہ ہوگا۔ قطب الدین، التمش اور بلبن خود بھی بڑے دیندار اور پابند شریعت تھے، ان کے درباروں میں علماء اور فقہاء کو بڑا اعزاز حاصل تھا، بادشاہ کئی موقعوں پر ان سے مشورے کرتا تھا، وہ بھی موقع بہ موقع بادشاہ کو نصیحت کرتے اور شرعی احکام کی یاد دہانی کراتے۔ التمش کی مجلس میں شیخ نورالدین مبارک غزنوی نے مشہور نصیحت کی تھی جس میں بادشاہ کے شرعی فرائض اسے یاد دلائے تھے۔ التمش اور بلبن کے دسترخوان پر سینکڑوں علماء ہوتے جن سے مذہبی گفتگو اور حکومت کے کام کاج کی بابت مشورے ہوتے تھے، لیکن یہ بادشاہ بھی ملکی مصالح میں شریعت کے پابند نہیں ہوتے تھے۔ علاء الدین خلجی اور محمد تغلق نے ان کا اثر کم کرنے کی کوشش کی، قاضی مغیث الدین بیانوی کے ساتھ علاء الدین کی گفتگو اس ضمن میں مشہور ہے جس میں بادشاہ نے اگرچہ قاضی سے بیت المال کی آمدنی کے ذاتی استعمال، سزاؤں میں اس کے طریقے اور دوسرے پیچیدہ امور کے بارے میں شریعت کی رائے جاننی چاہی، لیکن وہ قاضی کے شرعی جواب پر عمل کے لئے آمادہ نہ ہوا۔

سلاطین دہلی میں سے کئی حکمرانوں نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ خود کو خلیفۃ المسلمین کا نائب بنا کر پیش کریں، عباسی خلافت اگرچہ دم توڑ رہی تھی، لیکن دہلی کے مضبوط ترین سلطان التمش نے اپنے لئے عباسی خلیفہ مستنصر باللہ سے سند توثیق منگوائی، اور خلیفہ کے منشور کا اس نے بڑے احترام واہتمام کے ساتھ استقبال کیا۔ اپنے خطبہ میں خلیفہ کا نام شامل کیا، سکوں پر اس کے نام کندہ کروائے اور خود اپنے لئے خلیفہ کے نائب کا لقب اختیار کیا۔ محمد بن تغلق نے بھی مصر کے عباسی خلیفہ سے اپنے لئے سند توثیق منگوائی تھی۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں گو کہ بغداد کی عباسی حکومت ختم ہو چکی تھی، لیکن اس نے دو مرتبہ خلیفہ سے ایسی سندیں حاصل کیں اور اپنی سلطنت کو شرعی استناد فراہم کیا۔ البتہ بلبن نے خود کو ہی خلیفہ کہلوایا، اس کا نظریہ تھا کہ بادشاہ زمین پر اللہ کا نائب ہے، اور اس کا مقام بہت بلند ہے، اپنے اس نظریہ کے تحت بلبن نے اپنے دربار کی شان وشوکت اور دبدبہ شاہی کو انتہائی بلندی پر برقرار رکھا۔ صرف قطب الدین مبارک خلجی نے سکوں پر سے خلیفہ کا نام ہٹوا دیا تھا۔

بادشاہ کی ذمہ داری سلطنت کی حفاظت، امن وقانون کی برقراری، محاصل کی وصولیابی، عوام ورعایا کی خوشحالی اور عدل کا قیام تصور کیا جاتا تھا، سلطان ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مختلف ذیلی محکموں اور افراد کی مدد لیتا تھا، اور مختلف کاموں کے لئے علاحدہ علاحدہ شعبے قائم کردئے تھے، ان تمام شعبوں کا آخری سربراہ خود بادشاہ تھا، ان محکموں کے قیام اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے بادشاہ اپنے مخصوص امیروں اور عقلمند عہدیداروں سے مشورے لیا کرتا تھا، یہ مشاورتی کونسل بھی بادشاہ کی صوابدید پر ہوتی تھی اور اس کے افراد کی تعداد اور ان کی تعیین بدلتی رہتی تھی، جو بسا اوقات درپیش مسئلہ کی نوعیت اور سنگینی کے لحاظ سے ہوتی تھی۔

6.4 مرکزی حکومت

سلطنت کے نظام کو بہتر طریقہ پر چلانے کے لئے تمام مفتوحہ علاقوں کو مختلف صوبوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، صوبوں کی تعداد مختلف زمانوں میں بدلتی رہی تھی۔ دہلی سلطنت کا ابتدائی دور استحکام اور وسعت کا تھا، ایبک اور اس کے بعد التمش اور بلبن کے عہد میں نئی فتوحات جاری

تھیں، اور نئے علاقے داخل سلطنت ہورہے تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ میں جب سلطنت دہلی کی سرحدیں شمال اور مشرق ومغرب کی وسعتوں کے ساتھ پہلی مرتبہ جنوب میں دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھیں تو اس وقت دہلی سلطنت اپنی وسعت کی بلندی پر تھی، ایسے وسیع علاقے کے انتظام کے لئے اسے بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کردیا گیا۔ ان میں بعض صوبے ملتان، گجرات، دیوپال پور، چتوڑ، بدایوں، اودھ اور بنگالہ وغیرہ تھے۔ صوبوں کو پرگنہ میں تقسیم کیا گیا تھا، اور ہر پرگنہ میں کئی کئی گاؤں ہوتے تھے۔

مرکزی حکومت کے نظام کے لئے مرکز میں وزراء مقرر کئے جاتے تھے، جو اپنے محکموں سے متعلق کاموں کو پوری مملکت کے اندر دیکھتے تھے، صوبے بھی ان کے اندر آتے تھے، البتہ صوبائی سطح پر داخلی انتظامات کیلئے اسی طرح کے محکمے صوبوں میں بھی قائم کئے جاتے تھے، جن کے سربراہان مرکزی وزراء اور عہدیداروں کی ماتحتی میں کام کرتے تھے، کئی محکمہ پرگنہ کی سطح پر بھی قائم کئے گئے تھے جن کی نگرانی صوبائی عہدیداروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔

مرکز میں قائم ہونے والے بڑے بڑے محکموں میں فوج، محاصل، قضاء و مذہبی امور، فرامین ومراسلات، شاہی محل، پولیس وجاسوس، ڈاک اور صوبائی نظم وغیرہ تھے۔ ان کے عہدیداران وزراء اور دوسرے مختلف ناموں سے جانے جاتے تھے۔ محکموں اور وزراء کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، اور ان کے اختیارات اور فرائض میں بھی مختلف حکومتوں میں فرق ہوا کرتا تھا۔

6.4.1 وزراء

مرکز کے وزراء میں سب سے اہم عہدہ وزیر کا تھا، اس کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی، جو بادشاہ کے بعد دوسرے نمبر کا شخص ہوتا تھا، بادشاہ کا قابل اعتماد اور اس کا نائب۔ شروع میں یہ عہدہ صرف وزیر کے نام سے تھا، التمش کے بعد اس کی اہمیت اور اختیارات میں کمی آگئی تھی، نائب الممالک کو بادشاہ کے بعد والے شخص کے اختیارات حاصل ہوگئے تھے، چنانچہ بلبن ترقی کرتا ہوا ناصر الدین محمود کے زمانہ میں نائب الممالک کے عہدہ پر فائز ہوگیا تھا، اور ایک طرح سے وہی پوی مملکت کے سیاہ وسپید کا مالک تھا۔ علاء الدین کے زمانہ میں ملک کافور نائب الممالک کے عہدہ تک پہنچا تھا۔ وزیر کا عہدہ عملی لحاظ سے دیوان وزارت کے سربراہ کا رہ گیا تھا، اور دیوان وزارت کے ذمہ مالیات اور محاصل کی نگرانی کا کام آگیا تھا۔ دیوان وزارت کے تحت مالیات ذمہ داری کے آجانے سے پوری مملکت کی آمد وخرچ اور ان کا حساب کتاب اس وزارت سے متعلق ہوگیا تھا ، وہ اپنے ماتحت عملوں کے ساتھ خالصہ یعنی شاہی زمینوں کا لگان اور باجگذار حکمرانوں سے خراج وصول کرتا تھا، صوبائی حکومتوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا، اور وہاں کے فاضل محصول وصول کرتا تھا۔ محاصل کے کاموں کے لیے اس وزیر کے تحت دو اور افسران ہوتے تھے، ایک کا عہدہ مشرف ممالک کہلاتا تھا جس کے ذمہ مملکت کی آمدنیوں کی دیکھ بھال تھی، یہ آج کی اصطلاح میں اکاؤنٹنٹ جنرل کے برابر کا عہدہ تھا، دوسرے کا عہدہ مستوفی ممالک کہلاتا تھا جو اخراجات کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا۔ اسے موجودہ اصطلاح میں آڈیٹر جنرل کہا جاسکتا ہے۔ مستوفی کے ماتحت ایک اور افسر ہوتا تھا جسے وقوف کہتے تھے۔ یہ عہدہ جلال الدین خلجی نے جاری کیا تھا، اس کا کام مصارف کی مدوں کا جائزہ لینا تھا۔ اسی دور میں ایک عہدہ ناظر منصب کا نکالا گیا جو عاملوں کی طرف سے مشرف ممالک کو بھیجے جانے والے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا، نچلی سطح کے عہدوں میں عامل، کارکن اور متصرف ہوا کرتے تھے۔ دیوان وزارت کا کام کافی وسیع اور پیچیدہ ہوا کرتا تھا۔ التمش کا وزیر فخر الدین عصامی تھا جس نے بغداد کے محکموں میں تیس برس کام کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ پھر اس کی جگہ نظام الملک جنیدی مقرر ہوا، جو بڑا قابل شخص تھا۔ بلبن خود وزیر

اور نائب الممالک رہا تھا لیکن بادشاہ بننے کے بعد اس عہدہ کو اس نے ختم کر دیا تھا، خواجہ حسن کو اس نے وزیر بنایا تھا جو بہت کم مشہور ہے۔

علاء الدین کے زمانے میں اس عہدہ پر خواجہ خطیر مقرر تھا، پھر نصرت خاں کو اس منصب پر فائز کیا گیا اور آخر میں ملک کافور نائب مملکت کے ساتھ وزیر خاص بھی تھا اور مالیات کا قلمدان اس کے پاس رہا۔ سید خاندان کے عہد میں اسے وکیل السلطنت کا نام دیا گیا تھا۔ محمد بن تغلق نے احمد ایاز کو خان جہاں کے خطاب کے ساتھ وزیر مقرر کیا تھا' جو معمر اور تجربہ کار آدمی تھا۔ فیروز تغلق کا وزیر خاں جہاں مقبول تھا جو تلنگی سے مشہور تھا اور نومسلم برہمن تھا، یہ نہایت لائق شخص تھا اور فیروز شاہ نے تمام معاملات اس کے سپرد کر دیے تھے۔

دوسرا وزیر سربراہ فوج تھا، اس کا عہدہ دیوان عرض کہلاتا تھا، اسے عارض ممالک بھی کہتے تھے۔ یہ اہم عہدہ تھا اور اہمیت میں وزیر خاص کے بعد دوسرے نمبر پر تھا، اس کے ذمہ سپاہیوں کی بھرتی، فوجیوں کے ساز و سامان کی نگرانی، ان میں تنخواہوں کی تقسیم اور وقفہ وقفہ سے عرض یعنی فوج کا معائنہ کرانا داخل تھا۔ اس کے تحت کئی نائب ہوا کرتے تھے جو بخشی بھی کہلاتے تھے۔ عارض ممالک فوج کا سربراہ یا سپہ سالار اعظم نہیں ہوتا تھا، بلکہ ہر فوج کے کمانڈر کی تقرری بادشاہ خود کرتا تھا، البتہ عارض ممالک یا اس کے نائب اور بخشی کا کام یہ تھا کہ میدان جنگ میں صوبائی گورنروں کے بھیجے ہوئے فوجی دستوں کا خیر مقدم کرے۔ سپاہیوں میں تنخواہوں کی تقسیم، سامان رسد اور ذرائع حمل و نقل کا انتظام اور اموال غنیمت کا انتظام و انصرام اس کے ذمہ تھے، وزیر جنگ کے اختیارات بڑے وسیع تھے۔

تیسری وزارت دیوان انشاء کہلاتی تھی، اس وزارت کا کام شاہی فرامین اور اعلانات کا مسودہ تیار کرنا، صوبائی گورنروں اور دیگر افسروں کے ساتھ رسل و رسائل کا رابطہ رکھنا اور سرکاری دستاویزات کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کے تحت سکریٹریوں کا ایک بڑا عملہ ہوا کرتا تھا، یہ لوگ دبیر کہلاتے تھے، ان دبیروں کا سربراہ دبیر مملکت کہلاتا تھا، یا صاحب دیوان انشا بھی کہلاتا تھا، بادشاہ کا پرائیوٹ سکریٹری دبیر خاص کہلاتا جو بادشاہ کے خط و کتابت کا نگراں ہوتا تھا۔

مملکت کا چوتھا وزیر دیوان رسالت تھا، اسے موجودہ زمانے کی اصطلاح میں وزیر خارجہ کہا جا سکتا ہے اس کے ذمہ دوسری حکومتوں کے درباروں میں خط و کتابت بھیجنا تھا، غیر ممالک سے آنے والے سفراء اور نمائندوں سے یہی قریبی رابطہ رکھتا تھا، اسی کی نگرانی میں دوسرے ممالک میں سفراء بھیجے جاتے تھے۔

6.4.2 جاسوس اور پولیس

ایک اہم عہدہ برید ممالک کا تھا، اس کے تحت پورے ملک میں واقعہ نویس اور جاسوس مقرر ہوتے تھے، جو مملکت کی ہر چھوٹی بڑی بات سے بادشاہ کو باخبر رکھتے تھے، یہاں تک کہ مملکت کی سرحد میں داخل ہونے والے شخص کے ذاتی کوائف اور حلیہ و لباس تک کی تفصیلات سے فوری طور پر بادشاہ کو باخبر کر دیا جاتا تھا۔ برید ممالک کے تحت بریدوں کی ایک پوری جماعت ہوتی تھی جو شہروں، بازاروں اور ہر آباد محلّہ میں تعینات ہوتی تھی، ان کا کام سلطنت میں واقع ہونے والے ہر کام کی خبر بادشاہ کو دینا تھا۔ برید سلطنت کے کان اور آنکھ ہوا کرتے تھے، بریدوں کے علاوہ بھی مخبر مقرر کیے جاتے تھے، جو منہی کہلاتے تھے، وہ مختلف درجوں میں منقسم ہوتے تھے اور وہ بادشاہ کو عوام و خواص کے معمولی معاملات سے بھی باخبر رکھتے تھے، یہ منہی لوگوں کے گھروں میں داخل ہو سکتے تھے، علاء الدین اسی محکمہ کی سخت نگہداشت کے ذریعہ بازار کا کنٹرول قائم رکھنے میں

کامیاب ہوا تھا۔اس محکمہ میں جاسوسوں کے ساتھ پولیس بھی مقرر تھے، پولیس کا افسر اعلیٰ کوتوال کہلاتا تھا، وہ امن وقانون کا محافظ ہوتا تھا اور اہم معاملات میں سلطان کومشورہ دیا کرتا تھا، پایہ تخت سے سلطان کی عدم موجودگی میں وہ شاہی حرم کا بھی نگہباں ہوتا تھا، بلبن کے زمانہ میں کوتوال کا بادشاہ پر بہت اثر تھا۔دہلی کا کوتوال اس زمانہ میں ملک فخرالدین تھا، جواہم معاملات میں بلبن کومشورہ دیا کرتا تھا، اس کا داماد ملک نظام الدین کیقباد کے زمانہ میں نائب کوتوال بن کر بادشاہ پر کافی اثر ورسوخ رکھنے لگا تھا، اور بغرا خاں کے مشورہ پر کیقباد نے اسے راستہ سے الگ کیا۔علاء الدین کے زمانہ میں ملک علاء الملک مشہور کوتوال تھا جوضیاء الدین برنی کا چچا تھا' اس نے بادشاہ کو بڑی صفائی اور جرأت کے ساتھ معتدل مشورے دئے تھے، جس کی وجہ سے علاء الدین خلجی اپنے دومنصوبوں سے یعنی کسی نئے طریقہ ومذہب کوجاری کرنے اور یونان کے سکندراعظم کی طرح عالمگیر فتوحات پر نکلنے سے باز رہا۔

اسی محکمہ کے تحت ایک افسر محتسب کے نام سے تھا جوعوام کے اخلاق کا نگراں اور لوگوں کے کردار پر نظر رکھنے والا ہوتا تھا، اس کے علاوہ وہ بازار کی اشیاء اور ناپ وتول کے پیمانوں کی بھی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا، تاجروں پر سخت نگہداشت رکھنے کے لئے شحنہ کے نام سے بھی ایک عہدہ تھا۔

6.4.3 حرم شاہی کے عہدیداران

بادشاہ کا محل، دربار، مطبخ' حرم شاہی اور سیکوریٹی وغیرہ خود اپنے آپ میں وسیع انتظامات کے متقاضی ہوا کرتے تھے، ان کاموں کے لئے علاحدہ علاحدہ عہدیدار مقرر تھے، اور ان کی ذمہ داریاں بڑی اہمیت کی حامل اور نزاکت بھری ہوتی تھیں۔بادشاہ کی حفاظت سے لے کر دربار کے آداب ورسوم اور دربار کی مجلسوں تک نیز حرم شاہی کے لئے خورد ونوش و پوشاک اور شان وشوکت نیز سفر کے دوران عارضی محل کے تمام انتظامات انہی عہدیداروں سے متعلق ہوا کرتے تھے۔انھیں بادشاہ کے پاس رسائی سے زیادہ مواقع ہوا کرتے تھے اور ان پر بادشاہ کی نظر بھی گہری رہا کرتی تھی۔اسی طرح بادشاہ کے حرم کا اپنا انتظامیہ بڑا وسیع ہوجایا کرتا تھا۔

حرم شاہی کے عہدیداروں میں ایک عہدہ وکیل در کا ہوتا تھا، یہ محل کے دروازوں کا کلید بردار ہوتا تھا، اور اس کے ذمہ پورے محل اور دربار کے انتظام وانصرام کودیکھنا تھا، یہ محل کا اہم ترین افسر ہوا کرتا تھا، محل کے عملہ کی تنخواہیں تقسیم کرنا، شاہی اولاد کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا، محل کا مطبخ، شاہی ملبوسات اور شاہی اصطبل اس کے ذمہ میں ہوتے تھے۔اس عہدہ کی نزاکت بہت زیادہ ہوا کرتی تھی، بادشاہ کی معمولی ناراضگی، ذرا سا بھی شک وشبہ اس کی جان کے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔وکیل در کے ساتھ اس کا نائب بھی ہوتا تھا اور بہت بڑے عملہ کے ذریعہ وہ اپنے فرائض کوانتہائی ذہانت وصلاحیت اور قابلیت کے ساتھ ادا کرتا تھا۔شاہی محل کے عملہ اور کارکنوں وخادموں کی تعداد سینکڑوں میں ہوا کرتی تھی۔

ایک اہم عہدہ امیر حاجب کا تھا، یہ سلطان سے تنہائی میں ربط رکھنے والا افسر ہوتا تھا، یہی دربار کے آداب کا نفاذ کرتا تھا، اور جلسوں اور تقریبات کے انتظامات دیکھتا تھا، دربار میں باریابی کے آداب اور امراء وافسران کی نشست گاہوں کی تعیین اس سے متعلق ہوتی، یہ بڑی اہم ذمہ داری تھی اور دربار میں ملاقات کے طریقے اور اس کی شان وشوکت اس سے وابستہ ہوتی تھی، بلبن کے زمانہ میں دربار کی شان وشوکت اور اس کے دبدبہ کا اہتمام بہت زیادہ کیا جاتا تھا، کہا گیا ہے کہ جب بلبن کا دربار آراستہ ہوتا تو ملوک وامراء نقیب وچاؤش اور دیوپیکر جوان ننگی تلواریں لئے اس کے دیگرد وپیش کھڑے رہتے، باہر کا کوئی سفیر یا مقامی کوئی راجہ دربار میں باریاب ہوتا تو سلام کے وقت خوف سے گرجاتا یا بے ہوش

ہوجاتا۔ چنگیزی فتنوں سے پریشان ہوکر بلبن کے دربار میں پندرہ شہزادے پناہ لئے ہوئے تھے، ان میں سے سوائے دو عباسی شہزادوں کے سبھی شہزادے تخت شاہی کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے۔ دربار کے بڑے بڑے امراء پر ایسی ہیبت رہتی کہ بلبن کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے، جب اس کی سواری نکلتی تو تماشائی اور سامعین پر لرزہ طاری ہوجاتا، برنی کے مطابق بلبن نے اپنی حکومت کے بیس سالہ دور میں شاہی وقار، شاہی آداب اور شاہی دبدبہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ بلند نہ ہوسکا۔ دربار کی اس شان وشوکت کے انتظام کی ذمہ داری امیر حاجب کے ذمہ ہوا کرتی تھی۔ امیر حاجب کو باربک کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔

ایک افسر سرجاندار کے نام سے تھا، یہ بادشاہ کے ذاتی محافظوں کا سربراہ ہوتا تھا، بادشاہ کی حفاظت میں بڑے توانا اور مضبوط نسل کے نوجوان اسلحوں کے ساتھ اردگرد کھڑے رہتے تھے، انھیں جاندار کہا جاتا تھا، اور ان کا یہ سربراہ سرجاندار کہلاتا تھا، بلبن کے دربار میں سینکڑوں دیو پیکر نوجوان ننگی تلواریں لئے کھڑے رہتے تھے جو اچانک کسی حملہ کے وقت تحفظ کے لئے تیار رہتے تھے اور ان سے دربار کی شان وشوکت میں بھی اضافہ ہوتا تھا، اسکی سواری کے جلو میں پانچسو سیستانی، عربی، سمرقندی اور غوری سوار ننگی تلواروں کے ساتھ نعرے بلند کرتے ہوئے چلتے تھے۔

بادشاہ کے معمولات میں سیر وشکار اور اس غرض سے سفر بھی ہوا کرتا تھا، شکارگاہ کی نگرانی امیر شکار کے ذمہ ہوا کرتی تھی، شاہی فوج کے ہاتھیوں کا ذمہ دار شحنہ پیلان کہلاتا تھا، اور سرکاری اسلحوں کا سربراہ سرسلاحدار ہوتا تھا، شاہی مہر بردار مہردار کہلاتا اور گھوڑوں کا افسر امیر آخور کہلاتا ، یہ شاہی سوار فوج کا سربراہ ہوتا تھا۔

شاہی محل کا ایک اہم کام مطبخ سے متعلق ہوا کرتا تھا، اسکے پاس نہ صرف شاہی افراد خاندان کے خورد ونوش کا انتظام تھا بلکہ بڑی شاہی ضیافتوں کا اہتمام بھی ہوا کرتا تھا۔ شاہی مطبخ کا نگراں سرچاشنی گیر اور مشروبات کا ذمہ دار شرابدار کہلاتا تھا۔ اس طرح کے بہت سے عہدے شاہی حرم سے متعلق ہوا کرتے تھے۔

شاہی حرم کے یہ وزراء، افسران اور سکریٹریز بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے، وہ بادشاہ سے بہت قریب ہوتے تھے اور اپنے مقام و حیثیت کے لحاظ سے خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔

معلومات کی جانچ:

1۔ دہلی سلطنت میں اقتدار اعلیٰ کس کے ہاتھ میں تھا؟

2۔ فوج کے سربراہ کو کیا کہتے تھے اور اس کے کیا اختیارات ہوتے تھے؟

3۔ بریدممالک کسے کہتے تھے اور اس کے کیا کام ہوتے تھے؟

6.5 صوبائی حکومتیں

دہلی سلطنت کا رقبہ اپنی ابتداء سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا، علاء الدین خلجی کے عہد تک تقریباً پورے شمالی اور جنوبی ہندوستان پر دہلی حکومت قائم ہوچکی تھی، مملکت کے انتظام کے لئے ان مفتوحہ علاقوں کو بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، بعض صوبے پہلے ہی سے

بڑے اور معروف تھے، جہاں دہلی سلطنت سے قبل چھوٹی حکومتیں تھیں اور دہلی سلطنت نے انھیں فتح کرلیا تھا، جیسے گجرات اور ملتان کی حکومتیں وغیرہ۔ بعض علاقوں کو صوبے کی حیثیت دی گئی، ان صوبوں کے علاوہ کچھ ایسے بھی علاقے تھے جن کو دہلی سلطنت کے تابع بنا کر حکومت پر سابق حکمرانوں کو باقی رکھا گیا کہ وہ مرکز کو خراج ادا کرتے رہیں، یہ باجگذار کہلاتے، جیسے شروع میں تلنگانہ کی حکومت اور راجستھان کی بعض راجپوت حکومتیں تھیں۔

علاء الدین کے زمانہ میں صوبوں کی تعداد گیارہ تھی جن کے علاحدہ علاحدہ گورنر مقرر تھے۔ گجرات پر الپ خاں مقرر تھا، ملتان کافور کے تحت تھا، دیوپال پور میں غازی ملک متعین تھا، اجین میں عین الملک ملتانی گورنر تھا، بدایوں کا گورنر ملک دینار تھا، سامانہ کی گورنری آخور بیگ کے تحت تھی، چتوڑ پر ملک ابومحمد گورنر بنایا گیا تھا، چندیری ملک تمر کے تحت، اودھ ملک بکتن کے تحت اور کڑہ ملک نصیر الدین سوتیلہ کے تحت تھے اور جھائن پر فخر الملک میرٹی گورنر تھا۔

صوبے اپنی جگہ مکمل یونٹ تھے اور وہاں گویا بادشاہ دہلی کے ماتحت خودمختارانہ حکومت تھی۔ صوبہ کے گورنر کی تقرری بادشاہ خود کرتا تھا، اسے صوبہ دار کہا جاتا تھا، وہ اپنے صوبہ میں آزادانہ حکومت کرتا تھا اور صوبائی سطح پر وہاں بھی مرکز کی طرح محکمے ہوتے تھے۔ صوبہ داروں کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا، اور گورنری ختم بھی کردی جاتی تھی، یہ سب کچھ صوبہ دار کے انتظام وانصرام اور بادشاہ کے ساتھ اس کے مراسم پر موقوف تھا۔ بعض صوبے بہت بڑے بڑے تھے، جیسے بنگالہ کا صوبہ جو لکھنوتی کہلاتا تھا، یا دکن کا صوبہ جس میں کئی چھوٹی حکومتوں کو شامل کردیا گیا تھا۔ اپنی فوجی قابلیت اور صلاحیتوں کی بنیاد پر صوبہ دار کی تقرری ہوتی، بادشاہ اپنے شاہزادوں کو بھی صوبوں کی گورنری پر مقرر کرتا تھا، یہ صوبے مقطع بھی کہلاتے تھے، اور یہاں کے سربراہ مقطع دار۔ ایبک نے التمش کو بدایوں کا مقطع دار بنایا تھا۔ خود ایبک شہاب الدین غوری کے ذریعہ دہلی کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ بلبن نے اپنے بڑے بیٹے خان محمد کو ملتان کی گورنری پر مقرر کرکے منگولوں کی روک تھام اس کے سپرد کی تھی، ملتان میں خان محمد کا دربار اہل علم وفضل کا مرکز تھا جس سے امیر خسرو جیسے فاضل بھی وابستہ تھے، اس نے اپنے دربار میں شیراز سے شیخ سعدی کو بھی بلانے کی کوشش کی تھی۔ بلبن کا دوسرا بیٹا بغرا خاں لکھنوتی (بنگال) کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ علاء الدین خلجی بادشاہ ہونے سے قبل کڑہ کا گورنر تھا اور اس کا سپہ سالار ملک کافور ملتان کا گورنر بنایا گیا تھا۔ غیاث الدین تغلق بادشاہ ہونے سے قبل دیوپال پور کا گورنر تھا۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں اس کی پالیسیوں سے ناراض ہوکر اور مسلسل ہورہے مالی وفوجی نقصان کے پیش نظر ان صوبائی گونروں نے ہی بغاوت کا علم بلند کردیا تھا، محمد بن تغلق نے کچھ بغاوتوں پر قابو پایا اور انھیں دہلی سلطنت کے تابع بنالیا، لیکن کچھ صوبے تو ایسے آزاد ہوئے کہ پھر وہ دہلی سلطنت کا حصہ نہ بن سکے، جیسے دکن، گجرات، بنگالہ اور ملتان وغیرہ۔ بلکہ اسی زمانہ میں کئی ہندو ریاستیں قائم ہوگئیں، جیسے راجستھان کی حکومتیں اور جنوب میں وجے نگر کی حکومت وغیرہ۔

باجگذار ریاستیں جو وہاں کے حکمرانوں کے تحت رہنے دی جاتی تھیں، ان کا داخلی انتظام مرکز سے متعلق نہیں ہوتا تھا۔ صرف انھیں سالانہ خراج کی ادائیگی کرنی ہوتی اور ضرورت پڑنے پر فوجی امداد فراہم کرنی ہوتی تھی، اور سکوں پر بادشاہ دہلی کا نام رہتا تھا۔ دیوگیری کے رام دیو اور دوسرے جنوبی ہند کے حکمراں ایسے ہی باجگذار تھے۔

صوبوں کی حکومتوں میں تمام اہم محکمے موجود ہوتے تھے، صوبائی گورنر ایک طرح سے چھوٹا بادشاہ ہوتا تھا، دہلی کے بادشاہ کی طرح وہ بھی اپنے صوبہ میں انتظامیہ اور عدلیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے دربار منعقد کرتا تھا، عدل وانصاف کے محکمہ کی نگرانی اور عدالت اپیل کا کام کرتا،

صوبے کا لگان صول کرتا اور امن وقانون کو یقینی بنائے رکھتا تھا، یہ صوبے دار عام طور پر اپنے صوبے یا مقطع میں مقیم رہتے تھے، لیکن بعض حالات میں انھیں دہلی کے شاہی دربار میں بھی رہنا پڑتا تھا، اور نائبوں کے ذریعہ صوبہ کے نظم ونسق کو چلانا پڑتا تھا۔

صوبائی گورنروں کی تنخواہ اس کے اقطاع کے کل محاصل کے تناسب سے مقرر کی جاتی تھی، وہ صوبے کے محصولہ لگان میں سے اپنی مقررہ رقم منہا کر کے فاضل رقم شاہی خزانے میں جمع کرادیتا تھا، وہ اپنے صوبہ کے حسابات کے لئے مرکز کے دیوان وزارت (وزارت مالیات) کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا، جہاں اس کے آمد وخرچ کی پابندی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی، مرکزی حکومت ہی صوبائی گورنر کی فوج کی تعداد متعین کرتی تھی، اور مقطع اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ گویا مرکز کی جانب سے صوبہ کی فوجی حیثیت کی تعیین ہوا کرتی تھی، سلطان کے برید اور جاسوس مقطعوں اور صوبوں کے اندر بھی ہر جگہ مقرر رہتے تھے جو صوبے کے حالات اور چھوٹی بڑی سرگرمی کی خبریں بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ اس کی وجہ سے گورنر بھی وفادار رہنے کی کوشش کرتے تھے، اور بغاوت کی ہلکی سے بھنک بھی کم وقت میں بادشاہ تک پہنچ جاتی تھی، خسرو خاں کی بغاوت کی خبر دکن کے دور دراز علاقہ سے دہلی پہنچ گئی تھی۔ ان پابندیوں کے علاوہ صوبہ دار کو کافی آزادی حاصل تھی، اور وہ اپنی قابلیت وصلاحیت اور وفاداری کی بنیاد پر طویل عرصہ تک گورنری پر برقرار رہ سکتے تھے۔ دیوپال پور میں غازی ملک اور گجرات پر الپ خاں نے طویل مدت تک گورنری کی۔

ان صوبوں کے علاوہ کچھ علاقے براہ راست مرکز کے زیر انتظام ہوتے تھے، یہ علاقے خالصہ کہلاتے تھے، اس کے اندر مختلف اضلاع اور شہر تھے، ان پر مقطع کے بجائے امیر شحنہ حکومت کرتے تھے، یہاں کے افسران دیوان وزارت سے تنخواہ پاتے تھے، اور اسی کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔

6.6 پرگنے اور گاؤں

دہلی سلطنت کے علاقوں کو بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جہاں صوبہ دار چند شرائط کے ساتھ پوری آزادی سے حکومت کرتے تھے، یہ صوبے بھی پرگنوں میں تقسیم تھے، پرگنہ ایک طرح سے ضلع کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ ایک پرگنہ کئی گاؤں پر مشتمل ہوا کرتا تھا، ضلع کو سرکار بھی کہتے تھے، صوبہ کے تحت شق بھی ہوتے تھے، جن کے سربراہ کو شق دار کہا جاتا تھا، پرگنہ کے اندر موجود ہر گاؤں کا ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا جسے عامل کہا جاتا تھا، گاؤں کے سربراہ کے لئے مقدم کا نام استعمال ہوتا تھا، اور زمین کے مالکان خوط کہلاتے تھے۔ پرگنہ اور گاؤں کی سطح پر نظم وانتظام، مذہبی معاملات اور رسوم ورواج میں مرکز کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوتی تھی، یہاں پہلے سے چلا آرہا سابق نظام باقی رکھا گیا تھا، گاؤں میں مالیات کا ذمہ دار پٹواری کہلاتا تھا، اور اس کے ذریعہ گاؤں کی محصولی پرگنہ اور صوبہ سے ہو کر مرکزی حکومت تک پہنچتی تھی۔

6.7 فوج

دہلی سلطنت کے نظم ونسق کا ایک حصہ فوج کا انتظام تھا، حکومت چونکہ بنیادی طور پر فوجی نوعیت کی تھی، اس لئے حکومت کی بقاء فوج کی اعلی قابلیت پر ہی منحصر تھی۔ پھر اس دور میں مرکزی حکومت کے اندر بادشاہ کو نہ صرف اپنی بادشاہت کو باقی رکھنے کے لئے فوجی قوت پر اعلی دسترس

کی ضرورت ہمیشہ رہتی تھی، بلکہ ملک کے اندر وقتاً فوقتاً اٹھنے والی بغاوتوں پر قابو پاکر صوبوں کو مرکزی اقتدار سے وابستہ رکھنے کے لئے، مختلف علاقائی ہندو حکومتوں پر قابو رکھنے کے لئے اور خاص طور پر شمال مغربی سرحدوں کی طرف سے بار بار امنڈ کر اٹھنے والے خطرناک منگولی سیلاب سے تحفظ کے لئے بادشاہ کو پوری طرح فوجی قوت پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے دہلی سلطنت کے جن بادشاہوں نے اپنی فوج مضبوط رکھی ان کی حکومتیں مستحکم رہیں، اور جہاں فوجی قوت میں کمزوری آئی علاقے ہاتھوں سے نکل گئے۔

دہلی سلطنت کے تمام ہی حکمراں بنیادی طور پر اعلیٰ قابلیت رکھنے والے فوجی تھے، اور انھوں نے میدان جنگ میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور بہادری کا مظاہرہ کر کے ہی تخت سلطنت تک رسائی حاصل کی تھی۔ قطب الدین ایبک اعلیٰ درجہ کا قابل فوجی سربراہ تھا، التمش کی فوجی قابلیت نے ہی اسے تخت نشین کیا۔ التمش کے بعد تخت نشینی کی جنگ چلی اور واحد خاتون بادشاہ رضیہ سلطان کو اس کی قابلیت کی وجہ سے ہی تخت سلطنت نصیب ہو سکا، بلبن کا طویل دور حکومت اس کی فوجی عظمت اور شاہانہ شوکت و شان کی مرہون منت ہے۔ بلکہ اس نے منگولوں کو بھی اپنی فوجی سطوت و قوت کا خوف دلانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ کیقباد کمزور اور ناز و نعمت کا پروردہ تھا، حکومت کا عصا مضبوطی سے نہ تھام سکا اور فیروز خلجی کی فوجی صلاحیت کام آئی اور حکومت خاندان خلجی میں منتقل ہوگئی، علاء الدین خلجی کو سکندر ثانی اس کی فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے کہا جاتا ہے، اس کی فوجی مضبوطی کی وجہ سے دہلی سلطنت جنوب تک پہنچ سکی، خسرو خاں نے اگرچہ حکومت خاندان خلجی سے غصب کرلی لیکن اس موقع پر بھی غازی ملک کی غازیانہ صلاحیت نے ہی دہلی سلطنت پر اس کے قدم جمادئے۔ محمد تغلق کے بعد جب فوجی قوت میں کمزوری آئی تو دہلی سلطنت کے ٹکڑے ہوتے گئے اور چھوٹی چھوٹی علاقائی حکومتیں وجود میں آگئیں۔

دہلی سلطنت میں فوج کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہر بادشاہ نے فوجی تیاری پر خاطر خواہ توجہ دی، کیونکہ اس زمانہ میں یہی تصور تھا کہ ''بادشاہت فوج ہے اور فوج بادشاہت''۔ ترکی نسل سے تعلق رکھنے والے ان بادشاہوں کی فوج اعلیٰ معیار کی تھی، اس کے سپاہی نہ صرف اپنی فوجی تربیت میں بہتر تھے بلکہ سامان جنگ اور اسلحوں کا معیار بھی اونچا تھا، پھر وہ حکمت و تدبیر کے ساتھ لڑتے تھے۔ شہاب الدین غوری کے مقابلوں میں ترائن کی دونوں جنگوں میں ہندوستانی فوج کے مقابلہ ترکی فوج کی برتری عیاں تھی۔

فوج کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ فوج کی ایک قسم بادشاہ کے ذاتی محافظوں پر مشتمل ہوتی تھی، یہ فوج جاندار کہلاتی تھی، وہ سلطان کی نگرانی اور ملازمت میں رہتے تھے۔

دوسرے گھوڑ سوار اور پیادہ فوج تھی، یہ سلطنت کی مستقل اور متعینہ فوج کا حصہ تھے، تیسرے مخصوص سپاہی ہوتے جو جنگ کے زمانے میں بھرتی کئے جاتے تھے، اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے، بلبن کے زمانہ کی فوج کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان میں لڑاکے پہلوان، دوڑنے والے شطار اور ہر قسم کے لوگ پائے جاتے تھے، ان کے پاس بہترین گھوڑے، شان دار اسلحے اور خوبصورت ملبوسات تھے۔ ترکی بادشاہوں نے اچھی نسل کے عمدہ گھوڑوں کی مسلسل فراہمی پر خصوصی توجہ دی تھی، یہ گھوڑے وسط ایشیا اور عرب و ایران سے آتے تھے، یہ اپنی قوت و تربیت میں علاقائی گھوڑوں سے بدرجہا بہتر ہوتے، ان گھوڑوں اور ان کے سواروں کو لوہے کے زرہوں کا لباس دیا جاتا اور دیگر اسلحوں سے لیس ہو کر وہ میدان جنگ میں مقابلہ کرتے۔

باشاہ فوج کا کمانڈر ان چیف ہوتا تھا، اگر بادشاہ کہیں کسی فوج کو بھیجتا تو اس کے لیے سالار مقرر کر دیتا تھا، سلطنت کی فوج وزیر جنگ یا

عارض ممالک کی نگرانی میں ہوتی تھی، جس کی ذمہ داری فوجیوں کی فراہمی، ان کی تنخواہوں کی تقسیم، ان کے اسلحوں اور پوشاکوں کا انتظام اور گھوڑوں کا معائنہ وغیرہ تھی، وہ فوجیوں کا ریکارڈ بھی رکھتا تھا۔

بلبن نے فوج کے لئے باضابطہ ایک محکمہ قائم کیا تھا، علاء الدین خلجی نے فوج میں نئی نئی اصلاحات کیں اور کئی تبدیلیاں لائیں۔ اس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ جاری کیا تا کہ معائنے کے وقت ایک گھوڑا دوبارہ نہ پیش کیا جائے یا اسے بدل نہ دیا جائے۔ فوجیوں کے ریکارڈ کے لئے رجسٹر بنوائے جس میں ہر فوجی کی تفصیل درج ہوتی، علاء الدین نے ہی فوج کو نقد تنخواہ دینے کا طریقہ شروع کیا، تا کہ سلطنت کے پاس باقاعدہ تنخواہ والی مستقل فوج رہے۔

سلطنت کی حفاظت کے لئے فوج کے ساتھ قلعوں کی تعمیر اور مرمت نیز ان میں تمام جنگی ساز وسامان کی فراہمی پر بھی توجہ دی گئی تھی، بلبن نے قلعوں کی تعمیر پر خاص توجہ دیتے ہوئے شمال مغربی سرحدوں پر متعدد قلعے تعمیر کرائے، تا کہ منگولوں کے حملوں کا موثر دفاع کیا جا سکے۔ علاء الدین کے زمانہ میں منگولوں کی فوج کے دہلی تک آ جانے کے بعد اس نے بھی قلعہ بندی کی ضرورت محسوس کی اور فوجی اہمیت کے مقامات پر پرانے قلعوں کو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ان قلعوں میں ہر قسم کے ہتھیار اور غلہ و رسد کے گوداموں کا انتظام کیا گیا، بڑے اسلحے جیسے منجنیق اور عرادے لگائے گئے، نیز ان کے بنانے والے ماہرین فن وہاں مقرر کئے گئے، اور ان قلعوں پر آزمودہ کار کمانڈر مقرر کئے گئے جو کوتوال کہلاتے تھے۔ علاء الدین اپنی فوج کے ساتھ بڑی شفقت کا معاملے رکھتا تھا اور ان کی آسانی کا خیال رکھتا تھا، اشیاء کی ارزانی اور قیمتوں پر کنٹرول کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فوجیوں کو کم داموں پر ضروریات کے سامان مہیا ہو جائیں۔ فوج میں گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی رکھے جاتے تھے۔

6.8 ڈاک

سلطنت کے دور دراز علاقوں سے رابطہ رکھنے کے لئے ڈاک کا انتظام بہتر بنایا گیا تھا، جس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، اور نظم ونسق میں سہولت پیدا ہو گئی تھی، ڈاک کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شہر سے دوسرے دور دراز شہر تک راستے میں ہر تھوڑے فاصلہ پر چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں، یہ چوکیاں بہت کم فاصلہ پر ہوتی تھیں، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ دہلی سے دولت آباد کی شاہراہ پر ہر میل پر تین چوکیاں قائم تھیں، ہر چوکی پر سوار افسر اور محرر مقرر ہوتے تھے، چوکیاں سواروں اور پیادوں دونوں کی ہوتی تھیں، چوکی پر وہ تمام چیزیں مہیا رکھی جاتی تھیں جن کی ضرورت کسی ایک مسافر کو پیش آ سکتی ہے، محمد بن تغلق کے عہد میں ہر چوکی پر دس تیز رفتار دوڑنے والے تعینات رہتے تھے۔ ان چوکیوں کے ذریعہ سلطنت کے ہر علاقہ کی خبر برابر دہلی میں بادشاہ کو پہنچتی رہتی تھی، جب مرکز سے کوئی فوج کسی علاقہ میں روانہ ہوتی تو فوج کی خبریں ہر روز یا تیسرے دن سلطان کے پاس بھیجی جاتی رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد بن تغلق نے ڈاک کے نظام کو اور بہتر بنایا تھا، محمد بن تغلق نے دہلی سے دولت آباد کی طویل شاہراہ بنوائی تھی جس پر دونوں کنارے درخت لگوائے تھے۔ علاء الدین کو اسی ڈاک کے بہتر نظام کی وجہ سے حاجی مولہ کی بغاوت کی خبر تیسرے دن ہی مل گئی تھی۔ اور قطب الدین مبارک کے زمانہ میں خسرو خاں کو قید کر کے دیو گیری کے دور دراز مقام سے صرف ایک ہفتہ میں دہلی پہنچا دیا گیا تھا۔ محمد بن تغلق کو اس ڈاک کے ذریعہ دولت آباد میں گنگا کا صاف پانی پہنچتا تھا، اور خراسان کے تازہ میوے بھی پہنچائے جاتے تھے۔

ڈاک کا یہ نظام پھیلی ہوئی دہلی سلطنت پر بیدار مغزی سے نظر رکھنے میں سلطان کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتا تھا۔

6.9 مالیاتی نظام

سلطنت کے نظم ونسق کا ایک اہم حصہ مالی نظام تھا، دہلی سلطنت کے سلاطین کے پیش نظر یہ بات رہی کہ ملک کے اندر ایک انتظامیہ رکھنے کے لیے آزاد سلطنتوں کو فتح کر کے دہلی کے تابع بنایا جائے، ملک میں امن وامان قائم رکھا جائے، بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کی جائے اور ملک کے مختلف حصوں سے محاصل وصول کئے جائیں۔ ان کاموں کے لئے دہلی سلطنت کو ایک مضبوط فوج کی ضرورت تھی، اور فوجی اخراجات کی تکمیل کے لئے نیز عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق رفاہی اقدامات کے لئے مستحکم مالی نظام کی ضرورت تھی۔

قطب الدین ایبک سے لے کر جلال الدین خلجی تک حکمرانوں نے ہندوستان میں پہلے سے رائج مالی نظام، محصول کے طریقوں اور زرعی معاملات کو باقی رکھا اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی، نیز ظلم وتشدد کی روک تھام کو یقینی بنایا۔ ہندوستان بنیادی طور پر زرعی ملک تھا، جہاں کاشتکار اپنی یا مالکان اراضی کی زمینوں پر کاشت کرتے تھے اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ جنس کی شکل میں یا نقد کے طور پر حکومت کو دیا کرتے تھے، صوبوں کے اندر اقطاع کا نظام رائج تھا، یعنی امیروں یا صوبہ داروں کو اپنے زیر انتظام علاقوں سے وصول ہونے والے لگان اور محصول میں سے ہی صوبائی اخراجات کے انتظام، صوبائی فوج کے اخراجات اور اپنے ذاتی اخراجات کو پورا کرنا ہوتا تھا، اور ایک مقررہ مقدار میں محصول مرکزی حکومت کو ادا کرنا ہوتا تھا۔

علاء الدین خلجی نے لگان کی تعیین اور اس کی وصولیابی کے انتظام میں بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں کیں، اس سے پہلے تک جو نظام رائج تھا وہ کچھ یوں تھا کہ کچھ زمینیں براہ راست مرکز کے تحت تھیں جو خالصہ کہلاتی تھیں، یہ زمینیں دیوان وزارت کی براہ راست نگرانی میں ہوتی تھیں، یا گورنر اپنے ماتحت علاقوں کی اراضی کے محصولات وصول کراتے، ان سے اپنی تنخواہ کا حصہ اور صوبائی نظم ونسق کے اخراجات نکال کر باقی محصول مرکزی خزانہ میں جمع کر دیتے تھے، محصول کی تعیین کا طریقہ یہ تھا کہ کاشتکار اپنی پیداوار کا کچھ حصہ مقطع یا بادشاہ کو ادا کرنے پر راضی ہو جاتا تھا، یہ مقدار عموماً پیداوار کی ایک تہائی ہوتی تھی۔ گاؤں کے مقدم یا خوط لگان کو وصول کرتے تھے، اور مرکزی حکومت کے حصہ کو نقد یا جنس جس شکل میں طے ہوا ادا کر دیا کرتے تھے۔ یہ وصول کنندگان اپنے عمل کا معاوضہ پاتے تھے۔ جلال الدین خلجی کے عہد تک محصول کی وصولیابی یا مالی نظام کا یہی طریقہ رائج تھا۔

علاء الدین خلجی نے جب دہلی سلطنت کی سرحدیں انتہائی وسیع کر دیں اور مملکت کا دائرہ تقریباً پورے ہندوستان پر پھیل گیا تو اس نے اپنی بڑھتی فوجی ضروریات کی تکمیل کے لئے نیز رعایا کی بہبودی کے پیش نظر دوسری اصلاحات کے ساتھ معاشی اصلاحات پر بھی خاطر خواہ توجہ دی، اور پہلی مرتبہ میں محاصل کی تعیین، ان کی وصولیابی، بازار کے نرخ، اشیاء کی درآمد و برآمد اور دیگر معاشی ضوابط میں بڑے پیمانہ پر تبدیلیاں کیں، اور ان معاشی ضوابط اور مالی اصلاحات کو پوری قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا۔ اپنی ان اصلاحات اور ان کے نفاذ کی وجہ سے علاء الدین اپنی وسیع مملکت میں امن وامان کے ساتھ طویل عرصہ حکومت کر سکا۔

علاء الدین نے پہلی مرتبہ زرعی زمینوں کی پیمائش کروائی، زمین کی حقیقی پیمائش کی بنیاد پر محصول کو مقرر کیا، اس کی وجہ سے درمیانی لوگوں

اور سرداروں کی من مانی وصولیابی پر روک لگ گئی۔ اب کاشتکاروں کی زمینیں جتنی ہوتیں ان پر محصول کی مقدار طے ہوجاتی، خوط اور مقدم اور چودھری پوری امانت داری کے ساتھ لگان کی مقررہ مقدار سرکاری خزانہ میں جمع کراتے، عاملوں اور پٹواریوں کی رشوت خوری بھی اس سے بند ہوگئی۔ علاء الدین نے لگان کی مقدار بھی بڑھادی تھی، پہلے لگان وصول کرنے والے افسران اور دوسرے عامل کاشتکاروں سے زیادہ وصول کرتے اور سرکار کو اس کی مقررہ مقدار دے کر فاضل آمدنی اپنے پاس رکھ لیتے تھے، اب زمینوں کی پیمائش کردی گئی تھی اور اسی حساب سے پیداوار کا نصف سرکاری خزانہ میں جمع کرنا ضروری قرار پایا تھا، اس سے سرکار کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور علاء الدین نے شراب بندی اور قمار بندی کردی تھی جس سے سرکاری خزانہ کو نقصان ہوا تھا، اس کی تلافی لگان کی شرح بڑھا کر کرلی گئی۔

علاء الدین نے اس کے علاوہ انعامی اور عطیات کی زمینوں کی منسوخی کا بھی فرمان جاری کیا، حکمرانوں کے ذریعہ اہل علم و فضل کو اور خوشی کے مواقع پر امراء کو بڑی بڑی زمین انعام کے طور پر ملتی تھیں، جن کے محاصل ان کی ذاتی آمدنی ہوتی تھی، علاء الدین نے ایسی تمام زمینیں بحق سرکار واپس لے لیں اور وہ خالصہ زمین قرار پاگئیں جن کے محصول براہ راست سرکاری خزانہ میں پہنچنے لگے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ بڑے بڑے امراء جو اپنی زبردست آمدنیوں کی وجہ سے شان و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور عیش و عشرت میں پڑ کر مغرور ہوجاتے اور بسا اوقات بغاوت کے منصوبے باندھتے، ان کی زمینیں جب ضبط ہوگئیں تو ان کی آمدنی بہت زیادہ گھٹ گئی، اور ان کے دماغ سے بغاوت کا سودا نکل گیا۔ اسی لئے علاء الدین کے زمانہ میں بغاوت کی بہت کم خبریں ملتی ہیں۔ اسی طرح گاؤں کے مقدموں، خوطوں اور کاشتکاروں پر بھی گہری نظر رکھنے کے لئے زمینداروں کو دی جانے والی مراعات واپس لے لی گئیں، اور ان کی طرف سے سرکشی کے خطرات پر بھی بندش لگادی گئی، اب وہ کاشتکاروں سے وصول ہونے والی مقررہ لگان جوں کی توں شاہی خزانہ کو بھیجتے اور اپنے معاوضہ پر گذارہ کرتے تھے۔

علاء الدین کا ایک اہم اقدام بازار کے نرخ کی تعیین سے متعلق تھا، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اشیاء ضرورت کو اتنا ارزاں بنادیا جائے کہ ملک کی عوام کم ترین قیمت پر اپنی ضروریات پوری کرسکیں، اس پالیسی سے اس کی فوج کو بھی کم آمدنی میں ضروریات زندگی کو پوری کرنے کے مواقع فراہم ہوتے تھے۔ اپنی اس پالیسی کے تحت علاء الدین نے اشیاء کی نرخ بندی کی۔ دہلی اور اطراف میں سامانوں کے بازار لگتے تھے، علاحدہ علاحدہ سامانوں کے لئے الگ الگ بازار تھے، ہر بازار اور وہاں کے سامانوں کی قیمتیں علاء الدین نے مقرر کردیں اور نرخ کی یہ فہرست بازار میں لگوادی اور سخت حکم جاری کیا کہ اس سے زیادہ قیمت پر چیزیں فروخت نہ ہوں، غلہ اور اجناس کے بازار میں انتہائی کم قیمت پر چاول، دال، گھی، شکر وغیرہ دستیاب ہوگئے تھے، کپڑا بازار میں ہر نوع کے کپڑے کی قیمت طے تھی، مٹھائی کے بازار میں وہاں کی اشیاء کی نرخ بندی تھی، جانوروں حتی کہ غلاموں کی بھی قیمتیں طے کردی گئی تھیں، یہی حال مسالہ جات، پھلوں، ہتھیاروں اور جوتوں وغیرہ کے بازار کا تھا۔ مارکٹ کے نرخ کی پابندی کے لئے ہر بازار پر ایک شحنہ مقرر تھا اور اس کے ماتحت افسران کی پوری ٹیم ہوتی، یہ بازار میں موجود رہتے اور حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دیتے۔ یہ ہر دن کی رپورٹ بادشاہ کو بھیجتے، ان کے علاوہ خفیہ پولیس کی رپورٹ علاحدہ سے روزانہ بادشاہ کے پاس آتی اور برید منڈی کے لوگ سامانوں کے معیار کی رپورٹ بھیجتے تھے، اس طرح تین مختلف ذرائع سے آنے والی روزانہ کی رپورٹ کی بنیاد پر مارکٹ پر سخت ترین نظر رکھی جاتی، اور کسی بھی کوتاہی پر خود افسران کو سخت ترین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا، اور علاء الدین کی سنگین سزاؤں کے خوف سے یہ افسران بازار کے بیوپاریوں کو انتہائی سختی کے ساتھ معاشی ضوابط کا پابند رکھتے تھے۔ بازار کے تاجروں کے علاوہ باہر سے اشیاء درآمد برآمد

کرنے والے کاروانیوں کو بھی نرخوں کا پابند کردیا گیا تھا، جب ان کاروانیوں کو باہر سے مہنگے دام خرید کر دہلی میں علاء الدین کے مقررہ کم نرخ پر فروخت کرنے میں دشواری ہوتی اور منڈی میں اشیاء کی فراہمی دشوار ہوئی تو علاء الدین نے ان کاروانیوں کو بڑی بڑی رقم فراہم کرکے پابند کیا کہ وہ ان رقومات سے اشیاء خرید کر لائیں اور مقررہ قیمت پر ہی منڈی میں تاجروں کو فروخت کریں، تاکہ عوام سستی نرخوں پر چیزیں پاتے رہیں۔

قحط اور خشک سالی کے زمانہ میں قیمتیں گراں ہونے کا اندیشہ تھا، علاء الدین نے اس سے نمٹنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ ہر ہر محلّہ میں سرکاری گودام بنوائے جہاں محصول میں آنے والی اجناس حفاظت سے رکھی جاتیں، یہ شاہی گودام غلوں سے بھرے رہتے اور قحط کے زمانہ میں ان گوداموں سے سستی قیمت پر سامان مارکٹ میں فراہم کردئے جاتے۔ کالا بازاری روکنے کے لئے قحط کے زمانوں میں راشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا، جس کے تحت ہر گھر کو اس کی ضرورت کے مطابق سامان خریدنے کی اجازت ہوتی، اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اذیت ناک سزائیں دی جاتیں۔

علاء الدین کی ان اصلاحات کو نافذ کرنے میں اس کے وزیر شرف الدین قائنی نے بڑی خدمات انجام دیں۔ اسی طرح مارکٹ پر کنٹرول قائم رکھنے کے لئے بادشاہ نے ملک قبول کو بازار کا شحنہ مقرر کیا تھا اور ملک یعقوب کو دیوان ریاست مقرر کیا گیا تھا، اس کا دائرہ اختیار بہت وسیع تھا، وہ مارکٹ کا ناظر اور محتسب یعنی عوام کے اخلاق کا نگراں بھی تھا۔ علاء الدین اپنے افسران کے علاوہ بذات خود بھی بازار کا حال اور قیمتوں کی صورت حال سے آگاہی حاصل کرتا رہتا تھا، اس کے لئے وہ چھوٹے بچوں اور غلاموں کو خفیہ طریقہ پر سامان خریدنے کے لئے الگ الگ بازاروں میں بھیج دیتا، اور آنے والے سامانوں کا وزن، معیار اور قیمت کی براہ راست واقفیت حاصل کرلیتا، اور اگر ذرا سا بھی قیمت یا وزن میں فرق معلوم ہوتا تو اسی وقت مجرم کو سنگین سزائیں دیتا، اس سختی کی وجہ سے بیوپاری ایماندار ہوگئے تھے، اور ناپ تول میں کمی ختم ہوگئی تھی۔ علاء الدین کی ان اصلاحات کی وجہ سے ملک سے رشوت خوری ختم ہوگئی، بغاوتیں بند ہوگئیں، اشیاء ارزاں ہوگئیں، اور سامانوں کے معیار اور وزن میں راست بازی آگئی۔ البتہ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ امراء کی عیش وعشرت جاتی رہی، خوطوں اور مقدموں کی من مانی اور مالی آسائش گھٹ گئی، لگان کی شرح بڑھنے سے کاشتکاروں پر بھی بوجھ بڑھ گیا، لیکن یہ بوجھ کاشتکاروں پر پہلے بھی تھا، اس کا فائدہ درمیانی لوگ اٹھاتے تھے، اب یہ فائدہ شاہی خزانے کو پہنچنے لگا، اور کاشتکاروں اور عوام کو اشیاء ارزاں دستیاب ہونے لگیں۔

علاء الدین کی سختی اس کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوگئی، اور بہت سے معاشی ضوابط بھی دم توڑ گئے۔ محمد تغلق نے بھی لگان کی شرح بہت اونچی رکھی، لیکن فیروز تغلق نے کاشتکاروں کو بے انتہاء راحت دے دی' ٹیکس کا بار بالکل ہلکا کردیا، کسانوں کے پرانے قرض کی بہت بڑی رقم معاف کردی، بلکہ غریبوں کی خورد ونوش وعلاج ومعالجہ، بے روزگاروں کی ملازمت اور غریب بچیوں کی شادی وغیرہ کے انتظامات سرکاری آمدنی سے کرائے، ان اقدامات کی وجہ سے رعایا ایک بار پھر خوشحال ہوگئی۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں اشیاء دوبارہ بہت زیادہ ارزاں ہوگئی تھیں، اور لوگ عہد علائی کو بھول گئے تھے، حالانکہ لودھی دور میں اشیاء کو سستا رکھنے کے لئے سخت سزاؤں کا سہارا نہیں لیا گیا تھا۔

معلومات کی جانچ

1۔ صوبہ کا سربراہ کیا کہلاتا تھا اور اس کے کیا اختیارات تھے؟

2۔ دہلی سلطنت میں فوج کی تقسیم کس طرح کی تھی؟

3۔ سرکار کی راست نگرانی والی زمین کیا کہلاتی تھی؟

6.10 خلاصہ

دہلی سلطنت کا نظم ونسق بنیادی طور پر فوجی استحکام پر مبنی تھا، اور پورے نظام حکومت میں بادشاہ کو محوری حیثیت حاصل تھی، وہ پوری طرح بااختیار اور بڑی حد تک مطلق العنان ہوتا تھا، بادشاہ کی تقرری کے لئے کوئی اصول وضابطہ طے نہیں تھا، اسی لئے تخت نشینی کے لئے بسا اوقات فوجی مقابلہ آرائی کی نوبت آجاتی تھی، بادشاہت کے حصول، اس کی بقاء اور حکومت کے استحکام کے لئے فوجی قابلیت بنیادی شرط تھی، امراء بادشاہ کے دست وبازو ہوتے تھے، التمش کے وقت میں چالیس امراء حکومت میں بادشاہ کے شریک تھے، بلبن خود ان کا ایک فرد تھا، لیکن بادشاہ بننے کے بعد اس نے امراء چہلگانی کی جماعت توڑ دی، اور بادشاہت کے عہدہ کو عظمت کا مقام عطا کر دیا، اس نے شاہی وقار کو اس بلندی تک پہنچا دیا جس سے آگے ممکن نہ تھا، بادشاہ سے اس بات کی توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ مسلم حکومت کے سربراہ کے طور پر دین وشریعت کا پناہ گاہ ہوگا، قطب الدین ایبک، التمش، بلبن، فیروز تغلق، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق، اور سکندر لودھی وغیرہ ایسے ہی سلاطین تھے، لیکن علاء الدین خلجی اور قطب الدین مبارک وغیرہ نے علماء کے مقام کو کمزور بنا دیا، بادشاہ پوری سلطنت میں تمام معاملات کے لئے حرف آخر تھا، وہی فوج کا سربراہ، انتظامیہ کی اتھاریٹی اور عدلیہ کی آخری منزل تھا۔

سلطنت کا نظام اس طرح چلایا جاتا تھا کہ مرکز میں بادشاہ چند وزیروں کو مقرر کر دیتا تھا، جو مختلف محکموں کے سربراہ ہوتے، یہ تقرری پوری طرح بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہوتی اور اس میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی، سب سے بڑا وزیر ہوتا جو بعد میں نائب الممالک کہلانے لگا، اسی وزیر کے تحت مالیات کا شعبہ بھی آتا تھا، اس کے بعد وزیر جنگ کا مقام تھا جو عارض ممالک کہلاتا تھا، اس کے ذمہ فوجی انتظامات سے متعلق سارے امور آتے تھے، تیسرا وزیر دیوان انشاء تھا جو شاہی فرامین اور شاہی اعلانات کا ذمہ دار تھا، صوبائی گورنروں اور دیگر افسروں کے ساتھ وہی رسل و رسائل رکھتا تھا، چوتھا وزیر دیوان رسالت تھا جو بیرونی ملکوں کے ساتھ سلطنت کے تعلقات اور سفیروں کے معاملات دیکھتا تھا، ایک عہدہ برید ممالک کا تھا جو دراصل محکمہ پولیس اور خفیہ جاسوسوں کا سربراہ ہوتا تھا، حرم شاہی کی فوج، دربار، مطبخ اور آداب ورسوم کے لئے علاحدہ علاحدہ عہدے تھے، وکیل در کے ذمہ پورے محل کے دروازوں کی کلید اور دربار کا انتظام تھا، محل کا مطبخ، شاہی ملبوسات اور شاہی اصطبل وغیرہ بھی اسی کے ذمہ میں تھے۔ امیر حاجب سلطان سے تنہائی میں ربط رکھنے والا افسر تھا جو دربار کے آداب اور تقریبات کا انتظام بھی دیکھتا تھا، بادشاہ کی ذاتی محافظ فوج کا سربراہ سرجاندار کہلاتا تھا، میر شکار کی نگرانی امیر شکار کے ذمہ ہوتی، سوار فوج کا سربراہ میرآخور کہلاتا، شاہی مطبخ کا نگراں سرچاشنی گیر کہلاتا تھا، دربار سے وابستہ یہ سارے عہدے بڑی ذمہ داری اور نزاکت کے حامل ہوتے تھے۔

مرکز کے اس انتظام کے علاوہ پوری سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، ہر صوبہ کا سربراہ صوبہ دار کہلاتا تھا، اور وہ صوبہ کی حد تک بادشاہ کی طرح تمام محکموں کا سربراہ اعلیٰ ہوتا تھا، صوبہ کے اندر مرکز کی طرح محکمہ ہوتے تھے، صوبہ دار اپنے علاقہ سے لگان وصول کرتے اور امن وقانون کو برقرار رکھتے اور ضرورت پر فوج مہیا کرتے تھے۔ لگان کی رقم سے صوبائی اخراجات اور اپنی تنخواہ نکالنے کے بعد بقیہ رقم مرکز کے شاہی خزانہ میں جمع کر دیتے تھے، صوبہ کی آمد وخرچ پر مرکز کے وزیر مالیات کی نگرانی رہتی تھی، مرکز کے خفیہ جاسوس صوبوں میں بھی تعینات رہتے تھے، صوبہ داروں کا تبادلہ بھی ہوتا تھا، اور ان کی برطرفی بھی ہو جاتی تھی، اگر انتظامات درست رہتے اور بادشاہ کے ساتھ وفاداری پر حرف نہیں آتا تو طویل مدت تک بھی صوبہ دار برقرار رہتے تھے۔ علاء الدین کے زمانوں تک صوبوں کی تعداد گیارہ ہوگئی تھی۔

صوبہ کو پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر پرگنہ کے اندر کئی گاؤں ہوتے تھے، گاؤں میں محصول کا ذمہ دار پٹواری کہلاتا تھا، اور گاؤں کا سربراہ مقدم اور زمیندار کو خوط کہتے تھے۔

سلطنت کے نظم ونسق کا اہم ترین حصہ فوج تھی، فوج سوار اور پیدل دونوں ہوتی تھی، بادشاہ ہی فوج کا سربراہ اعلیٰ تھا، لیکن کسی فوج کو بھیجتے وقت وہ کمانڈر مقرر بھی کرتا تھا، عارض ممالک فوج کے انتظامات دیکھتا تھا، فوج میں اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی بڑی اہمیت تھی، فوج کی ایک قسم بادشاہ کی محافظ فوج کی تھی، دوسرے سلطنت کی مستقل فوج تھی جس میں پیدل اور سوار دونوں ہوتے، تیسرے مخصوص سپاہی ہوتے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہوتے۔ بلبن اور علاء الدین نے فوجی محکمہ کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا تھا، اس کے ساتھ قلعوں کی تعمیر اور بڑے اسلحوں کا انتظام بھی کیا جاتا تھا، علاء الدین نے فوج کو نقد تنخواہ دینے اور گھوڑوں کو داغ لگانے نیز فوج کا رجسٹر ریکارڈ رکھنے کا طریقہ شروع کیا۔ ڈاک نظم ونسق کا ایک اہم عنصر تھا، اس کے ذریعہ سلطنت کے تمام حصے مرکز سے جڑے رہتے تھے، دہلی سلاطین نے ڈاک کے بہتر انتظام پر توجہ دی، بڑے بڑے شہروں کو عمدہ شاہراہوں سے جوڑا گیا، محمد بن تغلق نے دہلی سے دولت آباد تک سات سو میل کی لمبی سڑک بنوائی، جس پر دونوں جانب درخت لگوائے، ان راستوں پر ہر میل کی مسافت پر تین ڈاک چوکیاں بنائی گئیں، ہر ڈاک چوکی میں دس تیز رفتار دوڑنے والے افراد متعین ہوتے، ڈاک پیدل بھی ہوتی اور سوار بھی، ڈاک چوکی پر مسافر کی ضروریات کے سارے انتظامات مہیا کئے گئے تھے۔

مالیات کا انتظام نظم ونسق کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا، مرکزی حکومت کے لئے کچھ مخصوص علاقے ہوتے تھے، جو خالصہ کہلاتے اور وہاں کے محصولات مرکز کے خزانے میں آتے تھے، صوبے لگان کی وصول شدہ رقومات اور اجناس میں سے اپنی ضروریات منہا کر کے بقیہ مرکز کو بھیجتے تھے۔ علاء الدین نے زمینوں کی پیمائش کرائی اور حقیقی پیمائش کی بنیاد پر لگان کی مقدار مقرر کردی تھی، علاء الدین نے بازار کے اشیاء کی نرخ بندی بھی کردی تھی، جہاں ہر سامان کی قیمت مقرر تھی، اور نگرانی و جاسوسی کے سخت نظام کے ذریعہ اور سنگین سزاؤں کی سختی کے ذریعہ نرخ بندی کو مارکٹ میں پوری طرح جاری رکھوا دیا تھا۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں لگان اور ٹیکس میں کافی نرمی آگئی تھی جس سے کسان خوشحال ہوگئے تھے۔ ابراہیم لودھی کے زمانے میں بھی بازار کے اشیاء بہت ارزاں ہوگئے تھے، اور عوام خوشحال ہوگئی تھی، جبکہ اس کے لئے کوئی سختی نہیں کی گئی تھی۔

6.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1۔ مرکزی حکومت میں وزراء کی تقسیم اور ان کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالئے۔

2۔ دہلی سلطنت میں پولیس اور جاسوسی کے نظام کی تفصیل بیان کیجئے۔

3۔ علاء الدین خلجی کی معاشی اصلاحات کا تفصیلی تذکرہ کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

4۔ دہلی سلطنت میں بادشاہ کے اختیارات پر روشنی ڈالیے۔

5۔ حرم شاہی کے انتظامات اور ان کے عہدیداران کے بارے میں بتایئے۔

6۔ دہلی سلطنت میں ڈاک کے نظام کی وضاحت کیجیے۔

6.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. آب کوثر — شیخ محمد اکرام، فرید بک ڈپو، دہلی
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان، حصہ اول — پروفیسر ستیش چندر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2003ء اردو ترجمہ: عزیز الدین حسین
3. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک — سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ — سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان — کے ایس لال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 1998، اردو ترجمہ یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند — سید ابوظفر ندوی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011

اکائی۔7 : دہلی سلطنت میں نظام عدل اور سماجی و مذہبی حالات

اکائی کے اجزاء

7.1 مقصد

نظام عدل وانصاف کسی بھی مستحکم حکومت کی بنیادوں میں شامل ہوتا ہے، دہلی سلطنت کے تین سو سالہ دور کی بنیاد جہاں فوجی قوت، نظم و نسق کی بہتری اور عوام کی خوشحالی پر رہی، وہیں اس کے استحکام کی ایک اہم بنیاد عدل وانصاف کا نظام بھی تھا۔ سلاطین نے نہ صرف نظام عدل کو از سر نو قائم کیا بلکہ مرکز سے لے کر گاؤں کی سطح تک اس کے قیام کو یقینی بنایا۔ سلاطین دہلی نے عوام کی سماجی زندگی سے بھی دلچسپی لی۔ حکمراں، امراء

اورعوام نیزان میں بھی مسلم اور غیر مسلم کی سماجی زندگی مختلف سطحوں پر رہی، ان کے اخلاق وکردار پر نظر رکھی گئی اوران میں امن وہم آہنگی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ۔ چونکہ دہلی سلطنت کے قائم کرنے والے مسلمان تھے، انھوں نے سلطنت میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر بھی توجہ دی، اسلامی علوم کی تدریس و اشاعت اور علماء وفقہاء کی قدردانی سے دلچسپی لی گئی، یہ دور مختلف سلاسل تصوف کے بڑے مشائخ کا تھا۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں تصوف کی خانقاہیں قائم تھیں اور ہزاروں ہزار بندگان خدا ان سے فیضیاب ہورہے تھے، سلاطین دہلی کے مراسم ان بزرگوں کے ساتھ نیازمندانہ رہے، اوران سب کی وجہ سے دہلی سلطنت پر مذہبی حالات کا گہرا رنگ رہا۔

اس اکائی میں آپ ان سب باتوں کو پڑھیں گے اوراس کے مطالعہ کے بعد اس بات سے واقف ہوجائیں گے کہ سلاطین دہلی نے حکومت قائم کرنے کے بعد عدل وانصاف کا نظام کن بنیادوں پر قائم کیا، اس وقت قاضیوں کی تقرری کس طرح ہوتی تھی، فیصلے کس طرح کیے جاتے تھے اور دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ محکمہ عدالت میں کیا معاملہ اختیار کیا جاتا تھا، نیز عدالت اپیل کس طرح کام کرتی تھی اور بادشاہ کے کیا اختیارات ہوتے تھے؟ اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دہلی سلطنت کا سماج کیسا تھا، کون کون سے طبقات اس سماج میں تھے اوران کی کیا حالت تھی؟ اسی طرح آپ یہ بھی جانیں گے کہ دہلی سلطنت کے اندر مذہبی حالات کیا تھے، علماء ومشائخ کون کون سے تھے، ان کی کیا سرگرمیاں تھیں اوران کے ساتھ سلاطین دہلی کا رویہ کیا رہا؟

7.2 تمہید

دہلی سلطنت قائم کرنے والے حکمراں افغانستان کے علاقوں سے آئے تھے، بغداد کی عباسی حکومت اس وقت دم توڑ رہی تھی اور علم وفن کے نئے مراکز بغداد کے بعد دنیا کے کئی شہروں میں قائم ہوگئے تھے۔ عرب کے مشرق میں ایسے کئی مراکز وجود میں آگئے تھے جہاں اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی علوم وشریعت کی شاندار بزمیں آراستہ ہورہی تھیں۔ ایران وافغانستان کے علاقوں میں یہ رونق برپا ہوچکی تھیں اور جب ان کوہ ودمن کے جیالوں نے ہندستان کی سرزمین کو اپنا وطن بنایا تو وہ اپنے ساتھ اپنے مذہب اور قانون وشریعت کی شاندار روایات بھی لیتے آئے۔ یہاں انھوں نے حکومت دہلی کی بنیاد رکھی اور نظم ونسق کو استوار کیا تو اس کے ساتھ حکمرانی کے اہم ترین فریضہ کو پورا کرتے ہوئے قضاء کا نظام قائم کیا، تاکہ سلطنت کے ہر فرد کو انصاف مل سکے۔ دہلی کے سلاطین عدل وانصاف کی فراہمی کے معاملہ میں بڑے فکرمند اور سرگرم رہے، انھوں نے عدل کے محکمے قائم کیے اور مرکزی شہروں سے لے کر صوبائی شہروں، پرگنوں اور گاؤں تک نظام عدل وقضاء کا جال بچھادیا، قضاء کے نظام کو پختہ اور آسان بنانے کے لئے کئی طرح کے تجربات کیے، اور نظام عدل پر گہری نظر رکھی، انصاف کے کٹہرے میں انھوں نے ایک عام کسان اور غریب انسان کو وقت کے شہزادوں اور امیروں بلکہ بسا اوقات خود اپنے برابر کھڑا کیا اور بے لاگ انصاف فراہم کیا اوراس کو یقینی بنانے کے لئے قضاء کا پورا نظام قائم کیا۔ سلاطین دہلی کی نظر اس بات پر بھی رہی کہ ایک غریب انسان آسانی سے انصاف پاسکے اور امیروں یا طاقت وروں کا خوف اسے انصاف سے محروم نہ کرسکے۔ اس کے لئے انھوں نے نہ صرف اپیل کی عدالتیں قائم کیں، بلکہ اپنے درباروں میں مظلومین کی رسائی کو بالکل سہل وآسان بنادیا، جس کے نتیجہ میں ظلم کا سد باب ہوا اور انصاف کا دور دورہ ہوا۔ قضاء کا محکمہ دہلی سلطنت کے چار اہم وزارتوں میں سے ایک تھا اور بادشاہ براہ راست اس پر نگرانی رکھتا تھا اور قاضی کی معاونت کے لئے مفتیوں اور دیگر معاونین کا پورا عملہ ہوتا تھا۔

دہلی سلطنت کا سماج اس دور کے رائج سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔عہد وسطی میں سماجی نظام فرق مراتب پر مبنی تھا، جیسا کہ آج بھی ہندوستان کے اندر ہے، مسلم حکمراں اپنا اسلامی تصور ضرور رکھتے تھے جس میں سماجی فرق مراتب کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور محمود وایاز کو نہ صرف خانہ خدا میں بلکہ سماج کے عام احوال میں بھی ایک درجہ دیا گیا ہے، لیکن ہندوستان کے رائج حالات کا اثر مسلم حکمرانوں پر بھی رہا، چنانچہ بادشاہ اور امراء کا طبقہ اپنی علاحدہ شناخت رکھتا تھا، درمیانی درجہ کا ملازمت پیشہ طبقہ اس سے کمتر درجہ کا حامل تھا، علماء اور ارباب فضل کے طبقہ کو مخصوص سہولیات اور حیثیت حاصل تھیں، غلاموں کا طبقہ عہد وسطی کے سماج کا لازمی عنصر تھا اور ان کے اپنے مخصوص احوال تھے، گاؤں میں آباد زمینداروں کا طبقہ علاحدہ تھا اور ان کے بعد کاشتکاروں اور کسانوں کا طبقہ تھا، اہل ہنر اور تجارت پیشہ افراد کا اپنا مخصوص طبقہ تھا، اس طرح دہلی سلطنت کے اندر سماجی سطح پر ہمیں متعدد سماجی طبقات اور ان کے مخصوص احوال نظر آتے ہیں۔

مذہبی احوال کی نوعیت کچھ یوں تھی کہ دہلی سلطنت مسلم سلطنت کہلاتی تھی، اور کئی حکمراں ذاتی زندگی میں بے حد دیندار رہے جیسے التمش ،بلبن اور ناصر الدین محمود وغیرہ۔کئی حکمرانوں نے سرکاری سطح پر مذہب وشریعت کے ساتھ دلچسپی لی، جیسا کہ ہم محمد بن تغلق، فیروز تغلق اور سکندر لودھی کے زمانوں میں دیکھتے ہیں، لیکن اتنی بات صاف ہے کہ سیاست اور حکومت کو مکمل طور پر شریعت کے تابع رکھنے کی کوشش اس عہد میں نظر نہیں آتی ہے۔التمش اور بلبن نے اس کا اظہار بھی کیا کہ معاملات حکومت ملکی مصالح کے مطابق چلائے جائیں گے، بلکہ علماء نے اس ضمن میں اپنے شکوہ آمیز احساسات رکھے تو انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔جلال الدین خلجی نے اپنی حکومت میں دین وشریعت سے وابستگی کی لاچارگی کھلے لفظوں میں بیان کی ہے اور علاء الدین خلجی اور کیقباد کا عہد تو بڑی حد تک موجودہ عہد کے سیکولر نظام کے مطابق رہا۔

ذیل کی سطور میں آپ تفصیل کے ساتھ دیکھیں گے کہ دہلی سلطنت کے حکمرانوں نے قضاء کے نظام کو کس طرح نافذ کیا، اور اس عہد کے سماجی اور مذہبی احوال کیسے رہے؟

7.3 دہلی سلطنت میں نظام عدل

سلاطین دہلی نے خصوصیت کے ساتھ عدل وانصاف کی فراہمی پر توجہ دی، اور اسے آسان بنانے کی کوشش کی، اس شعبہ کی اہمیت ہی کی وجہ سے حکمرانوں نے باضابطہ اس کے لئے وزارت قائم کی اور مرکزی سطح سے لے کر صوبوں، پرگنوں اور قصبوں کی سطح تک عدل کا محکمہ قائم کیا اور اس کے لئے افراد مقرر کئے۔نظام عدل کی نوعیت درج ذیل طریقہ پر تھی:

7.3.1 سلطان کی ذات

دہلی سلطنت میں نظام عدل کچھ اس طرح قائم تھا کہ سلطان کی ذات ہی عدل وانصاف کا سرچشمہ تھی، اور وہ خود انصاف فراہم کرنے میں دلچسپی لیتا تھا۔ہفتہ میں مخصوص دنوں کے اندر سلطان کا دربار لگتا، کبھی کبھی ہفتہ میں دو یا تین بار دربار لگتے۔ان درباروں میں بادشاہ براہ راست لوگوں کے مقدمے سنتا اور مجلس کے اندر ہی فیصلہ صادر کر دیتا، بادشاہ کے دربار کی یہ عدالت کبھی ابتدائی مقدمے بھی طے کرتی، یعنی بادشاہ کے سامنے ہی مقدمہ پیش ہوتا اور کارروائی کے بعد فیصلہ کر دیا جاتا اور کبھی بادشاہ کا دربار عدالت اپیل کا کام کرتا، یعنی کسی فریق کے خلاف جو فیصلہ کسی قاضی کی عدالت میں ہو چکا ہوتا، وہ فریق مقدمہ کے خلاف اپیل پیش کرتا، سلطان محمد بن تغلق ہفتہ میں ہر شنبہ کو دربار لگاتا تھا، اور وہاں

اذن عام ہوتا تھا کہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اور وہ بلا تکلف بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے حالات بیان کرتے اور اثنائے بیان کسی کو روکنے کی مجال نہیں تھی، حالات سن کر سلطان خود فرمان صادر کر دیتا۔ ابن بطوطہ جو دہلی کا قاضی رہ چکا ہے، بیان کرتا ہے کہ محمد بن تغلق ہفتہ میں دو دفعہ پیر اور جمعرات کو انصاف رسانی کی غرض سے دیوان خانہ کے سامنے ایک میدان میں بیٹھتا تھا اور شکایت پیش کرنے والوں کو عام اجازت ہوتی تھی۔ سلطان کی عدل گستری کا یہ عالم تھا کہ اس نے اجازت دے رکھی تھی کہ خود اس کے خلاف بھی استغاثہ داخل کیا جاسکتا ہے۔ ابن بطوطہ نے ایسے تین چشم دید واقعات لکھے ہیں جن میں سلطان محمد بن تغلق خود ماخوذ ہوکر قاضی کے سامنے حاضر ہوا۔

سلطان کے دربار میں اس کی مدد کے لئے مفتی بھی مقرر ہوا کرتے تھے، جو مذہبی معاملات میں اس کی مدد کرتے تھے، سلطان محمد بن تغلق نے شاہی محل کے اندر چار مفتی مقرر کر رکھے تھے، کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں کو بلا کر مشورے کرتا اور ان کی روشنی میں فیصلے کرتا۔

عدل وانصاف کے معاملہ میں دہلی سلطنت کے بادشاہ ابتداء سے ہی سرگرم رہے، سلطان قطب الدین ایبک جو اس سلطنت کا بانی ہے، عدل وانصاف کا بے حد خیال رکھتا تھا، اس کے لشکر میں مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ تھے، لیکن کسی کو مجال نہ تھی کہ کسی پر ظلم کرے یا آبادی میں سے کسی کے گھر یا جنگل سے کسی کا کوئی سامان اٹھالے۔ عدل پروری کی اسی روش کو التمش نے جاری رکھا اور اسے اور مضبوط بنایا، اس نے اپنے محل کے ساتھ زنجیر لٹکا رکھی تھی اور اعلان کر دیا تھا کہ جو مظلوم ہو وہ رنگین کپڑا پہن کر آئے تاکہ دور سے پہچان لیا جائے۔ رضیہ سلطان اور ناصر الدین محمود کے زمانوں میں عدل وانصاف کے اسی معیار کو برقرار رکھا گیا۔ بلبن دہلی سلطنت کا نامور اور طاقتور بادشاہ گذرا ہے، اس نے عدل پروری کے نظام کو اور بھی مستحکم اور مضبوط بنایا۔ بلبن کے نزدیک بادشاہ کا بڑا فرض عدل وانصاف کی ترویج تھا، اس کا وہ سختی سے اہتمام کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں جن امراء نے غریبوں پر ظلم کئے بلبن نے انھیں سخت سزائیں دیں۔ انصاف کے معاملہ میں وہ اس قدر سخت تھا کہ اپنے بھائیوں، اپنے بچوں، اپنے ساتھیوں اور اپنے ملازموں کے ساتھ بھی کوئی مروت نہیں کرتا تھا۔ انصاف کو یقینی بنائے رکھنے کے لئے پورے ملک میں اس نے جاسوس مقرر کر دئے تھے تاکہ کسی پر زیادتی ہو تو اس کی خبر بادشاہ کو مل جائے۔ ایک مرتبہ بدایوں کے گورنر نے جو بلبن کا انتہائی قابل اعتماد تھا، نشہ کی حالت میں اپنے ایک ملازم کو کوڑے مار کر ہلاک کر دیا، ملازم کی بیوہ نے انصاف کی درخواست کی، بلبن نے حکم دیا کہ اس گورنر کو بھی کوڑے مار مار کر ہلاک کیا جائے۔ اور اس جاسوس کو بھی عوام کے سامنے پھانسی دے دی گئی جس نے اس واقعہ کی اطلاع بلبن کو نہیں دی تھی۔ انصاف کے ایسے متعدد واقعات بلبن کے زمانہ میں پیش آئے جن کی وجہ سے بلبن اپنے عوام میں نہایت مقبول اور گرویدہ ہوگیا تھا۔ علاء الدین خلجی بھی بلبن ہی کی طرح عدل وانصاف میں بڑا سخت تھا، وہ اس کا بھی خیال رکھتا تھا کہ قاضی سے کوئی نازیبا بات نہ ہونے پائے۔ ایک مرتبہ اس نے ایک قاضی کو شراب پینے کے جرم میں موت کی سزا دی تھی اس کے دور میں سزائیں بہت سخت تھیں اور پولیس اور جاسوس کا نظام پوری مملکت میں مضبوطی سے جاری تھا، فیروز شاہ کا دور جہاں خوشحالی و بہبودی کے لئے مشہور تھا، اس کی عدل پروری کی وجہ سے امن وامان بھی اسی طرح عام تھا، اس کے عہد میں عدل وانصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی کسی دوسرے پر ظلم وتعدی کرنے کا حق نہ تھا، وہ ان معاملات میں اسلام کے شرعی قوانین کو اہمیت دیتا تھا، سزائیں بھی وحشیانہ نہ تھیں، بلکہ شریعت کے مطابق تھیں، دہلی سلطنت کے آخری حکمراں خاندان کا بادشاہ سلطان سکندر لودھی بے انتہا عدل پرور تھا، وہ اپنی رعایا کے احوال سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا اور کسی طرح کے ظلم وچیرہ دستی کو پسند نہیں کرتا تھا، مظلوموں کی داد رسی کے لئے پورا اہتمام کرتا تھا اور اس میں بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیتا، اس نے خود اپنا معمول بنا رکھا تھا کہ روزانہ مغرب کے بعد حرم میں ایک

گھنٹہ گذار کر خلوت خاص میں آجاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنا کرتا۔ اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی صرف مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کر رکھے تھے، اس نے وکیل کو حکم دے رکھا تھا کہ عدالت کے اندر پہرارات گئے بیٹھا رہے کہ شاید اس وقت تک کوئی فریادی آجائے۔ سکندر لودھی کے انصاف پسندی کے بہت سے قصے مشہور ہیں، سکندر لودھی مذہبی انسان تھا، اس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ کوئی کام خلاف شریعت نہ ہونے پائے، وہ عدل وانصاف اور فیصلوں میں علماء سے مشورے کیا کرتا تھا اور اسلامی معیار کے مطابق سب کے ساتھ مساویانہ طور پر عدل وانصاف کرتا، اسی لئے وہ امن وامان قائم رکھنے میں کامیاب رہا اور اس کے عہد میں خوشحالی رہی۔

7.3.2 قاضی القضاۃ اور صدر الصدور

نظام عدل کا سربراہ بادشاہ کے بعد قاضی القضاۃ ہوتا تھا اس کی تقرری خود بادشاہ کرتا تھا اور بادشاہ اس کو تبدیل بھی کر دیا کرتا تھا۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت چیف جسٹس کی ہوتی جو پوری سلطنت کے عدلیہ کا سربراہ ہوتا، اس منصب پر ایسے شخص کو مقرر کیا جاتا تھا جو اپنے علم اور تقوی میں ممتاز ہو، قاضی القضاۃ کی اپنی بھی مجلس عدالت ہوتی جہاں وہ مقدمات سنتا اور نچلی عدالتوں سے آنے والی اپیلوں کی سماعت کرتا تھا۔ صوبوں کے لئے قاضیوں کی تقرری اسی قاضی القضاۃ کے ذریعہ ہوتی تھی اور وہ ان پر نظر رکھتا تھا، قاضی القضاۃ کا عہدہ دہلی سلطنت میں انتہائی اہمیت کا حامل تھا، بادشاہ کے بعد پہلا وزیر تو وزیر خاص ہوتا تھا، دوسرے نمبر پر قاضی القضاۃ ہی کا عہدہ اہمیت رکھتا تھا، اسے قاضی ممالک بھی کہا جاتا تھا۔

قاضی القضاۃ ہی کی طرح ایک عہدہ صدر الصدور کا تھا، یہ گویا وزارت مذہبی امور تھی، اس کے ذمہ مذہبی معاملات، جمعہ وعیدین کا قیام، علماء وفضلا کے لئے مدد معاش کی فراہمی، محتسبین اور دوسرے عہدیداروں کی تقرری وغیرہ تھی۔ کبھی کبھی یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص کے سپرد ہوتے تھے اور بسا اوقات دونوں کے لئے علاحدہ تقرری ہوتی تھی۔ صدر الصدور اپنے نائبین صوبوں میں مقرر کرتا جو صدر صوبہ کہلاتے تھے، یہ صوبائی سطح پر مذہبی امور کے سربراہ قرار پاتے تھے۔ عہد سلطنت کا مشہور مؤرخ و عالم قاضی منہاج سراج جرجانی دونوں عہدوں پر فائز رہا۔ بہرام شاہ نے اسے دہلی کی قضائت کے ساتھ صدر الصدور مقرر کیا تھا، سلطان ناصر الدین نے صدر جہاں کے نام سے عہدہ قائم کیا اور اس پر قاضی منہاج کو مقرر کیا، اس نے اس عہدہ کو قاضی القضاۃ سے اونچا بنا دیا تھا، کیونکہ صدر جہاں دیوان مظالم اور مذہبی امور دونوں کا نگراں تھا۔ علاء الدین خلجی نے دونوں عہدے ایک ہی شخص کے سپرد کر دئے تھے، اس نے تخت نشیں ہونے کے بعد قاضی صدر الدین عارف کو قضائے مملکت کی مسند سپرد کی تھی جو قاضی منہاج الدین سراج کے نواسے تھے اور مضبوط کیرکٹر کے حامل اور شہر والوں کے مزاج سے اچھی طرح آشنا تھے۔ فیروز تغلق کے دور میں یہ دونوں عہدے پھر سے علاحدہ کر دئے گئے تھے۔ دہلی سلطنت کے عہد میں جن لوگوں کو قضائے ممالک کا منصب عطا کیا گیا تھا۔ ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

قاضی وجیہ الدین کاشانی، قاضی ناصر الدین، قاضی اختیار الدین، قاضی ملک ضیاء الدین، محمد جنیدی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی شمس الدین، قاضی منہاج السراج، قاضی عماد الدین اشفورقانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، قاضی ملک نظام الدین، قاضی مغیث الدین، قاضی حمید الدین ملتانی، قاضی ضیاء الدین قاضی خاں، قاضی کمال الدین، قاضی جلال الدین، قاضی ضیاء الدین، قاضی سماء الدین، قاضی میاں بھوا۔

7.3.3 صوبوں اور شہروں میں قضا

قاضی القضاۃ کے ذریعہ پوری مملکت کے اندر ہر صوبے میں قاضی کی تقرری کی جاتی تھی، یہ قاضی صوبہ کہلاتے تھے، اگر صوبہ کے لئے صدر مقرر ہوتے تو صدر صوبہ کہلاتے تھے۔ قاضی صوبہ کے تحت صوبہ کے تمام پرگنوں میں قاضی مقرر ہوتے تھے، جو پرگنہ کی سطح پر مقدمات کی سماعت کرتے اور فیصلے کرتے تھے، اسی طرح صدر صوبہ کے ذریعہ پورے صوبے کے مذہبی معاملات دیکھے جاتے تھے۔ پرگنہ کئی شہروں اور گاؤں پر مشتمل ہوتا تھا، گاؤں کے معاملات کو اسی طرح باقی رکھا گیا تھا جیسا وہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔ یہ عہد سلطنت کے بادشاہوں کی پالیسی تھی کہ گاؤں کے نظام کو نہ چھیڑا جائے، چنانچہ وہاں پنچایت کے ذریعہ معاملے حل ہو جایا کرتے تھے۔

صوبوں اور پرگنوں کے اندر قاضیوں کے ساتھ ان کی معاونت کے لئے پوری ٹیم ہوا کرتی تھی، صوبوں کے اندر قاضی کے ساتھ مفتی بھی مقرر ہوتے تھے جو شرعی معاملات میں قاضی کو مشورہ دیا کرتے تھے، اگر قاضی خود ہی شرعی احکام کا ماہر ہوتا تو اسے مفتی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اگر مقدمہ غیر مسلموں سے متعلق ہوتا تو پنڈت قاضی کی مدد کیا کرتے تھے، گاؤں کی سطح پر غیر مسلموں کے فیصلے خود ان کے مذہب کے مطابق اور ان ہی کے ذریعہ طے ہو جایا کرتے تھے۔

7.3.4 قضاء کے دوسرے عہدیداران

قاضیوں کے ساتھ ایک عہدیدار میر داد کے نام سے ہوتا تھا، یہ عہدہ بڑے دبدبہ والے شخص کو سپرد کیا جاتا تھا اور اس کا کام ایسے امراء اور بڑے افراد کو عدالت میں حاضر کرنا ہوتا تھا جن کے بارے میں خدشہ ہوتا کہ وہ اپنے مقام و مرتبہ کی وجہ سے حاضر عدالت نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ایک عہدہ داد بک کا تھا جس کی حیثیت آج کل کے مجسٹریٹ کی ہوتی تھی۔ سکندر لودھی نے ایک عہدہ میر عدل کے نام سے قائم کیا تھا، جو صرف دیوانی کے معاملات کی سماعت کرتا تھا۔ فوج چونکہ لوگوں کی بڑی تعداد پر مشتمل ہوا کرتی تھی اور اکثر یہ متحرک رہتی اور مہینوں اور برسوں سفر کرتی، ایسی فوج کے اندر بھی مقدمات پیش آتے تھے اور وہاں بھی عدالت کا انتظام رکھا گیا تھا، چنانچہ فوج کے لئے قاضی کی تقرری ہوتی تھی' یہ قاضی عسکر کہلاتے تھے، اور ان کا کام لشکر کے اندر کے مقدمات کو سننا اور فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ دہلی شہر جہاں مرکزی حکومت تھی اور بادشاہ خود رہتا تھا، وہاں کے لئے بھی مخصوص طور پر قاضی مقرر کیا جاتا تھا، چنانچہ مشہور سیاح ابن بطوطہ جو محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی آیا تھا، اسے سلطان نے شہر دہلی کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مسلک کے علماء بھی قاضی مقرر ہو سکتے تھے، کیونکہ دہلی سلطنت میں فقہ حنفی کا رواج تھا اور ابن بطوطہ فقہ مالکی سے وابستہ تھا۔ قاضی کا بڑا احترام کیا جاتا اور وہ بڑے بڑے امراء کو سزا دے سکتا تھا۔ شہزادے، وزراء، فوج کے سردار اور دوسرے اہم عہدیدار بھی ایسے مقدمات فیصل کر دیتے جن میں بہت زیادہ قانون دانی کی ضرورت نہ ہوتی، مال کے مقدمات کی سماعت مقطع یا دیوان کر دیا کرتا تھا، ان میں قاضی کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ فیصلے بہت جلد ہو جایا کرتے تھے اور مظلومین کے لئے انصاف پانا بہت آسان تھا۔ عام طور پر عدالتی کارروائی جلد مکمل کر کے مجلس ہی میں فیصلہ سنا دیا جاتا، اور حق دار کو حق ملتا اور مجرم کو سزا۔ محکمہ عدل کے اس سستے، جلد اور مساویانہ انصاف کے نظام کی وجہ سے دہلی سلطنت میں عدل کی فرمانروائی تھی۔

7.3.5 شریعت کا نفاذ

عدل وانصاف کا یہ نظام پوری طرح اسلامی شریعت کے مطابق جاری کیا گیا تھا۔ دہلی سلطنت کے عہد میں دیگر وزارتوں کے مقابلہ میں محکمہ عدل کی وزارت ہی بڑی حد تک شریعت کے مطابق چلائی گئی تھی۔ قاضیوں کی تقرری ان کی شرعی قابلیت اور فقہی صلاحیت کی بنیاد پر ہوتی تھی اور مرکز سے لے کر صوبوں اور پرگنوں تک مقرر ہونے والے قاضی احکام شریعت کی روشنی میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ شرعی احکام کی تابعداری کی غرض سے ہی قاضیوں کے ساتھ مفتیوں کی تقرری کی جاتی تھی، خود بادشاہ اپنی معاونت کے لئے قاضیوں کو رکھتا تھا' البتہ بادشاہ کی ذات محکمہ عدل کی آخری منزل تھی۔ لوگوں کے مقدمات میں اس کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوا کرتے تھے اور فیصلوں سے پہلے عدالتی کارروائی یعنی ثبوت اور گواہیاں دیکھی جاتی تھیں اور ان کے بعد ہی فیصلہ ہوتا تھا۔ البتہ سزاؤں کے نفاذ میں بادشاہ ہمیشہ شریعت کا پابند نہیں رہتا تھا، بالخصوص ایسے معاملات جو سیاسی بغاوت یا سیاسی اختلاف کی نوعیت کے ہوتے یا ایسے جرائم جن سے بادشاہ کے احکام کی خلاف ورزی کی جاتی، ان میں متعدد بادشاہوں کی سزائیں بے انتہا سخت تھیں اور وہ شریعت کے مطابق نہیں کہی جاسکتی ہیں۔ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق نے سزاؤں میں سختی کی روش اختیار کی تھی، لیکن وہیں قطب الدین ایبک، التمش، ناصر الدین محمود، بلبن، فیروز تغلق، بہلول اور سکندر لودھی وغیرہ سلاطین نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ عدل کا اعلیٰ معیار برقرار رہے اور ان کا کوئی کام خلاف شریعت نہ ہو۔ ان بادشاہوں کی انصاف پروری اور عدل گستری کے شاندار قصے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

معلومات کی جانچ

1۔ دہلی سلطنت کے نظام عدل میں آخری اتھاریٹی کون ہوتا تھا؟

2۔ قاضی القضاۃ اور صدر الصدور میں کیا فرق تھا؟

3۔ میر داد کس عہدیدار کو کہتے تھے؟

7.4 سماجی حالات

دہلی سلطنت کا سماجی نظام عہد وسطی میں جاری سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ حکمراں اگرچہ مسلمان تھے اور اسلام میں سماج کے اندر ذات و برادری یا مالی حیثیت کی بنیاد پر فرق مراتب نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عہد وسطی میں سماج کے اندر یہ فرق مراتب موجود تھا۔ دراصل عہد وسطی کا سماج کئی طبقوں پر مشتمل تھا، حکمراں اور امراء کا طبقہ بیشتر مسلمانوں کا تھا۔ ملک کی اکثریت ہندوؤں کی تھی، ان میں بھی امراء اور حکمرانی کرنے والے خاندانوں کے افراد تھے، ہندو سماج کے اندر اونچ نیچ اور برادری کے طبقات پہلے سے موجود تھے۔ گاؤں کے اندر دو طرح کے لوگ تھے، ایک طبقہ کاشتکاروں اور کسانوں کا تھا جن کی محنت پر ملک کی معیشت کا انحصار تھا۔ دوسرا طبقہ زمینداروں اور گاؤں کے سرداروں کا تھا، ان ہی میں سے محصلین ہوتے جو گاؤں سے لگان وصول کرتے تھے۔ سماج کے اندر تاجروں کا ایک طبقہ تھا جو مختلف اشیاء کی تجارت انجام دیتا تھا، یہ لوگ اشیاء تجارت کی درآمد برآمد سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ عہد سلطنت کے سماج کا ایک اہم عنصر غلاموں کا تھا، اس دور میں دنیا کے

بیشتر حصوں میں غلاموں اور باندیوں کی تجارت جاری تھی، اس کے لئے غلاموں کو پکڑنے اور انھیں اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرکے اونچی قیمتوں پر فروخت کرنے کا رواج تھا۔ ایسے غلام اپنی قابلیت کی وجہ سے غلامی سے نکل کر امراء کی صف تک ہی نہیں پہنچتے بلکہ تخت حکومت پر بھی بیٹھتے تھے، دہلی سلطنت کا آغاز کرنے والے سلاطین بھی غلام ہی تھے، جو اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر ہندوستان کے بادشاہ بنے تھے۔

7.4.1 امراء کا طبقہ

سماجی زندگی میں سب سے اہم اور باحیثیت طبقہ امراء کا تھا، حکمراں طبقہ بھی ان ہی میں سے ہوتا تھا۔ شروع میں ترکوں نے حکومت قائم کی تو امراء بھی اسی نسل کے لوگ تھے، پھر جب حکومت ترک نسل سے نکل کر خلجی خاندان میں آئی تو لوگوں کے اس احساس کو تقویت ملی کہ وہ بھی امراء کے طبقہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ حقیقت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی، چنانچہ عہد وسطی کے اس سماج میں ایسے نمونے ملتے ہیں کہ معمولی سطح سے اٹھ کر لوگ امراء کی صف میں شامل ہو گئے۔ فوجی قابلیت اور اعلی صلاحیت کے بل بوتے پر ایسی ترقی ممکن تھی۔

امراء اور حکمراں خاندان کا طبقہ حکومت کے اعلی عہدوں پر فائز ہوتا تھا، سماج میں ان کو اونچی حیثیت حاصل تھی، ان کے پاس مالی وسائل بھی بہت زیادہ تھے، اور وہ بڑے عیش و آرام کی زندگی گذارتے تھے۔ عام طور پر امراء تین درجوں میں تقسیم تھے: کچھ خان تھے جو سب سے اعلی رتبہ تھا، اس کے بعد ملک، پھر امیر ہوتے تھے۔ یہ تقسیم بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتی تھی، حکومت اور فوج کے بڑے عہدے ان ہی لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ التمش نے ایسے چالیس امراء کی جماعت بنائی تھی جو حکومت کے کاروبار کو سنبھالنے میں اس کے مددگار ہوتے تھے، یہ جماعت چہلگانی کہلاتی تھی۔ التمش کے بعد سربراہ حکومت کی تعیین میں ان امراء کا بڑا دخل تھا۔ بلبن بھی انہی چالیس امراء میں سے ایک تھا اور اس جماعت کی طاقت و اہمیت سے وہ واقف تھا، چنانچہ جب وہ بادشاہ بنا تو اپنی حکومت کی مضبوطی کے لئے اس نے امراء کی یہ جماعت توڑ دی، لیکن سماج کے اندر امراء باقی رہے، اور قابل لوگوں کو ان کے کارناموں پر خان وغیرہ کے خطابات ملتے رہے۔ مختلف مناسبتوں میں اور فتوحات وغیرہ کے موقعوں پر ان امراء کو بیش قیمت تحائف ملتے تھے۔ یہ امراء بھی بادشاہ کے دربار میں قیمتی تحائف و نذر پیش کرتے تھے، امراء کے محلات، سامان عیش و راحت اور ٹھاٹھ باٹھ بادشاہ کے نقش قدم پر ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کو امتیازی حیثیت کے اظہار کے لئے کچھ علامتیں اور نشان وغیرہ بھی عطا ہوتی تھیں۔ جیسا کہ کہا گیا، امراء کی اس حیثیت تک پہنچنے کے لئے کسی نسل کی قید نہ تھی، لوگ اپنی صلاحیت و قابلیت کے ذریعہ اس مقام کو حاصل کر لیتے تھے۔

امراء کی صف میں غیر مسلم اور ہندو بھی تھے اور انھیں بھی اعلی سماجی حیثیت اور حکومت میں عہدے حاصل تھے۔ دہلی حکومت کے آغاز کے وقت راجپوت ہندوستان کے کئی علاقوں میں حکومت کر رہے تھے، آہستہ آہستہ ایسے بیشتر علاقے دہلی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ لیکن راجستھان اور آس پاس کے علاقوں میں کئی جگہ انکی حکومتیں باقی تھیں، کچھ جگہوں پر وہ دہلی سلطنت کے باجگذار کے طور پر تھے، اور مرکز کو متعینہ خراج دے کر اپنی حکومت میں آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے، انکے پاس فوجیں ہوتیں اور نہایت شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گذارتے تھے۔ اونچی ذات کے یہ ہندو اور برہمن وغیرہ خود دارالسلطنت دہلی میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ رہتے تھے، حکومت ان کو اعلی عہدے دیا کرتی تھی، قطب الدین ایبک کی فوج میں ہندو افسر اور سپاہی تھے۔ بلبن اور علاء الدین کے عہد میں ہندو سرداروں کا اقتدار کافی بڑھ گیا تھا' حتی کہ علاء

الدین نے ان کی بغاوت کے اندیشہ سے ان کی طاقت توڑنے کی کوشش کی اور مسلم امراء کے ساتھ ہندو سرداروں پر بھی سختی اور پابندی نافذ کی، لیکن محمد بن تغلق کے عہد میں ہندو سردار اور بھی طاقتور ہوگئے تھے، وہ صوبوں کے گورنری اور محکمہ مال کے اعلی عہدیدار مقرر ہونے لگے۔ ان کے اثرات اتنے زیادہ ہوگئے تھے کہ لوگ ان پر رشک وحسد کرتے تھے۔ فیروز شاہ کے محبوب ہم جلیسوں میں ہندو سردار بھی شامل تھے، مؤرخین نے ہندو سرداروں اور امیروں کی شاندار زندگی، عیش وعشرت اور مقام وعظمت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، جن کے یہاں مسلمان بھی نوکر ہوتے تھے اور جن کے دروازوں پر مسلمان غرباء بھیک مانگتے تھے۔ برنی نے فتاوی جہانداری میں لکھا ہے کہ ہندو دار السلطنت میں بھی بڑے بڑے مکانات محلوں ہی کی طرح بناتے ہیں، وہ کمخواب کے لباس پہنتے ہیں، عربی گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں، جن پر چاندی اور سونے کا ساز ہوتا ہے اوران کی عظمت طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ عیش وتنعم کی زندگی گذارتے ہیں۔

7.4.2 تاجروں کا طبقہ

ہندوستان بنیادی طور پر زراعتی ملک تھا، لیکن یہاں قدیم زمانہ سے تجارت کا رواج رہا، دہلی سلطنت کے قیام کے بعد وسط ایشیا اور عرب ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات میں مزید مضبوطی اور وسعت آگئی اور اشیاء تجارت کی درآمد برآمد بڑھ گئی، سلاطین دہلی نے بھی اس جانب پوری توجہ دی اور سہولیات بہم پہنچائیں، محمد بن تغلق نے دہلی سے دیوگیری تک سات سو میل کی لمبی شاہراہ تیار کرائی جس پر دونوں جانب درخت لگوائے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سرائے بنوائے جہاں مسافروں کے ٹھہرنے اور خورد ونوش کا انتظام کرایا۔ اس سے تجارت کو بہت فروغ ملا، ان تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے سماج کے اندر تاجروں کا طبقہ وجود میں آگیا تھا ان میں کچھ ایسے تھے جو ملک کے اندر تجارت کرتے تھے دہلی میں تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں، اور ہر سامان کیلئے علاحدہ بازار تھے، جہاں کپڑے، اجناس، جانور، غلام و باندی، مٹھائیاں، جوتے، اسلحے اور دیگر سامان ملتے تھے۔ ان تاجروں کے علاوہ کچھ بیرونی تجار بھی تھے جو دوسرے ممالک سے سامان تجارت لاتے اور ہندوستان میں فروخت کرتے، کیونکہ اس دور میں ملتان بیرونی تجارت کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، خراسانی، عراقی اور ایرانی بیرونی تجارت میں نمایاں تھے۔

تجارت پیشہ طبقہ میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے، ان کی سماجی زندگی بھی آرام وراحت اور باحیثیت تھی، بسا اوقات ان تاجروں کے پاس اتنی دولت ہوتی کہ امراء اور دوسرے لوگ ان سے قرض لیا کرتے۔ تجارت بحری اور بری دونوں قسم کی تھی، بحری تجارت کی وجہ سے ساحلی علاقوں کے شہروں میں تجارت کو فروغ مل رہا تھا۔ سلاطین دہلی نے تجارت کے فروغ اور اشیاء کی قیمتوں کو ارزاں بنانے میں کافی دلچسپی لی۔ علاء الدین کے زمانہ میں اشیاء کی نرخ بندی کردی گئی تھی اور قیمتیں سستی ہوگئی تھیں، فیروز شاہ تغلق اور بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے زمانوں میں قیمتیں اور بھی کم ہوگئی تھیں، جس سے لوگوں کو بہت آسانیاں حاصل ہوگئی تھیں۔

7.4.3 صنعت پیشہ طبقہ

تاجروں کے ساتھ سماج میں ایک بڑا طبقہ صنعت وحرفت سے جڑا ہوا بھی تھا، دیہاتوں میں تو چھوٹی موٹی ایسی صنعتیں تھیں جو زراعت سے وابستہ ہوتی تھیں، شہری صنعتوں میں پارچہ بافی یعنی کپڑے کی تیاری اور اس سے متعلق متعدد صنعتیں بڑی ترقی پر تھیں۔ اس کے علاوہ دھات سازی، شکر سازی، کاغذ سازی اور سنگ تراشی کی صنعتیں رائج تھیں، کپڑے کی صنعت عروج پر تھی اور اس سے جڑی زردوزی، رنگ سازی اور

کشیدہ سازی کی صنعتیں بڑے شہروں میں رائج تھیں۔طرح طرح کے عمدہ اور نفیس کپڑوں کی تیاری میں سماج کا ایک بڑا طبقہ مشغول تھا، ہندو اور مسلمان دونوں ان صنعتوں سے جڑے ہوئے تھے۔شہروں کے اندران پیشہ وروں اور صنعتوں سے وابستہ لوگوں کی علاحدہ آبادیاں ہوتی تھیں، ان صنعتوں کے لئے شاہی کارخانے قائم تھے، جہاں بڑی تعداد میں ملازم ہوتے تھے، ان کی زندگی متوسط طرز کی ہوتی تھی، بہت سارے غلاموں کوصنعتوں کی تربیت دے کران کاموں میں لگایا جاتا تھا۔فیروزشاہ تغلق نے ایسی صنعتوں کو بہت فروغ دیا تھا، اس نے تقریباً دولاکھ غلام جمع کر لئے تھے جن میں سے ایک بڑی تعدادکوصنعتوں کی تربیت دی گئی تھی اور انھیں مختلف پرگنوں میں پھیلا دیا گیا تھا، اس سے صنعت کو بھی ترقی ہوئی اور سماجی زندگی میں لوگوں کو ہنر مند بن کر کمانے کا راستہ حاصل ہوا۔

7.4.4 دیہی زندگی

دہلی سلطنت کے دور میں گاؤں کی آبادی بڑی اہمیت رکھتی تھی، چونکہ گاؤں سے ہی زراعت وابستہ تھی جس پر ملک کی معیشت کا دارو مدار تھا، سلاطین دہلی نے گاؤں کی زندگی میں دخل اندازی کی پالیسی نہیں اپنائی تھی، اس لئے گاؤں کا نظام زیادہ تر اسی حال پر رہا جو پہلے سے مروج تھا۔گاؤں میں بنیادی طور پر دو طبقے تھے، ایک کاشتکاروں اور زراعت پیشہ لوگوں کا تھا اور دوسرا زمین کے مالکان اور گاؤں کے سربراہوں کا تھا۔کسان اور کاشتکار زیادہ تر زمین کے مالک نہ ہوتے تھے۔ بلکہ وہ بٹائی پر یا شرکت کے دوسرے طریقوں پر کاشتکاری کرتے تھے اور اپنی بٹائی کے حصہ پر یا مزدوری پر گذارہ کرتے تھے، سماج کا یہ طبقہ مالی اعتبار سے کمزور تھا اور قدرتی آفات یا زراعت کی نابہتری کی صورت میں انھیں مشکلات کا سامنے کرنا پڑتا تھا، ورنہ عام حالات میں ان کی زندگی میں خوشحالی رہتی، حکومت بھی انھیں امداد فراہم کرتی تھی۔ فیروز شاہ تغلق نے زراعت کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لئے بے شمار نہریں بنوائیں، کنویں کھدوائے اور ٹیکس کا بار بالکل ہلکا کر دیا، جس کے نتیجہ میں زراعت میں بے انتہا ترقی ہوئی اور کاشتکار خوشحال و آسودہ ہو گئے تھے۔

گاؤں میں دوسرا طبقہ زمینداروں اور سرداروں کا تھا یہ لوگ خوط اور مقدم کہلاتے تھے، یہی کسانوں سے لگان وصول کرتے اور حکومت کو مقررہ حصہ ادا کر کے بقیہ آمدنی خود استعمال کرتے تھے ان لوگوں کی معاشی حالت بڑی اچھی تھی، یہ کاشتکاروں سے زیادہ وصول کرتے تھے اور حکومت کو کم ادائیگی کرتے، درمیانی منافع کا بڑا حصہ اپنے پاس رکھتے تھے۔خوط اور مقدموں کی ان بے ایمانیوں کو روکنے کے لئے ہی علاء الدین نے مقررہ لگان کے بجائے زمین کی حقیقی پیمائش کروائی اور پیمائش کی شرح پر لگان کی مقدار طے کی، جس سے اصل وصول شدہ لگان حکومت کو پہنچنے لگی اور پٹواریوں کو اپنا معاوضہ ملتا تھا، لیکن علاء الدین کے بعد پھر ان کی حالت پہلے جیسی ہو گئی۔ مؤرخین جیسے وصاف اور ابن بطوطہ نے بالترتیب گجرت اور بنگال کی دیہی آبادیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں بہت زیادہ خوشحالی ہے، گاؤں اور قصبے کے لوگ دولت سے کھیلتے ہیں اور تھوڑی سے آمدنی میں لوگ آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

7.4.5 اہل علم وفضل کا طبقہ

سماج کا ایک اہم ترین طبقہ اہل علم وفضل کا تھا، دہلی سلطنت اس معاملہ میں زریں ہے کہ یہاں کے بڑے شہر بالخصوص دہلی، لاہور، ملتان اور لکھنوتی وغیرہ علم وتہذیب کے روشن مراکز بن گئے تھے، جہاں اہل کمال کا مجمع رہتا، عالم اسلام میں چنگیزی تباہی کے نتیجہ میں بڑے بڑے با کمال دہلی میں سمٹ آئے تھے، ان میں فقہاء وعلماء کے علاوہ بڑے بڑے شعراء وادباء اور ماہرین فن تھے۔سماج میں اس طبقہ کو بڑی عزت

ووقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، سلاطین دہلی بھی ان کی بڑی قدر کرتے، ان کو شریعت سے وابستہ علم وتدریس اور قضاء وغیرہ کے لیے مناصب پر فائز کرتے اور ان کے لئے معیاری معاوضہ مقرر کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک، التمش اور بلبن کے زمانوں میں دہلی میں وقت کے نامور فاضلان کا مجمع اکٹھا تھا اور ان سلاطین نے انھیں حسب حیثیت اعزاز بخشا۔ التمش اور بلبن کے درباروں میں اور ان کے دسترخوانوں پر نیز ان کے سفر میں علماء واہل فضل ساتھ ہوا کرتے تھے، علاء الدین نے گوکہ بذات خود انھیں وہ اہمیت نہ دی جو اس سے پہلے حاصل تھی لیکن اس کے عہد میں سب سے زیادہ ارباب کمال اور علماء دہلی میں موجود تھے۔ محمد بن تغلق، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودھی ان کے بڑے قدرداں رہے۔ عہد سلطنت کے مشہور فقہاء میں قاضی منہاج سراج، قاضی قطب الدین کاشانی، شرف الدین ولوالجی، مولانا برہان الدین بزاز، نور الدین مبارک، فخر الدین ناقلہ اور شمس الدین وغیرہ فقہاء کی ایک طویل فہرست رہی ہے۔ ان فقہاء کے علاوہ یہ دور مشائخ کبار کا بھی ہے، دہلی سلطنت کے سماج کا یہ اہم عنصر تھے۔ یہ دور مشائخ عظام کے وجود اور ان کی برکتوں سے فیضیاب ہو رہا تھا، شیخ معین الدین چشتی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ ایبک، التمش اور بلبن کی عقیدت جگ ظاہر تھی، بابا فرید الدین گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیاء جیسی عظیم ہستیاں اسی دور میں تھیں جن کے آستانوں پر ہزاروں لوگ روحانی سکون اور اخلاقی تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔ سماج میں ان کی عظمت اور دبدبہ کے سامنے بسا اوقات شاہانہ عظمت ماند پڑ جاتی تھی۔ قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ نصیر الدین چراغ، علی احمد صابر کلیری، جمال الدین ہانسوی، مخدوم جہانیان جہاں گشت، شرف الدین احمد یحیی منیری، شیخ جلال الدین تبریزی، سید اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ سراج الدین اخی سراج، نور قطب عالم وغیرہ مشائخ سے دہلی سلطنت کا یہ زمانہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ان مشائخ کی خدمات اور روحانی سرگرمیوں نے سماج پر بڑے گہرے اثرات ڈالے، ہندو اور مسلم دونوں ان بزرگوں کی خانقاہوں میں آتے، مسلم امراء کے ساتھ ہندو امراء بھی یہاں جبین عقیدت خم کرتے، اور سماج کے اندر روحانی ماحول میں تقویت پیدا ہوتی۔

7.4.6 غلاموں کا طبقہ

غلامی کا رواج زمانہ قدیم سے جاری تھا، دہلی سلطنت میں یہ رواج باقی رہا، عام طور جنگوں میں گرفتار ہونے والے مرد وعورت غلام وباندی بنالئے جاتے، اس میں مذہب کا کوئی فرق نہ تھا، غیر مسلم جنگوں میں بھی اسی طرح قیدی غلام ہوتے جس طرح مسلم حکمرانوں کی جنگوں میں قیدی بنائے جاتے۔ یہ غلام گھروں میں کام کرتے اور اپنے مالکوں کی خدمت نیز ان کے مطابق تجارت وصنعت انجام دیتے تھے۔ غلاموں کی خرید وفروخت کے لئے باضابطہ منڈی ہوتی تھی، ہندوستان میں زیادہ تر غلام گھریلو کاموں کے لئے رکھے جاتے تھے، لیکن وسط ایشیاء میں غلاموں کو خرید کر انھیں بہترین مذہبی اور ادبی تعلیم دی جاتی، آداب سکھائے جاتے اور فوجی تربیت دے کر اونچی قیمتوں میں انھیں فروخت کیا جاتا تھا، ایسے غلاموں کو بڑے امراء، اصحاب ثروت اور اہل علم خریدتے، انھیں علمی کاموں میں لگایا جاتا یا فوج میں بھرتی کیا جاتا، ایسے غلام اپنی فوجی قابلیت اور اعلی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ترقی پاتے اور سماج کے اندر اونچا مقام حاصل کر لیتے تھے۔ ایبک، التمش اور بلبن جیسے عظیم سلاطین دہلی پہلے غلام تھے اور انھیں بازاروں سے خرید کر تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا گیا اور وہ ترقی کرتے ہوئے عظیم سلطنتوں کے بادشاہ بنے۔

7.5 مذہبی حالات

مذہبی اعتبار سے دہلی سلطنت پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ بڑی حد تک ایسی حکومت محسوس ہوتی ہے جس میں مذہب کو اعلی حیثیت حاصل تھی اور اس کا اثر براہ راست سماج پر بھی مرتب ہو رہا تھا۔ اس لئے یہ سماج بھی بڑی حد تک مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، حکومت اور سماج دونوں سطحوں پر اس عہد میں مذہب اور بالخصوص اسلام کا رنگ صاف نمایاں نظر آتا ہے، عہد سلطنت کے ابتدائی سلاطین بذات خود گہرے مذہبی رنگ کے حامل تھے، وہ نہ صرف علم اور دینداری سے آراستہ تھے بلکہ شریعت کی تابعداری اپنا فریضہ سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے مذہب اور اسلامی شریعت کو اہمیت دی اور اہل علم کی قدردانی کی جس کی وجہ سے سماج میں اہل علم کا مقام اونچا ہوا بلکہ لوگ مذہب اور دین کی طرف راغب ہونے لگے۔

مذہبی رنگ کو گہرا کرنے میں علماء وفقہاء کے علاوہ مشائخ اور صوفیوں کی عظیم خدمات کا بڑا دخل رہا ہے۔ یہ دور بڑے مشائخ اور بزرگان دین سے مالا مال تھا جو اسلامی تعلیمات اور اخلاقی خوبیوں کے عملی نمونے تھے۔ اور ان کی مجلسوں میں ہر کس و ناکس کی رسائی تھی، جہاں عوام کو روحانی سکون ملتا اور اپنے درد کا درماں پاتے۔ خواجہ اجمیری، خواجہ بختیار کاکی، بابا فرید، محبوب الٰہی، چراغ دہلی اور خواجہ گیسو دراز کی نفس گرم سے سماج کے اندر دینداری اور تعلق مع اللہ کی کیفیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا تھا، دوسری طرف علماء اور فقہاء نے وعظ وارشاد کی محفلیں اور درس کے حلقے قائم کر رکھے تھے۔ قاضی منہاج کا وعظ مشہور تھا جس میں شیخ نظام الدین بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ وعظ بادشاہوں کے درباروں، خانقاہوں، مسجدوں اور محفلوں میں ہوتے جہاں ہزاروں عوام ان سے مستفید ہوتی تھی اور ان کی زندگی میں مذہبی رنگ آجاتا تھا۔ یہ وعظ لشکروں کے اندر بھی ہوتے اور خصوصیت کے ساتھ بیرونی حملوں کے موقعوں پر سلاطین کی خواہش پر وعظ کے ذریعہ لوگوں میں جذبہ بیدار کیا جاتا تھا۔

مذہبی تعلق کے پیدا کرنے میں مشائخ کی خانقاہوں اور فقہاء کی محفلوں کے علاوہ تعلیم کے حلقوں کا بھی رول تھا۔ سلاطین نے اس بات سے بھی دلچسپی لی تھی کہ مدارس قائم ہوں اور اساتذہ تعلیم دیں، چنانچہ دہلی اور دوسرے شہروں میں مدارس بھی قائم ہوئے اور زیادہ تر اساتذہ نے اپنے یہاں تعلیم کے حلقے لگائے، جن سے علم دین کی اشاعت ہوئی اور لوگ مذہب سے گہری وابستگی قائم رکھتے رہے۔

دہلی سلطنت میں سماج کے اندر جہاں دینداری اور مذہب سے تعلق کا غالب ماحول رہا، وہیں اس کے برعکس صورت حال بھی رہی، جس میں بسا اوقات زیادہ شدت بھی پیدا ہوئی، چنانچہ علاء الدین کے دربار میں وہ دینی اور مذہبی رنگ نہ تھا جو اس کے پیشرو سلاطین اور بعد کے سلاطین میں نظر آتا ہے۔ علاء الدین مذہبی آدمی نہیں تھا، لیکن وہ مذہب کی بے حرمتی نہیں کرتا تھا، اس کے دور کو تو علماء وفقہاء کی موجودگی کے اعتبار سے سب سے زیادہ زرخیز دور کہا جاتا ہے۔ علاء الدین کے دور میں ہی قاضی شمس الدین محدث حدیث کی کتابوں کے ایک بڑے ذخیرہ کے ساتھ ہندوستان آئے کہ یہاں حدیث کی اشاعت ہو، لیکن جب اسے علاء الدین کے مذہبی احوال معلوم ہوئے تو وہ واپس چلے گئے۔ اسی طرح قطب الدین مبارک کا دربار مذہبی رنگ سے خالی تھا اور اس کا براہ راست اثر سماج کی مذہبی حالت پر مرتب ہوتا تھا، خسرو خاں کے زمانہ میں تو مذہب اسلام کی بے حرمتی کے واقعات پیش آنے لگے تھے، لیکن مجموعی طور پر دہلی سلاطین کے دربار میں مذہبی رنگ ہی زیادہ غالب رہا، البتہ دربار کی آرائش وزیبائش، بادشاہوں کی نجی محفلوں اور بادشاہوں کی سزاؤں کو مذہبی رنگ سے مستثنیٰ کر کے دیکھنا ضروری ہوگا۔

گو کہ سلاطین دہلی کا مذہب اسلام تھا اور وہ اسلام اور شریعت اسلامی کے نگہبان تصور کیے جاتے تھے، لیکن انھوں نے دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ بھی عزت و مساوات کا برتاؤ کیا، مذہب کی بنیاد پر کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کیا۔ محمد بن تغلق کی بنائی ہوئی دہلی سے دولت آباد کی طویل شاہراہ اور اس پر موجود مسافروں کی بیش قیمت سہولتیں ہندو و مسلمان سب کے لئے تھیں۔ فیروز تغلق کے عہد میں کسانوں سے قرضوں کی معافی، ٹیکس میں بے انتہا کمی اور نہر و کنوؤں کی تیاری نیز باغات کے لگوانے، بیماروں کے لئے اسپتال کھولنے، غریبوں محتاجوں کی مالی امداد، بے روزگاروں کے لئے روزگار، اور غریب بچیوں کی شادی کے انتظامات جیسے فلاحی اقدامات یکساں طور پر ہندو اور مسلمان سب کے لئے تھے۔ ہندو مذہب کی طرح جین مذہب اور دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ بھی یکساں برتاؤ ہوتا تھا اور سلاطین دہلی ان کی بھی قدر افزائی کرتے تھے۔

7.6 سماج پر اسلامی تہذیب کے اثرات

یہ بہت دلچسپ ہے کہ دہلی سلطنت کے دور میں ہندوستان کے سماج پر اسلام کے افکار و نظریات اور عقائد کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہندو سماج کے اندر ایسی تحریکیں اٹھیں جن میں اسلامی عقائد اور تعلیمات سے استفادہ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند کے درج ذیل چند ٹکڑے قابل مطالعہ ہیں: ''ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہمسایہ کی طرح زندگی بسر کرسکیں' اس نئے طرز زندگی سے ایک ایسا تمدن پیدا ہوا جو نہ تو بالکل ہندوؤں ہی کا تھا' نہ خالصاً مسلمانوں کا' بلکہ ایک مخلوط ہندو مسلم تمدن تھا' اس طرح ہندو مذہب' ہندو آرٹ' ہندو ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کیے اور ہندو کلچر اور ہندو ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی' مہاراشٹر' گجرات' پنجاب' ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔'' جناب کے ایم پنیکر صاحب نے لکھا ہے کہ ہندو معاشرت پر اسلام کے اثرات کی وجہ سے ہندوؤں کے معاشرتی نظام میں برابر نئے عقائد اور فرقے پیدا ہوتے جا رہے تھے اس عہد میں ہندو مذہب کی تجدید کی تحریکیں برابر جاری رہیں۔ ویشنو تحریک اسی زمانے میں شروع ہوئی جس کی وجہ سے شمال میں جے دیو، میرابائی، رامانند، کبیر، پھر مہاراشٹرا اور گجرات میں گیانیشور وغیرہ جیسے پیشوا پیدا ہوئے۔ کرناٹک میں لنگایت کا عروج بھی اسی دور میں ہو۔ گیت گووند پوری میں لکھی گئی اور یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی شرح راجپوتانہ کے مہارانا کمبھ نے لکھی، رامانند کی تحریک کا مرکز بنارس میں تھا۔ اور یہ بات تو واضح ہے کہ اسی عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا، ہندوستان میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا۔ بھکتی عقائد میں بھی خالص توحید پرستی ہے''۔

معلومات کی جانچ:

1۔ خان، امیر اور ملک کے درمیان دہلی کے سماج میں کیا فرق تھا؟

2۔ بیرونی تجارت سے جڑے لوگ کیا کہلاتے تھے؟

3۔ خوط اور مقدم کون تھے؟

7.7 خلاصہ

دہلی سلطنت میں نظام عدل مرکز سے لے کر صوبوں، پرگنوں اور قصبوں تک میں نافذ کیا گیا تھا۔ سلاطین دہلی نے عدل وانصاف کی فراہمی پر بہت زیادہ توجہ دی تھی اور اس معاملہ میں وہ بسا اوقات اپنے عزیزوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ دہلی سلاطین نے انصاف کا نظام سستا اور آسان بنایا تھا، مسلمانوں کے ساتھ اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا، جب کہ غیر مسلموں کے فیصلے ان کے مذہب کی روشنی میں کئے جاتے تھے، گاؤں میں پنچایت کے قدیم نظام کو باقی رکھا گیا تھا۔

نظام عدل کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا جس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا، پھر ہر صوبے کے لئے ایک قاضی مقرر ہوتا تھا، صوبہ کے اندر ہر پرگنہ میں ایک قاضی ہوتا تھا، قاضی صوبہ کی عدالت میں فیصلہ اور اپیل دونوں کے لئے تھی۔ عدالت کی آخری منزل بادشاہ کی ذات تھی، یہ سلاطین خود دربار لگا کر لوگوں کو انصاف دیتے، مقدمے سنتے اور اپیلوں کی بھی سماعت کرتے، ان کی معاونت کے لئے قاضی اور مفتی ہوا کرتے تھے، فیصلے بہت جلد ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ شرعی ضوابط کا خیال رکھا جاتا تھا، لیکن بادشاہ کی سزاؤں میں بسا اوقات سختی زیادہ ہوتی تھی جو شریعت کے خلاف کہی جائے گی۔ ایبک، التمش، بلبن، محمد بن تغلق اور سکندر لودھی وغیرہ اپنے بے لاگ عدل وانصاف اور دلچسپی کے لئے مشہور ہیں، بادشاہ کے خلاف بھی مقدمہ دائر ہو سکتا تھا، جیسا کہ محمد بن تغلق کے ساتھ کی مثالیں موجود ہیں۔

دہلی سلطنت کے سماج میں مختلف طبقے تھے، امراء اور حکمراں کا طبقہ اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، حالانکہ اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن دہلی سماج میں انھیں یہ حیثیت حاصل تھی، اعلیٰ عہدے اسی طبقہ کے پاس ہوتے تھے، البتہ یہ بات ممکن تھی کہ کوئی بھی شخص حتی کہ ادنی غلام بھی اپنی صلاحیت اور فوجی قابلیت کے ذریعہ ترقی کرتا ہوا امراء کے طبقہ میں شامل ہو جائے، ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ امراء کے طبقہ میں ہندو سردار بھی تھے اور انہیں بھی اعلیٰ سماجی رتبہ حاصل تھا، دارالسلطنت دہلی کے اندر ہندو امراء اپنی پوری شان وشوکت کے اظہار کے ساتھ رہتے تھے اور مذہب کی وجہ سے سماجی حیثیت میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا، اس سماج میں اور بھی طبقات تھے۔ جیسے تاجروں کا طبقہ، علماء واہل کمال کا طبقہ، صنعت پیشہ لوگوں کا طبقہ اور کاشتکاروں کا طبقہ، ان سب کی حیثیتیں مختلف تھیں، کسانوں کا طبقہ بہت نچلی سطح پر تھا، لیکن سلاطین دہلی کی پالیسیوں کی وجہ سے ان میں بھی خوشحالی آگئی تھی۔ غلاموں کا بھی طبقہ تھا جن کی خرید وفروخت ہوتی تھی، انھیں گھریلو کام کے لئے رکھا جاتا تھا۔ فیروز تغلق نے بہت سے غلاموں کو تعلیم وتدریس اور ہنر سکھا کر صنعت کے کاموں میں لگایا تھا۔ یہ غلام فوج میں بھرتی کئے جاتے تھے، جہاں اپنی قابلیت کی بنیاد پر وہ ترقی کر کے اونچے عہدوں تک پہنچ جاتے تھے۔

دہلی سلطنت کے سماج پر بنیادی طور پر مذہبی رنگ غالب تھا، نہ صرف سلاطین مسلمان تھے بلکہ وہ اسلام کے محافظ تصور کئے جاتے تھے، انھوں نے مذہبی علماء اور مشائخ کی بڑی قدردانی کی۔ اس عہد میں بڑی تعداد میں علماء وفضلاء اور مشائخ وصوفیاء تھے، جن کی خدمات کی وجہ سے عوام کی اصلاح وتربیت اور تعلیم واخلاق کی اشاعت ہوتی تھی، مختلف صوفی سلسلوں کے بڑی مشائخ اسی دور میں رہے ہیں، جیسے خواجہ اجمیری، بابا فرید، خواجہ محبوب الٰہی، شیخ چراغ دہلی، زکریا ملتانی، شرف الدین یحییٰ منیری وغیرہ۔ سلاطین دہلی میں سے کئی حکمراں بذات خود بڑے دیندار اور نیک تھے، جیسے التمش، بلبن اور ناصر الدین محمود، فیروز تغلق اور سکندر لودھی وغیرہ، لیکن کئی حکمرانوں کے عہد میں مذہبی حالات بہتر نہیں رہے، جیسے کیقباد اور قطب الدین خلجی، علاء الدین خلجی اور خسرو خاں وغیرہ کے زمانوں میں ہوا۔ مذہبی حالات غیر مسلموں کے بھی اچھے تھے، انھیں اپنے

مذہب پر عمل اور مذہبی شناخت کے ساتھ رہنے کی پوری آزادی تھی۔ سلاطین دہلی نے ہندو اور جین مذاہب کے ساتھ بھی بہتر برتاؤ روا رکھا، وہ اونچے سرکاری عہدوں پر فائز رہے، فیروز تغلق کے قریبی ہم نشین کئی ہندو تھے، فیروز کے ہی عہد میں نو مسلم ہریجن خان جہاں تلنگی بہت طاقتور وزیر رہا ہے۔

7.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات کم از کم تیس سطروں میں لکھیے۔

1. دہلی سلطنت کے نظام عدل پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. دہلی سلطنت کا سماجی نظام کیسا تھا، روشنی ڈالیے۔
3. دہلی سلطنت کے مذہبی حالات بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے

1. نظام عدل میں بادشاہ کی حیثیت بیان کیجیے۔
2. شریعت کے نفاذ کی صورت حال پر تبصرہ کیجیے۔
3. سماجی نظام میں غلاموں کی حیثیت پر گفتگو کیجیے۔

7.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. آب کوثر — شیخ محمد اکرام' فرید بک ڈپو' دہلی
2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان' حصہ اول — پروفیسر ستیش چندر' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی 2003ء اردو ترجمہ: عزیز الدین حسین
3. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک — سید صباح الدین عبدالرحمن' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2012
4. بزم مملوکیہ — سید صباح الدین عبدالرحمن' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 1999ء
5. خلجی خاندان — کے ایس لال' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی 1998 ' اردو ترجمہ' یسین مظہر صدیقی
6. مختصر تاریخ ہند — سید ابو ظفر ندوی' دار المصنفین' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2006
7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011

اکائی 8 : دہلی سلطنت میں علمی خدمات اور فن تعمیر

اکائی کے اجزاء

8.1 مقصد

سلطنت دہلی اگر چہ غلاموں کے ذریعہ قائم ہوئی لیکن یہ غلام بذات خود اچھی تعلیم وتربیت سے آراستہ اور علمی وتعمیری ذوق رکھنے والے تھے۔ ان کے اس ذوق کا واضح اظہار دہلی سلطنت کے آغاز سے ہی نظر آتا ہے۔ قطب الدین ایبک نے حکومت کے استحکام اور عدل و امن کے قیام کے ساتھ علم کے فروغ اور فن تعمیر پر بھی پوری طرح توجہ دی' جس کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف شہروں بالخصوص لاہور اور دہلی میں اہل علم جمع ہوتے گئے جنھوں نے تعلیم وتدریس کے حلقے قائم کیے اور تصنیف وتالیف سے دلچسپی لی۔ قطب الدین نے اہل علم کی قدردانی کی' پھر یہی روش دیگر سلاطین دہلی کے ذریعہ اپنائی جاتی رہی' جس کے نتیجہ میں ہندوستان کے اندر علم وادب کا فروغ بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگا اور عالم اسلام سے کھنچ کھنچ کر اہل فضل وکمال ان سلاطین کے درباروں میں جمع ہونے لگے' سلاطین کے نقش قدم پر امراء بھی چلے اور ان کے دربار بھی علم وادب کا مرکز بنتے گئے' ان سب کے نتیجہ میں یہاں مختلف موضوعات پر بیش قیمت کتابیں لکھی گئیں' مدارس اور اسکول قائم ہوئے' تعلیم و تدریس کے حلقے آراستہ ہوئے اور علم وفضلاء کے وجود سے ہندوستان کے شہر علمی عروج کے مرکز بن گئے۔ علمی فروغ صرف مسلمانوں کے ساتھ

نہیں رہا، بلکہ غیر مسلم اہل وطن کو بھی علمی ارتقاء کا حصہ بننے کے مواقع ملتے رہے اور ہندوستانی علوم میں بھی ترقی ہوئی اور تصنیفی کام انجام پائے۔

علمی فروغ کے ساتھ فن تعمیر کی جانب بھی سلاطین دہلی نے خاطر خواہ توجہ دی۔ ہندوستان میں فن تعمیر پہلے سے ہی کافی ترقی یافتہ تھا۔ مسلمان سلاطین نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں، طرز تعمیر، نقاشی اور پختگی کے اعتبار سے اپنے نئے تجربات کیے، جو آئندہ چل کر ہند اسلامی فن تعمیر کے لیے مشہور ہوئے۔ دہلی سلطنت کے پورے دور میں فن تعمیر کے اندر بتدریج ارتقا ہوتا رہا اور تعمیر کے عمدہ اور شاندار نمونے وجود میں آئے۔ اس اکائی میں دہلی کی ان دونوں میدانوں کی خدمات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا۔ اس کے مطالعہ سے طلبہ اس بات سے آگاہ ہو پائیں گے کہ تعلیم کے میدان میں سلاطین دہلی نے کیا اقدامات کیے، تعلیم کے لیے کون سے ادارے قائم کیے گئے، کن موضوعات پر علمی تصنیفات تیار کی گئیں اور کون کون سے اہم فضلاء و ماہرین نیز کون سے مرکز ہندوستان کے شہروں کو پورے عالم کے لیے رشک بنا رہے تھے۔ اسی طرح اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ اس بات سے بھی واقف ہو جائیں گے کہ سلاطین دہلی کی آمد سے پہلے یہاں کا فن تعمیر کس نوعیت کا تھا، مسلم حکمرانوں نے اس میں کس کس نوع کی تبدیلیاں اور اضافے کیے۔ تعمیر کے فن میں کس طرح ارتقا ہوتا گیا اور پورے عہد سلطنت میں کس قسم کی تعمیرات وجود میں آئیں اور ان کی خصوصیات کیا تھیں۔

8.2 تمہید

دہلی سلطنت کا تین سو سالہ دور علمی خدمات اور تعمیری نمونوں کے اعتبار سے زرخیز اور شاہکار دور ہے۔ اس سلطنت کے آغاز کے موقع پر عالم اسلام کے مختلف شہروں میں بڑی تباہی اور قتل و غارت گری مچی ہوئی تھی، علم کے مرکز تباہ ہو رہے تھے اور ماہرین و اہل کمال بے یار و مددگار ہو رہے تھے۔ اس موقع پر ہندوستان کے اندر دہلی سلطنت کا قیام اور وہاں علم و اہل علم کی قدردانی ان باکمالوں کے لیے بہت بڑی نعمت تھی، چنانچہ دہلی سلطنت قائم ہوتے ہی جہاں سلاطین نے اپنے درباروں میں اہل علم کی قدردانی کی اور علم و تعلیم کے فروغ کے لیے سہولیات بہم پہنچائیں وہیں بغداد و شام، ماوراء النہر اور وسط ایشیا کے علاقوں سے فضلاء و علماء اور شعراء جوق در جوق دہلی اور دوسرے ہندوستانی شہروں کا رخ کرنے لگے۔ قطب الدین کے دربار سے کئی نامور شعراء اور علماء وابستہ تھے۔ التمش اور بلبن کے عہد میں تو اہل علم و کمال دربار اور شہر کی زینت تھے اور بادشاہ کے ساتھ سینکڑوں علماء رہا کرتے تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی میں علماء و فضلاء کی کثرت ہو گئی تھی جو تعلیم و تعلم کے ساتھ تصنیف و تالیف انجام دے رہے تھے۔ تغلق خاندان کے بادشاہوں نے بڑے پیمانے پر علمی قدردانی کی، مدارس اور اسکول قائم کیے اور تصنیف کی ہمت افزائی کی، لودھی خاندان کی حکومت میں علمی قدردانی کی روایت مضبوط رہی، اس زمانے میں ہندوؤں میں فارسی لکھنے پڑھنے کا رواج شروع ہوا اور سنسکرت کی کئی کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ دربار سے وابستہ شعراء اور اہل فضل کو سلاطین دہلی نے بڑے انعامات سے نوازا۔ ایبک اپنی داد و دہش اور سخاوت کی وجہ سے لکھ بخش کہلاتا تھا۔ غلام بادشاہوں کی سخاوت اور نوازش مثالی بن گئی تھی۔ خلجی، تغلق اور لودھی سلاطین نے بھی دل کھول کر خرچ کیا اور علمی فروغ کی فیاضانہ سرپرستی کی۔

فن تعمیر کے میدان میں سلاطین کی شاندار خدمات آج بھی اپنے بچے کچھے کھنڈرات اور بچی عمارتوں کے ذریعہ داستان شکوہ و عظمت سنا رہی ہیں، دہلی کا قطب مینار، مسجد قوۃ الاسلام، علائی دروازہ، حوض شمسی، بادشاہوں کے مقبرے، فیروز شاہی مدرسے، کیلوگھڑی، سیری اور تغلق آباد

کے شہر کے قلعے اور بے شمار مساجد و مدرسے فن تعمیر کے میدان میں سلاطین دہلی کی جدت کاریوں، اور حسن و عظمت کے شاندار نمونے فراہم کرتے ہیں۔ ان تعمیرات میں سلاطین نے ہندوستانی کاریگروں سے مدد لیتے ہوئے عربی طرز اور اسلامی ذوق کا استعمال کیا اور ایک نئے فن تعمیر کو وجود بخشا جو ہندوستانی فن تعمیر کہلایا۔

علمی خدمات، فن تعمیر کے نمونے اور ان کی خصوصیات اس اکائی کا موضوع ہیں۔ سطور ذیل میں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی جارہی ہے۔

8.3 علمی خدمات۔ غلام سلاطین کے عہد میں

دہلی سلطنت کے پورے دور میں علمی خدمات کی ہمہ ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ خدمات کئی طرح کی رہی ہیں۔ عموماً سلاطین نے شعراء اور علماء کی سرپرستی کی اور انہیں دربار کی زینت بنایا، یہ شعراء اپنے فن کے کمال دکھاتے، علماء اور فضلاء نے بادشاہوں سے علمی گفتگو اور مشورے جاری رکھے، نیز تعلیم کی اشاعت کی، سلاطین کی خواہش پر اور اپنے طور پر بھی کئی اہل علم نے تاریخ کی کتابیں لکھیں جس سے اس عہد کی معاصر تاریخ قلم بند ہوگئی۔ بعض امراء نے اپنی سرپرستی میں کتابیں لکھوائیں۔ اس دور میں بڑے فقہاء اور علماء موجود تھے جنہوں نے تفسیر اور فقہ کے موضوعات پر قیمتی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ سلاطین نے مدارس اور اسکول بھی قائم کیے جہاں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے تعلیم اور رہائش کے بہترین انتظامات کے گئے۔ ان کے اخراجات کے لیے بڑے بڑے اوقاف خاص کیے گئے۔ سنسکرت اور فارسی زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمے کرائے گئے جس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوا۔ علاقائی زبانوں کو بھی فروغ دیا گیا اور ان میں غیر مسلم اہل فضل نے تصنیفات تیار کیں، اس طرح یہ عہد علمی اعتبار سے مالا مال نظر آتا ہے۔

8.3.1 قطب الدین ایبک کا دور

دہلی سلطنت کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک ہے، جب وہ غلام تھا، قسمت نے یاوری کی اور اس نے امام ابوحنیفہ کی اولاد میں سے ایک بڑے عالم قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے گھر میں تربیت پائی جنہوں نے اسے دینی تعلیم دی اور اپنے بچوں کی طرح تربیت سے آراستہ کیا۔ قطب الدین جب تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے مسلمانوں کی زندگی اسلامی اور شرعی نہج پر تشکیل دینے کی کوشش کی، اس نے غزنین اور غور کی علمی محفلیں دیکھیں تھی، دہلی میں اس نے علماء و فضلاء اور شعراء کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی اور ان کی سرپرستی شروع کی۔ مولانا بہاؤ الدین اوش اپنے زمانہ کے مشہور شاعر اور ادیب تھے، اوش ہندوستان آ کر ایبک کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے۔ جمال الدین محمد ایبک کے دربار سے وابستہ دوسرے بڑے شاعر تھے جن کے علم کی قدر دانی کی گئی۔ ایسے ہی قاضی حمید الدین ایک باکمال شاعر اور عالم و فاضل تھے جو عنایت شاہانہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ایبک کے دور کی ایک اہم علمی شخصیت حسن نظامی نیشاپوری کی ہے۔ جنہوں نے ایبک کی خواہش پر مشہور و معروف تاریخ ''تاج المآثر''، لکھی ہے، جس میں 587ھ سے 612ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر آخری پانچ حملوں کے ذکر سے لے کر قطب الدین ایبک کے پورے عہد اور التمش کے عہد کے ابتدائی سات برسوں کے سیاسی و جنگی واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایبک اور التمش کے حالات پر یہ پہلی تاریخ ہے اور اس کا مؤلف ہندوستان کا پہلا مؤرخ ہے، جس کی اصل کتاب محفوظ رہی ہے۔ ایبک کے دور کا ایک اور مشہور مورخ مبارک شاہ ہے جو عرف عام میں فخر مدبر کہلاتا ہے۔ اس نے 'بحر الانساب' کے نام سے کتاب لکھ کر

قطب الدین ایبک کی خدمت میں پیش کی' اس میں رسول اکرم ﷺ کے عہد سے لے کر مؤلف کے زمانہ تک کے شجرے قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس میں قطب الدین کے اوائل زندگی اور حکمرانی کے واقعات درج ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا ایک نام فخر الدین مبارک شاہ مروزی کا ہے جس کی کتاب 'تاریخ فخر الدین مبارک شاہ' کہلاتی ہے' یہ بھی اس دور کی معاصر کتاب ہے اور ایبک کے بارے میں مختصر معلومات درج ہیں۔ یہ دراصل غیاث الدین غوری کے دربار کا ایک ممتاز شاعر تھا اور 602ھ میں وفات پائی۔

عہد قطبی کے نامور فاضل اور فخر ہند شخصیت مولانا رضی الدین حسن صغانی کی ہے' جن کی کتاب 'مشارق الانوار' حدیث کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے اور عرصہ تک نصاب میں پڑھائی جاتی رہی' امام صغانی محدث ہونے کے ساتھ بڑے ادیب' لغوی اور مفسر وفقیہ بھی ہیں۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ سیاحت اور عالم عرب میں گذرا' عباسی خلیفہ بغداد کا فرمان وہاں سے التمش کے پاس لائے تھے۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کی قضائت پیش کی تھی۔ مختلف فنون پر انہوں نے بیسیوں کتابیں تصنیف کیں جن میں فن لغت کے اندر ایک کتاب العباب الزاخر بیس جلدوں میں اور ایک 'مجمع البحرین' بارہ جلدوں میں ہے۔

قطب الدین ایبک کا مشہور سپہ سالار محمد بختیار خلجی تھا جس نے بہار و بنگال کے علاقے فتح کیے۔ خلجی اور اس کے ساتھی امراء نے بھی اپنے مفتوحہ علاقوں میں مساجد اور مدارس قائم کیے جہاں تعلیم کی اشاعت پر توجہ دی گئی۔ قطب الدین نے علم کی اشاعت کے لیے مساجد بھی قائم کیے جہاں نماز کے ساتھ تعلیم وتدریس کے حلقے بھی لگتے تھے' مشہور قطب مینار بھی دراصل مسجد قوۃ الاسلام کا حصہ تھا۔

8.3.2 شمس الدین التمش

شمس الدین التمش عہد غلاماں کا نامور بادشاہ ہے' جس نے صحیح معنوں میں ہندوستان کے ایک وسیع حصہ پر امن وامان کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا چھبیس 26 سالہ طویل دور ہندوستان میں مسلم حکومت کے استحکام اور علم وادب کے روشن کارناموں کا زمانہ ہے۔ التمش ایک ثروت مند گھرانہ کا فرد تھا' لیکن بھائیوں کے حسد کا شکار ہو کر غلام بنا' اس نے بخارا اور بغداد میں غلامی کی زندگی گزاری' جہاں اسے نہ صرف اپنے آقاؤں کے علمی گھرانوں میں عمدہ تربیت ملی بلکہ بغداد کے کبار مشائخ کی خدمت اور استفادہ کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی' شیخ اوحد الدین کرمانی' خواجہ معین الدین چشتی اور قاضی حمید الدین ناگوری جیسے بزرگان دین کی عنایتوں اور دعاؤں سے اس زمانہ میں وہ بغداد میں شاد کام ہو چکا تھا۔ دہلی کی بادشاہت ملنے کے بعد مشائخ دین اور علماء وفضلاء سے اس کی عقیدت اور بڑھ گئی' ان صحبتوں کا اثر تھا کہ التمش خود بھی انتہائی دیندار اور پابند شریعت بلکہ ولی مرشد تھا' خواجہ عثمان ہرونی' خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ بختیار کاکی سے اس کے گہرے مراسم عقیدت اور سرگرم تعلقات رہے' حوض شمسی کے لیے جگہ کا انتخاب خواجہ قطب الدین کے ہی مشورہ سے کیا جس کا پانی انتہائی شیریں نکلا تھا۔

التمش کا عہد چونکہ دہلی میں مسلم حکومت کے استحکام اور امن وامان کا دور تھا' جب کہ عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں چنگیزی فتنہ کی قہر سامانیاں برپا تھیں' اس لیے دہلی کی طرف ہر جانب سے علماء وفضلاء آ رہے تھے' التمش نے آنے والے علماء واہل کمال کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے لیے وظائف مقرر کیے۔ ان کے علمی کاموں کی قدر اور ہمت افزائی اور علم ودین کی خدمت کے لیے ان کو سہولیات بہم پہنچائیں۔ التمش کے عہد میں مشہور بزرگ حضرت جلال الدین تبریزی دہلی آئے تو التمش نے علماء ومشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر ان کا

استقبال کیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کو اس نے شیخ الاسلام بنایا' قاضی قطب الدین کاشانی' نور الدین مبارک غزنوی اور قاضی فخر الائمہ اس کے دربار کی زینت تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری سے اس کو بے پناہ عقیدت تھی۔ ان مشائخ کے علاوہ علماء اور فقہاء سے بھی اسے گہری عقیدت رہی اور انہیں اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔ سفر اور حضر دونوں میں علماء التمش کے جلو میں ہوتے تھے' محل کے اندر ہفتہ میں تین روز علماء کی مجلسیں ہوتیں' رمضان المبارک میں روزانہ یہ مجلس ہوتی' جمعہ کے روز نماز کے بعد علماء اور مشائخ خاص طور پر دربار میں بلائے جاتے' یہ علماء بادشاہ کو سلطان کے فرائض سے آگاہ کرتے اور علمی مشورے دیا کرتے تھے۔ التمش ہی کے دربار سے مشہور مورخ' قاضی اور فقیہ مولانا منہاج الدین سراج وابستہ ہوئے' وہ شاہی خیمہ میں وعظ کہتے تھے' التمش نے انہیں گوالیار کا قاضی وخطیب اور تمام امور شرعی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ التمش کے دربار میں ارباب فضل وکمال اس قدر جمع ہوگئے تھے کہ کہیں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ ان علماء میں بعض درس وتدریس کے لیے مشہور تھے۔ التمش نے ان کے لیے دہلی میں متعدد مدرسے قائم کیے' دہلی کا مشہور مدرسہ معزی اسی بادشاہ کا قائم کردہ ہے جسے اس نے معز الدین (شہاب الدین غوری) کی یاد کے لیے قائم کیا تھا۔ بدایوں میں اپنی اقطاع کے زمانے میں بھی التمش نے اس نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ دہلی میں ایک دوسرا مدرسہ ناصریہ کے نام سے قائم ہوا تھا جسے التمش نے اپنے مرحوم بیٹے ناصر الدین کے نام پر بنایا تھا۔ التمش کے اپنے نام پر بھی ایک مدرسہ تھا جس کی بوسیدہ عمارت کی تعمیر ومرمت فیروز شاہ نے اپنے زمانہ میں کرائی۔

التمش کے دربار سے وابستہ شعراء میں خواجہ ابونصر ناصری' بخارا کے مشہور شاعر وفلسفی امیر روحانی تاج الدین ریزہ اور شہاب الدین مہرہ نامور اہل کمال تھے۔ التمش کا وزیر فخر الدین عصامی خود بڑا فاضل شخص تھا' وہ بغداد کے دربار خلیفہ میں تیس برس کام کر چکا تھا۔ پھر اس کی جگہ نظام الملک محمد جنیدی وزیر مقرر ہوا جو اپنے تدبر اور علم وفضل کے علاوہ علم دوستی اور علم پروری کے لیے بھی اس عہد میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا' خود اس کا دربار بھی علماء وفضلاء اور شعراء سے مزین رہا کرتا تھا۔ التمش کے ایک امیر بہاء الدین علی کا شمار بھی اہل علم واہل ذوق میں ہوتا تھا اور اس کا دربار بھی شعراء کی سرپرستی کے لیے مشہور تھا۔

فخر الدین مبارک شاہ جو فخر مدبر کے نام سے معروف ہے' التمش کے دربار سے وابستہ رہا' اس نے بحر الانساب یا سلسلہ الانساب لکھ کر قطب الدین ایبک کو پیش کی تھی' اس کی دوسری کتاب آداب الحرب والشجاع ہے' جسے اس نے التمش کے نام پر معنون کیا تھا۔ یہ فارسی زبان میں فنون جنگ پر بہترین کتاب ہے۔ اسی عہد کے ایک نامور اہل علم مؤید جرجامی ہیں' جنہوں نے امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کا فارسی میں ترجمہ کر کے التمش کے نام منسوب کیا' قاضی منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں ذکر کیا ہے کہ التمش کے دور میں علم وادب کی جو ترقی شروع ہوئی وہ آئندہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔

شمس الدین التمش نے اس بات کی بھی کوشش کی بیرون ہندوستان سے اچھی کتابیں منگوائی جائیں اور ملک کے علمی خزانہ کو مالا مال کیا جائے۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان نے اپنے بیٹے کیقباد کو نصیحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ میرے والدین نے اتالیق کو حکم دیا تھا کہ آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں جو سلطان شمس الدین التمش کے بیٹوں کے لیے بغداد سے لائی گئی تھیں' ہم لوگوں کو پڑھائی جائیں۔ دراصل التمش نے اپنے بیٹے محمود کی خاطر خواہ تعلیم کے لیے علاحدہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی رضیہ سلطان کی تعلیم وتربیت کے لیے بھی بڑا اہتمام کیا تھا جس کی وجہ سے وہ انتہائی تعلیم یافتہ اور قابل حکمراں ثابت ہوئی تھی۔

عہد شمسی میں صوفیہ کرام نے بھی تصنیفی کاموں سے دلچسپی لی' چنانچہ خواجہ اجمیری کے خلیفہ سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری کے مکتوبات فن انشاء میں مشہور ہیں' ان ہی کی اصول الطریقہ اور سرور الصدور نامی کتابیں ہیں' اسی نام کے ایک اور بزرگ قاضی حمید الدین ناگوری تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور دہلی آکر خواجہ بختیار کاکی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوئے اور سماع کے بڑے دلدادہ تھے' ان کی کتاب طوالع الشموس مشہور ہے' ان کی ایک کتاب رسالہ عشقیہ ہے جس میں عشق الہٰی کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔

8.3.3 خاندان التمش کے دوسرے بادشاہ

1236ء میں التمش کی وفات کے بعد دس برسوں تک ملک میں سیاسی بدانتظامی رہی' التمش کے بعد کچھ عرصہ کے لیے اس کا بیٹا رکن الدین فیروز سلطان بنا' اس کا دور اگرچہ ناکام تھا' لیکن اس نے بھی علم وادب سے دلچسپی لی' مشہور شاعر تاج الدین سنگریزہ اس کے عہد میں دبیر الملک کے منصب پر فائز تھا' مولانا شہاب الدین مہمرہ جیسے نامور شاعر بھی جن کو امیر خسرو نے اپنا استاد بنایا تھا۔ فیروز کے دربار سے منسلک رہے' سلطان فیروز کے حکم سے امام رازی کی عربی کتاب مکتوم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ فیروز کا زمانہ حکومت صرف سات ماہ رہا۔

پھر التمش کی بیٹی رضیہ سلطان تخت سلطنت پر بیٹھی' فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ خود بھی قرآن اور دوسرے علوم میں دستگاہ رکھتی تھی اور علماء وفضلاء کی سرپرست رہی۔ دہلی کے مدرسہ ناصریہ کا اہتمام اسی نے قاضی منہاج الدین سراج کو سپرد کیا تھا۔ انہوں نے طبقات ناصری میں رضیہ کو عالم نواز کے لقب سے یاد کیا ہے۔

رضیہ کے بعد اس کا بھائی بہرام شاہ تخت نشین ہوا جس نے دو سال سے کچھ زائد حکومت کی' وہ مولانا قاضی منہاج سراج کا معتقد رہا اور ان کو دہلی اور تمام مملکت کا قاضی مقرر کیا۔ اس عہد کے ایک ممتاز عالم قاضی جلال الدین کاشانی تھے' جنہیں بہرام نے دہلی کی قضاءت سے معزول کر دیا تھا۔ بہرام کے بعد علاء الدین مسعود شاہ بادشاہ بنا جس نے چار برس حکومت کی۔ اس نے قاضی جلال الدین کاشانی کی قدردانی کی' مولانا منہاج عہدۂ قضاء سے علاحدہ ہو گئے۔ ناصر الدین محمود کے زمانہ میں بلبن نے ان کی قدردانی کی اور پرانے عہدہ پر مامور کرتے ہوئے مدرسہ ناصریہ کے اوقاف کا متولی اور گوالیار کا قاضی مقرر کیا۔

ناصر الدین محمود التمش کا چھوٹا بیٹا تھا۔ بڑا نیک نفس وصالح اور سلیم الطبع تھا' اس میں اولیاء اللہ کے اوصاف تھے' علاء الدین مسعود کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھا اور بلبن کو تمام کاروبار سلطنت حوالہ کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا۔ وہ صرف دربار میں آتا اور پھر محل میں جا کر عبادت اور قرآن کی کتابت میں مصروف ہو جاتا۔ بائیس برس کی حکومت میں وہ درویشانہ زندگی گزارتا رہا' سلطان کو بابا فرید الدین گنج شکر سے بڑی عقیدت تھی۔ علماء وفضلاء سے وہ تعلق خاطر رکھتا تھا۔ مولانا منہاج الدین سراج حضر وسفر میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ سلطان نے ان کو صدر جہاں اور پھر قاضی دہلی اور تمام مملکت کا قاضی القضاۃ بنایا۔ مولانا منہاج الدین نے اپنی مشہور تاریخ طبقات ناصری ختم کر کے اسی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور اسی کے نام پر اس کا نام طبقات ناصری رکھا' بادشاہ نے بھی نہایت قدردانی میں اپنی چادر اتار کر ان کو دیدی اور بڑے انعامات سے نوازا۔ طبقات ناصری کارآمد تاریخ ہے۔ اس میں 23 طبقات ہیں جن میں ابتدائے عالم سے لے کر 1261 تک کے تاریخی واقعات ہیں' دہلی سلطنت کے قطب الدین ایبک سے ناصر الدین محمود تک سلاطین دہلی اور ان کے امراء کے حالات اخیر کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔ دہلی کے غلام سلاطین پر تاج المآثر اور طبقات ناصری دو معاصر کتابیں ہیں۔ مؤلف بلبن کی تخت نشینی کے وقت زندہ تھے' لیکن

تاریخ 658 مطابق 1260 پر ختم کردی ہے۔ مولانا ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ عہد بلبن سے شروع کی ہے۔

ناصرالدین محمود کے زمانے میں ہی قاضی عماد الدین محمد بن اسماعیل اشفور قانی ایک بڑے فقیہ اور جید عالم تھے۔ انہیں سلطان مسعود کے زمانے میں قاضی مما لک کے منصب پر فائز کیا گیا تھا' ناصرالدین محمود کے عہد میں 646 تک وہ اس عہدہ پر مامور رہے تھے۔ ان کی ایک قیمتی کتاب صنوان القضاء وعنوان الافتاء ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں قضاء کے آداب اور مسائل کے موضوع پر ہے اور اس موضوع پر ہندوستان میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی قاضی شریعت امارت شرعیہ پٹنہ نے اس کی تحقیق کر کے چار جلدوں میں طبع کرایا ہے۔ قاضی جلال الدین کاشانی بھی اس عہد کے ممتاز عالم تھے جنہیں قاضی اشفورقانی کے بعد 647 میں سلطان ناصرالدین محمود نے قاضی مما لک کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ قاضی شمس الدین بہرائچی بڑے صاحب فضل وکمال تھے' سلطان محمود نے انہیں دہلی کا قاضی بنایا تھا' وہ بادشاہ کے کاموں میں بھی مشیر بنے رہے۔ مولانا جمال الدین بسطامی کو سلطان نے شیخ الاسلام بنایا تھا اس عہدہ پر وہ چار سال رہ کر وفات پا گئے۔ مولانا قطب الدین بھی اس عہد کے نامور عالم تھے' وہ بہرام شاہ کے زمانے میں شیخ الاسلام رہ چکے تھے۔ سلطان کے دربار کے شعراء میں مولانا منہاج الدین اور عمید الدین سنامی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

8.3.4 غیاث الدین بلبن

سلطان غیاث الدین بلبن سلاطین دہلی میں اپنی شان وشوکت اور عظمت و دبدبہ کے لیے سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے' بلبن کو التمش نے خرید کر تربیت دی تھی اور اپنے چالیس امراء میں شامل کیا تھا۔ ناصرالدین محمود کے زمانے میں یہ قاضی مما لک بنا اور بیس برس تک اس عہد پر رہ کر ناصرالدین کے نام سے تحت حکومت کرتا رہا۔ محمود کی وفات کے بعد بلبن ہی تخت نشین ہوا اور مزید بیس برس پوری شوکت وشان کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا نظریہ تھا کہ نبوت کے بعد خلق کی خدمت کا سب سے بڑا ذریعہ بادشاہت ہے۔ بادشاہ کے مقام کو اس نے بہت اونچا کر دیا۔ وہ خود بھی اس مقام کے آداب کی بے انتہا رعایت کرتا تھا۔ بلبن کے طویل دور میں دہلی سلطنت امن وامان کی آماجگاہ رہی' چنگیزی فتنہ کو اس کے عہد میں دہلی پر حملہ کی جرأت نہ ہوسکی۔ اسی وجہ سے دوسرے علاقوں سے بڑی تعداد میں شہزادے اور علماء وفضلاء اس کے دربار میں اور ہندوستان میں آ گئے تھے۔ بلبن کے دربار میں پندرہ شہزادے پناہ گزیں تھے۔ اور ان شہزادوں کے ساتھ بھی کافی تعداد میں علماء وفضلاء اور ارباب کمال آ گئے تھے۔ بلبن نے ان ارباب کمال اور علماء وفضلاء کی بڑی قدردانی کی۔ وہ خود بھی عالم وفاضل تھا اور اس کی طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ التمش کے شاہی دربار میں وہ صلحاء کی صحبت اور فقہاء وعلماء کی مجلسوں سے مستفید ہوتا تھا۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے اس کی راسخ العقیدگی اور عبادت کی تعریف کی ہے۔

بلبن کو مشائخ میں بابا فرید گنج شکرؒ سے عقیدت تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی ایک بیٹی بابا صاحب کی عقد میں تھی۔ وہ مشائخ اور علماء کی بے حد تعظیم کرتا تھا اور حصول برکت کے لیے ان کے گھر جایا کرتا تھا' وہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد مشائخ کے مزاروں کی زیارت کے لیے جاتا۔ اس کے دور میں اتنے مشائخ جمع ہو گئے تھے کہ مورخین نے اس عہد کو خیر الاعصار کہا ہے۔ بابا فرید گنج شکر' خواجہ علی چشتی' شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی' ان کے صاحبزادے شیخ صدرالدین' شیخ بدرالدین غزنوی' شیخ ابوالمؤید' شیخ نظام الدین اولیاء' شیخ جمال الدین ہانسوی' خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر' شیخ حسام الدین ملتانی' شیخ نجیب الدین فردوسی اور شیخ ابوبکر طوسی وغیرہ سے پورا ملک منور ہو گیا تھا۔

ان مشائخ کے علاوہ فضلاء و علماء بھی بڑی تعداد میں اس دور میں جمع ہو گئے تھے۔ بلبن نے ان علماء اور ارباب کمال کو علاحدہ علاحدہ محلوں میں آباد کیا تھا اور ان کی بھرپور سرپرستی کی تھی جس سے اس عہد میں علم وفن کی بڑی رونق ہو گئی تھی۔

بلبن ہمیشہ علماء اور مشائخ کے جلو میں رہتا تھا' وہ علماء کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا' اس کا دستر خوان مذہبی مذاکرے کی مجلس میں منتقل ہو جاتا تھا' وہ شاہی جلال کے باوجود علماء کے گھروں پر بے تکلف جاتا' کسی عالم کا انتقال ہو جائے تو جنازہ میں شریک ہوتا اور تعزیت کے لیے گھر جاتا۔ ان کے عزیزوں کے وظیفے مقرر کرتا۔ کہیں وعظ کی مجلس ہوتی رہتی تو سواری سے اتر کر عام لوگوں کے ساتھ وعظ سننے بیٹھ جاتا۔ بلبن کے دور میں مشہور علماء میں ایک مولانا برہان الدین محمود بلخی تھے جو صاحب ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے شاگرد تھے۔ ان سے ہی ہندوستان میں ہدایہ کو رواج ملا' علامہ نجم الدین دمشقی فلسفہ کے عالم اور امام فخر الدین رازی کے شاگرد تھے۔ شیخ سراج الدین ابوبکر فقہ واصول فقہ اور عربی ادب کے بڑے عالم تھے۔ مولانا شرف الدین والوالجی درس فقہ کے لیے مشہور تھے۔ مولانا برہان الدین بزار اور قاضی رکن الدین سامانوی بھی اس دور کے مشہور فقیہ تھے۔ مولانا کمال الدین زاہد بڑے زاہد و متقی عالم تھے۔ ان سے ہی شیخ نظام الدین اولیاء نے مشارق الانوار پڑھی تھی۔ مولانا شمس الدین خوارزمی یگانہ عصر تھے' دہلی کے تمام اساتذہ ان کے شاگرد تھے' ان کے تین چہیتے شاگردوں میں مولانا قطب الدین ناقلہ مولانا برہان الدین عبدالباقی اور شیخ نظام الدین اولیاء تھے۔ بلبن نے ان کو شمس الملک کا خطاب دے کر سلطنت کا مستوفی الملک (آڈیٹر جنرل) مقرر کیا تھا۔ مولانا فخر الدین ناقلہ فقہ واصول اور عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ بلبن نے ان کو صدر جہاں بنایا تھا۔ اسی طرح قاضی رفیع الدین قارزونی، قاضی شمس الدین' قاضی جلال الدین کاشانی' قاضی سدید الدین اور قاضی ظہیر الدین وغیرہ بھی اس عہد کے بلند پایہ عالم اور منصب قضاء پر فائز اصحاب تھے۔

بلبن نے تعلیم کی ترویج سے بے حد دلچسپی لی' درس کے لیے مشہور فقہاء کے لیے تعلیم و تدریس کا انتظام کیا۔ دہلی کے دو مدارس مدرسہ معزیہ اور مدرسہ ناصریہ کے اخراجات شاہی خزانے سے پورے کیے جاتے تھے۔

اس عہد میں امراء کے دربار بھی علم وفضل کے مراکز بن گئے تھے' بالخصوص بلبن کے بیٹے خان محمد کا ملتان میں دربار بے مثال تھا۔ جہاں فضلاء و شعراء کا مجمع رہتا تھا اور شعر وادب کے علمی نکات پر گفتگو ہوتی تھی۔ خان محمد کے دربار سے امیر خسرو جیسی عظیم شخصیت اور امیر حسن جیسے ماہر فن شاعر وابستہ تھے' شہزادہ خود بھی شعر وادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتا تھا' اس نے ایک بیاض شعری تیار کی تھی جس میں اپنے ذوق کے مطابق بیس ہزار اشعار منتخب کیے تھے۔ اس انتخاب پر امیر خسرو اور امیر حسن سجزی بھی داد دیتے تھے۔ شہزادہ محمد کی علمی سرپرستی کی شہرت بیرون ملک پہنچی ہوئی تھی۔ دہلی کے شاہی دربار سے بھی کئی فضلاء سلطان محمد کے دربار ملتان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ شہزادہ نے ان کو جاگیریں دے کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ سلطان محمد اس بات کی کوشش کرتا کہ بیرون ملک کے ارباب کمال اس کے دربار میں آئیں' وہ لاہور میں خود شیخ عثمان ترمذی کی خدمت میں حاضر ہوا جو توران کے بڑے جید عالم تھے اور انہیں اپنے یہاں قیام کرنے کی بہت منت سماجت کی۔ اس نے دو مرتبہ شیخ سعدی کی خدمت میں شیراز قاصد بھجوا کر ان کو ملتان آنے کی دعوت دی اور تحائف کے ساتھ سفر خرچ بھیجا۔ بلبن کے دوسرے بیٹے شہزادہ بغرا خان کے یہاں بھی ادب کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں جہاں ماہرین موسیقی' ارباب نشاط اور مغنیوں کا اجتماع رہتا تھا۔ اس کے درباری شعراء میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر کے علاوہ ایک زمانے میں امیر خسرو اور حسن سجزی بھی رہتے تھے۔ ان امراء کی تقلید میں ایسے علمی جلسے ہر محلّہ اور آبادی میں

منعقد ہونے لگے تھے۔

علاء الدین کشلی خان جو بلبن کا بھتیجہ تھا، وہ بھی اہل علم کا قدرداں اور فیاض تھا۔ اس کے دربار کی شہرت سن کر مصر و شام، روم و بغداد، خراسان و ترکستان اور ماوراء النہر سے شعراء آتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر یہاں سے واپس جاتے۔ امیر خسرو سب سے پہلے اسی امیر کشلی خان کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔ اسی طرح امیر علی سرجاندار بھی علمی قدر دانی کے لیے مشہور امیر تھا اور کثرت سے سخاوت و فیاضی کرتا تھا۔ بلبن کے دربار کا ایک اور امیر ملک الامراء فخر الدین جو دہلی کا کوتوال تھا اہل علم کی سرپرستی اور علمی سخاوت و فیاضی کے لیے مشہور تھا۔ اس کے یہاں ہزاروں افراد قرآن کی تلاوت کے لیے متعین رہتے تھے۔ امیر خسرو کی شہرت و عظمت کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے۔ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد خسرو گوشہ نشین ہو گئے، کیقباد کی تخت نشینی کے بعد جب بغرا خان اور کیقباد کی ملاقات ہوئی تو اس موقع پر خسرو موجود تھے اور کیقباد کی خواہش پر اس تاریخی ملاقات کو انہوں نے منظوم کیا اور قران السعدین کے نام سے تین ہزار نو سو چوالیس اشعار کی ایک مثنوی لکھی۔ بادشاہ نے ان کو اپنا ندیم خاص بنا لیا تھا اور ان کے لیے روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کی شعری تصانیف غزلوں اور مثنویوں پر مشتمل ہے، تحفتہ الصغر، غرۃ الکمال، وسط الحیوۃ، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال، اسی طرح خمسہ اہم دیوان ہیں۔

معلومات کی جانچ:

1. حسن نظامی نیشاپوری کی تصنیف کا کیا نام ہے؟
2. طبقات ناصری کس کی تصنیف ہے؟
3. امیر خسرو کس شاہزادہ کے دربار سے وابستہ تھے؟

8.4 خلجی عہد میں علمی خدمات

8.4.1 جلال الدین خلجی

خلجی عہد کا آغاز جلال الدین فیروز خلجی سے ہوتا ہے، جلال الدین خلجی خود عمدہ علمی ذوق رکھتا تھا۔ وہ خود شاعر تھا اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا، وہ علم و ہنر کا بڑا قدرداں رہا۔ جلال الدین خلجی کے ہم نشینوں میں ممتاز ارباب علم ہوئے جو اکثر اس کی نجی مجلسوں میں شریک رہتے۔ امیر خسرو اس کی مجلس میں ہر روز نئی نئی غزلیں لاتے اور بادشاہ ان غزلوں کو خوب پسند کرتا اور انعامات سے نوازتا۔ جلال الدین نے امیر خسرو کو اپنے شاہی کتب خانہ کا کتاب دار مقرر کیا تھا۔ وہ بادشاہ ہونے سے پہلے بھی امیر خسرو کا قدرداں رہا تھا۔ اس نے خسرو کو اپنا مصحف دار بھی بنایا تھا اور امیر کا خطاب دے کر سفید کمر بند لگانے کی اجازت دی تھی جو صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ جلال الدین کے ہم نشینوں میں امیر خسرو کے علاوہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، معید دیوانہ، امیر ارسلان قلی، اختیار الدین یاغی اور باقی خطیر وغیرہ رہے۔ جن میں سے بعض نے شاعری اور تاریخ پر کتابیں تصنیف کی۔ جلال الدین خلجی کے عہد میں سدی مولہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا، یہ بابا فرید گنج شکر سے وابستہ اور نیک بزرگ تھے، اس عہد میں سعد الدین علم منطق کے بڑے جید عالم تھے۔

8.4.2 علاءالدین خلجی

جلال الدین کے بعد علاء الدین تخت نشین ہوا۔ یہ ان پڑھ تھا لیکن جلد ہی اس نے اپنی کمی کا احساس کر کے ضروری حد تک پڑھنا سیکھ لیا۔ اور اس کے سامنے علمی مذاکرے ہونے لگے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور علماء خصوصا قاضی مولانا کہرامی اور قاضی مغیث الدین کے ساتھ لطف وکرم سے پیش آتا۔ علاء الدین کا دور اہل علم اور ارباب کمال کی کثرت کے لیے ممتاز ہے' مولانا عبدالحق حقی نے لکھا ہے کہ: سلطان علاء الدین کے عہد میں دہلی علماء و فضلاء کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ مسجدیں' مدرسے' حمام' مقبرے' قلعے اور ہر قسم کی عمارتیں اس طرح تعمیر ہوئیں کہ جیسے کسی نے جادو کیا ہے اور فضلاء کا مجمع ایسا ہوا جو کہ کسی زمانے میں نہیں ہوا۔ علوم وفنون کے 45 ماہرین درس وتدریس میں مشغول تھے۔ دربار علائی سے وابستہ شعراء میں امیر خسرو' امیر حسن' صدر الدین علی' فخر الدین خواص' حمید الدین راجہ' مولانا عارف' عبدالحکیم اور شہاب الدین صدر نشین وغیرہ تھے۔ ان سب کو دربار سے وظائف ملتے تھے۔ اس دور کے مؤرخین میں امیر ارسلان کلاہی اور کبیر الدین فرزند تاج الدین عراقی ہیں جس نے فتوحات علائی پر کتاب لکھی تھی' جس کا نام فتح نامہ ہے۔ ان کے علاوہ امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی بھی اس دور کے بڑے مورخین میں ہیں' نثر نگاروں میں عین الملک ملتانی کا تعلق دربار علائی سے ہے جس کی انشائے ماہرو شستہ نثر میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔

8.4.3 مقامی زبانوں میں علمی خدمات

خلجی خاندان کی حکومت چالیس برس رہی۔ اس زمانے میں علم وادب کو بھی سب سے زیادہ رونق حاصل ہوئی۔ اوپر ذکر کی گئی کتابوں کے علاوہ اس دور میں ملفوظاتی ادب بھی سامنے آیا' چنانچہ شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو امیر خسرو نے افضل الفوائد کے نام سے' حسن سنجری نے فوائد الفواد کے عنوان سے اور شیخ نصیر الدین چشتی نے مفتاح العاشقین کے نام سے جمع کیا' خواجہ محبوب الٰہی کے ایک شاگرد امیر خورد نے ان کی حیات سیر الاولیاء کے نام سے لکھی۔

دور علائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں میں بھی تصنیفی کام انجام پائے۔ سارنگ دھر نے کاویہ اور ہمیہ راسد تصنیف کیا' جن میں رنتھمبور پر علاء الدین کے حملہ کے وقت ہمیہ دیو کے مدافعانہ اور جان نثارانہ انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نے سنسکرت نغموں کی ایک بیاض دھرپدہتی کے نام سے مرتب کی تھی۔ اس دور کا ایک مشہور شاعر بھوپتی تھا۔ نلاسنکھ اور ملا داؤد بھی اس دور کے شعراء ہیں۔ امیر خسرو نے بھی ہندی میں شاعری کی تھی۔ اس دور میں گجرات میں گجراتی ادب' بنگال میں بنگالی ادب اور جنوبی ہند کے علاقوں میں علاقائی ادب پر بھی کام ہوئے۔

8.5 تغلق دور میں علمی خدمات

تغلق دور حکومت دہلی سلطنت میں عروج اور زوال دونوں کی داستان لیے ہوئے ہے۔ غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے دور میں حکومت حسب سابق مضبوط ومتحد اور وسیع رہی۔ چنانچہ اس زمانے تک دیگر میدانوں کی طرح علم وادب کے میدان میں ترقیاں ہوتی رہیں' لیکن فیروز تغلق کا دور آتے آتے دہلی کی وسیع سلطنت میں بکھراؤ شروع ہو گیا تھا اور ایک مضبوط مرکزی سلطنت کے کئی باز وعلاحدہ ہو گئے۔ دہلی سلطنت کی مرکزی حکومت باقی رہی' لیکن متعدد علاقائی حکومتیں وجود میں آ گئیں' ان میں ملتان' گجرات' بنگال اور جنوب میں دکن کی حکومتیں زیادہ

مشہور تھیں۔ نئی قائم ہونے والی حکومتیں کچھ مسلم تھیں اور کچھ ہندو۔ اس تبدیلی سے جہاں مرکزی حکومت کا دائرہ سکڑ گیا وہیں نئے علاقائی مراکز قائم ہوگئے اور ایک دہلی کے بجائے کئی شہروں میں علم وفن اور ادب وشاعری کی آبیاری ہونے لگی اور اس سے علاقائی زبانوں کو بھی فروغ ملا' لیکن اس کے باوجود دہلی میں علم وادب کی محفل سونی نہیں ہوئی' بلکہ اس کی شان وشوکت اور بڑھتی گئی' بالخصوص فیروز تغلق کے زمانے میں شرعی علوم میں تصنیف اور مدارس کے قیام کے بڑے اہم کام انجام پائے۔

8.5.1 غیاث الدین تغلق

علاء الدین کا دور جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا گیا علم وادب کی بہار کا دور تھا' دہلی اور دوسرے شہروں میں علماء وفقہاء اور مشائخ اس کثرت سے جمع ہوگئے اور تعلیم وتصنیف کے کام اس طرح انجام پا رہے تھے کہ دہلی بغداد وبخارا کے لئے قابل رشک بن گیا تھا۔ لیکن علاء الدین کی وفات کے بعد ملک کافور قطب الدین مبارک خلجی' اور غاصب خسرو خان کا دور علم وتہذیب کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوا۔ اہل علم بکھر گئے اور اہل اسلام کے لیے مصائب شروع ہوگئے اور غیاث الدین تغلق بڑی نازک صورت حال میں برسر اقتدار ہوا اور اس لحاظ سے وہ اسلامی ہندوستان کی مایہ ناز ہستیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ وہ ملتان کا گورنر تھا جہاں منگولوں کی روک تھام اس کے ذمہ تھی اور اس نے 29 دفعہ تاتاریوں سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دی تھی جس کی وجہ سے غازی ملک کے لقب سے مشہور ہوا تھا۔ غیاث الدین تغلق ایک متدین اور احکام شریعت کا پابند شخص تھا' تخت نشین ہونے کے بعد مذہبی بدعنوانیوں کی اصلاح کی اور بیت المال کو استوار کیا۔ اس ضمن میں اس نے حضرت سلطان المشائخ سے بھی وہ رقم دریافت کی جو غاصب خسرو نے اپنی حمایت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے علاوہ انہیں بھی بھجوائی تھی' لیکن سلطان المشائخ نے وہ رقم اس وقت خیرات کر دی تھی۔

غیاث الدین تغلق کے عہد میں تعلیمی ترقی کی راہیں وسیع ہوئیں۔ سلطان ارباب علم وفضل کا گرویدہ تھا' انہیں اپنے دربار میں مدعو کرتا اور ان کے لیے وظائف جاری کرتا۔ اس کا عہد بہت مختصر رہا۔ بنگال کے سفر سے واپسی میں دہلی کے قریب ایک حادثہ میں وہ جاں بحق ہوگیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق اگرچہ علم وفضل کا قدرداں تھا لیکن اس کے دور میں لائق ارباب علم اتنے نہ تھے جتنے عہد علائی میں تھے۔ مشائخ بھی اس قدر نہ تھے' دہلی کی آخری عظیم بزرگ شخصیت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے بھی سلطان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد انتقال کیا۔ سلطان غیاث الدین کی وفات سے اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہوگیا۔

8.5.2 محمد بن تغلق

محمد بن تغلق اعلیٰ درجہ کا عالم وفاضل اور متعدد خوبیوں کا حامل شخص تھا۔ قرآن مجید کا حافظ' نماز وروزہ کا پابند' بہترین خطاط' ساحر البیان خطیب' عربی وفارسی میں اعلیٰ خطوط لکھنے والا' اور جدت پسند تھا۔ اس کا حافظہ بھی بڑا عجیب وغریب تھا جو کچھ پڑھتا اس کو تاریخ کے ساتھ یاد رکھتا' کئی کتابیں اس کو زبانی یاد تھیں' طب' منطق' ہیئت اور ریاضی میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ یونانی فلسفہ کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا' علماء وفضلاء سے مذاکرے کیا کرتا تھا' ارباب علم ودانش کو دلائل سے قائل کرتا۔ اشعار میں گہرے معانی اور نئی تشبیہات واستعارات پیدا کرتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اپنی ان خوبیوں کے ساتھ وہ فیاضی اور غربا پروری کے لیے بھی مشہور تھا۔ اس کی فیاضی کی شہرت سن کر ارباب فضل دہلی آتے اور انعامات

سے سرفراز ہوکر واپس جاتے' لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ تند خواور وہمی مزاج رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے علمی ماحول پر برا اثر پڑا۔ اس نے دہلی کی جگہ دولت آباد کو دارالخلافہ بنانا چاہا اور اس کے لیے انتہائی شدت سے کام لیا' جس کے نتیجہ میں دہلی کی علمی محفلیں اجڑ گئیں اور تعلیمی ادارے ومدارس خالی ہوگئے' گو کہ بعض مؤرخین کے مطابق محمد تغلق اس تبدیلی کے ذریعہ دیوگیر کو اسلام کا مرکز بنانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے اسلام کی شعاعیں دکن کے گوشہ گوشہ میں پہنچ سکیں اور اس کا یہ فیصلہ تبلیغ اسلام کی شعوری کوشش تھی۔ محمد بن تغلق نے اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ پاکر دوبارہ دہلی کو دارالخلافہ بنایا۔ اس بار بار تبدیلی کا بے حد نقصان ہوا' لیکن سلطان کا ذوق علمی تھا' اس کے دربار میں شروع سے آخر تک علمی معیار اونچا رہا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے دربار میں عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے ایک ہزار لائق شعراء تھے۔ اس کے دسترخوان پر دو دو سو علماء ہوتے اور وہ ان سے علمی مذاکرے کرتا۔

محمد بن تغلق کے دربار میں آنے والے نامور اہل علم میں القاموس کے مصنف علامہ مجدالدین' مولانا شمس الدین یحیی، شیخ عبدالعزیز الاردویلی جو علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد رہ چکے تھے' موجود تھے۔ مشائخ میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلی مشائخ چشتیہ کی یادگار تھے۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ دہلی آیا۔ محمد بن تغلق نے اسے دہلی کا قاضی مقرر کیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اسے سفیر بنا کر چین بھیجا۔ مشہور مورخ ضیاءالدین برنی بھی اس دور میں موجود تھا۔ وہ سلطان کا ندیم خاص مقرر ہوا تھا۔ شعراء میں ملک الشعراء بدر چاچ تھا جس کی سلطان نے بڑی قدر کی اور فخرالزماں کا خطاب دیا' مولانا معین الدین عمرانی بڑے فقیہ تھے' جنہوں نے فقہ واصول کی کئی کتابوں جیسے کنز' منار' حسامی وغیرہ پر حواشی لکھے تھے۔ ضیاء نخشبی بھی اس عہد کے نامور فاضل ہیں' جنہوں نے سلک السلوک اور طوطی نامہ لکھی۔ یہ طوطی نامہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہے۔ اس عہد کا ایک اور مشہور مؤرخ عصامی ہے۔ جس نے 12 ہزار اشعار کی ایک مثنوی فتوح السلاطین لکھی جس میں غزنویوں' غوریوں' خاندان غلاماں' خاندان خلجی اور خاندن تغلق کے پہلے دو بادشاہوں کی فتوحات اور واقعات زندگی نظم کیے ہیں۔

8.5.3 فیروز تغلق

فیروز تغلق اپنے رفاہی کاموں' عوامی فلاح و بہبود اور علم و دین کی خدمت کے شاندار کارناموں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی صف اول میں رکھے جانے کے لائق ہے۔ جس طرح اس نے سلطنت کی مادی خوشحالی پر توجہ دی۔ تعلیم وثقافت کے فروغ پر بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ خود اس کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ پر ہوئی تھی' چنانچہ اس نے خود ایک کتاب فتوحات فیروز شاہی تصنیف کی۔ اس کے دربار میں ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف جیسے بڑے مؤرخ تھے۔ ان دونوں کی کتابیں تاریخ فیروز شاہی کے نام سے موجود ہیں۔ فیروز شاہ نے علماء و فضلاء کی پذیرائی کے لیے خاص اہتمام کر رکھا تھا' چنانچہ ایک خاص محل صرف علماء سے ملاقات کے لیے بنوایا تھا۔ فیروز تغلق نے ہزاروں غلاموں کو جمع کر لیا تھا جن میں ایک بڑی تعداد کو تعلیم اور درس سے لگا رکھا تھا' کچھ غلام قرآن کی تلاوت کرتے اور حفظ کرنے میں مشغول رہتے۔ کچھ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور کچھ کتابوں کی نقلیں تیار کرتے۔ اس نے علم کے فروغ کے لیے باضابطہ قانون بنایا تھا اور سلطنت کے مختلف حصوں میں علماء وفضلاء کو آباد کیا تاکہ وہ لوگوں میں تعلیم کی اشاعت کریں۔ اس نے پرانے فرمانرواؤں کی عمارتوں کی مرمت کرائی جن میں مسجدیں اور مدارس کی بھی از سرنو مرمت کرائی اور ان کے اوقاف مقرر کیے چنانچہ' خود اس نے 40 مسجدوں اور 30 مدرسوں کا ذکر کیا ہے۔

فیروز شاہ نے ایک مدرسہ فتح خاں کے مقبرہ کے پاس بنوایا تھا۔ دوسرا مدرسہ فیروز آباد میں بنوایا تھا جو مدرسہ فیروز شاہی کہلاتا تھا' وہ اپنی

علمی شہرت اور تعمیری دلآویزی میں تمام مدارس میں ممتاز تھا' مولانا جلال الدین رومی اسی مدرسے میں درس دیتے تھے۔اس مدرسہ کو دیکھنے کے لیے دور دراز کے علاقوں سے سیاح آتے تھے' مدرسہ کے اساتذہ اور تمام طلبہ کے لیے روزینے مقرر تھے۔اچھے طلبہ کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق کے دور کے تین بڑے عالم مولانا احمد تھانیسری' مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر دہلوی تھے۔ مشائخ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی فیروز شاہ نے بڑی قدر کی' بلکہ اس کی تخت نشینی میں شیخ چراغ دہلی کی کوششوں کا دخل رہا' شیخ صدرالدین ملتانی اسی دور میں شیخ الاسلام تھے۔اس عہد کے شعراء میں قاضی عابد' مسعود بک' ظہیر دہلوی' حمید قلندر' امیر احمد اور سب سے معروف و مشہور رہے تھے۔

فیروز تغلق کے عہد میں فقہ کو خاص طور سے فروغ حاصل ہوا اور فقہ کے موضوع پر کتابیں لکھی گئیں' ان میں فقہ فیروز شاہی مشہور ہے' جو یعقوب مظفر کرانی نے تصنیف کی تھی۔ایسے ہی ایک کتاب فوائد فیروز شاہی ہے' جسے شرف محمد عطائی نے تصنیف کیا تھا' فیروز شاہ کا ایک صاحب علم امیر تاتار خاں تھا' اس نے فقہ کی ایک اہم مبسوط کتاب فتاوی تاتارخانیہ تیار کرائی' جسے مولانا عالم بن علاء حنفی نے تیار کرکے امیر کے نام سے منسوب کیا۔اس امیر نے علماء کی ایک جماعت کے ذریعہ تفسیر میں بھی ایسی ہی ضخیم کتاب تیار کرائی۔حضرت چراغ دہلی کے ایک مرید مولانا رکن الدین نے 30 ہزار اشعار پر مشتمل ایک فقہی کتاب طرفتہ الفقہاء لکھی تھی۔

فیروز شاہ کے عہد میں سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔جن میں دلائل فیروز شاہی قابل ذکر ہے۔اس دور کے مشائخ میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بھی ہیں۔جن کے مکتوبات کا مجموعہ مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی کے نام سے موجود ہے' عہد تغلق کا ایک مشہور ادیب عین الملک ملتانی ہے جس کی انشاء ماہر و مشہور ہے۔

معلومات کی جانچ:

1. فوائد الفواد کس بزرگ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے؟
2. ابن بطوطہ کو کس سلطان نے دہلی کا قاضی بنایا تھا؟
3. فتوحات فیروز شاہی کس کی تصنیف ہے؟

8.6 لودھی عہد میں علمی خدمات

لودھی خاندان کی حکومت افغان حکمراں بہلول لودھی نے قائم کی تھی اور اپنی ہمت و محنت کے ذریعہ ختم ہوتی دہلی سلطنت میں ایک بار پھر روح پھونک دی۔سید خاندان کی حکومت کے زمانہ میں دہلی سلطنت میں صرف آس پاس کے کچھ گاؤں رہ گئے اور سبھی جگہوں کے حاکم آزاد ہوگئے تھے۔بہلول نے اپنی 38 برس کی مضبوط حکمرانی میں مقامی سرداروں کو قابو میں کیا اور دہلی کی عظمت اور اسلام کی شوکت پھر سے قائم کردی' اس کا زیادہ وقت جنگوں میں گذرا۔اس لیے وہ دوسرے میدانوں میں زیادہ کام نہ کرسکا' وہ اچھے کردار کا انسان' غریبوں کے لیے رحم دل اور سختی سے عدل گستری کرنے والا تھا۔بہلول لودھی فضلاء کی محبت کا شوق رکھتا تھا اور ان کو انعامات دے کر علم کی قدردانی کرتا تھا۔اس نے کچھ مدارس بھی قائم کیے۔اور ایسا امن و مان قائم کیا جس سے علم و ادب کی ترقی ہوئی۔بہلول کے بعد اس کا بیٹا نظام خاں تخت سلطنت پر بیٹھا جس نے

سکندر لودھی کا لقب اختیار کیا۔ لودھی حکومت میں یہ فرمانروا بڑی خوبیوں کا مالک' متدین بے حد انصاف پرور اور بڑا عالم و فاضل ہوا ہے۔ اس کا دور عوام کی خوشحالی کے لیے بڑا زریں دور ہے۔ اس عہد میں غلہ کی فراوانی ہوگئی تھی اور اشیاء کی قیمتیں بے حد ارزاں ہوگئی تھیں۔ اس نے غلہ پر سے سارے محصولات ختم کر دیئے۔ زراعت کو بڑی ترقی دی۔ غرباء کی فہرست تیار کر کے ان کے لیے چھ مہینے کا سامان فراہم کراتا' اس نے کوشش کی کہ کوئی کام خلافت شریعت نہ ہو' اس کی عدل نوازی کے قصے بہت مشہور ہیں۔

سکندر لودھی خود بھی بڑا فاضل اور عالم تھا' علماء کے ساتھ صحبت رکھتا تھا' ان سے مذہبی مناظرے کیا کرتا تھا' اس نے علوم وفنون کی فیاضیانہ سرپرستی کی۔ اس کے دسترخوان پر جید قسم کے علماء وفضلاء ساتھ ہوتے۔ سلطان خود بھی ایک اچھا شاعر تھا اور گلرخ تخلص استعمال کرتا تھا۔ اس کے دیوان میں آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ سکندر لودھی نے اپنا دارالسلطنت آگرہ منتقل کر دیا تھا۔ وہاں عرب' ایران' بخارا اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے علماء وفضلاء اس کی قدر دانی کی وجہ سے جمع ہوگئے تھے۔ سکندر کے علمی ذوق اور علم کی اشاعت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ تمام فوجی عہدیدار بھی تعلیم یافتہ ہوں' اس طرح اس کے دور میں فوجی فنون سپہ گری کے ساتھ علمی قابلیت بھی رکھتے تھے۔

سکندر لودھی کے عہد کا ایک اہم علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس دور میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ پہلے ہندو فارسی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سکندر لودھی نے انہیں ترغیب دی اور اس کی ترغیب پر کائستھوں نے فارسی سیکھی اور سرکاری عہدے حاصل کرتے گئے۔ اس سے دونوں قوموں کے باہمی روابط کو فروغ ملا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے علوم کا خود ان کی زبان میں مطالعہ شروع کیا۔ اس عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا کثرت سے فارسی میں ترجمہ ہوا۔ سلطان نے ترجمہ کی ترغیب دی اور اس کی ہمت افزائی کی۔ سلطان کی فرمائش پر بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ طب پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب ارگا مہا بیدک ہے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا گیا اور طب سکندری نام رکھا گیا' موسیقی کی کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا۔

علم وفن کی سرپرستی میں سلطان سکندر لودھی کے ذوق وشوق کا اثر اس کے امراء پر بھی تھا' چنانچہ اس کے متعدد امراء بھی علمی فیاضی میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔ اس کے عہد میں ملتان سے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ دہلی آئے جنہوں نے درس وتدریس کے معیار کو بہت بلند کیا۔ مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے آئے' ملک العلماء مولانا عبداللہ اس کے دربار سے وابستہ تھے' جنہوں نے فتویٰ دیا تھا کہ ہندوؤں کی ایک قدیمی عبادت گاہ کو گرانا خلاف شرع ہے اور ہندوؤں کے اشنان کی قدیم رسم بند کرنا جائز نہیں ہے۔ عہد سکندری کی ایک اہم علمی شخصیت شیخ جمال کی ہے جن کی تصنیف سیر العارفین مشائخ کے تذکرہ میں ہے' ان ہی کے صاحبزادہ شیخ گدائی ہیں جو عہد اکبری کے شیخ الاسلام ہوئے۔

8.7 علاقائی حکومتوں میں علمی فروغ

دہلی سلطنت میں عہد تغلق کے اندر جب مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور علاقائی حکومتیں قائم ہوگئیں تو اس کا ایک مثبت پہلو یہ سامنے آیا کہ اب ہندوستان کے کئی شہروں میں علم وفن اور ادب وشاعری کی سرپرستی ہونے لگی۔ اب ایک دہلی کی جگہ کئی شہر علم وادب کے مراکز بن گئے۔ وہاں تصنیفی کام انجام پائے۔ بڑے بڑے ارباب فن اور اہل علم ان درباروں سے وابستہ ہوئے۔ وہاں علمی ادارے اور مدارس قائم ہوئے' تعلیم

وتدریس کا فروغ ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علاقائی زبانوں کو فروغ ملا اور ان زبانوں میں بھی علمی کام انجام پانے شروع ہوئے۔

ان علاقائی حکومتوں میں سے علم وفن کے حوالے سے چند حکومتیں بڑی اہم رہی ہیں' دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی اور گلبرگہ اور بیدر کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ اس حکومت میں شیخ خواجہ گیسودراز جیسے بزرگ تشریف لائے جنہوں نے اردو ادب کی ابتدائی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ کی کتاب معراج العاشقین اسی دور کی یادگار ہے۔ فیروز شاہ بہمنی بڑا عالم وفاضل اور اہل علم کا قدرداں رہا ہے' محمود گاواں اور اس کے مدرسے کی شہرت آج بھی باقی ہے۔ بہمنی سلنت کے زوال کے بعد قائم ہونے والی پانچ سلطنتوں میں سے گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومتوں میں بڑے اہم علمی کام انجام پائے اور جنوب کی متعدد علاقائی زبانوں کو بڑا فروغ ملا۔ محمد قاسم فرشتہ کی مشہور کتاب گلشن ابراہیمی' ابراہیم عادل شاہ کی طرف ہی منسوب ہے' جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

جونپور کی شرقی حکومت بھی علمی ترقی اور مدارس کے قیام کے لیے مشہور حکومت رہی ہے۔ جونپور کے مدرسہ میں ہی شیر شاہ سوری نے تعلیم پائی تھی۔ بڑے بڑے علماء وفضلاء' شعراء اور مشائخ شرقی حکومت کی شاہانہ عنایتوں سے مستفید ہوتے رہے تھے۔ علمی شہرت اور معیار کی وجہ سے جونپور کو شیراز ہند کہا جانے لگا تھا' قاضی شہاب الدین دولت آبادی (مشہور تصنیف پدماوت کا مصنف) جیسے فاضل اسی حکومت سے وابستہ رہے' سلطان ابراہیم شرقی کا دور علم وادب کے حوالے سے یادگار رہے۔

گجرات کی مسلم حکومت نے صنعت وحرفت اور تعمیرات کے ساتھ علم وادب کی بھی سرپرستی کی گجرات حکومت کے زیر سایہ متعدد شہروں میں اسلامی علوم کو ترقی ہوئی اور یہ علاقہ دہلی اور آگرہ پر سبقت لے جانے لگا۔ بنگال نے اسی دور میں علمی اعتبار سے ترقی کی' بنگال کے مسلم حکمرانوں نے بنگالی ادب کو بھی بڑا فروغ دیا۔ علاء الدین حسین شاہ نے بھگوت گیتا کا ترجمہ بنگالی میں کرایا اور اس کے بیٹے نصرت شاہ نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ اس طرح دیگر علاقائی حکومتوں میں بھی علم وادب اور فنون کی سرپرستی ہوئی اور علمی خدمات کے دائرے وسیع ہوئے۔

8.8 دہلی سلطنت میں فن تعمیر

8.8.1 تمہید

دہلی سلطنت کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ تعمیرات اور اس کا فن بھی ہے۔ مسلم سلاطین نے امن وامان' استحکام' عدل وانصاف' خوشحالی وفارغ البالی اور تعلیم وتمدن کے ساتھ تعمیرات سے بھی دلچسپی لی اور دہلی سلطنت کے پانچوں خاندانوں کی حکومتوں میں اس میدان میں نئے نئے تجربات کیے جاتے رہے۔ سلاطین دہلی کے یہ تعمیراتی کارنامے آج بہت کچھ مٹ چکے ہیں۔ لیکن جو کچھ باقی ہیں وہ اپنی عظمت وشوکت' نقش آرائی اور پختگی وحسن کے جلوے دکھانے کے لیے کافی ہیں' ان ہی نمونوں کو سامنے رکھ کر عہد سلطنت کے فن تعمیر کے نقوش کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شاہان دہلی نے اپنی ان خدمات کے تذکرے اپنی اور اپنے مؤرخوں کی تصنیفات میں کرائے ہیں۔ ان سے بھی عہد سلطنت کی تعمیرات اور ان کے طرز وصنعت پر روشنی پڑتی ہے۔

دہلی سلطنت کے فن تعمیر میں خاص بات یہ ہے کہ پورے تین سو برس کی مدت میں یہ فن مسلسل ارتقاء پذیر رہا' ہر بعد والے دور میں پہلے کی بہ نسبت کچھ نئے خیالات' نئے نقش ونگار' نئے طرز وانداز اور نئی اشیاء کے استعمال کو روبہ عمل لایا جاتا رہا۔ سلاطین اور ان کے امراء نے نہ

صرف اپنے پیش روؤں کی خدمات کو سراہا اور ان کے نقش قدم پر چلے' بلکہ اپنے ذوق وجدت طرازی کا استعمال کر کے اپنی علاحدہ شناخت بھی بنائی۔

سلاطین دہلی کی تعمیرات مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتی رہی ہیں' انہوں نے مذہبی مقاصد سے لے کر مقبرے' فوجی اہمیت کے قلعے' تعلیم گاہیں' محل' دروازے' منارے' شہر اور اس کی دیواریں' حوض اور سرائے وغیرہ متعدد قسم کی عمارتیں تعمیر کیں' گو کہ ان عمارتوں کے مقاصد استعمال مختلف تھے' لیکن انہوں نے ان سب میں اپنے طرز تعمیر کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

مسلم حکمراں جب ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ مختلف فنون کے ماہرین کو نہیں لائے تھے' چنانچہ ابتداء میں انہوں نے ہندوستانی ماہرین کی خدمت سے فائدہ اٹھایا۔ فن تعمیر میں بھی مستری اور کاریگر ہندوستانی تھے' جو ہندوستان کے فن تعمیر سے آشنا تھے' سلاطین دہلی نے انہیں کے ذریعہ اپنے اسلامی ذوق اور عربی انداز کی آمیزش کرتے ہوئے تعمیراتی کام انجام دیے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ عالم اسلام کے شہروں سے ماہرین فن بھی ہندوستان آنے لگے۔ بغداد و بخارا اور سمرقند کی تباہی سے بھی بہت سے اہل فن نے ہندوستان کا رخ کیا' ان علاقوں سے آنے والے شاہی خاندان کے شہزادوں کے ساتھ بھی ان سے وابستہ اہل کمال اور ماہرین فن دہلی آئے' ان ماہرین اور اہل فن کے ذریعہ دہلی کے طرز تعمیر میں نئے نئے تجربات کیے گئے اور یوں فن تعمیر میں ارتقا ہوتا رہا۔

8.8.2 عہد غلاماں میں فن تعمیر

ہندوستان فن تعمیر میں پہلے سے ترقی یافتہ تھا۔ شمال اور جنوب میں بڑے بڑے مندروں کی عمارتیں اور ان کے نقش و نگار بلکہ اجنتا اور ایلورا کے غاروں کی تعمیر اور نقاشی اس کی روشن مثالیں تھیں۔ جب قطب الدین ایبک نے دہلی سلطنت کی بنیاد رکھی اور شمالی ہندوستان کے علاقوں کو فتح کیا تو اس کے سامنے ہندوستانی عوام کی شاندار تعمیرات موجود تھیں۔ یہاں کی عوام کے ذہنوں میں اپنی سلطنت کی عظمت کا نقش قائم کرنے کے لیے یہ مناسب تھا کہ بلند و بالا اور پر شکوہ عمارتوں کی تعمیر کی جائے۔ قطب الدین ایبک نے اس کے لیے مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی اور اس کے اذان خانہ کے طور پر عظیم الشان قسم کا مینارہ بنوایا۔ یہ منارہ جو اب قطب مینار کہلاتا ہے۔ دراصل مسجد کا اذان خانہ تھا' مسجد بڑی وسیع و عظیم بنانے کا منصوبہ تھا اور مینار کی تعمیر میں اس نے اپنے اسلامی ذوق اور عظمت و شکوہ کے اظہار کو سمویا تھا۔ اس مینارہ کی تعمیر میں زیادہ تر یہیں کے کاریگر جیسے مستری اور سنگ تراش استعمال کیے گئے۔ مسلم دنیا میں مینار اس سے قبل موجود تھے لیکن یہ مینار کچھ انفرادیت رکھتا تھا' اس کی اونچائی 71.4 میٹر رکھی گئی۔ بعد میں اس کی اوپر کی ایک منزل گر گئی تھی اور فیروز تغلق نے اس کی مرمت کروا کے ایک منزل کا اور اضافہ کرا دیا تھا۔ قطب مینار بلند تخیل کے ساتھ اور بہت عمدہ طریقہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کے چھجے (بالکونی) اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں جو اس میں ابھرے اور باہر نکلے ہوئے ہیں۔ قطب مینار کی پہلی منزل پر آیت قرآنی لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) کندہ ہے۔ پورے مینار کو بہترین نقاشی سے آراستہ کیا گیا ہے۔

شمس الدین التمش نے ایبک کے کاموں کو آگے بڑھایا۔ اس نے مسجد قوۃ الاسلام کی توسیع کرائی اور شمال' جنوب اور مشرق کی سمتوں میں مسجد کے اندر اضافہ کر دیا جس سے یہ مسجد تین گنی ہو گئی۔ اس نے قطب مینار میں بھی اضافہ کرایا۔ التمش نے اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا تعمیر کرایا' بدایوں میں مسجد اور دوسری عمارتیں بنوائیں۔ اس نے خود اپنا مقبرہ بنوایا جو مربع شکل کی عمارت تھا اور چاروں کونوں پر ہشت پہل کی شکل

دے کر گنبد تعمیر کیا گیا تھا' اندرونی دیواروں پر متاثر کن نقاشی کی گئی تھی جس میں خطاطی کے اندر ہندوستان کی گل کاری کی آمیزش کی گئی تھی۔ یہ گویا ہندو مسلم روایات کے آپسی امتزاج کا نشان تھا۔

بلبن کے دور میں وسط ایشیا سے آئے ہوئے مسلم ماہرین فن' ریاضی داں اور ماہرین تعمیرات سے بھی استفادہ کیا گیا چنانچہ بلبن کے مقبرہ میں محراب میں فنی اعتبار سے زیادہ پختگی نظر آتی ہے' اس میں محراب کو دونوں طرف ابھرے چھجے یا منڈیر جیسے پتھروں پر براہ راست ابھارا گیا ہے اور ہندوستان میں پہلے سے رائج طریقہ ترک کیا گیا ہے جس میں پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کم کرتے جاتے تھے اور پھر اوپر ایک پتھر کی سل رکھ کر اسے ڈھک دیتے تھے۔

8.8.3 خلجی دور میں فن تعمیر

علاء الدین خلجی کے عہد سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' بلبن کے زمانہ میں بیرونی حملوں کی روک تھام اور اندرونی استحکام پر زیادہ توجہ ہونے کی وجہ سے تعمیرات پر توجہ زیادہ نہ ہو سکی۔ علاء الدین خلجی کے دور میں اس میدان میں ترقیاں ہوئیں اور بہت زیادہ عماراتی کام ہوا۔ علاء الدین نے سیری میں اپنا پایہ تخت تعمیر کرایا جو قطب سے کچھ کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔ اب اس کے نشان ناپید ہو چکے ہیں۔ علاء الدین نے قطب مینار سے دوگنا اونچا ایک اور مینار تعمیر کرانا چاہا لیکن اس کا یہ منصوبہ پورا نہیں ہو سکا' البتہ اس نے قوۃ الاسلام میں داخلہ کا ایک دروازہ بنوایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ اسے نئے اصول پر بنایا گیا تھا جو ہندوستان میں اپنے طرز کی پہلی عمارت تھی۔ اس کی صنعت اور آرائش جاذب فکر و نظر ہے۔ نقادوں کے مطابق علائی دروازہ مسلمانوں کی ابتدائی تعمیرات کا بہت ہی حسین اور مکمل نمونہ ہے۔ اس دروازہ میں ایک مربع شکل کی عمارت ایک ہشت پہل میں تبدیل ہو گئی ہے جس پر گنبد کا انحصار ہے۔ دروازہ کی اندرونی دیواریں بہت ہی مرصع نقش و نگار سے مزین ہیں اور ان میں عمدہ نفاست برتی گئی ہے۔

علاء الدین آخری سلطان ہے جس نے غلام عہد کے سلاطین کے فن تعمیرات کو برقرار رکھا۔

8.8.4 تغلق دور میں فن تعمیر

غیاث الدین تغلق کے دور میں طرز تعمیر کے اندر نقاشی اور نقش نگاری کو چھوڑ کر سادہ انداز اختیار کر لیا گیا' انتہا درجہ کی سادہ تعمیرات کا نیا اسٹائیل اس نے پیدا کیا' جس کا نمونہ تغلق آباد کا قلعہ ہے۔ اس قلعہ کی بنیاد ایک بلند پہاڑی پر ہے' اس کی چاروں طرف خندق ہے' قلعے میں چاروں طرف برج' فصیل' مینارے اور دروازے دیے گئے ہیں۔ اس کی شکل نیم مخمسی ہے۔ اس نئے طرز کی مثال ملتان میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ ہے۔ جو ہشت پہل ہے' اس کے مختلف زاویوں میں برج بنے ہیں۔ غیاث الدین تغلق کا یہ مقبرہ مشہور بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی کو دے دیا گیا تھا' کیونکہ سلطان کی وفات اچانک دہلی میں ہو گئی تھی۔

محمد تغلق نے تعمیرات سے دلچسپی لی' اس کی تعمیرات میں دولت آباد کا قلعہ' شہر جہاں پناہ' دہلی کا لال گنبد اور غیاث الدین کا مقبرہ وغیرہ ہیں۔ محمد تغلق نے طرز تعمیر اور اس کے تصور میں کچھ تبدیلی کی' اس نے مقبرہ کے سوگوارانہ ماحول کو ختم کیا۔ مقبرہ کو جھیل کے درمیان بنایا اور گنبد اور دیواروں کے نقش و نگار کے ذریعہ دیکھنے والوں کے لیے ایک اچھا منظر فراہم کیا۔ لال گنبد میں بھی اس نے نقش و نگار کے ذریعہ خوبصورتی پیدا

کی۔

محمد تغلق کا سب سے اہم تعمیراتی کارنامہ دولت آباد کا قلعہ ہے۔ اس قلعہ میں حربی فن تعمیر کا بہترین استعمال کیا گیا ہے' اور محمد تغلق نے اپنی جدت پسندی اور بلند خیالی کا عکس دکھایا ہے۔ قلعہ کو ایک ایسی پہاڑی پر بنایا گیا جہاں تک پہنچنے کا راستہ بہت پیچ وخم کے ساتھ لے جایا گیا۔ تاکہ ایک چھوٹی فوج بھی دیر تک دشمن کا مقابلہ کر سکے اور ہر طرف سے دشمن پر حملہ کرنا ممکن ہو۔ روزنوں کی تعداد زیادہ رکھی گئی' پھر قلعے کے دو حصے بنائے گئے۔ اوپر کی منزل فوجیوں کے لیے تھی' اور اسے نیچے کی منزل سے علاحدہ کر دیا گیا' اور اوپر کی منزل کا راستہ نیچے کی منزل سے علاحدہ کر کے زمین دوز اس طرح اوپر لے جایا گیا تھا کہ اگر دشمن نیچے کی منزل پر قبضہ کرے تو اوپر کی فوج کو مقابلہ میں دشواری نہ ہو۔ پھر زمین دوز راستوں کے بالائی حصہ پر ایک آہنی آنگیٹھی رکھی گئی تھی' جس میں حملہ کے وقت آگ جلادی جاتی تو اس کے دھویں اور شعلوں سے حملہ آور آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہوا تو غیاث الدین تغلق کے آسان اسٹائل کی طرف متوجہ ہوا' اس کی عمارتوں میں بڑی سادگی اور نشیب آ گیا۔ اس کی تعمیر میں اس کا مقبرہ اور قلعہ ہے جو فیروز شاہ کوٹلہ کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی قدیم عمارتوں' مسجدوں اور مقبروں کی مرمت کرائی اور ان میں ترمیم و اضافے کرائے' فیروز شاہ کا مدرسہ بھی اس کی تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس نے اس کے علاوہ کثرت سے نہریں جاری کیں' کنویں کھدوائے' مسجدیں اور خانقاہیں بنوائیں' نئے شہر بسائے' حمام تیار کرائے' شفاخانے بنوائے' ہزاروں باغ لگوائے' جن سے اچھی آمدنی بھی ہونے لگی۔ فن تعمیر میں کسی جدت کے بجائے اس کی توجہ رفاہ عام' زراعت کی ترقی اور لوگوں کی بہبود پر رہی۔

فیروز شاہ کی عمارتوں میں پتھروں پر گچ یا چونے کے مسالے کی ایک بڑی سی تہہ چڑھائی جاتی تھی' جس پر سفید پتائی کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بعد میں بھی رائج رہا۔ فیروز کی عمارتوں میں سجاوٹ میں کنول نظر آتا ہے۔

فیروز کے وزیر خان جہاں تلنگی نے بھی عمارتیں بنوائیں۔ البتہ اس نے مسجدوں کی تعمیر میں جدت کی' جہاں پناہ کی کھڑکی مسجد اور نظام الدین کی کالی مسجد میں مسقف چبوترہ بنوا کر اس کے کھلے ہوئے حصوں کو چار صحنوں میں تقسیم کر دیا تاکہ اندر جانے والے لوگ دھوپ اور تپش اور بارش سے بچ سکیں۔ اس کا مقبرہ چھوٹا اور ہشت پہل ہے۔ مقبرہ کی یہی شکل بعد میں مدتوں تک اپنائی جاتی رہی ہے۔

8.8.5 سادات اور لودھی عہد میں فن تعمیر

سادات سلاطین کے زمانہ میں بڑے پیمانے پر مقبرے تعمیر ہوئے' ان میں سائز کا اضافہ ہوا' رنگ و زینت میں اضافہ کیا گیا' اور فرش اور دیواروں کو مزین کیا گیا۔ ان عمارتوں میں بہترین قسم کے میناروں' چھتریوں اور بڑے گنبدوں کا اضافہ کیا گیا۔

لودھیوں کے زمانے میں زینت و آرائش میں اور اضافہ ہوا' رنگین ٹائل کا استعمال کیا گیا' انہیں اونچے چبوتروں پر اٹھایا گیا۔ جس سے وہ عالیشان نظر آنے لگیں۔ کچھ مقبروں کو باغات میں تعمیر کیا گیا۔ لودھی گارڈن اسی کی مثال ہے۔ اس دور میں ایک نیا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ گنبد دوہرے بنائے گئے' سکندر لودھی کے مقبرے میں یہ فن پوری طرح اختیار کیا گیا ہے' اس میں اوپر اور نیچے گنبد ہوتے' اوپر کے گنبد کی اونچائی زیادہ رکھی جاتی اور نیچے کا گنبد اتھلا بنایا جاتا' اس کا فائدہ یہ تھا کہ اوپر کا گنبد زیادہ اونچا رکھنا آسان ہو گیا۔ بعد میں یہی طریقہ عام عمارتوں میں

استعمال ہونے لگا۔

8.8.6 ہنداسلامی فن تعمیر

فن تعمیر کا یہ طرز جس میں ہندوستانی طرز کی آمیزش کرتے ہوئے اسلامی ذوق و رجحان کو برتا گیا' ہنداسلامی فن تعمیر کہلایا۔ مسلم سلاطین نے اپنی عمارتوں میں ہندوستان کے کئی اسٹائل اور بالخصوص نقاشی میں گل وبوٹے وغیرہ استعمال کیے۔ پھر ہندومندروں میں مسلم طرز تعمیر سے متاثر ہوکر وسیع گنبداور درباروں میں زیبائش وآرائش کے ملتے جلتے انداز اختیار کیے گئے۔ علاقائی حکومتوں کی تعمیرات میں اسی طرز کے اندر علاقائی اثرات بھی شامل ہوتے گئے' اور نئے نئے انداز کی عمارتیں بنیں۔

اس طرح سلاطین دہلی نے فن تعمیر کے میدان میں اپنے اعلیٰ ذوق' بلند خیالی اور وسیع تصور کے ساتھ اسلامی آہنگ کو شامل کر کے عمدہ و پختہ تعمیرات کی لافانی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

8.9 خلاصہ

دہلی سلطنت کے بادشاہوں نے علم کے فروغ اور تعمیرات دونوں سے دلچسپی لی۔ پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک خود تعلیم یافتہ اور اہل علم کا قدرداں تھا' صلحاء اور شعراء کی اس نے سرپرستی کی' مولانا بہاؤالدین اوش جیسے عالم اور جمال الدین محمد اور قاضی حمیدالدین جیسے شعراء اس کے دربار سے جڑے رہے' حسن نظامی نیشاپوری نے تاج المآثر ایبک کی خواہش پر لکھی۔ مشہور مؤرخ فخر مدبر نے بحر الانساب ایبک کو پیش کی' مولانا رضی الدین حسن صغانی مشہور مؤلف کتاب مشارق الانوار بھی اس دور میں تھے' جنہیں ایبک نے لاہور کی قضائت پیش کی تھی۔

التمش کے دور میں بغداد اور دوسرے اسلامی شہروں کی تباہی سے بڑی تعداد میں علماء وفضلاء دہلی آگئے تھے۔ التمش نے ان کی بے حد قدرافزائی کی' اوران کے لیے وظائف مقرر کیے۔ التمش نے علم کے فروغ کے لیے مدرسہ معزیہ اور مدرسہ ناصریہ قائم کیا اور طلبہ واساتذہ کے لیے اوقاف مقرر کیے۔ اس نے بغداد وغیرہ سے عمدہ کتابیں ہندوستان منگوائیں۔ التمش اکثر اہل علم کی صحبت میں رہتا اور علماء وصلحاء سے عقیدت مندانہ استفادہ کرتا تھا۔ مشہور مؤرخ قاضی منہاج سراج اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ ابونصر ناصر' امیر روحانی' تاج الدین ریزہ اور شہاب الدین مہرہ معروف شاعر تھے۔ فخر مدبر نے فنون حرب پر آداب الحرب والشجاعۃ لکھ کر التمش سے منسوب کی۔ اس کے دور میں جلال الدین تبریزی دہلی آئے۔ بہاء الدین زکریا ملتانی کو شیخ الاسلام بنایا' نورالدین مبارک غزنوی کا مشہور وعظ التمش کے دربار میں ہوا۔ التمش اپنے محل کے اندر بھی علمی محفلیں منعقد کرتا تھا۔

بلبن کے زمانے میں علماء وفقہاء کثرت سے دہلی آگئے تھے جنہوں نے علم کی اشاعت پر توجہ دی' ایسے علماء کی طویل فہرست ہے جن کی قدردانی بلبن کرتا تھا اور اپنے دسترخوان پر انہیں شامل کرتا تھا۔ اس دور میں مشائخ کبار بھی متعدد تھے جن سے بلبن کے گہری عقیدت مندانہ مراسم تھے۔ بابا فرید گنج شکر سے اس کو گہری عقیدت تھی۔ بلبن کے بیٹے خان محمد کے دربار سے امیر خسرو اور امیر حسن جیسے شعراء وابستہ تھے۔

جلال الدین خلجی خود اچھا شاعر تھا' علاء الدین کے عہد میں دہلی میں سب سے زیادہ علماء وفقہاء جمع ہوگئے تھے۔ تعلیم کی اشاعت' اور

وعظ و نصیحت سے کافی دلچسپی لی جاتی تھی۔ اس دور میں سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں میں بھی تصنیفی کام انجام پائے۔ تغلق دور میں بھی علم و ادب کا فروغ جاری رہا۔ محمد بن تغلق خود بڑا عالم و فاضل اور مختلف فنون کا ماہر تھا۔ ابن بطوطہ کو اس نے قاضی دہلی بنایا تھا۔ ضیاء الدین برنی اس کا ندیم خاص تھا۔ ضیا نخشبی نے سلک السلوک اور طوطی نامہ لکھا۔ طوطی نامہ سنسکرت سے فارسی ترجمہ ہے۔ عصامی نے فتوح السلاطین لکھی۔ فیروز تغلق کے عہد میں علوم شریعت کا رواج زیادہ ہوا۔ خود اس نے فتوحات فیروز شاہی لکھا اس دور میں فقہ فیروز شاہی اور فوائد شاہی لکھی گئی۔ فتاوی تاتار خانیہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف ہر دو کی تاریخ فیروز شاہی اسی بادشاہ کے نام معنون ہے۔ فیروز نے کثرت سے مدرسے تعمیر کرائے۔ اس دور میں سنسکرت سے فارسی میں کتابوں کا ترجمہ کثرت سے ہوا۔ سکندر لودھی کے دور میں بھی علم و ادب کو فروغ ملا۔ اس کے دور میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ جس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوا۔ شیخ جمال اسی عہد کے ہیں جن کی تصنیف سیر العارفین مشائخ کے تذکرہ کے لیے مشہور ہے۔

علمی کاموں کے ساتھ سلاطین دہلی نے تعمیرات سے بھی دلچسپی لی اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قطب الدین نے مسجد قوۃ الاسلام بنوایا اور عظیم الشان قطب مینار تعمیر کرایا جو سلطنت دہلی کی تعمیری عظمت کا نشان ہے۔ التمش نے مسجد اور مینار میں اضافہ کے ساتھ اجمیر وغیرہ میں مسجدیں بنوائیں۔ علاء الدین خلجی کے زمانہ سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے' اس نے خوبصورت علائی دروازہ بنوایا۔ سیری میں پایۂ تخت تعمیر کرایا۔ تغلق کے دور میں تعمیر کا ایک نیا اسٹائل اختیار کیا گیا۔ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد کا قلعہ بنوایا جو سادگی کا نمونہ ہے۔ محمد بن تغلق نے لال گنبد' غیاث الدین کا مقبرہ اور جہاں پناہ بنوایا' اس کا بڑا کارنامہ دولت آباد کا قلعہ ہے' جو دو منزلہ اور حربی فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ فیروز تغلق نے مدرسہ فیروز شاہی' قلعہ فیروز شاہ کوٹلہ اور کثرت سے مدرسے' مسجدیں' سرائے' محل' شفا خانے وغیرہ بنوائے۔ لودھی عہد میں مقبروں کی عمارتوں میں نقش و نگار پر زیادہ توجہ دی گئی اور کئی ڈیزائن اختیار کیے گئے جو آئندہ بھی جاری رہے۔ جیسے دوہرے گنبد کا رواج شروع ہوا جس کی مثال سکندر لودھی کا مقبرہ ہے۔ دہلی سلطنت کی ان تعمیرات سے ہندوستان کے قدیم اسٹائل کے اندر عربی ذوق اور اسلامی تصورات کی آمیزش کر کے اسے عہد بہ عہد ترقی دی گئی اور ان نئے نئے تجربات کی وجہ سے ایک نیا فن وجود میں آیا جو ہند اسلامی فن تعمیر بنا۔

8.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل کے سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. عہد غلاماں کی علمی خدمات پر گفتگو کیجیے۔
2. تغلق خاندان کے دور کی علمی اور تصنیفی خدمات پر مضمون لکھیے۔
3. علاء الدین خلجی سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ تبصرہ کیجیے۔

درج ذیل کے سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4. علاء الدین کے عہد میں دہلی علماء و فضلاء کا مرکز تھا' وضاحت کیجیے۔

5. غیاث الدین بلبن کی علمی دلچسپیوں پر روشنی ڈالیے۔

6. محمد بن تغلق کی تعمیراتی خدمات کا تعارف کرائیے۔

8.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. آب کوثر   شیخ محمد اکرام' فرید بک ڈپو' دہلی

2. عہد وسطیٰ کا ہندوستان' حصہ اول   پروفیسر ستیش چندر' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی 2003ء اردو ترجمہ: عزیز الدین حسین

3. ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک   سید صباح الدین عبدالرحمٰن' دارالمصنفین 'شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2012

4. بزم مملوکیہ   سید صباح الدین عبدالرحمٰن' دارالمصنفین ' شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 1999ء

5. خلجی خاندان   کے ایس لال' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی 1998 'اردو ترجمہ' یسین مظہر صدیقی

6. مختصر تاریخ ہند   سید ابوظفر ندوی' دارالمصنفین 'شبلی اکیڈمی' اعظم گڑھ 2006

7. "A Comprehensive History of Medieval India: Salma Ahmed Farooqui, Pearson:2011

بلاک: 3 علاقائی حکومتیں

فہرست

اکائی ۔ 9 : بہمنی حکومت کا قیام، استحکام، خدمات اور زوال

اکائی کے اجزاء

9.1 مقصد:

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ بہمنی سلطنت کے مشہور سلاطین، ان کے اوصاف وسیر اور طرز حکومت نیز ان کے اہم کارناموں سے

واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

اس اکائی میں بہمنی دور کا اجمالی تعارف کرایا جائے گا، اس کے قیام و زوال کی وجوہات کے ساتھ ساتھ مشہور سلاطین اور وزرا کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔ اس کے علاوہ اس عہد کے نظام حکومت: مرکزی و صوبائی، تعمیرات، علوم اور علماء کی سرپرستی پر بھی اظہار خیال کیا جائیگا۔

9.2 تمہید

دکن میں پہلے پہل مسلمان تبلیغ اسلام کے لئے آئے تھے اس کے بعد شمال کے حملے ہوئے اور دکن میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ دکن کے کچھ حصے کو علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے 1310ء میں فتح کر کے اپنے مقبوضہ علاقے کو راس کماری تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد 1323ء میں ورنگل فتح ہوا، اس کا نام سلطان پور رکھا گیا۔ اس کے بعد محمد بن تغلق کے عہد میں جب اس نے دیوگڑھ (دولت آباد) کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو دکن اس کے زیر نگیں رہا۔ مگر محمد بن تغلق کے ہی عہد میں جب دارالسلطنت دولت آباد سے دہلی کو منتقل کیا گیا تو اس کے آخری زمانہ میں سارے ملک میں انتشار پیدا ہوگیا اور سلطنت دہلی کئی حصوں میں بٹ گئی اور دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوگئی اور ظفر خان، علاء الدین بہمن شاہ کے لقب سے خود مختار بادشاہ بن گیا۔

9.3 بہمنی حکومت کا قیام: علاء الدین بہمن شاہ (1347-1358)

حسن گانگو کی تاج پوشی دولت آباد میں کی گئی اور اس نے سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے 1347ء میں حکومت سنبھالی۔ وہ ایک اولوالعزم حکمراں تھا دائرۃ المعارف کے مطابق اس کی نیت یہ تھی کہ دہلی سمیت تغلقوں کی تمام سلطنت کو اپنے زیر نگین کرلے لیکن اس کے وزیر اعظم ملک سیف الدین غوری نے اس سے باز رکھا اور مشورہ دیا کہ پہلے دکن پر اپنا قبضہ جمائے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے قندھار، کوٹ گر، مرام اور اکل کوٹ کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد اس نے کلیانی فتح کیا اور اس کا نام دارالامان رکھا۔ بعد ازاں اس نے گلبرگہ پر بھی قبضہ کرلیا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا اور اس کا نیا نام حسن آباد رکھا اس کا عہد شمال، جنوب اور مغرب کی مہمات میں گزرا۔ اس کے انتقال کے وقت اس کے براہ راست قبضہ میں جو مملکت تھی وہ شمال میں مانڈو سے لے کر مغرب میں دابول اور گوا تک پھیلی ہوئی تھی اور ورنگل کے راجہ اسے خراج دیتے تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کردیا تھا:

(1) حسن آباد گلبرگہ مع رائچور اور مدگل جو وزیر سیف الدین غوری کے سپرد تھا۔

(2) دولت آباد مع بیڑ، جنیر اور چاول جو بادشاہ کے بھتیجے محمد بن علی شاہ کے پاس تھا۔

(3) برار اور ماہولی صفدر جان سیتانی کے ماتحت اور

(4) اندور، کولاس اور بہمنی کو تلنگانہ کا الگ صوبہ بنا کر وزیر سیف الدین غوری کے لڑکے اعظم ہمایوں کے سپرد کیا۔

اخلاق وکردار

علاء الدین حسن ایک اچھا علم دوست بادشاہ تھا اس کا دربار ہمیشہ علماء سے بھرا رہتا تھا۔ محمد نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب ''دکنی کلچر'' میں لکھتے ہیں کہ اس کے دربار میں مولانا لطف اللہ، ملا اسحاق سرہندی، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، شریف سمرقندی، مولانا عاصامی وغیرہ تھے۔ اسے دکن کے آثار قدیمہ سے بھی دلچسپی تھی وہ 1352ء میں ایلور کے غاروں کو دیکھنے گیا اور اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو لے گیا جو کتبوں کو پڑھ سکیں اور دیواروں پر منقش تصاویر کے مفہوم کو بتاسکیں۔ ہارون خان شیروانی نے اپنی کتاب ''دکن کے بہمنی سلاطین'' میں رقم طراز ہیں کہ علاء الدین حسن شاہ کی حکومت کے حالات سے اس کے کردار کا اظہار ہوتا ہے، اس کی تمام مہمات میں سے کسی ایک میں بھی ظلم کا شائبہ تک نظر نہیں آتا اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر خود بادشاہ یا اس کے نمائندہ نے مفتوحہ ریاست اس مغلوب حکمران کو واپس کردی۔ یہی وجہ تھی کہ ورنگل کے رائے جیسے طاقتور حکمران نے بلاکشت وخون کے علاء الدین حسن کا اقتدار اعلیٰ قبول کرلیا اور اس کو معزز دوست اور حلیف سمجھنے لگا۔ مولانا عاصامی جو اس کے دربار میں تھے لکھا ہے کہ علاء الدین میں اچھے بادشاہوں کی تینوں صفات موجود تھیں یعنی وہ ہمیشہ مظلوموں کی مدد کرتا تھا، غریبوں پر مہربانی کرتا تھا اور احکام خداوندی کی پیروی کی پوری کوشش کرتا تھا۔ یہی نہیں اس نے اپنے بیٹے محمد شاہ ثانی کو جو اس کا ولی عہد بنا، کی شادی مبارک کے موقع پر ہزاروں تھان زربفت مخمل اور ریشم کے کپڑے اور ایک ہزار عربی اور عراقی گھوڑے اور بارہ مرصع تلواریں اپنے امراء میں تقسیم کیں اور خاص وعام کو غلہ تقسیم کیا اور دارالسلطنت کے غرباء اور محتاجوں کو پکا ہوا کھانا کھلایا اور یہ سلسلہ پورے سال بھر چلا۔ علاء الدین سے اس کی کامیابی کا راز پوچھے جانے پر اس نے جواب دیا کہ ہر ایک کے ساتھ خواہ دوست ہو یا دشمن مہربانی کا سلوک کرنا اور غریبوں اور محتاجوں کو فیض پہنچانا۔ عاصامی نے لکھا ہے کہ اس کے کردار کی دو خصوصیات تھیں ایک انصاف اور دوسرا فیض رسانی۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں ہی کے لئے فیض رساں نہ تھا بلکہ 1354ء میں اس نے مکہ معظمہ میں ایک رباط بھی بنوائی تھی۔ ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے حکم دیا کہ غیر مسلمانوں سے فوجی خدمت کے عوض جزیہ نہ لیا جائے اور یہ بھی حکم دیا کہ غلہ اور ہر قسم کے مویشی و پیداوار اس کی سلطنت میں بلا محصول کے آیا کریں۔

اس کی نصیحت، ہدایت وغریب پروری کا سلسلہ بستر مرگ پر بھی قائم رہا۔ بستر مرگ پر اس نے اپنے بیٹوں کو ہدایت دی کہ انہیں ایک جان دو قالب ہوکر رہنا چاہیے، ولی عہد کی اطاعت پر زور دیا اور روپیہ اور استعمال کی چیزیں گلبرگہ کی جامع مسجد میں حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت دی۔

معلومات کی جانچ

(1) بہمنی سلطنت کے بانی کا نام بتایئے۔

(2) حسن گانگو کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

9.4 محمد شاہ اول(1375-1358)

علاء الدین حسن بہمنی نے اپنے عہد میں تمام مخالف عناصر پر قابو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مگر ملک میں اب بھی چور اور ڈاکو بھرے ہوئے تھے اور اندرونی طور پر لاقانونیت تھی جسے محمد شاہ نے سخت اقدامات کے ذریعے قابو میں کیا اور سلطنت کو منظم کیا نیز اس کا آئین بنایا۔ اس نے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا جن کے مرکز دولت آباد، برار، بیور اور گلبرگہ تھے اور ان کے گورنروں کو بھی علی الترتیب مسند عالی، مجلس عالی، اعظم ہمایوں اور ملک نائب کے خطابات دئے۔ ان میں گلبرگہ کا صوبہ اہم تھا جس کا حاکم ملک نائب کہا جاتا تھا۔

محمد شاہ نے فوج کو بھی اسی طرح منظم کیا۔ کمانڈر ان چیف کے عہدہ کا نام امیر الامراء تھا اور افسروں کی ایک جماعت باربرداران کے نام سے قائم کی گئی تھی جو بادشاہ کے ذاتی اسلحہ کی ذمہ دار تھی ان کے علاوہ چار ہزار آدمیوں کا ایک مسلح دستہ شاہی باڈی گارڈ تھا جو خاصہ خیل کہلاتا تھا اس کے علاوہ خفیہ اطلاعات کا محکمہ بھی قائم تھا۔ اس منظم اور مستحکم فوج کی وجہ سے محمد شاہ نے وارنگل اور تلنگانہ کے حاکم کو شکست دی۔ وارنگل اور تلنگانہ کے حاکموں اور محمد شاہ کے بیچ معاہدہ ہوا جس میں خراج دینے کے علاوہ گولکنڈہ کا شہر مع متعلقات کے راجہ تلنگانہ کو چھوڑنا پڑا۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق بہمنی سلطنت کا محمد شاہ پہلا حکمران ہے جس نے سب سے پہلے سونے اور چاندی کے سکے جاری کئے۔ سکہ کے ایک طرف کلمہ طیبہ اور چاروں خلفائے راشدین کے نام کندہ تھے اور دوسری طرف حکمران بادشاہ کا نام اور ڈھالنے کی تاریخ لکھی تھی۔ اس کے پہلے وجے نگر کے سکے رائج تھے جن کے استعمال پر محمد شاہ نے پابندی لگادی ''دکن کے بہمنی سلاطین میں'' ہارون خان شیروانی نے لکھا ہے کہ 1360ء میں مادر ملکہ نے جب مکہ معظمہ کا سفر کیا تو انہوں نے مصر میں عباسی خلیفہ المعتصد سے خط وکتابت کی اور اپنے لڑکے کے لئے خطبہ وسکہ کے اجراء کے حق میں باضابطہ اجازت حاصل کی۔

محمد شاہ خود علم دوست تھا۔ بچپن سے اس کو علم وفن سے دلچسپی تھی۔ علامہ فضل اللہ اس کے زمانہ میں شیراز سے دکن آئے، ان کے علم و فضل کی محمد شاہ نے بڑی قدر کی۔ اس کے دربار میں علماء اور شعراء کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ المشائخ زین الدین دولت آبادی، عین الدین بیجاپوری، مولانا نظام الدین برنی، حکیم ظہیر الدین تبریزی جیسے اہل علم اس کے دربار میں تھے جس سے دکن اہل علم کا گہوارہ اور سارے ہندوستان کے لئے قابل رشک بن گیا تھا۔ سلطنت بہمنیہ کے بڑے بڑے شہروں مثلاً گلبرگہ، بیدر، دولت آباد، جنیر، دابیل وغیرہ میں مدرسے قائم کئے گئے۔ جہاں قابل اساتذہ درس دیتے تھے، طلبا کے لئے وظائف بھی جاری تھے۔

اخلاق وکردار:

اس کے عہد میں سارے ملک میں امن رہا۔ اس نے اپنا سارا وقت سلطنت کو مستحکم کرنے میں صرف کیا۔ وہ ہر سال اپنے ملک کے صوبوں کا دورہ کرتا۔ فرشتہ کے مطابق اس کے حکومت کے آخری زمانہ میں ہر شخص خوشحال اور فارغ البال تھا۔

علاء الدین مجاہد(1378-1375)

19 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور تین سال سے بھی کم عرصہ تک حکومت کی۔ وہ اپنے عہد میں وجے نگر کے خلاف مصروف جنگ

رہا۔ اسے دھوکہ سے داؤد جو اس کا چچا اور وفادار سپہ سالار تھا خیمے میں قتل کر کے خود تخت نشین ہوا۔

داؤد اول (1378 اپریل تا مئی 1378)

داؤد کے عہد میں خانہ جنگی پھیل گئی۔ علاء الدین مجاہد کے دوسرے سپہ سالار اور اس کی بہن روح پرور آغا نے بغاوت کی، اور داؤد کو قتل کرا دیا۔

محمد شاہ دوم (1378-1379)

اس کے بعد روح پرور نے بہمن شاہ کے پوتے محمد شاہ دوم کو تخت نشین کرایا۔ اس کی حکومت بہمنی تاریخ میں سب سے زیادہ پرامن رہی۔ اس نے مجاہد کے قاتلوں کا خاتمہ کیا اور سیف الدین غوری، جو سلطان علاء الدین مجاہد کا سسر تھا، وزیر اعظم مقرر کیا اور ہر ضروری معاملہ میں اس مشورہ لیتا تھا۔ اس نے وجے نگر سے مصالحت تا کہ ملک میں امن کو بحال کیا جا سکے۔ اس کے بعد غیاث الدین 1397ء جون۔ اپریل 1397ء اور شمس الدین جون 1397ء نومبر۔ جون 1397ء نے مختصر مدت کے لئے حکومت کی۔

اگر ہم پچھلے پانچ حکمرانوں کے حالات کا تجزیہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد دوم کے عہد کو چھوڑ کر بد نظمی اور بے اطمینانی کا دور تھا۔ لیکن دو ایک پہلو ایسے ہیں جو اس کی تلافی کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس مدت میں سے انیس سال محمد دوم کی شائستہ اور ترقی پذیر حکومت کے ہیں جو دکن کی تاریخ کا ایک سنگ میل ہے اس لئے کہ محمد دوم ہی نے اس ملک کو تہذیب اور علم و فضل کا گہوارہ بنانے کی کوشش کی۔ دوسرا یہ کہ دکن اور وجے نگر کے درمیان لڑائیوں کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

معلومات کی جانچ

(1) محمد شاہ اول کے عہد حکومت پر چند سطریں لکھئے۔

(2) مادر ملکہ نے مکہ معظمہ کے سفر پر عباسی خلیفہ سے کس چیز کی اجازت لی؟

(3) محمد اول، محمد دوم اور علاء الدین مجاہد میں سے کس کا دور امن کا دور مانا جاتا ہے؟

9.5 تاج الدین فیروز شاہ (1397-1422)

یہ سلطان محمد شاہ دوم کا داماد تھا اور اپنے خسر کی روایت کو یعنی دکن کو تمدن کا گہوارا بنانا، قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے امن قائم کرنے کے لئے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو ذمہ داری دی اور برہمنوں کو بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اس کا دور حکومت سلطنت بہمنی کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانہ میں سیاسی تدبر اور تدبیر مملکت سے ایک طرف کو ملک کو بلند منزل پر پہنچایا گیا اور دوسری طرف پاکیزہ تہذیب و تمدن سے ملک کو زینت دی۔

فیروز شاہ اپنی علمی قابلیت میں مشہور تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے فاضل ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ وہ علوم اسلامیہ میں قرآن،

حدیث، فقہ، صوفی مصطلحات اور علوم عقلیہ میں حکمت، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، علوم طبعی، اقلیدس، فن مناظرہ اور اخلاقی علوم میں ماہر تھا اس نے باضابطہ ہفتہ میں تین دن ان علوم میں خود درس و تدریس کے لئے مخصوص کر لئے تھے۔ وہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا اور عروجی اور فیروز تخلص رکھتا تھا۔ فیروز شاہ ان علوم کے ساتھ ساتھ دنیا کی کئی زبانوں سے بھی واقف تھا۔ فرشتہ کے مطابق وہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں سے تو خوب واقف تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ وہ تلنگی، کنڑی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی کے علاوہ کئی اور زبانیں بھی جانتا تھا۔ ان سے انہیں کی زبانوں میں بلا تکلف گفتگو کرتا تھا۔ اہل علم کے ساتھ وہ بے تکلفی سے ملتا تھا۔ وہ شام کا ایک حصہ اس لئے مخصوص رکھتا تھا کہ شعراء، اہل علم، داستان گو وغیرہ سے گھل مل کر بات چیت کر سکے۔ اس کی فضیلت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ تعمیر عامہ کے سلسلہ میں اس نے جو کام کئے ان میں دولت آباد کے قریب پہاڑی میں 1408ء میں بالا گھاٹ کے نام سے ایک رصدگاہ کی تعمیر تھی، جس کے لئے سید محمود گرزونی اور حکیم حسن گیلانی کو مامور کیا تھا۔

سیاسی صورت حال

فیروز شاہ نے تقریباً پچیس سال حکومت کی اور یہ مدت اس نے ہمسایہ حکومتوں مثلاً وجے نگر، کھیرلا، تلنگانہ سے کشمکش میں صرف کی۔ کھیرلا کے راجا شمال سے اور وجے نگر کے رائے جنوب سے حملہ آور ہوئے۔ فیروز شاہ نے پہلے وجے نگر کے رائے سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور کھیرلا کی مہم کو ملتوی کیا۔ شہزادہ وجے نگر بکا نے فیروز شاہ سے مقابلہ کے لئے بہت بڑی فوج تیار کی تھی جس میں 80,000 تیرانداز اور بندوقچی تھے۔ اس نے تنگ بھدرا ندی کو پار کر کے موگل، رائچور اور دوآبہ کے دوسرے بہمنی مقبوضات پر چڑھائی کر دی۔ اس کے مقابلہ کیلئے فیروز شاہ نے فوج بھیجی لیکن وہ زمانہ بارش کا تھا اور کرشنا ندی سیلاب پر تھی، جس کو عبور کرنا دشوار تھا ایسی صورت میں فیروز شاہ کے ساتھیوں میں سے ایک قاضی سراج تھا جو چند آدمیوں کے ساتھ دریا عبور کر کے اور وجے نگر کی کچھ طوائفوں کے ساتھ شاہی کیمپ میں گھس گیا اور جیسے ہی ناچ گانا شروع ہوا اور شاہزادہ اور اس کے ساتھی شراب کے نشے میں مست ہوئے، قاضی سراج شہزادہ پر حملہ آور ہوا اور قتل کر ڈالا۔ اسی دوران فیروز شاہ نے اپنے چار ہزار سپاہی گھوڑوں کو روانہ کیا اور صبح ہوتے ہی خود بھی دریا پار کر کے وجے نگر کی فوج کا تعاقب کیا۔ دونوں میں معاہدہ ہوا اور دس لاکھ ہن شاہی خزانہ میں جمع کیا گیا۔

وجے نگر کی کامیابی کے بعد فیروز شاہ کھیرلا کی طرف روانہ ہوا لیکن جب وہ ماہور پہنچا تو وہاں کے حاکم مقدم نے جو کھیرلا کا حکمران نرسنگھ کا ساتھ دیتا تھا، معافی مانگی اور خراج کی پیش کش کی۔ فیروز شاہ نے نرسنگھ کو بھی خراج دینے کو کہا مگر اس نے نفی میں جواب دیا۔ دونوں فوجوں کے بیچ بہت سخت لڑائی ہوئی۔ نرسنگھ کے لڑکے کوشل سنگھ کو قید کر لیا گیا۔ نرسنگھ کھیرلا کے قلعہ میں چھپ گیا۔ فیروز شاہ نے قلعہ کا محاصرہ کیا کچھ عرصہ کے محاصرہ کے بعد نرسنگھ نے ہتھیار ڈال دئے اور خراج دینے پر راضی ہو گیا اور اپنی بیٹی کو شاہی خادم کے طور پر دیا۔

کھیرلا کی مہم کے بعد فیروز شاہ تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے راجا سندری کو شکست دی لیکن بارش کی وجہ سے فیروز شاہ کو پوری کامیابی نہیں ملی اور مقامی سرداروں کو پورے طور پر زیر کئے بغیر ہی واپس لوٹنا پڑا مگر یہ سردار خراج کی رقم دیتے رہے۔

بہمنی سلطنت اور تیمور کے ساتھ اچھے تعلقات تھے فیروز کو جب یہ خبر ملی کہ تیمور ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے تو اس نے اپنا پیغام اور تحائف بھیجے۔ پیغام یہ تھا کہ اگر تیمور کا قصد دہلی پر حکومت قائم کرنے کا ہے تو وہ خود حاضر ہو کر اسے سلامی دے۔ اس کے جواب میں تیمور نے فیروز کو ایک فرمان بھیجا جس میں اسے اپنا لڑکا کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے دکن کی سلطنت کے قبضہ کی تصدیق کی جس میں گجرات اور مالوہ بھی

شامل تھا۔ اگر چہ یہ دونوں فیروز کی دسترس سے باہر تھے۔

محمد گیسودراز

فیروز شاہ کے عہد میں چشتیہ سلسلہ کے مشہور و معروف صوفی سید محمد گیسودراز گلبرگہ آکر بس گئے۔ چونکہ گیسودراز کے والد محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد آئے تھے اس لئے دکن کے عوام پر ان کا بہت اثر تھا۔ گیسودراز قلعہ گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے مریدوں کے ساتھ ایک خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ گلبرگہ میں بہت جلد مریدوں کا ایک حلقہ تیار ہوگیا۔ فیروز شاہ نے ان کی اور مریدوں کی گزر اوقات کے لئے کئی گاؤں وقف کئے۔ لیکن گیسودراز نے فیروز شاہ کے ذہن پر جو اثر ڈالا تھا وہ جلد ہی ختم ہوگیا اور دونوں میں تناؤ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ فیروز شاہ نے انہیں محل شاہی سے دور چلے جانے کو کہا۔ اس پر گیسودراز گلبرگہ سے چند میل دور چلے گئے جہاں آج ان کا مزار و مقبرہ ہے۔

فیروز شاہ کی حکومت کا خاتمہ

فیروز شاہ نے اپنے کمسن بیٹے حسن شاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ چونکہ فیروز شاہ کی عمر 70 سال کی ہوگئی تھی اس لئے اس نے کم و بیش اپنے سارے اختیارات دو غلاموں کو سونپ دیئے تھے۔ ان دونوں غلاموں نے فیروز شاہ کو باور کرانا شروع کیا کہ احمد، جو فیروز شاہ کا بھائی تھا اور بڑی صلاحیت اور قابلیت کا مالک تھا علاوہ ازیں لوگوں میں مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ سید گیسودراز سے بھی اچھے تعلقات تھے اور وہ کہیں بغاوت نہ کردے لہٰذا اسے قتل کرادیا جائے فیروز اس پر تیار نہیں ہوا مگر کمزوری کی حالت میں اس تجویز پر راضی ہوگیا کہ احمد کو اندھا کردیا جائے۔ احمد کو اس سازش کا پتہ چلا تو اس نے فوج جمع کی اور فیروز شاہ پر حملہ بول دیا۔ فیروز شاہ بھی آگے بڑھا مگر ضعف کی وجہ سے بغیر لڑے ہی میدان جنگ میں بے ہوش ہوگیا۔ لوگوں نے احمد کو اپنا نیا بادشاہ قبول کرلیا۔ فیروز شاہ جب ہوش میں آیا تو اس نے بھی اپنی غلطی کا اقرار کیا اور احمد کی بادشاہت کو قبول کیا، اس کی کمر میں تلوار باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھادیا۔

معلومات کی جانچ

(1) فیروز شاہ کن علوم کا ماہر تھا اور کون کون سی زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا؟

(2) فیروز شاہ کے سیاسی احوال پر روشنی ڈالئے۔

(3) محمد گیسودراز کون تھے؟

9.6 احمد اول (1422-1436)

احمد اول نے حکومت سنبھالتے ہی اپنے دارالسلطنت کو 1424ء میں گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا۔ ہارون خان شیروانی نے دکن کے بہمنی سلاطین میں دارالسلطنت کی تبدیلی کی کئی وجوہات گنائی ہیں:

(1) فیروز شاہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا مگر احمد اول جنگ سے حکومت پر قابض ہوا۔

(2) سید گیسودراز کے انتقال کے بعد احمد کو محسوس ہوا کہ اب گیسودراز کے مریدوں کی مدد نہیں ملے گی۔

(3) بیدر کا علاقہ زیادہ زرخیز تھا۔

(4) بیدر دکن کے تقریباً کنارے واقع تھا اور زیادہ محفوظ تھا اور اس کے علاوہ دور دراز گلبرگہ کے مقابلہ میں بیدر نئی سلطنت کے درمیان میں واقع تھا۔

سیاسی حالات

1422ء میں احمد اول نے تخت سنبھالتے ہی اپنے دوست و دشمن دونوں سے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنے دوست خلف حسن بصری کو جس نے اس کی جان بچائی تھی سلطنت کا وزیر اعظم بنادیا۔ اسی کے ساتھ اپنے مخالفین میں عین الملک ہوشیار اور نظام الملک بیدار کو جو فیروز شاہ کے غلام اور مشیر کار تھے کو بھی اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ فیروز شاہ کے بیٹے حسن کو بھی 500 کا منصب اور ایک جاگیر دی۔ اس کے علاوہ احمد اول نے منصب داری کے طریقے کو منظم کردیا اور سرلشکر کو 2000 کا منصب دیا، امیر الامراء کو 1500، وکیل کو 1200 اور دوسرے امراء کو 100 سے 1000 تک کا منصب دیا۔

وجے نگر اور تلنگانہ

فیروز شاہ کے آخری زمانے میں وجے نگر نے بہمنیوں کو جو شکست دی تھی اس کا بدلہ لینے کے لئے احمد اول نے تخت نشینی کے بعد ہی چالیس ہزار سواروں کی زبردست فوج لے کر وجے نگر کی طرف بڑھا۔ بکّا نے جو وجے نگر کا حکمران تھا یہ محسوس کیا کہ اس میں تنہا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے چنانچہ اس نے تلنگانہ کے راجا سے مدد مانگی۔ بہمنی اور وجے نگر کی فوجوں کا مقابلہ تنگ بھدرا کے کنارے ہوا۔ وجے نگر کے پاس اگرچہ پیادہ فوج، توپ خانہ اور تیر اندازوں کی تقریباً دولاکھ فوج تھی مگر انہوں نے چھاپا مار جنگ کا فیصلہ کیا اور روزرات کو بہمنی کیمپ پر حملہ کر کے بہت سے آدمی اور گھوڑے مار ڈالے۔ کچھ دنوں کے انتظار کے بعد احمد اول نے 2000 توپ گاڑیاں لے کر تنگ بھدرا کو پار کیا لیکن باضابطہ کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ وجے نگر کی فوج اور پیچھے ہٹ گئی اور اپنا علاقہ احمد کی فوج کو تاراج کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اسی دوران ایرانی نوروز کے دن احمد بطور تفریح ایک جھیل کے کنارے شکار کھیلنے نکلا اور اصل کیمپ سے آٹھ میل دور چلا گیا جہاں اسے دشمنوں کے پانچ چھ ہزار فوجیوں نے گھیر لیا۔ جنگ شروع ہوئی احمد کے دوسو ہمراہی مارے گئے مگر وہ خود اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ دوسری طرف احمد کے غائب ہونے کی وجہ سے بہمنی کیمپ میں کھلبلی مچ گئی اور ایک اعلیٰ افسر عبدالقادر نے دو تین ہزار فوج لے کر اسی سمت چلا جدھر احمد تھا۔ وجے نگر اور بہمنی افواج کے بیچ جنگ ہوئی۔ بہمنیوں کو غلبہ ہوا اور احمد اول کی جان بچی۔ اس کے بعد سلطان احمد اول نے خود وجے نگر پر چڑھائی کی اور بکّا سے بقایا خراج بھی وصول کیا۔

ماہور

وجے نگر اور تلنگانہ کی مہمات کے بعد 1426ء میں چونکہ تلنگانہ کے راجا نے وجے نگر کی مدد کی تھی اس لئے احمد اول اسے سزا دینا چاہتا تھا اور 1425ء میں تلنگانہ پر چڑھائی کی دونوں فوجوں کے بیچ جنگ ہوئی اور تلنگانہ کا حاکم انا پوتا دوم مارا گیا۔ احمد اول کا تلنگانہ پر قبضہ ہوا اور خان

اعظم کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ احمد اوّل ماہور کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا جس پر ایک مقامی رئیس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ احمد اول جب فوج لے کر پہنچا تو وہ ماہور کے جنگل میں بھاگ گیا اور چھاپا مار جنگ شروع کی، جس میں احمد اول کو شکست ہوئی مگر ملک کو تاراج کر دیا۔ اگلے سال احمد اول نے پھر ماہور پر چڑھائی کی لیکن اب بھی اسے کامیابی نہیں ملی اور واپس لوٹنا پڑا۔ تیسری بار احمد اول نے پھر حملہ کیا اور اس بار اسے کامیابی ملی۔ اس مہم میں اس نے خاص طور پر بڑی سختی کی اور رئیس کو فوراً قتل کرا دیا۔

مالوہ

احمد اول آمد و رفت کا راستہ صاف کرنے کے لئے مالوہ، خاندیش اور گجرات پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کھیرلا کی ریاست مالوہ اور دکن کے درمیان میں واقع تھی، اور کھیرلا کے حکمران نرسنگھ نے فیروز شاہ کے عہد میں بہمنیوں کی باجگزاری قبول کر لی تھی مگر جب اسے احمد کے قبضہ کرنے کے ارادہ کا اندیشہ ہوا تو نرسنگھ مالوہ کے حاکم ہوشنگ شاہ سے جاملا اور احمد کے ارادوں اور اس کے فوجی مہم کے متعلق اسے بتایا۔ ہوشنگ اپنی حفاظت کے لئے تیزی سے 20,000 کی فوج لے کر کھیرلا پہنچ گیا۔ احمد کے پاس چونکہ فوج کی تعداد کم تھی اس لئے وہ اپنے حدود میں لوٹ آیا اور مصالحت کا راستہ نکالا کہ آپس میں جنگ کرنے سے اعراض کرنا چاہئے لیکن ہوشنگ شاہ بہمنیوں کی طرف بڑھتا آیا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں بہت خونریز جنگ ہوئی اور آخر کار احمد کو مالوہ کی فوج پر غلبہ حاصل ہوا، ہوشنگ شاہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ احمد شاہ نے مالوہ پر قبضہ کیا اور اپنے لڑکے کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔

ولی عہدی

احمد اول نے اپنی حکومت کے آخری سال میں اپنے سب سے بڑے لڑکے علاء الدین ظفر خان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اسے خود اپنی زندگی میں سلطنت کا پورا اختیار دے دیا اور اپنے دوسرے لڑکوں کو مختلف صوبوں کا گورنر مقرر کیا اور سب سے حلف لیا کہ وہ کسی حال میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہونگے۔

اخلاق و کردار

احمد اول نے بڑے بیٹے کی جانشینی کا قانون بنا کر سلطنت کی بنیاد کو پورے طور پر مضبوط کر دیا تاکہ جانشینی کو لے کر کبھی آپس میں جنگ نہ ہو۔ اس کا عہد حکومت انصاف اور مساوات برتاؤ کے لئے مشہور تھا اور اپنے سابقہ دشمنوں سے اس کا فیاضانہ سلوک ایک نمایاں خوبی ہے۔ اس نے وجے نگر کے ولی عہد کا استقبال شاہانہ انداز سے کیا۔ کھیرلا کے نرسنگھ کو شکست دینے کے بعد اسے عہدے پر برقرار رکھا۔ اپنی حکومت کے آخری سال اس نے تلنگانہ کی شورش کو فرو کرنے کے بعد تقریباً تمام مفتوحہ قلعے ان کے سابقہ مالکوں کو واپس کر دئے۔

وہ ایک نیک دل اور خدا ترس انسان تھا اور آج تک دکن کی بہت بڑی اکثریت اسے ولی سمجھتی ہے۔ اس کے عہد میں بیدر ایران، عراق اور عرب کے ہر حصہ کے ذی علم اور متقی لوگوں کا گہوارہ بن گیا۔ احمد خود بھی صاحب علم اور فن موسیقی کا ماہر تھا۔ وہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا، خاص کر جب دکن میں قحط پڑا تو اس نے رعایا کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔ ایک مصری عالم ابوبکر بن عمر الحخزومی نے احمد اول کی بہت تعریف لکھی ہے۔ وہ ان دنوں وہیں تھا وہ لکھتا ہے کہ وہ گلبرگہ اس لئے آیا کہ اس نے اس عظیم شہر کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اس کی تصدیق کرے اور جو سلطان اس ملک پر حکمران ہے اور جس کا ملک غیر میں اس قدر شہرہ ہے اس کی حقیقت معلوم کرے۔ اس کا بیان ہے کہ بادشاہ ہر خاص و عام

میں بہت ہردل عزیز تھا اور اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو بادشاہ کا دشمن ہو۔ سلطان کو بہادر، باوقار اور دوسروں کی مدد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ ملک کے اندر اس کی نرم پالیسی اور بیرون ملک سے دوستانہ تعلقات کے نصب العین نے بہمنی سلطنت کو معزز اور قابل احترام بنا دیا تھا۔

معلومات کی جانچ:

(1) احمد اول نے اپنی دارالسلطنت کو کہاں منتقل کیا؟

(2) احمد اول کے کردار پر روشنی ڈالئے۔

(3) احمد اول نے ولی عہدی کا کیا نظام بنایا؟

9.7 علاء الدین احمد دوم (1436-1458)

احمد اول کے انتقال کے بعد علاء الدین ظفر خان تخت نشین ہوا اور علاء الدین احمد کا لقب اختیار کیا۔ اس کو کئی مہمیں نہ صرف وجے نگر اور تلنگانہ کی ہندو سلطنتوں کے خلاف بلکہ گجرات، خاندیش اور مالوہ کی مسلم حکومتوں کے خلاف بھی کرنی پڑیں۔

محمد خان کی بغاوت

وجے نگر سے پہلی لڑائی 1436ء میں خراج کی رقم ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ حصول خراج کے لئے علاء الدین احمد دوم نے اپنے بھائی محمد خان کو بھیجا۔ محمد خان اس مہم میں کامیاب ہوا۔ اس کامیاب مہم نے اسے سلطان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا کیونکہ اس کی فوج کے کچھ افسروں نے اسے بہکایا کہ اس کے والد کی یہ وصیت تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حکومت کرے لیکن اس کے بھائی نے اسے دوسرے درجے کے کام میں لگا دیا، اس لئے یہ بالکل حق بجانب ہے کہ وہ سلطنت کی تقسیم کا مطالبہ کرے کہ اسے نصف سلطنت دی جائے اور کوئی فیصلہ اس کی رضامندی کے بغیر نہ کیا جائے۔ محمد خان ان کی چال میں پھنستا چلا گیا اور بغاوت کر کے مدگل، رائچور، شولاپور کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور کرشنا ندی کے کنارے ایک مقام پر اپنے سر پر تاج بھی رکھ لیا۔ یہ خبر سنتے ہی علاء الدین احمد دوم فوج لے کر روانہ ہوا اور محمد خان کو شکست دی۔

خسر ناصر خان سے جنگ

محمد خان کو شکست دینے کے بعد علاء الدین احمد دوم نے اپنے وزیر اعظم دلاور خان کو سنگ میشور اور رانیل کے راجاؤں کے خلاف فوج دے کر روانہ کیا۔ دلاور خان کو جلد ہی کامیابی مل گئی اور وہ سنگ میشور کی حسین لڑکی کو لیکر واپس ہوا، جس کے ساتھ سلطان احمد دوم نے شادی کر لی اور اسے زیبا چہرہ کا خطاب دیا جس کی وجہ سے اسے اپنے خسر ناصر خان سے جو خاندیش کا حکمران تھا، جنگ کرنی پڑی۔ ناصر خان کو گجرات کے احمد شاہ اور گونڈوانہ کی فوجی امداد حاصل تھی اس لئے سلطان علاء الدین کو متحدہ افواج پر غلبہ پانا مشکل تھا۔ شروع میں علاء الدین احمد دوم کو شکست ہوئی مگر اس کے مشیر خلف حسن کے مشورہ پر فوج کو دو حصوں میں یعنی دکنی اور غیر دکنی (Native and Non-Native) میں منقسم کر کے دو طرف سے حملہ کروایا اور ناصر خان کو شکست دی۔

تلنگانہ، مالوہ، خاندیش اور وجے نگر کی مہمات کے بعد سلطان علاء الدین کا عہد پر امن رہا۔ وہ ہر کسی کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرتا تھا

اور سلطنت کے معاملات میں سرگرمی کے ساتھ دل چسپی لیتا تھا اس نے نظم وقانون کے نفاذ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ذی علم لوگوں کو نظام سلطنت میں شامل کیا۔ اس نے جوا، شراب نوشی اور زنا کاری جیسے جرائم کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھا خطیب بھی تھا اور دار السلطنت کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن تقریر بھی کیا کرتا تھا۔

9.8 ہمایوں شاہ (1457-1461)

ہمایوں کو عام طور پر ظالم کہا گیا ہے، فرشتہ نے اس کا خاکہ بدترین رنگ میں کھینچا ہے اور سنگین ترین جرائم اس سے منسوب کیے ہیں۔ فرشتہ کے مطابق اس نے تمام بندشوں کو پس پشت ڈال دیا وہ اپنی رعایا کے بچوں کو ان کے والدین کی گود سے چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا تھا۔ وہ اکثر سڑک پر برات کو روک لیتا تھا اور لہن کو چھین کر اس سے لطف اندوز ہوتا اور پھر اسے گھر بھیج دیتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اپنے محل کی عورتوں کو معمولی سے معمولی قصور پر قتل کر دیتا تھا اور اگر کسی امیر کو اس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تو وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر جاتا جیسے وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ ''دکن کے بہمنی سلاطین'' میں ہارون خان شیروانی نے لکھا ہے کہ ہمایوں معمولی طرز کا بہمنی حکمران تھا مگر اس کے ساتھ نظم وضبط کا بڑا خیال رکھنے والا تھا۔ دکنی اور غیر دکنی باشندوں میں توازن قائم کرنے میں کوشاں رہتا تھا اور اپنی حکومت کو حتی الامکان پر امن رکھنا چاہتا تھا یہ قابل لحاظ بات ہے کہ اس کے پورے عہد حکومت میں ایک بھی مہم حدود سلطنت کے باہر نہیں پیش آئی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بجائے دوسروں کے خلاف جارحانہ کاروائی کے خود اپنی سلطنت کو مستحکم کرنا چاہتا تھا لیکن اندرونی ہنگاموں نے اس کے تمام قابل تعریف منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم نے اس کی شہرت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ ہمایوں کا انتقال 1461ء میں ہوا، اسے سوتے میں کسی خادمہ نے قتل کر دیا۔

9.9 نظام الدین احمد سوم (1461-1463)

ہمایوں کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا احمد آٹھ سال کی عمر میں نظام الدین احمد شاہ سوم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ہمایوں نے اپنے عہد میں ہی ایک مجلس ولایت مقرر کر دی تھی جس کے اراکین خواجہ جہاں ترک، ملک التجار محمود گاواں اور مادر ملکہ مخدومہ جہاں بیگم تھے اور مادر ملکہ کو آخری رائے کا حق تھا۔ اس کے عہد میں محمود گاواں کو عمدۃ الملک اور وزیر کل اور طرفدار بیجاپور بنا دیا گیا اور خواجہ جہاں ترک کو وکیل اور طرفدار تلنگانہ۔ یہی تینوں حکومت کے منتظمین تھے۔ حکومت کا آغاز لوگوں کی عام معافی سے ہوا جنہیں ہمایوں نے سیاسی قصور یا فرقہ واری رجحان کی بنا پر قید کیا تھا اور دوسری طرف ان لوگوں کی سرپرستی کی گئی جو علم وفن یا سلطنت کی خدمت میں ممتاز تھے۔

بادشاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھا کر اڑیسہ کے حکمران کپلیشور اور مالوہ کے حکمران محمود خلجی حملہ آور ہوئے۔ کپلیشور اپنے تلنگانہ کے اتحادیوں کے ساتھ دار السلطنت سے دس میل کے فاصلہ کے اندر تک بڑھ آیا اور بہمنی سلطنت سے خراج کا بھی مطالبہ کر دیا۔ نظام الدین احمد سوم نے اپنی فوج اس کے خلاف بھیجی اور شکست دی اور اس سے پانچ لاکھ نقرئی ٹنکہ تاوان جنگ وصول کیا۔ دوسرا حملہ مالوہ کے حکمران محمود خلجی نے خاندیش کے فاروقی حکمران اور اڑیسہ کے کپلیشور کے ساتھ مل کر کیا اس نے برار اور دولت آباد کے سبھی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات میں محمود گاواں نے گجرات کے حکمران محمود سے مدد طلب کر محمود خلجی پر حملہ آور ہوا اور شکست دی۔

معلومات کی جانچ

(1) احمد دوم کے بھائی محمد خان نے کیوں بغاوت کی؟

(2) ہمایوں شاہ کون تھا؟

(3) احمد دوم نے اپنے خسر ناصر خان سے کیوں جنگ کی؟

9.10 شمس الدین محمد سوم 1463-1482

شمس الدین محمد سوم جس وقت تخت نشین ہوا اس وقت اس کی عمر 9-10 سال کے درمیان تھی۔ محمد سوم بہمنی سلاطین کا سب سے زیادہ باکمال حکمران تھا۔ حکومت سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد خواجہ جہاں ترک اپنے خودسرانہ طرز عمل کی وجہ سے قتل کردیا گیا۔ خواجہ جہاں کے قتل کے بعد سلطان شمس الدین محمد سوم نے محمود گاوان کو اپنا وزیراعظم مقرر کیا اور اسے سلطنت کے تمام صوبے سپرد کئے اور تمام ادنیٰ واعلیٰ معاملات کا اختیار دیا۔ اسے نہ صرف خواجہ جہاں کا خطاب دیا گیا بلکہ سرکاری کاغذات میں آقائے ساکنان عالم، معتمد قصر شاہی اور نائب السلطنت لکھا جانے لگا۔

محمود گاوان

محمود گاوان کی وزارت عظمیٰ میں بہمنی سلطنت نے وہ عروج حاصل کیا جو اس کی پوری تاریخ میں کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کے عہدوزارت میں خالص کلچرل کامیابی ہی نہیں ہوئی بلکہ اس نے کونکن علاقے کو گوا تک فتح کیا اور مشرق میں گوداوری کرشنا دوآبہ کو سلطنت میں شامل کرکے سلطنت کی سرحدوں کو وسیع کردیا اور اڑیسہ کے اندرونی حصے کانچی تک اور کارومنڈل کے ساحل پر کامیاب مہمات کیں۔ اس طرح بہمنی سلطنت کی حدود پہلی مرتبہ سمندر تک پہنچ گئیں اور مالوہ، اڑیسہ اور وجے نگر کے حوصلوں کو کچھ دنوں کے لئے پست کردیا۔

اس نے کونکن کے ہندو مخالفین کا خاتمہ کیا اور 1471ء میں سنگ میشور کے حکمران کو اپنا باجگزار بنایا۔ مالوہ کے حاکم محمود خلجی کو بھی شکست دی۔ 1472ء میں گوا پر قبضہ کیا۔ گوا جو وجے نگر کا حفاظتی علاقہ تھا اور مغربی سمندری کنارے کی سب سے مشہور بندرگاہ تھی۔ 1473ء میں اس نے بیلگام کو فتح کرنے کے بعد مغربی سمندری ساحل پر مکمل قبضہ کرلیا۔ مورخوں کا ماننا ہے کہ محمود گاواں کا اہم کارنامہ دابھول اور گوا سمیت سبھی مغربی علاقوں پر بالادستی اختیار کرنا تھا جس کے وجہ سے ایران اور عراق سے سمندری تجارت میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ 1470ء میں اڑیسہ کا حکمران کپلیشور گجپتی کے انتقال کے بعد جانشینی کو لے کر خانہ جنگی ہوئی جس میں محمود گاوان نے ہم ویر کا ساتھ دیا اور اسے تخت نشین کرانے میں کامیاب ہوا لیکن منگل رائے اسے گدی سے ہٹا کر خود تخت نشین ہوگیا اور پرشوتم گجپتی کا لقب اختیار کیا۔ اس نے سمندری ساحل کے کھیلنا اور سنگ میشور کے مقامی سرداروں کو شکست دی۔ چنانچہ ہم ویر نے اپنی سلطنت واپس لینے کے لئے بہمنی سلطان سے مدد کی درخواست کی۔ محمود گاوان نے ایک فوجی دستہ ملک حسن کی سربراہی میں اس کی مدد کو بھیجا جس کی مدد سے ہم ویر نے منگل رائے کو اڑیسہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ ملک حسن نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ سلطان کی ایما پر آگے بڑھ کر راجہ سندری کو اور کونڈاویڈو کے عظیم قلعہ کو بھی فتح کرلیا۔ لیکن

77-1478ء میں بہمنی اوراڑیسہ کے بیچ دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ ایک بہمنی افسر بھیم راج نے بغاوت کر کے کونڈ پلی پر قبضہ کرلیا اور پرشوتم گجپتی کو بہمنی علاقوں پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ لیکن محمد گاوان کے سیاسی اقدامات کی وجہ سے پرشوتم ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔

نظم ونسق

محمود گاوان ایک ہوشیار سیاست داں تھا اس نے ملکی اور غیر ملکی دونوں کے درمیان صرف توازن ہی برقرار نہیں رکھا بلکہ ہندو آبادی کی ہمدردی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی اور فرقہ واریت کو ختم کیا۔ اس نے ملکی نظم ونسق کو درست کیا۔ محمود گاوان کے عہد وزارت میں سلطنت میں غیر معمولی وسعت ہوئی۔ بہمنی سلطنت نہ صرف مغرب میں کونکن کے سارے ساحلی علاقے بلکہ جنوب میں گوا، مشرق میں آندھراپردیش کی آخری حد تک اور جنوب میں تنگ بھدرا کے علاقے تک پھیل گئی۔ اب تک یہ وسیع علاقے صرف چار صوبوں میں منقسم تھے۔ جس سے مرکزی حکومت پر برے اثرات پڑنے لگے کیوں کہ ہر صوبہ کا طرفدار (والی) عملی طور پر چھوٹا بادشاہ ہوگیا تھا جو کبھی کبھی مرکزی احکام کی خلاف ورزی بھی کرتا تھا۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے محمود گاوان نے سلطنت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا۔ یہ آٹھوں صوبے گاویل، ماہور، دولت آباد، گلبرگہ، بیجاپور، جنیر، راجہ سندری اور ورنگل تھے۔ ہر صوبے کے لئے نئے گورنر منتخب کئے گئے اس کے علاوہ کچھ حصہ الگ کر کے براہ راست بادشاہ کی ماتحتی میں رکھا جس سے گورنروں کے اپنے علاقہ کے اختیارات پر مستحکم روک ہوگئی۔ علاوہ بریں محمود گاوان نے فوجی نظام میں انقلابی تبدیلی کی۔ اس نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ ہر صوبہ دار کی ماتحتی میں صرف ایک قلعہ ہوگا اور باقی سب قلعوں کے قلعہ دار یا کمانڈر براہ راست مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر ہوں گے اور مرکز ہی کو جواب دہ ہوں گے۔

ان ملکی اور فوجی اصلاحات کے علاوہ محمود گاوان پہلا وزیر تھا جس نے زمین کی باضابطہ پیائش کرائی، شہر اور گاؤں کی حدبندی کی اور مالگزاری کی تشخیص کی۔ اس طرح ایک طرف تو اس نے سلطنت کے مالی تعین میں آسانی پیدا کردی اور دوسری طرف اس نے امراء کے اختیارات کی حدبندی کردی جس سے مرکز میں بادشاہ کی حکومت کی حیثیت مزید بڑھ گئی اور گورنروں کے بغاوت کے امکانات کم ہوگئے۔

علم وعلماء کی سرپرستی

محمود گاوان علم اور علماء کا بہت بڑا قدر دان تھا جس کی وجہ سے دکن کے بیرونی دنیا سے بہت گہرے کلچرل روابط ہوگئے تھے۔ وہ خود بھی بلند پائے کا عالم تھا اور اپنے عہد کا ممتاز ترین فارسی انشاپرداز سمجھا جاتا تھا۔ اس نے دارالسلطنت بیدر میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی جس کی عمارت نہایت بارعب انداز میں تین منزل کی بنی تھی اور رنگین کھپروں سے مزین تھی اس میں روشنی اور ہوا کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ طالب علموں کو کتابوں کے علاوہ کھانا و کپڑے بھی مفت ملا کرتے تھے۔ محمود گاوان کی کوششوں سے اس وقت کے مشہور ترین علم وفن کے ماہر نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران وعراق کے ممتاز ترین افراد کا تعلق اس دارلعلوم سے تھا۔ اس نے اپنے عہد کے اعلیٰ ترین اصحاب علم جیسے مولانا نورالدین جامی، مشہور ایرانی عالم جلال الدین دوانی، شیخ صدرالدین، عبدالرحمٰن وغیرہ کو دکن بلانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دارالعلوم کی اصل عمارت 1696ء میں اورنگ زیب کے عہد میں بارودوں کے ایک ذخیرہ میں آگ لگ جانے کے سبب گرگئی تھی۔

محمود گاوان کے خلاف سازشیں

محمود گاوان نے جو انتظامی اصلاحات کی تھیں وہ گورنروں اور اس کے دشمنوں کو سخت ناگوار گزری تھیں اور وہ لوگ ہمیشہ بادشاہ کے کان بھرا کرتے تھے۔ محمود گاوان جب سلطان کے ساتھ وِجے نگر کی مہم پر تھا تو اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر اس کے مخالفین نے سازش رچی اور محمود گاوان کے محرر کو جواہرات وگھوڑے وغیرہ کے تحفوں سے لاد دیا اور اسے شراب پلا کر ایک سادہ پرچہ پر محمود گاوان کی مہر لگوالی۔ اب اس سادہ پرچہ پر ایک خط اڑیسہ کے پرشوتم کے نام بنایا گیا جس میں پرشوتم کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سازش میں بادشاہ بھی آ گیا اور محمود گاوان کا سر قلم کروادیا۔

معلومات کی جانچ

(1) عہد شمس الدین پر نوٹ لکھیے۔

(2) محمود گاوان کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

(3) محمود گاوان نے نظام حکومت میں کیا کیا تبدیلیاں کیں؟

9.11 شہاب الدین محمود شاہ (1482-1518)

شمس الدین محمد سوم کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین محمود شاہ جانشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر 12 سال تھی اسی وجہ سے حکومت کی باگ ڈور نظام الملک کے ہاتھوں میں تھی جو محمود شاہ کا وزیر اعظم بھی تھا۔ شروع کے چار سال حکومت کا سیاہ وسفید کا مالک نظام الملک بنا رہا۔ اس دور میں ملکی دکنیوں کو کافی اہمیت دی گئی اور شہر کی ترکی آبادی کو ختم کرنے کا فیصلہ لیا گیا اور شہر کے پھاٹک اندر سے بند کر کے ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت کا نظم ونسق چار سال تک چلتا رہا لیکن 1486ء میں سلطان محمود نے ان حالات سے چھٹکارہ پانے کیلئے نظام الملک کو تلنگانہ مہم پر بھیج کر قتل کرا دیا اور حالات پر قابو پانے کے لئے سلطان نے اپنا جھکاؤ غیر ملکی دکنیوں کی طرف کیا۔ جس سے ملک کے حالات اور خراب ہوئے اور دکنیوں نے سلطان کو قتل کرنے کی سازش کی۔ 1487ء میں دکنیوں نے محل میں سلطان پر حملہ بول دیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس واقعہ کے بعد سلطان محمود نے دکنیوں کے قتل عام کا حکم دیا اور انکی جائداد کو ضبط کرالیا۔ یہ قتل عام تین دن تک جاری رہا لیکن یہ قتل عام اس کے زوال کی وجہ بنا کیونکہ جان بچ جانے کی خوشی میں سلطان نے چالیس دن تک جشن منانے کا حکم دیا اس کے بعد محل میں جو شراب نوشی اور رنگ رلیوں کا دور چلا اس سے حکومت کا نظام نہ صرف محل کے اندر متاثر ہوا بلکہ شہری آبادی بھی متاثر ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقی بے راہ روی کی تمام بندشیں ختم ہوگئیں۔

اس وقت سلطنت کے مختلف گورنروں اور جاگیرداروں نے محسوس کیا کہ حکومت سخت بے حسی کی حالت میں پہنچ گئی ہے اور یہ خیال کر کے کہ سلطنت کا زوال قریب ہے اپنا اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے پہلے جس نے سر اٹھایا وہ قاسم برید تھا جس کے پاس قندھار اور اوسا کی جاگیر تھی۔ سلطان محمود نے جب یہ سنا تو اپنی فوج بھیجی جسے قاسم برید نے شکست دی اور سلطان محمود کا وزیر اعظم بن گیا اور سبھی

سیاہ وسفید کا مالک ہوگیا۔

1518ء میں سلطان شہاب الدین محمود کا انتقال ہوا اور بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، کیونکہ اس کے انتقال پر تمام جاگیرداروں نے شاہی لقب اختیار کرلئے اور بہمنی حکومت پانچ حصوں میں منقسم ہوئی اور پانچ آزاد حکومتیں قائم ہوئیں جو بعد میں سلطنت بیجاپور، سلطنت احمد نگر، سلطنت برار، سلطنت گول کنڈہ اور سلطنت بیدر کے نام سے مشہور ہوئیں۔

9.12 بہمنی حکومت کا خاتمہ

سلطان شہاب الدین وزیر اعظم قاسم برید اور اس کے بیٹے امیر علی برید کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھا۔ 1518ء میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند احمد (1518 سے 1521)، علاء الدین (1521)، ولی اللہ (1521۔1524) اور کلیم اللہ یکے بعد دیگرے حاکم بنے۔ کلیم اللہ بہمنی سلطنت کا آخری حکمران تھا اس نے اپنی حکومت کو بچانے کے لئے مغل حکمران بابر سے مدد طلب کی مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ 1526ء میں کلیم اللہ کا انتقال ہوا اور اسی کے ساتھ بہمنی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

معلومات کی جانچ:

(1) بہمنی سلطنت کا آخری حکمران کون تھا؟

(2) شہاب الدین محمود شاہ کے عہد میں گورنروں نے کیوں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا؟

9.13 بہمنی سلطنت کا نظم ونسق

مرکزی نظام حکومت:

سلطان: سلطان حکومت کا اہم مرکز تھا وہ حکومت کے سیاہ وسفید کا مالک ہوتا تھا۔ گرچہ وہ اپنے فیصلہ میں آزاد تھا مگر حکومت کا نظام آٹھ وزرا کی مدد سے چلتا تھا جو حسب ذیل ہیں۔

(1) **وکیل السلطنت:** یہ وزیر اعظم کا عہدہ تھا سلطان کے سارے فرمان اسی کے ذریعہ نافذ کئے جاتے تھے وہ حکومت کی مہر کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

(2) **امیر الجملہ:** یہ وزیر بیت المال تھا۔

(3) **وزیر اشرف:** یہ وزیر خارجہ تھا (Foreign Minister)

(4) **وزیر کل:** یہ نائب وزیر اعظم تھا جو وزراء کے کاموں پر نظر رکھتا تھا۔

(5) **پیشوا:** وزیر کل کا مددگار ہوتا تھا۔

(6) **ناظر:** وزیر بیت المال کا مددگار تھا۔

(7) **کوتوال:** یہ صاحب الشرطہ تھا اس کا کام سماج میں امن وامان قائم رکھنا تھا۔ یہ پولیس کا سربراہ اور شہر کا منصف ہوتا تھا۔

(8) **صدر جہاں:** یہ قاضی ہوتا تھا سلطان کی غیر موجودگی میں قاضی القضاۃ کا کام انجام دیتا تھا۔

صوبائی نظام حکومت

سلطنت کے ابتدائی دنوں میں حکومت کم وبیش فوجی قانون کے ماتحت رہتی تھی، لیکن محمد اول نے حکومت کو نیم فوجی بنیاد پر قائم کیا اس نے سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا جو برار، گلبرگہ، دولت آباد اور تلنگانہ تھا۔ ہر صوبہ میں ایک گورنر منتخب کیا جو طرفدار کہا جاتا تھا۔ ہر طرفدار اپنے صوبہ میں نظم ونسق کو قائم کرنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس کے اہم کاموں میں فوجی نگرانی، ٹیکس وصولنا اور اپنا نائب منتخب کرنا تھا۔

محمد شاہ سوم کے عہد میں سلطنت میں غیر معمولی توسیع ہوگئی تو محمود گاوان کے مشورہ سے سلطنت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم گیا۔ برار کو گاویل اور ماہور میں، گلبرگہ کو بیجاپور اور گلبرگہ، دولت آباد کو دولت آباد اور جنیر اور تلنگانہ کو راجہ سندری اور ورنگل میں تقسیم کیا گیا۔

اس کے علاوہ صوبوں کو مزید سرکار اور پرگنوں میں بھی تقسیم کیا گیا تھا اور ایک پرگنے میں بہت سے گاؤں ہوتے تھے۔

معلومات کی جانچ

(1) مرکزی حکومت کے اہم عہدوں کے نام لکھیے۔

(2) صوبائی نظام حکومت پر نوٹ لکھیے۔

9.14 تعمیرات وعلمی سرپرستی

تعمیرات

بہمنی حکمرانوں میں محمد اول نے تعمیرات کے کام میں کافی دلچسپی لی اس کے عہد کی تین بڑی یادگار عمارتیں ہیں۔ ایک تو گلبرگہ کی جامع مسجد، دوسری گلبرگہ میں ہی شاہ بازار مسجد اور تیسری عثمان آباد میں حضرت شمس الدین کا مزار۔ ان عمارتوں میں ترک وایرانی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ترک اور ایرانیوں نے ہندو اثرات سے دکن کے فن تعمیر کو بالکل بدل دیا اور نئے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی جو بعد میں دکنی طرز تعمیر کہلایا۔ محمد اول کے عہد کا خاص معمار رفیع تھا جس کا تعلق قزوین سے تھا۔ سلطان تاج الدین فیروز کا مقبرہ بھی اپنی فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس میں ہندو اثرات کا نفوذ بڑی حد تک نمایاں ہے یہ ایرانی، ہندو اور دہلوی اسکولوں کا امتزاج ہے۔ اس کے علاوہ فیروز نے دریائے بھیما پر ایک بڑا شہر تعمیر کیا۔ جس میں کشادہ اور سیدھی سڑکیں، خوبصورت دکانیں اور بازار ہیں اور دریا سے پانی محل کے اندر تک پہنچایا گیا ہے۔ اس شہر کی تعمیرات فن تعمیر میں اپنی آپ مثال ہیں جن کے انوکھے تعمیری منصوبے دکن کے باہر کہیں اور نہیں نظر آتے۔ اس کی اصلی خصوصیت گنبد اور مخروطی چھت کا ملا جلا استعمال ہے۔ شہر کے چار بڑے پھاٹک ہیں۔ دیوان خاص کے قریب حرم شاہی کے کمرے ہیں۔ مسافر خانہ، زنان خانہ کے محرابی کمرے، غسل خانے اور

مسجد۔اس عہد میں گنبد اور مخروطی میناروں کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ چھتوں پر نیچی دیواریں بھی بالکل نئے طرز کی ہیں اور کناروں پر چھوٹے چھوٹے مینار بنے ہیں۔

گلبرگہ کی ممتاز یادگاروں میں حضرت گیسودراز کا مقبرہ ہے اسی کے ساتھ ان کے فرزند سید اکبر حسینی کا مزار بھی ہے جو مخلوط ایرانی دکنی یا بہمنی فن تعمیر کا نمونہ ہے اس کے چار کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے گلدان ہیں اور اوپر ایک عظیم الشان گنبد ہے جس پر پیتل کے نقوش ہیں۔اس کی محرابیں سادی اور قریب قریب ہیں۔گلبرگہ کی ایک اور مسجد ہے جسے یہاں کے گورنر قلندر خان نے تعمیر کیا تھا۔اس میں پانچ محرابوں کی دوہری قطاریں ہیں اور چھت کے اوپر پانچ گنبد ہیں۔ان محرابوں کے ستون لمبے لمبے ہیں۔

بیدر میں ایک قلعہ ہے جس کی چھت کی رنگین کھپروں سے آرائش کی گئی ہے اس قلعہ کے پاس سولہ کھمبا مسجد ہے اس کی چھت سولہ بھاری کھمبوں پر کھڑی ہے اس مسجد کی دو خاص باتیں ہیں ایک تو مسجد میں پانی کا ذخیرہ چھت پر ہے اور دوسرے اُس مسجد کا ہر نمازی امام کو دیکھ سکتا ہے اور ہوا کھلی آمدورفت ہے۔ بیدر کا تخت شاہی محل اور اس کے متصل محلات بہت خوبصورت ہیں اس میں کئی بڑے بڑے وسیع ہال ہیں جو رنگین کھپروں سے مزین ہیں۔تخت محل جس میں کئی بہمنی حکمرانوں کی تخت نشینی ہوئی اس کی محرابیں بلند ہیں اور کھپروں سے آرائش کی گئی ہے، جس کے پاسنگ میں منقش سیاہ رنگ کی دھاریاں ہیں جو بیش قیمت ہونے کے علاوہ اعلیٰ ترین مذاق سلیم کی نشاندہی کرتی ہیں کمروں کے اندرونی حصوں کا نقشہ نہایت فنکارانہ ہے۔تخت محل کے مغرب اور مشرق دونوں طرف شیر اور اس کے پشت پر طلوع ہوتا ہوا آفتاب دکن کے فن پر ایرانی اثر کا مظاہرہ کرتا ہے۔شہر بیدر میں ان محلات کے علاوہ سلطان احمد شاہ کا مقبرہ ہے۔اس مقبرے کو باہر سے دیکھنے پر تین منزلیں معلوم ہوتی ہیں اور چاروں سمت داخلہ کے دروازوں پر جو محرابیں ہیں وہ بلند اور شاندار ہیں اس کے کناروں کے گلدان چھوٹے چھوٹے ہیں اور گنبد بیضوی ہے۔ مقبرے کے اندر کی آرائش خوش نویس مغیث شیرازی نے کی تھی جس نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت علیؓ کا نام سینکڑوں طرز سے لکھا ہے۔اس کے علاوہ شیعی درود بھی اس نے دل کش انداز میں لکھا ہے اس لئے اس میں ہمیں نمایاں طور پر شیعیت کا اثر نظر آتا ہے۔اس میں عربی خط کے کئی طرز مثلاً کوفی، طغرا، نسخ وغیرہ کے نمونے ہیں اور اس کے کتبے سنہرے اور قرمزی رنگ کے ہیں اور انکی بنیاد بھی شوخ رنگ کی ہے جس میں جا بجا چمکدار جواہرات جڑے ہوئے ہیں اور ایسا کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض بیش قیمتی اصلی ہیرے ہیں۔

بیدر کی ایک اور مشہور عمارت شاہ نعمت اللہ کرمانی کا مقبرہ ہے۔اس مقبرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی گنبد نہیں ہے اور شیراز کے مغیث کا لکھا ہوا خط ثلث میں ایک نہایت خوبصورت کتبہ ہے۔ساری عمارت سادہ مگر پر شکوہ ہے محراب بہت خوبصورت ہے اس کے سنگ سیاہ کے حاشیوں میں بھی جن پر لکیروں، پتیوں اور پھولوں کے طرز کے نقوش کندہ ہیں۔ایک اور خوبصورت کھپرے کی لوح بھی ہے اس عمارت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رنگ برنگ کے نہایت خوبصورت کھپروں کا آزادانہ استعمال ہے، خصوصاً گہرے نیلے اور سبز رنگ۔اس کے علاوہ ایک خوبصورت سا مینار ہے جسے چاند مینار کہا جاتا ہے یہ ایک اکیلا مینار ہے جو 1445ء میں خالص ایرانی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا، یہ مینار بالکل مدور ہے جس کے گرد ہوا اور روشنی جانے کے لئے اور موذن کو اذان کہنے کے لئے برآمدے نکلے ہیں یہ مینار نیچے سے اوپر کی طرف بتدریج پتلا ہوتا گیا ہے اور اوپر گنبد ہے۔

علمی سرپرستی

سلاطین بہمن عام طور پر علماء و فضلاء کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ انکی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ بہمنی عہد حکومت میں عرب و عجم کے نہایت مشہور شعراء، صوفیاءِ کرام دکن آتے تھے۔ انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ ایک بار محمود شاہ کے عہد میں ایک عجمی شاعر دکن آیا اور محمود شاہ کے دربار میں ایک قصیدہ پڑھا بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپے کے برابر رقم کا ایک سونے کا سکہ دیا۔ محمود شاہ ہر ایک کی قدر کرتا تھا اس کی شہرت بہت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصنف تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی جیسے بزرگ دکن کے سفر پر آمادہ ہو گئے۔ خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی جو اپنے عہد کے مشہور تاجر تھے ان لوگوں نے بھی حافظ شیرازی کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری لی۔ لیکن موسم کی خرابی کے وجہ سے وہ دکن کا سفر نہ کر سکے لیکن ایک غزل لکھ کر بھیجی۔ سلطان محمد شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے کہا جو عالم دکن کے لئے روانہ ہوا وہ ہمارے انعام و اکرام اور تحفہ و تحائف کا حقدار ہو گیا ہے اور اس نے ایک ہزار سکہ طلائی عنایت کئے۔

سلطان فیروز شاہ بھی علم کا دلدادہ تھا اور فن و کمال کا بہت قدر دان تھا۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ ہر ملک کا سب سے بہترین اور اعلیٰ تحفہ اس ملک کے ماہر کمال و فن اشخاص ہیں۔ وہ ہر ملک کے اہل کمال کو اپنے دربار میں جمع کرنا چاہتا تھا اور یہی سبب تھا کہ ساری دنیا کے اہل کمال اس کے دربار میں حاضر ہو کر انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے تھے۔ وہ دنیا کی بہت سی زبانوں کا ماہر تھا اور ہر ملک کے باشندوں سے اسی کے ملک کی زبان میں بات چیت کرتا تھا اس کا حافظہ غضب کا تھا جو بات ایک بار سن لیتا تھا اس کو زندگی بھر نہیں بھولتا تھا۔ مستند شعراء کے اشعار اس کو ازبر تھے۔ وہ خود بھی کبھی عروضی اور کبھی فیروزی کے تخلص سے اشعار کہتا تھا۔ ملا داؤد بیدری نے اس کی علمی سرپرستی اور ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی اپنی کتاب ''تحفۃ السلاطین'' اس کے نام معنون کی ہے۔

فیروز شاہ کو تمام علوم سے دلچسپی تھی خاص طور پر تفسیر، اصول حکمت، طبعی اور نظری سے اور ان علوم میں اس کو دستگاہ بھی حاصل تھی۔ صوفیاء کرام کی اصلاحات سے بھی شغف تھا، ہفتے میں تین دن درس و تدریس کے لئے تھے اس کے پڑھنے کی خاص کتب زاہدی، شرح تذکرہ، فن ریاضی، شرح مقاصد کلام، اقلیدس، علم ہندسہ اور علم معانی و بیان کی تھیں۔ طلباء کو پڑھانے کا وقت اگر دن میں نہ ملتا تو رات کو پڑھاتا اور ذخیرہ معلومات سے ان کے دلوں کو معمور کر دیتا تھا۔

سلطان احمد شاہ بھی علم اور اہل علم کا سرپرست اور قدر دان تھا اس کے عہد کا مشہور عالم شیخ آذری اسفرائنی تھا اس نے احمد شاہ کی اجازت سے بہمن نامہ لکھا تھا۔ اسفرائنی نے جب اپنے ملک جانے کی اجازت مانگی تو احمد شاہ نے کہا کہ حضرت گیسودراز کے انتقال کے بعد جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو آپ نے کسی حد تک پر کر دیا ہے۔ اب اس طرح جدا ہو کر جانے سے مجھے بہت تکلیف ہوگی۔ شیخ آزری نے بادشاہ کو اتنا مہربان اور مخلص پایا تو اپنی اولاد کو بھی یہیں بلا لیا۔ شیخ آذری نے دارالامارات کے محل کی شان و شوکت میں بھی اشعار لکھے ہیں جسے خوش خط میں پتھر پر کندہ کروا کر محل کے دروازہ پر جڑ دیا گیا۔

سلطان شمس الدین محمد سوم کا وزیر اعظم محمود گاوان بھی علم کا شیدائی تھا وہ منقولات و معقولات میں دسترس رکھتا تھا۔ خاص طور پر ریاضی اور طب میں تو اسے بہت ہی کمال حاصل تھا۔ نظم و نثر و انشاء میں وہ اپنی مثال آپ تھا خوش نویسی پر بھی اسے کمال حاصل تھا۔ اس کا دیوان اور رسالہ روضۃ الانشاء دکن کے اکثر اہل علم کے پاس موجود ہے۔ محمود گاوان کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے عہد کے خراسانی اور عراقی فضلاء سے خط و کتابت کیا کرتا

تھا۔اس کے لکھے ہوئے خطوط اس کی کتاب انشاء میں شامل ہیں۔مولانا عبدالرحمن جامی نے خواجہ کی مدح میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ لکھا ہے۔

معلومات کی جانچ:

(1) محمد اول کے دور کی تین اہم عمارتوں کے نام لکھیے؟

(2) بہمنی تعمیرات کس سے متاثر ہیں؟

(3) محمود گاوان کی علمی سرپرستی پر نوٹ لکھیے۔

9.15 خلاصہ

محمد بن تغلق کے آخری زمانہ میں ملک میں انتشار پیدا ہوگیا، ملک کے حصے بخرے ہونے لگے تب دکن میں بہمنی سلطنت حسن گانگو نے قائم کی اور فتوحات سے سلطنت کو بہت وسعت دی وہ علم دوست بادشاہ تھا۔اس کے بعد اس کا پوتا محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا، مورخین نے اس کے عادات واخلاق کی بڑی تعریف لکھی ہے، اس کے عہد میں قانون کی پابندی اور عدل وانصاف کا بول بالا رہا اور علم وفن کو ترقی ہوئی بڑے بڑے شہروں میں مدرسہ قائم کیے گئے۔بہمنی سلطنت کا دوسرا فرمانرواں فیروز شاہ تھا اس کا دور عروج کا زمانہ تھا اس نے اپنے عہد میں سیاسی تدبر اور تدبر مملکت سے ملک کو بلند منزل پر پہنچادیا۔وہ اپنی علمی قابلیت میں مشہور تھا اور کئی زبانوں کا عالم تھا۔اس کے بعد اس کا بھائی احمد خان حکمران بنا اور اپنا دارالسلطنت گلبرگہ کے بجائے بیدر کو بنایا جس کو خوب ترقی دی اور یہ دنیا کے چند مشہور شہروں کے مدمقابل بن گیا۔اس کے عہد میں جو لڑائیاں ہوئی اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی مگر تمدنی لحاظ سے ملک کی ترقی ہوئی۔

احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین ثانی پھر ہمایوں شاہ، نظام شاہ اور محمد شاہ ثانی بیدر کے تخت پر تخت نشین ہوئے۔علاء الدین نے شفاخانہ تیار کروایا جہاں مریضوں کو غذا اور دوا مفت دی جاتی تھی۔شفاخانہ کے لئے کئی گاؤں وقف تھے۔ہمایوں شاہ اپنے زور وظلم کے باعث بہمنی سلطنت کا بدنام بادشاہ ہے۔ہمایوں کے بعد نظام شاہ نے دو سال حکومت کی پھر محمد شاہ ثانی حاکم بنا جو بقول فرشتہ فیروز شاہ بہمنی کے بعد خاندان بہمن کا علم دوست، ذی علم اور شائستہ بادشاہ تھا۔اس کے وزیر اعظم محمود گاوان کے تدبر وفراست کے باعث ملک کو وسعت حاصل ہوئی۔اس نے ملک کو آٹھ صوبوں میں منقسم کیا اور والی مقرر کیے اور امن امان بحال کیا۔لیکن بعد میں سلطان محمد ثانی اور محمود گاوان میں اختلاف پیدا ہوا اور محمود گاوان کو قتل کردیا گیا۔اس کے بعد سے سلطنت زوال کی طرف گامزن ہوئی۔بہمنی سلطنت کا آخری حکمران کلیم اللہ تھا جس کے 1527ء میں مرنے کے بعد حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

9.16: نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے:

(1) بہمنی سلاطین میں کس کا دور عہد زریں کا دور کہا جاتا ہے اور کیوں؟

(2) عہد احمد اول پر ایک نوٹ لکھئے۔

(3) بہمنی سلطنت کے مرکزی اور صوبائی نظام پر روشنی ڈالئے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھئے:

(1) تاج الدین فیروز شاہ کے عہد حکومت اور نظام سلطنت پر مختصر نوٹ لکھئے۔

(2) محمود گاوان کے سیاسی نظام پر روشنی ڈالئے۔

(3) عہد بہمنی کی تعمیرات کا جائزہ لیجئے۔

(4) بہمنی دور میں علماء کی سرپرستی پر نوٹ لکھئے۔

9.17 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

(1) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ فرشتہ (مترجم عبدالحی خواجہ) لاہور پاکستان

(2) ہارون خان شیروانی: دکن کے بہمنی سلاطین (مترجم رحم علی الہاشمی) نئی دہلی، 1982

(3) محمد نصیر الدین ہاشمی: دکنی کلچر، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1963

(4) دائرۃ المعارف: شعبہ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(5) History of Islam Masudul Hasan

(6) S.K. Pandey Medival India

اکائی-10 نظام شاہی حکومت، عادل شاہی حکومت، قطب شاہی حکومت، برید شاہی حکومت اور عماد شاہی حکومت

اکائی کے اجزاء

10.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء بہمنی حکومت کے زوال کے بعد منظر عام پر آنے والی پانچ خودمختار حکومتیں مثلاً نظام شاہی حکومت، عادل شاہی حکومت، قطب شاہی حکومت، برید شاہی حکومت اور عماد شاہی حکومت کے عروج وزوال، ان حکومتوں کے مشہور سلاطین اور ان کے کارنامے نیز علم وعلماء سے ان کے تعلق وسرپرستی اور نظم ونسق سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

10.2 تمہید

بہمنی سلطان شمس الدین محمد سوم کے انتقال کے بعد اس کا شیر خوار بیٹا شہاب الدین محمود شاہ سلطان بنا، وہ کم سن تھا اس لئے حکومت کی باگ ڈور نظام الملک کے ہاتھوں میں رہی جو بعد میں اس کا وزیراعظم ہوا۔ اس کے عہد میں دکنیوں اور غیر دکنیوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ سلطان

اس کشیدگی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ نظام الملک کا جھکاؤ دکنیوں کی طرف تھا اور سلطان کا غیر دکنیوں کی طرف اس لئے سلطان شہاب الدین محمود شاہ نے نظام الملک کو قتل کرادیا جسکی وجہ سے دکنیوں نے محل پر حملہ بول دیا لیکن غیر دکنیوں کی مدد سے سلطان کی جان بچ گئی۔ اس واقعہ کے بعد سلطان نے دکنیوں کا یک طرفہ قتل عام کرایا اور یہی بہمنیوں کی زوال کی وجہ بنی اور دن بدن بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا اور صوبے کے گورنروں نے اس کا فائدہ اُٹھا کر اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ جس کے نتیجہ میں بہمنی سلطنت پانچ خود مختار حکومتوں میں تقسیم ہوگئی جو حسب ذیل ہیں:

(1) بیجاپور میں یوسف عادل شاہ نے 1489ء میں عادل شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔

(2) احمد نگر میں ملک احمد نے 1490ء میں نظام شاہی حکومت کی بنا رکھی۔

(3) برار میں فتح اللہ عماد نے 1490ء میں عماد شاہی حکومت قائم کی۔

(4) گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ نے 1512ء میں قطب شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔

(5) اور بیدر میں امیر علی برید نے 1619ء میں برید شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔

10.3 عادل شاہی حکومت

بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ ہے جس کے متعلق یہ عام رائے ہے کہ وہ سلاطین عثمانیہ ترکی کے خاندان سے تھا۔ بہمنی حکومت کے دور میں بیجاپور کا صوبہ دار تھا۔ بہمنی حکومت کے کمزور ہونے پر 1489ء میں یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں حکومت قائم کی۔ یکے بعد دیگرے نو اشخاص حکومت کرتے رہے بالآخر سکندر عادل شاہ کے عہد میں 1686ء مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کر کے حکومت عادل شاہی کا خاتمہ کردیا۔

10.3.1 یوسف عادل شاہ (1490-1510)

یوسف عادل شاہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے اپنے عہد میں ممتاز تھا وہ دور اندیش اور تجربہ کار فرمانروا تھا۔ یوسف عادل شاہ کی شخصیت شجاعت، سخاوت اور انصاف جیسے محاسن کا مجموعہ تھی۔ ذاتی اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ علمی کمالات سے بھی متصف تھا۔ خوش خطی کے علاوہ وہ علم و شاعری کا بھی ماہر تھا۔ اسے علم موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ طنبور وعود کو نہایت عمدگی سے بجاتا تھا اور اس فن کے استادوں کی بے حد قدر کرتا تھا۔ دور دور سے علماء اور اصحاب علم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتا اور ان کو قیمتی تحائف ارسال کرتا تھا۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اس کی علم دوستی اور علماء کی سرپرستی کی بڑی تعریف کی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے ''اس دور میں حنفی، شافعی اور شیعی علماء بڑے خلوص اور محبت سے ملتے تھے اور باہم کسی طرح کا بغض وکینہ نہ رکھتے تھے''۔ اس کا نکاح مرہٹہ کے ایک سردار کی بہن پونجی خانم سے ہوا تھا۔ اس سے ایک لڑکا اسماعیل اور تین لڑکیاں تولد ہوئیں۔ اس کے عہد میں شیعہ مذہب کو ترجیح دی گئی تھی۔

10.3.2 اسماعیل عادل شاہ (1534-1510):

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند اسماعیل مسند پر بیٹھا اور 1534ء تک بڑی شان وشوکت سے حکمرانی کی۔ اس کے عہد میں 1510ء میں پرتگالیوں نے گوا اور وجے نگر کے حاکم کرشنہ دیونے رائچور دوآب پر قبضہ کرلیا۔ اسماعیل عادل شاہ بھی اپنے والد یوسف عادل شاہ کی طرح علم دوست اور صاحب علم اور شاعر تھا، وفائی کے تخلص سے شاعری کرتا تھا وہ بہت سخی تھا۔ اس کی سخاوت سے ملک کی آمدنی اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔ وہ نرم دل تھا خطا کاروں کی خطاؤں پر چشم پوشی کرتا تھا۔ وہ فحش الفاظ کبھی زبان سے نہیں نکالتا تھا اور ہمیشہ عالموں اور فاضلوں کے درمیان رہتا تھا۔ علم وموسیقی سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ اس کی شاعری کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے کہ دکن کے کسی بادشاہ نے اسماعیل عادل شاہ جیسے لطیف اور متین اشعار نظم نہیں کئے۔

10.3.3 ابراہیم عادل شاہ (1558-1534):

اسماعیل عادل شاہ کے انتقال کے بعد اسکا بیٹا ملو کی تخت نشین ہوا۔ وہ نااہل حکمراں ثابت ہوا اور چھ ماہ کے بعد اسکے چھوٹے بھائی ابراہیم عادل شاہ نے تخت پر قبضہ کیا اور 1534ء میں بادشاہ بنا۔ وہ بھی صاحب علم اور علم دوست تھا اس نے اپنے باپ دادا کے مذہب شیعہ کو ترک کر کے سنی مذہب اختیار کیا اس کی وجہ سے ایرانی اثر دربار میں کم ہوگیا۔ دکن کے ارباب کمال اس کے مقرب بن گئے۔ اس کی وجہ سے دکنی زبان کو عروج ہوا یعنی ہندوی (دکنی اردو) نے فارسی زبان کی جگہ لے لی۔ اس کے عہد میں ہندوؤں کو اونچے اونچے عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ اول کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے کہ وہ بڑا بہادر تھا اور اپنی مردانگی اور شجاعت کی وجہ سے کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

10.3.4 علی عادل شاہ اول (1580-1558):

ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند علی عادل شاہ اول مسند حکومت پر 1558ء میں متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں شولا پور کے قبضہ کو لے کر احمد نگر اور بیجاپور کے بیچ چلی آرہی کشیدگی بہت بڑھ گئی۔ علی عادل شاہ نے اپنے کو مضبوط کرنے کے لئے وجے نگر کے حکمران راما رائے سے معاہدہ کیا۔ دونوں فوجوں نے مل کر احمد نگر پر حملہ کیا۔ احمد نگر کا حاکم حسین نظام شاہ بھاگ لیکن کر جنیر چلا گیا بعد میں علی عادل شاہ نے حسین نظام شاہ کی صاحبزادی چاند بی بی سے نکاح کر کے احمد نگر کے ساتھ بھی معاہدہ کرلیا۔ اس کے عہد حکومت میں عادل شاہی سرحدیں ہونا ور بندر گاہ سے لے کر تنگ بھدرا ندی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ علی عادل شاہ نے مغل حکمران اکبر سے خوشگوار رشتہ قائم کیا اور دونوں طرف سے سفیروں کا آنا جانا ہوا۔ 1580ء میں ایک خواجہ سرا نے علی عادل کو اس کے حرم میں قتل کر دیا۔

علی عادل شاہ بھی اپنے اجداد کی طرح صاحب علم تھا اسے مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ سفر میں بھی چار سو صندوق کتابوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس کے کتب خانے میں بیسیوں کاتب، خوش نویس، مجدول اور نقاش مامور تھے۔ اس نے سنی مذہب ترک کر شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ وہ بہت سخی تھا۔ اس نے زر کثیر دے کر ملا فتح اللہ شیرازی کو طلب کیا۔ علی عادل شاہ نے باپ کے تمام اندوختے اور خود اپنے عہد کی تمام دولت ایران، عرب اور روم کے دیگر ممالک کے فضلا اور مستحقین کو عطا کر دی۔ اس کے عہد میں بادشاہوں اور وزیروں کے مکانوں میں علمی جلسے ہوا کرتے تھے۔ محمد علی، سید مصطفی خاں، شاہ عبدالحسن اور شاہ ابوالقاسم جیسے علماء اس کے درباری زینت بنے ہوئے تھے۔ ملا محمد رضا مشہدی اس کا

درباری شاعر تھا۔اس کے عہد تعمیرات مین گول گنبد بہت اہم ہے اس کی خصوصیت دکن اور غیر دکنی تعمیرات کا سنگم ہے۔

10.3.5 ابراہیم ثانی (1558-1627):

علی عادل شاہ کے قتل کے بعد اس کی جگہ اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی فرماں روا ہوا۔اس کی کم سنی کے باعث اول تو کئی سال تک نائب حکومت کرتے رہے خاص کر اس کی چچی چاند بی بی۔ جس سے حکومت کا شیرازہ بکھرتا گیا۔اس لئے ابراہیم نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی تو اس کو اپنے ہمسایوں سے کئی جنگیں لڑنی پڑیں، مغلوں نے احمد نگر پر حملہ کر قبضہ کر لیا اور ابراہیم نے ان کی باجگزاری قبول کر لی پھر اپنی بیٹی کا نکاح شہزادہ دانیال سے کر دیا۔

ان سیاسی اُتھل پُتھل کے باوجود بھی اس کے عہد میں علم وادب کی ترقی ہوئی۔ نہ صرف احمد نگر سے کئی ارباب علم بیجاپور آئے بلکہ ایران اور حجاز سے بھی اصحاب علم وسلوک بیجاپور میں آتے رہے۔دکن کا مشہور مورخ فرشتہ اس کے عہد میں بیجاپور آیا تھا اس نے ابراہیم کے کردار کی بڑی تعریف کی ہے۔ابراہیم کو شاعری اور موسیقی سے بڑی انسیت تھی جس کا ثبوت اس کی کتاب ''نورس'' سے ملتا ہے۔لفظ نورس سے اس کو بڑی دلچسپی تھی۔اسی نام پر ایک شہر آباد کیا، قلعہ بنایا، درباری شاعر عبدالقادر کو نورس کا لقب دیا، یہاں تک کہ شاہی مہر پر بھی نورس کندہ تھا۔وہ مشہور چشتی صوفی بندہ نواز گیسودراز کا گرویدہ تھا۔ان کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ابراہیم مرہٹی، دکنی، اردو اور کنڑ زبانوں کا ماہر تھا۔اس کے عہد میں کئی ہندوؤں کو اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا۔اس نے شیعہ، سنی اور دیگر مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی۔اسے خوش خطی سے بھی دلچسپی تھی اس کی ان مختلف صفات کی وجہ سے عوام نے اسے ''جگت گرو'' کا خطاب دیا تھا۔

10.3.6 محمد عادل شاہ (1627-1656):

ابراہیم کے انتقال کے بعد اس کا فرزند محمد عادل شاہ سولہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور دو امراء دولت خان (مقلبہ خواص خان) اور مرزا محمد امین لاری (مقلبہ مصطفیٰ خان) کی مدد سے حکومت کی۔محمد عادل شاہ کا دور حکمرانی کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے ایک طرف تو جنگ وجدال اور معرکہ آرائیاں ہیں تو دوسری طرف علم وادب کی سرپرستی کے لئے بھی مشہور ہے۔احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے دو مرتبہ فوج کشی کی مگر دونوں مرتبہ ناکام لوٹنا پڑا اس کے عہد میں مغل بادشاہوں جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی حملہ کیا۔1636ء میں محمد عادل شاہ نے شاہ جہاں سے معاہدہ کیا اور بیجاپور کی حفاظت کی۔دونوں میں خوش گوار رشتہ ہونے کے سبب شاہ جہاں نے محمد عادل شاہ کو 1648ء میں شاہ کا لقب عطا کیا۔عادل شاہی حکمرانوں میں مغلوں کے طرف سے شاہ کا لقب صرف محمد عادل شاہ کو ہی ملا تھا۔محمد عادل شاہ کو ملک کے بعض باغی اور خودسر امیروں کی بغاوت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ان میں شاہ جی اور اخلاص خاں کی بغاوتیں اہم ہیں۔ان لڑائیوں کے علاوہ محمد عادل شاہ نے ملک گیری بھی کی جس سے مملکت کے حدود وسیع ہو گئے 1636ء میں شاہ جہاں سے معاہدہ کے سبب شمال میں تو اضافہ نہ ہو سکا مگر مغرب میں کونارک، پونے، دھبول (ممبئی): جنوب میں میسور اور مشرق میں کرناٹک اور تلنگانہ عادل شاہی حکومت کے قبضہ میں آ گیا۔اس کے عہد میں عادل شاہی حکومت کا دبدبہ بحر عرب سے لے کر بنگال کی خلیج تک تھا۔

10.3.7 علی عادل شاہ ثانی (1656-1672):

محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔علی عادل شاہ نے انیس سال کی عمر میں عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لی۔اس کا دور حکومت بھی محمد عادل شاہ کی طرح جنگ وجدال سے بھرا ہے۔اس عہد میں شاہ جہاں کی طرف سے اورنگ زیب نے حملہ کر کے بیدر اور کلیانی وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد اورنگ زیب بیجاپور کی طرف روانہ ہوا مگر شاہ جہاں کی علالت کے باعث اورنگ زیب عارضی صلح کے بعد دہلی واپس لوٹ آیا۔اس صلح کے بعد عادل شاہی حکومت ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ شیواجی نے سرتابی کی۔اس کے مقابلہ میں سدی جوہر المخاطب صلابت خاں کو بھیجا گیا مگر وہ شیواجی سے مل گیا۔اس لئے اب خود علی عادل شاہ کو اپنے باغی امیروں کی بیخ کنی کرنی پڑی اور صلابت خان کو شکست دے کر قتل کر دیا۔شیواجی نے دوبارہ بغاوت کی اس مرتبہ اس کی سرکوبی کے لئے وہ خود گیا اور شیواجی کو شکست دے کر اسے پونہ کی طرف فرار ہونے پر مجبور کیا۔

10.3.8 سکندر عادل شاہ (1672-1686):

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس کا کم سن بیٹا سکندر علی شاہ جس کی عمر صرف چار سال تھی کو مسند حکومت پر بٹھایا گیا۔اس لئے اس کے عہد میں نائبوں اور وزراء نے حکومت کی جو امراء اور فضلاء کے بیچ خانہ جنگی کی وجہ بنی۔صوبائی حکمرانوں نے بغاوت شروع کی جس سے مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی۔مغل اور مراٹھا سے کئی معرکے ہوئے۔اورنگ زیب پوری طرح بیجاپور پر قبضہ کرنے کی نیت سے 1685ء میں حملہ آور ہوا اور بیجاپور کو فتح کیا۔سکندر شاہ کو زنجیر میں باندھ کر اورنگ زیب کے سامنے لایا گیا۔اورنگ زیب نے اسے دولت آباد قلعہ میں نظر بند کر دیا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔اس طرح عادل شاہی کی دوسو سالہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

10.3.9 علمی اور ادبی سرپرستی:

عادل شاہی حکومت کی اگر علمی اور ادبی سرپرستی وخدمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عادل شاہی حکومت کا بانی یوسف عادل شاہ سے لے کر آخری چشم و چراغ سکندر عادل شاہ کے عہد تک سبھی حکمرانوں نے خوب بڑھ چڑھ کر دلچسپی لی اور ادبی کارناموں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ادبی کتابیں فارسی اور اردو زبان میں مرتب ہوتی رہیں۔محمد عادل شاہ کے زمانہ میں آتشی نے خمسہ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں۔ملا ظہور نے محمد نامہ مرتب کیا، ملا محمد حسین نے رفیع الدین شیرازی کی کتاب احوال السلاطین کا تکملہ کیا۔محمد ابراہیم صنعتی، قاضی نور اللہ مقیمی اور مرزا دولت کی علمی کارنامے سامنے آئے۔محمد عادل شاہ کے عہد میں تعلیم کو وسعت ہوئی۔مدارس کھولے گئے طلباء کو وظائف جاری کئے گئے اور اصحاب علم کو فکر معاش سے مستغنی کیا گیا۔

علی عادل شاہ بھی علم کی آبیاری اور اصحاب علم وفن کی قدر دانی میں اپنے اجداد سے کم نہیں رہا۔علماء، فضلاء، شعراء وادباء سلطان کے دست کرم سے نہال ہوئے۔قاضی نور اللہ نے تاریخ عادل شاہ قلم بند کی۔نصرتی نے علم نامہ اور گلشن عشق جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔علی عادل شاہ کے متعلق مولف احوال السلاطین لکھتا ہے کہ چونکہ اسے اپنی خاص زبان دکنی اور اردو سے رغبت تھی اس لئے بیجاپور سے بہت سارے دکنی گو شاعر پیدا ہوئے ان میں نصرتی، ابوالمعالی، ملا عبدالرزاق، رفعت عبدالقادر، عبداللطیف اور عبدالنبی بلند پائے کے شاعر تھے۔علی عادل شاہ

کی علمی دلچسپی اوراس کے بہترین کردار کا تذکرہ اورنگ زیب عالمگیری مورخ خافی خان نے ان الفاظ میں لکھا ہے، ''ایک ایسا بادشاہ تھا جوفوج کو عزیز رکھتا تھا۔سخاوت،شجاعت اور وسعت اخلاق کے باعث مشہور تھا۔فضلاء کو دوست رکھتا تھا،شاعروں کی قدر کرتا تھا۔''

عادل شاہی حکومت کا آخری فرمانرواں سکندر شاہ گوکہ اس کا دور جنگی مصائب کا عہد رہا ہے مگر علم کی سرپرستی میں کمی نہیں آئی،نصرتی نے تاریخ اسکندری قلم بند کی۔

حکمران عادل شاہیہ کے علمی وادبی سرپرستی کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکومت علمی کاوشوں،ادبی شہ پاروں،تاریخی دستاویزات کی تصنیف کے علاوہ شاعری،موسیقی اور مصوری جیسے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے لحاظ سے بھی تاریخ میں یادگار رہے۔اس دور کے ادیبوں اور شاعروں نے جو نقش چھوڑے ہیں ان کو زمانہ مٹا نہیں سکتا۔

10.3.10 تمدنی ومعاشرتی پس منظر:

عادل شاہی عہد حکومت کے تہذیب وتمدن اور معاشرت پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دکن کی اسلامی حکومت نے جو روایات چھوڑی تھیں اور جنکی نشو نما عادل شاہی حکومت میں ہوئی تھی وہ آج بھی نظر آتی ہیں۔کھانے پینے،پہننے،اوڑھنے،رہنے سہنے کے جو طریقے رائج تھے وہ باقی ہیں اس تہذیب وتمدن میں ایک طرف اسلامی روایات،ایرانی،مغل اور ترکی مراسم نے جگہ لی تھی تو دوسری طرف ہندی روایات بھی شامل ہوگئی تھیں؛لیکن اس کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں کے طریقہ معاشرت اور رسم ورواج میں فرق نظر آتا تھا ان کے لباس،کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے جداگانہ تھے۔مذہب کو زندگی کا جزو سمجھتے تھے۔دعا مانگی جاتی تھی اوراس کو اثر پزیر خیال کیا جاتا تھا۔دسترخوان پر کھانا کھاتے تو تمام قسم کے کھانے کے لوازمات،نمکین وشیرین دسترخوان پر چنے جاتے تھے۔ملازم تول سے مکھی اُڑاتے،موسیقی کا عام رواج تھا،رقص بھی ہوتا تھا،ماتم کرنے کا دستور تھا اور ماتم کے وقت عورتیں سر کے بال کھول دیا کرتی تھیں۔سواری کے لئے گھوڑے،ہاتھی اور بیل گاڑی رہتے تھے۔سیر وشکار مردوں کی زندگی کا جز ہوتا تھا،عورتوں کے لئے باغوں میں جھولے ڈالے جاتے،پکوان ہوتا اور گیت گائے جاتے تھے۔مخلوط محفلوں کا رواج نہیں تھا مرد اور عورتوں کی محفلیں جداگانہ ہوتی تھیں۔علاوہ ازیں مردانہ کھیل اور فوجی کرتب بھی ہوتے تھے۔

معلومات کی جانچ:۔

(1) عادل شاہی حکومت کے قیام پر نوٹ لکھیے۔

(2) عہد عادل شاہی کی علمی سرپرستی پر روشنی ڈالیے۔

(3) عادل شاہی۔معاشرتی زندگی کو اجاگر کیجیے۔

(4) کس عادل شاہی حکمراں کو مغلوں نے شاہ کا لقب عطا کیا؟

(5) ہندی کو کس کے عہد میں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی؟

10.4 قطب شاہی حکومت

قلی قطب شاہ بہمنی دور میں تلنگانہ کا صوبہ دار تھا، دوسرے صوبے داروں کی طرح بہمنی حکومت کے زوال پر اس نے بھی 1518ء میں گولکنڈہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی جو 1687ء تک قائم رہی۔ قطب شاہی حکومت کا آخری سلطان ابوالحسن تھا جسے مغل حکمران اورنگ زیب نے 1687ء میں شکست دے کر اس کی حکومت کا خاتمہ کیا، اور اس مملکت کو اپنی حکومت میں ملا لیا۔

10.4.1 قلی قطب شاہ (1518-1543)

قلی قطب شاہ نے خود مختار حکومت قائم کرنے کے بعد قرب وجوار کے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کیا اس نے تقریباً ستر قلعے فتح کئے اور اپنی سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا اور حکومت کو ایک باعظمت اور شاندار سلطنت بنا دیا۔ قلی قطب شاہ کا تمام وقت اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے اور وسیع کرنے میں لگا۔ اس کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں گزرا۔ اس لئے تہذیب وتمدن کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے باوجود اس نے آتش خانے کے نام سے ایک خاص محل تعمیر کیا تھا جہاں شعراء وادیب جمع ہوتے تھے۔ قلی قطب شاہ نے تلنگانہ میں پچاس سال حکومت کی جس میں سے ابتدائی چوبیس سال صوبہ دار کی حیثیت سے اور باقی چھبیس سال ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ سلطان قلی کو اس کے بیٹے جمشید کے اشارہ پر 1543ء میں قتل کر دیا گیا۔

10.4.2 جمشید قلی اور سبحان قلی (1543-1550)

سلطان قلی قطب شاہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا جمشید تخت نشین ہوا اور سات سال تک حکومت کی۔ اس کو شعر وسخن سے دلچسپی تھی جمشید اس کا تخلص تھا۔ وہ اپنی شجاعت اور خودداری کے باعث بہت شہرت رکھتا تھا۔ جمشید قلی کے بعد اس کا بیٹا سبحان قلی صرف چند ماہ حکومت کر سکا کیونکہ امرائے ملک نے جمشید کے بھائی ابراہیم قلی کو مسند قطب شاہی پر متمکن کر دیا۔

10.4.3 ابراہیم قلی (1550-1580)

جمشید قلی اور سبحان قلی کے عہد میں ان کے خوف سے ابراہیم قلی وجے نگر میں مقیم تھا۔ امرائے ملک نے اسے طلب کر تخت نشینی عطا کی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا دور حکومت قطب شاہی سلطنت کے لئے بڑا اچھا ثابت ہوا۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ملک میں امن وامان قائم ہوا، بقول فرشتہ سوداگر تو سوداگر ایک بڑھیا بھی سارے قلمرو قطب شاہی میں بغیر تعرض سونا اچھالتی جا سکتی تھی۔ ابراہیم قلی نے تہذیب وتمدن اور تعلیم وتربیت کے فروغ میں دلچسپی لی۔ وہ ایک سیاست دان تھا اور وجے نگر کے خلاف تنظیم میں مسلمان سلطنتوں کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ 1580ء میں اس کی وفات ہوئی۔

10.4.4 محمد قلی قطب شاہ (1580-1612)

ابراہیم قلی کے انتقال کے بعد اس کا فرزند محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا دور حکومت قطب شاہی کا عروج کا دور ہے۔ اس کے عہد میں جنگ وجدال اور لڑائی جھگڑوں کی خونی فضا بدل گئی۔ امن وامان اور صلح وآشتی کا دور دورہ تھا۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اس کی بڑی تعریف

کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ محمد قلی میں چند باتیں ایسی جمع ہوگئیں تھی جو بہت کم بادشاہوں میں ہوتی ہیں۔ محمد قلی اپنے بھائیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا اور ان کو اپنا مصاحب اور ہم نشین بنا کر رکھتا تھا۔ حکومت کے طویل عرصہ میں وہ کبھی اپنے بھائیوں سے ناراض نہیں ہوا۔ دوسرا یہ کہ میر محمد مومن استر آبادی جیسے قابل اور لائق شخص اس کے دربار میں 25 سال تک وکیل سلطنت کی حیثیت سے رہے۔ ان کی مسلمہ قابلیت اور ہمہ گیر لیاقت کے باعث نظم ونسق حکومت میں کوئی خرابی نہیں آئی۔

محمد قلی کے عہد میں مغلوں کے حملے دکن پر شروع ہوگئے وہ یورشوں کی روک تھام اور دکن کی آزادی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ وہ گولکنڈہ کی چاروں طرف سے حفاظت کرتا رہا۔ اس کی کوشش رہی کہ سلطنت کے حدود بھی مستحکم اور محفوظ رہیں۔ اس نے حکومت کے نظم ونسق کو درست کیا۔ اس کا دور ارتقائے تمدن وتہذیب اور تعلیم کے فروغ کے لحاظ سے ایک زریں دور کہا جاتا ہے۔ اس نے شہر حیدرآباد آباد کیا اور اس کو عالی شان عمارتوں، خوبصورت ایوانوں، سرسبز وخوشنما باغوں اور نہروں سے آراستہ کیا۔ اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم کو نہایت سلیقہ سے کیا۔ اس شہر میں کشادہ راستے بنائے گئے شہر کے وسط میں چار مینار تعمیر ہوا جو کالج کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہی عمارتیں اپنی وسعت، بلندی، خوبصورتی اور شان وشوکت کے لحاظ سے ممتاز تھیں۔ مریضوں کے لئے دار الشفاء، سوداگروں کے لئے کارواں سرائے اور وسیع بازار بنائے گئے۔ دل بستگی، شگفتگی اور زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے باغات لگائے گئے، حمام تعمیر ہوئے اور تلنگانہ کے طول وعرض میں بہترین اجتماعی زندگی کی بناڈالی گئی۔ اس کو فنون لطیفہ کی ہر ایک شاخ سے دل چسپی تھی۔ علاوہ ازیں اسے شاعری اور موسیقی سے خصوصی دلچسپی تھی۔ خوبصورت عالی شان محل اور ایوان تعمیر کر کے ان میں نقش ونگار اور مصوری کے شاہ کار جمع کر دئے گئے تھے۔

سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں نہ صرف علوم اسلامی کو فروغ ہوا بلکہ عربی وفارسی کے شاہ کار مرتب ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ دکنی اور تلنگی ادب کی بھی ترقی ہوئی وہ خود بھی ان زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اسے دکنی اردو میں پہلا مصنف دیوان کہا جاتا ہے اس لئے محمد قلی کو دکنی اردو یا ہندی کا موجد مانا جاتا ہے 1612ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.4.5 سلطان محمد (1612-1626)

سلطان محمد قلی کے بعد اس کا بھتیجہ سلطان محمد تخت نشین ہوا وہ اپنے علم وفضل اور پاکیزگی کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ اس کے عہد میں تمام سلطنت میں امن رہا کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کے چودہ سالہ عہد میں ملک کی علمی اور عمرانی دولت میں اضافہ ہوا۔ وہ مذہب پسند، صاحب فہم و فراست بادشاہ تھا۔ حیدرآباد میں مکہ مسجد کی تعمیر اس کا بڑا کارنامہ ہے۔ ایک شہر سلطان نگری کے نام سے بسایا، پرانی عیدگاہ بھی اسی کی تعمیر کردہ ہے، ایک محل امان محل کے نام سے تعمیر کرایا۔ اس کو علم وفن سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاریخ قطب شاہی اسی کے عہد میں مرتب ہوئی۔ اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔ فارسی اور دکنی زبان میں طبع آزمائی کرتا تھا، ظلِ الٰہی اس کا تخلص تھا اس کے عہد میں اردو کو خاص ترقی ہوئی۔ خواص، قطبی، ابن نشاطی اور جنیدی وغیرہ اس دور کے نامور شعراء ہیں۔ علاوہ ازیں محمد سلطان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے خود اپنے علم وفن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے 1626ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.4.6 عبداللہ قطب شاہ (1626-1672)

سلطان محمد کی وفات کے بعد اس کا بارہ سالہ لڑکا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی کم سنی کی وجہ سے اس کی ماں حیات بخش بیگم اور

دادی خانم آغا نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ انتظام سلطنت کے لئے ایک مجلس بنائی گئی ان میں منصور خان کو ملک الماس، الملک یوسف کو انتظام ملک، علامہ شیخ محمد کو پیشوا، مولانا اویس کو دبیر کے عہدے پر فائز کیا گیا علاوہ ازیں مرزا قاسم، حکیم نظام الدین، حکیم جبرئیل اور اخلاص خاں وغیرہ کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا گیا۔ سلطان عبداللہ قطب تو کم سنی کی وجہ سے امور سلطنت انجام نہیں دے سکا اور جب شعور آیا تو اس میں سیاسی تدبیر اور بیدار مغزی کا فقدان تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کو سیر وشکار اور عیش وعشرت سے دلچسپی تھی۔ ہمیشہ رقص وسرور، نغمہ وطرب اور نشاط کے جلوس میں مصروف رہا۔ ایسی صورت میں خودغرض امراء اپنے مفاد کے لئے کام کرنے لگے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ شمال سے مغلوں کے حملے شروع ہوگئے۔ لیکن حیات بخش بیگم کی وجہ سے مغلوں سے صلح ہوئی اور اب قطب شاہی حکومت مغلوں کی ایک باجگزار حکومت بن گئی 1672ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.4.7 ابوالحسن (1672-1687)

عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے اس کا داماد ابوالحسن تخت نشین ہوا۔ ابوالحسن کا دور حکمرانی مغلوں کے حملوں اور بالآخر سلطنت کے خاتمہ کی وجہ سے افسوس ناک ہے، لیکن ملک کی ترقی کے لئے اس کے زمانہ میں جو امور کارنامے دئے گئے وہ فراموش نہیں کئے جاسکتے، زراعت کو فروغ دینے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے تمام ملک میں جدید باؤلیاں اور تالاب کھودے گئے۔ وصول مالگزاری کا مکمل انتظام کیا گیا۔ کاشتکاروں پر ہورہے ظلم وستم کو روکا گیا۔ جو دیہات ویران ہوگئے تھے انہیں ازسرِ نو آباد کیا گیا۔ اجارہ داری کے طریقے کو موقوف کرکے مستقل تنخواہ یاب ملازم مامور کئے گئے۔ اوقاف کا انتظام بہتر طریقے سے کیا گیا۔ معدنیات کی کھدائی جو بند ہوگئی تھی وہ ازسرنو شروع کی گئی اس طرح ملک میں خوش حالی کا اضافہ ہوا۔

معلومات کی جانچ

(1) قطب شاہی حکمرانوں میں کس کا عہد، عہد زریں مانا جاتا ہے؟

(2) سلطان محمد کی تعمیرات پر نوٹ لکھئے۔

(3) قلی قطب شاہ کے کارناموں پر روشنی ڈالئے۔

(4) قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ پر چند سطریں لکھئے۔

(5) قطب شاہی دور کے پانچ نامور شعراء کے نام لکھئے۔

10.5 نظام شاہی حکومت (1490-1636)

نظام شاہی سلطنت کا بانی ملک نظام احمد شاہ بحری ہے اس کا باپ حسن وجے نگر کے ایک معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ محمد شاہ بہمنی کے دور میں اس نے اسلام قبول کیا اور اس کو نظام الملک کا خطاب دیا گیا اور منصب سرلشکری سے سرفراز ہوا۔ بہمنی سلطنت کے جب حصے بخرے ہوئے تو حسن نظام الملک کا فرزند ملک احمد نے خودمختار نظام شاہی سلطنت قائم کی۔ اس خاندان کے چودہ بادشاہ 1490-1635 تک

یعنی تقریباً 145 سال حکومت کرتے رہے، اس کے بعد شاہ جہاں کے عہد میں اس علاقے کو مغلوں نے اپنے حدود میں ملالیا۔

10.5.1 ملک احمد (1490-1510)

ملک احمد نہایت متقی اور پرہیزگار تھا اچھے کردار اور قابل تعریف عادتوں کی وجہ سے نیک نام ہوا۔ بہمنی سلطنت میں وہ جنیر کا گورنر تھا۔ اس نے بہمنی سپہ سالار جہانگیر خان کو 1490ء میں شکست دے کر نظام شاہی سلطنت کی بنا رکھی تھی جس کی سرحدیں دو سلطنتوں: سلطنت گجرات اور سلطنت گولکنڈہ کے بیچ واقع تھیں۔ 1494ء میں شہر احمد نگر کی بنیاد رکھ اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ملک احمد نظام شاہ نے کئی کوششوں کے بعد دولت آباد کے عظیم اور مضبوط قصر پر قبضہ کیا۔ جنگ وجدل کے علاوہ اس کے عہد میں علم وفن کو ترویج دی گئی یہاں تک کہ بیجاپور کے کئی مشاہر، علماء اور اصحاب علم اولاً احمد نگر میں ہی آئے تھے۔

10.5.2 برہان نظام شاہ (1511-1553) اور حسین نظام شاہ (1553-1565)

احمد نظام شاہ کے بعد اس کا فرزند برہان نظام شاہ تخت نشین ہوا، یہ احمد نگر کا پہلا حکمران تھا جس نے نظام شاہ کا لقب اختیار کیا۔ برہان نظام شاہ چونکہ شیر خوار تھا اس لئے اس کا نائب و وزیر مکمل خان دکنی تھا جس نے اپنی قابلیت سے امن وامان کو بحال رکھا۔ 1553ء میں برہان کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حسین نظام شاہ حکمران ہوا۔ اس کے عہد کو نظام شاہی عہد کا عہد زرین کہا جاتا ہے اس کے عہد میں 1562ء بیجاپور کے عادل شاہ، گولکنڈہ کے ابراہیم قطب شاہ اور وجے نگر کے رام رائے تینوں افواج نے مل کر احمد نگر پر حملہ کیا اور خوب جم کر لوٹا اور تباہ و برباد کیا۔ ان تینوں افواج کا سرغنہ وجے نگر کا راجہ رام رائے تھا۔ اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لئے حسین نظام شاہ نے دکن کی مسلم سلطنتوں کی ایک مشترکہ فوج بنائی اور 1565ء میں تالی کوٹ کی جنگ میں وجے نگر کو بری طرح شکست دی۔

10.5.3 مرتضیٰ نظام شاہ (1565-1588)، میراں حسین (89-1588) واسماعیل (1591-1589)

حسین نظام شاہ کے بعد اس کا بیٹا مرتضیٰ نظام شاہ تخت نشین ہوا۔ مرتضیٰ نظام شاہ بہت ظالم تھا۔ اس کے خوف سے اس کے بھائی برہان نظام شاہ نے مغل حکمران اکبر کے پاس جا کر شمالی ہند میں پناہ لی تھی۔ اس کے عہد میں مغلوں نے پہلی بار احمد نگر پر حملہ کیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ دماغی فتور کے باعث اپنے فرزند میران حسین کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی میران حسین کا شکار ہوا۔ اس کے بعد میران حسین تخت نشین ہوا وہ بھی بہت ظالم بادشاہ تھا اس وجہ سے رعایا و امراء مخالف ہو گئے اور وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہیں کر سکا اور اس کی جگہ مرتضیٰ نظام شاہ کے بھائی برہان نظام شاہ کے فرزند اسمٰعیل جو نظر بند تھا کو مسند حکومت پر متمکن کیا۔ اسمٰعیل کے دو سالہ میں دور شیعہ اور مہدوی طبقوں کے بیچ آپس میں جھگڑے ہوتے رہے۔

10.5.4 برہان نظام شاہ (1591-1595)

جب برہان نظام شاہ کو اطلاع ہوئی کہ اس کا بیٹا اسمٰعیل کو حکمران بنادیا گیا ہے تو شمالی ہند سے واپس آکر بیٹے کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت بھی صرف چار سال رہی۔ لیکن ان چار سالوں میں جو مذہبی فرقہ وارانہ جھگڑے چل رہے تھے اس کو ختم کیا اور حکومت میں اس طرح

امن وامان قائم کیا کہ نظام شاہوں کی کھوئی ہوئی عظمت وشوکت دوبارہ حاصل ہوگئی۔ 1595ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.5.5 ابراہیم نظام شاہ وچاند بی بی

برہان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا۔ مگر چند ماہ بعد ہی ایک تیر لگنے سے فوت ہوا۔ اس کے انتقال پر احمد نگر میں افراتفری پھیل گئی قریب قریب یہی وقت تھا جب چاند بی بی احمد نگر آئیں۔ تخت کے متعدد دعویدار تھے۔ سب سے اہم شخصیت بہادر کی تھی جو ابراہیم نظام شاہ کا کم سن بیٹا تھا۔ دوسرا شخص تھا احمد، یعنی حسین نظام شاہ کے ایک بھائی کا مبینہ پوتا۔ چاند بی بی نے پوری قوت کے ساتھ بہادر کی حمایت کی لیکن میاں مانجو نے جو احمد کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ اپنے کو کمزور پایا تو اس نے مغل حکمران اکبر کے بیٹے شہزادہ مراد کو، جو اس وقت گجرات کا حاکم تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ مراد چونکہ پہلے سے اس انتظار میں تھا اس لئے فوراً دارالحکومت پر چڑھائی کردی۔ ادھر چاند بی بی نے بہادر کے تخت نشینی کا اعلان کر کے گولکنڈہ اور بیجاپور سے مدد طلب کی اس طرح چاند بی بی نے دو مرتبہ مغلوں کے محاصرہ کو ناکام کیا۔ مراد نے بارود کی سرنگیں بچھادی تھی چاند بی بی نے اسے بھی کھدوا کر مٹی بھروادی۔ اس کے علاوہ جب قلعہ کی فصیل میں شگاف پڑا تو چاند بی بی بہ نفس نفیس اس شگاف پر پہنچ گئی اور راتوں رات شگاف کو بھر دیا اس کے بعد چاند بی بی کی بہادری کو قبول کرتے ہوئے اسے سلطانہ تسلیم کیا گیا۔

دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ دکن کی یہی ایک ملکہ تھی جس نے سلطان کا مردانہ لقب اختیار کیا جسے دکن کی پانچ سلطنتوں اور مغلوں نے تسلیم کیا تھا۔ اس کے بعد مغلوں سے معاہدہ ہوا، جس کے مطابق برار کا علاقہ مغلوں کی طرف منتقل ہوگیا اور اس کے بدلے میں احمد نگر کی مکمل آزادی وخودمختاری تسلیم کرلی گئی۔

اس بحران کے ختم ہوجانے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے حالات سدھر گئے۔ لیکن داخلی امن زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔ پھر لوگ چاند بی بی کے مخالف ہوگئے انہوں نے اب مغل شہزادہ دانیال کو مدد کے لئے بلایا۔ چاند بی بی سلطان نے بھی دوبارہ گولکنڈہ اور بیجاپور سے مدد طلب کی۔ لیکن اس دفعہ اتحاد کامیاب نہ ہوسکا اور 1592ء میں گوداوری کے کنارے سون پت کے میدان میں سخت جنگ ہوئی جس میں چاند بی بی کے اتحادیوں نے شکست کھائی۔ مغلوں نے احمد نگر پر چڑھائی کر کے دوبارہ اس کا محاصرہ کرلیا۔ جس کا فائدہ ملک کے اندر مخالف گروہ نے اٹھایا جس کا سردار حمید خان تھا، شہر کے اوباشوں کو ساتھ لے کر محل میں گھس گیا اور چاند بی بی کو قتل کردیا اور دانیال کا 1600ء میں احمد نگر پر قبضہ ہوگیا۔

10.5.6 ملک عنبر

ملک عنبر ایک حبشی سردار تھا جو ابتداً ایک غلام تھا، بعد میں وہ وزارت کے عہدے تک ترقی کر کے پہنچا تھا اور نظام شاہی حکومت کی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے کی کوشش کی تھا۔ جب 1600ء میں شہزادہ دانیال نے احمد نگر کو فتح کرلیا، ملک عنبر اور ایک دکنی راجہ منان نے باقی علاقے کو آپس میں تقسیم کرلیا۔ ان کو قبضہ کرنے میں کامیابی ملی کیونکہ اس زمانہ میں سلیم کی بغاوت، اکبر کی وفات اور سلطان خسرو کی سرکشی کی وجہ سے عنبر کو اتنی مہلت مل گئی کہ اس نے اپنے ملک کا باقاعدہ انتظام درست کیا اور بہت سی افواج تیار کرلی۔ اس کی تیار کردہ فوج نے نہ صرف اپنے صوبہ کا انتظام درست کیا بلکہ کئی دفعہ مغلوں سے بھی جنگ کی جسارت بھی کی اس نے دکن میں ایک نیا مالی دستور جاری کیا۔ مگر جب شہنشاہ جہانگیر کا اقتدار جم گیا تو اس نے دکن پر کئی مہمات بھیجیں ملک عنبر مطیع نہ ہوسکا لیکن آخر کار اس نے وہ مقامات جو مغلوں سے لیئے تھے 1620ء میں شاہ جہاں کو

واپس کردیے۔ لیکن 1625ء میں ملک عنبر کا انتقال ہوا اور اس کے بعد شاہ جہاں کی فوج نے 1644ء میں احمد نگر پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا اور اس طرح نظام شاہی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

معلومات کی جانچ

(1) نظام شاہی سلطنت کا بانی کون ہے اس نے یہ نام کیوں رکھا؟

(2) ملک عنبر کے متعلق چند جملے لکھیے۔

(3) چاند بی بی کے کارناموں کو اجاگر کریں۔

(4) نظام شاہی حکومت پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

(5) چاند بی بی کو سلطان کا لقب کس نے دیا تھا؟

10.6 عماد شاہی حکومت (1490-1574)

برار کے عماد شاہی خاندان کا بانی فتح اللہ عماد الملک تھا۔ یہ بیجاپور کے کسی غیر مسلم کا بیٹا تھا۔ وہ بچپن ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ملک برار کے سپہ سالار خان جہاں کے غلاموں کی جماعت میں داخل ہوگیا۔ وہ نہایت ہی ذہین اور بلا کا محنتی تھا اسی وجہ سے اس کا شمار خان جہاں کے مقربین میں ہونے لگا۔ خان جہاں کے انتقال کے بعد فتح اللہ عماد الملک بہمنی سلاطین کے غلاموں کی جماعت میں شامل ہوگیا۔ سلطان محمد شاہ کے عہد حکومت میں اس نے بڑی ترقی کی اور محمود گاوان کی عنایت سے عماد الملک کا خطاب حاصل کیا اور ملک برار کا سپہ سالار مقرر ہوا 1490ء میں عماد الملک نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے برار میں اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ اس کی وجہ محمد شاہ بہمنی سے بے وفائی نہیں تھی بلکہ یہ کہ وہ اس کے وزیر قاسم برید کی خدمت کرنا نہیں چاہتا تھا جو بادشاہ کو نظر بند کر کے ملک کا اصل حکمران بن بیٹھا تھا۔ فتح اللہ نے محمود شاہ بہمنی کو اس کے پنجے سے نکالنے کی ایک ناکام کوشش بھی کی تھی۔ 1504ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.6.1 علاء الدین اور دریا عماد شاہ

اس کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے شاہ کا لقب اختیار کیا اور برار کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ لیکن وہ قابلیت میں اپنے باپ فتح اللہ عماد الملک سے کافی کم تر تھا۔ چنانچہ وہ جلد ہی گجرات کے محمود شاہ بیگڑا اور گولکنڈہ کے سلطان قلی قطب شاہ کے ساتھ ایسے جھگڑوں میں الجھ گیا جن سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان سے اس کی مملکت کو سخت نقصان ہوا۔ یہ تنازع گوداوری ندی کے کنارے ایک مقام پاتھری کو لے کر تھا۔ 1529ء اس کی وفات ہوئی۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا دریا عماد شاہ تخت نشین ہوا وہ ایک کمزور حکمران تھا۔ اس نے اپنے ہمسایہ دکنی حکومتوں کے ساتھ جنگ و جدال ختم کرنے کے لئے اپنی دختر کی شادی حسین نظام شاہ سے کردی اس وجہ سے کچھ عرصہ تک برار میں امن و امان رہا لیکن اس کے اس طرز عمل سے اس کے طویل عہد حکومت میں برار کا اثر سیاست دکن میں گھٹتا چلا گیا۔ دوسرے مسلمان سلطانوں کی باہمی آویزش میں اس کی حیثیت

ثانوی رہ گئی۔ احمد نگر کے حسین نظام شاہ اول کے خلاف سلطان بیجاپور اور راجہ وجے نگر کے غیر قدرتی اتحاد میں شامل ہو کر خفیہ طور پر حسین نظام شاہ کی مدد کی، اس طرح اس نے جنوبی ہند میں ہندوؤں کا اقتدار قائم ہونے کا سد باب کر دیا۔ 1560ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.6.2 عماد شاہی حکومت کا خاتمہ

دریا عماد شاہ اپنے آخری زمانہ میں اپنے وزیر تفال خان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن چکا تھا۔ اس لئے اس کے انتقال کے بعد تفال خان نے اس کے کم سن بیٹے برہان عماد شاہ کو تخت نشین کر کے اسے قید کر لیا اور اطاعت کا اظہار کئے بغیر برابر حکومت کرنے لگا، چونکہ تفال خان نے بیجاپور اور احمد نگر کے سلطانوں کے ساتھ اس وفاق میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا جو وجے نگر کے خلاف بنائی گئی تھی۔ 1565ء میں بیجاپور اور احمد نگر کی افواج نے تالی کوٹ کی جنگ میں وجے نگر کو شکست دی۔ اس کے بعد بیجاپور اور احمد نگر دونوں نے تفال خان پر حملہ کر دیا اور شکست دی۔ اگر چہ اسے شکست ہوئی اور بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کی سیاسی چالوں نے احمد نگر اور بیجاپور کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا۔ لیکن 1572ء میں احمد نگر کے بادشاہ مرتضٰی نظام شاہ نے اس پر ایک بار پھر حملہ کیا اور یہ جواز پیش کیا کہ وہ برہان عماد شاہ کو اس کی زبوں حالی سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ مرتضٰی نظام شاہ نے نرنالہ فتح کر کے برار اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور برہان عماد شاہ، تفال خان، اس کے بیٹے اور عماد شاہی خاندان کے سارے افراد کو ریاست احمد نگر کے ایک قلعہ میں لے گیا جہاں وہ سب کے سب ایک ہی رات میں جاں بحق ہو گئے۔

معلومات کی جانچ

(1) فتح اللہ عماد پر نوٹ لکھئے۔

(2) عماد شاہی حکومت پر روشنی ڈالئے۔

(3) عماد شاہی حکومت کا زوال کیسے ہوا۔

(4) عماد شاہی حکمرانوں میں شاہ کا لقب کس نے اختیار کیا؟

10.7 برید شاہی حکومت (1489-1619)

دکن میں حکمرانوں کا ایک خاندان، جس کی بنیاد قاسم برید نے رکھی تھی۔ قاسم برید ایک ترکی غلام تھا جسے محمد شاہ ثالث بہمنی نے خریدا تھا۔ قاسم برید غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا اور اعلیٰ درجہ کا خطاط اور مغنی ہونے کے علاوہ ایک بہادر سپاہی بھی تھا۔ محمود شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں کوتوال کے منصب تک پہنچ گیا اور ملک حسن نظام الملک کی وفات کے بعد بہمنی سلطنت کی وزارت عظمٰی کے منصب پر قابض ہو گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت ان جاگیرداروں سے لڑنے میں گزرا جو طاقت میں اس سے زیادہ اور بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ میں عملاً خود مختار ہو چکے تھے۔ 1504ء میں قاسم برید کا انتقال ہوا۔

10.7.1 امیر برید و علی برید

قاسم برید کی وفات کے بعد اس کا فرزند امیر برید تخت نشین ہوا۔ قاسم برید نے بہمنی سلاطین کے اقتدار کا تو خاتمہ کر ہی دیا تھا۔ ان کا رہا سہا اقتدار امیر برید نے فتح کر لیا یہاں تک کہ بہمنی سلطنت کے نام نہاد آخری حکمران کلیم اللہ کے بھاگ جانے پر بیدر پر اس کا اقتدار مسلم ہو گیا۔ اب اس کا مقابلہ بیجاپور کے فرمانروا علی عادل شاہ سے ہوا جس میں امیر برید کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد اس نے چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کو مرکزی حکومت کے زیر اقتدار لانے کی کوشش کی مگر اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی اس کا انتقال 1543ء میں ہو گیا۔

امیر برید کے بعد اس کا بیٹا علی برید تخت نشین ہوا۔ اسے طویل مدت تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بریدی حکمرانوں میں وہ پہلا حکمران ہے جس نے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اگر چہ اس نے محض ملک الممالک کے لقب پر قناعت کی۔ وہ چار حلیف فرماں رواؤں میں سے ایک تھا جس نے بالآخر 1565ء میں وجے نگر کے حاکم رامارائے کی حکومت کو ختم کیا۔ ابراہیم قطب شاہ کے ساتھ حلیفوں کے میسرہ کی کمان علی برید کے سپرد تھی۔ علی برید کو ادب، مصوری اور فن تعمیر سے بڑی دلچسپی تھی اور بیدر کا رنگین محل اور اس کا نہایت ہی موزوں و متناسب مقبرہ اس کے حسن ذوق کی دو شاندار یادگاریں ہیں 1579ء میں اس کا انتقال ہوا۔

10.7.2 بریدی حکومت کا خاتمہ

علی برید کی وفات کے بعد اس خاندان کا اقتدار بھی جلد ہی ختم ہو گیا اس کے بعد ابراہیم اور پھر قاسم ثانی تخت پر بیٹھے۔ قاسم کے بعد اس کا شیر خوار بیٹا جو مرزا علی برید شاہ کے نام سے معروف ہے تخت کا وارث ہوا۔ لیکن اس کے ایک رشتہ دار امیر برید شاہ ثانی نے اسے تخت سے اتار کر خود تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس کا جانشین مرزا ولی امیر برید شاہ ہے۔ جس کے عہد حکومت میں بریدی خاندان کا خاتمہ ہوا اور بیدر 1619ء میں بیجاپور میں شامل ہو گیا۔

10.7.3 بریدی سکے

دائرۃ المعارف کے مطابق بریدی حکومت کے چند ہی سکے دستیاب ہوئے ہیں۔ بقول مصنف تاریخ فرشتہ قاسم برید نے بھی اپنے نام کے سکے ضرب کرائے تھے لیکن اس وقت تک جن سکوں کا پتا چلا ہے وہ یا تو تانبے کے ہیں جن پر ''امیر شاہ'' کے ٹھپے کا نشان ہے جو امیر برید ثانی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں یا پھر تانبے کے قلس اور نیم قلس جن پر ''امیر برید السلطان'' کندہ ہے۔

10.7.4. تعمیرات

بریدی خاندان کی تمام تعمیرات شہر بیدر ہی میں ہیں۔ چونکہ یہ لوگ بہمنی خاندان کی مستحکم سلطنت کے جانشین تھے اس لئے انہیں بہت سی اعلیٰ درجہ کی عمارتیں ورثے میں ملیں تھی اس لئے ان کی تعمیری سرگرمیاں کوئی اہم عمارت تعمیر کرنے کے بجائے زیادہ تر پرانی عمارتوں کو از سر نو تعمیر کرنے یا ان میں ردوبدل کرنے تک محدود رہیں۔

بریدی طرز تعمیر کی ترقی کے بڑے رقبے کے نمونے ان کے بنوائے ہوئے مزار ہیں جو شہر سے تقریباً چھ کلو میٹر کے فاصلے پر شاہی

قبرستان کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ قبرستان بڑے وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہر مقبرے یا مزار کے ساتھ باغ کا وسیع احاطہ شامل ہے۔ قاسم اول کا مقبرہ معمولی قسم کا ہے جس میں ایک سادہ سا مخروطی شکل کا گنبد ہے۔ اس کے جانشین امیر برید اول کے مقبرے پر کوئی گنبد نہیں ہے۔ سامنے کے رُخ پر محرابوں کی دو منزلیں ہیں اور ان محرابوں کے درمیان ایک بڑی محراب ہے۔ علی برید کے زمانہ حکومت میں خاصی تعمیری سرگرمیاں رہیں۔ قلعہ اور شہر کی فصیل میں بڑے پیمانے پر ترمیم اور تبدیلیاں کی گئیں اور فصیلوں پر خاصی تعداد میں توپوں کا اضافہ کیا گیا۔ رنگین محل کی از سرِ نو تعمیر ہوئی اور اس میں نہایت نفیس سیپی کی پچکاری اور بڑا نازک لکڑی کی کھدائی کا کام کروایا گیا ہے۔ جس میں ہندو طرز اور اسلامی طرز کی آمیزش کی گئی ہے، قبر کے محل میں بھی خاص ترمیم ہوئی بالخصوص بالائی منزل میں جس میں زنجیریں اور آویزے کا کام، جو اس وقت سے بریدی طرز کی خصوصیت سمجھا جانے لگا زیادہ نمایاں ہے۔ علی برید کے مقبرہ کا بیرونی پھاٹک بڑا شاندار ہے اور وسیع محرابوں اور نیچے ستونوں پر قائم ہے اور جس کے بالائی کمروں میں کثرت سے ہلالی شکل کے جھروکے بنے ہوئے ہیں اس کا اندرونی حصہ نہایت روشن اور ہوادار ہے اسے رنگین ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اس قبر سے ملحق میناروں اور گنبد دار چھت والی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ علی برید کے زمانے سے عمارتوں کی آرائش میں زیادہ نمائش اور تکلف پیدا ہو گیا ہے اور ہندو طرز تعمیر کا اثر زیادہ نمایاں نظر آنے لگا۔

معلومات کی جانچ:

(1) بریدی حکومت کہاں قائم کی گئی تھی؟

(2) قاسم برید کون تھا؟

(3) علی برید پر نوٹ لکھیے۔

(4) بریدی حکومت کا خاتمہ کیسے ہوا؟

(5) بریدی تعمیرات پر نوٹ لکھیے۔

10.8 خلاصہ

پندرہویں صدی کی آخری دہائی میں بہمنی سلطنت میں دکنیوں اور غیر دکنیوں کی کشیدگی کے سبب حکومت کا شیرازہ بکھرتا گیا اور ان کے پانچ علاقوں کے والیوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا وہ عادل شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی ہیں۔

بیجاپور میں عادل شاہی حکومت کی بنا یوسف عادل خان نے رکھی۔ خود مختار بیجاپور کی تاریخ 1489ء سے لے کر 1686ء تک ہے اس کے بعد ہندوستان کی مغلیہ سلطنت نے اس ریاست کو فتح کر کے اپنے حدود میں ملا لیا۔ اس عہد حکومت میں شیعہ عقائد کی ترویج ہوئی یوسف عادل خان کو ہندوستان کا پہلا حکمران جانا جاتا ہے جس نے ایسا کیا۔ اسی کے عہد میں پرتگیز نے ہندوستان میں گوا کی بندرگاہ پر قبضہ جما لیا۔ بیجا پور کی حکومت دکن کی سیاسی تاریخ میں مختلف ریاستوں بیدر، احمد آباد، گول کنڈہ اور وجے نگر کے ساتھ جنگ وجدال کے واقعات سے لبریز ہے۔ بیجاپور کی طاقت وخوشحالی ابراہیم ثانی کے عہد میں اپنے عروج کی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ بیجاپور کی مملکت شاہ جہاں کے تخت نشین ہونے تک دہلی کے

مغل شہنشاہوں کے براہ راست حملوں سے بچی رہی لیکن جب مغلوں کے حملے سے احمد نگر کی ریاست کمزور ہو رہی تھی تو بیجا پور نے اس مملکت کے بعض علاقوں پر قبضہ کرنے کو خود لے لینے کی کوشش کی۔ پھر مغلوں اور بیجا پور میں ٹکر ہوئی اور 1636ء میں مغلوں نے بیجا پور پر چڑھائی کی اور اسے صلح پر مجبور کیا جس کی رو سے بیجا پور نے مغلوں کی شہنشاہی کا اعتراف کر لیا اس کے بعد بیس سال تک اس مملکت میں امن و امان رہا۔ 1656ء میں جب علی عادل شاہ حکمران ہوا تو شاہ جہاں نے اپنے شہنشاہی دعوے پر اعتراض کی وجہ سے اورنگ زیب کو حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن شاہ جہاں کی علالت کی وجہ سے جنگی اقدامات روک دیئے گئے۔ مغلوں کے علاوہ بیجا پور کو مرہٹہ سردار شیواجی کی طرف سے بھی خطرے کا سامنا کرنا پڑا جس نے 1656ء میں کمین لگا کر بیجا پور کی ایک فوج اور اس کے سالار افضل خان کا خاتمہ کر دیا اس کے بعد بیجا پور کی مملکت کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بمشکل کبھی نجات ملی۔ بیجا پور سکندر عادل شاہ کے عہد میں مغلوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں رفتہ رفتہ اپنے صوبوں سے محروم ہونے لگا یہاں تک کہ 1656ء میں اورنگ زیب نے ایک سال سے زائد محاصرے کے بعد خود بیجا پور کو سر کر لیا اور مملکت کے باقی ماندہ حصے مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گئے۔ عادل شاہی حکمرانوں نے بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔ انہوں نے اپنے دارالسلطنت بیجا پور کو ہندوستان میں مسلمانوں کے تعمیری کمالات کی ایک نہایت شاندار یادگار بنا دیا وہ علم و ادب کے بھی بڑے سرپرست تھے۔ مشہور مورخ فرشتہ نے اپنی تاریخ ابراہیم عادل شاہ ثانی ہی کی سرپرستی میں لکھی تھی۔

احمد نگر میں ملک احمد نے نظام شاہی مملکت کی بنیاد رکھی اور اس کی اولاد تقریباً دو سو سال تک حکومت کرتی رہی، اس خاندان کے چودہ بادشاہ 1490ء سے 1635ء تک حکومت کرتے رہے۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت بھی دکن کی دوسری سلطنتوں کی طرح علوم وفنون کو ترویج وترقی دیتی رہیں۔ بیجا پور کے کئی مشاہیر، علماء اور اصحاب علم اولاً احمد نگر ہی میں آئے تھے۔ نظام شاہی سلطنت سے نہ صرف اپنے ہمسایہ حکومتوں کی لڑائی ہوتی رہی بلکہ شمال کی مغلیہ حکومت نے بھی دکن میں اس سلطنت پر حملہ کیا۔ اکبر کے دو فرزند یکے بعد دیگرے احمد نگر پر حملہ آور ہوئے۔ گجرات کے بادشاہوں سے بھی نظام شاہوں کو معرکے کرنے پڑے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو بہادر شاہ والی گجرات نے احمد نگر پر اپنا قبضہ بھی کر لیا تھا۔ نظام شاہی حکومت میں برہان نظام شاہ اور حسین نظام شاہ خاص کر سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے دور حکومت میں ایک طرف تو جنگ وجدال کے معرکے ہوتے رہے اور دوسری طرف علم وفن کی بھی قدر دانی ہوتی رہی۔ دکن کی دوسری مملکتوں کی طرح یہ بھی آپس کی رقابت اور امراء کی سازشوں سے کمزور ہوتی گئی اور حکومت نظام شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

دکن کے ان پانچ خود مختار حکمران خاندانوں میں سے ایک قطب شاہی خاندان ہے جو بہمنی سلطنت کے خاتمے پر ظہور میں آیا، اور قطب شاہی لقب سے موسوم ہوا جو بہمنی بادشاہوں کے ماتحت اس کے بانی سلطان قلی کو حاصل تھا جب احمد نگر، بیجا پور اور برار کے صوبائی گورنروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اس وقت تک سلطان قلی بہمنی حکمران محمود کے دربار ہی میں تھا۔ 1493ء میں سلطان قلی کو قطب الملک کا لقب ملا اور اس نے باغیوں کو پسپا کیا تو 1495ء میں اسے بصور انعام تلنگانہ کی حکومت دے دی گئی۔ اس نے 1512ء تک ظاہری طور پر بہمنیوں سے وفاداری قائم رکھی اس کے بعد اس نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ قطب شاہی خاندان کے ہر ایک حکمران نے قطب شاہ کا امتیازی لقب اختیار کیا اگرچہ مغل شہنشاہوں نے انہیں کبھی یہ لقب نہیں دیا بلکہ وہ انہیں ہمیشہ قطب الملک ہی بلاتے رہے۔ اورنگ زیب نے 1687ء میں گول کنڈہ فتح کر قطب شاہی حکومت کا خاتمہ کیا۔ گول کنڈہ دکن کی پانچوں آزاد ریاستوں میں اہمیت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر تھا۔ حیدر آباد کے گول کنڈہ کی سلطنت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ دراصل دکنی کلچر کا آغاز اور مسلمانوں کے تمدن اور تہذیب میں تلنگانہ

کے کلچر کو داخل کرنے کا بڑا سہرہ قطب شاہی سلطنت کے سر ہے خصوصیت سے ابراہیم سے لے کر محمد قلی قطب شاہ تک اس کے ہیرو قرار دئے جا سکتے ہیں۔

برار کی عماد شاہی حکومت کے بانی فتح اللہ عماد الملک نے بہمنی حکومت کے دوسرے صوبہ داروں کی طرح 1490ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔لیکن بعض مورخ اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ اس نے بادشاہی کا اعلان نہیں کیا تھا بلکہ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے علاء الدین نے تخت نشینی کے بعد اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔اس کے عہد میں گجرات کے حکمران بہادر شاہ نے برار پر فوج کشی کی اور علاء الدین نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔علاء الدین کے فرزند دریا عماد شاہ نے اس جنگ وجدال کو ختم کرنے کے لئے اپنی بیٹی کی شادی نظام شاہی حکمران حسین نظام شاہ سے کردی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک برار میں امن وامان رہا۔دریا عماد شاہ کے بعد چونکہ اس کا بیٹا برہان عماد شاہ کم سن تھا اس کا فائدہ اُٹھا کر اس کے ایک امیر تفال خان نے اسے نظر بند کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا۔چونکہ نظام شاہی حکمران سے عماد شاہی حکومت کی رشتہ داری قائم ہو چکی تھی اس لئے مرتضیٰ نظام شاہ نے تفال خان کے خلاف برار پر فوج کشی کی اور 1572ء میں پورا علاقہ برار کا اپنی حکمرانی میں شامل کر لیا۔

بیدر کی برید شاہی حکومت کا بانی قاسم برید ہے اس نے بھی دوسرے بہمنی گورنروں کی طرح بیدر میں علیحدہ حکومت قائم کی۔اس خاندان میں پانچ اشخاص یکے بعد دیگرے بیدر میں حکومت کرتے رہے۔ہمسایہ حکومتوں میں سے عادل شاہوں کے ان سے معرکے ہوتے رہے کبھی ان کو اور کبھی عادل شاہوں کو غلبہ حاصل ہوتا۔محمد عادل شاہ کے زمانہ میں بیدر عادل شاہی حکومت میں شامل ہوا اس طرح برید شاہی حکومت ختم ہوگئی۔برید شاہی حکومت بہت مختصر عرصہ کے لئے ہی قائم ہوئی تھی مگر اس خاندان نے علم وفن کی خدمت کی اور دکن کلچر کو فروغ دیا۔

10.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے:

(1) بہمنی سلطنت کے خاتمے پر کون کون سی حکومتیں قائم ہوئیں؟ ان کا قیام کہاں ہوا اور کب سے کب تک رہا؟

(2) عادل شاہی حکومت کے عروج وزوال پر نوٹ لکھئے۔

(3) نظام شاہی حکومت کے کارناموں پر روشنی ڈالئے۔

(4) قطب شاہی حکومت پر نوٹ لکھئے۔

(5) بریدی حکومت یا برار حکومت میں سے کسی ایک پر روشنی ڈالئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

(1) عادل شاہی حکمرانوں کی علمی سرپرستی پر نوٹ لکھئے۔

(2) عادل شاہی حکومت کی معاشرتی زندگی مختصراً بیان کیجئے۔

(3) محمد قلی قطب شاہ کے عہد پر نوٹ لکھئے۔

(4) چاند بی بی کون تھیں؟ ان کے انتظامی اقدامات پر روشنی ڈالئے۔

(5) عماد شاہی حکومت کا خاتمہ کیسے ہوا؟

(6) بریدی حکومت کی تعمیرات پر نوٹ لکھئے۔

10.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

(1) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ فرشتہ (مترجم عبدالحی خواجہ) لاہور پاکستان

(2) دائرۃ المعارف: شعبہ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(3) Masudul Hasan History of Islam

(4) S.K.Panday Medieval India

(5) محمد نصیر الدین ہاشمی: دکنی کلچر

اکائی۔11: جون پور کی شرقی حکومت، سوری خاندان کی حکومت

اکائی کے اجزاء

11.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء شرقی حکومت اور سور حکومت کے مشہور سلاطین، ان کے اوصاف و سیرت، طرز حکومت نیز ان کے

اہم کارناموں، جنگوں اور اصلاحات سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

11.2 تمہید

اس اکائی میں شرقی وسور حکومتوں کا اجمالی تعارف کرایا جائے گا۔ ان کے قیام وزوال کے ساتھ ساتھ مشہور حکمران اور ان کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی ان کے علاوہ ان کے عہد کے نظم ونسق: مرکزی وصوبائی نظام، محکمہ قضا، محکمہ محصول، تعمیرات، علم وعلماء کی سرپرستی پر بھی اظہار خیال کیا جائے گا۔

11.3 شرقی حکومت کا قیام

جونپور کی بنیاد فیروز شاہ تغلق نے اپنے چچیرے بھائی جونا خان یعنی محمد بن تغلق کی یاد میں 1359ء میں اپنے بنگال پر حملہ کے دوران رکھی تھی۔ یہ دہلی سلطنت کے مشرقی صوبوں کا دارالسلطنت تھا۔ جونپور میں آزاد حکومت کی بنیاد ملک سرور نام کے ایک خواجہ سرا جس کا لقب ملک الشرق رکھی تھی یہ حکومت شرقی حکومت کہی جاتی ہے۔

11.3.1 ملک سرور(1394-1399):

ملک سرور سلطان محمد بن تغلق کا ایک غلام تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد جانشینی کی خانہ جنگی میں اہم کردار نبھایا اس لئے اسے حکومت میں اہم مقام حاصل ہوگیا۔ سلطان ابوبکر شاہ(1390-1389) کے وقت اہم منصب حاصل کیا۔ اس کے بعد اس خانہ جنگی میں ناصر الدین محمد شاہ(1394-1390) کا ساتھ دیا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے ملک سرور کو خواجہ جہاں کا لقب عطا کیا اور اپنا وزیر اعظم منتخب کیا۔ بعد میں ملک الشرق کا لقب عطا کر اسے مشرقی علاقوں کا منتظم بنایا۔ ناصر الدین محمد کے انتقال کے بعد ملک سرور کی مدد سے ہی ناصر الدین محمود(1413-1394) تخت نشین ہوا۔ ناصر الدین محمود نے اسے اپنا وزیر منتخب کیا اور جون پور کا والی مقرر کیا جس کے ماتحت بہار میں ترہٹ تک کا علاقہ تھا۔ ملک سرور نے اس علاقے کا اچھا انتظام کیا اور اپنی خوش اسلوبی سے گردونواح کے راجاؤں کو اپنا مطیع بنایا۔ وہ قلعے جو غیر مسلمانوں کے قبضے میں تھے ان کو اپنے قبضہ میں کر کے تجربہ کار سپاہیوں کے سپرد کیا۔ رفتہ رفتہ اس کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی زمانہ میں تیموروں نے بھی ہندوستان پر حملہ بولا جس سے حکومت درہم برہم ہونے لگی اور ناصر الدین محمود کا اثر کم ہونے لگا جس کا فائدہ ملک سرور نے اٹھایا اور سلطان الشرق کا لقب اختیار کیا اور علی گڑھ سے لے کر بہار کے ترہٹ تک کے علاقے پر قابض ہوا اور تمام باغیوں اور سرکشوں کو مغلوب کیا اور بڑی شان وشوکت سے حکومت کرنے لگا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق اس نے اپنی دھاک ایسی بٹھائی کہ سلاطین بنگال اور لکھنوبھی اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے اور اس کی خدمت میں تحفے ارسال کرتے رہتے تھے۔ ملک سرور نے چھ سال حکومت کی اور 1399ء میں اس کا انتقال ہوا۔

معلومات کی جانچ:

(1) شرقی حکومت کی بنیاد کہاں اور کس نے رکھی تھی؟

(2) ملک سرور کون تھا؟ پانچ سطر لکھیئے۔

11:3:2 مبارک شاہ شرقی (1399-1401)

ملک سرور کے انتقال کے بعد اس کے متبنی بیٹے ملک قرنفل نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور نظام حکومت کو درست کر کے اپنی قوت میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا۔ ان دنوں سلطنت دہلی زوال پذیر تھی۔ ملک قرنفل نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور مبارک شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنے کو سلطان کہا، سکہ جاری کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ تغلق حکمران سلطان ناصرالدین محمود کے وکیل مطلق اقبال خان کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ سخت غصے میں آیا اور جون پور حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اقبال خان جب قنوج پہونچا تو مبارک شاہ بھی اپنی جرار فوج لے کر مقابلہ کو گیا۔ دونوں فوجوں کے بیچ گنگا حائل ہوئی۔ ایک کنارے پر اقبال خان نے قیام کیا اور دوسرے کنارے پر مبارک شاہ اپنے لشکر کے ساتھ مقیم ہوا۔ دونوں فریقین میں سے کسی نے بھی دریا پار کر کے حریف تک پہونچنے کی کوشش نہ کی۔ دو ماہ اسی عالم میں گزر گئے آخر بغیر جنگ کے ہی دونوں فریق اپنے اپنے علاقے لوٹ آئے۔ مبارک شاہ جب جون پور پہونچا تو اسے معلوم ہوا کہ سلطان ناصرالدین محمود جو مالوہ میں تھا واپس لوٹ آیا ہے اور اقبال خان کو ساتھ لیکر جون پور کو فتح کرنے کے ارادے سے سفر اختیار کیا ہے۔ مبارک شاہ نے بھی جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن جنگ سے قبل ہی اسکا 1401ء میں انتقال ہوا۔

11:3:3 ابراہیم شاہ شرقی (1401-1440)

مبارک شاہ کے انتقال کے بعد اسکا چھوٹا بھائی ابراہیم شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ چونکہ مبارک شاہ کے عہد میں سلطان ناصرالدین اور اقبال خان جونپور کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے، ابراہیم شاہ نے بھی حکومت سنبھالتے ہی ایک زبردست لشکر جمع کیا اور حریف سے معرکہ آرا ہونے کے لئے دریائے گنگا کے کنارے مقیم ہوا۔ فریقین ایک مدت تک ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے رہے لیکن جنگ کی نوبت نہ ہوئی۔ اسی دوران اقبال خان اور سلطان ناصرالدین محمود میں نااتفاقی ہوگئی۔ سلطان ناصرالدین محمود ابراہیم شاہ شرقی سے آملا۔

اس واقعہ کے بعد اقبال خان دہلی اور ابراہیم شرقی جونپور بنا کسی جنگ کے لوٹ آئے۔ 1406ء میں اقبال خان کا انتقال ہوا اور سلطان ناصرالدین محمود دہلی کی طرف روانہ ہوا، ابراہیم شرقی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور 1407ء میں قنوج پر حملہ بول دیا۔ اگلے سال 1408ء ابراہیم شرقی نے دہلی فتح کرنے کا ارادہ کیا لیکن اسی بیچ اسے خبر ملی کہ سلطان مظفر گجراتی سلطان ناصرالدین محمود کی مدد کے لئے آرہا ہے اور اسکا ارادہ جونپور پر قبضہ کرنے کا بھی ہے۔ ابراہیم شرقی نے اس اطلاع کے بعد دہلی پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد اس کے عہد میں کوئی بڑا معرکہ نہیں ہوا۔ 1440ء میں ابراہیم شاہ شرقی بیمار پڑا اور اسی بیماری میں اسکا انتقال ہوا۔

ابراہیم شاہ شرقی عقل وفہم اور علم وفضل کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کے علماء وفضلاء کے علاوہ ایران کے علماء بھی جونپور آئے۔ ابراہیم شرقی نے ہر طرح سے ان کی دل جوئی کی۔ انہیں امن واطمینان سے زندگی گزارنے کا سامان بہم پہونچایا۔ اس کے دربار میں علماء کی ایک ایسی جماعت جمع ہوگئی کہ جون پور ایک اہم علمی مرکز بن گیا۔ اس عہد حکومت کے علماء وفضلاء میں قاضی شہاب الدین جون پوری بڑی اہمیت رکھتے ہیں ابراہیم شاہ شرقی ان کے علم کا بڑا قدر دان تھا۔ مصنف تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ قاضی صاحب کی توقیر

وتعظیم کا یہ عالم تھا کہ مقدس دنوں میں قاضی صاحب شاہی مجلسوں میں چاندی کی کرسی میں بیٹھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار قاضی صاحب بیمار پڑے، ابراھیم شرقی ان کی مزاج پرسی کے لئے گیا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ابراہیم شرقی نے ایک پیالہ پانی کا طلب کیا اور پیالے کو اس نے قاضی صاحب کے سر پر تصدیق کر کے خود پی لیا اور کہا" اے خُدا جو مصیبت قاضی صاحب کے سر پر پڑی ہوئی ہے اس سے انہیں نجات دے اور مجھ کو اس مصیبت میں ڈال دے تا کہ قاضی صاحب صحت یاب ہو جائیں"۔ اس واقعہ سے ابراہیم شرقی کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے علمائے دین سے کس قدر عقیدت تھی۔

ابراہیم شاہ شرقی کے عہد ہی میں شرقی اسلوب نے جنم لیا۔ فارسی زبان میں کئی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ جس میں حاشیہ ہندی، مصابح متن، بدیع البیان، فتاویٰ ابراہیم شاہی، تفسیر فارسی المعروف بہ بحر مواج، رسالہ مناقب سادات اور رسالہ شہابیہ وغیرہ۔ ابراہیم شاہ شرقی نے تعمیر کے میدان میں اٹالہ مسجد اور جھانجھری مسجد تعمیر کروائی۔ جونپور کو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مغل بادشاہ نے اس کی تعبیر شیراز سے کی تھی۔ اس لئے جونپور کو شیراز ہند بھی کہا جاتا ہے۔

معلومات کی جانچ

(1) ابراہیم شاہ شرقی کے کارناموں پر مختصر نوٹ لکھیئے۔

(2) قاضی شہاب الدین جونپوری اور ابراہیم شاہ شرقی کے تعلقات کو اُجاگر کریں۔

(3) ابراہیم شاہ شرقی کے عہد کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالیئے۔

11.3.4 محمود شاہ (1440-1457)

ابراہیم شاہ شرقی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمود خان سلطان محمود شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا اور بڑی کامیابی سے سلطنت کے کاموں کو سرانجام دینے لگا۔ اس نے ابراہیم شرقی کی تقلید کر کے رعایا کو ہر ممکن طریقے سے خوش وخرم رکھنے کی کوشش کی اسی وجہ سے ملک کے سارے باشندے اس سے بھی بے پناہ محبت کرنے لگے۔ محمود شاہ کی بڑی کامیابی چنار پر قبضہ ہے۔ اس نے کالپی اور دہلی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ 1457ء میں اسکا انتقال ہوا۔ اپنی وفات سے دو سال قبل محمود شاہ نے اپنے بیٹے بھیکن کے نام سے سکہ بھی جاری کیا تھا۔

محمد شاہ (1457-58)

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا بھیکن محمد شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ وہ مزاجاً بہت سخت اور ظالم تھا۔ ایک ہی سال کے بعد بھائی حسین شاہ نے تخت پر قبضہ کرلیا۔

حسین شاہ (1458-1479)

حسین شاہ شرقی حکومت کا آخری حکمراں تھا۔ اس کے عہد میں دہلی اور جون پور کے بیچ کشیدگی بڑھتی گئی۔ جب حسین شاہ نے حکومت

کی باگ ڈور سنبھالی تو بہلول لودھی دہلی کا حکمران تھا۔حسین شاہ نے بہلول لودھی سے صلح کی، جو چار سالوں تک چلی۔اس دوران حسین شاہ نے ترہٹ کے زمینداروں کی بغاوت کو کچلا اوراڑیسہ کے حاکم کو خراج دینے پر مجبور کیا۔67-1466ء میں گوالیار کے راجا مان سنگھ کو اپنا باجگزار بنایا۔ ان سب کامیابیوں سے اس کی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔اس کے بعد حسین شاہ نے دہلی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں دہلی اور جونپور کے بیچ کشیدگی بڑھی۔دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے اس نے کئی بار کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔بہلول لودی نے اسے شکست دے کر بہار میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔آخر میں سکندر لودی نے اسے بُری طرح شکست دی اور جونپور کو دہلی سلطنت میں ملالیا اور اس کے ساتھ شرقی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

معلومات کی جانچ

(1) محمود شاہ کس کا جانشین تھا؟

(2) حسین شاہ کے متعلق چند سطریں لکھیے۔

113.5 تعمیرات

شرقی حکمرانوں نے علم اور علماء کی سر پرستی کی اور فن تعمیر میں دلچسپی لی۔عہد شرقی کی اہم تعمیرات میں اٹالہ مسجد، لال دروازہ، جامع مسجد اور جانجھری مسجد ہیں۔اٹالہ مسجد کی بنیاد 1367ء میں فیروز شاہ تغلق نے رکھی تھی مگر تعمیر 1408ء کا کام مکمل ہوئی۔ابراہیم شاہ شرقی کے ہی عہد حکومت میں جانجھری مسجد کی تعمیر کا کام 1430ء میں پورا ہوا۔لال دروازہ 1450ء میں محمود شاہ کے زمانے میں تعمیر کیا گیا اور جونپور کی جامع مسجد آخری شرقی حکمراں حسین شاہ کی یادگار ہے۔

معلومات کی جانچ

(1) عہد شرقی کی چند مشہور عمارتوں کے نام لکھیے؟

(2) اٹالا مسجد کی بنیاد کس نے رکھی اور کس کے عہد میں تعمیر کا کام مکمل ہوا؟

11.4 سور خاندان کی حکومت: پس منظر

سور افغان کا ایک قبیلہ ہے۔شیر شاہ جس نے مغل بادشاہ ہمایوں کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ کے علاقے میں سور خاندان کی بنیاد رکھی، وہ اسی قبیلے سے تھا۔دائرۃ المعارف کے مطابق سور لودھیوں کے ایک قبیلہ کی شاخ ہے جب بہلول لودھی دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس کی کوشش سے بہت سے افغان ہندوستان آئے،ان میں سے سور کی ایک جماعت بھی ابراہیم خان سور کی قیادت میں یہاں آئی۔ابراہیم خان کے چار بیٹے تھے: حسین، احمد، محمود اور غازی۔حسین اور محمود جونپور میں آ کر بس گئے۔حسین کو بعد میں صوبہ بہار میں سہسرام اور خواص پور ٹانڈہ کی جاگیر ملی۔اس کے چار بیٹے تھے: فرید، نظام، سلیمان اور احمد۔فرید آخر کار شیر شاہ کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

فرید کی تعلیم جونپور میں ہوئی۔ تعلیم کے مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے والد حسین کی جاگیروں کا داروغہ بنا۔ اس نے نظام وانصرام کو درست کیا، سرکشوں کو قتل کیا۔ اس طرح تمام شر پسند اس کے مطیع اور فرمانبردار بن گئے اور مالگزاری وقت پر ادا کرنے لگے۔ اس طرح فرید اپنی شجاعت اور سیاست کے لئے مشہور ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس کے والد حسین نے جاگیر واپس لے لی اور اپنے دو بیٹوں سلیمان اور احمد میں منقسم کردی۔

اس کے بعد فرید آزردہ ہوکر آگرہ آگیا اور ابراھیم لودھی کے مشہور امیر دولت خان لودھی کے یہاں ملازمت کرلی۔ فرید نے اپنی قابلیت سے اس کو متاثر کیا۔ جب فرید کے والد حسین کا انتقال ہوگیا تو دولت خان لودھی نے فرید کو حسین کے پرگنوں کا نگراں مقرر کردیا جس کے وجہ سے فرید اور اس کے بھائی سلیمان میں کشیدگی ہوگئی۔ اسی درمیان مغل سلطنت کا بانی بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ابراہیم لودھی کو شکست دی۔ سور خاندان کے ایک شخص بہادر خان نے بہار پر قبضہ کرلیا تھا اور سلطان محمد کا لقب اختیار کرکے بہار کا بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ فرید نے اس کی ملازمت اختیار کرلی۔ ایک دن سلطان محمد شکار کھیلنے شہر سے باہر گیا کہ اچانک ایک شیر نے حملہ بول دیا فرید نے شیر کا مقابلہ کیا اور اسے تلوار سے مار گرایا۔ اس واقعہ کے بعد سلطان محمد نے فرید کو شیر خان کے لقب سے نوازا۔ دوسری طرف فرید کے بھائی سلیمان نے حاکم جون پور محمد خان سور کے یہاں پناہ لی۔ محمد خان نے سلطان محمد کے ذریعے باپ کی جاگیر کا بھائیوں میں تقسیم کروایا۔ فرید اس تقسیم پر راضی نہ ہوا۔ دونوں میں کشیدگی ہوئی۔ فرید چونکہ سلطان محمد اور محمد خان سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا اس لئے جنید برلاس جو بابر کی طرف سے حاکم تھا کی خدمت میں حاضر ہوا اور فوجی امداد طلب کی۔ محمد خان اب فرید کا مقابلہ نہ کرسکا اور رہتاس کے پہاڑوں میں چھپ گیا۔ فرید اپنے پرگنوں کے علاوہ جون پور اور اس کے گردو نواح پر بھی قابض ہوگیا۔ اس کامیابی کے بعد فرید نے جنید برلاس کے سپاہیوں کی خوب خاطر کی اور جنید برلاس کو بھی تحفے بھیجے۔ فرید نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو بھی جمع کیا اور اپنی جماعت بنائی۔ حاکم جون پور محمد خان کو بھی رہتاس کی پہاڑی سے بُلا کر جون پور کی جاگیر لوٹادی اور اپنی جاگیر اپنے بھائی کو دی، اور خود جنید برلاس حاکم کٹرہ کی خدمت میں چلا گیا۔ اتفاق سے حاکم بابر سے ملنے جارہا تھا وہ فرید یعنی شیر خان کو بھی اپنے ساتھ آگرہ لے گیا۔ اس طرح شیر خان بابر کے خیر خواہانِ سلطنت میں شامل ہوگیا۔ اور اس طرح شیر خان کو مغلوں کے طور طریقوں اور عادات سے واقفیت ہوئی۔ ایک دن بابر کے دسترخوان پر ایک طباق ماہیچہ کا شیر خان کے سامنے بھی رکھا گیا۔ اس نے دیکھا اس طرح اس کو نہیں کھا سکتا لہٰذا اس نے ماہیچہ کو چھری سے کاٹ کر کھانا شروع کردیا۔ بابر یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ بابر نے کہا کہ اس پٹھان نے ایک عجیب کام کیا۔ شیر شاہ بابر کے اس جملہ کا اشارہ سمجھ گیا اور اسی رات شاہی لشکر سے بھاگ کر اپنی جاگیر میں پہونچ گیا اور دوبارہ سلطان محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان محمد نے شیر خان کو اپنے بیٹے جلال کا اتالیق مقرر کردیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد سلطان محمد کا انتقال ہوا اور اس کا کم عمر بیٹا جلال جانشین ہوا۔

شیر خان جلال کا نائب

جلال خان کی ماں دودو بی بی شیر خان کی مدد سے ملکی معاملات انجام دینے لگی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد دودو بی بی کا انتقال ہوا اور بہار کی حکومت پوری طرح سے شیر خان کے قبضہ میں آگئی۔ اس کو اپنی طاقت کو پھیلانے اور نظام حکومت درست کرنے کا موقع ملا۔ حکومت پر اپنی پکڑ مظبوط کرنے کے لئے اپنے پر اعتماد لوگوں کو اہم عہدوں پر مقرر کیا اسی درمیان ابراہیم لودی کا بھائی محمود لودی بہار پہونچا۔ بہار کے افغان امیروں نے اسے اپنا حاکم مان کر بابر کے خلاف جنگ کرنے کو کہا۔ مگر شیر خان اس پر راضی نہ ہوا اس نے کہا ابھی مغلوں پر حملہ کرنے کا صحیح وقت

نہیں ہے لیکن افغان امیروں کے دباؤ میں نیم رضامندی کا اظہار کیا۔ 1529ء میں بابر کے خلاف جنگ ہوئی۔ بابر نے گھاگھرا کے میدان میں افغانوں کو بری طرح شکست دی۔ محمود لودی میدان جنگ سے فرار ہوا۔ شیر خان نے بابر کی بالادستی کو قبول کیا۔ بابر نے جلال خان کو بہار کا حاکم اور شیر خان کو اس کا نائب قبول کیا۔

شیر خان کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے کچھ امیروں میں حسد پیدا ہوئی اور اس کے خلاف بنگال کے حکمران نصرت شاہ سے مدد طلب کی 1529ء میں نصرت شاہ حملہ آور ہوا مگر اسے شکست ہوئی۔ اس کے بعد شیر خان کی طاقت میں اور اضافہ ہوا اور اس نے حضرت اعلیٰ کا لقب اختیار کیا۔ 1530ء میں شیر خان نے اپنی سرحد کو بڑھاتے ہوئے چنار کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور قلعہ کے حولدار تاج خان کی بیوہ لاڈو ملکہ سے نکاح کر اس کی جائیداد کا مالک بن گیا۔

11.4.1 ہمایوں سے تصادم

ہمایوں شیر خان کی بڑھتی ہوئی طاقت پر قدغن لگانا چاہتا تھا اس لئے اس نے 1532ء میں چنار کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن چار ماہ کے محاصرہ کے بعد بھی اسے کامیابی نہیں ملی۔ اسی وقت گجرات کے حکمران بہادر شاہ نے راجستھان پر حملہ کیا۔ ہمایوں نے بہادر شاہ کے حملہ کو روکنے کے لئے شیر خان سے معاہدہ کیا جس کے تحت شیر خان نے اپنے بیٹے قطب خان کی قیادت میں ایک فوجی ٹکڑی ہمایوں کی مدد کو آگرہ بھیجی۔ یہ معاہدہ شیر خان کے لئے بھی موقع غنیمت تھا۔ 1536ء میں شیر خان نے بنگال پر حملہ کیا اور اس کی دارالسلطنت گوڑھ کی گھیرابندی کی آخر میں بنگال کے حکمران محمود شاہ نے تیرہ لاکھ دینار دے کر معاہدہ کیا۔ قطب خان بھی آگرہ سے اپنی فوج لے کر اپنے والد شیر خان کے پاس لوٹ آیا۔

ہمایوں 1537ء میں شیر خان کے خلاف چنار پہونچا اور چنار کے قلعہ کا دوبارہ محاصرہ کیا اور چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد قلعہ پر ہمایوں کا قبضہ ہوگیا۔ چنار کے بعد ہمایوں بنگال کی طرف بڑھا اور بنارس پہونچ کر معاہدہ کی بات کی اور باجگزاری قبول کرنے کو کہا۔ شیر خان اس پر راضی نہیں ہوا۔ ہمایوں اپنی فوج لیکر بنگال پہونچا اور گوڑھ کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن شیر خان نے دوسری طرف سے اپنی فوج لیکر شمالی ہندوستان یعنی بنارس، قنوج اور سنبھل کا علاقہ قبضہ کیا اور ہمایوں کے بنگال سے دلّی آنے کے سارے راستوں پر قابض ہوا۔

جنگ چوسا

1539ء میں جب ہمایوں بنگال سے آگرہ کی طرف بڑھا تو شیر خان نے چوسا کے قریب اس کا راستہ روکا۔ ہمایوں کی فوج کرم ناشا اور گنگا ندی کے دوآب میں رکی۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے تقریباً تین مہینے تک رہیں۔ موسم چونکہ بارش کا تھا اس لئے دونوں ندیوں کا پانی بڑھنے لگا جس سے مغلوں کی فوج میں کھلبلی مچ گئی ان کا توپ خانہ بیکار ہوگیا اس کا فائدہ اُٹھا کر شیر خان نے 26 جون 1539ء کو مغلوں پر حملہ کیا۔ فوج اپنی جان بچانے کے لئے گنگا میں کود گئی۔ ہمایوں نے جم کر مقابلہ کیا مگر وہ بھی تیر سے زخمی ہوا اور گھوڑے سمیت گنگا میں کود پڑا، ہمایوں کی جان ایک بھشتی نے جس کا نام نظام تھا بچائی۔ اس جنگ میں ہزاروں مغل فوجی مارے گئے۔ اس کامیابی کے بعد شیر خان نے اپنے کو سلطان کہا اور شیر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ بھی جاری کیا۔ شیر شاہ اس کے بعد اپنی فوج بھیج کر بنگال پر قابض ہوا۔

جنگ قنوج

جنگ چوسا میں شکست کے بعد ہمایوں بھشتی نظام کی مدد سے جان بچا کر آگرہ پہونچا۔ شیر شاہ نے اپنی ایک فوجی ٹکڑی اپنے بیٹے قطب خان کی قیادت میں ہمایوں کے خلاف بھیجی لیکن قطب خان کالپی کے نزدیک جنگ میں مارا گیا۔ شیر خان اس کا بدلہ لینے کے لئے قنوج پہونچا اور گنگا ندی کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ دوسری طرف ہمایوں کی فوج تھی ہمایوں ابھی جنگ کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ زبردست بارش ہوئی اور اس کے خیموں میں پانی بھر گیا۔ ہمایوں نے خیموں کو دوسری اونچی جگہ پر منتقل کرنے کا حکم دیا۔ اسی بیچ 17 مئی 1540ء کو شیر خان نے اچانک مغلوں پر حملہ کیا اور ان کو زبردست شکست دی۔ ہمایوں وہاں سے اپنی جان بچا کر آگرہ بھاگا۔ شیر خان بھی پیچھا کرتے ہوئے آگرہ پہونچا۔ اس لئے ہمایوں آگرہ سے لاہور اور لاہور سے ایران پہونچا اور وہاں کے حکمران شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ گزیں ہوا۔

معلومات کی جانچ

(1) فرید کون تھا؟

(2) جنگ چوسا پر نوٹ لکھیے۔

(3) جنگ قنوج کس کے بیچ لڑی گئی؟

11.4.2 شیر شاہ بحیثیت ہندوستان کا حکمراں

قنوج میں ہمایوں کو شکست دینے کے بعد شیر شاہ نے دلی اور آگرہ پر قبضہ کیا۔ اس نے 10 جون 1540ء کو آگرہ میں تاج پوشی کروائی اور اپنی سلطنت قائم کی۔ سلطان بننے کے بعد شیر شاہ کے سامنے کئی مشکلات تھیں۔ سب سے پہلا کام تھا مغلوں کو دوبارہ حکومت قائم کرنے سے روکنا اور ان سبھی علاقوں پر قابض ہونا جو مغلوں کے زیرِ نگیں تھے۔

پنجاب پر حملہ

شیر شاہ نے سب سے پہلے پنجاب کی طرف رُخ کیا اور وہاں کے حاکم کامران کو شکست دی۔ مغلوں کے پلٹ وار سے محفوظ رکھنے کے لئے شیر شاہ نے بولن درّے اور پشاور سے آنے والے سبھی راستوں پر حفاظتی دستے بٹھائے اور اہم بلوچی سرداروں: اسلام خان، فتح خان اور غازی خان کو اپنے طرف ملا لیا۔

مالوہ پر حملہ

اس وقت مالوہ ملّو خان کے قبضہ میں تھا جو گجرات کے حاکم بہادر شاہ کی طرف سے صوبہ دار تھا مگر ملّو خان نے بہادر شاہ کے انتقال کے بعد قادر خان کا لقب اختیار کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور مانڈو، سارنگ پور، اُجین اور رنتھمبور پر قبضہ جما لیا تھا۔ 1542ء میں شیر شاہ مالوہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں گوالیار کے قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ گوالیار کا حکم پورن مل تھا جس نے شیر شاہ کی باجگزاری قبول کی۔ وہاں سے

شیر شاہ سارنگ پور کی طرف روانہ ہوا وہاں کے حاکم قادر شاہ نے شیر شاہ کی اطاعت قبول کی۔اس کے بعد شیر شاہ نے مانڈو اور اُجین پر قبضہ کیا اور شجاعت خان کو وہاں کا نگراں مقرر کیا۔آگرہ واپسی پر شیر شاہ نے رنتھمبور کے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

رائے سین پر حملہ

رائے سین ایک مضبوط صوبہ تھا یہاں کا حاکم پورن مل بہت طاقتور تھا اس نے کئی پرگنوں پر قبضہ کر دو ہزار مسلمان عورتیں اپنے حرم میں داخل کر رکھی تھیں، یہ مسلمان عورتیں رقاصاؤں اور گانے بجانے کا کام انجام دیتی تھیں۔شیر شاہ نے جب یہ واقعہ سنا تو صوبہ رائے سین پر حملہ آور ہوا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔محاصرے کی طوالت کی وجہ سے شیر شاہ نے صلح کی بات چیت شروع کی، اس نے پورن مل سے وعدہ کیا کہ اس کی جان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور قلعہ کی جانچ کے بعد قلعہ اسے لوٹا دیا جائے گا۔پورن مل اپنے بال بچوں اور چار ہزار راجپوتوں کے ساتھ قلعہ کے باہر ایک جگہ پر قیام پذیر ہوا۔جانچ کے دوران مسلم عورتوں نے پورن مل کے ظلم وستم کی شکایت اور اسے سزا دینے کی گزارش کی۔شیر شاہ کو اچھا بہانہ ملا اور اس نے قلعہ پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں لیا۔

ملتان کی فتح

جب شیر شاہ پنجاب میں مصروف جنگ تھا تو اسے بنگال میں بغاوت کی خبر ملی۔اس نے فوج کے انتظام کو درست کیا اور ہیبت خان کو ذمہ دار بنا کر خود بنگال کی بغاوت کو کچلنے کے لئے روانہ ہوا۔ادھر ہیبت خان نے ملتان کے حاکم فتح خان بلوچ کو ہرا کر 1543ء میں پورے ملتان کو قبضہ میں لے لیا۔اس کامیابی کے بعد قندھار سے ہندوستان کو آنے والے سارے راستے شیر شاہ کے اختیار میں آ گئے۔

مارواڑ پر حملہ

شیر شاہ کے سامنے سب سے بڑی مشکلات راجپوتانہ کے صوبے تھے جہاں کئی ایک آزاد اور طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔سب سے پہلے شیر شاہ نے مارواڑ کی طرف رخ کیا۔وہاں کا حکمران مال دیو تھا وہ بہت بہادر اور قابل حاکم تھا اسکی سرحدیں سیوانا، جالور، ٹونک، اجمیر اور جھاجھر تک پھیلی ہوئی تھیں۔جھاجھر دلی سے صرف تیس میل دور تھا اس لئے مال دیو شیر شاہ کے لئے کبھی بھی مشکلات کھڑا کر سکتا تھا۔اس لئے شیر شاہ مالدیو کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اپنی سرحد کی حفاظت کے لئے مال دیو کے خلاف مارواڑ کی جانب روانہ ہوا اور جودھ پور کا محاصرہ کیا۔یہ محاصرہ ایک مہینہ تک چلتا رہا، جب کچھ خیر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تو شیر شاہ نے جعلی خطوط کے ذریعہ سرداروں اور افسروں میں پھوٹ ڈال دی۔ان حالات کو دیکھ کر مال دیو سیوان کی طرف بھاگ گیا۔آخر میں راجپوت سرداروں نے بہت بہادری سے شیر شاہ کی فوج کا سامنا کیا مگر شکست ہوئی۔اس جنگ میں راجپوتوں کے حملوں سے شروع میں شیر شاہ کی فوج درہم برہم ہوگئی اور شیر شاہ کے قدم ڈگمگانے لگے لیکن اچانک ایک افغان امیر جلال خان جو اپنی شجاعت کے لئے مشہور تھا ایک فوجی ٹکڑی کے ساتھ حملہ آور ہوا جس کی وجہ سے شیر شاہ کو فتح نصیب ہوئی۔اس حملہ میں راجپوتوں کی بہادری کو دیکھ کر شیر شاہ نے کہا تھا کہ ''خیر گذری ورنہ ایک مٹھی بھر باجرے کے لئے ہندوستان کی سلطنت کھو بیٹھا تھا''۔

چتوڑ پر حملہ:

مارواڑ کی کامیابی کے بعد شیر شاہ نے چتوڑ کا رُخ کیا۔اس وقت وہاں کا راجا راڑا ادے سنگھ تھا، جو کم عمر تھا۔اس نے بنا جنگ کے ہی

شیر شاہ کی اطاعت قبول کر لی۔

کالنجر پر حملہ

چتوڑ کی کامیابی کے بعد شیر شاہ کالنجر کی طرف بڑھا۔ کالنجر کا حکمران کیرت سنگھ تھا۔ کانجر کا قلعہ بہت مشہور اور مضبوط حصار کا قلعہ تھا۔ 1544ء میں شیر شاہ ایک بہت بڑی فوج لیکر کالنجر پہونچا اور قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مہینوں کے بعد بھی جب کامیابی نہیں ملی تو شیر شاہ نے قلعہ کی دیوار کو بارود سے اُڑانے کا حکم دیا۔ شیر شاہ جہاں خود کھڑا تھا اسی جگہ بارود کے بھرے ہوئے ڈبے رکھے ہوئے تھے ان کو سپاہی آگ لگا کر قلعہ کے اندر پھینک رہے تھے۔ اتفاق سے ایک گولہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر بارود کے دوسرے ڈبوں کے درمیان آگرا۔ اس کے گرتے ہی سارے ڈبوں میں آگ لگ گئی۔ شیر شاہ بُری طرح جل گیا، اس حالت میں بھی اس نے قلعہ کو فتح کرنے کا حکم دیا۔ شام ہوتے ہوتے کامیابی ملی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس کامیابی کے بعد شدید جلنے کی وجہ سے شیر شاہ کا انتقال 22 مئی 1544ء کو ہوا۔ کالنجر کی کامیابی شیر شاہ کی آخری کامیابی تھی۔

معلومات کی جانچ

(1) شیر شاہ سوری کے جنگی کارناموں پر روشنی ڈالیے؟

(2) شیر شاہ کے کالنجر کے حملہ پر ایک نوٹ لکھیے۔

11.4.3 شیر شاہ کا نظم ونسق

شیر شاہ ایک بہادر وعظیم سپہ سالار وحکمراں ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انتظامی قابلیت رکھنے والا شخص بھی تھا۔ مشہور مورخ کین (Keen) کے مطابق "اس پٹھان نے پانچ سالوں میں اتنا کچھ کرڈالا جتنا کہ مغل یہاں تک کہ انگریز بھی نہیں کر پائے"۔ بقول سمتھ (Smith) اگر شیر شاہ کچھ سال تک اور زندہ رہتا تو ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کا نام ونشان نہ ہوتا۔

مرکزی نظام حکومت:

سور حکومت کا مرکز خود سلطان تھا، وہ ہر سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ مرکزی نظام حکومت کو کامیابی سے چلانے کے لئے چار اہم محکمے تھے۔

(1) دیوانِ وزارت: یہ مرکزی نظام کا سب سے اہم محکمہ تھا۔ اس کا انچارج وزیر ہوتا تھا، اس کا اہم کام مال وزر کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے محکموں کے بھی انتظامات دیکھتا تھا۔

(2) دیوانِ عرض: یہ محکمہ حرب تھا۔ اس کا افسر عرض ممالک کہا جاتا تھا۔ فوج کا نظم وضبط، تنخواہ وضروریات وغیرہ سب کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

(3) دیوان رسائل: اس محکمہ کو دیوان محتسب بھی کہا جاتا تھا۔ یہ وزیر خارجہ کی طرح کام کرتا تھا اس کا کام ملک کی سیاسی مصلحت اور اس کے طرز عمل پر نظر رکھنا ہوتا تھا۔

(4) دیوان انشاء: یہ شاہی دفتر معتمدین (Secretriat) تھا اس محکمہ کا اعلیٰ افسر دبیر ممالک کہلاتا تھا، اس کا اہم کام شاہی فرمانوں کو لکھنا اور متعلقین افسروں کے پاس بھیجنا ہوتا تھا۔

ان کے علاوہ کچھ اور محکمہ بھی تھے مثلاً:

(5) دیوان القضا: یہ محکمہ انصاف تھا۔

(6) دیوان برید: یہ محکمہ ڈاک تھا۔

صوبائی نظام حکومت

سور سلطنت کئی صوبوں میں منقسم تھی جن کا نظم وضبط صوبہ دار یا فوجدار کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ شیر شاہ نے اپنے پورے مقبوضہ کو 66 سرکاروں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر سرکار میں شہ دار شہ داران اور منصف منصفان نام کے دو اعلیٰ افسر ہوتے تھے۔ شہ دار شہ داران کے ذمہ ضلع کے نظم وضبط پر نظر رکھنا ہوتا تھا اور سماج میں امن کی بحالی تھی۔ منصف منصفان محکمہ انصاف سے متعلق تھا یہ پرگنوں کے منصفوں کے خلاف اپیل سنتا تھا۔

پرگنوں کا نظام

ہر سرکار کئی کئی پرگنوں میں منقسم تھی۔ ہر پرگنہ میں ایک شقدر، ایک منصف اور ایک فوتہ دار (خزانچی) اور دو کارکن ہوتے تھے۔ شقدار کے ساتھ ایک فوجی دستہ ہوتا تھا جس کا کام پرگنہ میں امن کی بحالی تھا۔ منصف کا کام دیوانی مقدمہ کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ زمین کی پیائش اور لگان کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ کارکن کے ذمہ حساب وکتاب لکھنا ہوتا تھا۔ کھاتے فارسی اور مقامی زبان (ہندوی) دونوں میں لکھے جاتے تھے۔

موضع (گاؤں) کا نظام

شیر شاہ کے نظام حکومت میں موضع کا نظام سب سے چھوٹی اکائی تھی۔ ہر پرگنہ کئی موضع میں منقسم تھا۔ موضع کا اعلیٰ افسر مقدم یا کھیا کہلاتا تھا اس کے ذمہ موضع میں امن کی بحالی تھی۔ حفاظت اور صفائی کی ذمہ داری پنچایت کو ہوتی تھی۔

فوجی نظام

شیر شاہ نے ایک بہت بڑی فوج قائم کی تھی۔ فوجی نظام میں وہ کچھ حد تک علاء الدین خلجی سے متاثر تھا۔ اس کی فوج گھڑ سوار، پیدل، ہاتھی اور توپ خانہ پر مشتمل تھی۔ اسکی دو سطحی فوج تھی: مرکزی اور صوبائی۔ صوبائی فوج سے ضرورت کے وقت مدد بھی لی جاتی تھی۔ اس کی مرکزی فوج میں ایک لاکھ پچاس ہزار گھڑ سوار، پچیس ہزار پیدل اور پانچ ہزار ہاتھی تھے۔ اس کے گھڑ سوار محکمہ میں زیادہ تر افغانی تھے۔

شیر شاہ نے فوجی نظام میں بھی بہت سے سدھار کئے تھے۔

(1) داغ کا نظام: اس نظام میں جنگی گھوڑوں کے پیٹھ پر ایک مہر لگائی جاتی تھی تا کہ وہ تمام گھوڑوں سے الگ نظر آئے۔ حکومت کی مخصوص چراگاہوں میں صرف مہر لگے گھوڑوں کو ہی جانے کی اجازت تھی۔

(2) چہرہ کا نظام: اس میں فوجیوں کی پوری تفصیل لکھی جاتی تھی مثلاً اس کا نام، فوجی اور علمی قابلیت، جسامت، پتہ وغیرہ۔

(3) تنخواہ: فوجیوں کو تنخواہ نقد دی جاتی تھی۔ جاگیریں دینے کا رواج نہیں تھا۔

(4) منتقلی: فوجی اعلیٰ افسروں اور متوسط افسروں کو ایک جگہ پر دو سال سے زیادہ وقت تک نہیں رکھا جاتا تھا، عہدیداروں میں تبادلہ کا طریقہ رائج تھا۔

محکمہ پولیس

شیر شاہ کے عہد میں پولیس کا کوئی الگ نظام نہیں تھا۔ افسر اپنے اپنے علاقوں میں امن وامان کی بحالی کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ ہر صوبہ میں یہ کام شقدار شقداران کا ہوتا تھا۔ گاؤں میں یہ ذمہ داری چودھری کی ہوتی تھی۔ چوروں سے ہونے والی نقصان کی تلافی اس علاقے کے عہدہ داروں سے کرائی جاتی تھی اگر وہ چوری کا مال برآمد کرنے میں ناکام ہو۔

محکمہ جاسوس

شیر شاہ کا محکمہ جاسوس اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ملک کے تمام اہم مقامات پر جاسوس متعین تھے، جن کا کام ملک کے اندر و باہر ہونے والی تمام سرگرمیوں پر گہری نظر رکھنا اور شیر شاہ کو اس سے باخبر رکھنا ہوتا تھا۔

دیوان القضاء

شیر شاہ کے نظام حکومت کی اہم خاصیت اس کی غیر متعصب عدلیہ کا نظام تھا۔ وہ خود قاضی القضاۃ تھا اور ہر بدھ کو وہ خود مقدمہ کی سنوائی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ پرگنوں میں منصف اور سرکاروں میں منصفِ منصفان اس کام کو انجام دیتے تھے۔ فوجداری مقدمہ شقدار شقداران سُنا کرتے تھے۔ علاوہ بریں قاضی اور امیر عدل کے نام کے عہدے بھی تھے جن کا کام انصاف کو بحال رکھنا تھا۔

محکمہ محصول

شیر شاہ کی اصلاحوں میں محکمہ محصول کی اصلاح سب سے اہم ہے۔ حکومت کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ محصول ولگان تھا، اس لئے کہ شیر شاہ کسانوں کی بھلائی میں حکومت کی بھلائی مانتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ٹیکس کی وصولی میں کسانوں کے ساتھ نرمی کی جائے۔ دوران جنگ فصلوں کو نقصان پہونچائے جانے کی مناہی تھی۔ شیر شاہ نے حسب ذیل اصلاحیں کیں تھی:

(1) محکمہ محصول خاص طور پر رعیت واڑی تھا جس میں کسانوں سے سیدھا تعلق ہوتا تھا مگر ملتان، مالوہ، راجستھان اور مغربی پنجاب میں بٹائی (غلہ بخشی) کا نظام تھا۔

(2) لگان طے کرنے کے لئے شیر شاہ نے زمینوں کی پیائش کرائی۔ پیائش کے لئے گج سکندری کا استعمال کیا گیا اور بیگھا کو اکائی مانا گیا۔ایک بیگھا میں 3600 مربع گز تھا۔

(3) پیداوار کی بنیاد پر زمینوں کو الگ الگ اقسام میں منقسم کیا گیا۔

(4) محصول کے لئے فصل کی دروں کی ایک فہرست تیار کی گئی۔

(5) لگان کی در کل پیداوار کا 1/3 حصہ طے کیا گیا جو فصل کے کٹنے کے فوراً بعد وصول کیا جاتا تھا۔اس طرح سال میں دو بار لگان وصول کیا جاتا تھا۔

(6) لگان کی نقد و اناج دونوں شکل میں وصولی کی جاتی تھی لیکن نقدی لگان کو ترجیح دی جاتی تھی۔

(7) شیر شاہ نے پٹے کا نظام بھی شروع کیا تھا جس میں محصول کی تفصیل لکھی ہوتی تھی مثلاً فصل کی پیداوار، محصول کی رقم، آبپاشی کا انتظام، محصول کی گئی رقم کا استعمال وغیرہ۔

محکمہ مالیہ

شیر شاہ نے تین طرح کے سکے جاری کئے تھے: روپیہ، اشرف اور دام۔اس نے مخلوط سکوں کو بند کرایا اور خالص دھاتوں کے مثلاً سونے، چاندی اور تانبے کے سکے ڈھلوائے۔اسکے عہد میں تئیس ٹکسالیں تھیں۔

دوسرے عوامی کام:

(1) تجارت کو ترقی دینے کے لئے Grand Trunk روڈ بنوائے۔پہلی سڑک بنگال میں سنار گاؤں سے آگرہ، دہلی اور لاہور ہوتی ہوئی پنجاب تک جاتی تھی۔یہ سب سے لمبی سڑک تھی اور سڑک اعظم کہی جاتی تھی۔اسے شیر شاہ سوری سڑک بھی کہا جاتا تھا۔دوسری سڑک آگرہ سے برہانپور جاتی تھی۔تیسری آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ جاتی تھی۔چوتھی لاہور سے ملتان جاتی تھی۔ان سڑکوں کے کنارے سایہ دار درخت لگائے گئے تھے ہر چار میل پر مسافروں کے لئے سرائے بنائی گئی تھی اور پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔اس کے عہد میں سترہ سو سرائیں بنوائی گئی تھیں اور سرائے کا نگران شقدار ہوتا تھا۔ان سرائیوں سے ڈاک چوکیوں کا بھی کام لیا جاتا تھا۔

(2) شیر شاہ نے علم و علماء کی سرپرستی کی۔مکتب و مدرسہ قائم کئے۔اس کے عہد کا مشہور شاعر ملک محمد جائس تھا۔

(3) غریبوں اور محتاجوں کے لئے جگہ جگہ لنگر کا انتظام کیا گیا تھا۔

معلومات کی جانچ

(1) عہد سوری کی مرکزی حکومت کا تجزیہ کیجئے؟

(2) عہد سوری کے فوجی نظام پر چند سطریں لکھیئے۔

(3) عہد سوری کے محکمہ محصول پر روشنی ڈالیئے۔

11.4.4: شیر شاہ کے جانشین

شیر شاہ کے دو بیٹے تھے: عادل خان اور جلال خان۔ 1545ء میں شیر شاہ کے انتقال کے وقت عادل خان رنتھمبور میں تھا اور جلال خان ریواں میں تھا۔ انتقال کی خبر سنتے ہی دونوں کالنجر کی طرف روانہ ہوئے۔ جلال خان نزدیک ہونے کے سبب پانچ دن میں پہنچ گیا اور 25 مئی 1545ء کو امیروں نے جلال خان کو تخت پر بٹھایا اور سلطان مان لیا حالانکہ شیر شاہ نے بڑے بیٹے عادل خان کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا۔

اسلام شاہ: 1545-1553

جلال خان نے اسلام شاہ کا لقب اختیار کیا اور 25 مئی 1545ء کو سلطان بنا۔ شیر شاہ کے انتقال کے غصہ میں اسلام شاہ نے کالنجر کے راجا کیرت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا قتل کرا دیا۔ اس کے بعد وہ آگرہ پہونچا اور کچھ نئے فوجیوں کو اونچے عہدوں پر منتخب کیا جس سے پرانے افسر ناراض ہوئے اور عادل خان کو سلطان بنانے کی سوچنے لگے۔

اسلام شاہ کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے بڑے بھائی عادل خان سے تھا۔ اس نے ایک خط کے ذریعہ عادل خان کو آگرہ آنے کی دعوت دی۔ اسلام شاہ کے ارادوں سے عادل شاہ خوب واقف تھا اس لئے اس نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ لیکن شیر شاہ کے عہد کے اعلیٰ افسر مثلاً قطب خان، عیسیٰ خان، خواص خان وغیرہ کے اصرار پر عادل خان رنتھمبور سے آگرہ کے لئے روانہ ہوا۔ آگرہ پہنچنے پر ان افسروں نے عرض کیا کہ عادل خان کو بیانہ اور اس کے گرد ونوح کے علاقے جاگیر میں دے دیے جائیں۔ اسلام شاہ نے اس کو منظور کیا اور بیانہ جانے کی اجازت دے دی۔ دو تین مہینے کے بعد اسلام شاہ نے ایک امیر غازی محل کو حکم دیا کہ عادل خان کو قید کر کے پا بہ زنجیر لے کر آئے عادل خان کو جب اس کی بھنک لگی تو وہ خواص خان کے پاس میوات چلا گیا اور اسلام شاہ کے ارادوں سے باخبر کیا۔ خواص خان نے غازی محل کو بلوا کر وہی بیڑی اس کے پیروں میں ڈال دی اور اسلام شاہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ خواص خان نے دوسرے امیروں کو بھی خط لکھ کر اپنا ہم نوا بنا لیا پھر ایک جرار لشکر لے کر عادل خان کے ہمراہ آگرہ روانہ ہوا۔ قطب خان اور عیسیٰ خان نے بھی اسلام شاہ سے بددل ہو کر عادل خان کو لکھا اور ترغیب دی کہ رات کے آخری حصہ میں وہ آگرہ پہونچ جائے پھر ہم بھی آملیں گے۔ لیکن ان کے آگرہ پہونچنے میں دیر ہوئی اور صبح کے وقت آگرہ پہونچے اس کی اطلاع اسلام شاہ کو بھی ہو گئی دونوں میں جنگ ہوئی اور اسلام شاہ کو کامیابی ملی۔ خواص خان اور عیسیٰ خان میوات کے طرف بھاگے اور عادل خان کی خبر ہی نہیں ملی کہ وہ کہاں گیا اور اس کا انجام کیا ہوا۔ اسلام شاہ نے اپنی فوج خواص خان اور عیسیٰ خان کے تعاقب میں بھیجی جن کا وہ مقابلہ نہ کر سکے اور کمایوں کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ گئے۔ اس کے بعد اسلام شاہ نے دوسرے باغی امراء کو شکست دی اور قتل کروا دیا۔ ان میں بلال خان اور اس کا بھائی خداد خان، قطب خان، محمود خان، اعظم ہمایوں، شجاعت خان، خواص خان، مہدوی فرقہ کا مبلغ شیخ علائی وغیرہ اہم ہیں۔

اسلام شاہ کے آخری دنوں میں سب سے بڑا خطرہ مغلوں کی طرف سے تھا۔ ہمایوں دوبارہ طاقت بڑھا کر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن اسلام شاہ کے آگے اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسی دوران اسلام شاہ بیمار پڑا۔ اس کا فائدہ ہمایوں کو ملا اور وہ سندھوں ندی کے کنارے آپہونچا۔ اسلام شاہ بیماری کی حالت میں ہی اپنی فوج لے کر مقابلہ کو پہونچا۔ لیکن ہمایوں مقابلہ کے بجائے اپنی فوج لیکر قابل کی جانب چلا گیا۔

اسلام شاہ بھی گوالیار لوٹ آیا لیکن اس کی حالت بگڑتی گئی اور 1553ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

11.4.5 سور حکومت کا زوال

اسلام شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا فیروز خان تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر بارہ سال کی تھی لیکن تخت نشینی کے تین دن بعد ہی اس کے ماموں مبارز خان نے اس کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے محمد شاہ عادل کا لقب اختیار کیا۔ اس میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور ساتھ ہی نا اہل لوگوں کی دستگیری کی اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا۔ ان میں ایک ہندو ہیمو نام کا تھا۔ محمد شاہ عادل نے ملک کی باگڈور ہیمو کے ہاتھ میں دے دی اور خود عیاشی اور شراب نوشی میں مصروف ہو گیا۔ محمد شاہ عادل کو لوگ عدلی کہتے تھے اس کے بے تکے کاموں کی وجہ سے عدلی اندھلی میں بدل گیا جسکا مطلب اندھا ہے۔

اس کی ان حرکتوں سے افغان امراء ناراض ہو گئے، ملک میں جگہ جگہ فتنہ وفساد ہونے لگا۔ کئی ایک امراء اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے منحرف ہو گئے نتیجتاً ملک کے چاروں سمت بغاوتیں ہونے لگیں۔ اس کے چچازاد بھائی ابراہیم خان نے بغاوت کر کے دلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب میں شیر شاہ کے بھتیجے شہزادہ احمد خان نے بغاوت کر کے سکندر شاہ سوری کا لقب اختیار کیا اور بارہ سو گھڑ سواروں کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہوا اور ابراہیم خان کو شکست دیکر آگرہ اور دلی پر قابض ہوا۔ ابراھیم خان سنبھل کی طرف بھاگ گیا۔

اس خانہ جنگی اور نا اتفاقی کی وجہ سے سور سلطنت کئی حصوں میں منقسم ہو گئی۔ پنجاب، دلی، آگرہ پر سکندر شاہ کا قبضہ تھا۔ دوآبہ اور سنبھل کے علاقوں پر ابراہیم خان قابض تھا۔ چنار سے بہار تک عادل خان کے قبضہ میں تھا۔ بنگال میں محمد شاہ اور مالوہ میں باز بہادر نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اسی وقت مغل حکمران ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو دوبارہ پانے کے لئے پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ سکندر شاہ جو اس وقت دلی پر قابض تھا ایک بڑی فوج لے کر ہمایوں کے مقابلہ کو گیا۔ سرہند کے قریب جنگ ہوئی سکندر شاہ کو شکست ہوئی اور میدان جنگ سے بھاگ کر شوالک کی پہاڑیوں میں چھپ گیا۔ اس طرح دہلی اور آگرہ دونوں ہمایوں کے قبضہ میں آ گئے اور سوری سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

معلومات کی جانچ

(1) اسلام شاہ کے عہد پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(2) سور حکومت کے زوال کے اسباب بتائیے۔

(3) سور حکومت کا آخری حکمران کون تھا؟

11.5 خلاصہ

اس اکائی میں دو حکومتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک حکومت جون پور میں قائم تھی جسے شرقی حکومت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسری حکومت سور کی ہے جو دہلی میں مغل حکمراں ہمایوں کی جنگ قنوج میں شکست کے بعد قائم ہوئی تھی۔

شرقی حکومت کا بانی ملک شاہ سرور ایک خواجہ سرا تھا، مگر اپنی سیاسی وحکومتی تدابیر کے سبب ملک الشرق اور بعد میں سلطان الشرق کا لقب اختیار کر کے جون پور میں حکومت قائم کی۔ شرقی حکمرانوں میں ابراہیم شاہ شرقی کا دور عہد زریں ہے اس نے فتوحات کے علاوہ علم وعلماء کی سرپرستی میں کافی دل چسپی لی۔ جون پور علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا، دور دراز سے علماء وفضلاء یہاں آکر مقیم ہونے لگے۔ شرقی حکمرانوں نے فنون لطیفہ میں دل چسپی لی اور خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں جس کے سبب جون پور کو شیراز ہند کا خطاب دیا گیا۔

سور حکومت میں ایک ہی نام بہت اہم ہے اور وہ نام خود بانی حکومت کا ہے۔ جو بچپن سے ہی اپنی بہادری، شجاعت، تدبیری اقدامات کے لئے مشہور تھا۔ وہ فرید سے شیر خان ہوا اور شیر خان سے شیر شاہ سوری ہوا جس کی حکومت دلی، پنجاب، بہار، بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے مغل حکمران ہمایوں کو دو مرتبہ: جنگ چوسا اور جنگ قنوج میں بُری طرح شکست دی، اور ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ شیر شاہ کی عہد حکومت صرف پانچ سال ہی ہے مگر اس نے حکومت کے نظم وضبط کو ایک سمت دی۔ فوج کا معاملہ ہو یا وصول ومحاصل کا، محکمہ عدل کا معاملہ ہو یا عوامی فلاح وبہبود کا ہو سب میں یگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ شیر شاہ سوری کے ذریعہ کی گئی اصلاحات کا تجزیہ کریں تو ہم بآسانی یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے نظام حکومت کی بنیاد انہی اصولوں پر ہے جنہیں شیر شاہ سوری نے اپنے عہد میں رائج کیا تھا۔

11.6 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجئے۔

(1) ابراھیم شاہ شرقی کے کارناموں کا تجزیہ کیجئے۔

(2) شیر شاہ سوری کے نظام حکومت پر تفصیلی روشنی ڈالئے۔

(3) شرقی حکومت کے قیام پر نوٹ لکھئے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھئے۔

(1) جون پور کو شیرازِ ہند کیوں کہا جاتا ہے؟

(2) شیر شاہ سوری اور ہمایوں کے تصادم کا جائزہ لیجئے۔

(3) شیر شاہ کے محکمہ محصول کی اصلاحوں پر روشنی ڈالئے۔

(4) شرقی حکومت کے زوال پر نوٹ لکھئے۔

11.7 فرہنگ اصطلاحات

الفاظ معانی

مطیع	اطاعت کرنے والا
باجگزاری	محصول
آزردہ	خواہش مند
طباق	بڑی رکابی
محاصرہ	قلعہ بندی، گھیرا ڈالنا
جرار	بہت بھاری، کثیر
خواجہ سرا	ہجڑا، مخنث، محل سرا کا ذمہ دار
ارسال	بھیجنا، روانگی
عنان	باگ ڈور، لگام
مطلق	آزاد، قطعی
حریف	ہم پیشہ، دشمن
توقیر	عزت، وقعت، تعظیم و تکریم
تصدق	صدقہ دینا
اتالیق	استاد، تربیت دینے والا
محاصل	لگان

11.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

(1) دائرۃ المعارف

(2) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ فرشتہ (ترجمہ عبدالحی خواجہ)

(3) K.R.Qanungo - شیر شاہ

(4) Sher Shah and his Successors - A.L.Srivastava

اکائی۔12 گجرات، مالوہ اور خاندیش کی حکومتیں

اکائی کے اجزاء

12.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم گجرات، مالوہ اور خاندیش کی حکومتوں کے بارے جانکاری حاصل کرے، اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طالب علم کو معلوم ہوگا کہ ان حکومتوں میں کون کون سے حکمراں گذرے ہیں، ان کے کارنامے اور خدمات کیا ہیں، ان کے دور میں انتظامی امور کس طور سے انجام دئے جاتے تھے، نیز ان حکومتوں میں علمی سرگرمیاں کیا تھیں۔

12.2 تمہید

گجرات

قدیم زمانے سے ہی ہندو پاک سے عربوں کے تعلقات چلے آرہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' میں لکھا ہے کہ مہاراجہ اشوک نے اپنے کتبوں میں جس رسم الخط کا استعمال کیا ہے وہ داہنی جانب سے لکھا جاتا تھا اور بظاہر کسی شامی زبان سے ماخوذ تھا۔ اسی قسم کے کتبات گجرات میں بھی تھے۔ شروع سے ہی عرب تاجر گجرات آتے رہے تھے۔ مورخ مسعودی اپنی کتاب ''مروج الذہب'' میں لکھتا ہے کہ جب وہ 915ء میں گجرات کی بندرگاہ کھمبایت آیا تو یہاں کا راجا ہندو تھا اور مسلمانوں سے مذہبی معاملات پر بحث ومناظرے کیا کرتا تھا۔ عربوں کی حکومت جب سندھ پر رہی تو مسلمانوں کی آمدورفت کھمبایت تک عام تھی۔ اس لئے سندھ اور گجرات سے

مسلمانوں کا خاص تعلق رہا ہے۔ گجرات اور سندھ کا دنیا میں سب سے پہلے نقشہ ابن حوقل نے تیار کیا تھا۔ مسلمانوں نے کئی صدیوں تک چونکہ گجرات پر حکومت کی ہے اس لئے عربی و فارسی کے بہت سے الفاظ گجراتی زبان میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ تقسیم ملک کے وقت گجرات بھارت میں شامل ہوا البتہ گجرات کاٹھیاواڑہ کی ریاستوں جونا گڑھ، مانو در وغیرہ نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا مگر اسے عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔

مالوہ

مالوہ کے رقبہ میں وسطی بھارت کا بہت بڑا حصہ شمالی بھوپال اور جنوبی مشرق راجستھان کے علاقے شامل ہیں۔ اس کے شمال میں وندھیاچل کی پہاڑیاں، شمال مغرب میں اراولی کی پہاڑیاں اور مشرق میں وہ تیز کوہی نشیب ہے۔ زمین بہتر زرخیز ہے، خاص کر کپاس کی کاشت کے لئے بہت مفید ہے۔ یہاں سے دریائے چنبل، سپرا، کالی سندھ اور پاربتی گزرتے ہیں اس علاقے کی تقریباً نصف آبادی راجستھانی بولی بولتی ہے اور یہاں کے اہم شہر اندور، اجین، رتلام اور دیواس ہیں۔

یہ صوبہ قدیم زمانہ میں موریا خاندان کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ راجا اشوک اپنے والد کے عہد میں اس صوبہ کا حاکم تھا اور اس کا پائے تخت اجین میں تھا۔ بعد میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہیں اور پھر گپتا راجاؤں نے اس پر قبضہ کیا۔ جب گپت سلطنت کو زوال ہوا تو اس کا زیادہ حصہ سفید ہون کے قبضے میں آ گیا جو قنوج کے حکمران تھے اور پھر یہ علاقہ مالوہ لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا جن کے نام پر اس کا یہ نام پڑا۔ التتمش نے 1235ء میں اجین پر قبضہ کر لیا اور اس طرح مالوہ کا علاقہ سلطنت دہلی کا صوبہ بن گیا۔ ہندوؤں کی سازشوں اور چند وقتی بغاوتوں کے سوا یہ علاقہ 1392ء تک حکومت دہلی کے زیر نگین رہا۔ دہلی کی سلطنت کے انحطاط کے بعد، جو تیمور کے حملے کے بعد وقوع پذیر ہوا، افغان گورنر دلاور خان غوری نے اسے خود مختار حکومت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ہوشنگ شاہ، محمد شاہ غوری، محمود خلجی اول، غیاث شاہ، نصیر شاہ، محمود خلجی دوم اور قادر شاہ یہاں کے فرمانروا ہوئے۔

خاندیش

خاندیش حکومت کا بانی مالک راجا فاروقی تھا۔ اس کے اجداد علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے عہد میں امراء کے عہدوں پر فائز تھے۔ یہ اپنا نسب حضرت عمرؓ سے جوڑتے ہیں اس لئے انہیں فاروقی کہا جاتا ہے۔ ان کا دارالسلطنت برہان پور تھا، یہ تین بڑی بڑی سلطنتوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف بہمنی، دوسری طرف گجراتی اور تیسری طرف مالوہ کے حاکم تھے۔ خاندیش کے حکمراں شادی کا رشتہ قائم کر کے حالات کو اپنے موافق کئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ تینوں ریاستوں کی آپسی جنگ وجدال کے وجہ سے یہ بھی محفوظ تھے۔ 1382ء میں انکی حکومت قائم ہوئی اور اکبر کے عہد تک رہی اس کے بعد یہ علاقہ مغلیہ سلطنت کا حصہ ہو گیا۔

12.3 گجرات کی حکومت

آغاز اسلام کے وقت سے ہی مسلمان گجرات کاٹھیاواڑ میں بحیثیت تاجر آنے جانے لگے تھے۔ محمد بن قاسم کی آمد سے سندھ میں عربوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ محمد بن قاسم کے تین سو سال بعد محمود غزنوی کی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ 1034ء میں وہ ملتان سے انہل

واڑا پہنچا اور وہاں جا کر سومناتھ کے مشہور مندر کو جو سورٹھ کے جنوب مشرق میں ساحل سمندر پر واقع تھا، مسمار کیا۔ 1178ء میں شہاب الدین غوری کے عہد میں انہل واڑا کو قطب الدین ایبک نے اپنے قبضہ میں لیا۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی کے ایک سپہ سالار الغ خان نے اس پر قبضہ کر مسلمانوں کے اقتدار کا آغاز کیا۔ 1347ء اور 1351ء کے درمیان محمد بن تغلق نے سندھ سے گجرات کے علاقے پر کئی حملے کئے اور آخر میں اس کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ اس کے بعد فیروز شاہ تغلق نے اس ملک میں اپنا اقتدار قائم کیا جو اس زمانے سے برابر مسلمان گورنروں کے ماتحت رہا۔ ان گورنرون میں ایک کا نام ظفر خان تھا جو عہد تغلق میں سلطان نصیرالدین محمد بن تغلق چہارم کے دور میں 1391ء میں گجرات کا گورنر منتخب ہوا تھا۔ 1407ء میں ظفر خان کا لقب اختیار کر اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور مظفری ریاست کی بنیاد رکھی۔

مظفری حکومت 1407ء سے 1537ء تک قائم رہی۔

12.3.1 مظفر شاہ اول (1411-1407)

سلطان مظفر شاہ کا اصلی نام ظفر خان تھا اس کا والد سلطان فیروز شاہ تغلق کے دربار میں تھا اور ترقی کرتا ہوا معتمد علیہ کے عہدے تک پہنچا۔ مظفر شاہ اپنی پرہیزگاری اور دیانت داری کی وجہ سے مشہور ہوا۔ فیروز شاہ تغلق کے بعد سلطان محمد شاہ نے مظفر شاہ کو گجرات کا صوبے دار مقرر کیا۔ اس وقت گجرات کا گورنر فرحت الملک نے، جو مفرح کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، سلاطین تغلق کی مخالفت کر گجرات کے ہندو زمینداروں کی مدد حاصل کی اور غیر مسلم روایات کو فروغ دیا۔ فرحت الملک کے اس رویے سے تغلق سلطان محمد شاہ نے مظفر شاہ کو نیا گورنر منتخب کیا۔ مظفر شاہ جب گجرات پہنچا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور فرحت الملک کو شکست دے کر گجرات کی گورنری سنبھالی اور عدل وانصاف کو بحال کیا۔

مظفر شاہ نے 1389ء میں بیدر کے ہندو راجا کو شکست دے کر تمام علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد سومناتھ پر حملہ کیا اور ایک جامع مسجد تعمیر کروائی۔ 1396ء میں مندل گور کے راجپوتوں کی سرکشی کو کچلنے کے لئے ان کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن ان کی درخواست پر امان بحال کیا۔

مظفر شاہ کا فرزند تاتار خان تغلق سلطان محمد شاہ کا وزیر تھا۔ وہ دہلی پر حکمرانی کا خواہاں تھا اس لئے اس نے اپنے والد مظفر شاہ سے دہلی پر حملہ کرنے کو کہا۔ مظفر شاہ اس پر راضی نہیں ہوا۔ اس لئے اس نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کی اور مظفر شاہ کو قلعہ میں قید کر دیا۔ تاتار خان نے اپنے چچا شمس خان کو وکیل السلطنت مقرر کیا اور خود ناصرالدین محمد شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا اور اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کیا اور دہلی کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ مظفر شاہ نے اپنے بھائی شمس خان کے ذریعہ تاتار خان کو زہر دلوا کر ہلاک کروایا اور دوبارہ تخت پر بیٹھا۔ اسی اثناء میں مالوہ کے حاکم دلاور خان کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا ہوشنگ شاہ حاکم ہوا اور گجرات پر لشکر کشی کی، دونوں فوجوں میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی، ہوشنگ شاہ کو شکست ہوئی اور گرفتار ہوا مگر بعد میں معافی اور رہائی کی درخواست پر رہا کر دیا گیا اور مالوہ اور منڈو کا حکمران بھی بنا دیا گیا۔ 1411ء میں مظفر شاہ علیل ہوا اور اسی سال انتقال کر گیا۔ اس وقت اس کی عمر اکہتر سال کی تھی۔

احمد شاہ (1411-1443)

مظفر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا احمد شاہ تخت نشین ہوا، اس نے بڑی دیانت داری اور عدل وانصاف سے حکمرانی کے فرائض انجام دیے۔ احمد شاہ کے تخت نشینی کے بعد مظفر شاہ کے فرزند فیروز خان نے بغاوت کی، اسے کچھ امراء کی مدد بھی حاصل تھی جس میں مالوہ کا حاکم ہوشنگ شاہ بھی شامل تھا۔ فیروز خان اپنی فوج لے کر کھمبایت کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان احمد شاہ نے بڑی دانشمندی سے کام لیا اور جنگ کو ٹالتا رہا، لیکن جب کوئی صورت نہ بچی تو فوج کی ایک ٹکڑی کو فیروز شاہ سے مقابلہ کو بھیجا مگر اسے شکست ہوئی۔ فیروز خان کی اس کامیابی سے اس کے امراء میں اختلاف ہوا اور آپس میں لڑنے لگے اور اکثر امراء فیروز خان سے علیحدہ ہو کر احمد شاہ سے مل گئے۔ اس کے بعد احمد شاہ اپنی فوج لے کر بھروج روانہ ہوا اور فیروز خان کو امن کا پیغام بھیجا جسے فیروز شاہ نے اپنے امراء اور دوسرے بھائیوں سے مشورہ کر قبول کیا۔ احمد شاہ نے عام معافی کا اعلان کیا اور جاگیریں عطا کیں۔

فیروز خان نے 1414ء میں ایک بار پھر فتنہ وفساد کا بازار گرم کیا، اس میں سلطان مظفر شاہ کے ایک خاص امیر ملک علائی بدر نے اہم رول ادا کیا۔ فیروز خان نے ایدر کے راجا رنمل کو لالچ دے کر اپنا رفیق بنالیا۔ مہراسہ کے جاگیردار سید ابراہیم، جو رکن خان کے نام سے مشہور تھا، نے بھی فیروز خاں کا ساتھ دیا۔ احمد شاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے مہراسہ کا رخ کیا۔ احمد شاہ نے علماء وفضلا کے ذریعہ امن وامان قائم کرنے کی کوشش کی مگر جب اسے کامیابی نہیں ملی تو قلعہ کا محاصرہ کیا۔ چھٹ پٹ جھڑپیں بھی ہوئیں جس میں احمد شاہ کو کامیابی ملی، فیروز خان کے کچھ امراء مارے گئے اور کچھ نے ہتھیار ڈال دیے۔ راجا رنمل اور فیروز خان میں بھی اختلاف ہوا اور رنمل نے فیروز خان کو مغلوب کر اس کے تمام ہاتھی، گھوڑے سلطان احمد شاہ کے پاس بھیج دیے۔

اس کے بعد احمد شاہ نے جلوارہ پر لشکر کشی کی کیوں کہ راجا جلوارہ نے سلطان ہوشنگ شاہ اور احمد شاہ سے حسد رکھنے والے امراء کو ملا کر علم بغاوت بلند کیا تھا۔ سلطان احمد شاہ نے بڑی دانشمندی سے ان کو شکست دی۔ اس کے بعد احمد شاہ کرنال کی طرف بڑھا، وہاں کا راجا ہندو تھا اور کبھی مسلمانوں سے مطیع نہ ہوا تھا۔ دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی، راجا کرنال نے شکست کھا کر جوناگڑھ کے قلعہ میں آکر پناہ لی۔ احمد شاہ نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ راجا نے جب کوئی راہ نجات نہ دیکھی تو سالانہ محصول اور لگان ادا کرنے کے وعدے پر صلح کر لی۔ اس کے بعد سلطان احمد شاہ احمد آباد لوٹ آیا۔

اس کے بعد سلطان احمد شاہ 1419ء میں مالوہ کے حاکم ہوشنگ شاہ کی سرکوبی کے لئے مالوہ کی طرف روانہ ہوا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور زبردست معرکہ آرائی ہوئی، ہوشنگ شاہ کو منہ کی کھانی پڑی اور دونوں میں معاہدہ ہوا۔ 1420ء میں احمد شاہ نے جنانیر پر لشکر کشی کر قلعہ کا محاصرہ کیا اور آخر میں وہاں کے راجا نے احمد شاہ کی اطاعت قبول کر لی۔ 1425ء میں احمد شاہ نے مالوہ پر دوبارہ حملہ کیا اور ہوشنگ شاہ کو شکست دی۔ 1427ء میں سلطان احمد شاہ نے بیدر پر لشکر کشی کی اور قبضہ کیا۔ 1435ء میں جھالوہ کے حاکم کانہا رائے کو شکست دی۔ کانہا رائے دکن کی طرف فرار ہوا اور بہمنیوں کے دربار میں پناہ لی اور فوجی امداد طلب کی۔ اس طرح دکن کے بہمنیوں اور گجراتیوں میں جنگ ہوئی۔ جس میں گجراتیوں کو کامیابی اور ملی سلطان احمد شاہ کی فوج نے تھانہ پر قبضہ کر لیا۔ 1436ء میں مالوہ کا رخ کیا اور مندو پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کیا، بڑی جدوجہد کے بعد اسے کامیابی ملی۔ 1443ء میں احمد شاہ کا انتقال ہوا۔

احمد شاہ نے چھتیس سال حکومت کی وہ تمام عمدہ اور نفیس خصوصیات کا مجموعہ تھا، وہ بہت ہی خوش اخلاق، بامروت اور باہمت انسان تھا۔ احمد شاہ نے 1412ء میں سابرمتی دریا کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام احمد آباد رکھا جسے سلاطین گجرات نے اپنا پایہ تخت بنایا۔ وہاں مساجد، محلات ومکانات کے علاوہ تین بڑے بڑے پختہ ایوان تعمیر کئے گئے، شہر کا بازار بہت وسیع تھا۔ 1428ء سلطان احمد شاہ نے سابرمتی دریا کے کنارے ایک دوسرا شہر تعمیر کیا جس کا نام احمد نگر رکھا اور ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔

معلومات کی جانچ:

(1) مظفر شاہ اول کے حالات مختصراً بیان کریں۔

(2) احمد شاہ گجراتی کے کارناموں پر نوٹ لکھیے۔

12.3.3 سلطان محمد شاہ بن احمد شاہ گجراتی (1443-1451)

احمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد شاہ تخت نشین ہوا، وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے مقابلہ نہ تو اچھا فوجی تھا اور نہ ہی اچھا منتظم تھا۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی رعایا میں انعام واکرام تقسیم کئے۔ اس نے 1443ء میں بیدر پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد دونگر پور کا رخ کیا، وہاں کے حاکم نے بھی اس کی اطاعت قبول کی۔ 1451ء میں اس نے قلعہ چینا پر حملہ کیا مگر وہاں کے راجا نے مالوہ کے حاکم محمود خلجی کو ایک بڑی رقم دے کر فوجی مدد طلب کی۔ سلطان محمد شاہ محمود خلجی سے مقابلہ کے بجائے بھاگتا رہا، آخر کار اس کے امراء نے اسے زہر دے کر ہلاک کردیا۔

12.3.4 سلطان قطب الدین بن محمد شاہ (1451-1458)

سلطان قطب الدین کو تخت نشینی کے بعد ہی حاکم سلطان محمود خلجی اور رانا کنبھو سے جنگ کرنی پڑی بعد میں تینوں میں معاہدہ ہوا۔ سلطان قطب الدین قہر وغضب کا پتلا تھا، ذرا ذرا سی بات پر غصہ میں آجاتا تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور ہر طرح کی برائیوں کا ارتکاب کرتا۔ اس نے سات سال حکومت کی اور یہ سارا عرصہ مستی کے عالم میں گزارا۔

12.3.5 سلطان محمود بیگرا (1458-1511)

قطب الدین کے انتقال کے بعد امراء نے اس کے چچا داؤد شاہ کو تخت پر بٹھایا، اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بدمعاشی اور بد چلنی کو اپنا شعار بنایا۔ یہ صورت حال دیکھ کر امراء اور وزراء نے اسے معزول کر کے سلطان قطب الدین کے چھوٹے بھائی محمود کو تخت پر بٹھایا، اس وقت اس کی عمر صرف چودہ سال تھی۔

سلطان محمود، محمود بیگرا کے نام سے مشہور ہوا کیوں کہ اس نے دونہایت ہی مشہور ومعروف قلعے کرنال اور جنا نیر فتح کئے تھے اس لئے عوام وخواص اسے بیگرا کہنے لگے جس کا مطلب ہے دوقلعوں والا۔ وہ گجرات کا عظیم حکمران تھا۔ وہ بہت ذی اثر اور صاحب اختیار تھا۔ وہ اپنی خصوصیات وعادات کے لحاظ سے ایک مہذب ترین انسان تھا، بہادری ودانائی، معاملہ فہمی، سخاوت ومہربانی کی خصوصیات اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں، جھوٹ بولنے وسننے کو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ مصنف تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ اس کی زبان سے کبھی کوئی ایسا جملہ نہیں نکلا جو تہذیب و

شائستگی کے معیار سے گرا ہوا ہو۔شریعت کا وہ سختی سے پابند تھا۔ تیر اندازی اور شکار کا اسے بہت شوق تھا۔شرم وحیا کا وہ پیکر تھا۔اسے اپنی ساری مہمات میں کامیابی ملی تھی۔

محمود بیگرا نے حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے باغی امراء کا خاتمہ کیا۔اس نے بہمنی سلطان نظام شاہ کے مالوہ کے حکمران محمود خلجی کی فوجی کارروائیوں سے حفاظت کی۔محمود بیگرا نے گجرات وکونکن کے وسط میں دون کے راجا کو شکست دے کر اپنا باجگزار بننے پر مجبور کیا1466ء میں محمود بیگرا نے گرنار (جونا گڑھ) کے راجا رائے مندلک کے خلاف فوج کشی کی اور سخت معرکہ آرائی کے کے بعد شکست دے کر خراج دینے پر مجبور کیا۔جونا گڑھ کی کامیابی کے بعد محمود بیگرا نے مصطفےٰ آباد نام کا ایک شہر آباد کیا جسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔1482ء میں محمود بیگرا چمپانیر کے خلاف فوج لے کر روانہ ہوا۔اس وقت وہاں کا حاکم گنگا داس کا بیٹا جے سنگھ تھا۔دونوں میں جم کر لڑائی ہوئی اور آخر میں جے سنگھ ہار گیا اور محمود بیگرا نے چمپانیر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اس شہر کا نیا نام محمد آباد رکھا۔اپنی حکومت کے آخری سالوں میں اس نے دوارکہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

محمود بیگرا کے ہی عہد میں واسکوڈی گاما کالی کٹ کی بندرگاہ پر پہنچا اور پرتگالیوں کو سمندری راستے سے ہندوستان آنے کا راستہ ملا۔اس لئے محمود بیگرا کی حکومت کو سب سے زیادہ خطرہ پرتگالیوں سے تھا۔اس وقت گجرات ہندوستان کا ایک مشہور ومعروف تجارت کا مرکز تھا،مصر،ترکی اور عرب کے تاجر یہاں آیا کرتے تھے۔پرتگالیوں کی آمد سے ان کے لئے خطرہ لاحق ہو گیا تھا،اس لئے مصر،ترکی اور گجرات کے بیچ ایک معاہدہ ہوا اور سب پرتگالیوں کے خلاف متحد ہو گئے 1507ء میں پرتگالیوں کے خلاف مصر نے گجرات کی بندرگاہ پر ایک فوجی مہم بھیجی ان کا سپہ سالار امیر حسین تھا۔پرتگالی فوج کی کمان پرتگالی وائس رائے فرنسسکوڈی المیڈ (Francisco De Almeda) کے فرزند جیمس لوریکو (James Lorico) کے ہاتھوں میں تھی 1508ء میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی جس میں پرتگالیوں کو شکست ہوئی اور جیمس لوریکو مارا گیا۔اپنے بیٹے کے مارے جانے کے بعد وائس رائے فرنسسکو ہندوستان روانہ ہوا اور 1509ء میں دیپ کے نزدیک مصر اور گجرات کی متحدہ افواج کو بری طرح شکست دی اس شکست سے محمود بیگرا اس نتیجہ پر پہنچا کہ پرتگالیوں کو پانی میں شکست دینا آسان نہیں ہے اس لئے محمود بیگرا نے پرتگالیوں سے معاہدہ کرنے میں بہتری سمجھی اور اپنا ایک سفیر بھیجا۔مگر اسی بیچ 1510ء میں پرتگالیوں نے بیجاپور کے سلطان اسمٰعیل عادل شاہ سے گوا چھین لیا۔اس کامیابی کے بعد پرتگالی اتنے طاقتور ہو گئے کہ ان کا رویہ بدل گیا۔ان حالات کے تحت محمود بیگرا کو ان سبھی پرتگالی قیدیوں کو رہا کرنا پڑا جو اس کے یہاں قید تھے۔

محمود بیگرا دہلی کے سلطان سکندر لودی کا ہم عصر تھا اور دونوں میں خوش گوار رشتے بھی قائم تھے۔سلطان سکندر لودی نے 1510ء میں محبت وخلوص کے اظہار کے لئے محمود بیگرا کی خدمت میں بہت سے گراں قدر تحفے ارسال کئے، یہ پہلا موقعہ تھا کہ دہلی کے کسی بادشاہ نے فرماں روائے گجرات کو تحفے بھیجے تھے۔سکندر لودی نے ایک جوڑا گینڈے،تیس گھوڑے اور دوسری قیمتی تحائف سمیت ایک خاص سفیروں کا دستہ محمود بیگرا کے دربار میں بھیجا تھا۔اس کے بدلے میں محمود بیگرا نے سکندر لودی کو کچھ طوطے، بگلے اور عربی گھوڑے ارسال کئے تھے۔اس کے علاوہ محمود بیگرا کے اچھے رشتے ایران،ترکی اور مصر کے حکمرانوں سے بھی تھے۔

محمود بیگرا نے نظام حکومت میں نرم دلی سے کام لیا۔اعلیٰ عہدوں پر اس نے قابل ترین علماء وفضلاء کو منتخب کیا تھا۔اس نے ہندوؤں کا بھی انتخاب اہم عہدوں پر کیا تھا۔ایک برہمن ملک گوپی اس کا وزیر اعظم تھا۔محمود بیگرا نے گرنار (جونا گڑھ) کے قریب مصطفےٰ آباد اور چمپانیر

کے قریب محمد آباد کی بنیاد رکھی۔ چمپانیر میں باغ فردوس لگوایا۔اس نے عربی کتابوں کو فارسی زبان میں ترجمہ بھی کرانے میں کافی دل چسپی لی۔اس کے عہد میں سنسکرت زبان میں تصنیف وتالیف کا کام ہوا۔ادے راج اس کا درباری شاعر تھا، جس نے محمود بیگرا کی تعریف میں "محمود چرت" کے نام سے اشعار لکھے۔

معلومات کی جانچ

(1) سلطان محمود بیگرا کا عہد حکومت لکھیے۔

(2) محمود بیگرا کے دہلی سلطنت سے قائم تعلقات پر نوٹ لکھیے۔

12.3.6 سلطان مظفر شاہ بن سلطان محمود بیگرا 1526-1511

محمود بیگرا کے انتقال کے بعد اس کا فرزند مظفر شاہ دوم تخت نشین ہوا۔اس نے پرتگالیوں سے دیب کی حفاظت کی اور ان کی مہمات کو ناکام بنایا۔اس نے راجپوت راجا میدنی رائے کے خلاف مالوہ کے حاکم محمود کی مدد کی تھی اور میدنی رائے کو شکست دے کر محمود کو دوبارہ مالوہ کا حاکم بنادیا۔

مظفر شاہ صاحب حلم اور نرم دل انسان تھا، اس لئے وہ مظفر حلیم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، وہ نہایت پارسا اور مذہب اسلام کا شیدائی تھا۔احکام شرع کی پابندی ہر حال میں کرتا تھا اور حدیث کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔خطاطی میں اسے کمال حاصل تھا۔خط ثلث، نسخ اور رقاع میں اسے بڑی مہارت تھی۔قرآن کی کتابت کا بھی اسے بہت شوق تھا، جب ایک قرآن مجید ختم ہوجاتا تو اسے حرمین شریفین بھیج دیتا اور دوسرا لکھنا شروع کردیتا۔ایران، روم اور عرب جیسے ممالک کے شرفاء اور اکابر اس کے عہد حکومت میں گجرات آئے۔مشہور و ممتاز خوش نویس ملا محمد سیاوش اسی کے عہد حکومت میں شیراز سے گجرات آیا تھا۔

12.3.7 سلطان سکندر بن مظفر شاہ 1526ء

سلطان مظفر شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا سکندر خان تخت حکومت پر بیٹھا۔سلطان سکندر نے اپنے خاص خدمتگاروں کو جو شہزادگی کے زمانہ میں اس کے ساتھ تھے طرح طرح کی عنایتوں سے نوازہ اور بڑی بڑی جاگیریں دیں، اس کے برعکس ان امیروں کو جو اس کے والد مظفر شاہ کے وقت سے سلطنت کی خدمت کررہے تھے بالکل نہ پوچھا۔اس کے اس طرز عمل سے امراء میں ناراضگی ہوئی اور وہ اس کے خلاف ہوگئے اور وہ صرف تین مہینے ہی حکومت کر پایا اور قتل کردیا گیا۔

12.3.8 سلطان بہادر شاہ بن مظفر شاہ 1537-1526

سلطان بہادر شاہ گجرات کا آخری حکمران تھا۔اس کے عہد میں پرتگالیوں نے 1531ء میں بندر دیب پر حملہ کیا۔بہادر شاہ نے ترکی بحری فوج کی مدد سے پرتگالیوں کو شکست دی اور ان سے گوا چھین لیا، اس کامیابی کی خوشی میں اس نے بندر دیب میں مینار تعمیر کرایا اور اس کا نام برج بہادر شاہی رکھا اس نے ترکی سپہ سالار مصطفیٰ کو رومی خان کا لقب عطا کیا اور شاہی توپ خانے کا انتظام اس کے سپرد کیا۔

پرتگالیوں کو شکست دینے کے بعد بہادر شاہ مالوہ کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں مالوہ کے حکمران محمود خلجی دوم نے اس کے باغی بھائی چاند خان کو پناہ دے رکھی تھی۔ بہادر شاہ نے مالوہ پر حملہ کیا اور محمود خلجی کو شکست دے کر مالوہ پر قابض ہوا اور اپنے حدود مملکت میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد بہادر شاہ نے مالوہ کے مشرقی علاقوں مثلاً رائے سین، سارنگپور اور بھلسا پر بھی قبضہ کرلیا۔ ان سب علاقوں کو اس نے عالم خان لودی کو دے دیا جسے مغل حکمران ہمایوں نے کالپی سے باہر کھدیڑ دیا تھا۔ عالم خان وہاں سے فرار ہوکر بہادر شاہ کے پاس پناہ گزیں تھا۔ بہادر شاہ نے عالم خان کو اپنے یہاں پناہ دے کر ہمایوں سے دشمنی مول لی تھی۔

1535ء میں بہادر شاہ نے ترکی سپہ سالار و توپ خانے کے منتظم رومی خان کی مدد سے چتوڑ کے حاکم رانا رتن سنگھ کو شکست دے کر چتوڑ پر قبضہ کرلیا۔ چتوڑ کی کامیابی کے بعد رومی خان وہاں کا گورنر بننا چاہتا تھا۔ مگر بہادر شاہ نے اس کی خواہش کو درکنار کر برہان الملک کو وہاں کا گورنر منتخب کیا جس سے رومی خان ناراض ہوا اور بہادر شاہ سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مغل حکمراں ہمایوں کی خفیہ طور پر مدد کی اور بہادر شاہ کے رسد خانے کو لٹوا دیا اور دیگر ضروری سامان کی ترسیل کی راہیں روک دیں۔ چند روز جب اسی عالم میں گزر گئے تو گجراتیوں کی فوج میں قحط کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اب رومی خان نے ہمایوں کے ساتھ مل کر بغاوت کردی۔ جب بہادر شاہ کو کوئی راستہ نہ ملا تو گجرات سے فرار ہوکر مانڈو گیا اور وہاں سے چمپانیر کے قلعہ میں پناہ لی۔ ہمایوں نے اس کا پیچھا کیا۔ چمپانیر سے فرار ہوکر بہادر شاہ کیمبے پہنچا وہاں اس نے اپنے ہی تقریباً ایک ہزار بحری بیڑوں کو جلوا دیا تاکہ یہ بحری بیڑے ہمایوں کے ہاتھ نہ لگیں اور پھر وہاں سے وہ بحری راستہ کے ذریعہ بندر دیب چلا گیا۔ وہاں سے اس نے پرتگالیوں سے امداد مانگی۔ 25 اکتوبر 1535ء میں بہادر شاہ اور پرتگالی کمانڈر کے درمیان معاہدہ ہوا۔ پرتگالیوں نے فوجی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اس کے بدلے میں بہادر شاہ نے بندر دیب میں ایک قلعہ بنانے کی اجازت دی۔ اس درمیان ہمایوں نے چمپانیر اور احمد آباد پر قبضہ کرلیا اور جیت کی خوشی میں ہمایوں نے اپنے نام کے چاندی و سونے کے سکہ جاری کئے اور اپنے چھوٹے بھائی عسکری کو یہاں کا گورنر منتخب کر بندر دیب کی طرف روانہ ہوا۔ مگر ہمایوں کا سفر وہیں رک گیا کیونکہ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کے خلاف فوج کشی کی تھی۔ ہمایوں وہاں سے لوٹا اور آگرہ پہنچا۔ ہمایوں کے لوٹتے ہی بہادر شاہ نے اپنی فوج کو منظم کیا اور 1536ء میں اپنے ہارے ہوئے علاقوں پر دوبارہ قابض ہوا۔

چونکہ ہمایوں کی آگرہ واپسی کے سبب بہادر شاہ نے پرتگالیوں کی فوجی امداد کے بنا ہی اپنے کھوئے علاقوں پر دوبارہ قابض ہوگیا تھا اس لئے وہ پرتگالیوں سے ہوئے معاہدہ میں دی جانے والی سہولیات کو واپس لینا چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ چمپانیر سے گودھرا میں پرتگالی سپہ سالار کے پاس گیا۔ پرتگالیوں کو جب اس کی خبر ہوئی تو ایک چال چلی اور اپنے سپہ سالار کو بیمار مشہور کردیا اور کہا کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں اور بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتے۔ اس پر بہادر شاہ اس کی عیادت میں پرتگالیوں کی ایک بڑی کشتی میں جہاں سپہ سالار تھا، گیا۔ بہادر شاہ کو کشتی میں داخل ہوتے ہی یہ احساس ہوا کہ حالات اچھے نہیں ہیں اور اس کے خلاف کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے کشتی سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر پرتگالیوں نے جو پہلے سے تیار تھے، حملہ بول دیا اور بہادر شاہ کو پانی میں دھکا دے دیا اور سر پر نیزہ مار کر قتل کردیا۔ اور بندر دیب پر پرتگالیوں نے قبضہ کرلیا۔

سلطان بہادر شاہ سلاطین گجرات میں آخری عظیم سلطان تھا۔ اس کے بعد کئی ایک سلطان ہوئے مگر وہ سب کمزور تھے، حکومت میں عدم دلچسپی لیتے تھے اور موسیقی اور شکار میں اپنا وقت صرف کرتے تھے جس کے سبب انکی حکومت جاتی رہی اور 1572ء میں مغل حکمران اکبر نے

گجرات پر قبضہ کر کے اسے اپنے حدود سلطنت میں شامل کر لیا۔

معلومات کی جانچ

(1) سلطان مظفر شاہ کے حکومت پر روشنی ڈالئے۔

(2) سلاطین گجرات میں آخری طاقتور حکمران کون تھا؟

12.3.9 تعمیرات

مسلمان جہاں پہنچے وہاں مساجد و مقابر کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ابوظفر ندوی ''تاریخ گجرات'' میں لکھتے ہیں کہ گجرات کی سب سے پہلی مسجد عباسی خلیفہ منصور کے عہد میں تعمیر کی گئی۔ غزنویوں، خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں بہت سے تعمیرات کے کام ہوئے، بے شمار مساجد، مقابر، مدارس، کنویں وغیرہ تعمیر کئے گئے۔ 1407ء سے سلاطین گجرات کا زمانہ شروع ہوتا ہے جو 1573ء تک رہا۔ اس عہد میں بھی تعمیری میدان میں نمایاں کام ہوئے۔

احمد آباد کا شہر سلطان احمد شاہ کی غیر فانی شہرت کا موجب ہے۔ سلطان نے اسے 1411ء میں دریائے سابرمتی کے مشرق میں تعمیر کر کے اپنا دارالحکومت بنایا۔ 1413ء میں یہاں بھدرا کا قلعہ تعمیر ہوا جس کے دو برج لنڈن ٹاور کی قسم کے ہیں۔ اس میں دو مسجدیں ہیں قلعہ مربع شکل کا ہے جس کے کئی دروازے ہیں۔ 1487ء میں محمود بیگرا نے شہر کے اردگرد فصیل بنوائی جو مضبوطی اور بلندی کے لحاظ سے دہلی کی عمارتوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ سولہویں صدی کے اختتام تک احمد آباد ہندوستان کے عظیم اور حسین ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ امین احمد رازی نے اپنی کتاب ''ہفت اقلیم'' میں اس شہر کی صفائی، رونق، آثار کی نفاست، شہری عظمت اور گلیوں کی ترتیب اور کشادگی کی بڑی تعریف کی ہے۔

احمد آباد کی جامع مسجد

1426ء میں جامع مسجد احمد آباد تعمیر کی گئی۔ یہ احمد آباد کی سب سے وسیع اور عظیم الشان عمارت ہے جو بارہ سال میں مکمل ہوئی تھی، یہ برصغیر کی بڑی مساجد میں سے ہے۔ اس کے دو بلند مینار اس کی زینت کو دوبالا کرتے تھے جنکا تناسب اور نقش و نگار کا کام بڑا ہی دل کش تھا 1819ء کے زلزلے میں یہ مینار گر پڑے اور مسجد اپنی خصوصیت سے محروم ہوگئی۔ اس کا صحن وسیع ہے درمیان میں پانی کا حوض ہے، پندرہ بڑے گنبد ہیں۔ دو سو ساٹھ خوبصورت مینار ہیں۔ فرش سفید سنگ مرمر کا ہے۔ ایک کونے میں شاہی گیلری ہے جسے چلمن کے ذریعہ علیحدہ کیا گیا ہے۔

احمد آباد کے مقابر

احمد آباد میں مانک چوک میں احمد شاہ کا مقبرہ ہے، یہ مسجد کے مشرقی جانب ہے۔ مقبرہ گنبد والی ایک عظیم عمارت پر مشتمل ہے، جس کے درمیان ایک بڑا کمرہ ہے، کونوں پر چار مربع شکل کے کمرے ہیں جن کے درمیان ستونوں والے عمیق برآمدے ہیں۔ بڑے کمرے میں احمد شاہ اول کی قبر ہے جس کے پہلوؤں میں اس کے بیٹے محمد ثانی اور پوتے قطب الدین احمد شاہ ثانی کی قبریں ہیں اور تینوں سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ احمد شاہ کے مقبرے کے مشرق میں اس خاندان کی بیگمات مدفون ہیں۔ سب سے اہم قبر بی بی مغلی کی ہے جو محمود بیگرا کی ماں تھی، یہ

مقبرہ سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا اس قبر کے ساتھ ہی سیاہ سنگ مرمر کی مہر بی بی کی قبر ہے جو بی بی مغلی کی بہن تھی۔ سیاہ قبر پر شروع میں سیپ کا جڑاؤ کام کیا گیا تھا۔ دونوں قبریں فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہیں۔

تین دروازہ

یہ جامع مسجد کی طرح شان وشوکت رکھتا ہے، اس کے حسن کا باعث اس کے کامل درجے کے متناسب قوسی دروازے ہیں جن کے درمیان اعلیٰ درجے کے مزین پشتے ہیں۔ مسطح چھت ہے، جس کے دونوں طرف تین شہ نشین کھڑکیاں ہیں۔ یہ ایک وسیع صحن کا رفیع الشان دروازہ تھا، جسے میدان شاہ کہا جاتا تھا اور برجوں کے قریب قلعے کے اصلی دروازے تک چلا جاتا تھا۔

محمود آباد

محمود بیگڑا نے احمد آباد کے جنوب مشرق میں اٹھارہ میل کے فاصلے پر اپنے نام کی مناسبت سے نیا شہر تعمیر کرایا۔ اس شہر میں محل کے علاوہ کئی خوبصورت عمارتیں اور وسیع باغات بنوائے گئے۔ بعد میں سلطان محمود سوم نے اسے اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا اور اس میں ہرنوں کے لئے کھلا باغ بنوایا۔

محمد آباد

چمپانیر کے قدیم شہر کے قریب محمود بیگڑا نے 1484ء میں نیا شہر محمد آباد کے نام سے آباد کیا۔ شہر کے اردگرد فصیل بنائی گئی جس کا نام جہاں پناہ رکھا۔ اس شہر میں قلعہ اور محل کے علاوہ ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر ہوئی۔ وسیع باغات تھے جن میں فوارے اور جھرنے تھے۔ آم وصندل کے درخت لگوائے گئے۔ یہ شہر پچاس سال تک گجرات کا دارالخلافہ رہا۔ جامع مسجد انتہائی خوبصورت فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس میں مرکزی گنبد کے نیچے ایک دوسرے کے اوپر ستونوں کی تین قطاریں ہیں جن کے درمیان سنگ تراشی کر کے بالا خانے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے فرش پر کوئی تقریباً ایک سو بہتر ستون ہیں، جنہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ان پر گیارہ بڑے بڑے گنبد ہیں محمد آباد میں نگینہ مسجد خالص سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے اور بڑی خوبصورت ہے۔

اس کے علاوہ محافظ خان کی مسجد، بی بی اچھوت کوکی کی مسجد، رانی روپمتی کی مسجد، رانی سپری کی مسجد، حوض قطب، باغ فردوس، باولیاں ، خان جہاں کا مقبرہ، قطب عالم کا روضہ، حضوری شاہ کی مسجد، ملک شعبان کا روضہ، دریا کا روضہ، عثمان پور کی مساجد ومقابر، سیدی سعید کی مسجد وغیرہ اپنی فن تعمیر کے لئے مشہور ہیں۔

سلاطین گجرات کے فن تعمیر کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 1407ء سے لے کر 1511ء تک فن تعمیر باقاعدہ ارتقاء پذیر رہا۔ نشوونما اور ارتقا کے اس دور میں جینی اور اسلامی عناصر کا امتزاج ہوا۔ ابتدائی مساجد میں مثلاً بھدر والی احمد شاہ کی مسجد میں دونوں عناصر کے امتزاج میں کامیابی نظر نہیں آتی، لیکن 1424ء میں جامع مسجد تعمیر ہوئی تو اس میں بڑی خوبی سے آہنگ اور امتزاج پیدا ہو گیا۔ میناروں، محرابوں کو چھوڑے ہندووانہ بغلی راستوں کے ساتھ بڑی کامیابی کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔ عمارتوں میں اسلامی عناصر بہت کم تھے 1465ء سے محمود بیگڑا کی حکومت کے اختتام تک ملی جلی طرز کی مساجد تعمیر ہوئیں۔ ہندووانہ اور اسلامی عناصر کا امتزاج، مثلاً بی بی اچھوت

کوکی کی مسجد میں، ایسا کامل ہے کہ امتیاز کرنا مشکل ہے۔

معلومات کی جانچ:

(1) گجراتی مسلمانوں کے عہد کے فن تعمیر پر نوٹ لکھیے۔

(2) شہر احمد آباد کی مشہور عمارتوں پر نوٹ لکھیے۔

(3) محمود آباد اور محمد آباد کے فن تعمیر پر روشنی ڈالیے۔

(4) مسلم فن تعمیر پر ہندووانہ اثرات پر روشنی ڈالیے۔

12.4 مالوہ کی حکومت

مالوہ ایک وسیع سلطنت ہے اور اس پر بڑے بڑے ذی شان فرمانرواؤں نے حکومت کی ہے، مثلاً بکر ماجیت، راجا بھوج، اشوک وغیرہ جو ہندوستان کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مالوہ اپنے اقتصادی مرکزیت اور تہذیب وتمدن کے لئے کافی مشہور تھا۔ فن تعمیر میں بھی مالوہ کا ایک اہم مقام ہے۔ یہاں کے سلاطین نے دارالسلطنت مندو میں بہت سے عالی شان محلات، مساجد اور مقابر تعمیر کرائی ہیں۔ التتمش کے عہد سے لے کر عہد تغلق تک مالوہ دہلی سلطنت کے ماتحت رہا۔ 1398ء میں تیمور کے حملہ کے بعد دلاور خان غوری نے اپنی خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی۔

12.4.1 دلاور خان غوری

دلاور خان کے بزرگوں میں سے ایک شخص غور سے دہلی آیا اور شاہی ملازمت حاصل کر کے نام پیدا کیا۔ اس شخص کا بیٹا ترقی کرتے کرتے امارت کے عہدہ پر فائز ہوا اور اس کا پوتا دلاور خان فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں امیر ہوا۔ سلطان محمد فیروز شاہ کے قتل کے بعد دلاور خان جس کا اصلی نام حسین تھا مالوہ کی حکومت پر فائز ہوا اور رفتہ رفتہ یہاں کا مستقل حکمران بن گیا۔ دلاور خان غوری کی خود مختاری کے بعد مالوہ کی سلطنت دہلی کی حکومت کی اطاعت سے آزاد ہوگئی۔ دلاور خان غوری نے دھار میں قیام کیا اور اپنی فہم وفراست اور انتظامی صلاحیتوں سے مالوہ کا معقول اور مناسب انتظام کیا۔ اس علاقہ کو ہر قسم کے فتنہ وفساد سے پاک کیا۔ دلاور خان نے 1406ء تک بڑی کامیابی وکامرانی سے حکومت کی۔

12.4.2 ہوشنگ شاہ (1406-1435)

دلاور خان کے بعد اس کا بیٹا الپ خان، سلطان ہوشنگ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ ہوشنگ شاہ کو عنان حکومت ہاتھ میں لئے ہوئے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ مظفر شاہ گجراتی مالوہ پر حملہ آور ہوا، دونوں کے بیچ زبردست جنگ ہوئی۔ آخر میں ہوشنگ شاہ کو شکست ہوئی اور قلعہ دھار میں پناہ گزیں ہوا۔ جب بچنے کی صورت نہ ہوئی تو وہ خود مظفر شاہ گجراتی کے سامنے حاضر ہوا۔ مظفر شاہ نے اسے قید کیا اور اپنے ساتھ گجرات لے گیا۔ مظفر شاہ نے مالوہ کو اپنے حدود سلطنت میں شامل کرا اپنے بھائی نصرت کو گورنر منتخب کیا۔ نصرت خان نے رعایا پر سختیاں کیں۔ عوام نے

مخالفت کی۔لشکر نے بھی عوام کا ساتھ دیا اور نصرت خان کو دھار سے نکال دیا گیا۔اس کے بعد مالوہ کی رعایا نے ہوشنگ شاہ کے چچازاد بھائی موسیٰ خاں کو اپنا حکمران بنایا۔ہوشنگ شاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے مظفر شاہ گجراتی سے اپنی رہائی کی درخواست کی اور ہمیشہ فرمانبردار رہنے کا وعدہ کیا۔مظفر شاہ نے اسے رہا کیا۔رہائی کے بعد ہوشنگ شاہ نے دوبارہ اپنی حکومت قائم کی۔لیکن وہ زندگی بھر اس بے عزتی کو بھلا نہ سکا اور سلاطین گجرات سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔

1411ء میں مظفر شاہ کے انتقال کے بعد ہوشنگ شاہ نے گجرات میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کی۔گجرات کے کچھ زمینداروں نے مثلاً راجا جالوارہ، راجا بیدر اور راجا محمد آباد جنانیر نے ہوشنگ شاہ کو گجرات پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ہوشنگ شاہ انکی دعوت پر گجرات کی طرف روانہ ہوا۔سلطان احمد شاہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی فوج لے کر نکلا۔دونوں افواج میں زبردست جنگ ہوئی۔اس جنگ میں ہوشنگ شاہ کو شکست ہوئی اور وہ قلعہ شادی آباد مندو میں محصور ہو گیا۔یہ قلعہ بہت مضبوط تھا، اس لئے احمد شاہ نے اسے فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا، بعد میں دونوں میں معاہدہ ہوا۔

1420ء میں ہوشنگ شاہ نے کھیرلا پر لشکر کشی کی۔کھیرلا کا حاکم نرسنگ راؤ جنگ میں مارا گیا۔ہوشنگ شاہ نے نرسنگ راؤ کا قلعہ سارنگ گڑھ فتح کیا، وہاں کے خزانے پر قبضہ کیا اور نرسنگ کے بیٹے کو مطیع و باجگزار بنا کر شادی آباد منڈو لوٹ آیا۔اس کے بعد ہوشنگ شاہ نے گوالیار پر حملہ کیا مگر دلی کے سلطان مبارک شاہ کی مخالفت کی وجہ سے وہ پورے طور پر قلعہ پر قابض نہ ہو سکا۔1421ء میں اڑیسہ پر حملہ آور ہوا وہاں کے حاکم بھانو دیو کو بندی بنایا۔بھانو دیو نے اپنی رہائی میں پچھتر ہاتھی ہوشنگ شاہ کو دئے۔ہوشنگ شاہ نے کالپی کے حکمران قادر شاہ سے اپنی بہن کا نکاح کر کے اپنی حکومت کو مضبوط کیا۔

1435ء میں ہوشنگ شاہ بیمار پڑا۔اس نے اپنے امراء و وزراء کو نصیحت کی کہ آپس کی مخالفت کو ترک کر دو کیونکہ یہی وہ امر ہے جس سے سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں اور ان سب کی موجودگی میں شہزادہ غزنین کو مہر سلطنت عطا کی۔سلطان ہوشنگ شاہ نے تقریباً تیس سال حکومت کی۔مندو میں اسے ایک خطیرہ کے اندر دفن کیا گیا جہاں ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا ہے۔مصنف تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں میں نے اس خطیرہ کو دیکھا ہے، اس میں سوراخ ہے۔ ہوا ان سوراخوں میں داخل ہوتی ہے اور پھر پانی بن کر ٹپکتی ہے۔

ہوشنگ شاہ نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے اپنی سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کیا تھا، ان چار صوبوں کے مرکز سارنگپور، اجین، چندیری اور بھلسا تھے۔علاوہ بریں اس نے دھار، نچلہ اور مندو کے علاقے کو سیدھے اپنی نگرانی میں رکھا۔سرحدی علاقوں میں چوکیاں قائم کیں اور قابل عہدداروں کو منتخب کیا۔ہوشنگ شاہ ایک نرم دل انسان تھا، اس کی نرم دلی ہندوؤں کے لئے بھی تھی، ہندوؤں کو مندر بنانے کی پوری آزادی دے رکھی تھی، اس نے تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے جینیوں کی حفاظت کی جو ان میدان میں ماہر تھے۔اس نے ایک جین تاجر نردیو سونی کو اپنا خزانچی مقرر کیا تھا۔

ہوشنگ شاہ ایک دانش ور اور عاقل حکمراں تھا۔اس نے علم و علماء کی سرپرستی میں کافی دلچسپی لی۔اس کے عہد میں بہت سے صوفی مالوہ میں آ کر بس گئے۔ہوشنگ شاہ خود بھی اس وقت کے مشہور صوفی شیخ برہان الدین کا مرید تھا۔اس نے ملک مغیث کو اپنا وزیر منتخب کیا تھا جو بہت مشہور و معروف صوفی تھے۔دوسرے مشہور صوفی حضرات جو مالوہ آ کر بس گئے تھے ان میں سید نظام الدین، شیخ یوسف اور شیخ الاسلام اہم

ہیں۔اس نے علم وادب کو ترقی دینے کے لئے مندو میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

معلومات کی جانچ:

(1) مالوہ کی حکومت کا بانی کون ہے؟

(2) ہوشنگ شاہ کون تھا اس کے کارناموں پر روشنی ڈالئے۔

(3) ہوشنگ شاہ کے نظام حکومت پر نوٹ لکھئے۔

12.4.3 سلطان محمود خلجی (1436-1469)

سلطان ہوشنگ شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا غزنین خان محمود شاہ کا لقب اختیار کر تخت نشین ہوا۔تخت نشینی کے چند روز بعد اس نے اپنے بھائیوں کو قتل کرا دیا، اپنے بھتیجے اور اس کے بیٹوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیروادیں۔وہ خود بھی ملکی انتظامات سے کنارہ کشی اختیار کر شراب میں ڈوبا رہتا تھا اور نشہ ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔اس کے بعد اس کا بیٹا مسعود خان کو تخت پر بٹھایا گیا مگر وہ بھی نا اہل تھا اور اس کے بعد محمود خان تخت شاہی پر بیٹھا۔

مالوہ میں غوری حکومت کا اختتام 1436ء میں ہوا اس کے بعد محمود خلجی نے مالوہ کی بادشاہت حاصل کی۔وہ مالوہ کا سب سے طاقتور حکمران ہے اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے ہوشنگ شاہ نے اسے خان کا لقب عطا کر اپنی فوج میں اونچے عہدے پر منتخب کیا تھا۔حکومت سنبھالتے ہی محمود خلجی نے امراء پر طرح طرح سے عنایتیں کیں، ہر ایک کے منصب و جاگیروں میں اضافہ کیا اور خطابات سے نوازا۔اس نے اپنی حدوں کو چاروں سمت پھیلایا، اس کی سرحدیں جنوب میں ست پڑا کی پہاڑیوں تک، مغرب میں گجرات تک، مشرق میں بندیل کھنڈ تک اور شمال میں میواڑ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

جب سلطان محمود خلجی کی سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں تو اس نے علم و فضل کی طرف توجہ کی اور ملک کے تمام علماء و فضلاء کو مالا مال کر کے اپنے گرد جمع کر لیا۔سارے ملک میں جگہ جگہ مدرسے قائم کئے۔علماء، فضلاء اور طلباء کے وظیفہ مقرر کئے، الغرض بادشاہ کی علمی سرپرستی کی وجہ سے مالوہ کا ملک شیراز اور سمر قند کا ہم پلہ ہوگیا۔

محمود خلجی ایک بہادر، باہمت اور نیک دل انسان تھا۔اس نے گجرات کے احمد شاہ ثالث اور میواڑ کے رانا کنبھ کے خلاف جنگ کی۔ 1440ء میں اس نے دہلی پر حملہ کیا مگر اس کی اسی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر گجرات کے حکمران احمد شاہ اول نے مندو پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے محمود خلجی کو مندو واپس لوٹنا پڑا۔1443ء میں محمود خلجی نے چتوڑ پر حملہ کیا، اس وقت وہاں کا حاکم رانا کنبھ تھا دونوں میں جنگ ہوئی مگر کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہ ہوا۔محمود خلجی نے اجمیر پر بھی لشکر کشی کی، وہاں کے حاکم گجادھر راجپوت سے جنگ ہوئی جس میں گجادھر مارا گیا اور محمود خلجی نے قلعہ اجمیر پر قبضہ کر لیا۔

ان سب کارناموں اور کامیابیوں کے باعث مصر سے عباسی خلیفہ یوسف بن محمد کا ایک قاصد فرمان سلطنت اور خلعت لے کر سلطان

محمد خلجی کی خدمت میں حاضر ہوا۔محمود خلجی نے مسرت سے فرمان اور خلعت کا استقبال کیا۔

محمود خلجی کا انتقال 1469ء میں ہوا۔ وہ نہایت ہی بہادر اور بلند اخلاق انسان تھا۔ اس کے عہد حکومت میں رعایا کا ہر طبقہ خوش حال تھا، ہندو اور مسلمان سبھی بادشاہ پر جان چھڑکتے تھے۔ سلطان محمود خلجی نے دوسرے فرمانرواؤں کی طرح شراب نوشی کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنایا۔ اس نے زندگی بھر توسیع سلطنت اور باغیوں کی سرکوبی کی کوشش کی۔ اس کا شوق و ذوق اگر کچھ تھا تو وہ جنگ وجدال تھا اس کے آغاز حکومت سے لے کر وفات کے زمانہ تک شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہو کہ جس میں کسی نہ کسی مقام پر لشکر کشی نہ کی ہو۔ وہ بہت سخی اور فراخ دل انسان تھا، اس نے رعایا کو ہر طرح سے خوش رکھا، سرکاری گودام سے غریبوں ومحتاجوں کو غلہ تقسیم کرواتا تھا۔ اس نے لنگر خانے بھی تعمیر کروائے جہاں غریبوں کو پکا ہوا کھانا ملتا تھا۔ سلطان محمود خلجی نے شفاخانہ بھی قائم کیا تھا اور اس میں اپنے زمانہ کے بہترین حکیم مولانا فضل اللہ کو مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے متعین کیا تھا۔ اس شفاخانہ کے اخراجات کے لئے چند قصبے وقف کئے گئے تھے۔ مصنف تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود خلجی میں ایک عادت بہت اچھی تھی کہ وہ تجربہ کار مورخوں اور جہاں دیدہ سیاحوں سے گزشتہ زمانے کے حالات سُنا کرتا تھا۔ وہ مختلف بادشاہوں اور حکومتوں کے آغاز و انجام کے اسباب واثرات پر اکثر غور کیا کرتا تھا اور پھر ان کی روشنی میں اپنے لئے صحیح راستے کا تعین کرتا تھا۔ اس کے عہد میں چوری وڈاکہ زنی بالکل نہ ہوتی تھی اگر کہیں اس قسم کی واردات ہو بھی جاتی تو وہ بعد تحقیق جو مال چوری ہو جاتا اس کی قیمت شاہی خزانے سے ادا کر دیتا اور اس مال کو مقامی حکام سے وصول کرتا، یہی وجہ تھی کہ لوگ بلا خوف وخطر زندگی بسر کرتے تھے۔ تاجر اور بیوپاری جنگلوں میں بھی اپنے سامان کو اتنا ہی محفوظ سمجھتے تھے جتنا کہ اپنے گھروں میں۔

12.4.4 سلطان غیاث الدین بن سلطان محمود خلجی (1469-1501)

سلطان محمود خلجی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کی رسم کے بعد اس نے تمام عہدے اپنے تجربہ کار امراء میں تقسیم کئے اور کہا کہ میں نے اپنے والد سلطان محمود خلجی کے زمانہ میں لشکر کشی کی، میرا سارا وقت میدان جنگ میں گزرا، لہٰذا میری آسائش کا وقت آیا ہے۔ اس کے بعد غیاث الدین اپنا وقت حرم میں گزارنے لگا، اس کے حرم میں دس ہزار سے زیادہ کنیزیں تھیں۔ ان کنیزوں کو عہدے عطا کئے تھے ان میں سے کسی کو وزیر، وکیل، دبیر، خبردار، منجم، صدر مدرس، حکم، محتسب، مفتی، حافظ و موذن بنایا۔ اسی طور سے ان کو ہنر اور صنعتی تعلیم دی۔ اس کے علاوہ اس نے پانچ سو ترکی کنیزوں کو مردانہ لباس پہنا کر تیراندازی اور نیزہ بازی کی تعلیم دی۔ ان کنیزوں کو "سپاہ ترک" کا خطاب دیا۔ اسی طرح پانچ سو حبشی کنیزوں کو شمشیر بازی کی تعلیم دی۔ غیاث الدین نے اپنے حرم میں ایک بازار بھی تعمیر کروایا۔ وہ بہت سخی اور دریا دل تھا، وہ روزانہ سو اشرفیاں مستحقوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اسے خوف الٰہی بھی تھا۔ نماز میں وہ تہجد کا بھی پابند تھا۔ اسے نشہ ور چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ اس کی شاہی مجلس میں غیر شرعی باتوں اور غیر اخلاقی امور پر گفتگو کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔

سلطان غیاث الدین کا دور بہت ہی پر امن تھا، کسی قسم کا انتشار پیدا نہ ہوا۔ اس عہد میں صرف ایک مرتبہ فوج کشی کی ضرورت محسوس ہوئی جب دہلی کے بادشاہ بہلول لودی نے پالن پور پر حملہ کیا۔ جس کی تادیب اس نے جندیری کے حاکم شیر خان کے ذریعہ کی۔ بعد میں دونوں میں صلح ہوئی۔

1501ء میں غیاث الدین بیمار پڑا، صحت خراب ہوئی اور بڑھاپے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا، اس صورت میں شہزادوں میں تخت

کو لے کر خانہ جنگی ہوئی۔ جس میں ناصر الدین کامیاب ہوا اور بادشاہت شروع کر دی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ ناصر الدین نے سلطان غیاث الدین کو زہر دے کر ہلاک کیا۔

12.4.5 سلطان محمود خلجی ثانی (31-1510):

سلطان غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین سلطان بنا اس کا دور خانہ جنگی کا دور رہا، اس کے بیٹے شہاب الدین نے بغاوت کر کے دھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ دس سال حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہوا، اس کے بعد محمود خلجی ثانی تخت نشین ہوا۔

محمود خلجی ثانی جب سلطان بنا تو ملک کی حالت بہت خراب تھی۔ نظم و نسق کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس کا دربار سیاست کا اکھاڑا بنا ہوا تھا اس صورت حال میں ایک مضبوط اور طاقتور حاکم کی ضرورت تھی لیکن محمود خلجی ان خصوصیات سے عاری تھا اس نے امراء کی سیاسی چالوں سے اپنی حفاظت کے لئے چندیری کے راجپوت حکمران رائے چندر پُربیا کو میدنی رائے کا لقب دے کر اپنا مشیر خاص منتخب کیا اور بعد میں اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ میدنی رائے نے مالوہ کے نظام حکومت کو درست کیا اور اعلیٰ عہدوں پر اپنے حمایتیوں کو تعینات کیا، اس طرح میدنی رائے نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ محمود خلجی اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہو کر رہ گیا۔

محمود خلجی میدنی رائے سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اس نے گجرات کے حکمران مظفر شاہ ثانی سے فوجی امداد طلب کی اور 1518ء میں میدنی رائے کو شکست دی۔ مگر گجراتی فوج کے گجرات لوٹنے پر میدنی رائے نے رانا سنگا کی مدد سے گنگرون پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں سلطان محمود خلجی کو دوران جنگ کئی زخم لگے مگر وہ بہادری سے لڑتا رہا اور آخر میں گرفتار ہوا۔ رانا سنگا محمود خلجی کی بہادری سے متاثر ہوا، اس کی تعظیم کی اور علاج کروایا اور راجپوت فوجیوں کی مدد سے مالوہ کے تخت پر بٹھایا۔ تخت دوبارہ سنبھالنے کے بعد گجرات کے حاکم مظفر شاہ نے اس کی امداد میں ایک بڑی فوج ارسال کی لیکن محمود خلجی نے گجراتی افواج کو لوٹا دیا۔ گجراتی افواج کے مالوہ سے واپسی کے بعد سے ہی مالوہ کا زوال شروع ہو گیا۔ مندسور اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر مہارانا سنگا کا قبضہ ہو گیا۔ سارنگپور، بھلسا، رائے سین اور چندیری پر میدنی رائے اور اس کے ساتھیوں نے قبضہ کیا۔ محمود خلجی نے اپنی حکومت کو بچانے کے لئے کئی جنگیں لڑیں مگر اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ دوسری طرف محمود خلجی نے گجرات کے حاکم بہادر شاہ کے باغی بھائی چاند خان کو اپنے یہاں پناہ دی جس سے بہادر شاہ بھی اس سے ناراض ہوا اور 1530ء میں اپنی فوج لے کر مندو کی طرف روانہ ہوا۔ 1531ء میں بہادر شاہ نے مندو پر قبضہ کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ محمود خلجی گرفتار کر لیا گیا اور مع اس کے ساتوں بیٹوں کے قلعہ جنا نیر میں نظر بند کر قتل کر دیا گیا۔ اس طرح مالوہ گجرات کا حصہ بن گیا۔

1537ء تک مالوہ گجرات کے فرمانرواؤں کے ہاتھوں میں رہا۔ 1537ء میں بہادر شاہ کے انتقال کے بعد گجرات میں خانہ جنگی ہوئی اور گجرات کے حاکم امداد الملک نے ملو خان کو قادر خان کا لقب دے کر مالوہ کا حکمران بنایا، قادر خان ایک کامیاب حکمران رہا مگر جلد ہی شیر شاہ سوری نے مالوہ پر حملہ کر اپنے قبضہ میں لے لیا اور شجاعت خان کو مالوہ کا گورنر منتخب کیا۔ 1545ء میں شیر شاہ کے انتقال کے بعد مالوہ میں دوبارہ خانہ جنگی شروع ہوئی شجاعت خان کو ہٹا کر اس کی جگہ عیسیٰ خان کو گورنر بنایا گیا۔ 1553ء میں اسلام شاہ سوری کے انتقال کے بعد جب محمد شاہ عادل حاکم بنا تو اس نے شجاعت خان کو دوبارہ مالوہ کی گورنری عطا کی۔ مگر دو سال بعد شجاعت خان کا انتقال ہوا، اس کے بعد اس کا بیٹا میاں بایزید باز بہادر کا لقب اختیار کر مالوہ پر قابض ہوا اور اپنی آزاد حکومت کا اعلان کیا، باز بہادر کے عہد میں ہی 1562ء میں مغل حکمران اکبر نے مالوہ

پر حملہ کر اسے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔

معلومات کی جانچ

(1) سلطان محمود خلجی اول کے عہد پر روشنی ڈالئے۔

(2) سلطان محمود خلجی ثانی کے کارناموں کو مختصراً بیان کریں۔

(3) مالوہ کی حکومت کے زوال پر نوٹ لکھئے۔

12.5 خاندیش کی حکومت

دہلی سلطنت کا ایک چھوٹا سا اقطاع خاندیش، محمد بن تغلق کی سلطنت کا ایک حصہ تھا جو دریائے تاپتی کے ساحل پر تھا اس کے شمال میں وندھیاچل، جنوب میں اجنتا کی پہاڑیاں، مشرق میں برار اور مغرب میں صوبہ گجرات واقع ہیں۔ خاندیش حکومت کی بنیاد ملک راجا فاروقی نے رکھی اس نے اپنے آپ کو حضرت عمرؓ کے خاندان سے بتایا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں اس کا سلسلہ نسب بھی لکھا ہوا ہے اس لئے اس حکومت کو فاروقی حکومت بھی کہا جاتا ہے۔ اس حکومت کے سبھی حکمرانوں نے خان کا لقب اختیار کیا اس لئے اسے خاندیش بھی کہا جاتا ہے۔

12.5.1 ملک راجا فاروقی (1399-1382)

حکومت خاندیش کی بنیاد ملک راجا فاروقی نے رکھی۔ اس کے اجداد علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے دربار میں نامی گرامی امیر تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ملک راجا فاروقی نے سلطان کو شکار کے موقع پر بھوک کی صورت میں کھانا مہیا کیا تھا جس کے باعث فیروز شاہ تغلق نے اسے اپنے دو ہزار منصب داروں میں شامل کیا اور تھالنیر اور کروند کی جاگیر جو مملکت خاندیش میں تھی عطا کی۔ 1370ء میں یہ راجا فاروقی خاندیش پہنچا اور وہاں کا نظم و نسق درست کیا۔

ملک راجا فاروقی نے راجا بہارجی پر حملہ کر اسے اپنا باجگزار بنایا اور بہت سی گراں قدر چیزیں بطور پیش کش وصول کیں، جسے اس نے فیروز شاہ تغلق کی خدمت میں بھیجا۔ اس سے خوش ہو کر فیروز شاہ نے ملک راجا فاروقی کو سہ ہزار منصب عطا کیا اور اسے خاندیش کا سپہ سالار بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے آس پاس کے علاقوں پر لشکر کشی کی اور ان سے پیش کش وصول کی۔ اس کی قوت کو دیکھتے ہوئے جاجنگر کے راجا نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ الغرض ملک راجا فاروقی نے اپنی محنت اور دانش مندی سے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو مرتبہ بادشاہت تک پہنچا دیا۔ فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد مالوہ پر دلاور خان کی حکومت قائم ہوئی۔ ملک راجا فاروقی اور دلاور خان میں بھائی جیسے تعلقات تھے اور بعد میں رشتہ داری بھی ہوگئی۔ انہیں دنوں گجرات کا حکمران مظفر شاہ گجراتی ہوا، ملک میں انتشار پیدا ہونے کے سبب ملک راجا فاروقی نے حملہ کیا، بعد میں دونوں میں صلح ہوئی۔ ان واقعات کے بعد ملک راجا فاروقی نے مملکت اور رعایا کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ کی، اس نے تعمیرات اور زراعت کی ترقی پر خاص طور پر توجہ دی۔ ملک راجا فاروقی شیخ الاسلام زین دولت آبادی کا مرید تھا اور اس نے ان سے خرقہ ارادت بھی حاصل کیا تھا۔

انتیس سال کی حکومت کے بعد 1399ء اس کی صحت خراب ہوئی۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے ملک نصیر کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

12.5.2 نصیر خان فاروقی (1399-1437)

1399ء میں نصیر خان (ملک نصیر) تخت نشین ہوا، اس کے عہد میں حکومت خاندیش نے بڑی ترقی کی۔ اس نے اپنے دربار میں علماء و دانشوروں کو جمع کیا، ان کی عزت افزائی کی جس کی وجہ سے خاندیش اہل علم وارباب کمال کا مرکز بن گیا۔ ملک نصیر نے ہر ایک کو حتی الامکان وظیفے وجاگیروں سے نوازا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ جاری کیا۔

ملک نصیر نے قلعہ اسیر کو آسا اہیر کے قبضے سے نکال کر شیخ زین الدین کی خواہش پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام شیخ برہان الدین کے نام پر برہان پور رکھا۔ ایک عظیم الشان مسجد بنائی اور اس کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اس کے علاوہ دریا کے دوسری طرف شیخ زین الدین کے نام پر ایک قصبہ آباد کیا جس کا نام زین آباد رکھا۔

1417ء میں ملک نصیر نے مالوہ کے فرمانروا سلطان ہوشنگ شاہ سے مدد طلب کر تھالنیر کے قلعہ پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد ہوشنگ شاہ کا بیٹا غزنین خاں اور ملک نصیر نے مل کر سلطان پور ندر بار پر لشکر کشی کی اس وقت یہاں کا حاکم احمد شاہ گجراتی تھا۔ اس نے اپنے دفاع میں ایک کثیر تعداد افوج بھیجی ملک نصیر اور غزنین خان میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ملک نصیر خان نے تو باقاعدہ معافی مانگی، جس کے بدلے میں سلطان احمد گجراتی نے ملک نصیر کو 'خان' کا خطاب عطا کیا اس کے بعد وہ نصیر خان کہا جانے لگا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد نصیر خان نے احمد شاہ بہمنی کے بیٹے علاء الدین سے اپنی بیٹی زینب کا نکاح کیا۔ سلطان احمد شاہ گجراتی کے مشورہ پر نصیر خان نے برار کو فتح کرنے کا ارادہ کیا، چونکہ برار پر بہمنیوں کا قبضہ تھا اور وہاں کے سپہ سالار سے رعایا خوش نہیں تھی اس لئے رعایا نے نصیر خان کا خیر مقدم کیا، اس کے نام کا خطبہ پڑھا، مگر جب بہمنی حکمراں علاء الدین کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک لشکر جرار بھیجا جس کا مقابلہ نصیر خان نہ کر سکا اور تلنگ کے طرف چلا گیا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے بہمنی فوج برہان پور نصیر خان کے دارالسلطنت پہنچی اور تمام بڑی عمارتوں کو جلا کر خاک کر دیا۔ بعد میں نصیر خان سے جنگ ہوئی نصیر خان کو اس جنگ میں زبردست شکست ہوئی اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد 1437ء اس کا انتقال ہوا۔ نصیر خان نے چالیس سال حکومت کی تھی۔

معلومات کی جانچ:

(1) خاندیش کی حکومت کو فاروقی حکومت کیوں کہا جاتا ہے؟

(2) ملک راجا فاروقی کو کس طرح عنان حکومت حاصل ہوئی؟

(3) نصیر خان فاروقی پر پانچ سطر لکھیے۔

12.5.3 میران عادل خان ثانی (1457-1501)

نصیر خان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا عادل خان حکمراں بنا۔ اس نے بہمنیوں سے جنگ کر سلطان پور پر قبضہ کیا اور سلطنت کے نظم و نسق کو درست کیا، چار سال کے بعد اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مبارک خان فاروقی حاکم ہوا۔ اس نے کامیابی سے سترہ سال

1441ء سے 1457ء تک حکومت کی اس کے بعد اس کا فرزند میران علینا عرف عادل خان ثانی تخت نشین ہوا۔

محمد قاسم فرشتہ اپنی کتاب ''تاریخ فرشتہ'' میں لکھتے ہیں کہ میران علینا عرف عادل خان ثانی نے جس استقلال اور شان وشوکت سے حکومت کی وہ استقلال وشان وشوکت اس کے اسلاف میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اس نے اردگرد کے تمام راجاؤں سے خراج وصول کیا اور گونڈ وارا اور گدھ کے حاکموں کو اپنا اطاعت گزار بنایا۔ اس نے قلعہ اسیر کے دروازے کے مقابل ایک دوسرا دروازہ مالی گڑھ میں بنوا کر قلعہ کو اور مضبوط کیا۔ اس کے علاوہ برہان پور میں دریائے تاپتی کے کنارے ایک قلعہ اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر کروائیں۔

اس نے محمود بیگڑا گجراتی کے عہد میں اپنے اراکین کو پیش کش لانے کے لئے روانہ کیا۔ محمود بیگڑا کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری اور بہت بڑی فوج خاندیش بھیج کر قلعہ اسیر اور قلعہ تھالنیر کو لٹوادیا اور عادل خان کو معافی مانگنے پر مجبور کیا اور چند سال کا خراج پیشگی وصول کیا۔

میران علینا کا انتقال 1501ء میں ہوا اس کا کوئی بیٹا نہ تھا اس لئے اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی داوؤد خان تخت نشین ہوا۔

12.5.4 خاندیش کا زوال

میراں علینا عادل خان کے بعد یکے بعد دیگرے کئی حکمران ہوئے مثلاً داوٗد خاں، غزنی خان، عالم خان، عادل خان ثالث، میران محمد شاہ اول، میران مبارک شاہ، میران محمد شاہ ثانی، حسن خان، راجا علی خان اور بہادر شاہ۔ یہ سب نااہل وکمزور حکمران تھے ان کی کمزوری اور نظام حکومت سے عدم دلچسپی کا فائدہ اٹھا کر احمد نگر اور گجرات کے حکمرانوں نے مداخلت کرنا شروع کردی تھی۔

خاندیش ریاست کا آخری حکمران بہادر شاہ تھا، اس کے عہد میں مغل بادشاہ اکبر اپنے لشکر کے ساتھ برہان پور آیا اور اپنے امیر کو قلعہ اسیر کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ محاصرہ تقریباً دس ماہ رہا جس کے سبب قلعہ میں کھلی آب وہوا کی کمی سے بیماری پھیل گئی۔ اسی درمیان قلعہ اسیر کے مقابل قلعہ مالیگر واقع تھا اکبر کی فوج نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس صورت میں بہادر شاہ مجبور ہوا اور اکبر کی اطاعت قبول کی اور قلعہ اسیر اکبر کے حوالے کردیا۔ اس طرح حکومت خاندیش کا خاتمہ ہوگیا۔ اکبر بہادر شاہ کو اپنے ساتھ لاہور لے گیا اور اسے اور اس کے بیٹوں کی تنخواہیں مقرر کردیں بہادر خاں جہانگیر کے عہد حکومت تک زندہ رہا اور 1611ء میں اس کا انتقال ہوا۔

معلومات کی جانچ:

(1) میران عادل خان کے عہد پر نوٹ لکھئے۔

(2) فاروقی حکومت کے زوال پر نوٹ لکھئے۔

(3) خاندیش حکومت کا آخری حکمراں کون تھا؟

12.6 خلاصہ

1407ء سے سلاطین گجرات کا زمانہ شروع ہوتا ہے جو 1573ء تک رہا ہے گجرات کا پہلا سلطان مظفر شاہ تھا جو اگرچہ 1392ء سے

یہاں بطور صوبہ دار کام کر رہا تھا مگر اس نے اعلان آزادی 1407ء میں کیا اور اس طرح اس سنہری دور کا آغاز ہوا جو تاریخ گجرات میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ سلاطین نسلاً گوجر تھے۔ مظفر شاہ کے والد نے محمد بن تغلق کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا اور دہلی دربار میں وجیہ الملک کا خطاب پایا تھا اس لئے گجرات کے گوجران کی اپنی نسل کے لوگ تھے اور سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی تصور نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی عظمت کے ایسے نشانات باقی چھوڑے ہیں کہ پانچ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج اہل علم انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے نئے شہر تعمیر کرائے، فصیلیں بنوائیں، مضافاتی آبادیوں کا سلسلہ قائم کیا۔ حوض، باولیاں اور جھیلیں بنیں، محل تعمیر ہوئے عالی شان مساجد بنوائی گئیں، مقبرے بنوائے گئے اور فن تعمیر اپنے کمال کو پہنچا۔ ان تمام جدید کارناموں کی وجہ سے ملک بھر کے نقشے میں بڑی خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی۔ احمد شاہ اول کا عہد اس لحاظ سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ مگر محمود بیگرا کا عہد سنہری زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کی روایات زوال پذیر ہوگئیں۔

1235ء میں اجین پر قبضہ کر سلطان التتمش نے مالوہ کو دہلی سلطنت میں شامل کرلیا جو 1392ء تک دہلی حکومت کے ماتحت رہا، اس کے بعد تیموروں کے حملہ کے سبب دہلی سلطنت بکھر گئی تو افغان گورنر دلاور خان غوری نے اسے خود مختار حکومت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد ہوشنگ شاہ حاکم بنا اور اپنے نام کا ایک شہر ہوشنگ آباد قائم کیا اور اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد محمد غزنی، محمود خلجی، غیاث الدین، ناصر الدین، محمود ثانی مالوہ کے حاکم ہوئے۔ محمود ثانی نے گجرات کے حاکم مصطفیٰ ثانی کی مدد سے اپنے زبردست اور سرکش راجپوت وزیر میدنی رائے کو شکست دی۔ چتوڑ کا راجا رانا سنگا نے چونکہ میدنی رائے کی مدد کی تھی اس لئے رانا سنگا اور محمود ثانی میں جنگ ہوئی اور محمود ثانی قید کرلیا گیا، لیکن بعد میں اسے رہا کر دیا۔ رانا سنگا کے انتقال کے بعد اس نے پھر چتوڑ پر حملہ بول دیا مگر اس دفع گجرات کے والی بہادر شاہ نے جو چتوڑ کا حلیف تھا اسے قید کرلیا، قید سے بھاگنے کی کوشش میں وہ قتل کر دیا گیا اس طرح مالوہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور یہ حکومت گجرات کی سلطنت میں شامل کرلی گئی۔

ملک راجا فاروقی نے 1382ء میں اپنی آزاد حکومت کی بنیاد رکھی۔ ملک راجا فاروقی اور اس کے جانشین تمام شاہی القاب سے قطع نظر کر کے صرف خان کہلانے پر اکتفا کرتے تھے۔ اس لئے اس سلطنت کا نام بھی خاندیش پڑ گیا چونکہ خاندیش طاقتور سلطنتوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے لئے کامل آزادی دشوار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خاندیش کے حکمراں پہلے مالوہ اور بعد میں گجرات کی حکومت کے طرف دار تھے۔ ان دونوں سلطنتوں کی باہمی چشمک سے خاندیش کی آزادی برقرار رہی۔ میران احمد اول جو خاندیش حکومت کا گیارہواں حکمراں تھا اور گجرات کے شاہی خاندان کا قریبی رشتہ دار تھا اسے 1537ء میں گجرات کا تخت و تاج پیش کیا گیا۔ وہ اس اعزاز کو قبول کرنے کے لئے روانہ ہوا لیکن راستہ میں ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ میران احمد کی سرفرازی سے حوصلہ پا کر اس کے جانشینوں نے بھی شاہ کا لقب اختیار کرلیا۔ انتظامی اعتبار سے برہان پور خاندیش کا صدر مقام تھا لیکن جب خطرے کا زمانہ ہوتا تو خاندیش کے حکمرانوں کے لئے قلعہ اسیر ہی محفوظ پناہ گاہ کا کام دیتا تھا۔ اکبر نے 1601ء میں خاندیش حکومت کے سترہویں اور آخری فرمانرواں بہادر شاہ سے قلعہ چھین لیا اور اس طرح اس حکومت کا خاتمہ ہوا۔

12.7 نمونے کے امتحانی سوالات۔

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے:

(1) گجرات کی مظفری حکومت کا اجمالی جائزہ لیجیے۔

(2) مالوہ کے مسلم سلطنت کے کارناموں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(3) خاندیش حکومت پر نوٹ لکھیے۔

حسب ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے:

(1) محمود بیگرا کے کارناموں پر نوٹ لکھیے۔

(2) احمد شاہ گجراتی کے اہم کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

(3) ہوشنگ شاہ کون تھا مختصراً بیان کریں؟

12.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

(1) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ فرشتہ (مترجم عبدالحی خواجہ) لاہور پاکستان

(2) دائرۃ المعارف: شعبہ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(3) History of Islam Masudul Hasan

(4) سید ابوظفر ندوی تاریخ گجرات

(5) شاہ ابوتراب ولی تاریخ گجرات

اکائی-13: بنگال اور کشمیر کی حکومتیں

اکائی کے اجزاء

13.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء بنگال اور کشمیر کی مسلم ریاستی حکومتوں کے متعلق مثلاً ان کے قیام وزوال کے اسباب، مشہور سلاطین و ان کے کارنامے خاص کر نظام حکومت، علماء کی سرپرستی اور تعمیرات سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

13.2 تمہید

اس اکائی میں دو ریاستی حکومتیں یعنی بنگال اور کشمیر کی مسلم حکومتوں کا اجمالی جائزہ لیا جائے گا۔ ان دو ریاستی حکومتوں کے مشہور سلاطین اوران کے احوال کا تذکرہ ہوگا اوران کے نمایاں اوصاف بیان کئے جائیں گے۔ نیز اس دور کی فتوحات، علمی سرپرستی اور تعمیرات پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی۔

13.3 بنگال کی حکومت

بنگال مشرقی ہندوستان کا اہم شہر تھا۔ عہد سلطنت میں شمالی ہندوستان میں سب سے زیادہ بغاوتیں بنگال ہی میں ہوئیں ہیں۔ بنگال کے دارالسلطنت لکھنوتی کو بغاوتوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ بارہویں صدی کی آخری دہائی میں محمد بختیار خلجی نے بنگال کو دہلی سلطنت میں ملایا اسی لئے بنگال میں اسلامی ریاست کے قیام کا سہرا بختیار خلجی کو جاتا ہے، اسی نے مذہب اسلام کو اس خطے میں رواج دیا۔ وہ شہاب الدین غوری کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور کئی پرگنے اسکی جاگیر میں تھیں۔ قطب الدین ایبک کے عہد میں بھی اس کی ہمت افزائی کی گئی اس نے بہار کو باغیوں اور سرکشوں سے پاک کیا اور وہاں قابض ہوا۔ قطب الدین ایبک کے عہد میں اسے بہار اور لکھنوتی کی حکومت عطا کی گئی تھی۔

دہلی سے دور ہونے کے سبب بنگال پر اختیار رکھنا آسان نہ تھا۔ اسی لئے یہاں کے حکمرانوں نے وقتاً فوقتاً دہلی کی سلطنت سے بغاوتیں کیں۔ 1279ء میں بلبن کے عہد میں طغرل خان نے بغاوت کی جسے شکست دے کر بلبن نے اپنے بیٹے بغراء خان کو وہاں کا حاکم منتخب کیا۔ بلبن کے انتقال کے بعد بغراء خان نے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ 1324ء میں غیاث الدین تغلق نے بنگال پر حملہ کیا اور نصیر الدین کو حاکم منتخب کیا اسے سلطان کا لقب دیا اور اسے اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کی بھی آزادی دی۔ بغاوتوں کو روکنے کے لئے غیاث الدین تغلق نے بنگال کو تین حصوں میں منقسم کیا۔ لکھنوتی (شمالی بنگال)، سونارگاؤں (مشرقی بنگال) اور ستگاؤں (جنوبی بنگال)۔ محمد تغلق کے عہد میں علی مبارک نے سلطان علاء الدین کے نام سے لکھنوتی میں آزاد حکومت قائم کی اور پانڈو کو اپنی دارالسلطنت بنایا۔ اسی درمیان میں لکھنوتی کے نواح کے ایک

امیر حاجی ملک الیاس نے تجربہ کار سپاہیوں کا ایک لشکر جمع کر کے لکھنوتی پر حملہ کر دیا اور سلطان علاء الدین کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا اور سلطان شمس الدین کے نام سے حکومت کرنے لگا، یعنی محمد بن تغلق کے ہی عہد میں بنگال میں دہلی سے الگ ایک آزاد حکومت قائم ہوئی۔ یہ دہلی سلطنت سے الگ ہونے والے صوبوں میں پہلا صوبہ تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے بنگال پر قبضہ کرنے کے لئے دو مرتبہ حملہ کیا لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔

13.3.1 سلطنت الیاس شاہی

حاجی ملک الیاس محمد بن تغلق کے عہد میں علی مبارک (سلطان علاء الدین) کو قتل کر بنگال پر قابض ہوا اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر بنگال میں الیاس شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے بعد گرد و نواح کے علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس نے ساکھی سنگھ اور کامیشور کو جو ترہٹ کے حکمران تھے شکست دیکر ترہٹ کو اپنے علاقے میں ملا لیا، 1346ء میں جے راج دیو کو ہرا کر نیپال پر قبضہ کیا۔ اس کے عہد میں دہلی کے تغلق سلطان فیروز شاہ تغلق نے بنگال پر قبضہ کرنے کے لئے 1353ء میں حملہ کیا لیکن اسے کامیابی نہیں ملی اور برسات کے موسم کے سبب فیروز شاہ دہلی لوٹ آیا۔ 1354ء میں سلطان شمس الدین نے اپنے شیریں زبان قاصدوں کے ساتھ سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں پیش کش روانہ کی۔ سلطان فیروز شاہ ان سے اچھی طرح پیش آیا۔ 1357ء میں سلطان شمس الدین دوبارہ قیمتی تحائف کے ساتھ اپنے قاصدوں کو دہلی روانہ کیا تا کہ سلطان فیروز شاہ سے اچھے تعلقات برقرار رہ سکیں۔ لیکن اسی سال سلطان شمس الدین کا انتقال ہوا۔

معلومات کی جانچ

(1) کس شہر کو بغاوتوں کا شہر کہا گیا ہے؟

(2) دہلی سلاطین کو بنگال پر اختیار رکھنا کیوں آسان نہیں تھا؟

(3) غیاث الدین تغلق نے کس کو بنگال کا سلطان منتخب کیا؟

(4) الیاس شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

13.3.2 سکندر شاہ (1359-1389)

سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سکندر شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ بھی سلطان فیروز شاہ کی دل جوئی کرتا رہا مگر 1359ء میں فیروز شاہ نے بنگال کی تسخیر کا ارادہ کیا اور ایک عظیم لشکر لے کر لکھنوتی کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان سکندر شاہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سامنا کرتا اس لئے اس نے سالانہ پیش کش ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا اور ہاتھی کے علاوہ بہت سے قیمتی تحائف اس کی خدمت میں بھیجا اور معذرت کا اظہار کیا۔ سلطان فیروز شاہ واپس دہلی لوٹ آیا۔ سکندر شاہ نے پانڈو میں عدینہ مسجد تعمیر کرائی اور اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔ 1389ء میں سکندر شاہ کا انتقال ہوا۔

13.3.3 غیاث الدین اعظم شاہ (1389-1411)

سکندر شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ یہ فرمان روا بہت ہی نیک طبیعت، بہادر اور رعایا پرور تھا۔ امرا و وزراء اس کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کی وجہ سے ہر وقت محتاط رہتے تھے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس نے زندگی بھر ایسا کام نہیں کیا جو اخلاقی نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہو۔ آس پاس کے تمام راجا اس کے اطاعت گزار تھے اور وقت مقرر پر مالگزاری کی رقم ادا کرتے تھے۔

غیاث الدین کا تعلق ایران کے مشہور شاعر حافظ سے تھا، ان سے خط و کتابت بھی کرتا تھا۔ اس کے عہد میں تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔ مشرقی بنگال میں چٹگاؤں بندرگاہ کو ترقی دی، چین سے تجارتی رشتہ قائم کیا۔ 1406ء میں ایک چینی سفیر اس کے دربار میں آیا اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کو چین بھیجنے کی گزارش کی۔ 1409ء میں غیاث الدین نے دھرم راج نام کے ایک بودھ کو اپنا سفیر بنا کر قیمتی تحائف کے ساتھ چین بھیجا تھا۔

غیاث الدین اعظم شاہ کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے تین حکمران تخت نشین ہوئے: ان کے نام صیف الدین حمزہ (13-1411) شہاب الدین بایزید (1414-1413) اور علاء الدین فیروز (1414) ہے۔ یہ تینوں ناتجربہ کار اور حکومت کے کاموں کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ایک ہندو امیر گڑلیس نے (فرشتہ نے کانس لکھا ہے) بہت زیادہ اختیار حاصل کر لیا اور ملک کے تمام انتظام اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے، اور علاء الدین فیروز کے انتقال کے بعد بنگال اور لکھنوتی کا فرمانروا بن بیٹھا۔ امیر گڑلیس کے خلاف ایک چشتی صوفی نے جو غیاث الدین اعظم شاہ کے بہت قریب تھے۔ جون پور کے سلطان ابراہیم شاہ شرقی سے فوجی امداد طلب کر جنگ کا اعلان کیا اور گڑلیس کو شکست دیکر معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا چن مل 1418ء میں مشرف بہ اسلام ہوا اور سلطان جلال الدین احمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت عادل اور منصف مزاج تھا اور 1433ء تک بہت کامیابی سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے سلطان احمد شاہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، اس نے بھی اپنے والد کی طرح رعایا کی خبر گیری اور نگہداشت کو اپنا مقصد حیات بنایا اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ 1435ء تک حکومت کی۔ اس نے چین اور ہرات کے حکمرانوں سے اچھے تعلقات قائم کئے۔ آخر میں نصیر خان (یا ناصر الدین) نام کے غلام نے اسے قتل کر دیا اور حکومت پر قابض ہوا۔ وہ بہت ظالم تھا اور ملک کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس صورت حال میں سلطنت الیاس شاہی کے امیروں نے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اور ناصر شاہ جو سلطان شمس الدین کے خاندان سے تھا تخت پر بیٹھا۔

معلومات کی جانچ

(1) غیاث الدین اعظم شاہ کے کردار کو اجاگر کیجیے۔

(2) سلطان سکندر نے کب سے کب تک حکومت کی؟

13.3.4 ناصرالدین محمود شاہ (1435-1459)

غلام ناصر الدین کے قتل کے بعد ناصر شاہ ابو مظفر محمود شاہ کا خطاب اختیار کر تخت نشین ہوا۔ وہ اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے نہایت عالی مرتبہ انسان تھا۔ اس نے الیاس شاہی خاندان کی حکومت کو دوبارہ بحال کیا۔

رکن الدین باربک شاہ (1459-1474): ناصرالدین محمود شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا باربک شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں رعیت اور لشکری آسودہ حال رہے۔ اس نے افریقہ کے حبشیوں پر مشتمل ایک فوج قائم کی اور شاہی محل کی حفاظت پر مقرر کیا۔ اس کے دربار میں آٹھ ہزار حبشی تھے جنہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے عطا کئے گئے تھے۔ فرشتہ کے مطابق باربک شاہ ایسا پہلا حکمران ہے جس نے چشتی صوفیوں پر نگاہ التفات ڈالی اور انہیں اعلیٰ مراتب تک پہونچایا۔ اس کے عہد میں چاروں سمت علاقوں پر قبضہ کیا گیا۔

باربک شاہ کو بنگالی ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ اس نے بنگالی ادیبوں کو اپنے دربار میں اہم مقام عطا کیا۔ مالدھر واسو نام کا ایک مشہور بنگالی ادیب کو گڑ راج خان کے لقب سے نوازہ اور اس کے بیٹے کو ستیہ راج خان کا لقب دیا۔ اس کے عہد میں کریتی واس نے رامائن کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا تھا جسے بنگال کی بائیبل اور پنچ دیو کہا جاتا ہے۔ اسے تعمیرات سے بھی دل چسپی تھی، ایک خوبصورت شاہی محل بنوایا جس میں پانی کا انتظام زمین دوز نہر کے ذریعہ تھا۔ اس کے عہد کی عمارتوں میں داخل دروازہ بہت مشہور ہے۔

13.3.5 شمس الدین یوسف شاہ (1474-1481)

باربک شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند یوسف شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی عدل وانصاف کو اپنا شعار بنایا۔ علم وفضل اور انتظام سلطنت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں مذہبی احکام سختی سے نافذ تھے، شراب نوشی پر سختی سے پابندی تھی، کوئی بھی شخص بادشاہ کے کسی بھی حکم کی تعمیل میں تاخیر نہیں کرسکتا تھا۔ فرشتہ کی روایت کے مطابق اس نے ایک روز علماء وامراء کو اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا ''مقدمات کا فیصلہ کرنے میں تم کبھی کسی کی رعایت نہ کرنا ورنہ مجھ میں اور تم میں بن نہ سکے گی''۔ مذہبی علم میں بھی وہ یگانہ روزگار تھا اور ایسے مسائل جو قاضیوں سے حل نہ ہوتے تھے انہیں خود حل کرتا تھا۔ اس نے کئی مساجد و مدارس کی تعمیر کرائی جس میں بائیس دروازہ مشہور مسجد ہے۔ اس نے سات برس تک حکومت کی اور اس کا 1481ء میں انتقال ہوا۔

13.3.6 جلال الدین فتح شاہ (1481-1486)

یوسف شاہ کے انتقال کے بعد سکندر شاہ تخت نشین ہوا لیکن اس میں نظام حکومت کی قطعاً اہلیت نہ تھی اس لئے اراکین سلطنت نے اسے معزول کر کے فتح شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ فتح شاہ بہت ہی پڑھا لکھا فرمانروا تھا۔ اس نے علماء، امراء اور اراکین سلطنت کو ان کی حیثیت کے مطابق نوازا۔ وہ حبشی غلام جنہوں نے باربک شاہ اور یوسف شاہ کے عہد میں بہت اقتدار حاصل کرلیا تھا وہ اب اپنی حیثیت سے بڑھ کر بے اعتدالیاں کرنے لگے تھے، جس طرح عباسیوں کے زمانے میں ترکوں کی سرپرستی ہوئی تھی اور وہ حکومت کو نقصان پہونچا رہے تھے۔ فتح شاہ نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کا سدباب کرنا چاہا مگر اسے پوری کامیابی نہیں ملی اور ایک خواجہ سرا سلطان شہزادہ نے افریقی غلاموں سے مل کر جلال الدین فتح شاہ کو قتل کردیا۔ اس طرح بنگال میں الیاس شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ اس خاندان کے عہد میں بنگال کو معاشرتی اور معاشی ترقی نصیب

ہوئی اور اس کے سلاطین بنگالی نہ ہونے کے باوجود ہر دل عزیز رہے۔

معلومات کی جانچ:

(1) کس سلطان نے الیاس شاہی سلطنت کو دوبارہ بحال کیا؟

(2) رکن الدین باربک شاہ کی ادبی دلچسپی پر نوٹ لکھیے۔

(3) شمس الدین یوسف شاہ نے احکامات کی پابندی میں کیا رویہ اختیار کیا؟

(4) الیاس شاہی سلطنت میں حبشی غلاموں کا کیا رول تھا؟

13.3.7 حبشی سلطنت

جلال الدین فتح شاہ کے قتل کے بعد خواجہ سرا سلطان شہزادہ 1486ء میں باربک شاہ لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن چند ماہ بعد سلطان جلال الدین فتح شاہ کے ایک خیر خواہ حبشی سردار ملک عندیل کے ہاتھوں مارا گیا۔ ملک عندیل فتح شاہ کی بیوی کے رضامندی سے تخت پر بیٹھا اور سیف الدین کا لقب اختیار کیا، وہ لائق حکمران تھا۔ لیکن تین سال کے بعد وہ بھی مارا گیا۔ اب فتح شاہ کے بالغ لڑکے ناصر الدین محمود کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن 1490ء میں وہ بھی موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اس کے قتل میں ایک حبشی امیر سیدی بدر کا ہاتھ تھا۔ یہ سیدی بدر شمس الدین مظفر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ بھی ظالم حکمران تھا، اس نے ہندو مسلمان سبھی پر سخت اقدامات کئے، فوج کی تنخواہ کم کر دی جس کی وجہ سے بلوا ہو گیا۔ ایک عرب سید حسین اس کا وزیر تھا اس نے محل کا محاصرہ کر لیا، شمس الدین مظفر شاہ مارا گیا اور حبشی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یہ بنگال کی تاریخ کا تاریک دور ہے، جس میں فوجی طاقت کمزور اور ملک کی معاشی اور تہذیبی حالت ابتر ہوئی۔

معلومات کی جانچ:

(1) باربک شاہ کس کا لقب تھا؟

(2) کس کی سلطنت میں بنگال کی سیاسی اور معاشی حالت ابتر تھی؟

13.3.8 حسین شاہی خاندان (1493-1537)

شمس الدین مظفر شاہ کے قتل کے بعد سید حسین نے علاء الدین حسین شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت سنبھالا اور حسینی حکومت کی بنیاد رکھی، وہ بنگال کا ہر دل عزیز حکمران تھا۔ اس نے 1493ء سے 1519ء تک بہت خوش اسلوبی سے حکومت کی۔ 1495ء میں اس نے خلیفۃ اللہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس کا عہد پُر امن رہا کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔ اس نے حبشی امیروں کے بدلے پرانے مسلم اور ہندو امیروں کو بحال کیا اور دارالحکومت گوڑ سے ایکڈالا لے گیا۔ اس نے اپنی خارجہ پالیسی بنائی۔ وہ خود عرب تھا لیکن اس نے بنگالیوں کی زبان اور تہذیب کی سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں فتوحات اور تعمیرات کے دور کا آغاز ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں خوش تھے۔ ہندوؤں نے اسے کرشن کا اوتار، نرپتی تلک اور جگت

پھوشٹر وغیرہ کے لقب سے نوازا تھا۔ ویشنومت کا مشہور سنت چیتنیہ اس کا ہم عصر تھا جس نے بہار اور بنگال میں ویشنومت کی تبلیغ کی تھی۔ اسی کے عہد میں مالدھر باسو نے بھگوت پران کا شری کرشن وبجئے کے نام سے سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ علاء الدین حسین نے ہندوؤں کو اونچے اونچے عہدوں پر مقرر کیا تھا مثلاً گوپی ناتھ باسواس کا وزیر تھا، مکند داس طبیب، کیشو محافظ خاص، انوپ نگراں ٹکسال اور گوڑ ملک سپہ سالار تھا۔ متعدد بنگالی مصنفین مثلاً مالدھر باسو، وپیر داس، وجے گپت، جسراج خان اس کے دربار سے منسلک تھے۔ اس نے مالدہ میں مدرسے قائم کیے تھے۔ اسی کے عہد میں چھوٹا سونا مسجد کی تعمیر بھی کی گئی تھی۔ 1519ء میں اس نے وفات پائی۔

13.3.9 نصرت شاہ (1519-1532)

حسین شاہ کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا ناصر الدین ابوالمظفر نصرت شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ نصرت شاہ نے بہار میں ترہٹ پر حملہ کر وہاں کے حکمران راجہ کنس کو شکست دی اور قابض ہوا۔ نصرت شاہ کو شیر شاہ سوری اور مغلوں دونوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلوں سے لڑائی گھاگھرا اور گنگا کے سنگم پر ہوئی بالآخر بابر فتح یاب ہوا اور نصرت شاہ کو اطاعت اور سالانہ خراج ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا۔ اس کے عہد میں رامائن اور مہابھارت کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا اور بڑا سونا مسجد اور قدم رسول کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ نصرت شاہ نے ''شرف نامہ'' نام کی ایک پانڈورسم الخط تیار کروائی تھی۔ 1532ء میں نصرت شاہ کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا۔

غیاث الدین محمود (1532-1538)

نصرت شاہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین فیروز شاہ تخت پر بیٹھا لیکن چند ہی روز بعد نصرت شاہ کے چھوٹے بھائی غیاث الدین محمود نے اسے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یہ حسین شاہ خاندان کا آخری حکمران تھا۔ اس کے عہد میں شیر شاہ سوری نے بنگال پر حملہ کر پورے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ 1538ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے مرنے کے ساتھ ہی بنگال کی مسلمان خود مختار حکومت کا خاتمہ ہوا۔

معلومات کی جانچ

(1) حسین شاہی خاندان کا بانی کون تھا؟

(2) نصرت شاہ نے کن کن حکمرانوں کا سامنا کیا تھا؟

13.3.10 بنگال کی تعمیرات

بنگال کی تعمیرات میں پتھر کے بجائے اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ عمارتوں میں چھوٹے چھوٹے ستونوں پر نکیلی محرابیں اور کمل کی سجاوٹ اس کی اہم خصوصیت ہے۔ بنگال تعمیرات کی سب سے پہلی مثال ظفر خان کا مقبرہ اور مسجد ہے۔ پانڈو میں جلال الدین محمد شاہ کا مقبرہ ایک لاکھی مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اہم خصوصیت محرابوں کا جوڑ ہے جو ہندو اور مسلم تعمیر فن کی نشاندہی کرتا ہے۔ بنگال کی اہم تعمیرات میں داخل دروازہ، درسواری مسجد، لوٹن مسجد، چھوٹا سونا مسجد، بڑا سونا مسجد، قدم رسول مسجد، گوڑ کی مسجد اہم ہیں۔

معلومات کی جانچ:

(1) بنگال کی اہم عمارتوں کے نام لکھیے۔

(2) تعمیرات بنگال کی خصوصیات لکھیے۔

13.4 کشمیر کی حکومت: جغرافیہ وپس منظر

کشمیر کا شمار دنیا کے مشہور ترین صوبوں میں ہوتا ہے۔ یہ پنجاب کے جنوب ومشرق میں واقع ہے۔ کشمیر دو پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس وادی کی لمبائی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً 84 میل ہے اور چوڑائی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت 20 سے 25 میل تک ہے۔ رقبہ کم وبیش 8439 مربع میل ہے۔ اسے جموں، راجوری اور پونچھ کی بیرونی پہاڑیوں سے پیر پنچال کا بلند سلسلہ کوہ جدا کرتا ہے۔ ان سے پرے ایک وسیع پہاڑی علاقہ ہے جسے چند دشوار گزار درے اس وادی کو لداخ، بالائی وادی سندھ اور وسطی ایشیاء سے ملاتے ہیں۔ وادی کشمیر کی سطح کم وبیش ہموار ہے اور زمین بہت زرخیز ہے۔ یہ وادی اپنی دورافتادگی اور دشوار گزار راستوں کے باعث شمالی ہند پر ہونے والے متعدد حملوں سے محفوظ رہی۔

کشمیری حسن وجمال اور عقل وذہانت میں مشہور ہیں۔ تعلیم یافتہ کشمیری اپنی ذکاوت، تہذیب وشائستگی اور دیگر صفات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی دستکاری جو شال اور اخروٹ کی لکڑی پر ہوتی ہے اپنی خوبصورتی، نزاکت اور پائداری کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کشمیر پر سفید ھنوں (Epthalites)، ہندوراجاؤں، مسلمان سلاطین، مغل شہنشاہوں، دُرانی افغانوں اور سکھوں کے ادوار کے علاوہ برطانوی عہد میں جموں کے ہندو ڈوگرا حکمرانوں کا دوراقتدار رہا ہے۔

کشمیر میں حملوں کا آغاز 1320ء میں منگولوں کے حملوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے قبل محمود غزنوی نے دو بار 1015ء اور 1021ء میں حملہ کیا تھا لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ 1286ء میں سنگھ دیو نے کشمیر میں ایک ہندوریاست کی بنیاد رکھی اور بڑی خوش اسلوبی سے 1301ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بھائی سہ دیو تخت نشین ہوا۔ اسی کے عہد میں منگولوں نے حملہ کیا اور کشمیری عوام کے ساتھ بہت ہی ظلم وستم کیا۔ سہ دیو بنا جنگ کے ہی کشمیر سے بھاگ گیا۔

راجا سہ دیو کے عہد حکومت میں ایک شخص شاہ مرزا فقیروں کے لباس میں کشمیر آیا اور اس کے ملازموں میں داخل ہو گیا۔ شاہ مرزا نے ایک عرصہ تک اس کی ملازمت کی۔ راجا سہ دیو کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ارجن تخت نشین ہوا۔ اس نے شاہ مرزا کو اپنا وزیر بنایا اور اسے تمام امور سلطنت سونپ دئے۔ راجا ارجن نے اسلام مذہب قبول کیا اور صوفی بلبل شاہ کا مرید ہوا اور بلبل شاہ نے اس کا نام صدرالدین رکھا۔ جس کے سبب راجا ارجن (صدرالدین) کے چچا ادین دیو (تاریخ فرشتہ میں اودن لکھا ہے) نے بغاوت کی اور ارجن کو شکست دے کر کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ارجن کی بیوی سے شادی بھی کر لی۔

ادین نے بھی تخت پر بیٹھنے کے بعد شاہ مرزا کو اپنا وزیر بنایا اور اس کے دو بیٹوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ دھیرے دھیرے

شاہ مرزا اور اس کے بیٹوں نے بہت قوت حاصل کر لی جس سے ادین دیو اور شاہ مرزا کے بیچ کشیدگی ہوئی۔ اسی درمیان منگولوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ ادین دیو چونکہ نااہل تھا اس لئے بنا جنگ کے لداخ کی طرف بھاگ گیا۔ اس صورت حال میں اسکی بیوی کولا رانی نے جو بہت بہادر تھی حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر منگولوں کو مار بھگایا۔ کولا رانی شاہ مرزا کے اثر ورسوخ کو ختم کر امن واطمینان سے حکومت کرنا چاہتی تھی۔ شاہ مرزا نے اس کی مخالفت کی اور لشکر کشی کر دی۔ دونوں فریقین میں جنگ ہوئی جس میں کولا رانی کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لی گئی۔ شاہ مرزا نے اسے مسلمان کر کے اپنی بیوی بنالیا لیکن کولا رانی نے اپنے آپ کو قتل کر کے خودکشی کی۔

معلومات کی جانچ

(1) کشمیر پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے قبل کے صورت حال لکھیئے۔

(2) کشمیر ہندوستان پر ہونے والے حملوں سے کیونکر محفوظ رہا؟

(3) سہ دیو کون تھا؟

13.4.1 شاہ مرزا کی خودمختار حکومت

کولا رانی کے شکست اور خودکشی کے بعد 1339ء میں شاہ میرزا نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کر کے کشمیر میں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ یہ کشمیر کا پہلا مسلم حکمران تھا، اس نے اپنے نام کا خطبہ وسکہ جاری کیا۔ شاہ میرزا نے اپنی حکومت عدل وانصاف اور مساوات پر قائم کی اور فصل کا چھٹا حصہ ٹیکس کے طور پر وصول کیا۔ شاہ میرزا نے بڑی مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل کی۔ عمر زیادہ ہونے کے سبب شاہ مرزا نے اپنے دو بیٹوں جمشید اور علی شیر کو اپنا جانشین بنا کر حکومت سے دستبردار ہوگیا۔ 1342ء میں اسکا انتقال ہوگیا۔

جمشید(1342-44)

شاہ میرزا سلطان شمس الدین کے انتقال کے بعد اسکا بڑا بیٹا جمشید تخت نشین ہوا مگر اس کے چھوٹے بھائی علی شیر نے علم بغاوت بلند کیا۔ دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی۔ جمشید میں مقابلہ کی ہمت نہ تھی اور اس نے سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور کچھ عرصہ بعد وفات پا گیا اس کی مدت حکومت ایک سال دو مہینہ ہے۔

13.4.2 سلطان علاء الدین(1344-1356)

بڑے بھائی جمشید کے انتقال کے بعد علی شیر نے سلطان علاء الدین کا لقب اختیار کر کشمیر کا فرمانروا ہوا۔ علاء الدین نے بخش پور کے قریب اپنے نام کی مناسبت سے ایک شہر "علاء پور" آباد کیا اور اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس نے ایک نیا قانون جاری کیا کہ کوئی بیوہ یا زانی عورت اپنے شوہر کی وارث نہیں ہوسکتی۔ علاء الدین کے عہد میں حکومت میں ابتداً تو بڑی خوشحالی رہی لیکن بعد میں قحط پڑنے کی وجہ سے بے شمار جانیں چلی گئیں جس سے کچھ لوگ مخالف ہوگئے۔ 1356ء میں بارہ سال حکومت کرنے کے بعد اسکا انتقال ہوگیا۔

سلطان شہاب الدین (1356-1374)

سلطان علاء الدین کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بھائی نے سلطان شہاب الدین کا لقب اختیار کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ بہت ہی بہادر اور جرات مند تھا نیز بلند اخلاق کا مالک تھا۔ اس نے چاروں سمت قبضہ کر اپنے علاقے میں اضافہ کیا۔ شہاب الدین نے پنجاب پر حملہ کر وہاں کے حکمران کو شکست دی۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس کے رعب و دبدبے کا یہ عالم تھا کہ قندھار اور غزنی کے باشندے بھی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ اس نے لداخ کے کاشغری منگولوں کو بھی شکست دی۔ اس کے بعد شہاب الدین نے پشاور پر لشکر کشی کی اور کامیاب ہوتا ہوا ہندوکش پہونچا اور دریائے ستلج کے کنارے قیام کیا، وہاں راجا نگر کوٹ نے اس کی اطاعت قبول کی۔ تبت کو چک کا حاکم بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور فرمانروائی قبول کی۔ شہاب الدین نے شریک پورہ اور شہاب الدین پور نام کے دو نئے شہر آباد کئے۔

معلومات کی جانچ:

(1) شاہ مرزا کون تھا؟ اس کے نظام حکومت کو بیان کریں۔

(2) شہر علاء پور کس نے آباد کیا؟

13.4.3 سلطان قطب الدین (1374-89)

شہاب الدین کے انتقال کے بعد اسکے بھائی ہندال نے عنان سلطنت سنبھالی اور سلطان قطب الدین کا لقب اختیار کیا۔ یہ بلند کردار واخلاق کا مالک تھا اور اپنے احکام کے نفاذ اور تعمیل میں نہایت اہتمام رکھتا تھا۔ 1389ء میں اس نے وفات پائی۔

سلطان سکندر بت شکن (1389-1413)

سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد اس کا کم سن بیٹا سکندر تخت نشین ہوا۔ سلطان سکندر کی ماں حکومت کے کام انجام دیتی تھی لیکن پانچ سال کے بعد سلطان سکندر نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا۔ اسی زمانے میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا، سلطان سکندر نے اپنی دور بینی اور سیاسی چالوں کے تحت کشمیر کی حفاظت کی اور ہزاروں ایرانی اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کو سرینگر میں پناہ دی۔ سلطان سکندر نہایت سخی تھا چنانچہ اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر دانشمند عراق، خراسان اور ماوراء النہر سے اسکی ملازمت کے واسطے آئے اور علم وفضل اور مذہب اسلام نے مملکت کشمیر میں رواج پایا۔ آنے والے دانشمندوں میں ایران کے مشہور صوفی سید محمد ہمدانی تھے۔ سلطان سکندر ان کی بہت تعظیم کرتا تھا اور آداب دین سیکھتا تھا۔ اس نے ایک خانقاہ بھی بنوائی۔ سید محمد ہمدانی سے متاثر ہو کر ایک برہمن سیہ بت نے اسلام قبول کیا۔ سلطان سکندر نے اسے وزیر الوزراء کے عہدے پر فائز کیا اور اپنا معتمد بنایا۔ سیہ بت ہندو مذہب کا سخت مخالف ہوا اور انکی ایذا رسانی میں بہت کوشش کرتا تھا یہاں تک کہ سلطان سکندر نے اس کے کہنے سے حکم دیا کہ ہندوؤں کے تمام دانشمند مسلمان ہو جائیں اور جو شخص مسلمان نہ ہوگا کشمیر سے نکل جائے اور قشقہ یعنی ٹیکہ پیشانی پر نہ لگائے۔ اس نے بڑی سختی سے عورت ستی پر پابندی لگائی۔ علاوہ بریں سونے و چاندی کے بتوں کو پگھلا کر سکہ ڈھلوائے اور تمام بتوں اور بت خانوں کو توڑا اور مسمار کیا۔ اس لئے وہ سلطان سکندر بت شکن کہا گیا۔

سلطان علی شاہ(20-1413)

سلطان سکندر کے بعد اسکا بیٹا میر خان تخت نشین ہوا اس نے سلطان علی شاہ کا لقب اختیار کیا۔ آغاز سلطنت میں اس کا مشیر سلطان سکندر کا وزیر الوزراء سیہ بٹ تھا۔ اس نے سلطان علی شاہ کے عہد میں بھی برہمنوں اور ہندوؤں پر بہت ظلم کیا اور تہ تیغ کیا۔ 1417ء میں سیہ بٹ کا انتقال ہوا اس کے بعد سلطان علی شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی شاہی خان کو اپنا وزیر منتخب کیا جو اپنی شجاعت میں بے نظیر تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد علی شاہ کو جہاں کی سیر کا شوق ہوا اور کشمیر سے سفر کرنے کا ارادہ کیا اور شاہی خان کو اپنا جانشین مقرر کیا اور جموں کی طرف روانہ ہوا۔ راجا جموں جو علی شاہ کا خسر تھا، راجا راجوری کی مدد سے شاہی خان کی ولیعہدی کو مسترد کرنے کا مشورہ دیا۔ اسکے سبب دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی جس میں علی شاہ کو شکست ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد وہ مارا گیا اور شاہی خان سلطنت پر قابض ہوا اور زین العابدین کا لقب اختیار کیا۔

معلومات کی جانچ

(1) سلطان سکندر کو بت شکن کیوں کہا جاتا ہے؟

(2) سلطان علی شاہ پر نوٹ لکھیے۔

13.4.4 سلطان زین العابدین(70-1420)

سلطان زین العابدین کشمیر کا ایک بہت اہم سلطان ہے۔ اسکی سخاوت، طرز عمل اور مصلحت اندیشی کے سبب اسے کشمیر کا اکبر اور اسکی لگان اور سامان و قیمت پر نظم وضبط کے سبب سے کشمیر کا علاؤالدین کہا جاتا ہے۔ عنان حکومت سنبھالتے ہی اس نے اپنے خلاف ساری بغاوتوں کا سد باب کیا۔ سلطان زین العابدین اپنے والد سلطان سکندر کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے ہندو مندروں کی دوبارہ تعمیر کروائی، برہمن جو کشمیر سے ہجرت کر گئے تھے دوبارہ انہیں کشمیر بلا کر صرف بسایا ہی نہیں بلکہ اونچے عہدوں پر فائز بھی کیا۔ جو ہندو جبراً مسلمان بنائے گئے تھے انہیں دوبارہ ہندو مذہب اختیار کرنے کی آزادی دی، گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگائی اور ہندوؤں سے جو زبردستی محاصل وصول کیے گئے تھے انہیں لوٹا دیا گیا۔ اس کے عہد میں عورت ستی کا رواج دوبارہ شروع ہوا۔ اس نے ہندو افسروں مثلاً تلک چاریہ اور شری بھٹ کو ہندوؤں کو دوبارہ کشمیر میں بسانے کا ذمہ دار بنایا تھا۔ جوناراج شاہی طبیب تھا، شر یور تاریخ نگار تھا، سنگھ بھٹ اور روپ بھٹ شاہی نجومی تھے، یدو بھٹ فارسی کا مشہور ادیب اور جین پرگاش کا مصنف تھا اور بھٹ اوتار نے جین پرگاش اور اقسوم نام کی دو مشہور کتابیں تصنیف کی تھی۔

نظام حکومت

سلطان زین العابدین نے حکومت کے نظم وضبط میں کئی اصلاحات کیں۔ اس نے وادیٔ کشمیر کی زمینوں کی پیمائش کرائی اور زرخیز زمینوں کا بیورہ تیار کرایا۔ اس نے سلطنت کو پرگنوں میں، پرگنوں کو گاؤں میں اور گاؤں کو کاشتکاروں میں منقسم کیا۔ پیداوار کا چھٹا حصہ محاصل کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ مالگزاری کی وصولی اناج کی شکل میں ہوتی تھی۔ زمینوں کی آبپاشی کے لئے نہروں کا جال بچھا دیا تھا۔ نہر کاکا پور، کرالہ نہر، شکدر نہر، اونتی نہر، شاہ کھل (صفا پور) نہر، جین گنگا نہر، فرو نہر، مار نہر وغیرہ اہم نہریں ہیں۔ معاشی و اقتصادی اصلاح میں سلطان زین

العابدین نے سبھی چیزوں کی قیمت کو مستحکم کیا اور نگران منتخب کیا، جو بازاروں کا جائزہ لیتا رہتا تھا، اس کے لئے باقاعدہ قیمت کنٹرول نظام بنایا گیا۔ جب کبھی قیمت میں تبدیلی کی جاتی تو تانبے کی پتی میں لکھ کر بازاروں میں کئی جگہوں پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان زین العابدین نے تانبے اور چاندی کے سکے جاری کئے۔

تہذیب وتمدن اور علم وادب میں دل چسپی

سلطان زین العابدین کے عہد میں کوئی ایسا شعبہ نہیں تھا جس میں ارتقاء کا کام نہ ہوا ہو۔ سلطان زین العابدین نے فنون لطیفہ، علم و ادب اور فن تعمیر میں بہت دل چسپی لی اور علماء، فضلاء و معماروں کی فیاضانہ سرپرستی کی۔ وہ ہندو مسلمان دونوں کی تقاریب میں حصہ لیتا تھا۔ اسے ناچ گانے سے بھی دل چسپی تھی۔

علاوہ بریں سلطان زین العابدین ایک بہت بڑا ادیب بھی تھا، وہ فارسی، سنسکرت اور کشمیری زبان کا ماہر تھا۔ وہ خطیب تخلص سے فارسی زبان میں شاعری بھی کرتا تھا اس نے مُلا احمد کو جو بہت مشہور فارسی ادیب تھا مہا بھارت، دشاوتار، کلہن کی راج ترنگنی کو فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا تھا۔ اس کے عہد میں کئی ایک جنگ ناموں اور رزمیہ نظموں کی تخلیق کی گئی۔ اتم پنڈت نے کشمیری زبان میں کشمیر کے حکمرانوں کی تاریخ لکھی۔ یدو بھٹ نے سلطان زین العابدین کے حیات و کارناموں پر سوانح عمری لکھی۔ بھٹ اوتار نے فردوسی کے شاہ نامہ کے طرز پر جین ویلاس نام سے کشمیر کی تاریخ لکھی جون راج نے راجترنگنی کی دوسری جلد لکھ کر 1458ء تک کی تاریخ لکھی۔ شری ور نے راجترنگنی کا تیسرا حصہ لکھا۔ زین العابدین نے اپنے نااہل بیٹوں کے طرز زندگی پر مختصر شکایت نامہ تصنیف کی۔

زین العابدین نے تعمیرات میں بھی دل چسپی لی۔ کئی ایک نئے شہر بسائے جن میں نوشہر (ویچارناگ)، جین گیر، جین پور اور جین کوٹ اہم ہیں۔ علاوہ بریں زین العابدین نے لنگا اور سون نام کے دو جزیرے ڈل جھیل میں بنوائے اور وولر جھیل میں لنکا نام کا مصنوعی جزیرہ بنوایا۔

زین العابدین کے عہد کے قبل کشمیری صرف کاشتکاری پر ہی منحصر تھے اور برفیلے مہینوں کی وجہ سے صرف ایک ہی فصل پیدا ہو پاتی تھی جس کی وجہ سے زندگی بہت دشوار تھی۔ زین العابدین نے کاشتکاری کے علاوہ دست کاری کو فروغ دیا۔ اس نے پتھر تراشنے، شال بننے، بندوق بنانے اور آتش بازی کے ہنر کی خوب سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں مشہور بندوق صنعت کار حبیب تھا اسی کی مدد سے سلطان زین العابدین نے بارود پر ایک کتاب تصنیف کی۔ کاغذ بنانے اور جلد سازی کے ہنر کو سیکھنے کے لئے کاریگروں کو سمرقند بھیجا۔ شال بنانے کی دستکاری کو کشمیریوں نے تبت سے سیکھا تھا۔

زین العابدین ایک عظیم حکمران تھا مگر اسے اپنے دو نااہل فرزندوں کی وجہ سے پریشان بھی ہونا پڑتا تھا کیونکہ ان دونوں نے بغاوت کر آپس میں جنگ کی۔ بڑا بیٹا آدم خان اور چھوٹا حاجی خان تھا۔ زین العابدین نے اپنے بڑے بیٹے آدم خان سے ناراض ہو کر اسے اپنے علاقہ سے باہر نکال دیا اور چھوٹے بیٹے حاجی خان کو اپنا جانشین منتخب کیا۔

معلومات کی جانچ:

(1) زین العابدین کا برہمنوں کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟

(2) زین العابدین کے نظام حکومت پر نوٹ لکھیے۔

(3) زین العابدین کی علمی سرپرستی پر روشنی ڈالیے۔

(4) زین العابدین نے کن کن صنعتوں کو فروغ دیا؟

13.4.5 زین العابدین کے جانشین

سلطان زین العابدین کے سبھی جانشین نااہل ثابت ہوئے۔اس کے انتقال کے بعد اسکا چھوٹا بیٹا حاجی خان (72-1470) حیدر شاہ کا لقب اختیار کر تخت نشین ہوا۔وہ اکثر شراب کے نشے میں ڈوبا رہتا تھا اور حکومت کے دوسرے ہی سال شراب کے نشے میں گر کر مر گیا۔اس کے بعد اس کے بیٹے حسن شاہ (84-1472) نے عنان حکومت سنبھالی۔اس نے امیر الامراء کا لقب اختیار کیا۔اس نے بھی نظام سلطنت میں دل چسپی نہیں لی اور اپنا زیادہ تر وقت ناچ گانے اور عیاشی میں گزارا۔اس کے دربار میں تقریباً دو سو مرد اور عورت قوال تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں گویوں کو محل میں نوکر کی طرح رکھتا تھا۔وہ خود بھی سرود نواز اور شاعر تھا۔وہ کشمیری اور سنسکرت زبان میں شاعری کرتا تھا۔اس کے عہد میں 1479ء میں زبردست آگ لگنے کی وجہ سے شمالی مشرقی سری نگر جل کر خاک ہو گیا تھا۔

حسن شاہ کے بعد محمد شاہ (87-1484) سے لے کر محمد شاہ سوم (28-1516) کے عہد تک سلطنت کی باگ ڈور سیاست کی نذر رہی۔یعنی اعلیٰ افسروں اور وزراء کی سیاسی چالوں کے سبب کئی بار سلاطین کو سلطنت سے ہٹایا گیا اور انہی کو پھر دوبارہ سلطنت پر فائز کیا گیا۔1540ء میں مغل بادشاہ ہمایوں کے چچازاد بھائی مرزا حیدر دوغلات نے امراء کی مدد سے تخت پر قبضہ کرلیا اور نازک شاہ کے لقب سے حکومت کرنے لگا۔نازک شاہ کو بھی کئی مرتبہ تخت سے اتارا اور بٹھایا گیا۔ 1550ء میں مقامی بغاوت کو روکنے وہ مارا گیا،اس کے بعد ملک دولت چک نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور چک سلطنت کی بنیاد رکھی اور تقریباً 27 سالوں تک حکومت کی۔اس سلطنت کا مشہور حکمران محمد غازی شاہ چک تھا۔آخری چک سلطان ناصر الدین محمد یعقوب شاہ کو شکست دے کر مغل بادشاہ اکبر نے 1586ء میں کشمیر پر قبضہ کرلیا۔

معلومات کی جانچ:

(1) امیر الامراء کا لقب کس نے اختیار کیا تھا؟

(2) کس کے عہد میں قوال اور گویئوں کو اہمیت دی گئی؟

(3) حسن شاہ کن کن زبانوں میں شاعری کرتا تھا؟

13.5 خلاصہ

خود مختار مسلمانوں کے زمانے میں بنگال میں بڑی ترقی ہوئی۔ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری عمارت، قلعے، مسجدیں و مدرسے، اقامت خانے، سرائیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔تالاب کھودے گئے اور سڑکیں تیار ہوئیں۔اس عہد میں دو شاہی خاندان حکمران رہے: ایک

حاجی الیاس اور دوسرا علاؤ الدین حسین کا، درمیان میں راجا کنس (گنیش) اور اس کے جانشینوں نے کچھ عرصے کے لئے حکومت غصب کر لی تھی۔مملکت بنگال کو مسلمانوں نے یہ وسعت دی کہ مغربی آسام، کوچ بہار اور اڑیسہ کے اقطاع اور شمالی جنوبی بہار کا علاقہ ان کے زیر حکومت رہا۔اس مملکت کے مرکزی شہر تین تھے:

(1) گوڑ جو قدیم لکھنوتی کا نیا نام ہے اور وسط بنگال (ضلع مالدہ) میں گنگا کے کنارے واقع ہے اور چند وقفوں کے ساتھ بہت عرصے تک پائے تخت رہا۔

(2) مشرق میں سنارگاؤں: موجودہ ڈھاکے کے قریب ایک وسیع شہر تھا۔

(3) ساتگاؤں، دریائے ہگلی پر تجارتی اور انتظامی مرکز تھا۔

کشمیر میں 1339ء میں شاہ میرزا نے سلطان شمس الدین اول کے لقب سے ایک مسلمان خاندان ''شاہ میری'' کی بنا رکھی۔اس کے عہد میں ہندوؤں سے رواداری کا سلوک رہا، وہ سرکاری ملازمتوں میں بھی متعین ہوتے رہے۔اس خاندان کے حاکم سکندر شاہ کے عہد میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی، مندروں کو گرایا گیا، بتوں کو پگھلا کر سکہ ڈھالے گئے۔سکندر شاہ کے بعد زین العابدین نے اپنے عہد حکومت میں رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔وہ ہر لحاظ سے نہایت اچھا بادشاہ تھا۔اس کے عہد میں عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔اس عہد کو کشمیر کے ہر طبقے کے لوگ سنہرے دور کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔اس نے سڑکیں، نہریں اور پل تعمیر کرائے اور ہر طرح سے ملک کی خوشحالی کو فروغ دیا۔اس کے جانشینوں کے عہد میں پھر بدنظمی پھیل گئی۔شیعہ چکوں نے بڑا اثر واقتدار حاصل کر لیا اور آخر کار حکمرانوں کی جگہ لے لی اور اپنے لئے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ جب بابر نے شمالی ہندوستان کو فتح کر لیا تو اس کی توجہ کشمیر کی جانب ہوئی اور ایک مختصر سی مہم بھیجی جسے کامیابی نہ ملی، لیکن ہمایوں کے عہد میں اسکا چچا زاد بھائی مرزا حیدر دغلات ہمایوں کے نام سے کشمیر پر مغلیہ حکومت کرنے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران چلا گیا تھا مگر دغلات کی حکومت کشمیر میں 1551ء تک برقرار رہی۔اس کے بعد یہاں چک حکومت قائم ہوئی۔آخر کار اکبر نے 1586ء میں کشمیر پر فوج کشی کی اور کشمیر کو مغل سلطنت کا حصہ بنالیا۔

13.6 فرہنگ اصطلاحات

الفاظ	معانی
رعیت	ملک کے لوگ جو کسی کے ماتحت ہوں
آسودہ	آرام کرنے والا
اطوار	وضع، ڈھنگ (طور کی جمع)
التفات	توجہ، رغبت
شعار	چلن، طریقہ

تعمیل	عمل کرنا، حکم بجالانا
تاخیر	دیر، پیچھے چھوڑنا
رعایت	تخفیف
افتاد	مصیبت، اچانک سانحہ
تعرض	مزاحمت کرنا، روک

13.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل کے سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

(1) الیاس شاہی سلطنت پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(2) حسین شاہی خاندان نے کب اور کہاں حکومت کی؟ ان کے کارناموں کا جائزہ لیجیے۔

(3) حکومت کشمیر پر روشنی ڈالیے۔

حسب ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

(1) حبشی سلطنت کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

(2) شاہ مرزا نے کشمیر پر کس طرح اپنی حکومت قائم کی؟

(3) سلطان زین العابدین کو کشمیر کا اکبر کیوں کہا جاتا ہے؟

13.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

(1) دائرۃ المعارف

(2) تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ

S.K.Panday - Medieval India (3)

Masudul Hasan - History of Islam (4)

بلاک: 4 مغل حکومت

فہرست

اکائی 14 : مغلیہ حکومت کا قیام، عروج اور استحکام

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

اس اکائی میں بتایا جائے گا کہ مغلیہ حکومت کب قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں بابر کا کیا رول ہے۔ مغلیہ حکومت کے عروج و استحکام میں کن کن حکمرانوں کی کیا خدمات ہیں۔ ملک کی ترقی، خوشحالی، رعایا کی فلاح و بہبود، امن و امان کی بحالی اور عدل و انصاف کے قیام اور معاشرتی اصلاح کے لیے کیا اقدامات کیے۔

14.2 تمہید

ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ حکومت کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور کے حکمرانوں نے ہندوستان کو ایک متحدہ اکائی بنایا، اور توسیع کی۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ٹھوس اقدامات کیے۔ رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اہم پالیسی بنائی اور اس کو نافذ کیا۔ ملک کے نظم و نسق کو مضبوط بنایا۔ علم و ادب کی خوب خوب سرپرستی کی اور فن تعمیر و فنون لطیفہ میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔

14.3 مغلیہ حکومت کا قیام

14.3.1 ظہیر الدین محمد بابر (عہد حکومت 1526-1530ء)

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد ظہیر الدین محمد بابر نے 1526ء میں رکھی۔ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا کی والدہ کا نام قتلغ نگار خانم تھا۔والد کی طرف سے اس کا سلسلہ نسب امیر تیمور سے اور والدہ کی طرف سے چنگیز خان سے ملتا ہے۔تیمور سے اس کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: بابر بن عمر شیخ مرزا ابن ابوسعید مرزا ابن مرزا سلطان بن میراں شاہ بن تیمور۔

بابر اپنے والد عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد جون 1494ء میں گیارہ سال کی عمر میں فرغانہ کا حکمراں بنا۔لیکن سیاسی حالات نے اسے چین نصیب نہ ہونے دیا۔اس کی ابتدائی زندگی مشکلات سے گھری ہوئی تھی۔یہ مشکلات اس کے مخالف چچا اور ماموں نے پیدا کی تھیں۔جو فرغانہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔اس نے 1497ء اور 1503ء میں سمرقند پر جو تیمور کا پایہ تخت تھا۔قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔اس کے بعد وہ کابل چلا آیا۔

1504ء میں اس نے اپنے چچا الغ بیگ مرزا کی وفات کے بعد کابل پر قبضہ کرلیا۔وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کرلی۔تیموری حکمراں اب تک مرزا کہلاتے تھے۔بابر نے پہلی مرتبہ 1507ء میں شاہ کا لقب اختیار کیا۔1511ء میں بابر نے ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی کی مدد سے سمرقند، بخارا اور خراسان پر فتح حاصل کرلی۔لیکن یہ فتح دیرپا ثابت نہ ہوسکی۔اور 1512ء میں بابر کو کابل واپس جانا پڑا۔سمرقند پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بابر نے اپنے موروثی علاقوں کے حکمراں بننے کے دیرینہ خواب کو خیر باد کردیا۔اور اپنی پوری توجہ ہندوستان کی طرف مرکوز کردی۔بابر ہندوستان کے ان علاقوں پر جو تیمور فتح کرچکا تھا اپنا خاندانی اور موروثی حق سمجھتا تھا اور اس پر حکومت کرنے کا دعویٰ رکھتا تھا۔اسی لیے اس نے ہندوستان کی فتح کا منصوبہ بنایا۔اپنی فوجی طاقت کو منظّم و مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی۔دوترکی توپچیوں استاد علی رومی اور دوسرے ماہر مصطفیٰ رومی کی مدد سے ایک جدید توپ خانہ فراہم کیا۔1419ء میں بابر نے باجور کا محاصرہ کیا اور قبضہ کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔اس کے بعد اس نے دریائے سندھ پار کیا اور پنجاب کا رخ کیا، جس کو تقریباً 120 سال پہلے تیمور کی ریاست کا حصہ بننے کے سبب وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

ابراہیم لودھی کے دو امیروں دولت خاں گورنر پنجاب اور ابراہیم کے چچا علام خاں علاء الدین نے جو اپنے بادشاہ ابراہیم لودھی سے ناراض ہوگئے تھے بابر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی۔اس دعوت پر بابر نے ہندوستان پر پانچ حملے کیے۔1524ء میں بابر نے ہندوستان پر اپنا چوتھا حملہ کیا اور لاہور اور دیپال پور کو فتح کرلیا۔1525ء میں ہندوستان پر پانچواں حملہ کیا اور پنجاب میں اپنے مخالفین کو شکست دے کر دہلی کی جانب بڑھا۔دہلی کا بادشاہ ابراہیم لودھی بھی بابر سے مقابلہ کے لیے پنجاب کی طرف بڑھا۔بابر کے سپاہیوں کی کل تعداد کا تخمینہ 8 سے 24 ہزار تک کیا جاتا ہے، لیکن وہ انتہائی منظّم تھے۔ان کے ساتھ جدید اور کارکرد توپ خانہ تھا اور لائق جنرل کمانڈر تھا۔ابراہیم کی فوج تقریباً ایک لاکھ تھی۔لیکن وہ نہ تو اتنی تجربہ کار تھی اور نہ ہی منظّم تھی۔21 اپریل 1526ء کو دونوں افواج پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہوئیں۔جنگ صبح دس بجے سے شروع ہوئی۔غروب آفتاب تک جاری رہی۔اس جنگ میں بابر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔پندرہ ہزار

سپاہیوں کے ساتھ ابراہیم لودھی بھی مارا گیا۔ اس کے بعد فوری طور پر دہلی اور آگرہ بابر کے قبضے میں آ گئے۔ اس طرح ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر اپنی وسعت، آبادی، وسائل اور تہذیب کے لحاظ سے ایک عظیم الشان حکومت بن گئی۔

پانی پت کی تاریخی فتح کے بعد بابر نے اپنی فوج کا ایک دستہ اپنے لڑکے مرزا ہمایوں کی قیادت میں آگرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور مہدی خواجہ کو، جو کہ بابر کا برادر نسبتی تھا، دہلی کی طرف روانہ کیا۔ جمعہ 27 اپریل کو دہلی کی مسجد جامع میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، اور غربا و فقراء کو خیرات تقسیم کیگئی۔ 10 مئی 1526ء کو بابر دہلی سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ آگرہ میں ہمایوں نے اس کو کوہ نور ہیرا پیش کیا جو اس نے گوالیار کے راجہ وکر ماجیت کے اہل وعیال سے حاصل کیا تھا۔ متعدد افغان سرداروں نے آگرہ میں آ کر بابر کی حکمرانی کو قبول کیا۔ بابر کے سپاہیوں نے سنبھل، اٹاوہ، قنوج، کالپی، دھول پور، بیانہ وغیرہ کے علاقوں پر قبضہ کر کے ان کو حکومت میں شامل کرلیا۔ 16 مارچ 1527ء کو بابر نے میواڑ کے راجپوت والی رانا سانگا سے جنگ کی۔ جو کہ بابر کی دوسری اہم جنگ ہے۔ خانوہ کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جس میں راجپوتوں کو شکست ہوئی اور رانا سانگا زخمی ہوا اور کچھ دنوں بعد اس کی وفات ہوگئی۔ رانا سانگا کی موت سے راجپوتوں کی قوت کمزور ہوگئی۔

ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد افغان سردار مشرق کی جانب فرار ہوگئے تھے اور بہار میں اپنا پیر جمانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہاں انہوں نے بنگال کے حکمراں نصرت شاہ کی مدد بھی حاصل کی۔ لیکن بابر نے ان کو بہار اور اودھ کی سرحد پر گھاگرہ ندی کے کنارے 6 مئی 1529ء کو ایک بار پھر شکست فاش دی۔ اس فتح سے بہار پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا اور اب مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گوالیار اور چندیری تک پھیل گئی۔

1528ء سے بابر کی صحت آہستہ آہستہ گر رہی تھی۔ بابر جسمانی وذہنی طور پر کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار بیمار پڑا اور 26 دسمبر 1530ء کو 47 سال کی عمر میں آگرہ میں وفات پائی۔

بابر غیر معمولی لیاقت واستعداد کا مالک تھا اس کی شخصیت بڑی دلکش تھی۔ وہ صرف ایک نہایت محتاط سپہ سالار اور قابل حکمراں ہی نہیں نہ تھا بلکہ وہ ایک نقاش، باغوں اور گلزاروں کا شوقین اور ایک باکمال شاعر اور مصنف بھی تھا۔ وہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کی کتاب ''تزک بابری'' ترکی ادب کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ بابر کی ایک تصنیف اس کا دیوان ہے جس کا اکثر حصہ ترکی زبان میں ہے اور جو نظم کی ہر صنف سخن پر مشتمل ہے اس میں چند نظمیں فارسی زبان میں بھی ہیں۔ وہ خطاط بھی اعلیٰ درجہ کا تھا اور ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جسے خط بابری کہا جاتا ہے۔

14.4 نصیر الدین محمد ہمایوں (1556-1508)

ہمایوں بابر کی وفات کے بعد ہندوستان کا دوسرا مغل حکمراں بنا۔ ہمایوں کا پورا نام نصیر الدین محمد ہمایوں ہے۔ وہ بابر کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ 6 مارچ 1508ء کو کابل کے محل میں پیدا ہوا۔ اسے باپ کی زندگی ہی میں کئی ایسے مواقع میسر آئے جن سے فائدہ اٹھا کر اس نے فوجی اور مملکت داری کے تجربے حاصل کیے۔ بادشاہ بننے سے پہلے بابر نے اپنی زندگی میں دو بار بدخشاں کی حکومت اس کے سپرد کی۔ پہلی مرتبہ 1520ء سے 1525ء تک اور دوسری مرتبہ 1527ء سے 1529ء تک۔ ہندوستان میں 1529ء میں کچھ عرصہ کے لیے وہ ایک بہت ہی شورش پسند

علاقہ ''سنبھل'' کا بھی گورنر رہا۔ بابر کی وفات کے چار روز بعد 29 دسمبر 1530ء کو شہر آگرہ میں ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت 23 سال تھی۔ امراء و افسران حکومت نے غیر مشروط وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ہمایوں نے امرا و افسران کی گذشتہ کارروائیوں کی جانچ پڑتال کیے بغیر ان کو اپنے اپنے عہدوں پر برقرار رکھا۔

ہمایوں کو باپ سے وراثت میں ایک وسیع مملکت ملی تھی جو کہ دریائے آمو سے بہار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے مغربی علاقے قندز' بدخشاں' کابل' غزنی اور قندھار تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ملتان' پنجاب' اتر پردیش اور بہار کا کچھ علاقہ اس کی حکمرانی میں شامل تھا۔ بیانہ' رنتھنبور' گوالیار' الور اور چندیری اس کی سلطنت اور راجپوتانہ و مالوہ کی ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلطنت کا نظم و نسق غیر مستحکم تھا۔ نیز ہمایوں کے مخالفین میں قریبی عزیز تھے۔ بابر نے جب وفات پائی تو ہمایوں کا بھائی کامران کابل اور قندھار پر قابض تھا' ہمایوں نے سنبھل کی حکومت اپنے دوسرے بھائی ہندال کے سپرد کی اور میوات اپنے تیسرے بھائی عسکری کو دیا۔ کامران سازشی تھا۔ ہندال اور عسکری کمزور تھے۔ دوسری طرف افغان اپنے سردار محمود دلودی اور شیر خاں سوری کی قیادت میں اپنی طاقت کو منظم و مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنگال کا حکمراں نصرت شاہ ابھی بھی افغانوں کا حلیف تھا۔ گجرات میں بہادر شاہ ایک طاقتور حکمراں تھا اور ہمایوں کا حریف تھا۔

ہمایوں نے کالنجر کی فتح پر توجہ مرکوز کی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ مزید دباؤ ڈالنے کے لیے اس نے جونپور اور چنارگڑھ کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں اس نے شیر شاہ سوری کو شکست دی۔ 1532ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ کے خلاف فوج کشی کی اور اولاً مانڈو کے قلعہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر شاہ کے تعاقب میں چمپانیر فتح کرتا ہوا آگے تک پہنچا کیونکہ اس نے باغی مغلوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ گجرات کی تسخیر ہمایوں کے لیے ایک عظیم کامیابی تھی۔ اپنے برادر خورد مرزا عسکری کو گجرات کا حاکم مقرر کر کے ہمایوں آگرہ واپس چلا آیا۔ گجرات سے ہمایوں کی غیر موجودگی اور فوج کی نااہلی کا فائدہ اٹھا کر بہادر شاہ نے یکے بعد دیگرے گجرات کے اہم فوجی مرکزوں پر پھر سے قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہمایوں کی کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

اسی اثناء میں بہار کے افغانی حکمراں شیر شاہ سوری نے ہمایوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا۔ ہمایوں نے شیر خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اکتوبر 1537ء میں اس کے خلاف فوج کشی کی اور چنار کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چھ مہینے کی پیہم جدوجہد کے بعد مارچ 1538ء میں ہمایوں نے چنار پر فتح حاصل کر لی۔ پھر ایک طویل مہم کے بعد اگست 1538ء کو ہمایوں نے بنگال کے دارالحکومت گور پر بھی فتح حاصل کر لی۔ شیر خاں نے اس دوران مغل حکومت کے شمالی علاقوں پر حملہ کر کے تلیا گڑھی سے قنوج تک کے سارے علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اسی دوران آگرہ میں ہمایوں کے چھوٹے بھائی ہندال نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ان نازک حالات کے مدنظر ہمایوں نے مجبوراً گور سے آگرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مارچ 1539ء میں ہمایوں گور سے رخصت ہوا اور مونگیر کے راستے جون 1539ء میں بکسر سے کچھ فاصلہ پر شمال مغرب میں واقع چوسا کے مقام پر قیام کیا۔ 25 جون 1539ء کی رات کو شیر خاں نے مغل فوجوں پر شب خون مارا اور زبردست شکست دی اور ہمایوں کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

شیر خاں نے چوسا کی جنگ میں تاریخی کامیابی کے بعد اپنا لقب شیر شاہ اختیار کیا' اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا اور آگرہ کی جانب چل پڑا۔ اس کے سرداروں نے لکھنؤ اور قنوج پر قبضہ کر لیا۔ قنوج کی جنگ میں ہمایوں کو دوسری مرتبہ پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہمایوں کے سامنے اپنے

باپ کی بنائی ہوئی، مملکت کو خیر باد کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ ہمایوں نے اپنے بھائیوں کی نااتفاقی اور سرداروں کی نااہلی کے پیش نظر نومبر 1540ء میں ہندوستان کو خیر باد کہہ کر راجپوتانہ کے راستے سندھ چلا گیا۔ سندھ میں قیام کے دوران ہمایوں نے شیخ اکبر جامی کی بیٹی حمیدہ بانو سے 29 اگست 1541 میں شادی کرلی۔ اسی بیگم کے بطن سے 15 اکتوبر 1542ء جلال الدین محمد اکبر پیدا ہوا۔

ہمایوں ہرات پہنچا تو شاہ ایران نے قزوین میں استقبال کیا اور تخت کی بازیابی میں شاہ طہماسپ نے اس کی بھرپور مدد کی۔ 1544ء میں شاہ طہماسپ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ہمایوں کو قندھار روانہ کیا۔ اس نے قندھار و کابل پر فتح حاصل کرلی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب شیر شاہ کے بعد جانشین اپنے اپنے حق کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ اس طرح سے سوری حکومت اپنی فوجی وسیاسی طاقت کھو چکی تھی۔ شیر شاہ سوری (وفات 1545ء) اور اسلام شاہ سوری (وفات 1553) کے بعد سوری حکومت طوائف الملوکی اور آپسی نااتفاقی کا شکار ہوگئی۔ اور سوری حکمراں عادل شاہ سوری کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے لگا۔

ہمایوں نے حالات موافق پاکر ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور قندھار اور کابل پر قبضہ کرنے کے بعد 25 دسمبر 1554ء میں پیشاور پہنچا۔ پیشاور پر قبضہ کے بعد لاہور پر فتح حاصل کی۔ پھر مغل فوج نے یکے بعد دیگرے دیپال پور، ہریانہ اور جالندھر پر قبضہ جمالیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد اس کے وفادار مصاحب بیرم خاں کی قیادت میں مغل فوجوں کی افغانوں سے ماچھی واڑہ کے میدان میں 15 مئی 1555ء کو معرکہ آرائی ہوئی۔ اس جنگ میں افغانوں کو شکست ہوئی۔ پھر دوسرا مقابلہ مغلوں اور افغانوں کے درمیان 22 جون 1555ء میں سرہند میں ہوا۔ اس جنگ میں مغل افواج نے سکندر شاہ سوری کو شکست دی۔ اس جنگ کے بعد دہلی کی فتح کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔ جب 23 جولائی 1555ء میں دہلی پہنچا تو اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور اس طرح سے وہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہمایوں نے اپنے بیٹے جلال الدین اکبر کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور خود اس نے نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ہمایوں کا یہ دوسرا دور مشکل ہی سے چند مہینے ہی گزرا تھا کہ 24 جنوری 1556ء کی شام کو دہلی میں شاہی کتب خانہ کے زینہ سے گر کر شدید زخمی ہوا اور وفات پائی۔ مرنے کے بعد ''جنت آشیانی'' اس کا لقب ہوا۔ اس کی بیوہ حاجی بیگم نے دہلی میں اس کے لیے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروایا۔

ہمایوں فطری طور پر کریم النفس تھا جب کسی کو سزا دینا چاہتا تو وہ اسے معاف کردیتا۔ زندگی میں وہ ایک پرخلوص دوست اور ساتھی تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود حکمراں کی حیثیت سے اس میں فوجی فراست، تدبر، مہارت اور سیاسی دانائی کی کمی تھی۔ کتب بینی کا دلدادہ تھا۔ شاعر بھی تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ تمدنی اقدار کا بھی عاشق تھا۔

14.5 جلال الدین محمد اکبر (1556-1605)

ابوالفتح، جلال الدین محمد اکبر بن ہمایوں بن بابر، ہمایوں کی وفات کے بعد ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا تیسرا حکمراں بنا۔ جلال الدین محمد اکبر 15 اکتوبر 1542ء کو امرکوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا۔ اکبر کی عمر 13 سال کی ہوئی تو اس کے والد ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت اکبر دہلی سے دور کالانور (ضلع گورداس پور، پنجاب) میں تھا۔ 14 فروری 1556ء کو بیرم خاں نے اکبر کی بادشاہت کا اعلان کردیا اور تخت

نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت مغل حکومت کے سامنے بہت سنگین مسائل تھے۔

عادل شاہ سوری کا وزیر ہیمو بقال نے دہلی اور آگرہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور خود تخت کا دعویدار بن بیٹھا۔ اس کی خبر اکبر کو جالندھر میں ملی تو مغل فوج تیزی سے اکبر اور اس کے اتالیق بیرم خاں کی سرگردگی میں دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔ 5 نومبر 1556ء میں پانی پت کے تاریخی میدان میں مغل فوج اور افغان فوج کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ جس میں افغان فوج ہار گئی اور ہیمو بقال زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اس فتح کے بعد دہلی اور آگرہ پر اکبر کا پھر سے قبضہ ہو گیا۔

سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری تھا کہ ارد گرد کی خود مختار ریاستوں اور سرکش و باغی سرداروں کو مطیع کیا جائے، خصوصاً افغان سرداروں کے ذہن سے بادشاہت کا خیال نکال دیا جائے، چنانچہ سب سے پہلے سکندر سور کے خلاف اقدامات کیے گئے، جو مان کوٹ میں محصور ہو گیا تھا۔ 24 مئی 1557ء کو اس نے اطاعت قبول کر لی اور بہار چلا گیا۔ اس طرح پورا پنجاب اس کے ماتحت آ گیا۔ اسی سال اجمیر پر اور 1559ء میں گوالیار پر قبضہ ہو گیا۔ 1559ء تک خان زماں نے عادل شاہ کے امراء کو شکست دے کر سنبھل سے لکھنو اور الہ آباد سے جونپور تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ ان فتوحات سے ہندوستان میں مغل حکومت کو کافی استحکام حاصل ہوا۔ مغلیہ حکومت کے دائرہ کی یہ توسیع بڑی حد تک اتالیق بیرم خاں کی کوشش و محنت کا ثمرہ تھی

جلال الدین محمد اکبر نے 1556ء سے 1560ء تک اپنے اتالیق بیرم خاں کی سرپرستی میں حکومت کی۔ بیرم خاں کے حریفوں اور مخالفین کی کوششیں رنگ لائیں۔ 1560ء میں اکبر نے ایک فرمان کے ذریعہ بیرم کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر کے حجاز جانے کی اجازت دیدی اور تمام شاہی اختیارات خود سنبھال لینے کا اعلان کر دیا۔ آخر کار سفر حرمین کے دوران ہی کھمبایت میں مبارک خاں لوحانی کے ہاتھوں 31 جنوری 1561ء میں بیرم خان قتل کیا گیا۔

توسیع سلطنت

بیرم خان کے قتل کے بعد اکبر نے عنان حکومت مکمل طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بیرم خاں سے ملک گیری اور عملی سیاست کے جو گراں قدر تجربات حاصل کیے تھے، انہیں استعمال میں لاتے ہوئے اپنی پوری توجہ توسیع مملکت کی طرف مبذول کر دی اور ایک بہت ہی مختصر مدت میں مالوہ (1561ء)، گونڈوانہ (1561ء)، رنتھمبور (1569ء) کالنجر (1569ء) گجرات (1572-1573ء) اور بنگال (1575ء) کے علاقے اپنی حکومت کے حدود میں شامل کر لیے۔ اکبر نے ایک طرف تو کالنجر، رنتھمبور، گوالیار اور چتور جیسے اہم مستحکم قلعے فتح کر کے اپنی عسکری قابلیت اور مستحکم فوج قوت کا ثبوت پیش کیا اور علاقائی فرمانرواؤں کو یہ احساس بھی دلایا کہ ان کی حکومتیں اور جاگیریں اب شہنشاہ کی اطاعت کے بغیر باقی نہیں رہ سکتیں تو دوسری جانب ادہم خان، خان زماں، بہادر خان اور عبداللہ خاں ازبک جیسے نامور اور طاقتور سرداروں کی بغاوت کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ مغل حکومت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ 1976ء تک اکبر کی حکومت کے حدود میں کم و بیش پورا شمالی ہند آ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی حدود مملکت میں توسیع کی پالیسی قائم رہی اور بعض ایسے صوبے بھی فتح کر لیے گئے جو اب تک سلطنت دہلی کی حدود میں کبھی نہیں آئے تھے۔ 1586ء میں کشمیر، 92-1591ء میں سندھ، 1594ء میں بلوچستان و مکران اور 1595ء میں قندھار فتح کیا گیا۔ پھر اکبر نے دکن کا رخ کیا اور 1591ء میں جنوبی ہند کی چار آزاد ریاستوں خاندیش، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں کے یہاں مغلیہ سلطنت کا باجگزار بن

جانے کا پیغام دے کر اپنے نمائندوں کو بھیجا۔ لیکن صرف خاندیش کے حکمراں راجہ علی خاں فاروقی نے اس کے پیغام کو قبول کیا۔ 1593ء میں اکبر نے ایک فوج عبدالرحیم خانخاناں اور شہزادہ مراد کی سرکردگی میں احمد نگر کی فتح کے لیے روانہ کی لیکن سات سال کی مسلسل فوج کشی کے باوجود بھی احمد نگر کی مہم میں مغلوں کو مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اسی اثناء میں راجہ علی خان کے جانشین اور خاندیش کے حکمراں میراں بہادر شاہ فاروقی نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور اسیر گڑھ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر مغل فوج کے خلاف لڑائی لڑی۔ اکبر نے بنفس نفیس 1599ء میں خاندیش پر حملہ کیا اور دارالحکومت برہان پور پر قبضہ کرلیا اور چاروں طرف سے اسیر گڑھ کا محاصرہ کرلیا۔ بالآخر میراں بہادر شاہ نے شکست مان لی اور 6 جنوری 1601ء کو اسیر گڑھ پر مغل پرچم لہرا دیا گیا اور خاندیش کو اکبر نے اپنی مملکت کی حدود میں شامل کرلیا۔ ایسے ہی دکن کی دیگر ریاستوں کے خلاف بھی اکبر فوجی مہم کا ارادہ رکھتا تھا لیکن الہ آباد میں اپنے بڑے لڑکے شہزادہ سلیم کی بغاوت کے سبب مجبوراً دکن کی تسخیر کی پالیسی کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ رخصت ہونا پڑا۔ اکبر کو اپنی آخری عمر میں بہت سے صدمات برداشت کرنے پڑے۔ راجہ ٹوڈرمل' بیربل کے بعد اپنے عالم و فاضل دوست ابوالفضل سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شہزادہ مراد 1599ء اور شہزادہ دانیال 1604ء کی موت نے بھی اسے بے حد کمزور کردیا۔ 10 ستمبر 1604ء کو اس کی ماں حمیدہ بانو بیگم کا بھی انتقال ہوگیا۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام شہزادہ سلیم کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اور بھی تکلیف دہ بن گئے تھے۔ اکبر 3 اکتوبر 1605ء کو بیمار پڑا اور تین ہفتوں کی علالت کے بعد 26 اکتوبر 1605ء کو 63 سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔

اکبر کا شمار دنیا کے عظیم فاتح حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ذہین و فطین حکمراں تھا' اس نے انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں کئی ایجادات کیں۔ اس کا عظیم کارنامہ نظام محاصل ہے۔ اس کے ذریعہ پچھلی دس سالہ جمع بندی کے تحت آئندہ دس برسوں کی جمع بندی کی گئی۔ لگان وصول کرنے کے ضابطے مقرر ہوئے۔ زراعت کو ترقی دینے کے طور طریقے اور مزارعین کی اصلاح کے تعلق سے قوانین جاری ہوئے۔ اکبر کے عہد سے پہلے فوجیوں کو جاگیریں اور انعامات ملا کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے دور میں پہلی مرتبہ تنخواہ دینے کی شروعات کی۔ اس کے دور میں پورے ملک میں اصول انصاف کی باقاعدہ سختی سے پابندی کرائی جاتی۔ ہندوؤں کے فیصلے پنڈتوں کے سامنے اور مسلمانوں کے فیصلے قاضیوں کی عدالت میں ہوتے تھے۔ اوزان پیمائش' غذائی اشیا کی جانچ پڑتال اور جرائم کے سدباب کے لیے صوبوں میں محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔ غیر مسلم رعایا کے مذہبی رجحانات کا احترام کیا جاتا تھا۔ مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے 1526ء میں جنگی قیدیوں کو جبریہ غلام بنانے کے قانون کو منسوخ کردیا گیا۔ 1563ء میں ہندو زائرین پر لگایا جانے والا ''یاتری محصول'' معاف کردیا گیا۔ 1564ء میں غیر مسلموں پر لگایا جانے والا مذہبی محصول جزیہ کو معاف کردیا گیا۔ غیر مسلموں کو فوج اور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کرکے اکبر نے مذہبی وسیع النظری اور آزادی کی ایک بہترین مثال قائم کی۔

اکبر اہل علم و فضل کا بہت قدر داں تھا۔ اس کے دور میں علوم و فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس کے دربار سے ابوالفضل' فیضی' عبدالقادر بدایونی' عبدالرحیم خانخاناں' نقیب خان' نظام الدین بخشی' ملا مبارک اور میر فتح اللہ شیرازی جیسے مشہور و معروف علماء وابستہ تھے۔ جنہوں نے علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ عرفی' نظیری' شکیبی اور حیدری تبریزی جن میں فارسی کے بڑے شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ نیز کئی مصور' خطاط' ماہر معمار اور ماہر موسیقی کار کا تعلق بھی اس کے دربار سے تھا۔ جیسے میر سید علی تبریزی' خواجہ عبدالصمد' اشرف خاں' سید حسینی' رام داس' میاں چاند محمد حسین کاشمیری' تان سین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اکبر کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ سنسکرت' عربی اور ترکی کی کئی اہم کتابوں کے ترجمے کروائے اور فارسی میں نئی کتابیں تصنیف کروائیں۔ تراجم میں مہابھارت' رامائن' پنچ تنتر' اتھرو وید' لیلاوتی' سنگھاسن بتیسی' تزک بابری' حیاۃ الحیوان' معجم البلدان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فن تعمیر کے متعدد قابل قدر نمونے اکبر کی یادگاریں ہیں جیسے دہلی میں' ہمایوں کا مقبرہ' سیکری میں مقبرہ سلیم چشتی: اسی طرح اٹک' آگرہ' فتح پور سیکری' لاہور اور الہ آباد کے قلعے قابل دید ہیں۔

14.6 نورالدین جہانگیر (1605-1627)

اکبر کے بعد اس کا بڑا شہزادہ نورالدین محمد جہانگیر دہلی میں خاندان مغلیہ کے چوتھے بادشاہ کے طور پر تخت نشین ہوا۔ جہانگیر کی والدہ مریم الزمانی تھی۔ اس کی پیدائش 31 اگست 1569ء میں آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کے مقام پر ہندوستان کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ہوئی۔ اس بزرگ ہستی کے نام پر شہزادے کا نام بھی سلیم ہی رکھا گیا۔ لیکن اکبر ہمیشہ شہزادے کو شیخو بابا کے نام سے پکارتا تھا۔ کیونکہ اکبر احتراماً بزرگ شیخ کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

اکبر کی وفات کے آٹھ روز بعد 3 نومبر 1605ء کو جہانگیر ابوالمظفر نورالدین محمد پادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تخت نشینی کے چھ ماہ بعد ہی جہانگیر کو اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ خسرو اکبر کا چہیتا پوتا تھا اور حکومت کے بعض امراء جن میں راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز خان کوکہ شامل تھے اس کو سلیم کی جگہ پر اکبر کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اکبر نے اپنی حیات میں ہی سلیم کو اپنی پگڑی اور تلوار دے کر اپنا جانشین مقرر کرایا تھا۔ خسرو کی بغاوت کے بعد اگرچہ بادشاہ جہانگیر اور خسرو میں مصالحت ہوگئی لیکن جہانگیر نے اپنے بیٹے کی اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ بالآخر خسرو نے 1622ء میں برہان پور کے مقام پر انتقال کیا۔ اس کے انتقال سے جہانگیر کی ایک بڑی پریشانی دور ہوگئی۔

1611ء میں جہانگیر نے نور جہاں سے شادی کی۔ نور جہاں غیاث الدین کی بیٹی تھی' جو اعتمادالدولہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک حکمراں کی حیثیت سے جہانگیر کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ شہنشاہ جہانگیر سے شادی ہوجانے کے بعد نور جہاں نے آہستہ آہستہ تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سلطنت پر کافی اثر انداز ہونے لگی اور اس کا نام شہنشاہ کے نام کے ساتھ طلائی سکوں پر کندہ ہونے لگا۔

میواڑ کی تسخیر جہانگیر کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اکبر اپنے دور میں بہت کوششوں کے باوجود اس کو مکمل طور پر فتح کرنے میں ناکام رہا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے دور میں باپ کے چھوڑے ہوئے اس ادھورے کام کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ 1605ء میں اس نے اپنے بیٹے شہزادا اور پرویز کو فتح میواڑ کی مہم پر مامور کیا لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جہانگیر نے متعدد امرا کو اس کام کے لیے تعینات کیا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ فتح میواڑ کے لیے آصف خاں کو جے پور کے راجہ جگن ناتھ کو شریک کار کی حیثیت سے کمان دی گئی۔ اس کے بعد مہابت خان کو 1608ء میں اور پھر عبداللہ خاں کو 1609ء میں کمان دی گئی۔ آخر کار 1614ء میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اس کے بعد شہزادہ خرم کی سیاسی اور فوجی تدبیریں کام آئیں اور 1615ء میں راجہ امیر سنگھ نے صلح کی درخواست کی۔ خرم کے آگے رانا نے اطاقت قبول کی اور فراخدلانہ شرائط پر معاہدہ امن ہوا جو کہ مغل۔ راجپوت تعلقات کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

1608ء میں جہانگیر نے عبدالرحیم خانخاناں کو احمد نگر کی مہم پر مامور کیا۔ لیکن احمد نگر کے حبشی سردار ملک عنبر نے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ پھر 1610ء میں جہانگیر نے شہزادہ پرویز اور آصف خاں کو احمد نگر کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا لیکن یہ مہم بھی ناکام رہی۔ آخر کار 1617ء میں شہزادہ خرم کو احمد نگر پر اہم فتح حاصل ہوئی۔ جہانگیر نے اس فتح کا جشن منایا اور خرم کو شاہ جہاں کا لقب دیا۔ 1620ء میں ملک عنبر نے صلح کی شرائط توڑ کر احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر جانا پڑا۔ بالآخر 1621ء میں فریقین میں ایک مرتبہ پھر معاہدہ ہو گیا اور ملک عنبر نے احمد نگر سلطنت کے کچھ اور علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے۔ احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ نے 12 لاکھ، 18 لاکھ اور 20 لاکھ روپے سالانہ محصول کے طور پر مغل حکومت کو دینا قبول کر لیا۔

1622ء میں جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خرم نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت میں شہزادہ خرم اور نور جہاں کی باہمی رنجش کا بڑا دخل تھا۔ شہزادہ خرم کی شادی نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی اور شہر یار جو جہانگیر کا چھوٹا بیٹا تھا اس کا عقد نور جہاں کی بیٹی لاڈو بیگم سے ہوا جو نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی۔ نور جہاں کی خواہش یہ تھی کہ جہانگیر کے بعد اس کا داماد جانشین بنے۔ خرم کی بغاوت خاصی پھیل گئی اور 1625ء سے 1626ء تک خرم شاہی افواج سے لوہا لیتا رہا۔ آخر کار اس نے مہابت خاں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور باپ سے معافی مانگ لی۔

1626ء میں جہانگیر کابل کے لیے روانہ ہوا۔ جہلم کے کنارے جب شاہی کیمپ قائم تھا تو مہابت خاں نے اچانک شہنشاہ کو اپنی تحویل میں لے لیا لیکن آخر کار نور جہاں نے اسے آزادی دلانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے 1627ء میں لاہور میں اس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر 58 سال تھی۔ اس نے کل 22 سال حکومت کی۔ لاہور میں ہی دفن کیا گیا۔ جہاں اس کی بیوہ نے اپنے خرچ سے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا۔

جہانگیر کے دور حکومت کے دو مشہور واقعات قاضی نور اللہ شوستری کا قتل اور حضرت مجدد الف ثانی کی اسیری ہے۔ جنہیں جہانگیر کے حکم پر گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا تھا، لیکن کم و بیش ایک سال کے بعد بادشاہ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے انہیں رہا کر دیا۔

جہانگیر ایک عالم و فاضل شخص تھا۔ وہ مردم شناس اور مسائل میں گہری نظر رکھنے والا تھا۔ وہ نرم دل اور کریم النفس بھی تھا۔ انصاف پسند اور عادل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے محل کی دیوار کے ساتھ سونے کی ایک زنجیر مع گھنٹیوں کے نصب کروائی تھی اور حکم دے رکھا تھا کہ جس شخص کو کوئی شکایت ہو اور ہم سے ملنا چاہتا ہو وہ رات کے وقت بھی اس زنجیر کو ہلا کر بادشاہ سے فریاد کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔ اس کا دور حکومت رعایا کے لیے امن و خوشحالی کا دور تھا۔ اس دور میں صنعت و تجارت کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا اور سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال و استحکام پیدا ہوا۔

جہانگیر ادب، فنون لطیفہ اور بالخصوص مصوری کا نہایت دلدادہ تھا۔ وہ فارسی، ترکی، عربی اور ہندوستانی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔ بابر کی طرح اس نے بھی اپنی سوانح حیات خود اپنے ہاتھوں سے تصنیف کی اور اس کا نام ''تزک جہانگیری'' رکھا۔ اس کی سرپرستی میں فن مصوری نے بہت ترقی کی اور مصوری کا وہ دبستان جس کو مغل مصوری کہا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں اپنے معراج کو پہنچ گیا تھا۔ استاد ابوالحسن نادر الزماں، استاد منصور، بشن داش اور گوردھن اس دور کے ممتاز مصور تھے۔

14.7 شہاب الدین شاہجہاں (1627-1657)

جہانگیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خرم' شہاب الدین محمد شاہجہاں پادشاہ غازی کے نام سے تخت نشین ہوا۔ تحت نشینی کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ بندیل کھنڈ کے راجا ججھر سنگھ نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے شاہجہاں فوری طور پر گوالیار پہنچا۔ ججھر نے شاہی فوج سے مقابلہ کرنا بے سود سمجھا اور مہابت خان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد 1629ء میں خان جہاں لودھی نے بغاوت کر دی اور دکن فرار ہو گیا۔ بالآخر 1631ء میں شیہونڈا کے مقام پر (جو ضلع باندہ میں ہے) مادھو سنگھ راجپوت کے نیزے سے زخمی ہو کر مارا گیا۔

شاہجہاں نے 1629ء میں دکن کی نامکمل تسخیر کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے دکن پہنچ کر احمد نگر اور بیجاپور کے خلاف مہم کا آغاز کیا اور بالا گھاٹ' ناسک اور سنگم نیر پر فتح حاصل کی۔ 1691ء میں شاہجہاں کی محبوب بیوی ممتاز محل کی 7 جون 1631ء کو وفات ہو گئی۔ ممتاز محل کی موت کی وجہ سے شاہجہاں کو دکن کی مہم کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ پھر 1632ء میں مہابت خاں کو جنوبی مہم پر مامور کیا گیا۔ مہابت خاں نے 1633ء میں احمد نگر سلطنت کے قلعہ دولت آباد پر قبضہ کر لیا اور احمد نگر کے سلطان حسین نظام شاہ کو گوالیار میں قید کر دیا گیا اور یوں احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ 1636ء میں ایک مرتبہ پھر دکن کی تسخیر کے لیے شاہجہاں خود دولت آباد روانہ ہوا اور آخر کار بیجاپور کے سلطان سے مصالحت ہو گئی۔ صلح کی شرائط کے مطابق سلطان بیجاپور نے 20 لاکھ روپے سالانہ ادا کرنا منظور کیا' نیز مراٹھوں کے خلاف مہم میں مغلوں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ شہنشاہ شاہجہاں نے بیجاپور کے سلطان کو پارندہ اور کونکن کے علاقے جاگیر میں عطا کیے۔ 1936ء میں ہی ریاست گولکنڈہ کے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے بھی مصالحت ہو گئی۔ اور مئی' جون 1636ء میں عبداللہ قطب شاہ نے مغل شہنشاہ کی مرضی کے مطابق ایک معاہدہ پر دستخط کر دیا۔ اس معاہدے میں یہ بات شامل تھی کہ خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ ساتھ مغل شہنشاہ کا نام بھی خطبے میں پڑھا جائے گا اور سکوں پر بھی ان کا نام کندہ ہو گا۔ گولکنڈہ کے حاکم نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ شہنشاہ کا مطیع رہے گا' اگر بے وفائی کی تو ریاست چھین لی جائے گی۔ نیز قطب شاہ نے سالانہ دو لاکھ ہن یا چھ لاکھ روپیہ پیش کش دینا قبول کیا۔

سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں پرتگالی ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور جلد ہی ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندرگاہوں کو چین' گوا' دمن اور دیو پر اپنا قبضہ جما لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہگلی کی بندرگاہ پر بھی قبضہ کر لیا اور بنگال کی تجارت میں مداخلت شروع کر دی۔ 1632ء میں بنگال کے صوبہ دار قاسم خان نے شاہجہاں سے پرتگالیوں کے خلاف فوج کشی کی اجازت مانگی۔ شہنشاہ نے اجازت دے دی۔ تقریباً چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد پرتگالیوں کو سخت شکست ہوئی اور ہگلی کو پرتگالیوں سے چھین لیا گیا۔ 1634ء میں شاہجہاں نے ایک چھوٹی مہم بلتستان (تبت خورد) کے حکمراں ابدال کے خلاف بھیجی اور ابدال کو مغل شہنشاہ کا اقتدار قبول کرنے اور سالانہ پیش کش دینے پر مجبور کیا۔

ہندوستان اور ایران دونوں کے درمیان عرصہ سے قندھار کے تعلق سے نزاع چلا آ رہا تھا۔ شاہ ایران کے وزیر سے شدید اختلافات کی وجہ سے قندھار کے ایرانی حاکم علی مردان خاں نے مغلوں سے مدد مانگی اور قندھار کو حوالہ کرنے کی پیش کش کی۔ 1638ء میں غزنی کا کمانڈر اور کابل کا گورنر قلعہ میں داخل ہو گیا اور علی مردان نے مغل شہنشاہ سے وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے قلعہ حوالے کر دیا۔ اس طرح سے قندھار مغلوں کے قبضہ میں آ گیا اور علی مردان خاں کو مغل کی طرف سے انعام و اکرام سے نوازا گیا اور کچھ دنوں کے بعد علی مردان کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر

کر دیا گیا' لیکن ایرانیوں نے 1649ء میں قندھار کو دوبارہ لے لیا' اور قندھار کا قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔

شاہجہاں کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ وسط ایشیا کے خلاف فوج کشی کا ہے۔ شاہجہاں نے شہزادہ مراد کو اس مہم کا سربراہ بنایا۔ جولائی 1645ء میں مراد بدخشاں میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک طاقتور فوج کی مدد سے بلخ پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ بلخ کے حاکم اور ازبکوں کے سردار نذر محمد مراد کی کامیابی سے پریشان ہو کر ایران فرار ہو گیا لیکن مراد نے اس مہم کی زیادہ دنوں تک قیادت نہیں کی اور باپ کی حکم عدولی کر کے کابل واپس چلا آیا۔ شاہجہاں نے مراد کی جگہ شہزادہ اورنگ زیب کو اس مہم کی قیادت کے لیے مقرر کیا اور مہم جاری رکھنے کا حکم دیا' لیکن شہزادہ اورنگ زیب بھی اس مہم کو زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکا اور ان علاقوں پر تسلط قائم کرنے میں ناکام رہا اور وہاں سے واپسی پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح سے وسط ایشیا کی مہم ناکام ہو گئی۔

1652ء میں شہزادہ اورنگ زیب کو دوبارہ دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا' جہاں اس کی جارحانہ حکمت عملی کو شاہجہاں نے روکا اور حکم دیا کہ حاکم گولکنڈہ عبداللہ قطب شاہ ' جس پر اس نے حملہ کر دیا تھا' سے صلح کر لے۔ چنانچہ 1656ء میں مغلوں اور گولکنڈہ کے درمیان صلح ہو گئی' لیکن اورنگ زیب نے بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کے خلاف فوج کشی کر کے بیدر اور کلیان پر قبضہ کر لیا۔

ستمبر 1657ء میں شاہجہاں شدید بیمار ہوا تو اس کی علالت کی خبر پا کر اس کے چاروں بیٹوں داراشکوہ' شجاع' اورنگ زیب اور مراد بخش میں حصول اقتدار کے لیے آپس میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کو ساموگڑھ میں شکست فاش دی اور شاہ شجاع کو الہ آباد کے قریب کھجوہ کے مقام پر شکست دی اور وہ اراکان کے جنگلوں میں فرار ہو گیا جہاں اس کی وفات ہو گئی اور مراد بخش کو قید کر کے قتل کرا دیا۔ نیز شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر کے خود آگرہ میں تخت نشین ہو گیا اور شاہجہاں نے طویل نظر بندی کے دن گزارنے کے بعد 22 جنوری 1666ء کو 74 سال کی عمر میں وفات پائی۔

شاہجہاں کا تیس سالہ دور حکومت مغلیہ سلطنت کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس کا دور خوشحالی کا دور تھا۔ تہذیبی امور میں شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان نے کافی ترقی کی۔ اس دور میں علم و ادب کا بھی خوب فروغ ہوا۔ شاہجہاں کے دو بیٹے داراشکوہ اور اورنگ زیب صاحب تصنیف اور انشاء پرداز تھے۔ اس کی بیٹی جہاں آراء بیگم کی کتاب مونس الارواح کافی مشہور ہے۔ اس کے امراء میں ظفر خاں احسن اور نواب شکر اللہ خان بھی صاحب تصنیف تھے۔ بادشاہ خود فارسی اور سنسکرت ادب کے دلدادہ تھا۔ سنسکرت کے عظیم شاعر جگناتھ پنڈت' چتامنی اور سندر داس اس کے دربار سے متعلق تھے۔ ایسے ہی حاجی محمد' جان قدسی' ملک الشعرا ابو طالب کلیم' غنی کاشمیری' منیر لاہوری وغیرہ اسی دور سے متعلق تھے۔

فن تعمیر اور فنون لطیفہ کو بھی اس دور میں کافی ترقی ملی۔ آگرہ کی تزئین و آرائش شاہجہاں آباد کی تعمیر' جامع مسجد دہلی' لال قلعہ دہلی' تاج محل آگرہ وغیرہ کی تعمیر عہد شاہجہانی کی عظمت اور شان و شوکت کی آج بھی شہادت دے رہی ہے۔ فن موسیقی میں تان سین کا داماد لال خاں اور ماہر موسیقی جگن ناتھ بہت مقبول ہوئے۔ عہد شاہجہانی میں شبیہ سازی کو بڑی ترقی ملی اور تصویریں رنگ و حواشی کے لحاظ سے زیادہ شاندار ہو گئیں۔ فن خطاطی بھی اس عہد میں اوج کمال تک پہنچی۔ چنانچہ عبدالرشید دیلمی مشہور خطاط کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ اس کا خط نستعلیق خاص ندرت رکھتا ہے۔ کندہ کاری' نگینہ کاری' مہر سازی جیسے فنون کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔

14.8 محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (1658-1707)

ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر 3 نومبر 1618ء کو مالوہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی زمانے ہی سے اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا گیا اور اس نے عربی، فارسی، قرآن و حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور شاہجہاں کے دور حکومت میں کئی اہم عہدے پر فائز رہا۔ ستمبر 1657ء میں جب شاہجہاں شدید بیمار ہوا اور اس کے چاروں بیٹوں کے درمیان حصول تخت کے لیے چپقلش بڑھتی جون 1658ء میں اورنگ زیب نے شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا اور سلطنت مغلیہ پر فرمانروائی کا آغاز کر دیا۔

اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کی پہلی رسم دہلی کے قریب باغ اعزآباد میں (جو بعد میں شالیمار باغ کے نام سے مشہور ہوا) نہایت سادگی کے ساتھ ادا کی اور ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کا لقب اختیار کر کے 31/جولائی 1658ء میں اپنی بادشاہت کا باضابطہ اعلان کیا۔ اس نے حصول تخت کے خواہاں دیگر بھائیوں سے نمٹنے کے بعد اپنی دوسری رسم تخت نشینی شان و شوکت کے ساتھ 5/جون 1659ء کو دہلی میں ادا کی۔

اورنگ زیب نے پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔ اس نے اپنی طویل دور حکومت میں توسیع سلطنت اور استحکام و تحفظ مملکت کے لیے کئی جنگیں لڑیں اور بغاوتوں کو ختم کیا اور اصلاحات کیں۔ اپنی دور حکومت کے پہلے پچیس سال شمالی ہندوستان میں بغاوتوں کو ختم کرنے اور اصلاحات نافذ کرنے اور آخری پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں صرف کیے۔

اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی اہم صوبوں میں اپنے آدمی مقرر کیے، چنانچہ دکن کی ذمہ داری شائستہ خان کے سپرد کی اور میر جملہ کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا۔ بنگال کا صوبہ دار میر جملہ ایک کامیاب سپہ سالار اور منتظم تھا۔ میر جملہ نے کوچ بہار کے قلعہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد میر جملہ نے دریائے برہم پتر کو عبور کیا اور آسام کو فتح کر کے اسے پہلی مرتبہ مغل بادشاہ کا باجگذار بنایا۔ میر جملہ کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اپنے ماموں شائستہ خان کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ شائستہ خان نے کئی اہم کارنامے انجام دیے۔ اس علاقے میں سواحل پر ماگ قوم فرنگی قزاقوں سے مل کر لوٹ مار کرتی رہتی تھی۔ اورنگ زیب نے شائستہ خان کو حکم دیا کہ ان غارت گروں کی سرکوبی کرے اور استیصال کرے، چنانچہ 1666ء میں شائستہ خان نے اپنے بڑے بیٹے امین خان کو باقاعدہ اس مہم پر روانہ کیا۔ پرتگیز حلیفوں نے تو لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا، لیکن اراکان کے رئیس اور راجہ ان کے حامی بن گئے اور کئی دریائی معرکے ہوئے۔ آخر کار چٹاگانگ کے مضبوط قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کامیابی پر بادشاہ نے شائستہ خان اور اس کے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے نوازا اور شائستہ خان کو ہفت ہزاری کا منصب بھی دیا۔ شائستہ خان نے بنگال کے نظم و نسق کو اچھی طرح درست کیا۔ اس کے دور میں متعدد مدرسے، مسجدیں، پل اور سڑکیں تعمیر ہوئیں اور اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کیا گیا۔

پنجاب اور کابل کے درمیان جنگجو قبائل تھے، وہ اکثر بغاوتیں اور شورشیں کرتے رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں بھی اس علاقے کے قبائل نے بغاوتیں کیں۔ خصوصاً یوسف زئیوں نے 1667ء میں سوات، باجور اور پشاور کے علاقے میں علم بغاوت بلند کیا اور آفریدیوں نے 1672ء میں اپنے سردار اکمل خان کی قیادت میں بغاوت کی اور علی مسجد کی جنگ میں افغانستان کے حاکم محمد امین خان کو شکست

دی۔ خٹک قبائل نے آفریدیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح سے اورنگ زیب کے لیے ان علاقوں میں انتظامی مسئلہ پیدا ہوگیا۔ مزید صورت حال کو بگڑتا دیکھ کر بادشاہ بذات خود حسن ابدال روانہ ہوا اور وہاں ڈیڑھ سال قیام کر کے قبائل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ تادیبی دستے ہر طرف پھیلا دیے۔ چند مہینوں میں باغیوں اور شرکشوں نے سزا پائی۔ ہرنا کے پر شاہی فوج تعینات ہوئی اور جنگی چوکیاں قائم ہوئیں۔ اس طرح سے ان قبائل کی بغاوت کو ختم کرنے میں کامیابی ملی۔ 1676ء میں اورنگ زیب نے امیر خاں کو کابل کا صوبہ دار مقرر کیا امیر خان نے اپنی وفات (1698ء) تک کابل پر حکمرانی کی اور مغلیہ حکومت کی شمال مغربی سرحدوں پر نظم و نسق بحال رکھا۔

1668-1675ء کے درمیان متھرا میں جاٹوں نے' نارنول میں ستنامیوں (جو جوگیوں کا ایک فرقہ تھا) نے اور پنجاب میں سکھوں نے بغاوتیں کیں۔ مشہور مورخ پروفیسر عرفان حبیب کے مطابق یہ بغاوتیں بہت حد تک کسانوں کی تھیں جو کہ زرعی محصول یا مالگزاری کے نظام میں تبدیلی کی وجہ سے حکومت سے ناراض تھے۔ ان بغاوتوں کو دبایا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کو 1678ء سے 1681ء کی مدت میں مارواڑ (جودھپور) اور میواڑ (اودے پور) کے راجپوتوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ 10/دسمبر 1678ء میں مارواڑ کے لاولد راجہ جسونت سنگھ کی وفات ہوگئی' اس کے بھتیجے اندر سنگھ کو جودھپور کا راجہ مقرر کیا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد متوفی کی دو رانیوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک پیدائش کے بعد ہی فوت ہوگیا اور دوسرا بیٹا اجیت سنگھ بعد میں جودھپور کا راجہ بنا۔ اجیت سنگھ کی ماں" ٹھاکر درگا داس اور دیگر حامیوں نے اورنگ زیب سے اجیت سنگھ کو راجہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ اورنگ زیب کے انکار کرنے کے بعد ٹھاکر درگا داس اور دیگر راجپوت سرداروں نے علم بغاوت بلند کردیا۔ صوبائی حکام نے اس کی سرکوبی کرنی چاہی لیکن وہ بھاگ کر میواڑ (اودے پور) پہنچ گیا۔ اودے پور کا رانا سنگھ بھی اس کا حامی و مددگار بن گیا۔ نتیجتاً راجپوتوں نے بغاوت کردی۔ بغاوت کو کچلنے کے لیے ستمبر 1679ء میں شہزادہ اکبر کو بھیجا گیا۔ راجپوتوں نے مجبوراً سازش کی راہ تلاش کی۔ رانا اودے پور اور ٹھاکر نے شہزادہ اکبر کو بادشاہی کے سبز باغ دکھائے۔ اور خود اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اس طرح سے شہزادہ اکبر کو باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے اورنگ زیب بذات خود اجمیر کی طرف روانہ ہوا اور اجمیر سے دس میل جنوب دوہارا میں قیام پذیر ہوا۔ اورنگ زیب نے حالات کا نہایت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ ہوشیاری اور حکمت عملی سے کام لے کر شہزادہ اکبر اور راجپوتوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اس نے راجپوتوں کو شہزادے سے علاحدہ کردیا۔ بادشاہی فوج ایک پچیس سالہ شہزادے کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ چند ہی دنوں میں بہت سے سردار اور سپاہی شہزادہ اکبر کو چھوڑ کر اجمیر چلے آئے جہاں اس وقت اورنگ زیب مقیم تھا۔ اورنگ زیب نے از سرنو لشکر مرتب کیا۔ اکبر شکست کھانے کے بعد اپنے راجپوت حلیفوں کے ساتھ دکن فرار ہوگیا اور پھر وہاں سے ایران چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

درگا داس ٹھاکر بھی اکبر کے ساتھ ہی راجپوتانے سے فرار ہوگیا تھا' اودے پور کا رانا بھی پہاڑوں میں جا چھپا تھا۔ مگر وہاں بھی اورنگ زیب کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ مجبوراً معافی طلب کی' اور دو پرگنے اورنگ زیب کو پیش کیے۔ اورنگ زیب نے درگزر سے کام لیا اور ان کی ریاست بحال کردی اس طرح سے ان علاقوں میں حالات معمول پر آگئے اور امن قائم ہوگیا۔

اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں دکن کی نامکمل تسخیر کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ 1665ء میں اس نے راجہ جے سنگھ

کو دکن کا صوبے دار مقرر کر کے بیجاپور اور مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی سرکوبی کا حکم دیا۔ دکن میں مراٹھا سردار شیواجی نے (جو شاہ جی بھونسلے کا لڑکا تھا) اپنی طاقت بہت بڑھالی تھی۔ شیواجی اعلیٰ درجہ کا مدبر' گوریلا طرز جنگ کا ماہر سپاہی تھا' اس نے دکن کے کئی قلعوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ راجہ جے سنگھ نے دکن پہنچنے کے بعد شیواجی کے خلاف محاذ قائم کیا اور اسے شکست دے کر صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ جے سنگھ نے معاہدہ پورنڈھ کے ذریعہ شیواجی کو مجبور کیا کہ اپنے 37 قلعوں میں سے 23 قلعے مغلوں کے حوالے کر دے۔ شیواجی نے بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کے خلاف جنگ میں مغلوں کی حمایت کا یقین دلایا۔ جے سنگھ نے اس فتح کے بعد بیجاپور کے خلاف مہم چھیڑی لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ 1666ء میں اورنگ زیب نے اسے واپس بلالیا۔ جے سنگھ کے بعد دیگر صوبیداروں بہادر خاں اور دلیر خان نے بھی بیجاپور کے محاذ میں ہزیمتیں اٹھائیں۔ اس لیے ستمبر 1681ء میں اورنگ زیب کو برہان پور خود آنا پڑا۔ اورنگ زیب نے برہان پور پہنچنے کے بعد سب سے پہلے مراٹھوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چاروں طرف سے مراٹھا حکمراں شمبھاجی کے علاقوں پر حملہ کیا' لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر کار مقرب خاں کی قیادت میں 1689ء میں مغل فوج نے رتناگری کے قریب قائم مراٹھا کیمپ پر اچانک حملہ کر دیا۔ شمبھاجی اور اس کا وزیر مقرب خاں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور بعد میں دونوں کو سزائے موت ہوئی۔

مراٹھوں کے خلاف محاذ آرائی میں بادشاہ اورنگ زیب کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ مراٹھا قوت پوری طرح اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ بیجاپور اور ریاست گولکنڈہ سے نہ نپٹ لیا جائے۔ چنانچہ 1685ء میں شہزادہ محمد معظم کی قیادت میں مغل فوج نے بیجاپور کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر بیجاپور والوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ 22 / ستمبر 1686ء کو بیجاپور کے سلطان سکندر عادل شاہ نے قلعہ اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ عادل شاہ کو خاں کا لقب ملا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ بطور پنشن دے کر سبکدوش کر دیا گیا اور بیجاپور کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنالیا گیا۔ پھر اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر چڑھائی کی۔ آٹھ ماہ تک گولکنڈہ کا محاصرہ چلا پھر بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ آخر کار اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے ایک افغان امیر عبداللہ کی مدد سے قلعہ کو فتح کیا۔ اس طرح گولکنڈہ کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور اس کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے 1689ء سے 1707ء تک مسلسل مراٹھوں کی طاقت کو ختم کرنے میں لگا رہا۔ سب سے پہلے بسنت گڑھ فتح ہوا پھر ستارا' تورنا اور کھیلنا وغیرہ کے قلعے تسخیر ہوئے۔ پرنالا اور بھوسان گڑھ کے قلعوں پر بھی قبضہ ہو گیا۔ لیکن مغل سرداروں کی آپسی چپقلش اور سازش کی وجہ سے مراٹھوں کی طاقت کو مکمل طور سے کچلنے میں اورنگ زیب کامیاب نہ ہو سکا۔ سخت محنت اور مسلسل فوج کشی نے اورنگ زیب کی صحت پر بڑا اثر ڈالا اور اورنگ زیب کا 89 سال کی عمر میں 3 مارچ 1707ء کو احمد نگر میں انتقال ہو گیا۔

اورنگ زیب کا شمار مغلیہ حکومت کے اہم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ تخت نشینی کے بعد رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اورنگ زیب نے کئی اہم اصلاحی اقدامات کیے۔ مغلیہ دور میں سکوں پر کلمہ طیبہ لکھا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے کلمہ طیبہ کی بے حرمتی کا خیال کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سکوں پر کلمہ کا کندہ کرانا بند کرا دیا۔ بھنگ کی کاشت بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ مسلمانوں کے اخلاق واطوار کی اصلاح کے لیے محکمہ احتساب قائم کیا۔ ملک کے اندر تمام قصبوں اور شہروں میں بڑے مستعد محتسب مقرر کیے جو لوگوں کو معاشرتی برائیوں یعنی شراب پینے' جوا کھیلنے سے منع کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید وفروخت کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ دربار میں ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کی رسم رائج تھی اسے بھی ختم کر دیا گیا۔ دربار میں گانا بجانا اور رقص وسرور کی محفلیں بند کر دی گئیں۔ جشن نوروز بند کر دیا گیا۔ بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانا' زمین بوسی اور جھروکے درشن کی رسمیں موقوف کر دی

گئیں ۔جشن ولادت اور جشن تخت نشینی سادہ طریقے سے منانے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ کو سونے اور چاندی میں تولنے کی رسم ختم کر دی گئی ۔ درباری لباس میں اصلاح کی گئی ۔ امراء کے لیے زیورات اور ریشمی کپڑے پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ ستی کی رسم ممنوع ہوگئی ۔ ملک میں اسّی کے قریب ناجائز ٹیکس وصول کیے جارہے تھے ۔ ان میں محصول راہ داری جو اشیا تجارت پر مالیت کے اعتبار سے دس فیصد شرح سے عائد تھا معاف کر دیے گئے ۔ ٹول ٹیکس اور مختلف دیگر محصول جن کو ابواب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور گنگا جمنا پر نہانے کا ٹیکس وغیرہ بھی معاف کر دیا گیا۔ ان اقدامات سے عام آدمی کو فائدہ پہنچا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت تقریباً 150 سال تک قائم رہی ۔ اورنگ زیب کے بعد اس کے جانشینوں کے دور حکومت میں بڑی تیزی سے مغل حکومت کا زوال ہونے لگا۔ اس کے جانشینوں میں بہادر شاہ اول (عہد حکومت 1712-1707ء) ایک طاقتور حکمراں تھا اور اس کے دور میں مغلیہ حکومت کی سرحدیں تقریباً اتنی ہی تھیں جتنی اورنگ زیب کے وفات کے وقت تھی ۔ اس کے بعد فرخ سیر (عہد حکومت 1719-1712) کے زمانہ میں اگرچہ حکومت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئی تھیں، لیکن اس کے باوجود اس وقت تک مغلیہ حکومت کے اثر و اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پھر محمد شاہ (عہد حکومت 1754-1719) تخت نشین ہوا۔ اسی دور سے مغلیہ حکومت کے زوال کا آغاز ہوگیا۔ اسی زمانے میں ایرانی حکمراں نادر شاہ کا حملہ (1739ء) دہلی پر ہوا۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے احمد شاہ (عہد حکومت 1754-1748) عالمگیر ثانی (عہد حکومت 1759-1754) ، شاہ عالم ثانی (عہد حکومت 1806-1759) ، اکبر شاہ ثانی (عہد حکومت 1837-1806) اور بہادر شاہ ظفر (عہد حکومت 1857-1837) نے حکومت کی ۔ اس طرح ہندوتان میں جس حکومت کی بنیاد بابر نے 1526ء میں رکھی تھی۔ 1857 ء میں ہمیشہ کے لیے اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

14.9 خلاصہ

ظہیر الدین محمد بابر نے 21/ اپریل 1926ء کو ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست دی اور ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد ڈالی ۔ اور کئی علاقے فتح کر کے مغلیہ حکومت کو وسیع کیا۔ اس کی کوششوں سے مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گوالیار اور چندیری تک پھیل گئی ۔ بابر کی وفات کے بعد اس کا لڑکا نصیر الدین محمد ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے دور میں اٹھنے والی بغاوتوں کو ختم کیا اور آخر کار چوسا کی جنگ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران چلا گیا۔ پھر شاہ ایران سے مدد حاصل کی اور ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہمایوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر 13 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ابتداء میں اپنے اتالیق بیرم خان کی سرپرستی میں حکومت کی ۔ بیرم خان کے قتل کے بعد اکبر نے عنان حکومت مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لی ۔ اپنی حکومت کی حدود کو وسیع کیا۔ نظام محاصل کو درست کیا۔ انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں کئی ایجادات کیں ۔ نور الدین جہانگیر کے بعد دور حکومت میں بھی کئی بغاوتیں ہوئیں ۔ ان بغاوتوں کو ختم کیا۔ میواڑ کی تسخیر اس دور کا اہم واقعہ ہے ۔ اس کے دور میں سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال اور استحکام پیدا ہوا۔ اس دور کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں ۔ اس دور میں خصوصاً مصوری کو بہت فروغ ملا۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس دور میں بھی کئی علاقے فتح کیے گئے ۔ شاہجہاں کا دور تہذیبی لحاظ سے کافی اہم شمار کیا جاتا ہے ۔ اس کا تیس سالہ دور خوشحالی کا دور تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بنا۔ اورنگ زیب نے اپنی دور حکومت کے پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے

میں صرف کیے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ حکومت زوال پذیر ہوگئی۔ اس کے نااہل جانشینوں نے حکومت کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ بالآخر 1857ء میں مغلیہ حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

14.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. بابر کے بارے میں آپ اپنی معلومات تحریر کیجیے۔
2. جلال الدین محمد اکبر کی فتوحات کو تفصیل سے لکھیے۔
3. اورنگ زیب کے دور حکومت میں دکن کی تسخیر سے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4. ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد کیسے پڑی؟ روشنی ڈالیے۔
5. ہمایوں نے ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ کیسے حاصل کیا۔
6. شاہجہاں کی حکومت پر روشنی ڈالیے۔

14.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: (حصہ دوم) ثروت صولت۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ نئی دہلی
2. مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال: آر۔ پی۔ ترپاٹھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
3. اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر۔ شبلی نعمانی ۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔
4. تزک بابری۔ بابر
5. منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بدیوانی
6. اکبرنامہ۔ ابوالفضل
7. تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ

اکائی 15 :مغلیہ حکومت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزاء

15.1 مقصد

اس اکائی میں یہ بتایا جائے گا کہ مغلیہ دور حکومت کا نظم ونسق کیسا تھا؟ اس میں بادشاہ کی کیا حیثیت تھی، اور روزمرہ کے کام کا کیا معمول تھا؟ حکومت چلانے میں مدد کرنے والے کون کون سے محکمے تھے اور وہ محکمے اپنے امور کو کیسے انجام دیتے تھے اور ان کی ذمہ داریاں کیا تھیں؟ اسی

طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مغلیہ عہد کا فوجی نظام کیسا تھا اور یہ نظام کتنا موثر تھا۔

15.2 تمہید

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ایک طویل عرصہ تک قائم رہی۔ اس وسیع حکومت کا نظم ونسق مضبوط بنیادوں پر قائم تھا۔ اس کا معمار بادشاہ اکبر تھا۔ ملکی امور کو انجام دینے کے لئے کئی اہم شعبے تھے۔ شعبوں کے عہدہ داران قابل، فرض شناس اور بادشاہ کے وفادار ہوتے تھے۔ تمام اعلیٰ عہدیداران بادشاہ کی نگرانی میں اپنے امور انجام دیتے تھے اور بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھے۔

15.3 بادشاہ

مغلیہ دور تقریباً 331 سالوں پر محیط ہے۔ اس وسیع حکومت کی عظمت واستحکام کا انحصار اس کے بہترین نظم ونسق پر تھا۔ اس نظم ونسق کا معمار بادشاہ اکبر تھا۔ یہی نظم حکومت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں قائم رہا۔ مرکزی حکومت کے انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے بادشاہ اکبر نے کئی اہم شعبے قائم کئے۔ ہر شعبہ کی نگرانی ایک بڑے عہدیدار یا وزیر کے سپرد کی گئی۔ حکومت کا سب سے اعلیٰ اور بڑا عہدیدار خود بادشاہ ہوتا تھا۔ وہ مطلق العنان ہوتا تھا، اسے غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ صدر مملکت، افواج حکومت کا سپہ سالار، عدل وانصاف کا سرچشمہ، سب سے بڑا قانون ساز اور حکومت میں قطعی اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ امور حکومت کی انجام دہی اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے بادشاہ مرکزی حکومت میں کئی عہدیداروں سے مدد لیتا تھا۔ ان میں ایک اہم عہدیدار وکیل یا وزیر اعظم ہوتا تھا۔ وکیل کے عہدہ کی مستقل حیثیت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وکیل کا عہدہ ہمیشہ پُر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ عام طور سے بادشاہ کی کم سنی یا کمزوری یا خرابی صحت کے دور میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اس عہدے پر خاندانی امیروں کی اجارہ داری نہ تھی بلکہ موزوں اشخاص کا انتخاب چھوٹے درجہ کے لوگوں میں سے بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح سے وکیل کے تقرر کا انحصار کلی طور پر بادشاہ کی مرضی پر تھا۔ لیکن جب بھی کسی کو سلطنت کے وکیل کے عہدہ پر مقرر کیا جاتا تھا تو وہ بادشاہ کے بعد حکومت کے سربراہ کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔

نظام حکومت کو چلانے کے لئے حکومت کے فرائض واختیارات چار وزیروں میں تقسیم تھے۔

(1) دیوان۔ وزیر مال وفینانس

(2) میر بخشی۔ وزیر فوج

(3) میر سامان۔ وزیر کارخانہ جات اور اسٹور

(4) صدر۔ وزیر عدالت اور امور مذہبی

اس طرح سرکاری محکمہ جات کا انتظام تو ان چار وزیروں کے ذمہ رہا، لیکن مجالس مشاورت میں وزیروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک کئے جاتے تھے۔ دربار میں، دوروں اور مہمات میں بادشاہ کی موجودگی اور نظم ونسق کی سرگرمیوں پر اس کی گہری نظر سے یہ مرکزی نظام موثر

اور کارکرد بن گیا تھا۔

15.3.1 بادشاہ اور کارمملکت

بادشاہ کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اور اسے بادشاہت کرنے کا حق خدا کی جانب سے ملتا ہے۔ وہ اپنے دائرہ کار میں اعلیٰ ترین فرد ہوتا ہے۔ خدا کے اس عظیم عطیہ کو حاصل کرنے کی صورت میں بادشاہ پر اس کی عبادت اور شکریہ ادا کرنا فرض ہے اور اس کے لئے عبادت کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے رعایا کے تمام متعلقہ فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیتا رہے۔

بادشاہ اکبر نے جو مغلیہ سلطنت کے نظم و نسق کا معمار تھا' شہنشاہیت کے تصور کو اپنے عمل کے ذریعہ حمایت بھی کی' اکبر نے اپنے عہد حکومت میں جھروکہ درشن کی رسم کو رائج کیا۔ اس دور کے مورخ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ ''اس رسم کا مقصد یہ تھا کہ خاص و عام بلا روک ٹوک بادشاہ کے حضور میں باریاب ہونے کا شرف حاصل کرسکیں' یہ رسم بادشاہ اکبر کے بعد اس کے بعض جانشینوں کے دور میں بھی رائج رہی۔ عقیدت مند صبح کے وقت جھروکے کے نیچے اکٹھا ہوتے تھے جن میں خواص و عوام' سپاہی' تاجر' سوداگر' اہل حرفہ اور دیہاتی ہر طرح کے لوگ درشن کے لئے جمع ہوتے تھے۔ بادشاہ اکبر جھروکے میں نمودار ہوتا اور درشن دینے کے بعد دربار عام منعقد کرتا تھا۔

اکبر روزانہ امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے خلوت گاہ سے تین دفعہ باہر نکلتا تھا۔ پہلی دفعہ طلوع آفتاب کے بعد درشن کیلئے' جھروکہ درشن کے بعد ہی دربار عام منعقد کرتا تھا۔ جس میں ہندو' مسلم خاص و عام اور مرد و عورت ہر ایک کو اپنی معروضات اور درخواست پیش کرنے اور اپنے مقدمات کو براہ راست بیان کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری مرتبہ دوپہر کے بعد جب وہ ان جانوروں کا معائنہ کرتا تھا جن کی نگرانی کا کام مرکزی حکومت کے سپرد تھا۔ اس کے بعد وہ کارخانوں اور دیگر امور کا جائزہ لیتا۔ اگر کام زیادہ ہوتا تو غروب آفتاب کے بعد تک اجلاس جاری رہتا تھا۔ اس طرح سے دن میں تین مرتبہ شاہی دربار منعقد کرنے سے انتظام سلطنت پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ دن کا درمیانی وقت شاہی حرم کے معاملات کے لئے وقف ہوتا تھا۔ یہ وقت اندرون خانہ صرف ہوتا تھا۔ یہاں بیگمات اور دیگر عرضی گزار خواتین کے معاملات پر توجہ دی جاتی تھی۔ رات کا وقت صرف نجی مجالس کے لئے تھا۔ اس مجلس میں علماء' دانشوران' حکماء شریک ہوتے۔ اور مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ ہوتا۔ کبھی کبھی اس وقت بھی امور سلطنت انجام دیئے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں صرف متعلقہ امور کے عہدیداران اور چند خدمت گار ہی کو اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوتی تھی۔

15.3.2 دیوان خاص و عام کا طریقہ کار

صبح میں امور سلطنت انجام دینے کے بعد دوبارہ دوپہر کے وقت بادشاہ پورا دربار منعقد کرتا تھا۔ یہ مجلس دیوان خاص و عام میں منعقد ہوتی تھی۔ اور وہاں روزمرہ کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔ اور جانوروں کا معائنہ ہوتا تھا۔ اسی دربار میں نئے خریدے ہوئے جانوروں کی قیمت طئے کی جاتی تھی۔ اور پرانے جانوروں کی حالت کا معائنہ کرکے ان کے نگرانوں پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا۔ یا انہیں انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

مرکزی حکومت کے کارخانوں اور مال گوداموں میں جو کام ہتھیاروں' جواہرات' کپڑوں' زردوزی' نقاشی' خطاطی' مصوری وغیرہ سے

متعلق ہوتا تھا اسے بھی بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ نیز تراجم اور ادبی تصانیف سے متعلق جو کام تھا وہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ عہدوں پر نئے تقررات کئے جاتے تھے۔ اسی دربار میں عہدیداروں کو ترقیاں دی جاتی تھیں اور مستحق افراد کو جاگیریں بخشی جاتی تھیں۔ ممتاز اشخاص، سفرا اور غیر ملکی حکمراں پہلے عام دربار میں حاضر ہوتے تھے اگر ضرورت محسوس ہوتی تو بعد میں انہیں مخصوص کمرے میں حاضر ہونے اور گفتگو کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات جنگی قیدی، شکست یافتہ دشمن اور گرفتار باغی بھی اس دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔

غسل خانہ (خلوت خانہ یا پرائیویٹ چیمبر)

دیوان خانہ اور حرم سرا کے درمیان ایک کمرہ تھا۔ اس کمرہ میں گنے چنے قابل اعتماد اشخاص کو ملاقات کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں دیوان اور بخشی بھی امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے وہیں طلب کئے جانے لگے۔ بعض امرائے دربار کو بھی حاضری اور رکنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح امور مملکت وہیں انجام دیئے جانے لگے۔ اور غسل خانہ سے یہ کمرہ متصل تھا اس وجہ سے اس کمرے کو "غسل خانہ" کہا جانے لگا۔ شاہجہاں نے اپنے عہد میں اس کمرے کا نام "دولت خانہ خاص" رکھا۔ اس کے زمانے میں یہ کمرہ اسی نام سے مشہور تھا۔

سہ پہر اور شام کا دربار

اس اجلاس میں بھی صبح کی طرح سلطنت کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔ یہ اجلاس صبح کے اجلاس کے مقابلے میں زیادہ محدود نوعیت کا تھا۔ اس میں زیادہ تر وزراء اور اعلیٰ عہدیداران سلطنت ہی شریک ہوتے تھے۔ یہ اجلاس صرف ضابطے کے معمولی کاموں کے لئے ہوتا تھا۔

اسی طرح شاہی دربار منعقد کرنے سے انتظام سلطنت پر گہرا اور اچھا اثر پڑتا تھا۔ اور امور سلطنت کی انجام دہی میں کافی آسانیاں ہوتی تھیں اور کھلے دربار منعقد کرنے کے رواج نے بادشاہ اور رعایا کے درمیان مضبوط روابط اور رشتے قائم کردیئے تھے۔

15.4 دیوان (وزیر مال وفینانس)

دیوان۔ وکیل کے بعد دوسرا بڑا عہدیدار دیوان یا وزیر ہوتا تھا جو محکمہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ جس کی ذمہ داری مالی معاملوں کی نگہداشت اور خصوصاً محصولات کی وصولی ہوتی تھی۔ اس کا انتخاب حیثیت یا درجہ کا لحاظ کئے بغیر ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں اور بادشاہ سے وفاداری کی بناء پر عمل میں آتا تھا۔

15.4.1 دیوان کا محکمہ اور اس کے دفتر کا کام

محکمہ دیوان، دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا۔

1- دیوان خالصہ۔ (خالصہ اراضی کے لئے)

2- دیوان تان (تنخواہوں کے لئے)

3- مشرف۔ (محاسب خاص)

4- مستوفی (حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا)

ان میں سے ہر عہدیدار کے ماتحت ایک ذاتی مددگار یا سیکریٹری ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دفتر کے متعدد محافظ اور اہل کاروں پر مشتمل ایک بڑا عملہ ہوتا تھا۔ یہ تمام محکمے کے طریقہ کار سے واقف اور اس کے متعلق خاص طور سے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔

دیوان محکمہ مالیات کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ ہر اس عہدیدار پر نظر رکھتا تھا جو جاگیر سے اپنی تنخواہ وصول کرتا تھا۔ محکمہ مال کے اختیارات کے علاوہ صوبوں اور عہدیداران صوبہ پر بھی اختیارات حاصل تھے۔ ان عہدیداروں میں حاکم صوبہ سے لے کر عامل اور پٹواری تک سبھی شامل تھے۔ محکمہ مالیات کا وزیر ہونے کی حیثیت سے شاہی خزانہ میں پہنچنے والی یا اسے باہر جانے والی رقم پر اس کی نظر رہتی تھی۔ اسی طرح صوبہ کے نظم ونسق کے سبھی شعبوں تک اس کی رسائی تھی۔ اس عام نگرانی کی وجہ سے حکومت کے تمام وزراء میں اسے ممتاز ترین حیثیت حاصل تھی۔

15.5 میر بخشی (وزیر فوج)

سلطنت مغلیہ کے میر بخشی کو محکمے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے کئی اہم اختیارات حاصل تھے۔ اور دربار میں اسے بادشاہ کی قربت حاصل ہونے کے بناء پر اس کا وقار بڑا تھا۔ اپنے محکمہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس کا ہر منصبدار سے تعلق تھا۔ اور اسی وجہ سے دربار میں اس کی حاضری اس کے فرائض کا ایک اہم جز تھی۔ وہ دربار میں تخت شاہی کے داہنے جانب کھڑا ہوتا اور اپنے محکمے سے متعلق تمام معاملات بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔ وہ ملازمت کے امیدواروں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ نئے سپاہیوں اور منصبداروں کے گھوڑوں کو داغ ونشانی کے بعد بادشاہ کے سامنے بخشی پیش کیا کرتا تھا۔ ایسے ہی مستقل عہدہ داروں کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ نیز وہ صوبوں سے آنے والے تمام عہدیداراں دارالحکومت سے اپنے صدر مقامات کو جانے والے عہدیداران اور دوسرے ملک سے آئے ہوئے سفرا اور معزز مہمانوں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کا کام انجام دیتا تھا۔ میر بخشی محل کے محافظوں کا اعلیٰ عہدیدار ہونے کی حیثیت سے محافظین کے نام بادشاہ کے سامنے انعامات کے لئے پیش کیا کرتا تھا۔

میر بخشی غسل خانے (خلوت گاہ) میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتا۔ یہاں بھی وہ بادشاہ کے دائیں جانب کھڑا ہوتا۔ اور معمول کے مطابق عہدیداروں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور محکمہ فوج کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے محافظین کی فہرست میر بخشی کے پاس رہتی تھی۔ مختلف صوبہ جات سے وقائع نویسوں کے ارسال کردہ خبرناموں کو وصول کرنے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔ اپنے محکمہ کا سربراہ اور بادشاہ و منصبداروں کے درمیان واسطے کا خاص ذریعہ ہونے کی وجہ سے میر بخشی دوروں اور سیر وشکار میں ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور شاہی خیموں کی نگہداشت اور تمام منصبداروں کا ان کے مرتبے کے لحاظ سے جگہ متعین کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔ اسی کے ذریعہ دورے پر جانے والے عہدیدار اور منصبدار بادشاہ کی خدمت میں شرف حاضری کی اجازت حاصل کرتے تھے۔ نیز فوجوں کے آرام اور آمدورفت وغیرہ کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ میر بخشی یا اس کے رفقائے کار میدان جنگ میں بھی مختلف حیثیتوں سے حاضر رہتے تھے۔

فوج کے ہر شعبے کا ایک علاحدہ بخشی ہوا کرتا تھا۔ اکثر وبیشتر وقائع نویسی کے فرائض وہی انجام دیتا تھا۔ بادشاہ کے یہاں پوری پابندی

سے اطلاعات بھیجی جاتی تھی۔ قرضے کی تقسیم' پیشگی رقم دینا اور میدان جنگ میں تنخواہیں تقسیم کرنا' میدان جنگ میں سرگرم فوجوں کے بخشی کا کام تھا۔ میر بخشی اور اس کے شریک کار خود میدان جنگ میں جاتے اور دوسرے عہدیداروں کی طرح جنگ بھی کرتے تھے۔

میر بخشی کے محکمہ میں درج ذیل کاغذات محفوظ رکھا جاتے تھے۔

1- مرکز اور صوبوں میں متعین منصبداروں کی فہرست

2- منصبداروں کے ذمہ واجب الادا رقوم کا حساب و کتاب

3- تنخواہوں کی ادائیگی کے گوشوارے

4- ایسے ضوابط جن کا تعلق تنخواہوں' جاگیروں اور جاگیروں کے بعد نقد تنخواہوں میں تبدیل کئے جانے سے ہوتا تھا۔

5- وہ فہرستیں جن میں منصبداروں کے درجے' ان کی تنخواہیں اور تنخواہ وصول کرنے کے طریقے درج ہوتے تھے۔

6- ایسے کاغذات جن میں منصبداروں اور سواروں کا حلیہ درج ہوتا تھا۔

7- وہ کاغذات جو گھوڑوں کو داغنے اور ان کے معائنے سے متعلق تھے۔

8- صوبوں اور مختلف فوجوں میں منصبداروں کی حاضری کے کاغذات

9- محافظین محل کی حاضری کے کاغذات

10- فوجوں کی فہرستیں اور دشمنوں سے مقابلے میں ان کی ترتیب

اس طرح سے اختیارات' حیثیت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے میر بخشی کا دائرہ کار وسیع تھا۔ میر بخشی محکمہ فوج کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے منصبداروں کا خاص نمائندہ ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ سے فوج پر اسے کوئی خاص اثر و رسوخ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہ تو سلطنت کے فوجوں کا سپہ سالار ہوتا تھا اور نہ ہی اپنے عہدے کی وجہ سے اسے کسی مہم کی قیادت کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہ کلی طور پر بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ جس طرح چاہے مہم کی نوعیت' فوج کی تربیت اور منتخب کردہ سپہ سالاروں کو دیکھتے ہوئے مناسب انتظامات کرے۔ اکثر مہم پر جانے کے لئے علاحدہ بخشی کا تقرر ہوتا تھا جنہیں عسکر یا بخشی لشکر کہا جاتا تھا۔ اور ان کا انتخاب نہ تو میر بخشی کرتا تھا اور نہ ہی اس کا محکمہ بخشی سے ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ وہ صرف بخشی کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔

15.6 میر ساماں

کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم تھا جس کا سربراہ میر سامان کہلاتا تھا۔ دوسرے عہدیدار حسب ذیل تھے۔

دیوان بیوتات: یہ دوسرا اعلیٰ عہدیدار ہوتا تھا جو خاص طور سے محکمے کے مالی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مشرف کل وجز: (چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا محاسب) یہ محکمے کا محاسب ہوتا تھا۔ محکمے کے ہر شعبے میں اس کا ایک مشرف ہوتا تھا۔

داروغہ: ہر شعبے یا کارخانے میں ایک داروغہ مقرر رہتا تھا۔ جو براہ راست اپنے شعبے کے کاریگروں سے کام لیتا' کاریگروں کے روزمرہ کے کام ان کے درمیان تقسیم کرتا اوران کے پاس روزانہ جو سامان باقی بچ جاتا اسے اپنی تحویل میں لے لیتا تھا۔

تحویلدار: ہر کارخانے میں ایک تحویلدار ہوتا تھا جس کی تحویل میں وہ نقدرقم اور سامان رہتا تھا جس کی اس شعبہ میں ضرورت پڑتی تھی۔

مستوفی: کارخانوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا مستوفی کے حوالے تھا۔

داروغہ کچہری: دفتری عملے کی نگرانی اس عہدیدار کے سپرد تھی۔

ناظر: محکمے کے دیوان کے بعد دوسرا سب سے بڑا عہدیدار یہی ہوتا تھا۔ ناظر کا کام محکمہ دیوان کے کاموں پر نظر ثانی کرکے اس پر مہر لگانا تھا۔

میر سامان کی ذمہ داریاں:

میر سامان محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے انتظامی امور انجام دیا کرتا تھا۔ نیز ہر شعبے کے اندرونی طریقہ کار کا نگران بھی تھا۔ میر سامان داروغہ' مشرف اور تحویلدار کیتقرری و برخواستگی کے تعلق سے ابتدائی کاروائی کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اوران کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔ وہ محکمے کے تمام کام انجام دیتا تھا۔ اور صوبوں سے کارخانے کے نام آنے والی تمام فرمائشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ تمام اہم اموراور تجارتی معاملات کی جانب بادشاہ کی توجہ دلاتا تھا۔

15.7 صدر : (محکمہ عطیات اور امور مذہبی کا سربراہ)

مرکزی حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح صدر کے ماتحت بھی ایک مستقل عملہ ہوتا تھا۔ جو تمام امور صدر کے احکام کے مطابق انجام دیتا تھا۔ محکمے سے مدد معاش سے متعلق جو حکم یا صداقت نامہ جاری ہوتا تھا اس پر صدر کی مہر ضروری ہوتی تھی۔ اراضی عطا کرنے اور نقد بھتے اور وظیفے دینے میں بھی صدر کا اہم رول تھا۔ وہ تخت کے دائیں جانب کھڑا ہوتا تھا۔ شاہجہاں کے دور میں اسے اس بات کا بھی موقعہ فراہم کیا گیا تھا کہ وہ ''غسل خانے'' میں ایسے درخواست گذاروں کو پیش کرے جنہیں وقت کی قلت کی وجہ سے دربار میں نہیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ یا جن کی طرف وہ بادشاہ کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

صدر کی ایک دوسری ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ غریبوں اور مفلسوں کی خبر گیری کرے اور اپنی تحویل میں رکھی ہوئی اس مد کی رقم سے ان کی ضروریات پوری کرے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ خاص خاص مواقع یا قحط کے زمانہ میں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اور ٹھنڈی کے موسم میں پہننے کے لئے گرم کپڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ صوبہ جات میں بھی صدروں کا تقرر ہوتا تھا۔ صوبائی صدر کا تقرر محکمے کی تنظیم کے لئے کیا جاتا تھا۔

15.8 نظام عدلیہ

بادشاہ ایک قاضی القضاۃ یعنی صدر کا تقرر کرتا جسے ایک جج کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔صدر کو ماتحت قاضیوں کی تقرری کا اختیار حاصل تھا۔لیکن ایسے تمام تقررات میں بادشاہ کی منظوری اور مرضی کا شامل ہونا ضروری تھا۔ایک شہر میں ایک سے زائد قاضی اپنے اپنے فرائض کی تصریح کے ساتھ مقرر ہوسکتے تھے۔قاضی کے ساتھ میر عدل کا تقرر بھی عمل میں آتا تھا۔اوراس کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔بادشاہ فوج کے لئے قاضی عسکر بھی مقرر کرتا تھا۔اوراس کے ساتھ بھی میر عدل ہوتا تھا۔صرف مرکز' صوبائی صدر مقامات اور دوسرے بڑے شہروں ہی میں قاضی نہیں ہوتے تھے۔بلکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں' قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔اوزان' پیمائشوں اوراشیائے خوردنی کی جانچ پڑتال' انسداد گداگری' معالجوں کی اسناد کی چھان بین' غلاموں کی حالت کی نگرانی' لوگوں کو جوے بازی اور شراب نوشی سے روکنے اور صوم وصلوٰۃ کا پابند بنانے کے لئے مرکز اورصوبوں میں محتسب کا تقرر عمل میں آتا تھا۔غیر مسلم فریقین کے جو مقدمات وراثت اور شادی بیاہ وغیرہ سے متعلق ہوتے تھے وہ ان کے مذہبی رہنماؤں کے سامنے پیش ہوتے اوران کے قانون کے مطابق طئے پاتے۔سرکاری عدالتوں کے علاوہ قدیم دیہی نظام اور ادارے یعنی پنچایت وغیرہ حسب دستور قائم رہے۔

حصول انصاف کا دوسرا ادارہ بادشاہ کا دربار ہوتا تھا۔بادشاہ روزانہ کھلے دربار میں معمولی مقدمات کی شنوائی کرتا تھا اوراہم معاملات کی سماعت جن میں شہادت اور جرح کرنے کی ضرورت ہوتی تھی' ہفتہ میں ایک متعینہ دن کو کیا کرتا تھا۔بادشاہ اکبر نے جمعرات' جہانگیر نے منگل اور شاہجہاں نے بدھ کا دن اس کام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔خاص طور سے ان دنوں میں بادشاہ مظلوموں کی دادرسی کرتا تھا۔ان بادشاہوں کی عدالتوں میں صداقت وانصاف کا بول بالا تھا۔بادشاہ اپنی فوجی مہموں' تفریحی سفروں اور مختلف صوبوں کے سفر کے دوران بھی مقدمات کی شنوائی کا معمول جاری رکھتا تھا۔وہ دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔اس کی عدالت ابتدائی عدالت کے ساتھ ساتھ عدالت عظمیٰ بھی تھی' جسے اپیل سننے کے اختیارات بھی حاصل تھے۔بادشاہ کے سامنے دیوانی مقدمات کے بہ نسبت فوجداری مقدمات زیادہ پیش ہوتے تھے۔دیوانی مقدمات کے دونوں فریقوں کو براہ راست بادشاہ کے پاس مقدمات پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔یا قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف بادشاہ سے اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔ ایسے ہی فوجداری مقدمات میں بھی ملزم کو اپیل کرنے کا حق تھا۔فوجداری مقدمات کی شنوائی کرنے والے مجسٹریٹوں کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مقدمات کی شنوائی خود کریں یا بادشاہ کے پاس بھیج دیں۔مغلوں کے نظام عدل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے اور حق وانصاف کا بے انتہا لحاظ رکھتے تھے۔کسی کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہیں کرتے اور قانون کی نگاہ میں سب کو برابر سمجھتے تھے۔

15.9 نظام فوج

بادشاہ اکبر نے سلطنت کی منظم فوج تیار کی۔اس کا بانی درحقیقت وہی سمجھا جاتا ہے۔مغلیہ سلطنت ایک طرح کی فوجی مطلق العنان حکومت تھی۔چنانچہ ہر صوبے کا حاکم سپہ سالار کہلاتا تھا۔ہر پرگنے یا ضلع کے ایک حصے کے حاکم کو فوجدار کہتے تھے۔اور عام طور پر تمام عہدیدار اور درباری حتیٰ کہ ان لوگوں کے مراتب جو شہری یا عدالتی عہدوں پر فائز تھے سواروں کے سرداروں کی حیثیت سے متعین ہوتے تھے۔سواروں کی

قیادت کومنصب کہتے تھے۔اور ایسے عہدیدار کومنصب دار کہتے تھے۔جن عہدیداروں کو برائے نام پانچ سو سے دو ہزار پانچ سواروں کا قائد سمجھا جاتا تھا' اسے ''امیر'' کہتے تھے۔وہ لوگ جو اس سے زیادہ تعداد کے قائد نامزد کئے جاتے تھے انہیں امیر کبیر کا خطاب حاصل ہوتا تھا۔ یہ سپہ سالاریاں اعزازی ہی ہوتی تھیں۔جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ منصب دار کی حیثیت اور مرتبہ معلوم ہو سکے۔اور ان کے منصب کو''منصب ذاتی'' شمار کیا جاتا تھا۔ان لوگوں میں سے جنہیں واقعی فوجی اختیارات حاصل ہوتے تھے ہر ایک کو اس کے منصب ذاتی کے علاوہ منصب سواری بھی حاصل ہوتا تھا۔جن منصب داروں کا منصب سواری ان کے منصب ذاتی کے برابر تھا۔ان کو اول درجہ کا منصب دار مانا جاتا تھا۔جن منصبداروں کا سوار منصب ان کے منصب ذاتی کے نصف یا اس سے زیادہ ہوتا تھا ان کو دوئم درجہ کا منصب دار مانا جاتا تھا۔جن کا سوار منصب ان کے منصب ذاتی کے نصف سے کم ہوتا تھا وہ تیسرے درجے کے منصبدار کی فہرست میں آتے تھے۔ ہر منصب دار کو اپنے منصب کے مطابق گھوڑے' ہاتھی' اونٹ وغیرہ رکھنے ہوتے تھے۔جنگ کے وقت میدان جنگ میں منصب دار اپنے سواروں اور جانوروں کے ساتھ جاتے تھے بہت کم منصب داروں کو نقد تنخواہ دی جاتی تھی جن کی نقدی منصب دار کہا جاتا تھا۔لیکن عموماً منصب داروں کو ان کی تنخواہ کے برابر آمدنی والی جاگیر عطا کی جاتی تھیں۔

مغلیہ دور میں ''داغ ومحلی'' یعنی جانوروں کو داغنے لگانے کا قاعدہ بھی جاری تھا۔جانوروں کے معائنے اور حاضری کے وقت جاگیردار اِدھر اُدھر سے بیگاری اور مانگے ہوئے گھوڑے اور ہتھیار لے کر حاضر ہو جاتے۔ظاہر ہے ایسی فوج میدان جنگ میں دشمن کے سامنے کہاں تک ٹھہر سکتی تھی۔اس کی اصلاح کے لئے بادشاہ اکبر نے فوجیوں کو حتی الامکان خزانے سے نقد تنخواہ دینا شروع کی۔ ہر سپاہی کا حلیہ فوج کے کاغذات میں درج کرایا اور داغ ومحلی کے قواعد جاری کئے جن کے ماتحت آدمیوں اور گھوڑوں کے صحیح اعداد وشمار محفوظ رکھے جانے لگے۔اور گھوڑوں کو یہ جانچنے کے بعد کہ وہ جنگی استعمال کے لائق ہیں داغ دیا جاتا۔اور اجتماعی پریڈوں کے مواقع پر صرف انہیں لوگوں کو تنخواہ دی جاتی تھی جو داغ شدہ گھوڑے لاتے تھے۔

شہزادوں اور منصب داروں کے فوجی دستوں کے علاوہ بادشاہ کی ذاتی فوجیں بھی ہوتی تھیں۔اس کا ذاتی حفاظتی عملہ ایک فوج پر مشتمل ہوتا تھا جسے ''والاشاہی'' کہتے تھے۔اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جو اس کی شہزادگی کے زمانے میں اس کی ملازمت میں تھے۔اس کے علاوہ ایک اور بڑا گروہ ایسے سواروں کا تھا جو تنہا کام کرتے تھے یہ ''احدی'' کہلاتے تھے۔ اور کسی فوج میں داخل نہ ہوتے تھے۔ان کی تنخواہ اہلیت پر منحصر تھی جو عام سواروں سے زیادہ ہوتی تھی۔

پیادہ فوج ہر لحاظ سے فوج کا ایک ادنٰی بازو خیال کی جاتی تھی۔اور اس کے سپاہیوں کا شمار دربانوں' پہرا داروں' ہرکاروں' مخبروں' تیغ زنوں' پہلوانوں اور پالکی برداروں کے ضمن میں ہوتا تھا۔لیکن ان میں سے جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں میں بندوقچی' تیرانداز اور نیزہ باز ہوا کرتے تھے۔ان سپاہیوں کے علاوہ بعض اور سپاہی ہوتے تھے۔جنہیں ''داخلی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ان میں سے ایک چوتھائی حصہ بندوقچیوں اور تین چوتھائی حصہ تیراندازوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ وہ سپاہی تھے جنہیں پرگنوں یا تحصیلوں میں فوجداروں کو رکھنے کی اجازت تھی تاکہ وہ انہیں امن وامان قائم کرنے اور مالگذاری وصول کرنے میں مدد کر سکیں۔

توپ خانہ دو طرح کا تھا۔ایک تو بھاری اور دوسرا ہلکا۔ بھاری توپ خانے کا انتظام عموماً عثمانی ترکوں یا پرتگیزی نومسلموں اور بعض

اوقات دیگر ملکوں کے افسروں اور کسی حد تک توپچیوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ہلکا توپ خانہ میدانی توپوں' دیواروں پر رکھنے والی توپوں وغیرہ ہلکی قسم کی توپوں پر مشتمل تھا۔ جنہیں چھکڑوں پر لاد کر لے جاتے تھے۔ سارے توپ خانے کا ایک افسر اعلیٰ ہوتا تھا جسے ''میر آتش'' کہتے تھے۔ ایک سو توپچیوں کے افسر کو ''صدی وال'' کہتے تھے اور ''میر دھہ'' یعنی دس کا افسر ہوتا تھا جس کے ماتحت صرف چند یا ایک توپ ہی ہوتی تھی۔ تمام فوجوں کا سپہ سالار اعلیٰ بذات خود بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن فوجی نظام کا مہتمم اعلیٰ ایک افسر بخشی الممالک ہوتا تھا اس کے ماتحت تین بخشی اور کئی محرر ہوتے تھے۔ اس شعبے کی ذمہ داریوں میں بھرتی کرنا' حاضری لینا' منصب داروں اور سواروں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم جاری کرنا شامل تھا۔ اور وہ دیکھتے تھے کہ لوگ جانوروں کو داغ دینے کے ضوابط پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔ بخشی سال میں دومرتبہ اس پوری سوار فوج کا جو دربار میں حاضر ہوتی تھی جائزہ لیتا تھا۔ سب گھوڑوں کا معائنہ کرتا اور یہ دیکھتا کہ ان میں سے کوئی زیادہ عمر کے اور کام کے ناقابل تو نہیں ہو گئے۔ اگر وہ ایسا پاتا تو ان کے مالکوں کو ان گھوڑوں کو علاحدہ کر کے نئے گھوڑے خریدنے کا حکم دیتا تھا۔

15.10 صوبائی نظام

بادشاہ اکبر نے اپنے عہد حکومت میں صوبوں کا ایک موثر نظام قائم کیا۔ 1580ء میں اس نے سلطنت کو 12 صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ 1605ء میں صوبوں کی یہ تعداد بڑھ کر 15 ہو گئی تھی۔ (1) کابل معہ کشمیر (2) لاہور (3) ملتان مع سندھ (4) دہلی (5) اودھ (6) آگرہ (7) اجمیر (8) احمد آباد (9) مالوہ (10) الہ آباد (11) بہار (12) بنگال (13) خاندیش (14) برار (15) احمد نگر۔ شاہجہاں کے عہد حکومت میں صوبوں کی تعداد بڑھ کر 19 ہو گئی تھی اور اورنگ زیب کی وفات تک سلطنت میں کل 21 صوبے تھے۔ ہر صوبے کا سب سے اعلیٰ عہدیدار صوبہ دار ہوتا تھا۔ اسے سپہ سالار اور ناظم بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے فرائض میں صوبے میں امن وامان قائم رکھنا' بغاوت ختم کرنا اور بیرونی دشمنوں سے صوبے کی حفاظت کرنا تھا۔ صوبے کے مالی نظام کے محکمہ کا سربراہ دیوان ہوتا تھا جو مرکزی دیوان کے ماتحت اپنا کام انجام دیتا تھا۔ اور عام طور سے اس کا عہدہ صوبہ دار کے عہدے کے برابر ہوتا تھا۔ ہر صوبہ میں صوبائی بخشی اور صوبائی صدر بھی مقرر ہوتے تھے جو مرکزی میر بخشی اور صدر الصدور کی ماتحتی میں اپنے امور انجام دیتے تھے۔ اور صوبہ کے فوجی اور مذہبی امور کے اعلیٰ عہدیدار ہوتے تھے۔ صوبائی بخشی عموماً صوبہ کی واقعہ نویسی کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ ان عہدہ داروں کا تقرر خود بادشاہ کرتا تھا۔ صوبوں کو سرکاروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ سرکار کا اہم ترین عہدیدار فوجدار ہوتا تھا۔ سرکار میں امن وامان بحال کرنے کا کام اس کے سپرد تھا۔ اس کی مدد کے لئے سرکار کے اہم علاقوں میں کوتوال تعینات کئے جاتے تھے جو محکمہ پولیس کا اعلیٰ عہدیدار ہوتا تھا وہ ایک منصف' پولیس افسر' حاکم اور محتسب کے فرائض انجام دیتا تھا۔ سرکار کے شعبہ مالیات کی ذمہ داری کروڑی اور عامل کے سپرد تھی۔ ہر سرکار کے تحت کئی پرگنے تھے۔ پرگنے یا محال کا اعلیٰ عہدیدار شق دار تھا۔ امین پرگنہ شعبہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ ہر پرگنہ میں فوتہ دار یا خزانچی مقرر ہوتا تھا جو پرگنہ کے خزانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ پرگنوں میں قانون گو بھی مقرر تھے جو پرگنے کے کسانوں کی زمینوں اور پیدا ہونے والی فصلوں کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ہر پرگنہ کے ماتحت کئی گاؤں تھے۔ گاؤں کے اہم اہل کاروں میں پٹواری اور چوکیدار ہوتے تھے۔

15.11 خلاصہ

مغلیہ حکومت کی عظمت واستحکام کا انحصار اس کے بہترین نظام حکومت پر تھا جس کا معمار بادشاہ اکبر تھا یہی نظام معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں قائم رہا۔ مرکزی حکومت کے انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے کئی اہم شعبے قائم تھے ہر شعبہ کا سربراہ ایک اعلیٰ عہدیدار یا وزیر ہوتا تھا۔ حکومت کا سب سے بڑا اور اعلیٰ عہدیدار بادشاہ ہوتا تھا۔ وہ مطلق العنان تھا۔ بادشاہ امور حکومت کو انجام دینے اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے کئی عہدیداروں سے مدد لیتا تھا۔ ان میں ایک اہم وکیل یا وزیر اعظم ہوتا تھا۔ لیکن یہ غیر مستقل عہدہ تھا۔ حکومت کے فرائض واختیارات چار وزیروں میں تقسیم تھے۔ (1) دیوان (وزیر مالیات) (2) میر بخشی (وزیر فوج) (3) میر سامان (وزیر کارخانہ جات اور اسٹور) (4) صدر (وزیر عدالت اور امور مذہبی) اس طرح یہ چار بڑے وزراء تھے۔

بادشاہ اکبر نے اپنے دور حکومت میں جھروکہ درشن کی رسم کو رائج کیا۔ طلوع آفتاب کے بعد خاص وعام ہر طبقہ کے لوگ بادشاہ کے درشن کے لئے جمع ہوتے۔ بادشاہ جھروکے میں آتا اور لوگ درشن کرتے تھے۔ پھر دربار عام منعقد ہوتا اور لوگ اپنے معروضات بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس طرح سے روزانہ امور حکومت کو انجام دینے کے لئے تین مرتبہ شاہی دربار لگتا تھا۔ جس کا انتظام سلطنت پر گہرا اور اچھا اثر پڑتا تھا۔ غسل خانہ (خلوت خانہ) میں مخصوص اور چند قابل اعتماد افراد کو ہی ملاقات کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں بعض امرائے دربار کو بھی حاضری کی اجازت مل گئی۔ اس طرح سے امور مملکت وہیں انجام دیئے جانے لگے۔ حکومتی معاملات کو انجام دینے کے لئے سہ پہر اور شام کو بھی دربار منعقد ہوتا تھا۔

مغلیہ حکومت کا ایک بڑا عہدیدار دیوان تھا جو محکمہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ محکمہ دیوان' دیوان اعلیٰ کے علاوہ دیوان خالصہ (خالصہ اراضی کے لئے) دیوان تان (تنخواہوں کے لئے) مشرف (محاسب خاص) اور مستوفی (حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا) جیسے اہم عہدیداران پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسی طرح میر بخشی (وزیر فوج) بھی ایک اہم عہدیدار تھا۔ یہ فوج کی تنخواہ' جانوروں کو داغنے اور فوجوں کے بھرتی اور حاضری وغیرہ کے متعلق امور انجام دیتا تھا۔ کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ تھا جس کا سربراہ میر ساماں کہلاتا تھا۔ صدر بھی ایک اہم عہدہ دار تھا جو محکمہ عطیات اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا تھا۔ صوبوں میں بھی صدر مقرر ہوتے تھے۔ جو اپنے محکمہ سے متعلق فرائض انجام دیتے تھے۔ حصول انصاف کے لئے عدلیہ کا بہترین نظام قائم تھا۔ عدالتوں کے علاوہ شکایتوں کے ازالہ اور انصاف وحق کے حصول کے لئے بادشاہ کا دربار بھی تھا جس میں خاص وعام اپنے مقدمات براہ راست پیش کرسکتے تھے۔ ہر صوبہ کا اعلیٰ عہدہ دار صوبہ دار ہوتا تھا۔ اسے سپہ سالار اور ناظم بھی کہا جاتا تھا۔ صوبوں میں بھی مرکز کے طرز پر محکمے قائم تھے جو مرکزی محکموں کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

15.12 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

-1 مغلیہ حکومت میں بادشاہ کی حیثیت اور کارمملکت پر روشنی ڈالئے۔

2- مغلیہ حکومت میں میر سامان کی حیثیت اوراس کی ذمہ داریاں کیا تھیں واضح کیجئے۔

3- مغلیہ حکومت کے نظام عدلیہ کو بیان کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1- مغلیہ حکومت کے فوجی نظام پر روشنی ڈالئے۔

2- میر بخشی سے متعلق اپنی معلومات قلمبند کیجئے۔

3- مغلیہ حکومت کا صوبائی نظام کیا تھا؟ تفصیل کے ساتھ واضح کیجئے۔

15.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1- سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت۔ابن حسن۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

2- اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء۔محمد اطہر علی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

3- آئین اکبری۔ابوالفضل

4- اکبرنامہ۔ابوالفضل

5- مغلیہ حکومت کا عروج وزوال۔آر۔پی۔ترپاٹھی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اکائی 16 : نظامِ عدل اور سماجی و مذہبی حالات

اکائی کے اجزاء

16.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مغل دور کے نظام عدل سے روشناس کرانا ہے تاکہ انھیں اس بات کی مکمل آگہی ہو سکے کہ مغل عہد کا عدالتی نظام کن اصولوں پر مبنی تھا؟ مغل عہد میں کون کون سے عدالتی عہدے دار ہوا کرتے تھے اور اس عہد کی عدالتوں کے ذریعے عوام الناس کو انصاف کس حد تک مل پاتا تھا؟ ملک کے انتظامی امور میں عدالتوں کا قیام کن کن سطحوں پر تھا اور یہ عوام الناس کے لیے کس حد تک سودمند ثابت ہو رہے تھے؟

اس اکائی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو مغل دور کے سماجی ڈھانچے کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی جائیں تاکہ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ ہو سکیں کہ مغل سماج کی کیا حالت تھی؟ عوام الناس کن کن خانوں میں تقسیم تھے اور ان کی سماجی و معاشرتی زندگی کس طرح گزر رہی تھی۔ ساتھ ہی اس اکائی کا مقصد یہ بھی کہ طلبہ کو مغل دور کی مذہبی حالت کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کرائی جائے اور انھیں اس بات کا علم ہو سکے کہ ہندوستان میں مغل عہد حکومت میں کون کون سے مذاہب پائے جاتے تھے اور ان کی صورت حال کیا تھی؟ ان مذاہب میں آپسی تال میل کس حد تک تھا؟ کون کون سی مذہبی تحریکیں رونما ہوئیں اور انھوں نے مغل سماج پر کیا اثرات مرتب کیے؟

16.2 تمہید

عدلیہ کسی بھی ملک یا علاقے کے انتظامی ڈھانچے کی بہت ہی اہم کڑی ہوتی ہے کیوں کہ سماجی اور معاشرتی انصاف کا دار و مدار اسی نظام پر ہوتا ہے۔ اگر عدالتی نظام چست اور درست نہیں ہوگا تو پورا سماجی و معاشرتی ڈھانچہ بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور عوام الناس کو انصاف نہ ملنے کی صورت میں معاشرتی افراتفری اور بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ عدالتی نظام کی اسی اہمیت کے پیش نظر انسانی تاریخ کے تمام

ادوار میں نہ صرف اس کے قیام واستحکام بلکہ اسے فعال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں مغل عہد اس اعتبار سے ممتاز دور شمار کیا جاتا ہے کہ اس عہد میں نہ صرف عدالتی نظام کو مستحکم بنایا گیا تھا بلکہ اس کی تنظیم اس طرح سے کی گئی تھی کہ ہر حالت میں عوام الناس کو انصاف مل سکے۔

مغل عہد حکومت کی سماجی و مذہبی حالت سابقہ روایت پر ہی مبنی رہی۔ سماجی اعتبار سے عوام الناس مختلف بنیادوں پر طبقات میں منقسم تھے۔ ان کی پہچان عمومی طور پر حرفے اور پیشے کے ذریعے ہوتی تھی۔ مذہبی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ کا مغل دور بہت اہم شمار کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس عہد میں نہ صرف بڑے پیمانے پر مذہبی تکثیریت کو فروغ حاصل ہوا بلکہ تمام مذاہب ایک دوسرے کے قریب آئے اور لوگوں میں مذاہب کے مطالعے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر علمی وادبی سرمایہ اکٹھا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مذاہب کے آپسی میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل دور کے ہندوستان میں مختلف طرح کی مذہبی تحریکوں کو ابھرنے اور فروغ پانے کا موقع ملا اور ان تحریکوں نے مغل عہد کی سماجی زندگی پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔

16.3 نظام عدل

ہندوستانی عدالتی نظام کی تاریخ میں مغل دور حکومت کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ مغلوں نے اپنے عہد کے عدالتی نظام میں نئی تبدیلیوں کو روشناس کر کے ہندوستانی عدالتی نظام پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مورخین کے مطابق موجودہ عہد کے ہندوستانی عدالتی نظام پر مغل عدالتی نظام کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ دوسرے انتظامی ڈھانچوں کی طرح مغل عہد کا عدالتی نظام بھی بہت ہی مستحکم اور فعال شمار کیا جاتا ہے، جس کی سب سے اہم خصوصیت معاملات کا فوری حل تھا۔ مغلوں نے ملک میں امن وسکون کو رواج دینے کے لیے انصاف کے قیام پر خاص زور دیا جس کے لیے انھوں نے نچلی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک عدالتی نظام کا ایک جال بچھا دیا تا کہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی طرح کی کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

مغل ہندوستان کے ایک اہم مورخ ابن حسن کے مطابق مسلم حکومت کا تقاضہ تھا کہ حکمراں قرآنی قوانین کے مطابق حکومت کرے اور اپنی سلطنت میں شریعت کا نفاذ کرے۔ ابن حسن کے بقول مغل دور حکومت میں عوام الناس کو مسلم اور غیر مسلم کے خانوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور بادشاہ کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ نہ صرف اس بات کو ممکن بنائے کہ مسلم عوام ایک حقیقی مسلم کی زندگی گزاریں بلکہ ان کی نگرانی بھی کرے اور ذمی کی حیثیت سے غیر مسلم رعایا کے تمام حقوق کی ذمے داری پوری کرے۔ ان کے جان و مال، عزت وآبرو اور مذہب سبھی کی حفاظت کرے۔ اس طرح مسلم نظام حکومت کا پہلا عنصر یہ ہے کہ حکمراں تمام ملکی ذمے داریوں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے وقار کو بھی بچائے رکھے اور اسلامی شریعت کے مطابق حکومت چلائے۔ مسلم نظام حکومت کا دوسرے بنیادی عنصر تمام رعایا کو چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم جان و مال، عزت وآبرو، امن وچین اور خوش حالی وانصاف کی ضمانت دینا ہے۔ مسلم فقہاء کا اس بات پر اصرار ہے اور خاص طور سے انصاف کے معاملے میں وہ قانون کے مطابق مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یکساں نظر سے دیکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انصاف اور احسان وکرم فرمائی تمام رعایا کے لیے یکساں ہونی چاہیے۔ حکمراں زمین پر خدائی سایہ ہوتا ہے اور خدائی احسان وکرم مسلم وغیر مسلم سب کے لیے مساوی ہوتا ہے۔

اس لیے ایک حکمراں کو چاہیے کہ وہ کمزور و ناتواں پر اٹھنے والے ظالم کے ہاتھ کو روک دے کیوں کہ قول نبوی ہے کہ ''انصاف کے لیے مظلوم کی پکار خدا کے یہاں سے واپس نہیں کی جاتی چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔''

16.3.1 عدلیہ اور اس کی تنظیم

مغل عہد حکومت میں عدالتی تنظیم کا ڈھانچہ تقریباً وہی رہا جو اس سے پہلے شمالی ہندوستان میں دہلی سلطنت کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا۔ زیادہ تر ادارے بھی وہی رہے، جن کا قیام عہد سلطنت میں ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اس عہد کے عدالتی نظام کا اصل مصدر سلطان تھا۔ حکومت کا سربراہ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وہ عدالتی نظام کا بھی سربراہ اعلیٰ تھا اور کسی بھی طرح کی حکومتی غلطی کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ مغل دور کے عدالتی نظام کا دوسرا اہم مرکز قاضی تھا۔ اس عہد کے عدالتی نظام میں قاضی کا کردار بہت اہم تھا۔ وہ مقدمات کی سماعت کرتا اور فیصلے سناتا۔ مغل دور حکومت کے عدالتی نظام میں عدلیہ کے عہدے داران اور ذمے داران بھی تقریباً وہی تھے، جو عہد سلطنت میں تھے، لیکن حکمراں، وقت کے حالات اور نوعیت کے اعتبار سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ خاص طور سے اکبر کے عہد حکومت میں مغل دور کے عدالتی نظام میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عدالتی نظام میں سب سے بڑی تبدیلی جو اس عہد میں کی گئی وہ یہ تھی کہ عہد سلطنت میں صدر الصدور کے اختیارات بہت تھے۔ قاضیوں کی تقرری اور ان کے لیے مدد معاش کے طور پر اراضی کے عطیات دینا صدر کے ہاتھوں میں تھا، لیکن اکبر نے صدر کے اختیارات کو کم کیا۔ عدلیہ پر سے صدر کا کنٹرول ہٹا کر قاضی القضاۃ کے سپرد کیا گیا اور مدد معاش کی اراضی عطا کرنے میں بھی صدر کو 'دیوان' سے مشورے کا پابند بنایا گیا۔

16.3.1.1 بادشاہ: عدالتی تنظیم کا سربراہ اعلیٰ

مغل ہندوستان میں انصاف کی فراہمی کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ تھا۔ گرچہ فقہا کا اس بات پر اختلاف ہے کہ بغیر قاضی کے بادشاہ کو انصاف کے بندوبست کا حق ہے، ساتھ ہی وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک بادشاہ ذاتی طور پر انصاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک قانون کے مطابق انصاف کے بندوبست اور انتظام و انصرام کی بات ہے تو اس کے لیے قانون اور اس سے متعلق علوم کی جانکاری ضروری ہے۔ اس کے لیے بادشاہ کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے قابل عالم کا اس عہدے کے لیے تقرر کرے۔ مغل عہد حکومت میں بادشاہ اس عہدے کے لیے ایک ایسے شخص کا تقرر کرتا جس سے وہ بذات خود اچھی طرح واقف ہوتا اور بادشاہ کی نظر میں وہ شخص اس عہدے کے لیے سب سے مناسب امیدوار ہوتا۔ اگر بادشاہ اس شخص سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوتا تو اہل علم کے ایک مخصوص گروہ کے ذریعے اس کی علمی صلاحیتوں کا امتحان لیا جاتا اور اس کے پڑوسی اس کے اخلاق و کردار کی گواہی دیتے۔ جس طرح سے بادشاہ کو قاضی کی تعیناتی کا حق تھا، اسی طرح اسے یہ حق بھی تھا کہ وہ اسے عہدے سے معزول کردے۔

اسی طرح سے بادشاہ فوج کے لیے ایک الگ قاضی کا تقرر کرتا، جسے 'قاضی عساکر' کا نام دیا جاتا۔ اسی طرح سے بادشاہ کو یہ حق بھی تھا کہ وہ ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضیوں کا تقرر کرے لیکن ایسے موقعوں پر ان کے کام اور علاقوں کی توضیح و تشریح ضروری تھی۔ بادشاہ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ اس کے پاس قانون کی تھوڑی بہت جانکاری ضرور ہونی چاہیے۔ کیوں کہ شخصی بادشاہت ہونے کی وجہ سے اس کا ایک جملہ کسی

ایک شخص یا گروہ کو انصاف دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جان لے بھی سکتا تھا اور زندگی عطا بھی کرسکتا تھا۔ اس کا فیصلہ حکومت کے لیے بہ یک وقت سودمند اور نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ اس کے فیصلوں کے تجزیے اور بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے کسی بھی طرح کے فرامین جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا۔

16.3.1.2 قاضی/قاضی القضاۃ

مغل عہد حکومت کی عدالتی تنظیم میں انصاف کے بندوبست کا دوسرا اہم مصدر 'قاضی' تھا۔ مغل دور کے عدالتی نظام میں قاضی کا تقرر بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتا۔ وہ عدالت میں مقدمات کی سماعت کرتا اور ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں بھی سنتا تھا۔ مغل عہد حکومت میں قاضی کی تقرری کے لیے درج ذیل شرائط ضروری تھیں۔

1۔ بالغ مرد ہونا: حنفی قانون کے مطابق قاضی کے عہدے پر ایک عورت کا تقرر بھی ہوسکتا تھا لیکن مغل حکمرانوں نے عورت قاضیوں کا دائرہ کار صرف حرم تک محدود کر دیا تھا۔

2۔ آزاد ہونا قاضی کے لیے دوسری شرط تھی۔ قاضی کے عہدے پر غلام کا تقرر نہیں ہوسکتا تھا۔

3۔ عاقل اور ذی شعور ہونا، تاکہ بغیر کسی تفریق کے انصاف کرسکے۔

4۔ مسلمان ہونا: قاضی کے عہدے پر غیر مسلم کی تعیناتی نہیں ہوسکتی تھی۔ قاضی کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ایک اچھا مسلم دانشور ہو، شریعت کے مطابق زندگی گزارتا ہو اور اس کے اوپر کسی قسم کا کوئی اتہام نہ ہو۔ قرآن وسنت اور اسلامی قوانین کی اچھی سمجھ بوجھ رکھتا ہو۔

5۔ ایمان دار ہونا: قاضی ہونے کے لیے ضروری تھا کہ عوام الناس اس شخص کی ایمان داری کی گواہی دیں۔ اسی طرح سے ایک قاضی کے لیے اعلیٰ اخلاق وکردار کا حامل ہونا بھی ضروری تھا۔

6۔ اچھی سماعت اور بصارت کا ہونا: کیوں کہ کسی بھی قاضی کا فیصلہ اس وقت تک صحیح نہیں شمار کیا جاسکتا تھا، جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ اس نے معاملے کو پوری طرح سے سمجھ بوجھ کر اور غور وفکر کے بعد فیصلہ سنایا ہے۔

مغل عہد حکومت میں قاضی کے اختیارات اور اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع تھا، ساتھ ہی اس کی ذمے داریاں بھی بہت تھیں۔ قاضی کے عدالتی فیصلوں پر عمل آوری ضروری تھی۔ اصولی طور پر قاضی کے عدالتی اختیارات میں مداخلت کا حق بادشاہ کو بھی نہیں تھا۔ اگر قاضی کے ذریعے قانون کے مطابق کسی مقدمے کا فیصلہ سنایا جاچکا ہے اور بادشاہ دوبارہ اس مقدمے کو کھولنے کا حکم جاری کرے تو بادشاہ کا یہ حکم غیر قانونی شمار کیا جاتا۔ اپنی تقرری کے بعد ایک قاضی اپنے امین کے ذریعے تمام سابقہ دستاویزات پر قبضہ پاتا تھا، ساتھ ہی وہ سابق قاضی کے عہد سے متعلق جائیداد، یتیموں، شادی بیاہ اور وراثت کی تمام فائلوں کی دوبارہ دیکھ ریکھ کرسکتا تھا۔ وہ مقدمات کی دوبارہ تحقیق کرسکتا تھا اور قانون کے مطابق فیصلے کا حق رکھتا تھا۔ قاضی اپنی عدالت مسجد میں یا اپنے گھر میں لگا سکتا تھا۔ بے جا تعلقات سے بچنے کے لیے وہ تحفے تحائف نہیں قبول کرتے تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ ایک قاضی کے دفتر کے درج ذیل کام شمار کیے جاسکتے ہیں:

(1) مقدمات کی تحقیقات کرنا اور فیصلے سنانا (2) عدالتی فیصلوں کی تنفیذ (3) ان لوگوں کی جائیداد کے لیے نگراں متعین کرنا جو خود اس کی نگرانی نہیں کر سکتے، جیسے کہ نابالغ اور مجنون وغیرہ (4) اوقاف کا انتظام وانصرام اور ان کی نگرانی (5) وصیت ناموں کی تنفیذ (6) مطلقہ کی دوبارہ شادی کے اخراجات: تنفیذ م (7) مذہبی قوانین کے ذریعہ متعینہ سزاؤں کی تنفیذ (8) گلیوں، سڑکوں اور عمارتوں کی نگرانی کہ کوئی آدمی گلیوں اور سڑکوں پر غیر منظور شدہ عمارتوں کے ذریعہ قبضہ نہ کرے۔ (9) قانون اور عدالتی عہدے داروں کی نگرانی، جن کے عزل ونصب کا اختیار اسے حاصل ہے۔ (10) ان جگہوں پر صدقہ وصول کرنے والوں کی تعیناتی جہاں اس کی ضرورت ہو۔

16.3.1.3 قاضی عسکر

مغل دور حکومت میں فوج کے لیے ایک علیحدہ قاضی متعین کیا جاتا تھا، جسے قاضی عسکری کہا جاتا۔ وہ فوج کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا اور اس کا دائرہ کار بھی متعینہ حدود تک محدود ہوتا۔ اس مقدمے میں جس کا ایک فریق فوج سے متعلق ہوتا اور دوسرا عوام میں سے، ساتھ ہی دوسرا فریق یہ چاہتا کہ اس کا مقدمہ شہری قاضی کی عدالت میں چلے تو ایسے معاملات میں مقدمہ سننے کا خصوصی حق ہونے کے باوجود بھی قاضی عسکر مداخلت نہیں کرتا۔ اسی طرح سے اگر دونوں فریق فوج سے متعلق ہوتے اور وہ قاضی عسکر کے دائرہ کار میں آنے کے باوجود بھی یہ چاہتے کہ ان کا مقدمہ شہر کے قاضی کے ذریعہ فیصل کیا جائے تو وہ ایسا کر سکتے تھے اور شہر کا قاضی ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

16.3.1.4 مفتی

مغل عہد حکومت کے عدالتی نظام میں مفتی کا عہدہ بھی کافی اہم شمار کیا جاتا تھا۔ مذہبی علوم کے ماہرین خاص طور پر علم فقہ اور مذہبی قانون میں دست رس رکھنے والے اشخاص مفتی شمار کیے جاتے تھے۔ عدالتوں میں جہاں پر قانون مکمل طور پر واضح نہیں ہوتا تھا وہاں پر مذہبی اعتبار سے ایسے مقدمات ومعاملات کو فیصل کرنے کے لیے اس طرح کے مذہبی قانون کے ماہرین کی مدد لی جاتی تھی۔ بشیر احمد کے مطابق مغل عدالتوں میں مفتی شاہی سند کے ساتھ تقرر پاتے تھے اور کبھی کبھی پرگنہ کے مفتیوں کو محتسب کے عہدے کا اضافی چارج بھی دیا جاتا تھا۔ وہ ایک شارح قانون کی حیثیت مین عدالتوں سے منسلک ہوتے تھے، انھیں فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا۔ مفتی کا کام قاضیوں کے سامنے مقدمے سے متعلق مثالوں اور نمونوں کو پیش کرنا تھا اور قاضی کو اس بات کا اختیار تھا کہ وہ فیصلہ سنائے۔ لیکن کسی بھی مسئلے پر قانون اور شریعت کے مطابق دیے گئے مفتی کے مشوروں کو قاضی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور رایوں کے اختلاف کے نتیجے میں اعلیٰ عدالتوں کی رائے ضروری شمار کی جاتی تھی۔

16.3.1.5 میر عدل

عمومی طور پر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عدالتی نظام کا وہ ڈھانچہ جو عہد خلافت میں تیار ہوا تھا، عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دور سلطنت میں رائج کیا گیا اور مغل عہد میں بھی اسی کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن اس عدالتی نظام کے مطالعے کے بعد چند قسم کے عہدے جو ہمیں عہد خلافت میں نہیں ملتے، ان میں سے ایک عہدہ میر عدل کا بھی ہے۔ عدالتی نظام میں یہ عہدہ، سب سے پہلے سکندر لودھی کے عہد حکومت میں متعارف ہوا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں بھی قاضی کے ساتھ ساتھ میر عدل کا عہدہ برقرار رہا۔ ابوالفضل کے مطابق مغل دور حکومت میں دو عہدے دار مقرر کیے جاتے تھے۔ تحقیقات کرنے والے عہدے دار کو قاضی جبکہ نتائج اکٹھا کرنے والے کو میر عدل کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بنی پرساد کے مطابق مغل

عہد حکومت میں ہر قصبہ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں بھی قاضی اور میر عدل کی تعیناتی ہوتی تھی اور یہ دونوں مل کر ایک عدالتی بنچ کی تشکیل دیتے تھے اور کبھی کبھی یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے۔ ڈاکٹر بی پی سکسینہ کے بقول شاہ جہاں کے عہد میں قاضی اور میر عدل کے عہدے بالعموم ایک ہی شخص کے پاس ہوتے۔

بشیر احمد کا قول ہے کہ قاضی کی بہ نسبت میر عدل کے پاس عدالتی اختیارات نہیں ہوتے تھے۔ عدالت میں اس کا یہ کام مفتی کے مشابہ تھا۔ عدالت میں مفتی کسی مسئلے پر قانون کے مطابق اپنی رائے دیتا اور میر عدل حقائق پر مبنی دستاویز تیار کرتا اور پھر قاضی کے ذریعہ مقدمے کا فیصلہ سنایا جاتا۔ حقیقت میں میر عدل عدالت کا سب سے اعلیٰ کلرک تھا۔ میر عدل کی یہ پوزیشن اورنگ زیب کے عہد میں بھی برقرار رہی اور اس عہد میں بھی اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ میر عدل کو الگ سے عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ اسی طرح سے اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ میر عدل کا عہدہ تمام ریاستوں میں نہیں تھا، جس کی واضح مثالیں گجرات اور بنگال کی عدالتیں ہیں۔

16.3.1.6 محتسب

مسلم تاریخ کے انتظامی امور میں محتسب کا عہدہ دور اول یعنی عہد خلافت سے ہی ملتا ہے۔ ابتدائی عہد میں محتسب کی ذمے داری عوام الناس کے اخلاق و کردار کی نگرانی کے ساتھ ساتھ تجارتی بد دیانتی کی روک تھام تھی۔ ساتھ ہی اس طرح کے مجرموں کی شناخت کے ساتھ انھیں سزا دلوانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ محتسب کا عہدہ دھیرے دھیرے مسلم حکومتوں کے نظم و نسق کا ایک اہم جزء بن گیا اور مسلم تاریخ کے ہر دور، حکومت اور علاقے میں یہ عہدہ برقرار رہا۔

محتسب کی ذمے داریوں میں بہت سی باتیں شامل تھیں، جن میں مضر رساں چیزوں پر روک، عوامی راستوں اور سڑکوں پر سے ناجائز قبضوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا، دوسروں کی ملکیت والی زمینوں میں میت کو دفنانے سے روکنا، غلاموں اور جانوروں پر ظالمانہ اور غیر فطری سلوک سے ممانعت، مسجدوں میں نماز کی ادائیگی پر ابھارنا، رمضان کے مہینے میں عوامی مقامات پر کھانے پینے سے روکنا، مطلقہ اور بیوہ عورتوں پر عدت کے ایام کی تنفیذ، غیر شادی شدہ لڑکیوں اور عورتوں کی شادی پر ابھارنا، کسی بھی شخص کو شراب نوشی کی حالت میں پائے جانے پر سزا دینا وغیرہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ بازار کے نگران اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے محتسب اپنے نائبین کے ساتھ روزانہ بازار میں گھومتے۔ اشیا اور ان کی قیمتوں کا معائنہ کرتے، وزن کرنے اور ناپنے والے آلات کی جانچ پڑتال کرتے۔ بہر حال، جہاں تک سزا دینے سے متعلق محتسب کے اختیارات کی بات ہے تو وہ محدود تھیں۔ معاملے میں اگر کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی تو محتسب کو سزا دینے کا اختیار تھا اور اگر کسی معاملے میں جانچ پڑتال اور شہادتوں کی ضرورت پڑتی تو اسے عدالت میں قاضی کے پاس منتقل کر دیا جاتا۔

مذکورہ بالا تمام ذمے داریوں کے ساتھ محتسب کا عہدہ مغل عہد حکومت میں بھی موجود تھا۔ محتسب کا یہ عہدہ مغل عہد حکومت میں دار السلطنت کے ساتھ ساتھ صوبائی مراکز اور ذیلی صوبائی مراکز میں بھی موجود تھا۔ مغل عہد حکومت میں محتسب کو سزا دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں محتسب کی ذمے داریوں میں ارتداد، مذمت دین، خلاف شرع کام کرنے اور شریعت پر عمل نہ کرنے کے معاملات کی نگرانی اور اس کی اطلاع دینا بھی شامل تھا۔ اس طرح سے اس عہد میں یہ عہدہ بہت اہم ہوگیا تھا۔ عمومی طور پر مغل عہد حکومت میں محتسب کو شرعی قانون کا مستغیث شمار کیا جاسکتا ہے، جو حکومت کی طرف سے استغاثہ دائر کرتا تھا۔

16.3.1.7 وکیل شرعی یا وکیل سرکار

مغل دور حکومت کے عدالتی نظام میں فریقین کی طرف سے قاضی کے سامنے عدالت میں مقدمے کو پیش کرنے اور اس پر مباحثے کے لیے وکیلوں کی موجودگی بھی ملتی ہے۔ بہت سے مؤرخین نے اس عہد میں اس پیشے کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بشیر احمد کے مطابق مورلینڈ کا یہ بیان کہ ''بلاشبہ مغل عہد حکومت میں مسلم اور ہندو قوانین کے عالم موجود تھے، لیکن عدالتوں میں فریقین کی طرف سے مقدموں کو پیش کرنے کے لیے وکلا نہیں ہوتے تھے۔'' سچائی پر مبنی نہیں ہے۔ انھوں نے نہ صرف وکیلوں کی موجودگی کے واضح ثبوت فراہم کیے ہیں بلکہ نو ایسے مقدمات کا ذکر بھی کیا ہے، جس میں وکیلوں کی طرف سے مباحثے بھی کیے گئے۔

شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں حکومت کی طرف سے مستقل طور پر وکیل متعین کیے جاتے تھے تا کہ وہ حکومت کے خلاف عوام الناس کا دفاع کریں اور غریب مدعین کو بلا معاوضہ قانونی مشورے دیں۔ حکومت کی طرف سے تمام سرکاروں میں مستقل طور پر وکیلوں کا تقرر ہوتا تھا اور وہ 'وکیل سرکار' یا 'وکیل شرعی' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان وکیلوں کو حکومت کی طرف سے معاوضے کی شکل میں ایک روپیہ روزانہ کے اعتبار سے ادا کیا جاتا، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ وکیل اپنے موکلوں سے کتنی فیس لیتے تھے؟ بہر حال یہ سچائی ہے کہ یہ وکلاء اپنے موکلوں سے کچھ نہ کچھ فیس ضرور لیتے تھے، جس کی شہادت اورنگ زیب کے اس فرمان سے بھی ملتی ہے، جس میں اس نے سرکاری وکیلوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ مفلسوں اور غریبوں کو بلا معاوضہ مشورے دیا کریں۔ وکیلوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ سبھی مقدمات کے لیے عدالت میں اپنا وکالت نامہ داخل کریں اور موکل کو ہمیشہ اس بات کا اختیار تھا کہ وہ مقدمے کے کسی بھی مرحلے میں اپنے وکیل کے وکالت نامے کو کالعدم کر کے اپنا وکیل تبدیل کر سکتا تھا۔ گرچہ وکیل اپنے موکل کی طرف سے اعتراف نامے کی شکل میں مچلکہ داخل کر سکتا تھا، لیکن اس طرح کا اعتراف نامہ قابل قبول نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کے موکل کے لیے یہ لازمی تھا۔

16.3.2 عدلیہ کی قسمیں

مغل عہد حکومت میں عدالتوں کا قیام اور ان کی تنظیم سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کے مطابق تھی۔ اس عہد کا انتظامی ڈھانچہ گاؤں، پرگنہ، سرکار، صوبہ اور دارالسلطنت کے خانوں میں منقسم تھا۔ مغل عہد حکومت میں ان تمام سطحوں پر عدالتیں قائم تھیں، جہاں پر عوام الناس کے لیے انصاف کے حصول کا بندوبست تھا۔ مغل دور حکومت کے انتظامی ڈھانچے میں تکنیکی طور پر گاؤں کو سب سے چھوٹی اکائی کا درجہ حاصل تھا۔ گاؤں کی سطح پر حکومت کی طرف سے کسی قسم کا عدالتی بندوبست نہیں تھا، بلکہ گاؤں کی قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پنچایتی نظام کو جاری رکھا گیا تھا۔ دیہی عوام اپنے معمول تنازعات کو انھیں گرام پنچایتوں میں سلجھالیا کرتے تھے اور انھیں اپنے ان معمولی جھگڑوں اور تنازعات کے لیے عدالتوں کا رخ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

16.3.2.1 پرگنہ عدالت

مغل دور حکومت میں ملک کے ہر پرگنہ میں ایک عدالت قائم تھی، جس کا بندوبست اور انتظام وانصرام ایک قاضی کے ذریعے چلایا جاتا اور اسی قاضی کی ذمے داری ہوتی کہ وہ اپنے پرگنہ کے اندر انصاف کا بندوبست کرے۔ اسی طرح سے مغل عدالتی تنظیم میں سب سے نچلی عدالت

پرگنہ کی عدالت تھی۔ پرگنہ قاضی کی تقرری شاہی سند کے ذریعے ہوتی اوراس کی ذمے داری ہوتی کہ اپنے پرگنہ کے اندر آنے والے تمام گاؤں کے لوگوں کو انصاف دلائے۔ مغل عہد کی عدالتی تنظیم میں پرگنہ عدالت کو گرچہ سب سے نچلی عدالت کا مقام حاصل تھا، لیکن ضرورت کے مطابق عہدے داران کی تقرری اور وسائل کی فراہمی اس کے عدالتی وقار کو قائم کرنے کے لیے کافی تھی اوراس نچلی عدالت کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنے فیصلوں کا نفاذ کر سکے۔

ان پرگنہ عدالتوں سے قاضی کے علاوہ مفتی، محتسب اور داروغہ عدالت جیسے افسران منسلک ہوتے۔ کچھ پرگنہ عدالتوں میں مفتی اور محتسب کے عہدے پر ایک ہی شخص کی تقرری ہوتی، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مفتی اور محتسب کے دفاتر آپس میں ضم کردیے گئے ہیں، بلکہ ایک معینہ مدت کے لیے مفتی کو محتسب کا بھی اضافی چارج دے دیا جاتا تھا۔ داروغہ عدالت عمومی طور پر ایک چھوٹا منصب دار ہوتا، جس کی تعیناتی احکامات کی تعمیل کرانے اور امن کی بحالی کے لیے کی جاتی۔ خاص طور پر اس کی ذمے داری یہ ہوتی کہ عدالتی کارروائیوں کے دوران امن وسکون بحال رکھے اور کسی طرح کا تنازع نہ پیدا ہونے دے۔

16.3.2.2 ضلعی (سرکاری) عدالتیں

مغل انتظامی امور میں سرکار صوبوں کی ایک ذیلی تقسیم تھی، جس کے اندر متعدد پرگنے شامل ہوتے تھے۔ سرکاری حکومت کا کام نہ صرف پرگنہ کے کاموں کی نگرانی رکھنا تھا بلکہ ان تمام امور اور مسائل کی بھی دیکھ ریکھ تھی جو پرگنہ کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ انصاف کے بندوبست کے لیے سرکار کے اندر مختلف قسم کی عدالتیں قائم تھیں۔ دیوانی اور فوج داری عدالتیں قاضی سرکار کے ماتحت تھیں، جہاں پر نہ صرف دیوانی، فوجداری اور شرعی امور سے متعلق مقدمات سنے جاتے تھے بلکہ پرگنہ عدالتوں کی اپیلیں بھی درج کی جاتی تھیں۔ سرکار کا صدر اعلیٰ بھی، جو عام طور پر فوجدار ہوا کرتا تھا، عدالتی کارروائی انجام دینے کے اختیارات رکھتا تھا۔ وہ اپنی عدالت میں شورش و ہنگامہ اور امن وسلامتی سے متعلق مقدمات کی سنوائی کرتا اور فیصلے سناتا۔ سرکار اور مختلف قصبوں میں قانونی خلاف ورزی اور انحراف سے متعلق چھوٹے مقدمات کوتوال کے ذریعے فیصل کیے جاتے، جو چیزیں آج کل میونسپل قوانین کے تحت آتی ہیں۔ سرکار کے عامل کی بھی اپنی عدالت ہوتی تھی، جہاں پر مال گزاری سے متعلق مقدمات فیصل کیے جاتے تھے اور پرگنہ عامل کی عدالتون کی اپیلیں سنی جاتی تھیں۔ حقیقی معنوں میں سرکار میں واقع ان سبھی عدالتوں میں قاضی کی عدالت سب سے اہم تھی۔ ڈاکٹر پی سرن کے مطابق ''مغل عہد حکومت میں فوج دار کے پاس کسی بھی طرح کا عدالتی اختیار نہیں تھا۔'' ان کا مزید کہنا ہے کہ ''قاضی اور کوتوال مل کر تمام طرح کے عدالتی مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ مجسٹریٹ، پولیس کے افسر اعلیٰ اور میونسپل افسران تمام عہدوں کو کوتوال کی صورت میں ایک جگہ جمع کردیا گیا تھا۔ ایک مجسٹریٹ کی صورت میں وہ فوج داری سے متعلق سرکار کے تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور پولیس کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے اس کی عمل داری کو صرف سرکار کی دارالحکومت سے متعلق قصوں تک محدود کردیا گیا تھا۔ مقدمات کے بارے میں کوئی واضح تقسیم نہیں تھی کہ کون سے معاملات قاضی کے پاس جائیں گے اور کون سے کوتوال کے پاس؟ لیکن اس عہد کے چند مشہور مقدمات کو دیکھنے سے یہ فرق کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ فوج داری سے متعلق عام معاملات کوتوال کے پاس سنے جاتے تھے اور مذہب سے متعلق فوجداری مقدمات جیسے کہ شادی، طلاق اور وراثت ساتھ ہی تمام طرح کے دیوانی مقدمات قاضی کے یہاں طے پاتے تھے۔''

قاضی سرکار کی عدالت عام طور مراکز میں لگتی تھی۔ قاضی سرکار کی عدالت میں پیشکار، کاتب، امین، ناظر، دفتری مچلکہ نویس اور اردلی

وغیرہ پر مشتمل عملہ ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ قاضی سرکار کی عدالت سے کچھ افسران بھی منسلک ہوتے تھے، جن کا کام قاضی کو صلاح ومشورے دینا تھا۔ ان میں داروغہ عدالت، میر عدل، مفتی، پنڈت، محتسب بلدیہ اور وکیل شرعی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قاضی سرکار اپنے دائرہ کار کی جیلوں کا سرکاری معائنہ کنندہ بھی تھا اور اسے اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کی جیلوں کا معائنہ کر کے قیدیوں کے مقدمات کا جائزہ لے اور زیر سماعت قیدیوں کو ضمانت پر رہا کرے۔ قاضی سرکار کی تقرری کے شاہی فرمان کی سند صدر الصدور کے یہاں سے جاری ہوتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ قاضی سرکار صدر الصدور کے شعبے کا ماتحت ہے بلکہ یہ اس وقت کا ایک طریقہ تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں عدالتی شعبے کو صدر الصدور کے اختیارات سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس طرح سے اب قاضی سرکار حقیقی طور پر قاضی صوبہ کے ماتحت تھا۔

16.3.2.3 صوبائی عدالتیں

صوبہ مغل دور حکومت میں انتظامی تقسیم کا سب سے بڑا حصہ تھا، جس میں متعدد اضلاع (سرکاریں) شامل ہوتے تھے۔ صوبائی سطح پر ہر صوبے کی ذمے داری صوبے دار (گورنر) کی ہوتی تھی، جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہ صرف صوبے کا نظم ونسق چلاتا تھا بلکہ اپنے علاقے کی نگرانی و دیکھ و بھال بھی کرتا تھا۔ انصاف کے نظم و انصرام کے لیے صوبائی سطح پر ہمیں تین طرح کی قانونی عدالتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (1) ناظم صوبہ کی عدالت (2) قاضی صوبہ کی عدالت (3) دیوان صوبہ کی عدالت

ناظم صوبہ کی عدالت

صوبائی گورنر کی ذمے داریوں میں سے ایک اہم ذمے داری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دائرہ کار یعنی صوبے میں انصاف کے قیام کا مکمل نظم و نسق کرے۔ جہاں تک صوبے میں انصاف کے قیام اور انتظام و انصرام کا تعلق ہے تو عام طور سے زیادہ تر صوبے دار اس میں اپنی عزیمت کا ثبوت دیتے تھے، وہ اپنے سستی و کاہلی کے ذریعے عوام کو ایذا میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ مقدمات کے حل کے لیے وہ قسموں اور گواہیوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ بذات خود سچائی کی تحقیق کرتے تھے اور فریقین سے رحم دلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ناظم صوبہ کی عدالت میں نئے مقدمات اور دوسری عدالتوں کی اپیلیں دونوں دائر کی جاسکتی تھیں۔ صوبے میں بادشاہ کا نمائندہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے صوبے میں موجود تمام عدالتوں کی اپیلیں سنتا تھا یہاں تک کہ قاضی صوبہ کی عدالت کی اپیل بھی دائر ہوتی تھی۔ نئے مقدمے میں ناظم صوبہ یک رکنی جج کی حیثیت سے فیصلہ سناتا تھا اور اس کے فیصلے کی اپیل مرکزی عدالت میں کی جاسکتی تھی۔ جب وہ کسی دوسرے عدالت کے فیصلے کی اپیل سنتا تھا تو اس وقت عدالت دورکنی ججوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اس عدالت کا دوسرا ممبر قاضی صوبہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ زمینی مال گزاری کے مقدمات بھی اس کی عدالت میں دائر ہوسکتے تھے جب کہ عمومی طور پر یہ مقدمہ دیوان صوبہ کی عدالت کا تھا۔ ناظم صوبہ کی عدالت کے دو اہم افسر مفتی اور داروغہ عدالت ہوتے تھے جو مقدمے کو حل کرنے میں اس کا تعاون کرتے تھے۔

قاضی صوبہ کی عدالت

صوبے کی سطح پر عدالتی تنظیم کا شعبہ بنیادی طور پر قاضی صوبہ کے ماتحت تھا۔ گرچہ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ قاضی صوبہ کا تقرر قاضی القضاۃ یا شرع جہان کے ذریعے عمل میں آتا تھا۔ لیکن حقیت یہ ہے کہ قاضی صوبہ کی تقرری کا حتمی فیصلہ بذات خود بادشاہ کے ذریعے ہوتا تھا بقیہ

سب صرف سفارشی ادارے کا درجہ رکھتے تھے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اداروں کی حیثیت بہتر امیدوار کے انتخابات کی تھی نہ کہ انھیں تقرر دینے کی۔
قاضی صوبہ کی عدالت میں نئے قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدمے بھی درج ہوتے تھے اور صوبوں میں نچلی عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں سننے کی مرکزی عدالت شمار ہوتی تھی۔ اس کے عدالتی اختیارات صوبائی گورنر کے برابر تھے اور گورنر کی عدالت میں بھی اس کی ایک مستقل سیٹ ہوتی تھی۔ اس کے پاس ضلعی قاضیوں کے فیصلوں کی اپیلیں آتی تھیں اور ان معاملات میں جہاں شاہی یا حکومتی اختیارات پر سوال اٹھتے تھے گورنر بھی قاضی صوبہ سے مشورے لیتا تھا۔ بجا طور پر قاضی صوبہ کی ذمے داری بڑی اہم اور نازک تھی کیوں کہ قانون کی ذرا سی ان دیکھی انصاف کے خاتمے کا نتیجہ ہوسکتی تھی۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں اس کے تعاون کے لیے وہ تمام عدالتی عملہ متعین ہوتا تھا جس کا تذکرہ قاضی سرکار کے ماتحت ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی قاضی صوبہ کی عدالت سے مفتی، محتسب، داروغہ عدالت، میر عدل، پنڈت، سوانح نویس اور وقائع نگار جیسے افسران بھی منسلک ہوتے تھے۔

دیوان صوبہ کی عدالت

صوبائی سطح پر واقع دیوان صوبہ کی عدالت کا کام صرف مال گزاری سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس عدالت میں عامل کے احکامات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں درج کی جاتی تھیں۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں اعلیٰ عدالتوں یعنی مرکزی عدالتوں اور ناظم صوبہ کی عدالت میں داخل کی جاسکتی تھیں۔

16.3.2.4 مرکزی عدالتیں

مغل دور حکومت میں عوام الناس کو انصاف کی فراہمی کے لیے دار السلطنت میں بھی عدالتیں قائم تھیں، جہاں پر پورے ملک سے لوگ انصاف کے حصول کے لیے درخواستیں دے سکتے تھے۔ مغل عہد حکومت میں مرکزی سطح پر تین طرح کی عدالتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ (1) شاہی عدالت (2) عدالت عظمیٰ (3) مرکزی مال گزاری عدالت

شاہی عدالت

مرکز میں واقع شاہی عدالت سلطنت کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ بادشاہ اپنی عدالت میں دیوانی اور فوج داری دونوں طرح کے مقدمات سنتا تھا اور مملکت میں واقع عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف آخری اپیل بھی سنتا تھا۔ جب وہ عدالتی فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سنوائی کرتا تو وہ عدالت میں موجود ججوں کا صدر اعلیٰ ہوتا اور یہ عدالت بادشاہ کے علاوہ قاضی القضاۃ اور اس کی عدالت کے دوسرے قاضیوں پر مشتمل ہوتی۔ بادشاہ جب اپنی عدالت میں کسی نئے مقدمے کی سماعت کر رہا ہوتا تو اس کی مدد کے لیے اس وقت مفتی یا میر عدل موجود ہوتے۔ اس کے سامنے درخواستیں داروغہ عدالت کے ذریعے پیش کی جاتیں، اگر اسے قانونی طور پر کسی صلاح ومشورے کی ضرورت ہوتی تو وہ اسے اس مقصد کے لیے موجود ایک بنچ کے سپرد کر دیتا۔

مغل دور حکومت میں بادشاہ کی عدالت بہت مشہور تھی۔ عوام الناس اس کی عدالت میں اپنے مقدمات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں لے کر آتے۔ بادشاہ کی عدالت کے ساتھ مفتی، میر عدل، محتسب اور داروغہ عدالت وابستہ ہوتے۔ بادشاہ روزانہ کھلے دربار میں معمولی مقدمات

کی سماعت کیا کرتا تھا اور اہم مقدمات کی سماعت اس کی عدالت میں ہفتے میں ایک دن ہوتی تھی۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے اس کے لیے جمعرات، جہاں گیر نے منگل اور شاہ جہاں نے بدھ کا دن متعین کر رکھا تھا۔

عدالت عظمی

اس عدالت کا صدر اعلیٰ قاضی القضاۃ ہوتا جسے مغل سلطنت کا چیف جسٹس کہا جا سکتا ہے۔ عدالتی تنظیم میں اہمیت کے اعتبار سے اس کا درجہ بادشاہ کے بعد تھا۔ وہ قاضی القضاۃ کی حیثیت سے جانشینی کے وقت حکمراں کے حلف کا نظم و انصرام کرتا اور مسجدوں میں جمعہ کا خطبے بادشاہ کے نام کے ساتھ پڑھنے کا حکم جاری کرتا۔ قاضی القضاۃ کی تقرری بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتی۔ اس کی تقرری کے لیے دانشورانہ، علمی اور قانونی صلاحیتوں کے ساتھ اخلاق و کردار پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی۔ اس کا تقرر سیدھے طور پر بھی ہو سکتا تھا اور کبھی کبھی صوبائی قاضیوں کو بھی اس عہدے پر ترقی دے دی جاتی تھی۔ قاضی القضاۃ کے پاس دیوانی اور فوج داری سے متعلق جدید مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا، ساتھ ہی وہ نچلی عدالتوں کی اپیلیں بھی سنتا تھا اور صوبائی عدالتوں کے کاموں کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس کے پاس مستقل طور پر اس کے تعاون کے لیے نائب کی حیثیت ایک یا دو قاضی متعین ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا ذمے داریوں کے علاوہ قاضی القضاۃ کی درج ذیل ذمے داریاں تھیں:

1۔ دار الحکومت میں نماز جمعہ اور عیدین کی امامت کرنا۔

2۔ شاہی گھرانوں اور دوسری اہم تعزیتوں میں شرکت کرنا۔

3۔ شاہی گھرانوں کی نکاح خوانی کرنا۔

4۔ احکام شریعت کی تنفیذ کی نگرانی کرنا۔

اسی طرح سے عوام الناس پر نئے محصول کے نفاذ کے وقت قاضی القضاۃ کا مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ مغل دور حکومت میں دار السلطنت کا علاحدہ قاضی مقرر کیا جاتا تھا، جس کا درجہ قاضی صوبہ کے برابر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی متعینہ مدت کے لیے عہدہ خالی ہونے کی صورت میں قاضی القضاۃ یا دوسرے قاضیوں کی ذمے داری بھی اسی قاضی کے ذریعے ادا کی جاتی تھی۔

مرکزی مال گزاری عدالت

مرکزی مال گزاری عدالت کا صدر دیوان اعلیٰ ہوتا تھا۔ وہ حکومت کی مال گزاری اور تمام طرح کے مالیاتی امور کا نگران اعلیٰ ہوتا۔ وہ مال گزاری سے متعلق جدید معاملات کی سماعت کرتا اور مال گزاری سے متعلق صوبائی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل بھی سنتا۔ ان تمام کے علاوہ حقیقی طور پر اس کے ذریعے سلطنت کی معاشی پالیسیاں طے کی جاتیں۔ عدالتی چارہ جوئی سے متعلق صوبائی سطح سے اپیلیں اس کے پاس بمشکل ہی آتی تھیں اور شاذ و نادر ہی کوئی درخواست حکمراں کے خلاف دائر کی جاتی تھی۔

16.4 سماجی تنظیم

مغل عہد کے ہندوستانی سماج کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس دور کا سماج مختلف طبقات میں منقسم تھا اور اس سماجی تقسیم کی بنیادیں بھی مختلف تھیں۔ مغل دور کی سماجی تقسیم کی پہلی بنیاد مذہب کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ تاریخی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں عوام الناس مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے الگ تھے۔ مختلف مذاہب نے ان کے درمیان معاشرتی طبقات کو جنم دیا تھا۔ اس عہد کی سماجی درجہ بندی کی دوسری بنیاد پیشہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ سماجی تقسیم کی ایک ایسی بنیاد ہے جس کا وجود انسانی تاریخ کے ہر دور اور علاقے میں رہا ہے۔ مغل دور حکومت میں بھی عوام اپنے پیشے کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بنٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح سے رہائش کے اعتبار سے بھی عوام کی سماجی درجہ بندی کی جاتی ہے اور مغل دور میں بھی ہمیں اس طرح کی درجہ بندی کے ثبوت ملتے ہیں۔ مثلاً عوام کو دیہی اور شہری کے خانوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو معاشرتی تقسیم کی اور بھی بہت سی بنیادیں فراہم ہو سکتی ہیں، جن کا وجود ہمیں انسانی تاریخ کے مختلف ادوار سے فراہم ہوتا ہے۔

16.4.1 دیہی آبادی

مغل دور میں دیہی آبادی عام طور پر کاشت کاروں، دست کاروں اور کام گاروں پر مشتمل ہوتی تھی اور یہی تمام لوگ مل کر ایک گاؤں کی تشکیل کرتے تھے۔ مغل ہندوستان میں بھی ملک کی بڑی آبادی گاؤں میں ہی آباد تھی اور یہ تقریباً کل آبادی کا 85 فیصد حصہ تھی۔ مغل ہندوستان کی دیہی آبادی کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس عہد میں گاؤں کی بہت سی مختلف قسمیں تھیں۔ مثال کے طور پر مارواڑ، راجستھان میں ایسے گاؤں تھے جن کو 'بسی' کہا جاتا تھا، جب کہ دوسرے علاقوں میں اسی قسم کے گاؤں کو 'چھپر بند' کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ ایسے گاؤں تھے، جہاں کاشت کاروں کو سرداروں نے بسایا تھا، اس لیے انھیں وہاں رہ کر کم وبیش اپنے سرداروں کے بندوبست میں ہی گزر بسر کرنی پڑتی تھی۔ لیکن مغل دور میں ایسے گاؤں کی تعداد زیادہ تھی، جن میں عوام آباد تھے، یعنی ان گاؤں کی آبادی ایسے کاشت کاروں پر مشتمل تھی جو خود ہی کسی جگہ پر آباد ہو گئے تھے۔ حقیقت میں دوسری قسم کے گاؤں میں ہی دیہی آبادی کے نیم آزاد سماج کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے گاؤں ہر جگہ دو طرح کے کاشت کاروں میں بنٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف خود کاشت والے کاشت کار ہوتے تھے، جو ان لوگوں پر مشتمل تھے، جنھوں نے گاؤں کو آباد کیا تھا اور دوسری طرف مختلف جگہوں سے منتقل ہو کر آنے والے کاشت کار تھے، جن کی آراضی کو 'پاہی کاشت' کا نام دیا جاتا تھا۔ ان دوسری قسم کے کاشت کاروں کا گاؤں کے انتظامی امور سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ سولھویں صدی کے دستاویزات میں دیہاتوں کے رہنے والے ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو اپنے آپ کو 'پنچ' یا 'مقدم' کہتے تھے۔ انھیں گاؤں کی غیر مزروعہ زمین کو قیمتاً یا مفت کسی کو بھی دینے کا اختیار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے 'مقدموں' یا 'پنچوں' کو جو اپنے آپ کو پورے گاؤں کا نمائندہ سمجھتے تھے، غیر مزروعہ یا افتادہ زمین پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ گاؤں کے دست کاروں، کام گاروں اور دوسرے نچلے کام کرنے والوں کو آراضی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیے جاتے تھے، جن پر کوئی محصول عائد نہیں ہوتا تھا۔ آراضی کے ان ٹکڑوں کے بدلے میں انھیں پورے گاؤں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خدمت میں زیادہ توجہ ان ہی لوگوں پر رہتی تھی، جو پنچ کے زمرے میں آتے تھے یا پھر ان لوگوں پر جو بعض روایتی ادائیگیاں کرنے کے اہل تھے۔ دستاویزات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ایک گاؤں کے پنچ عموماً ایک ہی قوم یا ذات سے تعلق رکھتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کے درمیان متفرق

فرقوں اور اقوام کے لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ مثلاً بعض گاؤں میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ پنچ کے زمرے میں شامل نظر آتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ کاشت کار اکثر مختلف ذاتوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے تھے، جن کی سماجی حیثیت مختلف ہوتی تھی۔ بعض گاؤں میں تمام کاشت کار ایک ہی ذات سے متعلق ہوتے تھے۔ لیکن چند دوسرے گاؤں میں کاشت کاروں کی ایک سے زیادہ ذات برادریوں کے لوگ آباد تھے۔ عام طور پر دست کاروں اور گاؤں کی ملازمت کرنے والے زیادہ تر لوگ نہایت سختی کے ساتھ ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نوآبادیاتی عہد سے پہلے اچھوت برادریاں دیہی کام گاروں کی اکثریت کی نمائندگی کرتی تھیں۔ کیرالا میں اس زمرے کے کام گار زرعی غلاموں کی حیثیت میں پائے جاتے تھے۔ بہار کے بعض حصوں میں بھی زرعی غلامی پائی جاتی تھی اور اس طرح کی صورت حال آسام کے آہوم رجواڑوں میں بھی تھی۔

انفرادی کاشت اور بازار کے لیے اشیا پیدا کرنے کے رجحان کی وجہ سے دیہی سماج میں معاشی تفریق کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں کی غیر مزروعہ اور افتادہ آراضی پر پنچوں کے کنٹرول اور ان کے ذریعے زرعی ٹیکس جمع کیے جانے کے نتیجے میں معاشی تفریق کا یہ عمل اور تیز ہو گیا۔ بڑے کاشت کار اب وسیع آراضیوں میں اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی مدد سے مختلف فصلیں پیدا کرنے لگے تھے۔ اس طرح یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دیہی آبادی جمہوریت کا نمونہ ہونے کے بجائے چھوٹے اور عام کسانوں، دست کاروں اور کام گاروں کے مزید استحصال کا ایک ذریعہ ہی تھی۔

16.4.2 شہری آبادی

مغل دور حکومت میں حکمراں طبقے کے پاس بڑے پیمانے پر وسائل موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر وہ شہروں میں اپنے ذاتی عملوں اور ملازمین پر صرف کرتے تھے۔ ساتھ ہی وہ دست کاروں کی بنائی ہوئی اشیا بھی خریدتے تھے اور دوسری شہری آسائشیں پیدا کرنے والوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے، جس کے نتیجے میں شہری آبادی میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا۔ مغل دور حکومت میں آگرہ کی آبادی ساڑھے سات لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی اور امکان یہ ہے کہ مغل ہندوستان میں شہری آبادی کل ملکی آبادی کا 15 فیصد کے قریب تھی۔

شہری آبادی میں بڑی تعداد مزدور اور نوکر پیشہ لوگوں کی تھی جو روزانہ یا ماہانہ اجرت پر کام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ گھروں میں کام کرنے والے غلام تھے، جن میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جو زنان خانہ میں کنیزوں یا داشتاؤں کی حیثیت سے رکھی جاتی تھیں۔ عہد سلطنت کی صورت حال کے برخلاف مغل عہد میں غلاموں کی سر عام منڈیوں کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی غلام مزدوروں سے کام لینے کی صورت نظر آتی ہے۔ برنیر کے مطابق دست کاروں کی حالت خستہ تھی اور ان کی اجرت بھی بہت کم تھی، کیوں کہ امرا ان سے بسا اوقات زبردستی کام لیتے تھے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تصویر بھی کسی حد تک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا نتیجہ ہو۔ مثلاً تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ احمد آباد میں زربفت بنانے والے کاری گر ایک بڑی تعداد میں دور دراز کے بازاروں کے لیے مال تیار کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان پر اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے ممکنہ خریداروں کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔

مغل عہد میں شہروں کو تجارتی مراکز بنا کر مختلف علاقوں کے درمیان تجارتی لین دین ہونے لگا تھا اور جن تجارتی ذرائع سے زرعی پیداوار کو شہروں تک لایا جاتا تھا وہ شہری تاجروں کے لیے بھی منافع بخش تھے۔ تجارتی سہولیات فراہم ہونے کی وجہ سے شہروں میں مقیم تجارت

پیشہ لوگوں میں خوش حالی پیدا ہو چکی تھی۔ ساتھ ہی مغل سلطنت میں انتظامیہ کی مرکزیت اور اس کے اثر میں تجارت کے فروغ کی وجہ سے پیشہ وروں اور تاجروں پر مشتمل 'متوسط طبقات' سامنے آچکے تھے۔

مغل سماج کا ایک بڑا حصہ جس میں دیہات اور شہر دونوں جگہوں کے لوگ شامل تھے، سپاہی پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں مختلف علاقوں میں زمین داروں کے خدمت گاروں کی تعداد درج کی ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق زمین داروں کے خدمت گاروں میں 3,85,558 سوار اور 42,77,057 پیادے تھے۔ عملاً یہ سب سپاہی تھے اور دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ چند مورخین کے مطابق یہ چالیس لاکھ سے اوپر پیادے یقیناً ہتھیار بند کسان تھے۔ لیکن سوار جو زمین داروں کی نوکری میں تھے یا وہ سوار جن کو مالی عملہ کے لوگ اپنے کاموں کے لیے استعمال کرتے تھے، شاید دیہات کے نسبتاً خوش حال طبقوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ انھیں مقدموں یا چھوٹے زمینداروں میں سے بھرتی کیا جاتا ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بادشاہ اور منصب دار جن پیادوں کو بندوقچیوں، توپچیوں اور بان پھینکنے والوں کی حیثیت سے نوکر رکھتے تھے، وہ سب کسانوں یا دیہاتی دست کاروں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ایک وقت میں اس قسم کے پیادوں کی کل تعداد چالیس ہزار تھی، جن کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ 47-1946 میں شاہی فوج کے سواروں کی کل تعداد، بشمول ان سواروں کے جو منصب داروں کی نوکری میں تھے، دو لاکھ کے قریب تھی۔ یہ سب مختلف طبقات یا گروہوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان میں بہت سے وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے گھڑ سوار بھی تھے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جن کا تعلق راج پوت نسلوں سے تھا۔ دیہی علاقوں سے بھرتی کیے گئے سپاہی جب شہروں میں تعینات ہوتے تھے تو کبھی کبھی یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ شہر فوجی چھاونی بن گیا ہے۔

16.4.3 قبائل

مغل عہد کی سماجی تنظیم کا ایک اہم جزء وہ قبائل تھے، جو ذات پات کے نظام سے باہر تھے۔ اس عہد میں بعض ایسے بہت سے قدیم گروہ جنگل کے علاقوں میں ملتے تھے، مثلاً وہ 'بن مانس' جو آندھرا میں نندیال اور کرنول کے درمیان موجود ہیں، یہ لوگ کسی قسم کا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے اور اپنی گزر بسر کے لیے شہد اور جنگلی بیجوں کو جمع کرنے کے علاوہ جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ کچھ ایسی ہی حالت موجودہ ناگا قبائل کے آباء و اجداد کی تھی۔ یہ لوگ 'ننگا' کہلاتے تھے، کیوں کہ انھوں نے کسی قسم کی پوشاک پہننی شروع نہیں کی تھی اور ابھی سماجی ترقی کے اس دور سے باہر نہیں آئے تھے، جب انسان کی گزر بسر جنگل سے جمع کی گئی اشیائے خوردنی پر منحصر تھی۔ پھر بھی ناگا گروہ میں اس قدر سماجی تفریق ضرور آ گئی تھی کہ ان میں سے بعض لوگ آسام جا کر عود کی لکڑی کے بدلے نمک اور اناج لے آئے تھے۔ ایسے حالات میں جنگلات کے علاقے شکاریوں اور اشیائے خوردنی جمع کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہو سکتے تھے، جو شاید ایک قبائلی تنظیم کی ابتدا تھی۔ جن علاقوں میں لوگوں کی گزر بسر مویشیوں کی پرورش پر تھی، وہاں سب کا مل کر چراگاہوں کو استعمال کرنا قبائل کی تنظیم کو ایک مخصوص قسم کی اساس مہیا کرتا تھا۔ یہ چراگاہ موسموں کے اعتبار سے تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ ایسی صورت حال میں قبائل کے لوگ اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے، جو ان کی زندگی میں خوش حالی کا سبب بنتی تھی۔ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچستان اور سندھ علاقہ کے نہمردی قبیلہ کے لوگ، جن کا اصل پیشہ جانوروں کی پرورش تھا، اونٹوں، گھوڑوں، بھیڑوں، کھالوں، قالینوں اور پہاڑی علاقے میں پیدا ہونے والی دوسری اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔ وہ ان اشیاء کے بدلے میں میدانی علاقوں سے اناج، مختلف قسم کے ہتھیار اور کپڑے لے جاتے تھے۔ اسی طرح وسطی ہمالیہ میں

جانوروں کو پالنے والے خانہ بدوش قبائل بھی تجارت کرتے تھے۔

افغان قبیلے بھی ابتدا میں جانوروں کی پرورش کرنے والے لوگ تھے۔گرچہ افغان قوم کا نام تاریخ میں بہت پہلے سے جانا جاتا ہے لیکن ان کے کچھ قبیلوں کے نام پہلی بار پندرھویں اور سولہویں صدیوں کی تحریروں میں ملنے شروع ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب افغانوں نے جانوروں کی پرورش کے ساتھ زراعت اور تجارت کے پیشوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔اسی دوران شمال کی طرف ان کے پھیلنے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا، جو لمبے عرصے تک جاری رہا۔افغانوں کی ان روایات سے، جو'آئین اکبری' اور 'تاریخ خان جہانی' میں درج ہیں، پتہ چلتا ہے کہ ہر قبیلہ مختلف افراد کی اولاد ہونے کا دعوے دار تھا۔یہ قبائل اکثر ان ہی افراد کے نام سے جانے بھی جاتے تھے۔لیکن ان قبائل میں اکثر باہر کے افراد کو اپنے اندر شامل کر لینے کی رسم بھی تھی۔اسی طرح سے مختلف قبائل کے لوگوں کے درمیان آپسی شادی بیاہ کے رشتے بھی عام تھے۔

16.4.4 حکمراں طبقہ/امراء

مغل دور کا ہندوستانی سماج جاگیرداری نظام پر مشتمل تھا اور اس سماجی نظام کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ ہوا کرتا تھا۔پورے ملک کا حکمراں ہونے کی وجہ سے ملک کی تمام زمینوں پر اس کے مالکانہ حقوق تصور کیے جاتے تھے۔شاہی خاندان کے لوگ، ان کے رشتے دار، دوست احباب اور بادشاہ کے مقربین حکمراں طبقے میں شمار کیے جاتے تھے اور سماجی اعتبار سے ان کا درجہ سب سے بلند ہوتا تھا۔

مغل عہد حکومت میں امراء بھی حکمراں طبقے میں شمار ہوتے تھے۔ان کا تعلق منصب داری اور جاگیرداری نظام میں سب سے اونچا ہوتا تھا، بادشاہت کے متبع ہوتے اور اعلیٰ طبقے کی حکمرانی میں ان کی بھی شمولیت ہوتی۔مغل سلطنت اور اس عہد کی دوسری ریاستوں میں زرعی ٹیکس سے اصل فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ تھے، جن کو حکمرانوں کے امیروں کا درجہ ملا ہوا تھا۔ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو زمینداروں میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔مغل حکمراں تمام امراء کو، جن میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے، اپنا تنخواہ دار نوکر تصور کرتے تھے اور ان کی تنخواہیں منصب کے مطابق مقرر ہوتی تھیں، جن کی ادائیگی کے لیے انھیں ایسے علاقے جاگیروں میں دیے جاتے تھے، جہاں سے ملنے والی زرعی ٹیکس کی آمدنی ان کی تنخواہ کے برابر ہوتی تھی۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ تنخواہ کا ایک حصہ شاہی خزانے سے نقد ادا کر دیا جاتا تھا۔منصب داروں کے درجے اور ان کی تعیناتی کی جگہوں میں تبدیلی کے مطابق جاگیریں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھیں۔عام طور پر کسی کو بھی دو تین برسوں سے زیادہ ایک جاگیر میں رہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

مغل دور حکومت میں اعلیٰ منصبوں کے لیے مجوزہ تنخواہیں غیر معمولی حد تک بڑھی ہوئی تھیں۔اس زمرے کے منصب داروں کا تصرف کل مہیا جاگیروں کا بہت بڑے حصے پر تھا۔1595ء میں 500 یا اس سے اوپر کے منصب پر فائز 122 منصب داروں کی جاگیریں کل زرعی ٹیکس آمدنی کے نصف سے بھی زیادہ حصے پر مشتمل تھیں۔اسی سال میں 25 سب سے اونچے منصب دار زرعی ٹیکس آمدنی کی 30 فیصد جاگیروں کے مالک تھے۔47-1646ء میں اسی زمرے کے منصب داروں کے پاس کل آمدنی کا 24 فیصد جاگیر میں تھا۔اسی لحاظ سے بڑے جاگیروں کی سرکاریں بھی بڑی ہوتی تھیں۔ان میں سے اکثر اپنے ماتحتوں کو ضمنی جاگیریں بھی دیتے تھے۔ظاہری طور پر جاگیرداروں کا صرف ایک کام تھا کہ وہ ان ٹیکسوں کو جمع کریں، جو حکومت کی طرف سے واجب قرار دیے گئے تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جاگیرداروں کی غیر قانونی لوٹ کھسوٹ پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔سرکاری مآخذ میں جاگیرداروں کے جابرانہ رویوں کی شکایتیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔گرچہ جاگیروں کو تبدیل کرنے کا

قانون مطلق العنان مرکزیت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا، لیکن کاشت کاروں کی حالت پر اس کا بدترین اثر پڑتا تھا۔ چوں کہ ایک جاگیردار کو اپنی جاگیر کی مستقبل کی خوش حالی کے لیے کوشش کرنے میں کوئی ذاتی فائدہ نظر نہیں آتا تھا بلکہ اس کا ذاتی فائدہ اسی میں تھا کہ جتنی زیادہ آمدنی ممکن ہو سکے وہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، چاہے ایسا طرز عمل اس کی جاگیر کے مستقبل کے لیے کتنا ہی تباہ کن کیوں نہ ہو۔

مغل امراء کی بھرتی بعض خاصے جانے پہچانے گروہوں میں سے ہوتی تھی۔ ان میں سے بہت سے تو وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے لوگ تھے۔ ترک وطن کر کے آنے والوں کا یہ سلسلہ مستقل جاری تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایران سے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجے میں وسط ایشیائی امراء کی بہ نسبت ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ یہ تارکین وطن عام طور پر اپنے ملکوں میں بھی امراء یا دفتری حکام کی آسامیوں پر کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ امراء کے درجے میں افغان، ہندوستانی مسلمان اور راج پوت بھی تھے، پھر سترہویں صدی میں مراٹھوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ تارک وطن زمرے کے امراء اور ان کی اولاد امراء کی کل جماعت کے تقریباً نصف کے قریب تھے۔ مغل سلطنت میں بڑے امراء کے بیٹے اور دوسرے قریبی رشتے دار عموماً مخصوص عنایتوں کے مستحق قرار پاتے تھے۔ اس رعایت سے انھیں 'خانہ زاد' کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اگر امراء کے طبقے میں شامل مختلف گروہوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بہت کم لوگوں کا مقامی آبادی کے کسی بھی حصے سے سیدھا تعلق تھا۔ مقامی حالات سے اس طرح کی دوری کی کیفیت کو جاگیروں کے تبادلوں نے اور نمایاں کر دیا۔ امراء عام طور پر اپنے گھربار اور دفاتر شہروں میں بناتے تھے اور دیہاتی علاقوں کے بجائے وہ اپنے شہری محلوں میں ہی قیام کرتے تھے۔

16.4.5 زمین دار

عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں کاشت کاروں اور ان کی مزروعہ زمینوں پر مختلف نوعیت کے موروثی حقوق کے دعوے دار کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ مختلف علاقوں میں اس طبقے کے مختلف نام تھے، لیکن مغل انتظامیہ ایسے تمام مقامی طور پر طاقت ور زرعی گروہوں کے لیے زمیندار کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ زمین داروں میں ایک طرف نیم خود مختار مقامی حکمراں شامل تھے، وہیں دوسری طرف یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا جو عملاً دیہات کے مقدموں سے بہت مختلف نہیں ہوتے تھے۔ ان متفرق حیثیتوں کے موروثی حقوق رکھنے والوں کے درمیان بعض باتیں مشترک تھیں، مثلاً ان سب کو زرعی ٹیکس میں سے بھی ایک ادائیگی کی جاتی تھی جو نقد بھی ہو سکتی تھی اور معافی کی زمین کی صورت میں بھی دی جا سکتی تھی۔ اس طرح یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں زمین کے مالک نہیں تھے۔ یہ بات یوں بھی صاف ہو جاتی ہے کہ زمین کی پیداوار میں ان کا حصہ 'لگان' کے مطابق نہیں تھا، بلکہ خود انھیں جو کچھ ملتا تھا وہ ایک طرح کا زرعی ٹیکس تھا، جو فاضل پیداوار کے چھوٹے سے حصے کے برابر ہوتا تھا۔ یہ حصہ شمالی ہندوستان میں ایک تہائی یا پانچواں حصہ تھا۔ بعض علاقوں میں یہ لوگ کاشت کاروں کو زمین سے بے دخل کر کے ان کے بجائے نئے کاشت کار آباد کرنے کا حق رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کسی علاقے میں ایک زمین دار کے حقوق قائم ہونے کی روایت اکثر یہ ہوتی تھی کہ مخصوص برادری یا ذات کے لوگوں نے طاقت کے دم پر وہاں اپنا دبدبہ قائم کر لیا تھا۔ اس طرح کسی علاقے میں زمینداروں کی بالا دستی قائم رکھنے کے دو خاص ذرائع تھے۔ اول تو حاوی برادری کے لوگوں میں آپسی تعاون اور بھائی چارہ اور دوم ان میں سے بعض کی ملازمت میں مسلح افراد پر مشتمل جتھوں کا مہیا ہونا۔ لیکن مغل عہد کے آنے تک ہر جگہ زمینداری حقوق والے گروہ میں مختلف برادریوں کی نمائندگی بدلنے لگی تھی۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ان زمیندار برادریوں کی تفصیلی فہرست درج کی ہے جہاں پر علاقہ یا پرگنہ کے زمیندار برادریوں کے نام

درج کیے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں میں زمین داریاں ہندوؤں میں سے اونچی ذاتوں کے پاس تھیں، خاص طور پر راج پوت برادریوں کے پاس۔ لیکن بہت سے ایسے مقامات بھی تھے جہاں ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے زمین دار موجود تھے۔ اسی طرح 'آئینِ اکبری' میں زمین داروں کے زمرے میں مختلف برادریوں کا بھی ذکر آتا ہے۔

16.4.6 عورتیں

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مغل دورِ حکومت میں عورتوں کو سماجی اعتبار سے وہ اختیارات اور مراعات حاصل نہیں تھے جو مردوں کو حاصل تھے۔ اسی طرح سے ان پر سماجی جبر روا رکھا جاتا تھا، لیکن یہ سماجی جبر مختلف طبقات اور گروہوں میں الگ الگ انداز میں بروئے کار آتا تھا اور وقت، حالات و مقام کے ساتھ اس کی نوعیت بھی بدلتی رہتی تھی۔

عام طور پر ہندو معاشرے میں عورتوں کو بہت محدود اختیارات حاصل تھے۔ بچیوں کی پیدائش کو فال بد شمار کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ کبھی کبھی نوزائیدہ بچی کا قتل بھی ہوتا تھا۔ بسا اوقات ان کی شادیاں بچپن میں ہی کر دی جاتی تھیں اور ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی سن بلوغ سے پہلے ہی قائم کر لیے جاتے تھے۔ نچلی قوموں میں شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین کو کسی نہ کسی انداز میں 'دلہن کی قیمت' کے طور پر کچھ نہ کچھ ادا کیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف اونچی ذاتوں میں دولہا کے والدین کو دلہن کی طرف سے جہیز ملتا تھا۔ کئی کاشت کار اور مویشی پالنے والی ذاتوں، مثلاً جاٹوں، یادووں اور دوسری نچلی برادریوں میں بیواؤں کی شادیاں ہو سکتی تھی۔ اکثر ان کے متوفی شوہروں کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اور کبھی کبھی غیر مردوں کے ساتھ بھی یہ دوسری شادیاں انجام پاتی تھیں۔ اس طبقے کی عورتوں میں پردے کا کوئی رواج نہ تھا، عورتیں عام طور پر پانی بھرنے، سوت کاتنے اور آٹا پیسنے کا کام کرتی تھیں۔ گرچہ ایسی مثالیں کم ہیں لیکن بعض اوقات عورتیں کاشت کاری میں بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔ مثلاً ہمالیہ کی پہاڑی اقوام میں عورتیں زمین جوتنے کا کام بھی کرتی تھیں۔ چند مخصوص ذاتوں کی عورتیں دودھ، گھی اور دوسری اشیاء کو فروخت کرنے کے لیے پھیری لگانے کا کام بھی کرتی تھیں۔ بنگال کے بارے میں یہاں تک خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں کام کا اصل بوجھ عورتوں کے کاندھوں پر رہتا تھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ مغل عہد میں ہندوستان دنیا کے ان چند ملکوں میں تھا جہاں تعمیرات سے تعلق رکھنے والے مشکل کاموں کا بوجھ عورتوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ نچلے طبقات میں عورتوں کے وراثت میں حقوق کو قانونی طور پر تسلیم کیے جانے کے باوجود عام طور پر انھیں نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ بنگال میں کوئی متوفی کاشت کار اگر اپنے پیچھے ایک مرد وارث نہیں چھوڑتا تھا تو اس کی بیوی اور بیٹیوں کو مویشیوں کی طرح بحق سرکار یا بحق جاگیر دار یا اس علاقے کے زمیندار کے ذریعے پکڑ لیا جاتا تھا۔

ہندو معاشرے میں اونچی ذات کی عورتوں کو غالباً آرام کے کسی قدر زیادہ مواقع حاصل تھے، لیکن وہ بھی کئی قسم کی شدید مجبوریوں کا شکار تھیں، ان میں سے ایک مجبوری پردے کی سختی سے پابندی تھی۔ یہ واقعہ کہ اس زمانے کی اُہوم ریاست میں عورتیں، جن میں رانیاں بھی شامل تھیں اپنے چہروں یا سروں کو ڈھکے بغیر لوگوں کے سامنے نہیں آتی تھیں، مغل تحریروں میں ایک انوکھی بات کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اونچی ذاتوں میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کی سخت ممانعت تھی، راج پوتوں اور دوسری اقوام میں 'ستی' کی بھیانک رسم پر عمل کیا جاتا تھا۔ مغل حکومت نے 'ستی' کے واقعات کو کم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا کہ ہر انفرادی کیس میں یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ بیوہ اپنی مرضی سے 'ستی' ہو رہی ہے۔ گرچہ اس پالیسی کا کچھ اثر ضرور ہوا لیکن تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں گیر کے عہد میں ایک ہفتہ کے دوران دو یا تین مرتبہ 'ستی' کے واقعات

رونما ہوجاتے تھے۔ پھر بھی اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اونچی ذات سے تعلق رکھنے والی تمام یا زیادہ تر بیوائیں 'ستی' ہوجانے پر مجبور تھیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ بعض بیوائیں نہ صرف منقولہ اثاثوں کی مالک تھیں بلکہ ان کے پاس زمینداری حقوق بھی تھے جو بظاہر وراثت میں ہی مل سکتے تھے۔ کیرالا کی بعض اقوام میں وراثت ماں کی طرف سے چلتی تھی اور اسی قسم کی صورت حال میگھالیہ کے گھارو اور گھاسی قبائل میں بھی پائی جاتی تھی۔

مسلم معاشرے میں قانون کے مطابق ایک مرد کو چار بیویاں اور کئی باندیاں رکھنے کی اجازت تھی،لیکن یادرہے کہ یہ ایک ایسی رعایت تھی جس کا صرف بہت مال دار اور بااقتدار لوگ ہی فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ مردوں کو اس قسم کی رعایت دیے جانے کو بعض اوقات ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا اظہار شادی کے ان شرائط ناموں سے ہوتا ہے جو بعض اوقات فارسی دستاویزات کے مجموعوں میں ملتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک دستاویز وہ ہے جو سترہویں صدی کے نصف اول میں سورت میں تیار کی گئی تھی۔ اس قسم کے دستاویزات میں عورتیں اپنے شوہروں سے یہ یقین دہانی حاصل کرتی تھیں کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گے اور نہ ہی کوئی باندی رکھیں گے۔ ان شرائط ناموں کے ذریعے شوہروں کو یہ بھی وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو جسمانی وذہنی تکلیف نہیں پہنچائیں گے اور انھیں گزر بسر کے لیے مناسب وسائل بھی فراہم کرتے رہے گے۔ مسلم معاشرے میں سن بلوغ سے پہلے شادی گرچہ غیرقانونی نہیں تھی لیکن مسلمانوں میں اس کا چلن کم تھا۔ اس کے برخلاف بیوہ کی دوبارہ شادی نہ صرف قانونی طور پر جائز تھی بلکہ بسا اوقات ایسی شادیاں ہوتی بھی تھیں۔ اونچے گھرانوں کی مسلم عورتیں مکمل پردے میں رہتی تھیں۔ شادی کے وقت طے شدہ شرائط کے مطابق عورتیں اپنے شوہروں سے مہر کے روپیوں کے لیے دعویٰ کرسکتی تھیں اور انھیں وراثت میں جائیداد بھی مل سکتی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ اکبر نے قانون میں معدلت کے فقدان پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا تھا اور اورنگ زیب نے مدد معاش کی زمینوں میں وراثت کے اصول وضع کرتے وقت شریعت سے صرف نظر کرتے ہوئے بیواؤں کو اپنے متوفی شوہروں کی پوری مدد معاش کا زندگی بھر کے لیے وارث قرار دیا تھا۔

مغل عہد کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتیں عام طور پر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ خاص طور پر ہمایوں کی بہن گل بدن بیگم کا معاملہ غیرمعمولی تھا، جس کے بارے میں تاریخی شہادتیں ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ تھی مگر اس کا شوہر غیرتعلیم یافتہ تھا۔ لیکن اس کے برخلاف متوسط طبقات سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتیں بھی زیادہ تر غیر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ ان تمام تاریخی شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مغل دور حکومت میں عورتوں کی سماجی حیثیت اتنی اچھی نہیں تھی اور وہ مختلف قسم کی سماجی برائیوں کا شکار تھیں۔

16.4.7 ذات پات کا نظام

مغل دور کے ہندوستان کے سماجی ڈھانچے کی تشریح وتوضیح بڑی حد تک ذات پات کی روشنی میں کی جاسکتی ہے کیوں کہ 1664ء کے آس پاس جب تینسی نے یہ دکھانا چاہا کہ سماجی اعتبار سے کس زمرے کے کسان مارواڑ کے علاقے میں رہتے ہیں تو اس نے ان کی ذاتوں کے نام لکھ دیے۔ اسی طرح سے جب 1595ء کے آس پاس ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں پرگنہ کے زمینداروں کا ذکر کیا تو اس نے ان کی ذاتوں کے نام لکھ دیے۔ ایک جگہ ایک برہمن فخریہ انداز میں لکھتا ہے کہ وہ برہمن ہے اور جب وہ کسی شخص کی مہربانی یا بھلائی کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کی پوری ذات کی تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہے، مثلاً اس کا جملہ ہے: ''کائستھ بہرحال فراخ دل اور وفا شعار ہوتے ہیں۔'' اسی طرح سے اس

دور کی تحریروں میں ہر جگہ مختلف ذات برادریوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں پر پابندی اوران کے اپنے آبائی پیشوں کو ترک نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ مغل دور کا سماج کس طرح سے ذات پات کے نظام میں جکڑا ہوا تھا؟ اس کا اندازہ مہاراشٹر کے اٹھارہویں صدی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ جب کچھ درزیوں نے رنگ ریزی کا پیشہ اختیار کرلیا تو کچھ عرصے بعد ان کو اپنی ذات سے علیحدہ ذات تسلیم کرلیا گیا اوراس کے بعد ان کے اور پرانے درزی ذات کے بیچ شادی بیاہ کا رشتہ ممنوع قرار دے گیا گیا۔

سماجی ماہرین نے یہ بھی درج کیا ہے کہ کس طرح مختلف ذات برادریاں نئے پیشے اختیار کرنے کے بعد ذات پات کے نظام میں اپنا مقام بدل لیتی ہیں۔ انھوں نے اس عمل کو 'سنسکرٹائزیشن' کا نام دیا ہے یعنی اونچی ذاتوں کی رسوم اور طریقوں کو اختیار کرنا مثلاً نباتات خوری، میت کو جلانے کی رسم، عورتوں کو گھروں کے اندر رکھنے کی رسم اور بیواؤں کی دوسری شادی پر پابندی وغیرہ۔ تاجروں کی مشہور برادری بنیوں کے بارے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت سی ایسی چھوٹی ذاتیں شامل تھیں جو صرف آپس میں ہی شادی بیاہ کے رشتے رکھتی تھیں۔

غلامی کی طرح ذات پات کا نظام بھی ایک ایسا ادارہ تھا جو انسان کو اس کے مقام سے نیچے لے جاتا تھا۔ اس کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے دور ہو جاتے تھے۔ یہ دوری نہ صرف اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان ہوتی تھی بلکہ برابر کی حیثیت کے لوگ بھی مختلف طبقات میں بٹ جاتے تھے۔ نچلے طبقات کے لوگوں کے اوپر سخت قسم کے سماجی ظلم روا رکھے جاتے تھے۔ یہ ظلم خاص طور پر ان ذاتوں کے ساتھ زیادہ ہوتا تھا جن کا شمار 'کام گاروں' یا 'اچھوتوں' میں ہوتا تھا۔ باقی دوسرے نچلے طبقات کو بھی کئی قسم کی پریشانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جن میں زبردستی بے گار لینا عام بات تھی۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کی وحدانیت سے سرشار عوامی تحریکوں میں ذات پات کے دو بنیادی تصور 'نجس اور پاک کا فرق' اور 'انسانوں کے درمیان اونچ اور نیچ' کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ کبیر نے لکھا تھا:

پیدائش اور موت دونوں میں نجاست ہے

اے پنڈت مجھے بتاؤ 'پوتر' کون ہے؟

اسی طرح سکھ گرو امرداس نے کہا تھا کہ ''کوئی اپنی ذات پر فخر نہ کرے، یہ دنیا مٹی سے بنی ہے، بس کمہار نے برتن مختلف نمونوں کے بنائے ہیں۔'' گرچہ اس قسم کے اخلاقی احتجاج کا اصل زندگی میں کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، لیکن شاید ایسے ہی افکار سے ناراض ہوکر رام کے پجاری تلسی داس نے 'رام چرتر مانس' میں اس بات کی مذمت کی ہے کہ کل یگ میں شودروں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ان تمام کے باوجود بھی ذات پات کا نظام سماجی تبدیلیوں اور حرکت پذیری کے راستے میں کبھی بھی بہت بڑی رکاوٹ نہیں تھا۔ کیوں کہ تاریخی ماخذ یہ بتاتے ہیں کہ مغل عہد سے پہلے برہمن، کائستھ اور کھتری اپنے اپنے پجاری یا کلرکی پیشوں کی رعایت سے سنسکرت کا علم رکھتے تھے۔ مغلوں کا دور آنے تک ان لوگوں نے فارسی سیکھنا شروع کردی اور انتظامی امور میں اہمیت حاصل کر کے اس میدان میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

16.5 مذہبی حالت

صدیوں سے ہندوستانی سماج میں مذہبی تکثیریت کی موجودگی معاشرے کی ایک نمایاں خصوصیت شمار کی جاتی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مغل عہد کو اس کی عمدہ مثال تصور کیا جاتا ہے، جہاں پر مذہبی تکثیریت کے نتیجے میں ہمیں متحدہ تہذیب وثقافت کا ایک بے مثال ظہور نظر آتا

ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں مغل حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستانی سرزمین پر مختلف مذاہب، ذات پات، رنگ ونسل اور زبانوں کے بولنے والے لوگ ایک قومیت کے رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ گرچہ اس کی بنیاد ہمیں ہندوستانی تاریخ کے عہد سلطنت میں ہی پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر جس طرح مغل عہد میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک قومیت کے دھارے میں سمونے کی کوشش نظر آتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مغل دور حکومت میں اس کے مذہبی افق پر ہمیں ہندو، مسلمان، بدھ، جین، سکھ اور عیسائی غرض کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ملتے ہیں۔ ساتھ ہی اس عہد میں مختلف مذہبی تحریکوں کا ظہور بھی نظر آتا ہے۔ مذکورہ تمام مذاہب کے لوگ اپنے مختلف عقائد ونظریات کے ساتھ مغل دور حکومت میں زندگی بسر کر رہے تھے، ساتھ ہی ایک دوسرے کو متاثر اور ان کے اثرات قبول بھی کر رہے تھے، جس کے نتیجے میں ہمیں گنگا جمنی تہذیب کا ظہور نظر آتا ہے۔

16.5.1 ہندو مذہب

مغل دور حکومت میں عوام الناس کی اکثریت ہندو مذہب کی پیروکار تھی اور اس عہد کی مذہبی صورت حال کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو یہاں پر اسلام اور ہندو مذہب کی ایک دوسرے کے ساتھ موجودگی کو شمار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام مذہب کی کسی ایک ہی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ مغل عہد حکومت 1653ء میں تحریر کی گئی کتاب 'دبستان مذاہب' کے مصنف کا بیان ہے کہ ''ہندوؤں میں بہت سے مذاہب اور بے شمار اعتقادات اور رسوم ہیں۔'' دوسرے الفاظ میں اس عہد میں ہر اس ہندوستانی کو جو مسلمان نہیں تھا، ہندو کہا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ہندو مذہب کو اسی معنی میں اعتقادات کا ایک نظام تصور نہیں کیا جا سکتا، جس معنی میں ہم عام طور پر اسلام یا دوسرے سامی مذاہب کے سلسلے میں سوچ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف ہندو فرقے ایک دوسرے کے ساتھ تفاعل کے ذریعے سامنے آئے تھے اور یہ تفاعل بڑی حد تک ایک مخصوص علمی زبان یعنی سنسکرت کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا تھا۔ اس کے نتیجے میں مختلف ہندو فرقے نہ صرف ایک ہی قسم کی مذہبی اصطلاحات کا استعمال کرتے تھے بلکہ اکثر ان کے دیوتاؤں میں بھی مماثلت تھی۔ 'دبستان مذاہب' کی تصنیف سے تقریباً ساٹھ سال قبل 1595ء میں ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک تفصیلی اور جامع بیان درج کیا تھا۔

مغل عہد میں لکھی گئی ہندو مذہب کی مذہبی تحریروں میں راسخ العقیدہ ہندو مذہب کے ان تمام بنیادی عناصر پر زور دیا جاتا رہا، جن کا ذکر 'آئین اکبری' اور 'دبستان مذاہب' میں کیا گیا ہے۔ مثلاً نارائن بھٹ کی 1600ء کے آس پاس لکھی گئی کتاب 'مان میودیہ' میں 'می ماسا' کے فلسفے پر بحث ملتی ہے۔ اس فلسفے کے مطابق تناسخ کا عمل خود بخود جاری رہتا ہے۔ یہ ایک طرح سے زندگی کا آزاد عمل ہے، جس میں کسی ایک وقت میں روح کا مقام پچھلے مقاموں میں اس کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ 'دبستان مذاہب' کے مصنف کے مطابق ہندوؤں میں یہ ایک عام اعتقاد تھا کہ دنیا کو بنانے والا ایک خدائے واحد ہے لیکن مخلوق کی زندگیاں ان کے پچھلے اعمال ہی سے متعین ہوتی ہیں۔ گویا اب مذہب کی کنجی وہ اعمال تھے جو اسمرتیوں کے مختلف مدارس نے طے کیے ہیں۔ اس میدان کے روایتی نظریوں پر اسمرتیوں کی تازہ ترین تحریروں میں برابر زور دیا جاتا رہا۔ 1567ء کے قریب بنگال میں نوادیپ کے راگھونندن نے اپنی کتاب 'اسمرتی تتوا' تصنیف کی۔ یہ کتاب رسوم اور وراثت سے متعلق مسائل پر بہت معتبر مانی جاتی ہے۔ 1612ء میں کملاکار بھٹ کے ذریعے لکھی گئی کتاب 'نرنیا سندھو' کو مہاراشٹر میں مذہبی اور قانونی امور سے متعلق معتبر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کتاب میں راگھونندن کا ایک استاد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں گیر کے عہد میں مترامشرا نے

ہندو قانون سے متعلق ایک اہم کتاب تصنیف کی۔ ان تحریروں میں پیش کردہ نظریوں سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ گزرے زمانے کی اسمرتیوں میں ذات پات کے نظام کے بارے میں جو قواعد وضع کیے گئے تھے، ان سے کسی بھی قسم کا انحراف پیدا ہو رہا تھا۔ عام طور پر ان سب تحریروں میں ان بندشوں کو دہرایا بلکہ بڑھا کر بیان کیا گیا ہے جو پرانی اسمرتیوں میں نچلے طبقات اور عورتوں پر عائد کی گئی تھیں۔ راگھونندن نے یہاں تک کہہ دیا کہ برہمن اکیلی ایسی ذات ہے، جس کو دوبارہ پیدا ہونے والی یعنی اونچی ذات شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق چھتری اور ویش طبقے کے لوگ اس کے زمانے تک شودروں کے درجے پر پہنچ چکے تھے۔

ویدانت کے میدان میں شنکر آچاریہ کی علمی روایت خاصی بااثر تھی۔ اس دور میں ویدانت سے متعلق کئی تحریریں سامنے آئیں۔ 'دبستانِ مذاہب' کے مختلف بیانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے وسط تک شنکر آچاریہ کی وحدانیت کا تصور کئی فرقوں اور مدارس خیال کے نظریوں کو متاثر کر چکا تھا۔ سدانند کی کتاب 'ویدانت سارا' جو 1500ء کے آس پاس لکھی گئی تھی 'سانکھیا' کے اصولوں سے متاثر نظر آتی ہے۔ دوسری طرف 'سانکھیا سارہ' کا مصنف وجنان بھکشو 1650ء کے قریب کی اپنی تحریر میں ویدانت کی سچائی کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح ویدانت اور شیوا کے پیروؤں کے اعتقادات کے درمیان مفاہمت کی کوشش ویلور کے مشہور مصنف آپیا دیکشتا کی ہے۔ کسی قدر بعد کے زمانے میں ایسا ہی رجحان شیوا کے پیرو شیونانر کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ 'دبستان مذاہب' میں وسیع پیمانے پر جاری تانترک اعتقادات اور اعمال کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں تانترک ادب کو خاصہ فروغ ملا۔ 1589ء میں بنارس کے مہی دھار نے 'منتر مہوداھی' تصنیف کی۔ 1571ء کے بعد بنگال میں پورن آنند نے فلسفہ اور جادوئی رسموں کے بارے میں اپنی کتاب لکھی۔ سترہویں صدی میں نودیپ کے کرشن آنند آگموا آگیش نے 'تانتر سار' تصنیف کی، جس کا شمار معتبر تحریروں میں ہوتا ہے۔

16.5.1.1 بھکتی سے متاثر فرقے

ہندو مذہب کے اعتبار سے سولھویں اور سترہویں صدی بجا طور پر ویشنو مذہب کی صدیاں قرار دی جائیں گی۔ شمالی ہندوستان میں شری رام کی پرستش سے عبارت اس مذہب کے سب سے بڑے مبلغ تلسی داس تھے، جنھوں نے اپنی کتاب 'رام چرتر مانس' میں رامائن کی کہانی کو بڑے مقبول انداز میں پیش کیا۔ تلسی داس بھکتی کے شوق اور ولولے سے پر اپنی شاعری میں ایک ایسے رام کی تصویر پیش کرتے ہیں کہ جو منصف تھا وہ ایک اوتار کے درجے سے اٹھ کر ذات باری تعالیٰ کے مقام پر پہنچ گیا تھا اور جسے قضا وقدر پر پورا اختیار تھا۔ بنگال کے رہنے والے برہمن پروہت چیتنیہ نے کرشن اور رادھا کی پرستش کی ایسی رسم شروع کی، جس میں ایک بھکت اپنے خداوند کے نام کے تکرار کے ذریعے اپنے آپ کو ایسی ذہنی اور جذباتی حالت میں پہنچا دیتا تھا جہاں وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس نے بندرابن میں کرشن کی رفیقہ کی جگہ حاصل کرلی ہے اور وہ عشق کے ان تمام مدارج کا تجربہ کرتا ہے جن سے کرشن گزرے تھے۔ ان ذہنی تجربات کے ذریعے ایک بھکت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وصال کی کیفیت کا تجربہ کرتا تھا۔ گرچہ چیتنیہ کے زیادہ تر پیروکار بنگال میں ہی تھے لیکن انھوں نے اپنے خلفاء کو جنھیں گوسوامی کہا جاتا تھا، بندرابن میں متعین کیا تھا۔ ان گوسوامیوں نے اپنی سنسکرت تحریروں کے ذریعے اس مخصوص مذہبی رجحان کو فلسفیانہ اساس دی اور اس کے رسوم طے کیے۔ اپنے پیروکاروں کے لیے چیتنیہ خود بھی کرشن اور رادھا کے اوتار کا درجہ رکھتے تھے۔ گرچہ عام زندگی میں چیتنیہ کے ایک پیرو گھربار کی ذمے داری اٹھانے والا شخص ہوتا تھا جو ذات پات کے نظام کے تمام شرائط کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس مخصوص مذہبی رجحان میں نچلی ذات کے لوگوں کو پرستش کے

حق سے محروم نہیں رکھا گیا تھا۔اسی رجحان سے نکلنے والے اٹھارہویں صدی کے سہجیہ فرقے میں سمرتیوں کی تعلیمات کو قطعی طور پر برطرف کر کے کئی قسم کے شاکتک اور تانترک معمولات جاری کیے۔آسام میں ایک دوسرا ویشنو فرقہ شروع ہوا جو چیتنیہ کے فرقے سے ملتا جلتا تھا۔اس کی ابتدا چیتنیہ کے ایک ہم عصر شنکرادیو نے کی تھی جن کی وفات 1568ء میں ہوئی۔شنکرادیو نے بتوں کی پرستش سے گریز کرتے ہوئے ایک خداوند مطلق سے رجوع کیا۔ان کا خیال تھا کہ ذات باری تعالیٰ کی ہر عبادت کرشن کی محبت سے سرشار ہوگی۔ولبھ چاریہ (وفات 1531ء) اوران کے بیٹے وٹھل ناتھ (وفات 1576ء) نے پشٹی مارگ یعنی خدا کے فضل سے عبارت ایک مذہب کی تبلیغ کی۔سورداس اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ 1545ء میں انھوں نے 'سورسروالی' نامی کتاب مقامی بولی برج میں تصنیف کی۔اس تحریر میں کرشن اور رادھا کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ دونوں ذات باری تعالیٰ کے مظہر نظر آتے ہیں۔یہ فرقہ گجرات اور راجستھان میں مقبول ہوا۔اس کے تحت ولبھ چاریہ کی اولاد کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، انھیں اب کرشن کا اوتار سمجھا جانے لگا اور انھیں 'مہاراج' کے لقب سے مخاطب کیا جانے لگا۔ان کے مریدوں میں تاجروں کے امیر طبقے کے لوگ زیادہ تھے۔رادھاولبھی فرقے کی بنیاد ہیتا ہری ونش (وفات 1553ء) نے ڈالی تھی۔یہ فرقہ ذات باری تعالیٰ کی تثنیت میں رادھا کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

مہاراشٹر کے علاقے میں ویشنو تحریک کے وحدانیت کی طرف مائل ہونے کے ساتھ اس میں کئی قدامت پسند عناصر بھی موجود تھے۔ ایکناتھ (وفات 1599ء) نے بھکتی کے ایسے اصول وضع کیے، جن کی رو سے ہر ذات کے مردوں اور عورتوں کو ایک جگہ جمع ہو کر خداوند کی حمد وثنا کرنے اور کیرتن میں شریک ہو کر حال و وجد کا مزہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔وہ جذبہ سے عاری رسوم کے قائل نہیں تھے۔تکارام (وفات 1649ء) جن کا پیشہ کاشت کاری تھا اور شودر ذات سے تعلق رکھتے تھے،ممکن ہے کہ چیتنیہ فرقے سے متاثر رہے ہوں،لیکن اپنی عبادت میں وہ 'ویتھوبہ' دیوتا سے رجوع کرتے تھے۔تکارام کے خداوند وٹھل اور چیتنیہ کے کرشن کی بہ نسبت وحدانیت پرست کبیر کے رام سے زیادہ مشابہ تھے۔وہ اپنی گیتوں میں یہ کہتے تھے کہ ہر پجاری چاہے اس کا سماجی درجہ کتنا ہی نیچا کیوں نہ ہو، اپنے خداوند تک پہنچ سکتا ہے۔اس سلسلے میں اللہ کا نام استعمال کرنے میں بھی انھیں کوئی مضائقہ نہ تھا۔اس سلسلے میں رام داس (وفات 1681ء) کا رویہ کسی قدر مختلف ہے۔وہ ایک خداوند کی شکل میں رام کی پرستش کے ساتھ 'دھرم' کی بھی تائید کرتے تھے۔'دھرم' سے ان کا مطلب 'مہاراشٹر دھرم' تھا، جس کی رو سے برہمنوں اور دیوی دیوتاؤں کی حرمت برقرار رکھنا ضروری تھا۔انھوں نے مٹھ یعنی سنیاسیوں کے مراکز قائم کیے، جنھیں مراٹھا حکمراں شیواجی (وفات 1680ء) کی سرپرستی حاصل تھی۔

16.5.1.2 کبیر اور تحریک وحدانیت

بنارس کے بنکر کبیر (وفات 1518ء) کی تعلیمات نے ہندوستان کی مذہبی فکر میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ان کی شاعری میں ایک طرف تو ویشنو، ناگ پنتھی اور بعض اوقات تانترک اعتقادات کے پردے میں بے پناہ وحدانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔دوسری طرف اس میں اسلامی وحدانیت کے منطق کو پوری طرح قبول کرنے کے ساتھ اسلامی دینیات کو مسترد کیے جانے کا رویہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ کبیر نے اپنے خیالات لازمی طور پر ایسی زبان میں پیش کیے ہیں جن کو اسلامی ثقافت کے دائرے سے باہر کے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔کبیر نے اپنے خیالات کو کسی بھی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہو، ان کی بے محابہ فکر کی ندرت نے بلاشبہ اس عہد کے لوگوں کو بہت بڑے

پیمانے پر متاثر کیا تھا۔

کبیر نے ایک ایسی وحدانیت کی تبلیغ کی، جس میں بت پرستی یا کسی بھی قسم کی مذہبی رسوم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے مطابق خدا کی غلامی نہ کہ اس سے عشق نجات کی سچی راہ ہے، گو کہ اس سلسلے میں عشق کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ کسی قدر بعد میں آتا ہے۔ یہ بات اس دعوے کو کمزور کرتی ہے کہ کبیر نے اپنے خیالات ویشنو بھکتی اور اسلامی تصوف سے مستعار لیے ہیں۔ کبیر کے مطابق ایک انسان کو اس کے خدا پر ایمان اور اپنے اعمال کی بنا پر ہی پرکھا جاسکتا ہے۔ کبیر نے پاک اور نجس کے رسمی تصورات، اسمرتی کے قانون اور ذات پات کے نظام کو بڑی قطعیت کے ساتھ برطرف کیا ہے۔ سولہویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ایک تحریر میں ان کی تعلیمات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ وہ ذات پات کے بیچ تفریق کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ وہ برہمنوں کے سماجی طبقاتی نظام کے بھی منکر تھے۔ اسی طرح سے انھوں نے اپنے دوہوں میں مختلف مذاہب کے آپسی جھگڑوں کا ذکر حقارت آمیز انداز میں کیا ہے۔

کبیر کے سامنے عام انسان تھے۔ ان کی تمثیلوں اور استعاروں کو ایسے ہی لوگوں کی زندگیوں اور ان کی زحمتوں سے مستعار لیا گیا تھا اور ان کی زبان وہی تھی جو یہ لوگ بولتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ عورتوں کے خلاف بعض ان تعصّبات سے متاثر تھے، جو ان کے اپنے سماجی ماحول، خصوصاً غریب مردوں کی دنیا میں پائے جاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کبیر نے اپنے بنانے والے کی دنیا میں غریبوں اور دبے کچلے لوگوں کے لیے ایک نئی قسم کی منزلت کا سراغ لگا لیا تھا۔ اسی لیے ان کے بعد بہت سے ایسے لوگ بھگت اور گرو کی شکل میں سامنے آئے جو ان کی ہی طرح غریب تھے، پر انسانوں کی اس بستی میں خدا کے متلاشی تھے۔ سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو نے 1604ء میں اس ڈرامائی کیفیت کو جس طرح محسوس کیا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انھوں نے ایک جاٹ کسان دھنا کے منہ سے اس کیفیت کا اظہار کروایا ہے۔ اسی طرح سولہویں صدی کے بھگت روی داس جو جانوروں کی کھالوں کو صاف کرنے کا کام کرتے تھے اور سائیں جو حجام تھے، کبیر کو اپنا پیش رو قرار دیتے تھے۔ کبیر کے بارے میں اسی طرح کا خیال دادو دُھنہ کا تھا، جس کے مریدوں کی خاصی تعداد راجستھان میں پائی جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد تقریباً 1657ء میں ہریانہ میں ست نامی فرقہ نمودار ہوا، جو اپنے آپ کو کبیر کا پیرو قرار دیتے تھے۔ اس گروہ میں کسان اور چھوٹے سرمایہ دار تاجر شامل تھے۔ ان تمام بھگتوں یا گروؤں کے مرید اپنے گروہوں کو 'پنتھ' کا نام دیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جہاں ایک طرف یہ لوگ مذہبی ارکان کی رد میں لکھے گئے اپنے گروؤں کے اشعار اور اذکار محفوظ رکھے ہوئے تھے، وہیں دوسری طرف انھوں نے اپنے لیے نئے ارکان وضع کر لیے اور اپنے ابتدائی گروؤں کو اوتار کا درجہ دینے لگے۔ اس طرح انھوں نے اپنے وحدانیت پرست فرقوں کو ذات کی شکل دے دی۔ یہاں تک کہ کبیر کے لیے جو ایک بنکر کی اولاد تھے، برہمنی ولدیت تلاش کی جانے لگی۔ غرض بھگتوں کے اصل پیغام کو اس طرح بدلنے کی کوشش سے یہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مذہبی ارکان اور ذات پات کے نظام کی جڑیں کتنی مضبوط تھیں۔

16.5.2 جین مذہب

مغل عہد حکومت میں جین مذہب کے خاص اثر کا علاقہ گجرات تھا، پھر بھی اس مذہب کے لوگ دوسری جگہوں پر بھی مل جاتے تھے۔ جین مذہب کی تحریریں گجراتی، سنسکرت، پراکرت، برج، کنڑا اور دوسری زبانوں میں ملتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ یا تو مقدس ہستیوں کے حالات پر مبنی تحریریں ہیں یا پھر ہر کتاب یکساں باتیں دہراتی ہے۔ مغل عہد حکومت میں جدلیات کے بارے میں

جینیوں کا تصور سب سے پہلے یشو وجیا جی نے 1670ء میں لکھی اپنی کتاب 'جین ترک بھاشا' میں پیش کیا۔ مغل عہد میں یشو وجیا جی نے کئی اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ وجے نگر سلطنت میں جینیوں کے دونوں فرقے شویتامبر اور دیگامبر پھل پھول رہے تھے۔ جین پروہتوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اکبر کے دربار میں ان کے بڑے اثر و رسوخ تھے۔ اس عہد میں جین فرقے کے عام لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنیہ اور بوہرہ ذاتوں کے تاجروں تک محدود ہوتے گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اناج فروخت کرتے تھے اور کچھ نوکری پیشہ بھی تھے۔

16.5.3 سکھ مذہب

سولہویں صدی عیسوی میں سکھ مذہب دنیا کے منظر نامے پر ظاہر ہوا اور اب اس کا شمار دنیا کے چند معروف مذاہب میں ہوتا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا گرونانک کے مریدوں پر مشتمل ایک فرقے کی طرح ہوئی تھی۔ گرونانک پنجاب کے ایک کھتری تھے۔ اس فرقے کے وجود میں آنے کی تاریخ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس زمانے کے دوسرے وحدانیت پرست عوامی فرقوں کی تھی۔ سکھوں کی مقدس کتاب 'گروگرنتھ صاحب' میں گرونانک اور بعد کے دوسرے گروؤں کا کلام شامل ہے، اسے گرو ارجن دیو نے 1604ء میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں سکھ گروؤں کے علاوہ مسلمان صوفی شیخ فرید اور نام دیو، کبیر، رام دیو اور بعض دوسرے بھگتوں کے کلام اسی طرح شامل ہیں، جس طرح ان کو دادو پنتھیوں کی کتاب 'پنچ وانی' اور رجب داس کی 'سربنگی' میں جگہ ملی ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کم سے کم سترہویں صدی کی ابتدا تک گرونانک کے مریدوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ وہ وحدانیت سے عبارت رجحان کا ایک حصہ ہیں۔ گرچہ چند ایسی باتیں ضرور تھیں، جو نہ صرف طرز بیان کی رعایت سے بلکہ بعض اہم مسائل پر بھی اس عمومی رجحان میں شامل عناصر کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔

گرونانک کی تعلیمات اور ان کے نظریات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کے نظریے کے مطابق خدا اور اس کے ماننے والے کے درمیان ایک بہت ذاتی قسم کا رشتہ ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے رب کی خدمت اور اس نے محبت کے ذریعے اس کے لطف و کرم سے نوازا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ تصور بھی ہے کہ خدا کی کوئی شکل نہیں ہے مگر وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کو کسی بھی مادّی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ان کی تعلیمات بت پرستی اور اس سے متعلق رسوم کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے۔ نانک نے اخلاقیات پر بھی بہت زور دیا ہے، خاص طور پر دوسرے انسان کے ساتھ مہربانی کے سلوک کو اہمیت دی گئی ہے۔ انھوں نے پیدائشی فضیلت کے غرور، ذات پات کے درمیان اونچ نیچ کے فرق اور اس کے پیچھے کارفرما پاک اور نجس کے تصورات کی سخت مذمت کی ہے۔ ان کی تعلیمات کے مطابق نجات 'نروان' یا 'سچ کھنڈ' میں پہنچ کر ہی ملتی ہے۔ جہاں بالآخر انسان اپنے رب کو پوری طرح محسوس کر پاتا ہے۔

یہ واضح نہیں ہے کہ گرونانک نے اپنے اس فرقہ یا پینتھ کو کس حد تک ایک تنظیم کی شکل دی تھی اور یہ بھی پوری طرح صاف نہیں ہے کہ ان کے ارشادات یعنی 'جپ جی' میں لفظ 'گرو' کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب 'خدا' ہے یا صرف ایک 'مرشد' جو روحانیت یا خدا کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن جلد ہی اس فرقے میں دو طرح کے حالات پیدا ہو گئے۔ اول گروؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو نانک کے جانشین کہلائے۔ ان کا مرتبہ بلند ہو کر سچ گرو کے اوتار کے مقام تک پہنچ گیا تھا۔ ہر مرید سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ 'گرو' کی مکمل اطاعت کرے۔ اسی رعایت سے ان کے مرید کو 'سکھ گرو' کہا جاتا تھا۔ نئی حالت کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس فرقے کا اثر جاٹ کسانوں میں تیزی سے پھیلا۔ گرچہ سکھ مذہب کے سبھی گرو کھتری ذات سے تعلق رکھتے تھے لیکن سترہویں صدی میں اُن کے 'مسند' یعنی اہم نائب زیادہ تر جاٹ تھے۔ نئے حالات نے

سکھ فرقے کے لیے ایک نئی صورت حال پیدا کردی یعنی ایک ہتھیار بند طاقت ور گروہ کی حیثیت سے ابھرنے کے لیے میدان تیار ہوگیا۔ 1606ء میں گرو ارجن دیو کی شہادت کے بعد مغل حکام کے خلاف جنگ کو زیادہ عرصے تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ سکھ گروؤں کی فوجی طاقت آخری گرو، گرو گوبند سنگھ (1708ء-1666ء) کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ 1699ء میں انھوں نے اپنے مریدوں کو ایک نئی طرح کی جنگجو تنظیم خالصہ کی شکل دے دی۔ انھوں نے اس کے لیے ان سے ایک طرح کی بپتسمہ کی رسم ادا کروائی، چاہے وہ انسانی سماج کے کسی بھی ذات یا طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اب یہ لازمی قرار دیا گیا کہ ہر سکھ اپنے ساتھ ہمیشہ چند چیزیں رکھے گا، جن میں کرپان شامل تھی، جو اس عہد میں ایک سپاہی پیشہ فرد کی پہچان بن گئی تھی۔

16.5.4 اسلام

مغل عہد حکومت میں اسلام ہندوستان کا دوسرا بڑا مذہب تھا۔ اس کے ساتھ حکمرانوں کا مذہب ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی اسلام کو مغل حکومت کا سرکاری مذہب نہیں قرار دیا جاسکتا، کیوں اسلام حکمرانوں کا مذہب ضرور تھا لیکن انھوں نے کبھی بھی اسے سرکاری یا حکومتی مذہب کے بطور عوام الناس پر نہیں تھوپا بلکہ انھوں نے مذہبی رواداری کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو یہ حق دیا کہ وہ جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔ اسی وجہ سے ہمیں مغل عہد کے ہندوستان میں مذہبی تکثیریت کا فروغ بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے اور مختلف مذاہب کی مذہبی تحریکیں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

نظریاتی طور پر ہندوستان میں اسلام کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ عربی وفارسی زبانوں کے ذریعے پھیلنے والے اپنے مرکزی میلان سے اتنا زیادہ قریب تھا کہ اس کے لیے 'ہندوستانی اسلام' کی اصطلاح کا استعمال شاید پوری طرح صحیح نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ اصطلاح اس کی دوسرے اسلامی رجحانات سے دوری کا اشتباہ پیدا کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس میں رسوم اور اعتقادات کی جو تصریحات موجود ہیں وہ بڑی حد تک اس حقیقت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں کہ عرب ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کی ایران اور وسط ایشیا سے زیادہ قربت رہی ہے۔ ساتھ ہی یہاں پر اسلام کے ساتھ ہندو مذہب کی ایک لمبے عرصے تک ہم موجودگی نے ایک دوسرے پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ خاص طور پر اسلام اور ہندو مذہب کے آپسی میل جول میں تصوف نے بڑا اہم کردار انجام دیا۔ تصوف کے جو سلسلے ایران اور وسط ایشیا سے ہندوستان پہنچے تھے، ان کے لیے ہندوستان کی فضا بہت سازگار ثابت ہوئی اور سولھویں صدی کے آنے تک مذہب اسلام کے زیادہ تر راسخ العقیدہ عالموں نے تصوف کو ایک قابل قبول روحانی تربیت کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ وہ اسلامی شریعت، قانون اور رسوم کے تقاضوں پر پورا اترے۔ لیکن یہ آسان ذہنی سمجھوتہ اس وقت یکسر ٹوٹ گیا جب تصوف نے اپنے دروازے ابن عربی کے 'ہمہ اوست' سے عبارت خیالات کے لیے کھول دیے۔ ان کے 'وحدت الوجود' کے نظریے نے چودھویں صدی کے اواخر سے ہندوستانی صوفیوں کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا اور سخت مخالفت کے باوجود تواتر سے لوگ اس نظریے کو تسلیم کرتے گئے۔ نتیجتاً ہندوستان میں اسلام کی مختلف ہندو روایتوں کے ساتھ ہم موجودگی نے اس کے اپنے اعتقادات اور نظریات کے بارے میں مختلف قسم کے اندرونی سوالات کھڑے کردیے اور ایسی حالت میں ابن عربی کے نظریات اس ملک میں پائی جانے والی متنوع صورت حال کی ایک قابل قبول توضیح میں مدد کرتے ہیں۔ ابن عربی کے اس نظریے کی رو سے نظر آنے والی متنوع صورت حال محض ایک فریب نظر ہے، ساتھ ہی یہ نظریہ 'انسان کامل' کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس تصور کے ذریعے ابن

عربی کسی مرشد کامل یا شیخ کے مثالی رول کی توضیح کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مرشد اپنی جگہ پر ایک کائنات ہے، جس میں وہ خود اپنے آپ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کشف ہے جس سے مہدی کا تصور اگر نکلتا نہیں تو کم از کم مضبوط ضرور ہوتا ہے۔ یعنی یہ تصور کہ روز قیامت سے پہلے ایک مصلح کا ظہور ہوگا۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو عام مسلمانوں کے اعتقادات کا حصہ ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں یہ دونوں تصورات یعنی 'انسان کامل' اور 'مہدی' ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جیسے جیسے اسلامی تاریخ کے ہزار سال کا اختتام قریب آیا، ہزار سالہ تحریکوں کے ابھرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہندوستانی تاریخ میں مہدوی تحریک اسی قسم کی دانشورانہ اتھل پتھل کا پیش خیمہ تھی۔ سید محمد جون پوری (1504-1443ء) اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے، انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ عوام الناس کی ایک بڑی تعداد اس امید میں کہ مہدی کے بتائے ہوئے راستے اور اخلاقی اطوار کو اختیار کرکے نجات حاصل کی جاسکتی ہے، اس فرقے میں شمولیت اختیار کرتی گئی' ان لوگوں نے مختلف جگہوں پر اپنے دائرے قائم کیے۔ علماء برابر ان کی مذمت کرتے رہے لیکن یہ فرقہ موجود رہا۔

سولہویں صدی کی آخری دہائیوں کے دوران مغل حکومت کے صوبہ کابل میں ایک اور فرقہ وجود میں آیا۔ یہ لوگ بھی اسلامی کلنڈر کے ایک ہزار سالہ تحریک کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے۔ بس ان میں فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے مرشد بایزید میاں پیر روشن (1585-1525ء) نے مہدی ہونے کے بجائے نبوت کا دعویٰ کیا۔ وہ تصوف کی طرف راغب ہونے کے سبب وحدت الوجودی نظریے کے قائل تھے اور 'سکونت' یعنی وہ حالت جب سالک خدا کی ذات میں ضم ہوجائے، تک پہنچ جانے کو اپنا مقصد سمجھتے تھے۔ بایزید کسی بھی ایسے شخص کو برداشت نہیں کرتے تھے جو ان کے پیغام کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اس صورت حال نے بالآخر روشنیہ فرقے کو افغانوں کی ایک جنگجو تحریک بنادیا۔ بایزید روشن نے اپنی کتاب 'خیر البیان' پشتو زبان میں تحریر کی ہے۔ روشنیہ فرقے کے جنگجو رویے کے نتیجے میں ان کو مغلوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑنا پڑی، جس کا اختتام ان کی مکمل شکست کی صورت میں ہوا۔

اکبر کے عہد حکومت (1605-1556ء) میں مذہبی افکار و خیالات کی سطح پر جو زبردست دھماکے ہوئے، ان کی ابتدا کسی حد تک ان فکری محرکات یعنی وحدت الوجود اور مہدویت میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اکبر کی ابتدائی مذہبی دلچسپی روایتی اسلام کے دائرے میں ہی تھی۔ اس نے مشہور شہر فتح پور سیکری، جہاں سب سے شاندار عمارت جامع مسجد کی ہے 1570 میں شیخ سلیم چشتی کے اعزاز میں تعمیر کروایا تھا۔ 1570ء میں شیخ تاج الدین نے، جو ابن عربی کے خیالات کے حامی تھے، ان کے نظریات کو دربار میں متعارف کرایا۔ شیخ مبارک (وفات 1593ء) جو نہ صرف شہاب الدین مقتول کی اشراقی تعلیمات سے واقفیت رکھتے تھے بلکہ ان کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ مہدویت سے متاثر تھے، اسی دوران دربار میں ان کا اثر بھی بڑھنا شروع ہوگیا تھا۔ 1582ء میں اکبر نے حکم جاری کیا کہ 'تاریخ الفی' مرتب کی جائے، جو محمدؐ کی رحلت کے بعد گزرے ہزار برسوں کی تاریخی واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس حکم کے پس پردہ عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ محمدؐ کی رحلت کے پہلے ہزار سال کے آخر میں کوئی بڑی تبدیلی ہوگی، جس کے لیے کسی مجدد کا ظہور لازمی ہے۔ کوشش یہی تھی کہ اکبر کو ایک مصلح کے طور پر پیش کیا جائے اور دوسری طرف اس کو ابن عربی کی روایت کے 'انسان کامل' کے پیکر میں بھی دیکھنا تھا۔ 'انسان کامل' کے تصور کو استعمال کرنے کی ایک ابتدائی کوشش وہ تھی جو 1579ء کے محضر میں ملتی ہے۔ یہ ایک بیان تھا، جس پر درباری علماء کے دستخط تھے۔ اس میں یہ اعلان کیا

گیا تھا کہ بحیثیت ایک منصف سلطان کے اکبر کو مسلم قانون کی تعبیر وتوجیہ کرنے کا حق ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے اس تعبیر وتوجیہ کو تسلیم کرنا لازمی ہوگا۔

لیکن وحدت الوجود کے بڑھتے ہوئے اثرات کے نتیجے میں جلد ہی معاملات اس صورت حال سے بہت آگے نکل گئے، جس میں محضر کے ذریعے شہنشاہ کو بعض محدود قسم کے اختیارات دیے گئے تھے۔ اکبر کی موجودگی میں اب سنی علماء کے نمائندوں کے درمیان مباحث شروع ہوئے۔ یہ مباحث فتح پور سیکری میں واقع ایک مخصوص عمارت 'عبادت خانہ' میں پیش آتے تھے۔ پھر ان مباحث میں مختلف فرقوں کے مسلم علماء یعنی شیعہ، سنی اور صوفی کے علاوہ معقولات کے عالم بھی شریک ہونے لگے۔ اس کے کچھ عرصے بعد برہمن عالم، ہندو سنیاسی، جینی، پارسی اور عیسائی بھی شریک ہونے لگے۔ عیسائی اکبر کے دربار میں پہلی بار 1580ء میں پہنچے۔ ان مباحث کے نتیجے میں اکبر کے مذہبی نظریات تبدیل ہونے شروع ہوئے اور اسے اس بات کا یقین ہو چلا کہ اسلام کی کوئی ایک تعبیر ایسی نہیں جو پوری طرح یا قریب قریب صحیح ہو۔ اسے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ کوئی ایک مذہب اکیلا سچا مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے خیال میں سبھی مذاہب حق کے ایک مرکز سے کسی نہ کسی حد تک روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ اللہ کی طرف سے ایک مخصوص بااختیار انسان کی حیثیت میں اس کی ذمے داری ہے کہ مختلف مذاہب اور گروہوں کے درمیان بے مقصد تنازعوں کو ختم کرنے کے لیے ان کے درمیان 'صلح کل' قائم کرے۔ اپنے مریدین وتبعین کے لیے اکبر نے یہ تجویز کیا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ اور پیر ومرشد کی مکمل اطاعت کریں۔ ان کے لیے جو ضابطۂ اطوار تیار کیا گیا تھا، اس کو جہاں گیر نے مختصراً ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''مریدین وتبعین پر واجب ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے عداوت میں اپنے اوقات ضائع نہ کریں۔ تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں انھیں 'صلح کل' کی راہ پر گام زن رہنا چاہیے۔ انھیں اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو مارنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ انھیں میدان جنگ اور شکار کے علاوہ کسی اور جگہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر نہیں جانا چاہیے۔ سورج اور چاند کی عزت کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ دونوں اپنے مقدور کے مطابق خدائی روشنی پھیلاتے ہیں۔ خدا کو ہر حال میں خالق حقیقی اور علت دائم تسلیم کرنا چاہیے اور ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اکیلے ہو یا دوسروں کے ساتھ، اس کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی خدا سے ہٹنے نہ پائے۔''

اکبر نے تمام مذاہب کے ساتھ یکساں سلوک کیے جانے کی پالیسی اختیار کی تھی، جو ان کو محض انگیز کر لینے کے رویے سے بہت مختلف چیز تھی۔ یہ پالیسی ان نئے خیالات سے مطابقت رکھتی تھی جو اکبر نے 1580ء کی دہائی میں اختیار کیے تھے۔ اس پالیسی کے مطابق مذہبی خیالات کے اظہار کی مکمل آزادی، تبدیلی مذہب اور مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت دی گئی تھی۔ اکبر کے خیالات میں یہ تبدیلی اس صورت حال سے بھی متعین ہوئی کہ سیاسی لحاظ سے مذہبی رواداری کا رویہ بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی پالیسی اس زمانے سے بہت پہلے ہی اختیار کر چکا تھا، جب اپنی زندگی کے آخری پچیس برسوں میں اس نے ایک نیا ترقی یافتہ فلسفۂ زندگی اختیار کیا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے اعلان کیا کہ بادشاہیت 'فرّ ایزدی' یعنی وہ روشنی ہے جو ذات باری تعالیٰ کا حصہ ہے اور حکمراں خدا کی طرح تمام انسانیت کا پرورش کرنے والا ہے۔ اس لیے حکمراں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں مذہبی اختلافات کی بنا پر آپسی نفرت کی دھول نہ اڑے۔ اس بیان کے بارے میں یہ بات قابل غور ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی فلسفیانہ یا مذہبی روایت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے تانے بانے حکمراں کی مطلق العنانی سے عبارت اختیارات اور رعایا کو مطمئن رکھنے کی اس کی ذمے داریوں سے ملتے ہیں۔

مغل دربار میں صلح کل اور وحدت الوجود جیسے تصورات کی اشاعت کے اہم نتائج برآمد ہوئے اور سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ یکا یک ملک بھر میں دینیات اور اخلاقیات کے نہایت نازک پہلوؤں کو لے کر مسلمہ اور مروّجہ اعتقادات پر تنقید کی جانے لگی۔ اس بحث نے اسلامی حلقوں میں شیعیت کے رجحان کے لیے ایک جگہ پیدا کر دی۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے بھی شیعہ اور سنّی فرقوں کے درمیان معاندانہ بحث جاری تھی۔ لیکن اس صورت حال کے نتیجے میں جہاں ایک طرف راسخ العقیدہ مذہبی نقطہ نظر کو شدت اور اصرار کے ساتھ بیان کیا گیا، وہیں دوسری طرف اس رجحان نے سائنسی اور معقولیت میں عام دلچسپی کو نئے سرے سے بڑھاوا دیا۔ بالآخر مسلمانوں میں ایک نہایت اہم تحریک یہ پیدا ہوئی کہ ہندو مذہبی تحریروں اور ان کے یہاں پائی جانے والی وحدانیت کا مطالعہ یہ سمجھنے کے لیے کیا جائے کہ ہندوؤں میں 'حق' کا کیا تصور ہے؟ اکبر نے کئی سنسکرت تحریروں کے ترجمے کروائے، جن میں 'اتھرو وید، مہابھارت، رامائن' اور 'یوگ وششٹھ' جیسی تحریریں شامل تھیں۔ 'آئین اکبری' میں ابوالفضل نے فلسفہ کے مختلف ہندو مدارس فکر، ان کی دینیات، اعتقادات اور قوانین وغیرہ کا بھی نہایت درست اور اچھے انداز میں تذکرہ کیا ہے، جو قدیم تحریروں کے جدید مطالعے پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق قدیم تحریریں کا ترجمہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ لیکن ان تحریروں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوا کہ اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ابوالفضل کے بقول: ''گرچہ بعض مطالب اور دلائل میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن یہ ظاہر ہو گیا کہ ہندو بھی خدا کی عبادت اور وحدت میں یقین رکھتے ہیں۔''

مغل عہد میں مسلمانوں کی طرف سے ہندو مذہب کو سمجھنے کی کوششوں کا نقطۂ عروج داراشکوہ (1659-1615ء) کی دانشورانہ کارگزاریوں میں ملتا ہے۔ داراشکوہ نے اپنی دانشورانہ روش کی ابتدا مسلم تصوف کے مطالعے سے کی، جس کے دوران وہ میاں میر (وفات 1636ء) اور ملا شاہ بدخشی (وفات 1661ء) کے ذریعہ قادریہ سلسلے سے متعلق ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدائی تحریریں مسلم صوفیوں کے حالات سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن وحدانیت کے تصور اور صوفیوں کے اطوار میں اس کی دلچسپی نے بالآخر اس کو 55-1654ء میں 'مجمع البحرین' تصنیف کرنے پر آمادہ کیا۔ اس تحریر میں داراشکوہ نے ہندو روحانیت پر مرکوز بیانات میں استعمال ہونے والے اہم الفاظ اور تصورات کی توضیح کی ہے۔ اس توضیح میں داراشکوہ کا موقف بلکہ اصرار ہے کہ تلاش حق میں سرگرداں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے علاوہ ہر چیز یکساں ہے۔ 1657ء میں اس نے اپنشدوں کا ترجمہ 'سرالاسرار' کے عنوان سے کیا۔ اس کتاب میں سنسکرت کی بعض وقیع تحریروں کا نہایت صحیح ترجمہ ملتا ہے۔ فلسفیانہ نقطہ نظر سے تحریر کی گئی یہ اس کی سب سے اہم کوشش تھی۔ 56-1655ء میں داراشکوہ کی ایما پر حبیب اللہ نے 'یوگ وششٹھ' کا ایک نیا ترجمہ کیا۔

مغل دور حکومت کی علمی فضا کی نمائندگی اس عہد میں مذہب کے موضوع پر تحریر ہونے والی کتاب 'دبستان' کرتی ہے۔ اس کتاب کو 1653ء میں ایک ایسے مصنف نے تالیف کیا جسے اپنا نام اور مذہب ظاہر کرنے میں تامل تھا، لیکن اس نے اپنی اس تحریر میں کئی ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پارسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا تخلص 'موبد' تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ تمام مذاہب کا سچائی پر مبنی اور ہر قسم کے تعصب سے مبرا حال تحریر کرے۔ اس نے اپنی کتاب میں پارسی، ہندو، بدھ، یہودی، عیسائی اور اسلام جیسے مذاہب کے احوال کے ساتھ ان میں سے ہر مذہبی روایت کے اندر موجود مختلف فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس موضوع پر زیادہ تر مواد مصنف نے خود یکجا کیا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے ہر مذہب اور فرقہ کی نمائندہ تحریروں کے مطالعے کے علاوہ ان مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے گفتگو کے ذریعے

بھی اطلاعات جمع کی تھیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کئی زبانوں پر خاصا عبور حاصل تھا۔گرچہ 'دبستان' کا مصنف پارسی مذہب کا فرد تھا لیکن جس زبان میں اس نے اپنی کتاب تصنیف کی اس کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ اس کتاب کے بے شمار مخطوطوں کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فارسی پڑھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول تھی، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

اکبر کے عہد حکومت میں مذہب اور مباحث کی جو آزادی فراہم کی گئی تھی اس کے نتیجے میں شیعیت کو ایک گمراہ کن فرقے کے بجائے ہندوستان میں اسلام کی ایک مختلف شکل کے طور پر پہچانا جانے لگا۔قاضی نوراللہ شستری (1549-1610ء) پہلے اثنا عشری عالم ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں اپنی اہم تصنیفات چھوڑی ہیں۔انھوں نے تقیہ کے رویے کو برطرف کرتے ہوئے کھل کر شیعی اعتقادات کے دفاع اور فروغ میں سنی نکتہ چینی کا جواب دیا۔ان کے لیے ایسا کرنا اس لیے ممکن ہوسکا کہ اکبر نے مذہبی آزادی کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جہاں گیر کے حکم سے جسمانی ایذا پہنچائے جانے کے نتیجے میں 1610ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔اس بنا پر انھیں شیعہ فرقے کے شہیدوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ایران سے نقل مکانی کر کے آنے والے بہت سے افراد، جو زیادہ تر شیعہ تھے، مغل سلطنت میں اونچے عہدوں پر فائز ہوئے اور شیعہ مذہبی رسوم کھل کر ادا کی جاتی تھیں۔سترہویں صدی عیسوی میں حیدرآباد دکن اور اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ اور فیض آباد شیعہ علوم وفنون کے اہم مرکز بن گئے تھے۔

اکبر کے دور حکومت میں مذہبی اور فکری آزادی کے جو رجحانات اور میلانات ابھر کر سامنے آئے ان کے خلاف سنی مسلمانوں کے تقلیدی گروہ نے مختلف زاویوں سے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔یہ ردعمل کتنے شدید اور متفرق تھے، اس کا اندازہ شیخ احمد سرہندی (1564-1624ء) کے افکار وخیالات سے لگایا جاسکتا ہے۔ان کی سب سے پہلی دستیاب تحریر 'رسالہ ردّ روافض' میں شیعہ اعتقادات کی تردید کی کوشش ہے۔شریعت سے متعلق ان کے متشددانہ انداز فکر کا اظہار اکبر کی روادارانہ سیاسی حکمت عملی کے ردّعمل میں ہندوؤں اور ہندو اعتقادات کی سخت تنقید کی صورت میں ظاہر ہوا۔اکبر کے انتقال کے بعد لکھے گئے اپنے خطوط میں انھوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔لیکن اسی دوران 1600ء میں وہ نقش بندی صوفی باقی باللہ (وفات 1603ء) کے مرید بن گئے۔اس کے بعد انھیں ابن عربی کے وحدت الوجود اور انسان کامل کے تصورات سے ماخوذ نظریات میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔لیکن ان نظریات کو انھوں نے محض فروعی طور پر تسلیم کیا۔ان کا دعویٰ تھا کہ سالک کو اس نظریے کے ماوراء جا کر ہجر کی تکلیف کا تجربہ کرنا چاہیے۔ان کے لیے وحدت الوجود کا مطلب تھا 'وحدت الشہود'۔کیوں کہ بالآخر ان کی نظر میں ذات باری تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ان کے مطابق شریعت کی سختی کے ساتھ پابندی ایک صوفی کے لیے اتنی ہی لازمی ہے جتنی کسی دوسرے شخص کے لیے اور اس کے ساتھ وہ ہر قسم کی بدعتوں اور خرافات کی مذمت کرتے تھے۔اورنگ زیب نے عام طور پر روایتی اسلام کے شرعی احکام کو زیادہ اہمیت دی۔ اس بات کی سب سے عمدہ مثال اسلامی شریعت اور قانون کے موضوع پر اس کے ذریعے تیار کروائی گئی کتاب 'فتاویٰ عالم گیری' ہے۔اس کتاب کو شیخ نظام نے عالموں کی ایک پوری جماعت کی مدد سے عربی زبان میں اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ مختلف مسائل پر فقہاء کی آرا کا ایک مثالی مجموعہ بن جائے۔اس کتاب میں مسائل کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

16.5.5 عیسائیت

ہندوستان میں مغل دور حکومت میں پائے جانے والے مذاہب میں ایک اہم نام عیسائیت کا بھی ہے۔یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد اور خاص طور پر نو آبادیاتی عہد کی ابتدا میں دنیا میں عیسائیت کا عروج بڑے پیمانے پر شروع ہوا، لیکن ان تمام سے پیش تر کیرالا کے ساحل پر ایک لمبے

عرصہ سے عیسائی اور یہودی مذہب کے لوگ رہتے چلے آرہے تھے اور بحر احمر سے ہونے والی تجارت کے ذریعے ان لوگوں کا عیسائیت اور یہودی مذہب کی مشرقی شاخوں سے تعلق قائم رہا۔ پرتگالی تاجروں کے ساتھ ہندوستان میں کیتھولک عیسائیت کا بھی ظہور ہوا۔ فرانسس زیویر (1506-1552ء) پہلا عظیم کیتھولک مبلغ تھا جو ہندوستان آیا۔ اٹلی کے رہنے والے ایک دوسرے عیسائی مشنری رابرٹ ڈی نوبلی (1577-1656ء) نے عیسائیت کو ہندوستانی طرز میں پیش کرنے کی غرض سے اونچی ذاتوں اور دلتوں کے لیے الگ الگ کلیسے قائم کیے۔ عیسائیت سے متعلق تحریروں کو ہندوستانی زبانوں میں شائع کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں نے چھاپہ خانے کا استعمال کیا۔ 1557ء میں گوا کو آرچ ڈیوسیز (Archdiocese) یعنی ایک آرچ بشپ کے رہنے کے مقام کا درجہ مل گیا۔ پرتگال کے زوال کا اثر ہندوستان کے کیتھولک کلیسا کی کارکردگی پر بھی پڑا۔ سیرین عیسائیوں کے کئی گروہوں نے جو پرتگالیوں کے زیر اثر پاپائے روم کو اپنا سربراہ تسلیم کر چکے تھے 1653ء میں دوبارہ اینٹوک (Antioch) سے اپنا تعلق قائم کر لیا۔ 1759ء میں پرتگال نے بھی عیسائی سلسلے کو غیر قانونی قرار دے دیا، لیکن ایک لمبے عرصے تک کیتھولک عیسائی فرقہ ہی نصرانی عقائد کا واحد ایسا گروہ تھا، جس سے ہندوستان کے لوگ واقف تھے۔ 'دبستان مذاہب' کے نصرانی عقائد کے باب میں کیتھولک تعلیمات کا بہت ہی صحیح اور تفصیلی بیان ملتا ہے لیکن اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک سے قطعی ناواقف تھا۔

مارٹن لوتھر کی تعلیمات کو پھیلانے والے پہلے مشنری ڈنمارک کے تاجروں کے ساتھ 1706ء میں تامل ناڈو کے ٹرانکوبر نامی مقام پر پہنچے۔ ان مشنریوں میں ایک زی گنبا لگ (Ziegenbalg) تھا، جس نے 1714ء میں چاروں آسمانی کتابوں کا تامل زبان میں ترجمہ کیا۔ ابتدائی ادوار میں ہندوستان میں فروغ پانے والے ہندو اور مسلم دونوں قسم کے مذہبی افکار پر عیسائیت کا بہت کم اثر پڑا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے عیسائیت کے اثرات کسی قدر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔

16.6 خلاصہ

اس اکائی کے خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مغل دور حکومت میں حکمرانوں نے اپنی عوام کو انصاف کی فراہمی کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں کیں۔ اس کے لیے انھوں نے مغل انتظامی ڈھانچے کی بنیادی اکائی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک مختلف قسم کی عدالتوں کا سلسلہ قائم کیا تا کہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی قسم کی پریشانی اور ایذا نہ پہنچے۔ ان عدالتوں کو فعال بنانے کے لیے انھوں نے ان میں مختلف قسم کے افسروں، عہدیداروں اور کارکنان کا تقرر کیا۔ تا کہ عوام کو اپنے معاملات کا فوری حل مل سکے۔ مغل دور کی سماجی حالت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ کے پچھلے ادوار کی طرح اس دور میں بھی معاشرہ مختلف طبقات میں منقسم رہا۔ گرچہ مغلوں نے سماج کے طبقاتی نظام کے ان بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن انھیں اپنے اس مقصد میں کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی اور لوگ اونچی نیچی ذاتوں میں ہی منقسم رہے۔ حرفے اور پیشے کی بنیاد پر ہی لوگوں کی پہچان ہوتی رہی۔ مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت بہت حد تک قابل رشک شمار کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عہد کی سب سے اہم بات مذہبی تکثیریت ہے۔ مغلوں نے عوام الناس کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے اعتبار سے جس مذہب کو چاہیں مانیں، جس کی چاہیں عبادت کریں۔ اس عہد میں مذہبی افکار و نظریات کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ نئی تحریکیں وجود میں آئیں اور انھوں نے لوگوں کو مذہب کے معاملات میں کھل کر غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔

16.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1۔ مغل عہد حکومت کے عدالتی نظام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

2۔ صوبائی سطح پر مغل عہد حکومت میں کس کس طرح کی عدالتیں قائم تھیں؟ بیان کیجیے۔

3۔ مغل دور کی سماجی حالت پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4۔ مغل سماج میں حکمراں طبقے کو ملنے والی مراعات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت کا تجزیہ کیجیے۔

6۔ مغل عہد میں مذہب اسلام کی کیا حالت تھی؟ بیان کیجیے۔

16.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی، ابن حسن، اردو ترجمہ: عبدالغنی نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور

2۔ آئین اکبری، ابوالفضل، اردو ترجمہ: مولوی محمد فدا علی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

3۔ عہد وسطیٰ کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ، عرفان حبیب، اردو ترجمہ: اقتدار عالم خاں، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی

4۔ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، بی این پانڈے، اردو ترجمہ: تقی رحیم، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1998

5۔ مغل ہندوستان کا طریق زراعت، عرفان حبیب، اردو ترجمہ: جمال محمد صدیقی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی

6۔ مغل دربار، ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور

7۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

8۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

اکائی 17 : علمی خدمات، فنون لطیفہ اور فن تعمیر

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مغل عہد کی ثقافتی زندگی سے روشناس کرانا ہے تا کہ انھیں اس بات کا علم ہو سکے کہ مغل دور میں نظام تعلیم کیسا تھا اور اس عہد میں کس طرح کے علمی، ادبی و سائنسی کارنامے انجام دیے گئے؟ مغل دور کی اہم علمی شخصیات سے طلبہ کو متعارف کرانا بھی اس اکائی کا

ایک اہم مقصد ہے۔ ساتھ ہی اس اکائی کا مقصد طلبہ کو فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے ان نمونوں سے بھی متعارف کرانا ہے، جن کا اظہار مغل دور میں ہوا تاکہ طلبہ مغل دور کی اس ثقافتی ترقی سے بخوبی واقف ہوسکیں جو مغل سلطنت کا ایک شان دار باب رہی ہیں اور جو آج بھی اپنے زائرین اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔

17.2 تمہید

مغل سلطنت جو 1526ء میں اپنے قیام کے بعد تقریباً تین سو سال سے کچھ زیادہ عرصے تک قائم رہی، اس نے ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں غیر معمولی اضافے کیے۔ مغل حکمرانوں نے نہ صرف پورے ملک میں علم و تعلیم کی فضا ہموار کی بلکہ خود بھی اس کے سرپرستوں میں شامل رہے۔ علم و ادب، سائنس و حکمت اور فنون لطیفہ و فن تعمیر سے مغل حکمرانوں کی خصوصی دلچسپی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پورے ملک میں اس کا چلن عام ہوگیا۔ امراء سے لے کر عوام الناس تک سبھی نے اس کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا اور چند ہی برسوں میں پورے ملک میں نہ صرف تعلیم و تعلم، علم و دانش اور سائنس و حکمت کا چلن عام ہوگیا بلکہ ملک کے کونے کونے میں فن لطیف اور فن عمارت سازی کے نمونوں کی شکل میں تہذیبی و ثقافتی ترقی کی پوری فضا ہموار ہوگئی۔ مغل دور کی تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علم و سائنس اور فنون لطیفہ و فن تعمیر کے میدان میں جتنے اہم کارنامے اس دور میں انجام دیے گئے، شاید اس سے پہلے کی ہندوستانی تاریخ میں اتنے اہم کارنامے انجام نہیں دیے گئے تھے۔ اس وجہ سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں مغل عہد اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

17.3 مغل عہد میں تعلیمی ترقی

مغل حکمراں تعلیم کے بڑے سرپرست تھے اور انھوں نے اپنی حکومت میں اس کے فروغ کے لیے خصوصی توجہ دی۔ مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر خود اپنے عہد کا ایک عظیم دانشور تھا۔ وہ نہ صرف عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ایک بڑا عالم تھا بلکہ ایک باریک بیں نقاد بھی تھا۔ بابر نے ملک کے عوام کی ہمہ جہت ترقی اور ان کی بھلائی کے لیے جو نظام رائج کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے ادوار میں بھی جاری رہا۔ بابر کے وزیر سید معتبر علی کی کتاب 'تواریخ' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے محکمہ تعمیرات عامہ کو اس کے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سپرد کیا گیا تھا کہ وہ مدارس اور دارالعلوم تعمیر کرے۔ یہ محکمہ بعد کے مغل حکمرانوں کے ادوار میں بھی باقی رہا۔ اس حقیقت سے کہ تعلیمی عمارتوں کی تعمیر کا کام مملکت کے ایک محکمے کے فرائض میں شامل کیا گیا تھا، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمی امور پر توجہ دیتی تھی۔ بابر کے بیٹے اور جانشین نصیر الدین محمد ہمایوں کو بھی علم اور کتابوں کے مطالعے کا بڑا شوق تھا، علم فلکیات اور جغرافیہ میں اس کی خصوصی دلچسپی تھی۔ ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور دہلی کے پرانے قلعے میں شیر شاہ سوری کے ذریعے تعمیر کردہ عمارت شیر منڈل کو، جو عیش و نشاط کے لیے استعمال ہوتی تھی، ایک کتب خانے میں تبدیل کر دیا۔ اسی کے ساتھ مختلف تاریخی حوالوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کا مشہور مقبرہ بھی کسی زمانے میں درس گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

جلال الدین محمد اکبر کا عہد اپنی ہمہ جہت ترقیات کے لیے مشہور ہے، اس دور میں تعلیم اور اس کے فروغ کے لیے نئے زاویے اختیار کیے گئے۔ اکبر نے اعلیٰ تعلیم کے بہت سے ادارے آگرہ اور فتح پور سیکری میں قائم کیے۔ اسی بنیاد پر ابوالفضل کا یہ بیان ہے کہ ''تمام مہذب قومیں

اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کرتی ہیں، لیکن خصوصی طور پر ہندوستان اپنی درس گاہوں کے لیے مشہور ہے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک پہاڑی پر ایک تعلیمی ادارہ تعمیر کرایا۔ ایسا شان دار تعلیمی ادارہ شاید ہی کسی سیاح نے کسی دوسرے مقام پر دیکھا ہو۔ لالہ سیل چند کا بیان شاید اسی مدرسے کے بارے میں ہو جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ''اکبر نے اجمیر سے واپسی پر فتح پور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بہت سی عمارتیں وہاں تعمیر کیں، جن میں مدرسہ اور خانقاہ وغیرہ شامل ہیں۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم تعلیمی ادارے کے علاوہ اس شہر میں اور بھی کئی مدرسے تھے، جن کو اکبر کی ایما پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح آگرہ میں بھی کئی مدرسے تھے۔ لالہ سیل چند نے لکھا ہے کہ ایک بہت بڑا مدرسہ اس کے عہد تک آگرہ میں موجود تھا۔ دہلی میں واقع اکبر کے عہد کا ایک مدرسہ ادہم خاں کی ماں اور اکبر کی دایہ ماہم انگا نے 969ھ/ 1561ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ماہم انگا کے اس مدرسے کے علاوہ ایک اور مدرسہ جسے خواجہ معین نامی ایک شخص نے تعمیر کرایا تھا، دہلی کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا۔

نورالدین جہاں گیر بھی ترکی اور فارسی زبان کا ایک اہم عالم تھا، اس نے اپنی آپ بیتی 'تزک جہاں گیری' کے نام سے ترتیب دی تھی۔ مورخین کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکمراں بننے کے بعد اس نے بہت سے قدیم مدارس کی مرمت کرائی اور بہت سے دوسرے مدرسے تعمیر کرائے۔ اپنی حکومت کے آخری ادوار میں اس نے ایک قانون پاس کیا کہ جب کوئی دولت مند شخص یا کوئی مسافر انتقال کر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی جائیداد حکومت کے ذریعے ضبط کر لی جائے گی اور اسے مدرسوں و خانقاہوں وغیرہ کی تعمیر اور مرمت پر خرچ کیا جائے گا۔ شہاب الدین شاہ جہاں بھی ترکی ادب کے مطالعے کا بڑا شوقین تھا، اس کا معمول تھا کہ رات میں سونے سے پہلے کتابوں کا مطالعہ ضرور کرتا تھا۔ شاہ جہاں نے 'دارالبقا' نامی ایک ادارے کی مرمت کرائی اور دہلی میں ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ نے ہر طرح کی تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔ محی الدین اورنگ زیب نے بھی مسلمانوں کی تعلیم کے فروغ کی کوشش کی، اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ 1678ء میں اورنگ زیب نے گجرات کے قدیم مدارس کی مرمت کے لیے ایک رقم منظور کی۔ اسی طرح 1697ء میں احمد آباد میں اکرام الدین خاں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک دارالعلوم تعمیر کرایا اور اورنگ زیب سے اس کے لیے مالی امداد مانگی۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے دو گاؤں موضع سعدرہ، پرگنہ سنولی میں اور موضع سیہا، پرگنہ کڑی میں جاگیر کے طور پر عطا کیے۔ اورنگ زیب کے عہد میں سیال کوٹ مسلمانوں کے علم و فضل کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور بہادر شاہ اول کے تخت نشین ہونے کے بعد سے رفاہی کاموں کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے باوجود بھی بہادر شاہ اول کے عہد میں دہلی میں دو مدرسوں کے قیام کا تذکرہ ملتا ہے۔ پہلا مدرسہ غازی الدین خاں نے قائم کیا جو دکن میں نظام خاندان کے بانی آصف جاہ کے والد تھے۔ انھوں نے دہلی کے اجمیری دروازہ کے قریب دارالعلوم تعمیر کرایا تھا۔ دوسرا مدرسہ خان فیروز جنگ نے تعمیر کرایا تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں قنوج میں بھی ایک مدرسہ قائم تھا، جو مدرسہ 'فخر المرابع' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 1722ء میں محمد شاہ کے عہد حکومت میں نواب شرف الدولہ نے دہلی میں ایک مدرسے اور ایک مسجد کی تعمیر کرائی۔ اسی طرح بعد کے ادوار یعنی عہد زوال میں بھی مغل حکمرانوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں میں مدرسے قائم کیے، جو تعلیم سے ان کی دلچسپی کا پتہ دیتے ہیں۔

17.3.1 نظام تعلیم

مغل حکومت کے تعلیمی نظام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے یہاں تعلیم کے دو مراحل تھے، ایک ابتدائی تعلیم اور

دوسری اعلیٰ تعلیم۔ مغل عہد میں تعلیم کے یہ دونوں مراحل حکومت سے آزاد تھے۔ کیوں کہ مغل حکومت میں سرکاری سطح پر کوئی تعلیم کا شعبہ نہ تھا، جو عوام الناس میں باقاعدہ طور پر تعلیم کے فروغ کی کوشش کرتا اور حکومتی آمدنی کا ایک حصہ اس پر خرچ کرتا۔ اسی وجہ سے بہت سے مؤرخین اس کے لیے مغل حکومت پر تنقید بھی کرتے ہیں، خاص طور پر مغربی مؤرخین کہ مغل حکومت نے اپنی عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے سرکاری سطح پر عملی کوشش نہیں کی۔

یہ حقیقت ہے کہ مغل عہد میں تعلیمی ترقی انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ انفرادی کوششیں مغل معاشرے کے ہر سطح پر نظر آتی ہیں، چاہے وہ حکمراں ہوں یا امراء، جاگیردار اور زمیندار ہوں یا عوام الناس۔ لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کا خود انتظام کرتے، وقت، حالات اور علاقے کے اعتبار سے تعلیم گاہوں میں بچوں کے داخلے کی عمر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام کے باوجود بھی مغل عہد کی تعلیمی ترقی تشفی بخش شمار کی جاتی ہے۔ مغل عہد کے ابتدائی دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے اپنے علیحدہ تعلیمی ادارے قائم تھے۔ ہندو والدین عام طور پر اپنے بچوں کو پانچ سال کی عمر میں اسکول بھیجتے، جب کہ مسلمان اپنے بچوں کو چار سال، چار مہینے اور چار دن کی عمر میں مدرسے بھیجتے۔ شاہ جہاں نامہ میں اسے رسم مکتب کہا گیا ہے۔ ایل ایف اسمتھ نے 1801ء میں ملک کے شمال مغربی صوبے میں مسلمانوں کے درمیان اس رسم کے ادا کیے جانے کے طریقوں کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ اس کی تفصیلات اس طرح تحریر کرتا ہے ''جب بچے کی عمر چار سال، چار ماہ اور چار یوم کی ہو جاتی ہے تو اس کے لیے ایک چاندی کی تختی تیار کی جاتی ہے۔ اس پر سورہ اقرا لکھ دی جاتی ہے اور بچے کے سامنے اسے اس طرح پڑھا جاتا ہے کہ وہ بھی ساتھ ساتھ اسے دہراتا جائے۔ اس وقت ایک استاد اس کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے۔'' مغل عہد میں مسلم معاشرے کے ہر طبقے میں یہ رسم رائج تھی، حکمراں، امراء اور عوام سبھی اس رسم پر کاربند تھے۔ اسی طرح سے ہندو اور مسلم دونوں قوموں کا نصاب تعلیم بھی مختلف تھا اور دونوں کے تعلیمی اداروں میں تعلیم بھی الگ الگ زبانوں میں دی جاتی تھی۔

اکبر کے عہد حکومت میں مدارس اور جامعات میں تعلیم و تدریس کے نظام کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں تعلیم کے میدان میں نئی اصلاحات جاری کی گئیں جو حکمراں کی بے تعصبی اور فراخ دلی کا نتیجہ تھیں۔ مسلم تاریخ اور خاص طور سے ہندوستانی تاریخ میں غالباً اکبر پہلا بادشاہ تھا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم کی یکساں طور پر ترقی چاہتا تھا اور اسی دور میں پہلی مرتبہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ مدارس اور جامعات میں تعلیم پا رہے تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں درج ذیل مضامین کی فہرست دی ہے:

علم الاخلاق، علم ہندسہ، حساب، زراعت، مساحت، فلکیات، جغرافیہ، اقتصادیات، علم رمل، امور خانہ داری، نظم و نسق، طب، منطق، فلسفہ، ریاضی، علم طبیعیات، علم الٰہیات، دینیات اور تاریخ کے علاوہ ہندوستانی علوم مثلاً ویاکرن، نیائے، ویدانت اور پتن جلی یعنی قواعد، منطق، وید اور یوگ۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اکبر چاہتا تھا کہ طلبہ مدرسوں میں ان مضامین کو پڑھیں۔ اکبر نے جو کچھ تجویز کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانا ایک مشکل کام تھا، لیکن ابوالفضل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ان مضامین کے پڑھائے جانے سے مدرسوں میں نئی جان آ گئی تھی۔ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ یہ تمام مضامین ان مدرسوں میں حقیقی طور پر پڑھائے جاتے تھے، کیوں کہ زیادہ تر مدرسوں کا نصاب ہمیشہ کی طرح مسلم دینیات اور اس سے متعلق لاتعداد تحریروں پر ہی منحصر رہا۔ اعلیٰ تعلیم زیادہ تر مدرسوں کے باہر اساتذہ، اپنی ذاتی حیثیت میں ہی دیا کرتے تھے۔ جب کوئی طالب علم کسی مخصوص تحریر، مضمون یا علمی میدان میں عبور حاصل کر لیتا تو اس کو استاد کی طرف سے ایک سند مل جاتی تھی۔

17.3.2 غیر مسلموں کا تعلیمی نظام

مغل عہد حکومت میں ہندو ابتدائی تعلیمی ادارے مندروں سے منسلک ہوتے تھے۔ ان ابتدائی تعلیمی اداروں کا نظم ونسق عوامی تعاون یا اوقاف سے چلایا جاتا تھا اور طلبہ سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ان ابتدائی تعلیمی اداروں میں والدین اپنے بچوں کا داخلہ عام طور پر پانچ سال کی عمر میں کرادیا کرتے تھے۔ ان اسکولوں میں مطبوعہ کتابیں نہیں ہوتی تھیں، بچے لکڑی کی تختیوں پر یا اپنی انگلیوں کی مدد سے زمین پر حروف کی مشق کرتے۔ کلاس عام طور پر درختوں کے سائے میں لگائے جاتے۔ مکمل طور پر حروف تہجی کی مشق کے بعد طلبہ کو مذہبی تحریریں پڑھنے کے لیے دی جاتیں اور برنیر کے مطابق عام طور پر انھیں 'پُر ان' کی عبارتیں پڑھنے کے لیے دی جاتیں۔

مغل ہندوستان میں ہندو اعلیٰ تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، ان میں سے زیادہ تر تعلیمی ادارے مذہبی زیارت گاہوں کے قریب واقع تھے۔ بنارس ہندو علوم کا سب سے اہم مرکز تھا، خاص طور پر 'جیوتش وڈیا' کا، لیکن جیسا کہ برنیر نے لکھا ہے اس زمانے کے ہندوستان میں ایسے ادارے موجود نہیں تھے، جنھیں مغرب کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا مقابل قرار دیا جاسکے۔ وہاں پر قدیم طرز تعلیم کی طرح اس عہد میں بھی پورے شہر میں اساتذہ کے اپنے گھروں میں تعلیم گاہیں قائم تھیں، جہاں پر طلبہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے پہنچتے تھے۔ بنارس کے بعد ہندو علوم اور تعلیم کا دوسرا اہم مرکز مغربی بنگال کا ایک ضلع نادیہ (Nadia) تھا۔

سولہویں صدی عیسوی میں واسدیوسروبھاؤما نے وہاں پر نیائے کا ایک اسکول قائم کیا تھا جو بعد کے عہد میں متھلا یونیورسٹی کی ہم سری کرنے لگا تھا۔ اسی طرح مغل عہد میں متھلا یونیورسٹی بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز رہی۔ بہار کا ترہٹ (Tirhut) ڈویژن بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھا، جس میں مظفر پور، مغربی چمپارن، مشرقی چمپارن، ویشالی، سیتامڑھی اور سیوہر کے ضلعے شامل تھے۔

متھرا بھی اس عہد میں ہندو تعلیم کا ایک اہم اور مشہور مرکز تھا، جسے ہندو فلسفے کی تعلیم کے لیے شہرت حاصل تھی اور وہاں پر لگ بھگ دس ہزار سے زائد طلبہ زیر تعلیم تھے۔ مہاراشٹر کے تین علاقے پیٹھن (Paithan)، کرہڈ (Karhad) اور تھاٹے (Thatte) بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کے اہم مراکز تھے، ہیملٹن کے مطابق وہاں پر تقریباً چار سو تعلیمی ادارے موجود تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں ہندو دینیات، فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملتان کا تعلیمی مرکز فلکیات، نجوم، ریاضی اور طب میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے مشہور تھا اور اسی طرح سرہند میں بھی طب کا ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ مغل ہندوستان میں موجود ہندو اعلیٰ تعلیمی اداروں کا نصاب زبان وقواعد، شاعری، منطق، فلسفہ، تاریخ، فلکیات، نجوم، طب بشمول جانوروں کا علاج، ریاضی، طبعیات اور کیمیا پر مشتمل تھا۔

17.3.3 مسلمانوں کا تعلیمی نظام

مغل ہندوستان کے تعلیمی نظام میں مسلمان اپنے بچوں کو مسجدوں میں یا اس کے پاس واقع مکتب میں بھیجتے۔ اطالوی سیاح Delia Valle کے مطابق اس طرح کے اسکول ہر قصبے اور گاؤں میں موجود تھے۔ ان ابتدائی اسکولوں کا بنیادی نصاب ابتدائی فارسی اور قرآن پر مشتمل ہوتا تھا۔ جن میں شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں اور فردوسی کی نظمیں شامل ہوتی تھیں۔ بچوں کو پہلے فارسی کی ابجد سکھائی جاتی تھی، ساتھ ہی تلفظ کی صحت پر زور دیا جاتا تھا اور اوقاف واعراب سکھائے جاتے تھے۔ جب بچہ یہ چیزیں سیکھ لیتا تھا تو اسے دو حرفوں کا ملانا سکھایا جاتا تھا۔ کچھ دنوں

کے بعد انھیں نثر یا نظم کے مختصر جملے پڑھائے جاتے تھے، جن میں مذہبی یا اخلاقی پند و نصائح ہوتے تھے اور سیکھی ہوئی ترکیبوں کا استعمال ہوتا تھا، وہ انھیں خود پڑھنے کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی استاد بھی ان کی مدد کرتا، اس کے بعد استاد چند روز تک نئے فقرے یا مصرعے سکھاتا تھا اور نہایت تھوڑے وقت میں بچے روانی کے ساتھ پڑھنے لگتے تھے۔ استاد چھوٹے بچوں کے لیے چار مشقیں روزانہ مقرر کرتا تھا یعنی ابجد دہرانا، حروف جوڑنا، ایک نیا مصرع یا شعر یاد کرنا اور آموختہ دہرانا۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کو مدرسے کا نام دیا جاتا، جو ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود تھے۔ ان میں دہلی اور آگرہ تعلیم کے سب سے اہم مراکز تھے، جہاں پر شریعہ کالج کے ساتھ ساتھ لاتعداد مدرسے موجود تھے۔ دہلی کے مدرسوں میں ہمایوں کا بنوایا ہوا مدرسہ، ماہم انگا کا مدرسہ، جسے 'خیر المنازل' کے نام سے جانا جاتا تھا اور شاہ جہاں کا بنوایا ہوا مدرسہ 'دار البقا' کافی اہم تھے۔ خیر المنازل ایک اقامتی اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ مغل عہد میں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں جون پور اپنی ایک شناخت رکھتا تھا، جسے 'شیراز ہند' کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ یہاں پر ملک کے دور دراز علاقوں سے طلبہ حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ مغل عہد میں گجرات بھی اپنے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے مشہور تھا، وہاں کا 'فیض صفا' نامی مدرسہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کافی مشہور تھا۔ احمد آباد میں بھی کافی اہم مدرسے تھے، جن میں شیعہ مکتب فکر کا ایک مدرسہ، جسے اب 'بارہ اماموں کا کوٹلہ' کہا جاتا ہے، کافی مشہور تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں لاہور نے ایک اہم اعلیٰ تعلیمی مرکز کے طور پر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اسی طرح سے کشمیر بھی اپنی فطری خوب صورتی اور آب و ہوا کی وجہ سے دانشوروں کے لیے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ مغل عہد میں مسلم اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مرکز کے طور پر گوالیار، سیال کوٹ، انبالہ اور تھانیسر بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔

مغل عہد کے تعلیمی نظام میں اگلی کلاس میں طلبہ کی ترقی کے لیے باقاعدہ طور پر کوئی امتحان نہیں لیا جاتا تھا بلکہ استاد اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ بچہ اگلی کلاس میں پہنچنے کے لائق ہے یا نہیں۔ تعلیمی ادارے بچوں کو کسی طرح کی کوئی سند نہیں دیتے تھے بلکہ کسی اہم تعلیمی ادارے یا اپنے فن میں کسی معروف و مشہور علمی شخصیت سے تعلیم یافتہ ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح سے وثوق کے ساتھ یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ تمام تعلیمی اداروں میں تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ایک متعینہ مدت طے تھی۔ مغل عہد کے تعلیمی نظام کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کے لیے دس سے سولہ سال تک کے حصول تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا، جو کہ ہمارے موجودہ یونیورسٹی تعلیمی نظام کے ڈگری کورس کے مساوی ہوتا تھا۔ وہ طلبہ جو تدریس کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہتے، انھیں اس فن کے ماہرین کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ یہ طلبہ ملک اور بیرون ملک واقع اپنے فن کے اہم تعلیمی مراکز سے بھی استفادہ کرتے، جسے ان کے نصاب کا ایک اہم حصہ شمار کیا جاتا۔

17.3.4 کتب خانے

ملک اور قوم کی تعلیمی ترقی کے لیے کتابوں اور کتب خانوں کا کردار ہمیشہ سے ہی بہت اہم شمار کیا جاتا رہا ہے۔ ساتھ ہی کسی بھی قوم کے علمی اور تعلیمی معیار کا اندازہ وہاں پر واقع مدارس اور کتب خانوں کی موجودگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغل دور کی علمی و تعلیمی ترقی میں کتب خانوں کا بہت اہم رول ہے۔ کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کے قیام میں مغل معاشرے کے سبھی طبقات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چاہے حکمراں طبقہ ہو یا عوام الناس سبھی کے یہاں کتابوں سے دلچسپی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر عہد عروج کے تقریباً سبھی مغل حکمراں کتاب دوست دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر اپنی دانشورانہ اور علمی صلاحیتوں

کے لیے کافی شہرت رکھتا ہے۔ ہمایوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کتابوں کا دل دادہ تھا، فوجی مہموں کے دوران بھی وہ ایک منتخب کتب خانہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاؤنٹ نایر کے بیان کے مطابق شیر شاہ سوری سے شکست کے بعد جب وہ ایک جائے پناہ کی تلاش میں راہ فرار اختیار کیے ہوئے تھا، اس وقت بھی اس نے اپنے کتب خانے کے مہتمم اور اپنی چند محبوب کتابوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جس وقت وہ کھمبات کے مقام پر خیمہ زن تھا، اس وقت بھی اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں، جن میں 'تاریخ تیموری' کا ایک نادر نسخہ بھی تھا۔ ہمایوں کی طبیعت کے ادبی رجحان اور کتابوں سے اس کی دلچسپی کا پتہ اس واقعے سے بھی چلتا ہے کہ اس نے پرانے قلعے میں شیر شاہ کے ذریعے تعمیر کی گئی عمارت شیر منڈل کو دہلی کے تخت پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد کتب خانے میں تبدیل کر دیا، جو اس سے پہلے عیش ونشاط کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اسی عمارت کے زینے سے گر کر ہمایوں کا انتقال بھی ہوا تھا۔

اکبر کو بھی اہل علم اور کتابوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے دربار میں وہ علماء سے مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کرتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کے دوران مطالعہ جاری رکھا۔ روزانہ ایک شخص اسے کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ مشکل سے کوئی علمی، ادبی یا تاریخی کتاب باقی رہی ہوگی جسے بادشاہ کو نہ سنایا گیا ہو۔ حکمرانوں کی اس علم اور کتاب دوستی کی وجہ سے مغل عہد میں کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کا قیام بڑے پیمانے پر عمل میں آیا۔ مغل دور کا سب سے اہم کتب خانہ شاہی کتب خانہ تھا، جس میں حکمرانوں کی جمع کی گئی کتابیں موجود تھیں۔ اس شاہی کتب خانے کی بنیاد بابر کے عہد میں پڑی اور ہمایوں نے اس کتب خانے کو مزید وسعت دی۔ اکبر کے عہد میں بہت سے دوسرے کتب خانوں کو بھی اس شاہی کتب خانے میں ضم کر دیا گیا۔ مثلاً گجرات کی فتح کے بعد اعتماد خاں گجراتی کا کتب خانہ، جس میں بہت سی اہم اور عمدہ کتابیں تھیں، شاہی کتب خانے میں شامل کر دیا گیا۔ اسی طرح سے جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کا ذاتی کتب خانہ حکومت کے قبضے میں آیا۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق اس میں 4600 کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں سے بہت سی خود مصنّفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ کتابوں کے اس ذخیرے میں مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں تھیں، جن میں ادب، لسانیات، طب، فلکیات، نجوم، علم ہندسہ، تفسیر، احادیث، دینیات، فقہ، تصوف اور موسیقی سبھی شامل تھیں۔ اس کتب خانے میں کتابوں کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اکبر کے جانشینوں نے اس کتب خانے کو سنوارنے کا کام کیا اور مزید کتابوں کا اضافہ کیا۔

مغل عہد میں اس شاہی کتب خانے کے علاوہ شہزادوں، شہزادیوں اور امراء کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی تھے۔ مغل شہزادیوں میں سلمیٰ سلطانہ اور زیب النساء کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا۔ فیضی کے کتب خانے میں 4600 کتابیں تھیں جسے اس کی وفات کے بعد شاہی کتب خانے میں ضم کر دیا گیا۔ عبدالرحیم خان خاناں کا ذاتی کتب خانہ بھی مغل عہد کے اہم کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے، جس میں کتابوں اور نوادرات کی دیکھ بھال کے لیے 95 ملازم رکھے گئے تھے۔ مہاراجہ جے سنگھ کا بھی اپنا ایک اہم کتب خانہ تھا، جس کی زیادہ تر کتابیں فلکیات اور نجوم سے متعلق تھیں۔ برنیر نے بنارس یونیورسٹی کے ایک ہال کو کتابوں سے بھرا ہوا دیکھا تھا، جس میں مذہب، فلسفہ، طب اور تاریخ کی کتابیں تھیں۔ مغل دور میں طلبہ کے استعمال کے لیے تمام مدارس کے پاس بھی کتب خانہ ہوتا تھا، جس میں طلبہ کے ضرورت کی تمام کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ مدارس سے متعلق کتب خانوں میں سب سے اہم کتب خانہ مدرسہ فیض صفا کا شمار کیا جاتا ہے، جو اپنی اہمیت وافادیت کے لیے کافی مشہور تھا۔

17.3.5 عورتوں کی تعلیم

عورتوں کی تعلیمی صورت حال تقریباً تاریخ کے تمام ادوار میں یکساں رہی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مغل دور میں بھی عورتوں کی تعلیم کے کچھ بندوبست ضرور کیے گئے تھے، لیکن اگر تنقیدی طور پر مغل تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغل عہد میں زیادہ تر خواتین ابتدائی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ پاتی تھیں۔ حکمراں اور امراء خاندان کی خواتین کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بارے میں تاریخ سے ضرور کچھ شواہد ملتے ہیں۔ خاص طور سے مغل شہزادیوں کے بارے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انھیں عام تعلیم دی گئی تھی۔

بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے 'ہمایوں نامہ' تحریر کیا، جس سے 'اکبر نامہ' کی تکمیل میں مدد ملی۔ گرچہ تاریخی شواہد سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی، جس سے یہ پتہ چلے کہ اس نے کس طرح کی تعلیم حاصل کی تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عالم خاتون تھی۔ تاریخی حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے کتب خانے کے لیے کتابیں جمع کیا کرتی تھی۔ سلمیٰ سلطانہ جو ہمایوں کی بہن گل رخ کی بیٹی تھی، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ اس نے کئی فارسی نظمیں اور غزلیں 'مخفی' تخلص کے ساتھ لکھی تھیں۔ اکبر کی دودھ پلانے والی دایہ ماہم انگا اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ خاتون تھی، اس نے دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں شاہی خاندان کی خواتین کو باقاعدہ تعلیم وتربیت دی جاتی تھی۔ فتح پور سیکری میں اکبر نے محل کے کچھ کمرے ان کی تعلیم کے لیے 'درس گاہ خواتین' کے نام سے علیحدہ کر رکھے تھے۔ نور جہاں جو جہاں گیر کی مشہور بیگم ہے، فارسی اور عربی علم وادب میں بڑی دست گاہ رکھتی تھی اور اپنے شوہر کی زندگی میں وہ مملکت کا نظم ونسق بھی چلاتی تھی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنی ذہین، قابل اور تعلیم یافتہ تھی کہ مملکت کے تمام محکموں کے معاملات کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتی تھی۔ شاہ جہاں کی عزیز بیوی ممتاز محل فارسی زبان میں بہت کامل تھی اور اس زبان میں شعر کہہ سکتی تھی۔ شاں جہاں کی سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم بھی تعلیم یافتہ تھی اور اس زمانے کے علماء کو انعامات اور وظائف دے کر ان کی ہمت افزائی کیا کرتی تھی۔ ستی النساء جو اس عہد کی ایک فاضل خاتون تھی، جہاں آرا بیگم کی استانی تھی۔ وہ قرآن کی قاری کے ساتھ ساتھ فارسی میں اچھی مہارت رکھتی تھی۔ وہ ممتاز محل کی سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ زیب النساء بیگم جو اورنگ زیب کی لڑکیوں میں سب سے بڑی تھی، نہایت تعلیم یافتہ شہزادی تھی۔ وہ علم القرآن میں کامل مہارت رکھتی تھی، فارسی اور عربی خوب جانتی تھی اور فن خطاطی میں بہت اچھی مہارت رکھتی تھی، اس کے یہاں بہت سے علماء، شعراء اور انشاء پرداز ملازم تھے اور اس کے نام سے بے شمار تالیفات وتصنیفات منسوب کی گئی تھیں۔

اوپر بیان کردہ مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل عہد میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں غفلت نہیں برتی گئی تھی۔ کیوں کہ بعض اوقات انھوں نے ایسی علمی ترقی اور مہارت کا ثبوت دیا جو واقعی قابل داد ہے۔ مذکورہ بالا شواہد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مغل دور کی خواتین تعلیم سے قطعی عاری نہیں ہوسکتیں، جیسا کہ ان کے متعلق عام طور پر فرض کرلیا جاتا ہے۔

17.4 علمی وسائنسی اور تکنیکی ترقی

مغل سلاطین، امراء اور صوبے دار سبھی علم وادب کے بڑے سرپرست تھے اور علم وادب وتعلیم کی سرپرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل عہد میں بڑے بڑے صاحب کمال عالم اور ادیب پیدا ہونے لگے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں جس کثرت سے اہل علم پیدا ہوئے، اس کی مثال

ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دور کے علماء میں سب سے اہم شخصیت شیخ احمد سرہندی (1624ء-1564ء) کی ہے۔ ان کی پیدائش 1564ء میں سرہند میں ہوئی۔ مغل دور میں سرہند ایک اہم شہر تھا۔ شیخ احمد کی ابتدائی تعلیم سرہند میں ہوئی، اس کے بعد انھوں نے سیال کوٹ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، جو اس وقت علم وحکمت کا ایک اہم مرکز تھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے اصلاح معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا اور مسلم معاشرے میں پھیلے بدعات وخرافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ شیخ احمد سرہندی کی سب سے پہلی دستیاب تحریر 'رسالہ ردّ روافض' میں شیعہ اعتقاد کی تردید کی کوشش ہے۔ شریعت کے سلسلے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے ان کا ٹکراؤ حکومت وقت سے بھی ہوا، جس کا اظہار اکبر کے انتقال کے بعد ان کے ذریعے لکھے گئے خطوط سے ہوتا ہے۔ 1600ء میں وہ نقش بندی صوفی خواجہ باقی باللہ کے مرید بن گئے۔ ان کے مطابق ایک صوفی کے لیے بھی شریعت کی اسی طرح سے سختی کے ساتھ پابندی ضروری ہے جتنی کسی دوسرے شخص کے لیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شریعت میں ہر قسم کی بدعات وخرافات کی مذمت کرتے تھے۔ انھوں نے ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کا مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ شیخ احمد سرہندی کے ذریعہ صوفیانہ احیاپسندی کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک ایسا تقلیدی نقطۂ نظر بھی سامنے آیا، جس میں امام غزالی سے منسوب شریعت اور طریقت کو یکجا کرنے کی کوشش کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ شیخ احمد سرہندی کو ان کے انھیں اصلاحی کارناموں کی وجہ سے مجدد الف ثانی کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ان کا انتقال 1624ء کو سرہند میں ہوا۔

مغل دور کی علمی شخصیت میں دوسرا اہم نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی (1642ء-1551ء) کا ہے۔ وہ مسلم قانون اور شریعت کے موضوع پر بے شمار تحریروں کے مصنف اور حدیث کے مستند عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابیں اور رسائل تحریر کیے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ برصغیر میں علم حدیث کو رواج دینا ہے۔ انھوں نے علم حدیث کے موضوع پر بہت سی کتابیں تحریر کیں اور حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ کی شرح لکھی۔ ان کی تحریر کردہ 'مدارج النبوۃ' سیرت کے موضوع پر ایک اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اسی طرح سے ان کی ایک دوسری کتاب 'اخبار الاخیار' ہے، جس میں مسلم ہندوستان کے اولیا اور بزرگوں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ ملا عبدالحکیم سیال کوٹی (970ھ-1067ھ/ 1561ء-1656ء) بھی مغل عہد کے اہم علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ سیال کوٹ اور آگرے کے مدرسوں میں طلبا کو تعلیم دیتے تھے۔ انھوں نے تفسیر، فقہ اور علم کلام کی بہت سی کتابوں پر حاشیے لکھے ہیں۔ تفسیر بیضاوی پر ان کے ذریعے لکھا گیا حاشیہ سب سے اچھا اور مقبول مانا جاتا ہے۔ صدیوں تک ان کی کتابیں ہندوستان، مصر اور ترکی کی درس گاہوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ قاضی محب اللہ بہاری (وفات 1119ھ/ 1707ء) اورنگ آباد کے عہد میں لکھنؤ کے قاضی تھے۔ اصول فقہ اور منطق کے اہم عالموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اصول فقہ کے موضوع پر ان کی کتاب 'مسلم الثبوت' اور منطق میں 'مسلم العلوم' کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔ مغل سلطنت کے علماء و مصلحین میں سب سے اہم نام شاہ ولی اللہ (1114ھ-1176ھ/ 1703ء-1763ء) کا ہے۔ ان کا تعلق مغل سلطنت کے عہد زوال سے ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی تصنیف وتالیف میں اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور ان کے اندر کی اخلاقی خرابیاں دور ہوں۔ انھوں نے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لیے بادشاہوں اور امراء سے خط وکتابت بھی کی۔ دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ انھیں کے ایک خط کی تحریک پر ہوا تھا، جس میں پانی پت کی جنگ میں اس نے مراٹھوں کو شکست دی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاحی کے کام بھی بڑے پیمانے پر کیے۔ مسلمانوں میں معاشرتی اثرات کے پیش نظر بیوہ عورتوں کی شادی کو معیوب سمجھا جانے لگا تھا، انھوں نے اس رسم کی کھل کر مخالفت کی۔ اسی طرح سے انھوں نے نکاح میں بڑے بڑے مہر باندھنے اور خوشی وغم کے موقعے پر لوگوں کو فضول خرچی سے

روکا۔ ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس بات پر زور دیا کہ اختلاف کی صورت میں انتہا پسندی کے بجائے اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے علاوہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور تصوف پر مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنی ان تصانیف کی وجہ سے وہ امام غزالی، امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہ کی طرح تاریخ اسلام کے بڑے علماء اور مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' ہے۔ شاہ ولی اللہ کی طرح ان کی اولاد میں بھی بڑے بڑے عالم اور مصلح پیدا ہوئے، جنھوں نے ہندوستانی عوام کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز (1159ھ-1239ھ/ 1746ء-1823ء) عربی اور فارسی کے بڑے انشاپرداز اور عالم تھے۔ ہندوستان میں تقریباً ساٹھ سال تک وہ دینی علوم اور احادیث کی تعلیم دیتے رہے۔ شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین (1163ھ-1233ھ/ 1750ء-1818ء) نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ خدا کے کلام کو سمجھ سکیں۔ شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر (1167ھ-1230ھ/ 1754ء-1815ء) کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی اردو تفسیر ہے۔ یہ تفسیر 'موضح القرآن' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تفسیر اتنی مقبول ہوئی کہ آج تک بہت سے قرآن مجید کے حاشیوں پر اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی اولاد میں شاہ اسمٰعیل شہید (1193ھ-1246ھ/ 1779ء-1831ء) کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی کی اولاد تھے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح اور قرآن وحدیث کی تعلیم عام کرنے کا جو کام شروع کیا تھا، اس کو سب سے زیادہ ترقی شاہ اسمٰعیل نے دی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں اردو میں لکھی گئی 'تقویۃ الایمان' سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس مختصر سی کتاب میں انھوں نے مسلمانوں کی زندگی میں پائی جانے والوں بدعتوں اور خرافات کی نشان دہی کی ہے۔ اس کتاب نے برصغیر کے مسلمانوں کے عقیدے اور عمل کی اصلاح میں وہی کام کیا جو عرب میں محمد بن عبدالوہاب کی کتاب 'کتاب التوحید' اور نائیجیریا و مغربی افریقہ میں عثمان دان فودیو کی 'احیاء السنۃ' نے کیا۔ ان کی دوسری کتابوں میں فارسی میں لکھی گئی 'منصب امامت' اور 'عبقات' بہت اہم ہیں۔ شاہ اسمٰعیل نے اپنے ایک ساتھی مولانا عبدالحئی کے ساتھ مل کر سید احمد شہید کے اقوال وارشادات بھی فارسی زبان میں 'صراط مستقیم' کے نام سے مرتب کیے۔ اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کر کے ان کو دور کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مغل سلطنت کے دور زوال کی آخری بڑی علمی اور عملی شخصیت سید احمد شہید (1201ھ-1246ھ/ 1786ء-1831ء) کی ہے۔ یہ شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ سید احمد شہید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک بڑی وجہ ان کا اسلامی تعلیمات خصوصاً جہاد کی طرف سے غافل ہونا ہے، جس کی وجہ سے ان کے اندر مختلف طرح کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی اور اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے 'تحریک جہاد' کی بنیاد ڈالی، جسے تاریخ میں 'تحریک شہیدین' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

دینی علوم کے بعد مغل دور میں سب سے اہم کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں۔ دینی علوم پر لکھی جانے والی کتابیں عام طور پر عربی زبان میں تھیں، لیکن تاریخ کے موضوع پر کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ مغل دور کے تاریخ نگاروں میں ابوالفضل (1551ء-1602ء) کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ ابوالفضل اکبر کا وزیر تھا، اس نے 'اکبر نامہ' اور 'آئینِ اکبری' کے نام سے اس دور کی دو تاریخ کی کتابیں تحریر کی

ہیں۔ان کتابوں میں مغلوں کے انتظام حکومت اور صوبوں کے تذکرے کے ساتھ ہندوستانی ثقافت اور علوم وفنون کا بیان ملتا ہے۔سترہویں صدی عیسوی میں 'اکبرنامہ' کے طرز پر اور بھی کئی دوسری کتابیں تیار کی گئیں، جن میں قابل ذکر عبدالحمید لاہوری اور محمد وارث کی لکھی ہوئی سرکاری تاریخیں ہیں جنھیں 'بادشاہ نامہ' کے عنوان سے یاد رکھا گیا ہے۔اسی طرح اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی دس برسوں کے دوران لکھی گئی محمد کاظم کی 'عالم گیرنامہ' ہے۔سترہویں صدی میں لکھی گئی ان کتابوں میں تفصیلات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، جغرافیائی حالات اور واقعات کے تسلسل کو نہایت صحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی وہ بنیادی طور پر کسی سرکاری گزٹ سے زیادہ مشابہ ہیں۔ان کا 'اکبرنامہ' سے کوئی مقابلہ نہیں ہے، گرچہ 'اکبرنامہ' میں بھی اکبر کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے لیکن زیادہ اہم وہ فلسفیانہ اور نظریاتی بیان ہے جو اس کتاب میں جاری وساری ملتا ہے۔ جہاں تک 'آئین اکبری' کا تعلق ہے، اس قسم کی دوسری کتاب کبھی نہیں لکھی جاسکی۔ابوالفضل کے بعد کسی نے بھی سائنس، اعداد وشمار، جغرافیہ اور ثقافت میں اس طرح کی دلچسپی نہیں دکھائی۔

تاریخ نویسی کے میدان میں بابر کی 'تزک' کے ساتھ ایک نئی صنف وجود میں آگئی۔ یہ کتاب ابتداً چغتائی ترکی میں تالیف کی گئی تھی، لیکن عبدالرحیم خان خاناں کے فارسی میں لفظی ترجمہ کے بعد اس کا شمار فارسی تحریروں میں ہونے لگا۔ جہاں گیر کی 'تزک' بھی 'بابرنامہ' کی طرح نہایت سادہ طرز میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں بابر کی سی صاف گوئی کے ساتھ فنون اور فطرت میں بھی دلچسپی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس میں ڈرامائی عنصر مفقود ہے، جو بابر کی جاں بازی سے عبارت واقعات کے بیان کی وجہ سے اس کی 'تزک' میں پیدا ہو گیا ہے۔مختلف علاقوں کی تفصیلی تاریخیں تاریخی ادب میں ایک نیا اضافہ ہیں، جو اس زمانے میں لکھی جانا شروع ہوئیں۔ان میں میر معصوم کی لکھی ہوئی 'سندھ کی تاریخ' اور علی محمد خان کی 'تاریخ گجرات' کافی اہم ہیں۔اسی عہد میں ہندوستان میں مجموعی تاریخوں کے لکھنے کا چلن بھی شروع ہوا اور نظام الدین احمد کی 'طبقات اکبری' اس قسم کی کتابوں کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔ محمد قاسم فرشتہ کی 'گلشن ابراز' کو نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کیے گئے ماخذ کی مدد سے تیار کیا گیا۔تاریخی ادب میں اس کتاب کو بڑی شہرت ملی۔عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جائے گا۔بدایونی کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔زبان کی سلاست، دلچسپ انداز بیان، ناقدانہ نقطۂ نظر اور معلومات کی کثرت کے لحاظ سے ضیاء الدین برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' کے علاوہ عہد وسطیٰ کی کوئی تاریخ کی کتاب اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب اکبر کی پالیسیوں کی تیز طرار تنقید کے لیے بھی مشہور ہے۔اس دور کی علمی وادبی تاریخ کے لیے یہ ایک بہترین ماخذ ہے۔کتاب کے تین حصے ہیں، پہلے حصے میں محمود غزنوی سے اکبر کے عہد تک کا تذکرہ ہے، دوسرے حصے میں اکبر کے عہد کی تفصیلی تاریخ بیان کی گئی ہے اور تیسرے حصے میں اس عہد کے امراء، علماء ادیبوں اور شاعروں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔دورِ زوال کے ممتاز مورخوں میں محمد ہاشم خوافی خاں (1733ء-1664ء) کا نام کافی اہم ہے۔انھوں نے 'منتخب اللباب' کے نام سے ہندوستان میں مغلوں کی ایک مفصل اور مستند تاریخ لکھی ہے، جس میں بابر سے محمد شاہ کے عہد تک کی تاریخ درج ہے۔ یہ کتاب مغلوں کے دورِ زوال کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے اور مسلم ہندوستان میں لکھی جانے والی چند اچھی تاریخی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔مغل عہد کی تاریخ نگاری میں تذکرہ نگاری کی صنف بھی موجود ہے اور اس قسم کا سب سے اہم تذکرہ شاہ نواز خاں کی تصنیف 'مآثر الامراء' ہے۔اس کتاب میں مغل امراء کی سوانح درج کی گئی ہے۔اس کتاب کی ابتداء 1742ء میں ہوئی اور مصنف کے انتقال کے کافی عرصے بعد یعنی 1780ء میں اختتام کو پہنچی۔اس کتاب کے آخری حصے کو پورا کرنے میں آزاد بلگرامی اور عبدالحئی نے ہاتھ بٹایا۔

اس دور کی ایک اہم تصنیف 'دبستان مذاہب' ہے جس کے مصنف کا نام وثوق کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کو علم تقابل ادیان کی ایک بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف مذاہب کی تعلیمات، عقائد اور رسوم و رواج کو خاصی غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہندو مذہب اس کے مختلف فرقوں اور سکھوں کے عقائد سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسلم فرقوں اور دین الٰہی کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مغل دور میں جغرافیہ کے میدان میں اس طرح سے دلچسپی نہیں لی گئی اور نہ ہی بڑے پیمانے پر کارنامے انجام دیے گئے، جس طرح دینی اور تاریخی کتب کی تصنیف میں دلچسپی لی گئی۔ لیکن پھر بھی مختلف کتابوں میں ملک کے مختلف حصوں کے جغرافیائی حالات کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ خاص طور پر تاریخی کتابوں میں جغرافیہ پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ جغرافیہ میں ابوالفضل کی گہری دلچسپی کا اندازہ مغل سلطنت کے صوبوں کی ان تفصیلات سے لگایا جاسکتا ہے جو 'آئین اکبری' میں درج ہیں۔ اسی طرح 'تزک بابری' میں بھی مختلف علاقوں کے جغرافیائی حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔

سولہویں صدی کے آنے تک عربی ترجموں کے ذریعے یونانی تحریروں کی شناسائی کا دائرہ خاصہ محدود ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ابوالفضل کا دعویٰ ہے کہ وہ قدیم تحریروں سے واقفیت رکھتا تھا۔ ٹامس رو نے 1616ء میں یہ تسلیم کیا تھا کہ مغل دربار کے مسلمان عالم فلسفہ اور ریاضی میں درک رکھتے ہیں۔ ان میں مشہور منجم ہیں اور ارسطو، اقلیدس، ابن سینا اور دوسرے مشہور مصنفوں کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں، اسی وجہ سے اس دور میں سائنسی طرز فکر کو بڑھاوا ملا تھا۔ مغل دور کے فلسفیوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا نام کافی اہم ہے۔ وہ قرآنی علوم کے عالم کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ایک فاضل فلسفی بھی تھے، ہندوستان میں ملا صدرا کو متعارف کرانے کا سہرا بھی انھیں کے سر جاتا ہے، انھیں 'فاضل سیالکوٹی' اور 'فاضل لاہوری' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مغل دور کے فلسفیوں میں ملا محمود جونپوری (1062ھ-993ھ/ 1652ء-1585ء) کا نام بھی کافی اہم ہے۔ انھیں طبعی فلسفے کے ساتھ ساتھ علم فلکیات میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ طبعی فلسفے اور منطق پر ان کی بہت سی کتابیں شمار کی جاتی ہیں، جن میں سب سے مشہور کتاب 'شمس بازغہ' ہے۔ اپنی اس کتاب میں انھوں نے کائنات کی تخلیق کے بارے میں ایرانی فلسفی میر داماد کے 'حدوث دہری' کے نظریے کی تردید کی ہے۔ اپنی کتاب میں وہ فلکیات سے متعلق بطلیموسی نظریے پر بھی شکوک ظاہر کرتے ہیں۔ چاند پر نظر آنے والے دھبے کے بارے میں مختلف افکار و خیالات کا جائزہ لے کر ان کی تردید کی ہے اور پھر اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ چاند کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقامات ایسے ہیں، جہاں سورج کی روشنی نہیں پڑتی، اس لیے وہ دھبے کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں لکھی گئی یہ کتاب اپنی سلاست کی وجہ سے فلسفہ کی شاہ کار کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی (1648ء-1587ء) کا نام بھی مغل دور کے علماء، صوفیاء اور فلسفیوں میں کافی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ وہ شیخ فریدالدین گنج شکر کے خلیفہ اور مغل عہد کے مشہور صوفی عالم ہیں، ان کی زیادہ تر تحریریں متصوفانہ فلسفے سے متعلق ہیں۔ شیخ محب اللہ نے ابن عربی کے نظریات بالخصوص نظریے وحدت الوجود کی اس شدت سے حمایت کی کہ انھیں مسلم ہندوستان کا ابن عربی کہا جانے لگا۔ ان کا ماننا ہے کہ ابن عربی کی تحریروں کی ادبی اور مابعد الطبیعیاتی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اپنے انھیں متصوفانہ افکار و نظریات کی وجہ سے وہ بہت سے علماء خاص طور پر ملا محمود جونپوری اور ان کے متبعین کی تنقید کا شکار بھی ہوئے۔ شیخ محب اللہ کی موجود تحریروں میں: شرح فصوص الحکم، عبادۃ الخواص، ہفت احکام، غایۃ الغایات، تسویۃ، مفاتخ العاشقین، ترجمۃ الکتاب اور 'انفاس الخواص' کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔ میر محمد زاہد الہروی (وفات

1101ھ/ 1689ء) مغل عہد میں فلسفہ، منطق اور علم کلام کے اہم عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اورنگ زیب کے عہد میں محتسب کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے علم کلام میں شریف جرجانی کی مشہور کتاب 'شرح مواقف' اور منطق کی دوسری کتابوں پر جو حاشیے لکھے ہیں وہ ان کتابوں پر سب سے اچھے حاشیے تصور کیے جاتے ہیں۔

مغل دور میں علوم ریاضی اور فلکیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ 1587 میں بھاسکر آچاریہ کی مشہور کتاب 'لیلاوتی' کا اکبر کے درباری شاعر ابوالفیض فیضی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ایک ایرانی تارک وطن فتح اللہ شیرازی (وفات 1588ء) کی مغل دربار میں بڑی پذیرائی ہوئی، کیوں کہ وہ ریاضی اور فلکیات میں دست رس رکھتا تھا، حکیم فتح اللہ نے حکومت کے حکم پر ایک صحیح نظام تقویم یا الٰہی کلنڈر تیار کیا، جسے 1584ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے سرکاری کلنڈر قرار دیا گیا۔ فتح اللہ نے کئی تکنیکی آلات بھی ایجاد کیے تھے، جن میں سے بعض کو ابوالفضل نے اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ 35-1634ء میں شاہ جہاں کی زیر سرپرستی عطاء اللہ رشدی نے الجبرا پر بھاسکر آچاریہ کی کتاب 'بیج گنت' کا ترجمہ کیا۔ ایک دوسرا قابل ذکر کام صادق اصفہانی کا اٹلس تھا، جو اس نے 1647ء میں جون پور میں تیار کیا تھا۔ اس اٹلس میں کل 33 نقشے ہیں، جو مشرقی نصف الارض پر مشتمل ہیں، ان نقشوں کو بطلیموسی اصولوں کے مطابق بنایا گیا ہے۔

مغل دربار سے متعلق ایک اہم امیر اور آمیر کے راجہ سوائی جے سنگھ (وفات 1743ء) کی فلکیات کے میدان میں کارگزاریاں ہندوستانی سائنس کے ایک روشن پہلو کی نشان دہی کرتی ہیں۔ انھوں نے جے پور، دہلی، اجین، متھرا اور بنارس میں رصدگاہیں تعمیر کیں، جن میں اینٹ اور چونے کی مدد سے بڑے بڑے آلات تعمیر کیے گئے تھے۔ ان آلات کی تعمیر میں جے سنگھ کے سامنے پندرہویں صدی عیسوی میں سمرقند میں تیموری حکمراں الغ بیگ کے ذریعے بنوائے ہوئے آلات کی مثال تھی۔ اینٹ اور گارے کے ان آلات کی تعمیر کے پیچھے جواز یہ تھا کہ لکڑی اور لوہے کے بنے ہوئے چھوٹے آلات مثلاً اصطرلاب میں غلطی کا امکان زیادہ رہ جاتا ہے۔ جے سنگھ کو فلکیات سے متعلق یورپی مشاہدات کی صحت کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ڈی لاہیر (de La Hire) کے مشاہدات کا ریکارڈ حاصل کرلیا اور اس کی مدد سے انھوں نے انعطاف (Refraction) کا جدول تیار کرلیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی تحقیق کے نتائج ڈی لاہیر کے ریکارڈ سے زیادہ درست ہیں۔ جے سنگھ کے ماہرین فلکیات نے ایک یورپی دوربین کی مدد سے زہرا کا اس حالت میں مشاہدہ کیا جب وہ چاند کی روشن سمت میں ہوتا ہے۔ ان مشاہدات کے نتائج ان کی اہم کتاب 'زیج محمد شاہی' میں بیان کیے گئے ہیں۔ عام طور پر جے سنگھ نے مسلم فلکیات سے ہی استفادہ کیا تھا، لیکن ان کے کاموں کے ذریعے مسلم فلکیات کی اطلاعات سنسکرت زبان میں بھی منتقل ہوئیں۔ اس بات کا اندازہ ان سنسکرت ناموں سے لگایا جاسکتا ہے، جو انھوں نے اپنی رصدگاہوں کے آلات کو دیے تھے۔

مغل دور میں طبی سہولیات بھی بڑی منظّم تھیں اور بڑے پیمانے پر ان کو رواج دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ دارالسلطنت اور ملک کے تمام بڑے شہروں میں باتنخواہ ملازمین کے ساتھ مستقل شفاخانے قائم تھے۔ تاریخی حوالوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بابر کو طب کے فن میں دلچسپی تھی اور اس کے دربار میں طبیبوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ بابر کے امراء میں میر خلیفہ نامی ایک امیر اپنے عہد کا ایک اہم دانشور اور ماہر طبیب تھا۔ اسی طرح امیر ابوالبقا بھی بابر کا طبیب تھا۔ بابر اور ہمایوں کے عہد کے اہم اطباء میں یوسف بن محمد بن یوسف کا نام کافی اہم ہے، جسے طب کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل تھی۔ اسے طب یونانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی طریقہ علاج میں بھی کمال حاصل تھا۔ طب سے متعلق

اس کی کتابوں میں 'جامع الفوائد'، 'فوائد الاخیار'، 'طب یوسفی' اور 'علاج الامراض' کافی اہم ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اس نے اپنی شاعری کے نمونوں میں بھی حفظان صحت سے متعلق باتیں کیں ہیں، جن میں 'قصیدۃ فی حفظ الصحۃ' اور 'ریاض الادویۃ' کو اہم شمار کیا جاتا ہے۔ ہمایوں کے عہد میں طب سے متعلق کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں دیا گیا۔ اس کی سب سے اہم وجہ اس عہد کی سیاسی افراتفری کو شمار کیا جاسکتا ہے لیکن ہمایوں کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں بہت سے اطباء نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور انھوں نے بعد کے ادوار میں ہندوستان کی طبی تاریخ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اکبر کا عہد مغل تاریخ میں طبی ترقیات کے اعتبار سے سنہرا دور شمار کیا جاسکتا ہے۔ ابوالفضل نے مسلم اور غیر مسلم طبیبوں کی فہرست دی ہے جنھیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی اور ان میں سے کچھ کو منصب بھی عطا کیا گیا تھا۔ اکبر کے عہد میں سرکاری شفاخانوں کے علاوہ طبیبوں کے اپنے ذاتی مطب بھی ہوا کرتے تھے، جو بنا کسی بھید بھاؤ کے ہمیشہ عوام الناس کی خدمت کے لیے کھلے رہتے تھے۔ پروفیسر شری رام شرما کا بیان ہے کہ اس عہد میں کوی چندرا، وِدّیا راجہ، ٹوڈرمل اور نیل کنٹھ نے طب کے موضوع پر اپنی تحریریں مرتب کیں۔ بلاشبہ اس عہد کے اطباء میں حکیم علی حسین گیلانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے طب کے موضوع پر ابن سینا کی مشہور کتاب 'القانون' کی شرح لکھی جو 'قانون' کی سب سے اچھی شرح شمار کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے طبی تجربات کو ایک کتاب کی شکل میں مدون کیا جو 'مجربات علی گیلانی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم مسیح الدین ابوالفتح گیلانی (وفات 997ھ/ 1589ء) کا نام بھی کافی اہم ہے۔ وہ اکبر کے دربار میں اہم منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے 'فتاحی' کے نام سے طب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، ساتھ ہی 'قیاسیہ' کے نام سے 'اخلاق ناصری' کی شرح لکھی۔ ان کے دو بھائی حکیم نجیب الدین ہمایوں اور حکیم نورالدین قراری بھی اس عہد کے اطباء میں شمار ہوتے ہیں۔ دورِ اکبری کے طبیبوں میں مظفر بن محمد الحسینی الشفائی، جن کا اصل نام حکیم شرف الدین حسن تھا، کا نام بھی کافی اہم ہے۔ وہ ایرانی صفوی حکمراں شاہ عباس صفوی کے عہد کے مشہور دواساز شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی دوسری تحریروں کے علاوہ 1556ء میں 'طب شفائی' کے نام سے علم الادویہ کی ایک کتاب بھی ترتیب دی تھی، اس کتاب میں ادویہ کو ابجد کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے اصفہان کب چھوڑا اور ہندوستان کب آئے؟ ساتھ ہی اس کے پیچھے وجوہات کیا تھیں؟ لیکن اکبر کے درباری طبیبوں کی فہرست میں ابوالفضل نے ان کا نام شامل کیا ہے۔

حکمراں بننے کے بعد جہاں گیر نے جو فرامین جاری کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ''ہر بڑے شہر میں شفا خانے قائم کیے جائیں، بیماروں کے علاج کے لیے ان میں طبیبوں کی تعیناتی کی جائے اور تمام اخراجات سرکاری خزانے سے ادا کیے جائیں۔'' اسی طرح اس نے اپنی تزک میں، جو اس نے تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد یعنی 27-1605ء کے درمیان لکھی تھی، نباتات، جانوروں اور طب سے متعلق بہت سے مشاہدات درج کیے ہیں، جن کی بنا پر اسے نیچر اور طب کے ایک واقف کار کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم روح اللہ کافی نمایاں شمار کیے جاتے ہیں، جن کا تذکرہ جہاں گیر نے اپنی تزک میں بھی کیا ہے۔ عہد جہاں گیر میں طبی تصنیفات مدون کرنے میں مہابت خاں کے بیٹے حکیم امان اللہ نے کافی اہم کردار ادا کیا، انھوں نے 'گنج باداورد' کے نام سے مفرد اور مرکب ادویہ پر ایک مبسوط تحریر ترتیب دی۔ یہ کتاب ادویہ سازی کا انسائیکلوپیڈیا شمار کی جاتی ہے، جس میں مفرد ادویہ کے ساتھ ساتھ مرکب ادویہ سازی کے طریقے اور مشہور و معروف اطباء کے تجربات و مشاہدات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں میں 'اُم العلاج' اور 'دستور الہند' ہیں۔ آخر الذکر کتاب 'مدن نبد' نامی ایک سنسکرت تحریر کا فارسی ترجمہ ہے۔

عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے اپنے پیش رووں کی طرح شاہ جہاں بھی کوشاں رہا۔ اس کے عہد میں ملک کے طول و عرض میں شفا خانے قائم کیے گئے۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف کے مطابق دہلی کی جامع مسجد کے پاس عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ایک بڑا شفا خانہ قائم کیا گیا اور اس میں ملک کے باصلاحیت اور مشہور طبیبوں کی تعیناتی کی گئی۔ ہندوستان میں مغل دربار نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایران سے آنے والے دانشوروں، سائنس دانوں اور طبیبوں کو پناہ دی۔ ان میں سے ایک اہم نام حکیم عین الملک شیرازی کا ہے جو دارا شکوہ کے ذاتی طبیب تھے۔ وہ ایک مشہور ماہر امراض چشم تھے اور ساتھ ہی جراحی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ایک اہم تصنیف 'الفاظ الادویۃ' ہے، جو انھوں نے 29-1628ء میں شاہ جہاں کے لیے لکھی تھی۔ ان کی سب سے اہم تصنیف 'طب دارا شکوہی' ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق اس کتاب میں جراحی کا بمشکل ہی تذکرہ کیا گیا ہے، یہاں تک کہ موتیا بند کا علاج بھی دواؤں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ آتشک کے مرض کے لیے ایک باب مخصوص کیا گیا ہے اور اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر مرض کے پیدا ہونے کی وجوہات اور ظاہر ہونے کی علامات کے تذکرے کے بعد مصنف نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں اور پھر اس کا علاج بتایا ہے۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف کے مطابق اس عہد کے دوسرے اہم طبیب حکیم میر محمد ہاشم تھے، جنھیں شاہ جہاں نے احمد آباد کے شفا خانے کا منتظم اور نگران اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ اورنگ زیب نے انھیں اپنے عہد میں تین ہزاری منصب سے نوازا اور 'مسیح الزماں خان بہادر' کا خطاب عطا کیا۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم محمد داؤد تقرب خاں کا نام بھی اہم ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ کو خود پیشاب رکنے کا مرض لاحق ہوا اور علاج کے ساتھ ساتھ مرض میں قبض کا بھی اضافہ ہو گیا۔ بہت سے طبیبوں نے علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، جب حکیم تقرب خاں نے علاج شروع کیا تو انھوں نے نسخے میں 'شیر خشت' کا اضافہ کیا۔ بادشاہ کو اس سے بڑا افاقہ ہوا اور مرض جاتا رہا۔ شاہ جہاں کا عہد اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں ستی النساء خانم نامی ایک ممتاز خاتون طبیبہ تھی۔ وہ شاہی محل کی عورتوں کا علاج کیا کرتی تھی اور ساتھ ہی ایک مثالی نرس بھی تھی۔

اورنگ زیب کے عہد میں بھی دار السلطنت اور دور دراز کے شہروں میں مریضوں کے علاج کے لیے شفا خانے قائم کیے گئے۔ ملک کے مال دار اور صاحب حیثیت لوگوں نے بھی اپنے ذاتی خرچ پر شفا خانے قائم کیے۔ مثال کے طور پر نواب خیر اندیش خاں نے اٹاوہ میں ایک اچھا شفا خانہ قائم کیا، جو خود بھی ایک تجربہ کار طبیب اور صاحب طرز مصنف تھے۔ انھوں نے 'خیر التجارب' کے نام سے طب کی ایک کتاب بھی تحریر کی۔ اس شفا خانے میں یونانی اور ہندوستانی دونوں طرح کے طریقۂ علاج اپنائے گئے تھے۔ اس شفا خانے کے اطباء میں عبدالرزاق نیشاپوری، عبدالماجد اصفہانی، مرزا محمد علی بخاری، محمد عادل، محمد اعظم، کنول نین، سکھانند اور نین سکھ کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے دور کے اطباء میں محمد اکبر ارزانی کا نام بھی اہم ہے۔ وہ فارسی زبان میں بہت سی طبی کتابوں کے مصنف شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی طبی تحریروں میں 'طب اکبر، میزانِ طب، طب نبوی، مفرح القلوب، قرابادین قادری، مجربات اکبری، حدود الامراض' اور 'طب ہندی' اہم ہیں۔ اسی عہد میں حکیم محمد رضا شیرازی نے 'تحفۃ الاطباء' اور 'ریاض عالم گیری' نام سے دو کتابیں تحریر کیں۔ اس عہد کے اطباء میں محمد مہدی کا نام بھی اہم ہے، جنھوں نے شہزادے محمد اعظم کا علاج کیا اور 'حکیم الملک' کے خطاب سے نوازے گئے۔ اورنگ زیب کا عہد مغل تاریخ میں طبی ترقیات کے اعتبار سے بہت اہم دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں نہ صرف اہم کتابیں تصنیف کی گئیں بلکہ دوسری زبانوں سے اہم طبی کتابوں کے فارسی میں ترجمے بھی کیے گئے۔

محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی میں ایک بڑا شفاخانہ واقع تھا، جس کے مہتمم اعلیٰ حکیم قوام الدین تھے، اس شفاخانے کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ تھا۔ مرزا محمد ہاشم خان علوی اس عہد کے اہم اطباء میں شمار ہوتے تھے، جنھیں محمد شاہ کے ذریعے 'معتمد الملک' کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ حکیم ہاشم خاں نے بہت سی طبی تحریریں چھوڑیں، جن میں 'کتاب النبت، جامع الجوامع، خلاصۃ التجارب، مطب علوی خان، تحفۂ محمد شاہی، احوال عضوء النفس' اور 'خلاصۂ قوانین علاج' اہم ہیں۔ ان تحریروں میں 'جامع الجوامع' سب سے اہم ہے، جو طب کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس کتاب کو وہ اپنی زندگی میں مکمل نہیں کر سکے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے ایک دوسرے شخص محمد حسین خاں نے اس کی تکمیل کی۔ احمد شاہ کے دور حکومت میں حکیم اسکندر نے 'قرابادین حکیم اسکندر' کے نام سے ان شاہی اور لاطینی طبی اصطلاحات کا ایک فرہنگ تیار کیا جو عہد وسطیٰ سے ان کے عہد تک مغرب میں استعمال ہوتے تھے۔ حکیم محمد شریف خان کا نام شاہ عالم دوم کے دور کے اہم اطباء میں شمار کیا جاتا ہے۔ بادشاہ نے انھیں اپنا درباری طبیب متعین کیا تھا اور انھیں 'اشرف الحکماء' کے خطاب سے نوازا تھا۔ انھوں نے طب کے موضوع پر 'علاج الامراض، تالیف شریفی، علاج نافعہ، حاشیۂ نفیسی، تحفۂ عالم شاہی' اور 'شرح حمیات قانون' نامی کتابیں تحریر کیں۔ اودھ کے حکیم شفائی خان ارشد بھی اس عہد کے نامور اطباء میں شمار ہوتے ہیں، جو حکیم شریف خاں کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے 'شفاء الجمیل' نامی ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ ہندوستانی طبی تحقیق میں ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کے ذریعے تیار کی گئی ایک دوا ہے جو 'خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا' کے نام سے مشہور ہے، ان کے ذریعے تیار کیا گیا یہ 'خمیرہ' دل کے امراض میں بڑا مفید ہے۔

مغل دور حکومت میں جس طرح علمی و تعلیمی اور سائنسی ترقی پر زور دیا گیا اسی طرح سے تکنیکی و میکانکی ترقی اور آلات و مشینوں کے اختراع پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔ سولہویں صدی عیسوی کے ابتدائی عہد میں بابر نے پانی نکالنے کے ایک طریقے کا ذکر کیا، جس میں کیل دار پہیوں پر مشتمل گراری کام کرتی تھی۔ ہندوستان میں اسے 'پرشین وہیل' کہا گیا اور تکنیکی تاریخ کے ماہر اسے 'ساقیہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ مغل عہد کے کئی مصوروں نے ساقیہ کی تصویر بنائی ہے۔ اس مشین کی ایجاد کا سہرا درباری مورخ نے اکبر کے سر باندھا ہے لیکن ان میں سے بعض یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مشین فتح اللہ شیرازی کی اختراع تھی۔ اکبر کے عہد کی ایجادات میں وہ مشین بھی شامل ہے، جس کی مدد سے توپوں کی نالیوں کو اندر سے ہموار کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ ایک ہوائی چکی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ اسی طرح پانی نکالنے کا وہ پیچیدہ نظام بھی ہے جو فتح پور میں لگایا گیا تھا۔ اس میں کئی گراری دار پہیوں کی مدد سے پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا۔ اکبر کے نام پہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے شورے کی مدد سے پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ترکیب ایجاد کی، جو اس کے بعد ہندوستان میں بہت عام ہوگئی۔ اکبر کے اسلحہ خانہ میں ایک بندوق بنائی گئی جو ابوالفضل کے مطابق خود بادشاہ کی کارآگہی کا ثبوت تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ حکیم فتح اللہ شیرازی نے ایک ایسی بندوق بنائی جو یکے بعد دیگرے بارہ گولیاں چلا سکتی تھی۔ وہ مغل دور کے بہت اہم ماہر طبیعیات شمار کیے جاتے ہیں۔ مغل دور میں کئی اہم تکنیکی آلات اور ترکیبیں پہلی بار رائج ہوئیں، جن کے بارے میں کسی نے ایجاد کی دعوے داری نہیں کی ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً یہ ان گمنام دست کاروں کی دین ہیں جنھوں نے انھیں یہاں متعارف کرایا۔ استاد کبیر حسین اکبر کے عہد کے مشہور بندوق ساز تھے۔ اکبر کے عہد میں طرح طرح کی بندوقیں اور توپیں بنائی گئیں اور فن اسلحہ سازی کو بڑے پیمانے پر ترقی دی گئی۔

میکانکی آلات میں سب سے اہم ایک مخصوص قسم کا پیچ (Screw) تھا جو الٹے سے سیدھے کی طرف گھمایا جاتا تھا۔ اس کو بنانے کے

لیے کھانچے کاٹنے کے بجائے ایک کیل پر دھات کا بنا ہوا تار لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ایسے پینچ کا ذکر پہلی بار 1666ء میں ملتا ہے۔ اس پینچ کی مدد سے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لکڑی کے دو بیلنوں پر مشتمل کولہو میں وہی اصول کارفرما تھا جس کی جھلک پینچ میں ملتی ہے، جو اسی زمانے میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ اس آلے میں استعمال ہونے والے بیلنوں پر پینچ کے جیسے کھانچے بنے ہوئے تھے جو آپس میں پیوست ہو کر بیلنوں کو مخالف سمتوں میں گھماتے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک اور اوزار کا ذکر ملتا ہے جو ہاتھ سے ڈور کھینچ کر چلنے والا برما تھا، جو ہیروں کو تراشنے کے کام آتا تھا۔ اس نئے برمے نے قدیم زمانے کے کمان سے چلنے والے برمے کی جگہ لے لی تھی۔

تعمیرات کے میدان میں بھی جدید تکنیکی طریقے اختیار کیے گئے۔ خاص طور پر دوہرا پیاز نما گنبد بنانے کی صلاحیت پیدا ہونا، محراب کے اصول کو تعمیرات میں استعمال کرنے کی صلاحیت میں ایک قابل ذکر پیش رفت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ تکنیک تاج محل کے مشہور گنبد میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ یقینی طور پر یہ نئی کاری گری وسط ایشیا سے ہندوستان آئی تھی، لیکن یہاں آنے کے بعد اس میں کسی قدر بہتری بھی ہوئی۔ اس قسم کی مہارت پانی کو دور تک لے جانے کی غرض سے بنائی گئی اونچی نالیوں کی تعمیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے نمونے شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی مشہور مغربی جمنا نہر کے بعض حصوں میں ملتے ہیں۔ جہاز سازی میں عام خیال کے برخلاف ناریل کے ریشوں سے جوڑ پر کرنے کے بجائے اکبر کے آخری زمانے سے خاصے بڑے پیمانے پر لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے جہازوں کے بنیادی ڈھانچے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ کپڑے کی بنائی کے کام میں پھولوں سے سجی ہوئی بنائی لوم کے اندر موجود کشیدہ کاری کے فریم کی مدد سے پیدا کی جانے لگی، یعنی اب اس کے لیے تیلیاں ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

17.5 زبان و ادب

مغل دور میں علوم و حکمت کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان و ادب کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ عام طور پر یہ شمار کی جاسکتی ہے کہ تقریباً سبھی مغل حکمراں تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے علوم و فنون اور زبان و ادب کے فروغ میں نہ صرف خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ علماء و فضلاء اور دانشوروں و ادیبوں کی سرپرستی بھی کی۔ فارسی زبان نہ صرف مغل سلطنت اور دکنی ریاستوں میں اونچی سطح کے دفاتر کی زبان تھی بلکہ اس کا دائرہ پھیل کر راج پوت ریاستوں کے درباروں تک پہنچ گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کے طرزِ بیان اور لغت نے دفاتر میں استعمال ہونے والی زبان کو گہرے طور پر متاثر کیا، اس صورت حال کا اندازہ سترہویں صدی عیسوی کے راجستھانی اور مراٹھی دستاویزوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی نے کئی ہندوستانی زبانوں کی ادبی روایتوں کو بھی متاثر کیا اور اس کے نتیجے میں ہی ایک نئی زبان یعنی اردو وجود میں آئی، لیکن اس کے باوجود بھی فارسی ہندوستان کے کسی بھی حصے میں عام بول چال کی زبان نہیں بن سکی۔ مغل دور میں فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا گیا۔ فارسی لغت نویسی کے میدان میں مغل دور کی عمدہ مثالیں جمال الدین حسین انجوئی کی 'فرہنگ جہاں گیری' اور عبدالرحمان تھتوی کی 'فرہنگ رشیدی' ہیں۔ بالآخر یہ سلسلہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ٹیک چند بہار کی 'بہار عجم' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس لغت کا شمار بلاشبہ فارسی زبان کی سب سے زیادہ جامع لغات میں کیا جانا چاہیے۔ بہار نے اپنی اس تالیف میں ہر لفظ کے ضمن میں ماضی کے شعراء اور ادیبوں کی نگارشات کے حوالے تاریخی تسلسل میں دیے ہیں اور اسی طرح الفاظ کے استعمال میں آنے والی تبدیلیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ سراج الدین آرزو اس دور میں زبان و قواعد اور صرف و مستعملات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'چراغِ ہدایت' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ

ہندی اور فارسی میں بعض بنیادی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ولیم جونس (William Jounes) کی انڈو یورپی زبانوں کی بابت انکشافات سے تقریباً پچاس برس قبل منظر عام پر آچکا تھا۔ اسی طرح میرزا جان نے اپنی کتاب 'تحفۃ الہند' میں نہ صرف ہندوستان کے ادبی اسالیب اور موسیقی وغیرہ کا جائزہ لیا بلکہ اس کے تتمہ میں برج بھاشا کی مصطلحات کی ایک طویل فہرست بھی دی۔

مغل عہد کے نثر نگاروں میں ابوالفضل (1602-1551ء) کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ عمدہ اور شاہانہ انداز کی نہایت آراستہ و پیراستہ نثر لکھتا تھا، جس میں اس کی دوررس خیال آرائی، تازگی کی کمی پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ اسی لیے عرصہ تک ابوالفضل کو ہر اس شخص کے لیے ایک مثال تصور کیا جاتا رہا، جسے عمدہ نثر نگاری کا شوق ہو۔ فارسی ادب میں ابوالفضل کی خاص اہمیت اس کی نگارشات میں پیش کردہ خیالات کی بنا پر ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل توجہ اکبر کے عہد کی تاریخ 'اکبر نامہ' ہے، جو اس نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ تیار کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی دوسری تالیف 'آئین اکبری' ہے، جس میں مغلوں کے انتظام حکومت، سلطنت کے صوبوں کے ساتھ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کا ذکر ملتا ہے۔ 'اکبر نامہ' کے طرز کی کتابیں سترہویں صدی عیسوی میں بھی لکھی گئیں، جن میں قابل ذکر عبدالحمید لاہوری اور محمد وارث کی لکھی ہوئی سرکاری تاریخیں ہیں، جن کو 'بادشاہ نامہ' کے عنوان سے یاد رکھا گیا۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی محمد کاظم کی 'عالم گیر نامہ' ہے۔ لیکن ادبی و فنی سطح پر ان سبھی کتابوں کا 'اکبر نامہ' اور 'آئین اکبری' سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ مغل دور میں تاریخ نویسی کے شعبے میں بھی ادبی و فنی اعتبار سے تصنیف و تالیف کے بڑے کارنامے انجام دیے گئے، جن کا تذکرہ تاریخ نویسی کے فن میں کیا جا چکا ہے۔ مغل دور میں تصنیف شدہ فارسی ادب کا زیادہ تر حصہ مذہبی تحریروں پر مشتمل تھا، جن میں مسلم دینیات اور تصوف کے علاوہ دبستان مذاہب کافی اہم ہیں، جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ فارسی ادب میں قابل قدر اضافہ سنسکرت تحریروں کے ترجموں کے ذریعے ہوا۔ ان میں سب سے اہم 'مہابھارت' کا ترجمہ جو اکبر کے عہد میں ہوا اور داراشکوہ کے ذریعے کیا گیا 'اپنشدوں' کا ترجمہ جو 'سیر الاولیا' اور 'سراکبر' کے نام سے مشہور ہوا، شمار کی جاتی ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں فارسی شاعری کے سب سے عمدہ نمونے مغل حکومت کے تحت ہندوستان نے پیش کیے۔ مغل عہد کے فارسی شعرا میں ایرانی نژاد شاعر جمال الدین عرفی (وفات 1590ء) اپنی پر اثر شاعری کے لیے مشہور تھا۔ اسے ملک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے باہر بھی خاصی شہرت ملی۔ عرفی کے اشعار اور خاص طور پر اس کی تصنیف کی گئی مثنوی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس عہد کے فارسی شعراء میں جدت اور زور بیان کے لحاظ سے اکبر کا ملک الشعراء ابوالفیض فیضی (1004-954ھ/ 1595-1547ء) سب سے آگے ہے۔ وہ اپنی مشکل پسندی اور مزین و آراستہ پیرائے بیان کے لیے پسند کیا جاتا تھا۔ لیکن آج کے نقاد اس کی مثنوی 'نل دمن' کو فارسی شاعری کا شاہ کار مانتے ہیں، جس میں ہندوستانی کہانی کو پیش کیا گیا۔ ان کا ماننا ہے کہ امیر خسرو کے بعد فارسی ادب میں اس پائے کی مثنوی نہیں تحریر کی گئی۔ عبدالقادر بیدل (وفات 1133ھ/ 1720ء) جدت اور ندرت افکار کے لحاظ سے اس دور کا اہم شاعر شمار کیا جاتا ہے۔ وہ سبک ہندی کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری میں ہندوستانی طرز کا غیر واضح انداز بیان ملتا ہے، جس کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان کی شاعری پر تصوف کی چھاپ غالب ہے، وسط ایشیا میں ان کو خاصی مقبولیت ملی اور انھیں دوسرا رومی سمجھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور کے دوسرے ممتاز شعرا میں صائب، غنی کشمیری، نظیری، ظہوری، طالب آملی، ابوطالب کلیم اور صوفی سرمد کو شامل کیا

جا سکتا ہے۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی وجہ سے سنسکرت ادب جنوب میں چلا گیا تھا، مگر اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ مغل سلطنت میں سنسکرت ادب برابر پھلتا پھولتا رہا۔ اس زمانے کی زیادہ تر سنسکرت تحریریں مذہبی امور، فلسفہ اور قانون سے متعلق تھیں۔ اس کے ساتھ ہی زبان و ادب پر بھی مختلف کتابیں تحریر کی گئیں۔ ناگوجی بھٹ (وفات 1700ء) اپنی لاتعداد تصنیفات کے لیے جانے جاتے ہیں، انھوں نے پتانجلی کی 'مہابھاشیہ' جیسی مشہور اور قدیم سنسکرت گرامر پر شرح لکھی۔ شاہ جہاں کے درباری شاعر جگن ناتھ پنڈت نے نقد شعر کے موضوع پر 'رس گنگا دھارا' نامی ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'بھامنی ولاس' جیسی مشہور کتاب تصنیف کی، جو ایک ہی وقت میں عشقیہ نظم، مرثیہ اور حکیمانہ مقولوں کا مجموعہ قرار دی گئی ہے۔ کہانیاں، افسانے اور روایات سنسکرت میں برابر قلم بند ہوتے رہے۔ بلال سین نے سولھویں صدی میں راجہ بھوج کے دربار کے بارے میں پرلطف روایتیں اپنی کتاب 'بھوج پربندھ' میں یکجا کی تھیں۔ سترہویں صدی میں نرائن نے مقفع نثر میں اگنی دیوتا کی بیوی سواہا اور چندرما کے عشق کا ذکر کیا ہے۔ کام سوتر کے انداز میں عشق کے فن کا بیان کلیان مل کی 'اننگ رنگ' میں ملتا ہے، جو سولھویں صدی کی تصنیف ہے۔

سنسکرت ادب کی ایک دوسری صنف جس کو پڑھنے والے اور پروان چڑھانے والے برابر ملتے رہے، تاریخ کے متعلق 'کاویہ' یعنی شعری بیان ہے۔ کلہن کی لکھی ہوئی کشمیر کی عظیم تاریخ کے بیان میں شعری اوزان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرز تحریر کو جاری رکھنے کی کوشش اکبر کے عہد میں پراجایا بھٹ اور شوکا نے 'راجاوالی پٹا کا' کے عنوان سے کی تھی۔ مغل دربار میں موجود مدح خواں اور اسی قسم کے وہ لوگ بھی جو راجپوت اور مراٹھا درباروں میں موجود تھے، اس مرصع لیکن اکھڑی ہوئی سی بیانیہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرح کی مصنوعی زبان استعمال کرتے رہے۔ اس دور میں سنسکرت کا دوسری کلاسیکی زبانوں سے لین دین کا تعلق بھی رہا۔ اکبر کے دور میں کرشن داس نے 'پارسی پرکاش' نامی تصنیف تیار کی، جو فارسی اور سنسکرت زبان کی ایسی پہلی لغت ہے جس کا ذکر ملتا ہے۔

سنسکرت زبان کے سائنسی ادب میں قابل قدر اضافہ ان تحریروں کے ذریعے بھی ہوا، جن میں یونانی اور عربی علوم کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ علوم یہاں تک فارسی زبان کے توسط سے پہنچے تھے۔ ان میں سب سے اہم اکبر کے دربار کے منجم نیل کنٹھ کی کتاب 'تاجیک نیل کنٹھی' تھی۔ 1643ء میں ویدانگارایا نے اپنی کتاب 'پارسی پرکاش' تصنیف کی، جو علم فلکیات سے تعلق رکھنے والے الفاظ کی فارسی سنسکرت فرہنگ ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سمراٹ جگن ناتھ نے بطلیموس کی کتاب 'المجسطی' اور اقلیدس کی 'ہندسہ' سے متعلق تحریر کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ ان تحریروں کے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے مثنویوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔

مغل دور حکومت میں ہندوستان کی بہت سی بولیوں میں ادبی استعداد پیدا ہوئی۔ ان میں سے خاص طور پر دو بولیوں 'اودھی' اور 'برج' نے واضح طور پر ادبی سرمایوں کو جنم دیا۔ اودھی زبان میں عوامی انداز کی شاعری وجود میں آئی، جس کی عمدہ مثال کبیر کے وہ دوہے قرار دیے جا سکتے ہیں، جن میں ویدانت کے جذبے سے لبریز پیغام ملتا ہے۔ پھر اسی زبان میں ملک محمد جائسی نے 'پدماوت' لکھی۔ اکبر کے عہد میں تلسی داس نے اودھی زبان میں ہی 'رام چرتر مانس' تحریر کی، جو رامائن کا ایسا ادبی چربہ ہے، جس نے اپنے بھگتی سے بھرے بیانیہ کی بنا پر بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ مغربی ہندوستان میں جہاں 'برج' بولی جاتی ہے، ہمیں ایک طرف کرشن بھگتی میں ڈوبے ہوئے سورداس کے نغمے ملتے ہیں، وہیں دوسری

طرف عبدالرحیم خان خاناں کی اعلیٰ معیار کی حامل ادبی نظمیں بھی ہیں۔ اسی زمرے میں بہاری لال کی 'ست سائی' کو بھی شامل کیا جائے گا۔ برج کے ایک شاعر بنارسی داس نے نظم میں اپنی نہایت دلچسپ سوانح بیان کی جو 'اردھ کتھا نک' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی دور میں جدید ہندی نے اپنی مخصوص ادبی نثر کو کھڑی بولی کی غیر ادبی روزمرہ استعمال ہونے والی زبان کے ذریعے ترقی دی۔ اس کام میں دو اشخاص جنھوں نے اہم کردار ادا کیا، سدا سکھ لال اور انشاء اللہ خاں انشاء تھے۔ انشاء اردو کے مشہور شاعر اور ہندوستانی بولیوں کے عالم تھے۔ انھوں نے ہندی نثر میں غیر مذہبی موضوعات پر نہایت موثر مضامین لکھے ہیں۔

مغل دربار اور فوج میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد یکجا ہوگئی تھی جو مختلف زبانیں اور بولیاں بولتے تھے۔ ان بولیوں اور زبانوں کے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے نتیجے میں ایک مخلوط زبان وجود میں آئی جو فوجی چھاونیوں اور دربار میں بھی استعمال ہوتی تھی اور اس مخلوط زبان نے 'اردو' کی شکل اس وقت اختیار کرلی جب اس میں ایسے ادب کا فروغ ہوا، جس کی زیادہ تر اصناف فارسی سے مستعار لی گئی تھیں۔ ایسی کوشش پہلی بار اس علاقے میں نہیں ہوئی جہاں 'ہندی' سے ملتی جلتی زبانیں بولی جاتی تھیں، بلکہ اس عمل کا آغاز دکن کی سلطنتوں خصوصاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران ہوا۔ اس دکنی اسلوب کے ایک مانے جانے نمائندے محمد قلی قطب شاہ (وفات 1612ء) تھے۔ اردو کو پروان چڑھانے میں ایک دوسری چیز جس نے مدد کی وہ بازار میں ہونے والی گفتگو کے دوران فارسی اور 'ہندی' الفاظ کا استعمال تھا۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں جس 'ہندی' کے الفاظ استعمال میں آتے تھے، وہ کھڑی بولی تھی۔ ایسی بازاری زبان میں لکھی گئی طنزیہ لیکن عامیانہ نثر اور نظم دونوں کی عمدہ مثالیں جعفر زٹلی (وفات 1713ء) کی نگارشات میں ملتی ہیں۔ مختلف النوع اسالیب اور محاوروں سے عبارت یہ بولی اس وقت ایک معیاری اردو زبان بننے کی طرف مائل ہوگئی، جب گجراتی نژاد شاعر ولی دکنی اپنی غزلوں کے مجموعے کے ساتھ 1723ء میں دہلی پہنچے۔ اگلے سو برسوں میں اردو زبان خوب پھلی پھولی۔ اس زمانے میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے، جن میں سراج الدین خاں آرزو، حاتم، مرزا مظہر جان جاناں، محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر، ذوق، مومن، نظیر اکبر آبادی اور غالب کا نام شمار کیا جاسکتا ہے۔

ان شعراء نے جہاں ایک طرف فارسی ادب کے تمام تر تصورات اور اسالیب کو اپنایا وہیں اس میں جاری وساری تشکیک کی روایت کو بھی قبول کیا۔ انھوں نے اردو زبان کو نئے طرز فکر اور محاوروں سے روشناس کرایا۔

مغل دور میں ہندوستان کی مختلف علاقائی بولیوں کو پھلنے پھولنے اور ادبی زبانوں کے طور پر فروغ پانے کا موقع ملا۔ ان علاقائی زبانوں میں پشتو، کشمیری، پنجابی، سندھی، بنگالی، آسامی، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، کناڈا، تامل اور ملیالم سبھی زبانیں شامل ہیں۔ ان علاقائی زبانوں کے فروغ نے کئی قسم کے نظریات کو فروغ دیا۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس زمانے میں 'قومیتیں' وجود میں آئیں۔ ساتھ ہی ان علاقائی ادب کی نوعیتوں کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان علاقائی زبانوں میں جو ادب سامنے آیا اس کا زیادہ تر حصہ مذہب اور دینیات سے متعلق تھا۔

17.6 فنون لطیفہ

فنون لطیفہ یا فن تعمیر کے وہ نمونے جو قوموں اور تہذیبوں کی تمدنی تاریخ کے ارتقائی مراحل میں رونما ہوتے ہیں، وہ اپنے قوم وملک کی

تہذیبی وتمدنی تاریخ کا آئینہ دار ہوتے ہیں، جن سے اس قوم کے سیاسی عروج، معاشرتی ارتقا، تہذیبی وتمدنی ترقی اور معاشی خوش حالی کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں مغل دور حکومت کا اگر اس اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے اس ملک اور عالمی فنون لطیفہ کے میدان میں بہت سی اہم یادگاریں چھوڑی ہیں، جو نہ صرف ان کی تمدنی ترقی کا آئینہ دار ہیں بلکہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی فروغ کا ثبوت بھی ہیں۔

17.6.1 فن مصوری

مصوری فنون لطیفہ کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہندوستان کی مغل حکومت نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ مینا طوری مصوری (Miniature Painting) جو پوری طرح کاغذ پر بنائی جاتی ہے، اسے مغل بادشاہوں نے بڑے پیمانے پر ترقی دی۔ شروع میں یہ فن ایرانی مصوری کا ایک حصہ تھا جس میں لکیروں کی صفائی اور تفصیلات کی صحت پر زور دیے جانے کے ساتھ تناظر سے ارادتاً گریز کیا جاتا تھا۔ اس فن کے دو ابتدائی استاد عبدالصمد اور میر سید علی تھے۔ یہ دونوں 56-1555ء میں ہمایوں کے ساتھ ایران سے آئے تھے۔ اکبر نے اپنے عہد میں فنون لطیفہ خاص طور پر مصوری کی طرف خصوصی دھیان دیا اور اس نے ان ایرانی مصوروں کے ارد گرد فن کاروں کا ایک نیا گروہ تیار کرلیا، جن میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اور حوصلہ تھا۔ اس مقصد سے اس نے مصوری کے ایک اسکول کی بنا ڈالی، جس میں 'حمزہ نامہ' کی تصویریں بنانے کا کام شروع ہوا۔ اس کے بعد کئی دوسرے مخطوطوں کو تصویروں سے مزین کرنے کا کام کیا گیا، جو اکبر کے عہد میں مستقل جاری رہا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ملک کے مختلف حصے سے مصوروں کو یکجا کیا گیا تھا۔ نتیجتاً مصوری کے مختلف طرز جو ملک کے مختلف حصوں مثلاً مالوہ، گجرات، راجستھان، گوالیار اور کشمیر میں پنپ رہے تھے، اب اکبر کے اسکول میں بنائی گئی تصویروں میں جھلکنا شروع ہوگئے۔ ان ملکی طرز کے ساتھ تفصیلات پر مخصوص توجہ، جو ایرانی مصوری کا بنیادی عنصر ہے، نہ صرف مغل مصوری میں برابر جاری رہی، بلکہ اکبر کی خصوصی توجہ اور عبدالصمد و دوسرے فن کاروں کی کارگزاری کی بدولت اس میں مزید گیرائی پیدا ہوگئی۔ ابوالفضل نے ان مصوروں کی ایک فہرست دی ہے، جن میں خاص طور پر وہ دساونت اور جسونت کی ذہانت وفطانت کی تعریف کرتا ہے۔ مخطوطوں میں موجود مصوری کے نمونوں میں بہت سے دوسرے مصوروں کے نام بھی درج ملتے ہیں۔ اس طرح اس عہد میں مصوری کے ان نمونوں کا بھی پتہ چلتا ہے، جن کو کئی مصوروں نے مل کر تیار کیا تھا۔ ایسی صورت میں شکلیں اتارنے کا کام ایک مصور کرتا تھا اور تزئین وآرائش کسی دوسرے مصور کی ذمے داری ہوتی تھی، بعض اوقات ایک تیسرا مصور بھی اس کام میں شریک ہوجاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں تخلیقی عمل کی امتزاجی کیفیت کا نمایاں ہوجانا قدرتی امر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مصوری میں، چاہے وہ شبیہوں اور اشکال کا بنانا ہو یا قدرتی مناظر یا تاریخی واقعات کی تصویر کشی، حقیقت پسندی پر بہت زور دیا جاتا تھا، جس پر خود ابتدا ہی سے اکبر کا اصرار تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں اکبر کو یورپی مصوری کے نمونوں میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے بعد نہ صرف عیسائیت سے مستعار مذہبی پیکر بلکہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور کے دوسرے عوامل بھی مغل مصوری میں جھلکنے لگے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ مغل مصوری میں تناظر اور تناسب پر خاص توجہ دی جانے لگی تھی۔

جہاں گیر کے عہد میں ہر اعتبار سے مغل مصوری اپنے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اس دور میں کتابوں کی تزئین وآرائش سے ہٹ کر مصوروں نے البم اور افراد کے اشکال تیار کرنے شروع کردیے تھے۔ جہاں گیر کو افراد کی شکلیں (Portrait) تیار کروانے اور جانوروں، پیڑوں، پودوں

اور پھولوں کے خاکے (Sketch) بنوانے میں خاصی دلچسپی تھی۔ خاکے تیار کرنے میں منصور کو استاد کا درجہ حاصل تھا۔ اس قسم کی مغل مصوری کس حدتک دل کو چھو جانے والی ہو سکتی تھی، اس بات کا اندازہ مرض الموت سے دوچار ایک شخص کی شبیہ سے لگایا جاسکتا ہے، جو کسی نامعلوم مصور نے جہاں گیر کے حکم سے تیار کیا تھا۔ اس شبیہ کی خاص بات یہ ہے کہ جذبات کو چھو لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مغل طرز کی مخصوص انفرادیت بھی موجود ہے۔

شاہ جہاں کے دور حکومت (59-1628ء) خصوصاً داراشکوہ کی زیر سرپرستی فن مصوری ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا تھا۔ گرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں مصوری کے نمونوں کی فراوانی اور ان کی کل تعداد میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ بچتر کی 'صوفی نغمہ سرا' جس میں عام انسانوں کو سرراہ بیٹھا دکھایا گیا ہے، بلاشبہ مغل مصوری کی شاہ کار ہے۔ جہاں اس تصویر کی حقیقت پسندی نشاۃ ثانیہ کے دور کی یورپی مصوری کی یاد تازہ کرتی ہے، وہیں دوسری طرف اس میں تفصیلات پر مخصوص توجہ کلاسیکی مغل مصوری کی روایت کے عین مطابق ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مغل مصوری نے اپنے فن کی نمائش کو جنگ، شکار، درباری تقریبات اور علما کے اجتماعات جیسے موضوعات تک محدود رکھا۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ مغل مصوری کے زیادہ تر نمونے انھیں موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایرانی مصوری کی طرح مغل مصوری بھی بنیادی طور پر جمہوری موضوعات پر مشتمل ہے۔

علاقائی اور صوبائی حکومتوں میں موجود مصوری کے اسکولوں اور بازار میں بنے مرقعوں کو فروخت کرنے والے مصوروں کے ذریعے دربار میں پروان چڑھنے والے مغل طرز کا اثر دور دور تک پھیلتا گیا۔ بالآخر اٹھارہویں صدی میں اس عمل کے نتیجے میں کئی صوبائی یا علاقائی رجحانات وجود میں آگئے، جن کے درمیان پوری طرح سے مسابقت کا فقدان تھا، مثال کے طور پر پٹنہ اسکول اور اودھ اسکول وغیرہ۔ اسی طرح سے راجستھان اور مغربی ہمالیہ میں راج پوت اور پہاڑی اسکول وجود میں آگئے، جن میں جمہوری موضوعات کے ساتھ ساتھ بھکتی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی، خصوصاً کرشن اور رادھا سے عبارت تصویریں زیادہ اہم تھیں۔

17.6.2 فن موسیقی اور رقص

مغل عہد میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو بہت ترقی ملی۔ خاص طور پر اس عہد میں موسیقی کو ہندو۔مسلم اتحاد کا ایک اہم ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستانی موسیقی کے ان نظری اصولوں کو بخوبی سمجھا جانے لگا، جن کا ذکر سنسکرت تحریروں میں موجود ہے۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ان اصولوں کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نے موسیقی کے 36 ان استادوں کے نام دیے ہیں، جو اکبر کی ملازمت میں تھے۔ ان میں مغنی اور سازندے دونوں شامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام تان سین کا ہے۔ اکبر کے دربار میں تان سین کی بڑی پذیرائی ہوئی، جو بہت سے راگوں کا موجد شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے مغل عہد میں موسیقی کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تان سین کے ذریعے مغل عہد میں موسیقی کے ایک اسکول کی بنیاد پڑ گئی۔ روایتی طور پر یہ خیال ہے کہ کلاسیکی موسیقی میں 'کناڑا زبان' کی جگہ شمالی ہندوستان کی زبان اور خاص طور پر گوالیار کی بولی کا استعمال پندرہویں صدی کے اواخر میں گوالیار کے راجہ مان کے زمانے سے شروع ہوا۔ اب اس عہد میں 'دھرپد' موسیقی کا سب سے مقبول طرز بن گیا۔ نائک بخشو کو اس طرز کا استاد شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سولھویں صدی کے اوائل سے ایک نیا طرز وجود میں آیا، جس کو 'خیال' کا نام دیا گیا۔ اس طرز میں موسیقی کار کو برجستہ انداز میں تکمے لگانے کا موقعہ تھا۔

موسیقی کی ترقی میں اکبر کے جانشینوں جہاں گیر اور شاہ جہاں نے اسی کی پیروی کی، ساتھ ہی مغل امراء نے بھی موسیقی کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔ اورنگ زیب کے ذریعے موسیقی کا جنازہ نکالنے سے متعلق تاریخی کتابوں میں بہت سی غیر مستند روایتیں موجود ہیں۔ مگر جدید تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار میں مغنیوں پر پابندی عائد کی نہ کہ موسیقی کے آلات پر۔ اورنگ زیب خود ایک باکمال وینا ساز تھا۔ اسی طرح سے اورنگ زیب کے دور حکومت میں کلاسیکی ہندوستانی موسیقی پر فارسی زبان میں متعدد کتابیں تحریر کی گئیں۔ اس بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ملک میں موسیقی کا فروغ ہوتا رہا۔ مغل عہد میں موسیقی کے شعبہ میں آخری اہم کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں محمد شاہ کے دور حکومت (48-1720ء) میں ہوا۔

مغل مصوری کے نمونوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مغل دربار میں آہستہ آہستہ وسط ایشیا کے سازوں اور رقاصی کی جگہ ہندوستانی سازوں اور رقص کے طریقوں نے لے لی۔ 'بابرنامہ' کی ایک تصویر میں بابر کو ہمایوں کی پیدائش کے موقعے پر جشن مناتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں چار مرد اور تین عورتیں مختلف قسم کے ساز بجاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور ایک مرد ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ایک عورت کے ساتھ جو سر سے پیر تک ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہے، سازوں کی تال پر رقص کر رہے ہیں۔ رقص کے اس وسط ایشیائی منظر کا مقابلہ 'پادشاہ نامہ' کی ایک تصویر سے کیا جاسکتا ہے، جس میں شاہ جہاں کی بیالیسویں سال گرہ کی تقریب دکھائی گئی ہے۔ 'پادشاہ نامہ' کی تصویر میں پندرہ سے زیادہ مرد بیٹھے ہوئے یا کھڑی حالت میں مختلف قسم کے ساز بجا رہے ہیں اور تین مرد اور ایک لڑکا کچھ گا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے دس عورتیں ہیں، جن میں ایک کے سوا سب کی سب ہندوستانی لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ ان کے اوپری کپڑے اتنے شفاف اور باریک ہیں کہ ان کے نیچے جو کسے ہوئے کپڑے پہنے ہیں، وہ صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان عورتوں میں سے ہر ایک رقص کی کسی نہ کسی حالت میں ہے لیکن رقص کرنے والوں میں کوئی مرد شامل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دربار میں رقص کا فن عورتوں تک محدود تھا، جو 'لولیاں' یا 'کنچنیاں' وغیرہ جیسے ناموں سے پکاری جاتی تھیں اور دربار تک پہنچنے سے پہلے انھیں کافی ترتیب دی جاتی تھی۔ جہاں گیر کے ایک امیر اسلام خاں فتح پوری کی ملازمت میں ایسی عورتوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی تنخواہوں پر ہر مہینہ اسلام خاں -/80,000 روپیہ خرچ کرتا تھا۔ مگر تاریخی کتابوں میں ان عورتوں کی مخصوص فن کاری کی تفصیلات کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔

17.7 فن تعمیر

فنون لطیفہ کے میدان میں ہندوستانی مغل حکمرانوں کی سب سے اہم یادگاریں فن تعمیر کے میدان میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان عمارتوں کی جس بڑے پیمانے پر منصوبہ سازی کی گئی، ان میں پائی جانے والی عمارتی تفصیلات، ان کی نفاست، آرائش و زیبائش اور ان کا جمال دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ مغل عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کی بنیادی تکنیک اور ان کے مختلف النوع خاکوں کو مختلف عناصر سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان میں ایک بڑا حصہ ان اشکال کا ہے جن کو سلطنت کے فن عمارت سازی نے عطا کیا۔ اس سلسلے میں گنبد، محراب اور قوسی چھت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مغلوں نے بہت سی نئی جہات اور عمارتی اشکال ان صوبائی طرز تعمیر سے مستعار لیں جو سلطنت کی عمارتوں سے شروع ہو کر گجرات، راجستھان، مالوہ، مشرقی سلطنت اور بنگال میں نمایاں ہوتی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی متعدد نئے آرائشی طریقے وسط ایشیا اور ایران سے یہاں لائے گئے، جن میں ابھرے ہوئے گنبد، پچی کاری کا کام اور مربع قطعات میں باغات کی ترتیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاں

تک پانی کی موجودگی سے لطیف کیفیات پیدا کرنے کا تعلق ہے، ہندوستان، ایران اور وسط ایشیا تینوں جگہوں کی تعمیراتی روایتوں میں یہ خصوصیت مشترک ہے، لیکن مغل عمارتوں میں ان روایتوں کو نہ صرف ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا گیا ہے بلکہ اس کا زیادہ دل کش پہلو تجربہ اور ندرت سے عبارت وہ رجحان ہے جو مغل تعمیراتی روایت میں جاری وساری نظر آتا ہے۔ دور اکبر کے محل نما شہر فتح پور سیکری میں یہ رجحان نہایت تابناک انداز میں ملتا ہے۔ یہاں پر محراب اور کڑیوں سے عبارت تعمیراتی اصولوں کو نہایت سلیقے سے یکجا کر کے بہت خوب صورت اور دل کش عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ شاہ جہاں کا تاج محل ایک مستند تعمیراتی کارنامہ ہے، جس میں ہر وہ خوبی اور حسن موجود ہے جو مغل حکمراں اپنی عمارتوں میں پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔

جہاں تک مغل عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تاریخی شواہد اور حوالوں کی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے بانی بابر کے دور حکومت (30-1526ء) میں بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن اس عہد کی باقی بچی عمارتوں میں صرف دو مسجدوں کا نام لیا جا سکتا ہے ایک پانی پت میں واقع ہے اور دوسری سنبھل میں۔ اسی طرح سے ہمایوں کو اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے پیش نظر بہت زیادہ عمارتیں تعمیر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مورخین آگرہ اور حصار میں اس کے ذریعے بنوائی گئی کچھ مسجدوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حقیقی طور پر مغل فن تعمیر کی تاریخ کی ابتدا اکبر کے دور حکومت (1605-1556ء) سے ہوتی ہے، جب اس نے عظیم سلطنت کے قیام کے بعد ملکی صلاحیتوں کو استعمال کرنا اور ہندوستانی فن تعمیر کے نمونوں سے فیضان حاصل کرنا شروع کیا۔

مغل طرز تعمیر کا پہلا نمونہ ہمایوں کا مقبرہ ہے جو 1564ء میں دہلی میں تعمیر کیا گیا۔ اس عمارت کے بارے میں عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس عمارت کا تصور ایرانی ہے لیکن کاری گری ہندوستانی۔ یہ عمارت ایک بڑے اور اونچے چبوترے پر کھڑی ہے، جس کے اوپر گنبد اور چاروں طرف چھتریاں اور کوشکیں ہیں۔ مرکزی عمارت کے چاروں پر ایک چوگوشہ باغ ہے جو دیوار سے گھرا ہوا ہے اس باغ کو سیراب کرنے کے لیے نالیاں بنی ہوئی ہیں جو ایک دوسرے میں سے گزرتی ہوئی مختلف سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔ ہمایوں کی وفات کے بعد یہ مقبرہ اس کی ایک بیوی حمیدہ بانو بیگم نے تعمیر کرایا۔ یہ خوب صورت مقبرہ ایک ایرانی ماہر فن تعمیر ملک مرزا غیاث کی زیر نگرانی ہندوستانی کاری گروں اور راج گیروں کے ذریعے تعمیر کیا گیا۔ اپنی انھیں خصوصیات کی بنا پر اسے ہند، ایرانی فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ شمار کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں اکبر نے آگرہ کے قلعے کو دوبارہ تعمیر کروایا، جس میں زیادہ تر لال رنگ کا ریتیلا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اکبر کے عہد میں آگرہ کے قلعے میں تقریباً 500 عمارتیں تعمیر کی گئیں، لیکن ان میں سے آج صرف چند ہی محفوظ ہیں۔ فتح پور سیکری شہر کی بنیاد 1570ء میں پڑی، یہاں بھی لال ریتیلا پتھر زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اس جگہ پر جس قسم کی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا گیا ہے وہ تعمیر کے اصولوں اور استعمال کیے گئے سامان کی قیود سے باہر کی چیز معلوم ہوتی۔ عمارتوں اور محلوں کے اس انبوہ کا خاکہ اکبر نے اس وقت تیار کیا تھا، جب اس کے مذہبی افکار و خیالات میں اس طرح کی تبدیلیاں نہیں رونما ہوئی تھیں، جو بالآخر بعد کے دور میں وقوع پذیر ہوئیں۔ اس لیے فنون لطیفہ کے بعض مورخین کا یہ کہنا پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ یہاں محراب اور کڑیوں سے عبارت تعمیرات کے اصولوں کو یکجا کرنے کے پیچھے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا جذبہ کارفرما تھا۔ حقیقت میں اس بات کی بھی کوئی سند موجود نہیں ہے کہ تعمیرات کے ان اصولوں کی ہندو اور مسلم خانوں میں تقسیم کا اکبر کو احساس بھی تھا۔ لیکن اتنا ضرور واضح ہے کہ اسے عمارتوں کو صرف محرابی یا خمیدہ اشکال میں ہی دیکھنا پسند نہیں تھا۔ اس کے لیے شاید ان کا تنوع

زیادہ دل فریب تھا۔ ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں پر کس طرح اس نے ایسی تعمیرات کو بکھرے ہوئے تناسب کی حامل عمارتوں کے درمیان رکھ کر ایک عمدہ معیار کی چیز بنا دی ہے، جو اپنی جگہ پر بے مثال اور غیر معمولی ہیں۔ فتح پور سیکری کی عظیم مسجد کا مغل طرز میں بنا ہوا بلند دروازہ سامنے کی طرف یوں کھڑا ہے کہ اس کی مدد سے محلوں اور اس کے احاطوں اور تالابوں کی قطار بندی نکالی جا سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اٹنگن ندی پر بند باندھ کر اس کے پانی کو چرخیوں کے ذریعے اٹھانے کے بعد مرتفع نالیوں کے ذریعے محلوں کے حوضوں تک پہنچایا گیا ہے۔

سکندرہ میں واقع اکبر کا مقبرہ، جو اس کے بیٹے جہاں گیر کے عہد (27-1605ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، کسی طرح بھی کم ندرت کا حامل نہیں ہے۔ اس میں ستونوں پر کھڑی کئی منزلہ عمارت کا اوپری حصہ سنگ مرمر سے بنا ہے، جس سے گنبد غائب ہے۔ اس عہد میں سنگ مرمر کا استعمال عام ہو گیا تھا اور زیادہ پسند کیا جانے لگا تھا۔ آگرہ میں واقع اعتمادالدولہ (وفات 1622ء) کا نہایت خوب صورت مقبرہ، جس میں کئی ایرانی خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں، اس رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس عمارت میں اور لاہور میں تعمیر شدہ جہاں گیر کے مقبرے میں بھی گنبد کا موجود نہ ہونا ایک قابل توجہ بات ہے۔

شاہ جہاں کا دورِ حکومت (58-1628ء) مغل فن تعمیر کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ آگرہ میں تعمیر کروایا، جو اب تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔ جمنا ندی کے کنارے پر واقع یہ مقبرہ دراصل ایک چھوٹے سے شہر کا حصہ معلوم ہوتا ہے، جس کا خاکہ نہایت اچھے طریقے سے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں پر دکانیں اور کارواں سرائے وغیرہ موجود ہیں۔ انھیں ایک چوکور نقشے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ مقبرہ کی مرکزی عمارت مکمل طور پر سنگ مرمر سے تیار کی گئی ہے۔ اس کے دونوں بازوؤں کی سمت میں سرخ ریتیلے پتھروں کی عمارتیں ہیں اور سامنے کی طرف ایک عمدہ دروازہ ہے۔ ان تینوں عمارتوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ مرکزی عمارت اور دروازہ کے درمیان نہریں اور پگ ڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں اور دائروں کے شکل کی آرام گاہیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔ یہ سب مل کر اس پورے منظر کو دل کش بنا دیتی ہیں۔ اس کے بعد مقبرے کی سنگ مرمر سے بنی ہوئی مرکزی عمارت اور اس کا چبوترہ ہے، جس کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار کھڑے ہیں۔ مقبرے کے اندرونی حصے پر پیاز کی شکل کا ایک گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ گنبد کے چاروں طرف چار چھتریاں بنی ہوئی ہیں، جن کی انفرادی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے ان کی اونچائی گنبد کی کرسی سے کم رکھی گئی ہے۔ تاج محل میں پچی کاری کا کام اور اس میں جڑے ہوئے نگینوں اور قیمتی پتھروں کا استعمال، خاص طور پر سنگ مرمر میں تراشے ہوئے حسین نقش و نگار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کام کے لیے کاری گروں کی ایک بڑی جماعت کو لگایا گیا تھا، جن میں ہندوستانی اور ایرانی دونوں طرح کے کاری گر شامل رہے ہوں گے۔ شاہ جہاں نے آگرے کے قلعے کی عمارتوں میں کئی قابل ذکر اضافے کیے، جن میں موتی مسجد کافی اہم شمار کی جاتی ہے۔ یہ مسجد زیادہ تر سنگ مرمر کی ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں دنیا کی خوب صورت ترین مسجد ہے۔ اسی طرح شاہ جہاں نے دہلی میں جمنا کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا، جو تاریخ میں شاہ جہان آباد کے نام سے مشہور ہے۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد اس نئے شہر کا حصہ تھے۔ لال قلعے کے اندر اس نے بڑے پیمانے پر خوب صورت محل اور عمدہ عمارتیں تعمیر کرائیں۔ دہلی کی جامع مسجد بلاشبہ مغلوں کی بنائی ہوئی مسجدوں میں عظیم ترین مسجد ہے۔ اس میں سرخ ریتیلے پتھر اور سنگ مرمر کو نہایت موزوں تناسب میں استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل پتھروں کے استعمال میں یہ تناسب اور موزونیت شاہ جہاں کی تمام عمارتوں میں نظر آتی ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں مغل طرز تعمیر کے خط و خال اپنے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر ہونے والی تمام عمارتوں کے میر عمارت اس

عہد کے مشہور ماہر تعمیر استاد احمد شمار کیے جاتے ہیں، خاص طور پر تاج محل، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد انھیں کے زیر نگرانی تعمیر کیے گئے۔ ان کی حیثیت کا اندازہ اس اعتبار سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو مقام و مرتبہ عثمانی سلطنت میں سلیمان اعظم کے دور حکومت میں خواجہ سنان کو حاصل تھا، مغل عہد میں شاہ جہاں کے دور حکومت میں وہی مقام و مرتبہ استاد احمد کو حاصل تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت (1707ء-1659ء) میں بھی تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس زمانے کی تعمیر شدہ عمارتوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو فن تعمیر کی تاریخ میں کوئی خاص مقام مل پاتا۔ اس عہد کی قابل ذکر عمارتوں میں لاہور کی بادشاہی مسجد اور اورنگ آباد میں تعمیر کیا گیا رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ رابعہ دورانی کے مقبرے کو تاج محل کے طرز پر تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ مغل طرز تعمیر کے نمونے صرف دارالسلطنتوں اور بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ پورے ملک کے دور دراز علاقوں تک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسی طرح سے مغل طرز تعمیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عمارتیں صرف مسجدوں، مقبروں، قلعوں اور شاہی محلوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں رفاہ عامہ سے متعلق مختلف عمارتیں تعمیر کروائیں اور یہ تمام بھی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ شمار کی جاتی ہیں۔ مغلوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سے پل بھی تعمیر کروائے۔ ان پلوں میں جون پور میں گومتی ندی پر بنا ہوا پل سب سے اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس پل کی تعمیر 68-1567ء میں ہوئی تھی۔ اس طرح سے مغل عمارت سازی کا ایک اہم شعبہ سرائے کی تعمیر ہے۔ ان کی تعمیر کی ہوئی بے شمار سرائیں موجود ہیں۔ یہ سرائیں عام طور پر چوگوشہ عمارتیں ہوا کرتی تھیں، جن میں وسیع آنگن کے چاروں طرف کمروں اور ان کے سامنے بنے ہوئے دالانوں کی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔ مغل فن تعمیر کا ایک اہم کارنامہ مغربی جمنا نہر بھی ہے۔ یہ نہر شاہ جہاں کے عہد میں بنائی گئی تھی۔ 250 کلومیٹر لمبی مغربی جمنا نہر اینٹ اور چونے سے بنی ہوئی بھاری بھاری نلکیوں کے ذریعے دہلی تک جمنا ندی کی سطح سے کافی اونچائی پر پہنچتی تھی۔ مغل عمارت سازی کی ایک ندرت ان کے ذریعے تعمیر کیے گئے باغات بھی ہیں۔ یہ باغات عام طور پر مغلوں کی بڑی عمارتوں خاص طور پر مقبروں کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ ایسے باغات عام طور پر چار حصوں میں منقسم ہوتے تھے۔ ہر حصے میں پھولوں کی کیاریاں اور پھلوں کے درخت، ان کی آبیاری کے لیے حوض، تالاب، کنویں اور پختہ نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ بعض اوقات ان کے درمیان ایسے بنگلے یا شہ نشین بنے ہوتے تھے، جن میں کمرے ہوں اور ان پر گنبد کا چھت ہو۔ زیادہ تر ایسے باغات ذاتی ملکیت میں تھے، لیکن بعض میں عام لوگوں کو اندر جانے کی اجازت تھی۔

مغل طرز تعمیر کی انھیں خصوصیتوں کی بنا پر اس عہد میں مغل طرز تعمیر کی نقالی کا عام رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں آمبیر کے حکمرانوں نے خاص کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے پہلے پہل سترہویں صدی عیسوی میں مشرقی راجستھان میں آمبیر کے محلوں کا پورا سلسلہ تعمیر کیا اور پھر اٹھارہویں صدی عیسوی میں جے پور کا پورا نیا شہر آباد کیا۔ اس کے علاوہ 1590ء میں متھرا کے قریب وندرابن کے مقام پر اکبر کے امیر آمبیر کے حکمراں مان سنگھ نے گووند دیو کا مندر تعمیر کرایا، جس میں مغل طرز تعمیر پوری طرح جھلکتا ہے۔ اس بڑی عمارت کو گنبد اور ڈاٹوں سے اس طرح ڈھکا گیا ہے کہ مرکزی کمرے کے اوپر بنے ہوئے گلیارے ایک صلیب کی شکل اختیار کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ عمارت کسی کلیسا سے مشابہ نظر آتی ہے۔ جہاں گیر کے عہد میں بیر سنگھ بندیلہ کے ذریعے بنوائے گئے چتر بھج کے مندر میں بھی مغل طرز تعمیر کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ امرتسر میں واقع سکھوں کے ہرمندر جو گولڈن ٹمپل کے نام سے مشہور ہے، میں بھی مغل طرز تعمیر کی بنیادی خصوصیت یعنی محراب

اور گنبد کے ساتھ ساتھ بہت سارے مغل طرز کے نمونوں کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔

مغل طرزِ تعمیر کی اپنی خوبیوں کے باوجود اس عہد یعنی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں دکن کی سلطنتوں میں فروغ پانے والے طرزِ تعمیر کو کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 1591ء کا بنا ہوا حیدر آباد کا چار مینار ایک دروازے کی عمارت ہے، جس میں چاروں سمتوں میں باہر جانے کا راستہ ہے۔ ایک دوسرے پر کھڑے ستونوں کی قطاروں کے ذریعے اس عمارت کی کئی منزلیں اوپر اٹھتی ہیں اور اس کے چاروں کونوں پر چار بھاری بھرکم مینار ہیں، جو اس شہر کی پہچان بن گئے ہیں۔ بیجاپور میں محمد عادل شاہ (وفات 1656ء) کا مقبرہ واقع ہے، جس کو لوگ گول گنبد کے نام سے جانتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک فنی امتیاز یہ ہے کہ اس کا گنبد ہندوستان میں تعمیر شدہ سب سے بڑا صحیح گنبد ہے۔ اس عہد میں جنوبی ہندوستان کے مندروں کی تعمیر میں دراوڑی طرز ہی نمایاں رہا۔ اس بات کا اندازہ مدورا کے میناکشی سندریشور کے مندر اور رامیشورم کے لنگیشور مندر سے لگایا جا سکتا ہے، جو بالترتیب سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئے۔ آخر الذکر مندر میں 650 میٹر طویل ایک اندرونی غلام گردش ہے، جس کی چھت سنگ تراشی سے مزین بھاری ستونوں پر استوار ہے۔ دراوڑی طرزِ تعمیر کیرل میں بھی جا پہنچا تھا۔ تری ونت پورم میں تعمیر شدہ پدم نبھ سوامی کا مندر اسی طرز کا بنا ہوا ہے۔ اس مندر میں بڑے پیمانے پر لکڑی کا استعمال کیا گیا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تنجاور کا ایک مندر گرچہ باہر سے عام مندروں کی مانند ہے، لیکن 60 میٹر اونچائی والے اس مندر کے بالائی حصے پر کسی قلعے کی برجی کی شکل کو تعمیر کرنے کے لیے محرابی طرزِ تعمیر بروئے کار لایا گیا ہے۔

17.8 خلاصہ

عالمی تاریخ میں بالعموم اور مسلم و ہندوستانی تاریخ میں بالخصوص مغل دورِ حکومت کو ایک امتیازی مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ یہ مرتبہ و مقام اسے سیاسی عروج و استحکام کی بنا پر حاصل نہیں ہوا بلکہ اس دورِ حکومت میں جس طرح سے تہذیبی و تمدنی جلوے بکھیرے گئے اور علوم و فنون اور سائنس و حکمت کے شعبوں میں جو کارنامے انجام دیے گئے، اس کا نتیجہ ہے۔ مغل دورِ حکومت میں پورے ملک میں علمی و عملی سرگرمیاں انجام دی گئیں۔ اس کے لیے ملک کے ہر حصے میں اسکول و مدارس کا جال بچھایا گیا، اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے گئے، طلبہ کے لیے رہائش گاہوں اور کتب خانوں کا انتظام کیا گیا اور انھیں ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ملک میں تعلیمی فضا ہموار ہو۔ ملک میں علمی و تعلیمی فضا ہموار کرنے میں حکمراں، امراء اور عوام الناس سبھی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے اور ان کے یہ علمی کارنامے علم کے تمام شعبوں پر محیط ہیں، چاہے وہ مذہبی علوم ہوں یا فنی اور سائنسی۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں علماء، فضلاء اور دانشوروں کا پورا ایک قافلہ رواں دواں نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پورے ملک میں ادبی سرگرمیوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہو۔ اس ادبی سیلاب سے ملک کی تمام زبانیں اور بولیاں سیراب ہو رہی ہیں، چاہے وہ سرکاری یا قومی زبانیں ہوں چاہے صوبائی یا علاقائی۔

مغل عہدِ حکمت میں ان علمی، تعلیمی، سائنسی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیف کے تمام شعبوں میں بھی بڑے پیمانے پر کارنامے انجام دیے گئے۔ ہندوستان نے مغل دورِ حکومت میں مصوری کے میدان میں عالمی شہرت حاصل کی۔ اسی طرح موسیقی، خطاطی اور صنعتی فنون کو بھی اس عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ فنِ تعمیر مغل دورِ حکومت کے تہذیبی و ثقافتی مظہر کا ایسا شعبہ ہے، جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ مغل

عہد حکومت میں ملک کا کوئی بھی ایسا حصہ باقی نہیں بچا، جہاں پر انھوں نے اپنے اعلیٰ تعمیراتی نمونے کے مظاہر نہ چھوڑے ہوں۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ میں مغل دور ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

17.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. مغل دور کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔
2. مغل عہد کی علمی وسائنسی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

3. فنون لطیفہ میں مغلوں کی حصہ داری کی وضاحت کیجیے۔
4. مغل دور کی تعمیراتی ترقیوں کا جائزہ لیجیے۔

17.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی، پروفیسر این این لا، اردو ترجمہ: اخلاص حسین زبیری وسلطان فاطمہ بلخی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی

2۔ عہد وسطیٰ کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ عرفان حبیب، اردو ترجمہ: اقتدار عالم خاں، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، 2010ء

3۔ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، بی این پانڈے، اردو ترجمہ: تقی رحیم، خدابخش اورینٹل، پبلک لائبریری، پٹنہ 1998ء

4۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم: ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

5۔ اسلامی ہند میں علوم عقلیہ، شبیر احمد خاں غوری، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1997ء

6۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

7۔ آئین اکبری، ابوالفضل، اردو ترجمہ: مولوی محمد فدا علی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

8۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

اکائی 18 : دورِ زوال اور حکومت کا خاتمہ

اکائی کے اجزاء

18.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مغل سلطنت کے زوال اور خاتمے کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے اور انھیں اس بات سے واقف کرانا ہے کہ وہ کون سے حالات اور اسباب تھے، جن کی وجہ سے ایک ایسی حکومت جس نے ہندوستان پر صدیوں حکومت کی، اپنی مضبوطی و پائیداری اور وسعت میں اپنی مثال آپ ہے، زوال کا شکار ہوئی۔ اس اکائی کا مقصد طلبہ کو عہد زوال کے حکمرانوں سے متعارف کرانا بھی ہے۔ اس کے ساتھ اس اکائی میں مغل سلطنت کے زوال میں کارفرما عوامل اور محرکات کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا جائے گا تاکہ طلبہ ان تمام حقائق سے بخوبی واقف ہوسکیں اور انھیں اس بات کی آگہی ہو کہ مغل سلطنت کیوں کر روبہ زوال ہوئی؟

18.2 تمہید

پچھلی اکائیوں میں آپ ہندوستان میں مغل حکومت کے قیام، عروج واستحکام اور مسلم و ہندوستانی تہذیب وتمدن میں ان کے ذریعے کیے گئے اضافے کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس مطالعے کے بعد آپ بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے کہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب وثقافت میں مغلوں کا اضافہ غیر معمولی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ گزشتہ حکومتوں سے زیادہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی حکومت، جس نے اپنے عروج واستحکام کے زمانے میں ترقی کے اعلیٰ منازل کو طے کیا تھا، 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی زوال کا شکار ہوگئی۔ پھر اس کے بعد اس سلطنت میں کوئی بھی ایسا حکمراں نہیں پیدا ہوسکا جو اس زوال اور سکوت کو

روک سکے بلکہ دھیرے دھیرے سلطنت مغلیہ سمٹتی گئی اور 1857ء میں پوری طرح سے اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

18.3 سلطنت مغلیہ کا زوال

یہ نہ صرف ایک تاریخی حقیقت بلکہ قانون فطرت بھی ہے کہ ہر عروج کے لیے زوال ہے اور اس بات کا اطلاق فرد کی انفرادی زندگی سے لے کر سماج اور قوم کی اجتماعی زندگی تک ہر سطح پر ہوتا ہے، اگر ہم اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی تاریخ کے کسی دور میں ترقی اور عروج کے منازل طے کیے۔ عروج اور ترقی کی ایک خاص سطح پر پہنچنے کے بعد ان کا زوال شروع ہوگیا۔ اسی لیے عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی کا نقطۂ انتہا ہی اس کے زوال کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ حکومتوں اور قوموں کی ترقی وخوش حالی اور عروج واستحکام کے زمانے میں ارباب اختیار واقتدار کی جانب سے جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، اگر وقت پر ان کے تدارک کے اقدامات نہیں کیے جاتے، تو بہت جلد وہ مرض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہی مرض ان کے زوال وادبار اور ہلاکت وخاتمے کا سبب بن جاتا ہے۔ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کے عروج وزوال میں بھی یہی فطری قانون پنہاں نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی عظیم مغلیہ سلطنت کا آغاز 1526ء میں پانی پت کی پہلی جنگ میں ابراہیم لودھی کی شکست اور ظہیر الدین محمد بابر کی تخت نشینی سے ہوا۔ جلد ہی اس خاندان کے حکمرانوں نے اس حکومت کو وقت کی ایک اہم اور عظیم سلطنت میں تبدیل کر دیا، جو جنوبی ایشیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے ہی ہندوستان میں مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا۔ اسی وجہ سے ہندوستانی تاریخ میں اورنگ زیب کی وفات کو ایک عہد کے خاتمے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سالوں کے اندر ہی پوری مغلیہ سلطنت بکھر چکی تھی۔

عام طور پر مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے تصور کی جاتی ہے، جب کہ اس کی علامتیں، خاص طور پر زرعی بدعملی اور جاگیرداری نظام کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کی صورت میں بہت پہلے شمالی ہند میں بھی ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ مغلوں نے عام بے چینی کو دور کرنے کی غرض سے بعض رعایتیں دیں۔ مثلاً 1713ء میں جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ بہادر شاہ اول نے مراٹھوں کو خوش کرنے کے لیے شیواجی کے پوتے شاہو کو قید سے آزاد کر دیا۔ راج پوت سرداروں کا اونچے منصبوں اور گورنوں کے عہدوں پر تقرر کیا گیا، لیکن ان تمام کے باوجود بھی دربار میں اندرونی خلفشار بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر نئے حکمراں کے تخت پر آنے کے وقت مختلف دعوے داروں کے درمیان جنگوں نے اس خلفشار کو بڑھاوا دیا۔ محمد شاہ کے عہد میں مرکزی حکومت بتدریج کمزور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ گورنروں نے اپنے تبادلے کے احکام کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا اور خود مختار بنتے چلے گئے۔ یہ بات خاص طور پر دکن کے وائس رائے اور بنگال واودھ کے صوبے داروں پر صادق آتی ہے۔

ان حالات کے پیدا ہونے سے مغلوں کی عسکری طاقت کمزور ہوگئی۔ مختلف قسم کے آتشی ہتھیاروں مثلاً توپ بندوق وغیرہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور میدان جنگ میں گھڑ سوار تیر اندازوں کی برتری تیزی کے ساتھ ماند پڑنے لگی۔ اس وجہ سے منصب داری ایک عسکری نظام کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھوتی جا رہی تھی۔ 1737ء میں ایک لمبی جدوجہد کے بعد مراٹھوں نے مالوہ اور گجرات پر قبضہ جما لیا۔ اب وہ ان علاقوں پر مغل بادشاہوں کے حکمرانی کے دعوے کو برائے نام ہی قبول کرتے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد یعنی 1739ء میں نادر شاہ کی رہنمائی میں ایرانی

حملے نے مغل سلطنت کی حالت کو مزید ابتر کر دیا۔ دہلی پوری طرح سے تاراج کر دیا گیا اور وہاں پر جو دولت موجود تھی اسے لوٹ لیا گیا۔ اسی طرح سے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع صوبہ کابل کا پورا علاقہ اب مغلوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اس کے ساتھ سندھ کا صوبہ بھی چلا گیا۔ اس تباہی نے مغل سلطنت کے زوال کے عمل کو مزید تیز کر دیا۔ پنجاب میں سکھوں کی بغاوتیں بھڑک اٹھیں۔ روہیلہ سرداروں نے دہلی کے مشرق میں واقع علاقوں پر اپنا دبدبہ قائم کر لیا۔ جاٹوں نے اپنے سردار سورج مل کی رہنمائی میں دہلی کے جنوب میں حکومت قائم کر لی۔ دور دراز کے صوبوں پر بھی اب عملی طور پر کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں مراٹھا طاقت تیزی سے ابھری اور 1771ء سے 1803ء تک مغل شہنشاہ مراٹھا سرداروں کے کنٹرول میں رہا۔ 1803ء میں انگریزوں نے انھیں دہلی سے بے دخل کر دیا اور اب مغل شہنشاہ انگریزوں کے کنٹرول میں آ گیا۔ بالآخر 1857ء میں انگریزوں نے مغل سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

18.4 دورِ زوال کے حکمراں

اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی اس کے بیٹوں میں جانشینی کے لیے جنگ شروع ہو گئی۔ جس کا خاتمہ بڑے بیٹے محمد معظم کی فتح اور جانشینی کے ساتھ ہوا۔ جس وقت محمد معظم مغل سلطنت کا حکمراں بنا اس وقت اس کی عمر 65 سال تھی۔ محمد معظم (1712ء-1707ء) نے بہادر شاہ اول اور شاہ عالم اول کے نام سے پانچ سال تک حکومت کی۔ اس عہد میں آسام بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا تھا، جب کہ دیگر بہت سے علاقے مغل سلطنت سے الگ ہونا شروع ہو گئے۔ اورنگ زیب کے سخت گیر دورِ حکومت کی گھٹن کے نتیجے میں ملک بھر میں بغاوتیں سر ابھارنے لگی تھیں۔ جنوب اور مغرب میں مراٹھوں، شمال میں پٹھانوں، سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتیں شدید ہو گئیں۔ بہادر شاہ اوّل نے مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور اس نے راجپوتوں، مراٹھوں، بندیلوں، جاٹوں اور سکھوں سے مصالحت اور تال میل کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود بھی اس دور میں مراٹھے اور سکھ طاقتور ہوتے گئے۔ مغلیہ سلطنت کے پاس اب کوئی ایسا لیڈر نہیں رہا تھا جو ان تمام بغاوتوں کو کچل سکتا۔ بہت سے مسلم منصب داروں نے بھی بغاوتیں کرتے ہوئے اپنی اپنی ریاستوں کی آزادی کا اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1712ء میں 69 سال کی عمر میں بہادر شاہ اول کا انتقال ہوا اور دہلی میں مشہور صوفی بزرگ بختیار کاکی کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

جانشینی کے لیے جنگ مغلیہ خاندان کا ایک خاصہ تھی اور بہادر شاہ اول کے انتقال کے بعد اس میں مزید شدت آئی۔ اس کی سب سے بنیادی وجہ امراء و رؤسا کا طاقتور ہونا شمار کیا جاتا ہے، حکومت میں اعلیٰ مناصب کے حصول کے لیے امراء کے مختلف گروہ جانشینی کے الگ الگ دعوے داروں کا ساتھ دیتے، جس کا آخری فیصلہ جنگ کے ذریعہ ہوتا۔ جہاں دار شاہ (1713ء-1712ء) جو بہادر شاہ اول کا جانشین ہوا وہ ایک کمزور اور نا اہل حکمراں تھا، مغل حکمرانوں میں اس کا شمار ایک کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی نا اہلی اور مضبوط قیادت کے بحران کی وجہ سے دربار میں سازشیں عروج پر پہنچ گئی تھیں، جہاں دار شاہ نے صرف ایک سال حکومت کی اور مغل سلطنت کے اگلے حکمراں یعنی فرخ سیر (1719ء-1713ء) کے ذریعہ قتل کر دیا گیا۔ فرخ سیر اس دور کی درباری سازشوں کا پیداوار تھا اور خود بھی اسی کا شکار رہا۔ فرخ سیر نے درباری سازشوں سے وجود میں آنے والی خفیہ بادشاہ گر طاقت یعنی سادات برادران کی مدد سے اپنے پیش رو کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کیا اور چھ سالوں تک انھیں کے اشاروں پر ناچتا رہا، جو اس عہد میں مغلیہ سلطنت کے حقیقی حکمراں تصور کیے جاتے تھے۔ بالآخر جب فرخ سیر نے ان سے نجات کی کوشش کی تو نہ صرف حکمرانی سے برطرف ہوا بلکہ انھیں کے ہاتھوں قتل بھی کیا گیا، اس دور کی ایک اہم بات یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے

ایک فرمان جاری کیا گیا، جس میں انھیں بنگال میں بلامحصول تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔

مغلیہ سلطنت پر سادات برادران کی پوری گرفت قائم ہوچکی تھی اور انھوں نے ایک ہی سال میں چار بادشاہ تبدیل کیے تھے، تاریخ میں جن کے نام رفیع الدرجات، رفیع الدولہ یا شاہجہاں دوم، نیکو سیار محمد اور محمد ابراہیم تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بہادر شاہ اول کا 18 سالہ پوتا محمد شاہ (1748ء-1719ء) سید برادران کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے ہی محسنوں کو انجام تک پہنچا کر درباری سازشوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بھی اپنے آباواجداد کی تمام خوبیوں سے محروم تھا۔ آرام طلبی اور عیش پسندی اس کے یہاں بڑے پیمانے پر تھی انتظامی صلاحیت، تدبر اور دوراندیشی سے کوسوں دور تھا۔ اس لیے اسے تاریخ میں بجا طور پر محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد شاہ کا 30 سالہ دور حکومت سلطنت مغلیہ کو دوبارہ مستحکم کرنے کا آخری موقع تھا۔ کیوں کہ اس عہد کی ابتدا تک سلطنت مغلیہ کے اثر ورسوخ اور سیاسی اقتدار میں کوئی فرق نہ آیا تھا، یہ سلطنت اب بھی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود بھی عوام الناس میں اپنا ایک سیاسی مقام رکھتی تھی اور ایک مضبوط، طاقت ور اور اولوالعزم حکمراں مغلیہ خاندان کی حکومت کو بچا سکتا تھا لیکن محمد شاہ اس اہم کام کے لیے کسی بھی طرح موزوں نہ تھا۔ حکومتی وانتظامی امور میں اس کی کوئی بھی دلچسپی نہ تھی اور اس نے کبھی بھی لائق وفائق وزراء کو مکمل تعاون نہ دیا۔ محمد شاہ کی اس کمزور حکمرانی اور امراء ورؤسا کی آپسی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند مضبوط علاقائی امیروں نے اپنی خودمختار اور آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈالی، جن میں حیدرآباد، بنگال، اودھ اور روہیل کھنڈ کی ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ یہ ریاستیں اپنے آپ میں خودمختار تھیں لیکن اس کے باوجود بھی سلطنت مغلیہ کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں اور اس کی وفادار تھیں۔ ان علاقائی ریاستوں کے ابھرنے کی وجہ سے مغل سلطنت دھیرے دھیرے کمزور ہوتی گئی اور انتشار کا شکار ہوگئی۔

داخلی انتشار، خودمختار ریاستوں کے وجود، کمزور انتظامیہ وفوج نے بیرونی حملہ آوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ مغل سلطنت کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1739ء میں ایرانی حکمراں نادرشاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جنگ میں اس نے آسانی کے ساتھ محمد شاہ کو شکست دے کر قید کر لیا۔ ہندوستان کے لیے نادرشاہ کا یہ حملہ بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ دہلی کے باشندے تین سو سال سے امن وامان کی زندگی گزار رہے تھے، تیمور کے قتل عام کے بعد سے ان کو کسی تباہی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، لیکن نادرشاہ نے تیمور کی یاد تازہ کر دی۔ نادرشاہ نے نہ صرف دہلی کو بڑے پیمانے پر تاخت وتاراج کیا، قتل وغارت گری کی بلکہ اپنے ساتھ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرے کے ساتھ ساتھ بے شمار مال ودولت اور خزانہ لوٹ کر ایران لے گیا۔ نادرشاہ کے اس حملے کے بعد مغل سلطنت کا رعب ودبدبہ لوگوں کے دلوں سے نکل گیا۔ ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں سر ابھارنے لگیں۔ سلطنت کے بکھراؤ میں مزید تیزی آگئی۔ مغل صوبے داروں نے مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے صوبوں میں آزاد حکومتیں قائم کر لیں، جن کا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے۔ مغل سلطنت اب صرف دہلی اور اس کے اطراف تک محدود ہو کر رہ گئی۔ محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ (1754-1748ء) عالم گیر دوم (1759ء-1754ء) اور شاہ عالم دوم (1806ء-1759ء) مغل سلطنت کے اس زوال کو نہ روک سکے۔ ان حکمرانوں کی حیثیت امرائے سلطنت کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ امراء مختلف گروہوں میں منقسم تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ یہ امراء اپنے مقاصد کے حصول اور مخالف کو شکست دینے کے لیے اپنے دشمنوں سے مدد لینے میں بھی کوئی عار یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ اسی دور میں شہاب الدین نامی ایک امیر کا اثر ورسوخ مغل دربار میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے پہلے احمد شاہ کو معزول کر کے اسے اندھا کر دیا اور پھر اس کے جانشین عالم گیر دوم کو قتل کر کے اس کے لڑکے شاہ عالم دوم (1806ء-

1759ء) کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن شاہ عالم خوف کی وجہ سے دہلی سے فرار ہو کر الہ آباد چلا گیا اور وہاں پہلے اودھ کے نوابوں اور پھر انگریزوں کی پناہ حاصل کی، جو بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد الہ آباد تک پہنچ چکے تھے۔ جہاں ایک طرف مشرق سے انگریز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے، وہیں دوسری طرف شمال مغرب سے احمد شاہ ابدالی، جو نادر شاہ کے بعد افغانستان کا حکمراں بن چکا تھا، دہلی سلطنت کے صوبوں پر حملے کر رہا تھا۔ وہ 1756ء میں دہلی پر قابض بھی ہو چکا تھا اور شہاب الدین کو دہلی سے بے دخل کر کے واپس بھی چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی پر شہاب الدین نے مراٹھوں کی مدد سے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ہندوستانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مراٹھے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ لاہور تک بڑھتے چلے گئے اور ابدالی کے عہدے داروں کو لاہور سے نکال دیا۔ مراٹھوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے ہندوستانی مسلم دانشوروں اور امراء کو تشویش لاحق ہوئی۔ خاص طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی، روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ اور چند دوسرے امراء نے مراٹھوں کا زور توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ ابدالی اس دعوت پر ایک بار پھر ہندوستان آیا۔ دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں جنوری 1761ء کو ابدالی اور مراٹھوں کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں مراٹھوں کو شکست ہوئی اور ان کے کئی بڑے بڑے سپہ سالار مارے گئے۔ پانی پت کی اس جنگ میں فتح یاب ہونے کے باوجود بھی احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم نہیں کی بلکہ اس نے شاہ عالم کو جو ان دنوں انگریزوں کی پناہ میں الہ آباد میں تھا تخت پر بحال رکھا۔ اودھ کے شجاع الدولہ کو اس کا وزیر اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا اور احمد شاہ ابدالی خود افغانستان واپس چلا گیا۔

1498ء میں پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما کے ذریعے مغرب سے ہندوستان کا نیا بحری راستہ دریافت کرنے کے بعد جنوبی ایشیا کی طرف یورپی تاجروں کی آمد کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جن میں پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز سبھی شامل تھے۔ مغل سلطنت کے دور عروج میں ہی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک میں تجارت کی اجازت حاصل کر لی تھی اور انھوں نے کولکاتہ، ممبئی اور چنئی وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ انھوں نے دھیرے دھیرے اپنی ان تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر لیا اور وہ یہاں پر ہر قسم کا اسلحہ جمع کرنے لگے۔ کولکاتہ میں ہگلی ندی کے قریب پرتگالیوں کی بھی اسی طرح کی ایک بستی تھی، شاہ جہاں کے عہد میں انھوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن شاہی فوجوں نے ان کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں انگریزوں نے ممبئی میں ہنگامہ برپا کیا، لیکن ان کو بھی ناکامی ہوئی اور معافی تلافی کے بعد اورنگ زیب نے انھیں قیام کی اجازت دے دی، مگر دھیرے دھیرے جب مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی اور پورا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مراد بر آئی۔ انھوں نے اپنے تجارتی قلعوں میں فوجوں کی تعداد بڑھالی اور کچھ علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ انھوں نے سب سے زیادہ طاقت کرناٹک کے علاقے میں حاصل کی، جہاں چنئی شہر ان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جب اس علاقے میں وہ طاقت ور ہو گئے، تو انھوں نے بنگال پر حملہ کیا۔ یہ عالم گیر دوم کا دور تھا اور اس وقت بنگال کا حکمراں نواب سراج الدولہ تھا۔ 1757ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ اور انگریزوں کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ چند سالوں بعد 1764ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں نے بنگال کے سابق نواب میر قاسم اور اودھ کے نواب کو شکست دے کر الہ آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔ شاہ عالم نے 1765 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کر دی تھی، جس نے ان علاقوں سے محصول اکٹھا کرنے کا حق کمپنی کو دے دیا۔

پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ گرچہ مراٹھوں کو شکست فاش ہوئی تھی اور چند سالوں کے لیے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا، لیکن ان کی یہ شکست دائمی نہیں تھی۔ چند سالوں بعد مراٹھوں نے پھر شمال کی جانب سے دہلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور 1772ء میں وہ پھر دہلی پر قابض ہو گئے۔ شاہ عالم دوم جو اب تک انگریزوں کی سرپرستی اور پناہ میں تھا اب اس نے خود کو مراٹھوں کے حوالے کر دیا اور الہ آباد سے دہلی آ گیا۔ اس دوران جاٹوں اور سکھوں کی بغاوتیں اور ان کے حملے جاری رہے۔ شاہ عالم دوم کے عہد میں مرزا نجف خان کی سربراہی میں مغل فوج کو مضبوط بنانے اور ان کی تنظیم نو کی بھی کوشش کی گئی، مگر اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آیا۔ 1788ء میں روہیلہ سردار غلام قادر نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں۔ دہلی پر روہیلہ سردار غلام قادر کے قابض ہونے کے بعد فوراً مراٹھوں نے مہادجی شندے کی سربراہی میں جوابی کارروائی کی اور غلام قادر روہیلہ کو دہلی سے نکال کر شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بحال کیا۔ لیکن اب حقیقی حکومت مراٹھوں کی تھی، شاہ عالم صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اسی لیے تاریخ میں یہ مثل مشہور ہے۔ ''سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔''

اس یوروپی نوآبادیاتی دوڑ میں یورپ کے مختلف ممالک پوری دنیا میں اپنی نوآبادیاں بڑھانے میں لگے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے لیے خطرہ بھی بن رہے تھے۔ اس کے اثرات ہندوستان میں بھی ظاہر ہوئے کہ جب اٹھارہویں صدی کے اخیر میں انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ فرانسیسی یورپ اور دنیا کے تمام ممالک میں ان کے لیے خطرہ بن رہے ہیں اور اس کے نتائج ہندوستان میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ دہلی کی مغل سلطنت پورے طور پر زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس کے اندر کسی بھی حملے کی طاقت نہیں ہے۔ 1795ء کے بعد مراٹھے بھی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے اور 1799ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد برصغیر ہند میں کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو باہری حملے کا مقابلہ کر سکے۔ انگریز مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے تقریباً پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ دکن کے نظام اور مراٹھوں کے ایک گروہ نے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی تھی۔ 1803ء میں دہلی کے پاس انگریزوں نے مراٹھوں کے ایک دوسرے گروہ کو شکست دے کر دہلی، آگرہ اور علی گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مراٹھوں نے بھی مکمل طور پر انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ اب مغل سلطان شاہ عالم انگریزوں کی حفاظت میں چلا گیا اور انگریزوں نے لال قلعے میں بھی فوجی دستے تعینات کر دیے۔

شاہ عالم کے بعد اس کے دو جانشین اکبر شاہ دوم (1837ء-1806ء) اور بہادر شاہ ظفر (1857ء-1837ء) بھی صرف لال قلعے کے حکمراں رہے اور انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار۔ 1857 میں جب انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں نے بغاوت کی تو انھوں نے دہلی پر قبضہ کر کے بہادر شاہ کو جنگ آزادی کی قیادت سپرد کرنی چاہی، لیکن بوڑھے بادشاہ کے اندر اس کام کی سکت نہ تھی۔ نتیجتاً بغاوت یا پہلی جنگ آزادی ناکام ہو گئی۔ انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر کے 22 ستمبر 1857ء کو بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا۔ لال قلعے میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کے جرم میں 9 مارچ 1858ء کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا، جہاں 7 نومبر 1862ء کو انتقال ہوا۔ اس طرح 1857ء میں اس مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، جس کی ابتداء 1526ء میں بابر کے ذریعہ ہوئی تھی۔

18.5 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب

یہ ایک تاریخی حقیقت اور فطری اصول ہے کہ ہر عروج کو زوال و انحطاط جھیلنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اس دنیوی زندگی میں مفر نہیں۔

مغل سلطنت، جس نے اپنے قیام کے بعد بڑا عروج واستحکام حاصل کیا اور اس عہد میں تہذیب وثقافت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آخرکار انیسویں صدی عیسوی میں اس کا بھی زوال ہوا۔ مورخین اور تاریخی تجزیہ نگاروں نے اپنے مطالعے کے مطابق مغل سلطنت کے زوال کے بہت سے اسباب اپنی تحریروں میں بیان کیے ہیں۔ ان اسباب میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور انتظامی تقریباً سبھی طرح کے اسباب وعوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان تاریخی کتابوں میں جو ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ سے متعلق ہیں، ان میں حکمرانوں کی بے اعتدالیوں اور ان کی ان پالیسیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے مغل سلطنت زوبہ زوال ہوئی۔ ذیل میں مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کے ذریعہ پیش کردہ ان اسباب وعوامل کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ طلبہ مغل سلطنت کے زوال کے اسباب سے واقف ہوسکیں۔

18.5.1 جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی

مغلوں کے یہاں جانشینی کا کوئی واضح قانون نہ تھا، اس وجہ سے تقریباً سبھی حکمرانوں کی وفات کے وقت جانشینی کے لیے اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں جنگ چھڑ جاتی تھی، کیوں کہ سبھی شہزادے اپنے آپ کو جانشینی کا اہل سمجھتے تھے۔ اس جانشینی کا آخری فیصلہ تلوار کے ذریعے ہوتا۔ جانشینی کے اس قانون کی عدم موجودگی میں درباری امراء اس کا غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور اس طرح امراء کے درمیان گروہ بندی کی نوبت آتی تھی، جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے مختلف طرح کی سازشیں کرتے تھے۔ اس بات کی واضح اور بین مثالیں ہم مغل تاریخ میں دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ شاہ جہاں کے آخری دور میں کس طرح مغل دربار منقسم تھا؟ اورنگ زیب کو حکمراں بننے کے لیے اپنے بھائیوں سے جنگ اور باپ کو قید کرنا پڑا۔ 1712ء میں بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جانشینی کے لیے ہونے والی جنگ میں ذوالفقار خان نے بادشاہ گر کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح سے 1713ء سے 1720ء تک سید برادران بادشاہ گر کا کردار نبھاتے رہے اور اس دور میں انھوں نے چار حکمرانوں کو تخت شاہی پر متمکن اور پھر اس سے معزول کیا۔ مغل دربار کے منظرنامے سے سید برادران کے غائب ہونے کے بعد میر محمد امین اور آصف جاہ نظام الملک بادشاہ گر کا کام کرتے رہے۔ اس لیے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی نے مغل حکومت کے زوال میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

18.5.2 اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت افتراق وانتشار کا شکار ہوگئی۔ تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اورنگ زیب اس بات کو محسوس کرنے میں ناکام رہا کہ اس عظیم مغل سلطنت کا قیام واستحکام عوام الناس کے تعاون پر منحصر ہے، جس کے لیے ان کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنا حکومت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لیکن بعض مؤرخین کی نظر میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیاں ملک کے اکثریتی فرقے یعنی ہندوؤں کے خلاف رہیں، جن کی وجہ سے حکومت کو نہ صرف اس گروہ کا تعاون نہیں ملا بلکہ وہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس لیے اورنگ زیب کی یہ مذہبی پالیسیاں مغل سلطنت کے زوال کی سب سے اہم وجہ بیان کی جاتی ہیں۔ اورنگ زیب کی انھیں مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے ہندو معاشرے میں بہت سے افراد اورنگ زیب کے نام سے بھی اسی طرح متنفر ہوتے ہیں، جس طرح انھیں محمود غزنوی اور محمد غوری کے ناموں سے نفرت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بہت سارے لوگ ہندوؤں کے سیاسی حقوق کے نام پر بھی اورنگ زیب کو برا بھلا کہتے ہیں۔

مذہبی معاملات میں اورنگ زیب کی منفرد پالیسیوں کی ابتدا اس کے حکمراں بننے کے ساتھ ہی ہوجاتی ہے۔ 1658ء میں حکمراں بننے کے ایک سال کے بعد ہی عوام الناس کی اخلاقی صورت حال کی دیکھ ریکھ کے لیے اس نے ملک کے تمام بڑے شہروں میں محتسب متعین کردیے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ تمام معاملات میں اسلامی شریعت کی پابندی کی جائے اور وہ اعمال جو اسلامی شریعت میں ناپسندیدہ ہیں، جیسے شراب نوشی اور جوا وغیرہ، ان کے کھلے عام استعمال پر پابندی عاید کردی گئی۔

فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی کے وہ تعمیراتی نمونے، جو فن تعمیر میں اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں، ان میں اورنگ زیب کے لیے کوئی دلچسپی اور کشش نہ تھی۔ اس طرح سے وہ موسیقار جو اورنگ زیب کے پیش روؤں کے دربار سے منسلک تھے، اس عہد میں انھیں دربار سے الگ کردیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی حکومت کے حصول کی کوشش میں اورنگ زیب کا وہ رویہ جو اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اختیار کیا اور ان کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ کیا، وہ اورنگ زیب کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے کافی تھا، کیوں کہ وہ خود کو حقیقی شریعت کے پابند کے طور پر پیش کرتا تھا۔

ہندو عوام سے متعلق اورنگ زیب کی پالیسیوں کے اثرات 1668ء سے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ 1668ء میں ہندو مذہبی میلے غیر قانونی قرار دے دیے گئے اور 1669ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے نئے ہندو مندروں کی تعمیر اور قدیم مندروں کی مرمت پر پابندی عائد کردی گئی۔ 1669ء میں ہی اورنگ زیب نے اس شاہی درشن کی رسم کو بھی ختم کردیا، جس کی ابتدا اکبر کے عہد میں ہوئی تھی کہ بادشاہ اپنی ہندو عوام کے سامنے ظاہر ہوکر انھیں اپنا 'درشن' یعنی دیدار کراتا تھا اور نیک خواہشات ودعائیں دیتا تھا۔ 1679ء میں ملک کی غیر مسلم عوام پر جزیہ نافذ کردیا گیا، ایک تاریخی ماخذ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لال قلعے کے اطراف میں ہاتھیوں کو تعینات کیا گیا کہ اگر کوئی جزیہ وصول کرنے والوں کو جزیہ دینے سے منع کرتا ہے تو اسے کچل کر مار دیا جائے۔ مؤرخ John F Richards کا مجہول سا خیال ہے کہ ''اورنگ زیب کا حقیقی مقصد غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنا تھا۔ جب بھی موقع ملتا بادشاہ نومسلموں کو عزت واحترام، قیمتی تحائف اور اعلیٰ عہدوں سے نوازتا۔ اس طرح جلد ہی یہ بات عام ہوگئی کہ بادشاہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے تبدیلی مذہب سب سے اچھا طریقہ تھا۔''

سکھوں کے معاملے میں بھی اورنگ زیب کی پالیسیوں کو مغل حکومت کے لیے سودمند نہیں سمجھا جاتا۔ خاص طور سے گرو تیغ بہادر کی پھانسی کو بہت بڑی حکومتی غلطی شمار کی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گرو تیغ بہادر کو پھانسی دے کر اورنگ زیب نے تمام سکھوں کو مغل سلطنت کا دشمن بنا دیا، جنھوں نے بعد کے ادوار میں گرو گوبند سنگھ کی سربراہی میں نہ صرف بڑی فوجی طاقت حاصل کرلی بلکہ مغل حکمرانوں کے لیے مصیبتیں بھی کھڑی کیں اور حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق اسی طرح مذہبی تشدد کی پالیسی مراٹھوں کے ساتھ بھی اپنائی گئی، جس نے انھیں شیواجی کی سربراہی میں ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس تشدد آمیز اور متعصبانہ رویے نے ہندوؤں کے کردار کو سخت بنا دیا اور وہ مغلوں کے سخت دشمن بن گئے۔ لین پول کے مطابق ''شیواجی سے متعلق اورنگ زیب کی پالیسی نے طاقت وقوت کے ایک مرکز کو پنپنے کا موقع فراہم کیا، جو اس کی سلطنت کے لیے ایک کامیاب حریف ثابت ہوئے۔''

اگر تاریخی حقائق اور ماخذ کا موازنہ اور تجزیہ کیا جائے تو شاید یہ بات مشتبہ معلوم ہو کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیاں ہندوؤں، سکھوں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے لیے امتیاز پر مبنی تھیں۔ پروفیسر عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ ''مغل بادشاہ مذہبی قوانین اور مروجہ دستوروں اور ضوابط کو

تبدیل کرنا اپنی ذمے داری نہیں سمجھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جن معاملات میں مذہبی قوانین ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے، وہاں شہنشاہ کو کچھ اختیار تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر اور جہاں گیر کے عہد میں بعض علاقوں میں گائے کشی پر پابندی تھی جو ہندوؤں کے رواج کے مطابق تھا۔ دوسری طرف اورنگ زیب کا ہندوؤں پر جزیہ نافذ کرنا مسلم قانون کے مطابق تھا۔ یہی بات اورنگ زیب کے ہاتھوں بعض مندروں کے منہدم کیے جانے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ عورتوں کو زبردستی ستی پر مجبور کیے جانے کے خلاف حکم یقیناً ایک علیحدہ قسم کا قدم تھا۔ اس کے پیچھے کوئی مذہبی ہدایت نہیں تھی بلکہ صرف انسانیت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔''

بہر حال تاریخی ادب سے بہت سے خلاصے اور تجزیے تیار کیے گئے ہیں، جن پر تاریخی ماخذ اور حقائق شاید نہیں ہیں۔ گرچہ بہت سے مؤرخین نے ہندوؤں کی تبدیلی مذہب پر اپنی تحریریں چھوڑی ہیں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ شواہد بہت کم ہیں۔ اگر پیشکش کا کوئی ثبوت موجود بھی ہے تو یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ کتنے ہندوؤں نے مذہب تبدیل کیا اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا ایک بھی کوئی ایسی سرکاری پالیسی تھی جو ہندوؤں کے تبدیل مذہب کی حوصلہ افزائی کرتی تھی؟ اسی طرح اورنگ زیب کی اس تصویر اور شبیہ کی حقیقت کیا ہے کہ وہ ایک زبردست مندر شکن اور بت شکن تھا؟ دکن میں اورنگ زیب کی وسیع فوجی مہمات کے باوجود بھی شاید ہی کبھی اس علاقے میں ہندو مندر مسمار کیے گئے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ شمالی ہندوستان میں بلاشبہ کچھ ہندو مندروں کو ڈھا دیا گیا، لیکن زیادہ اہم اور ضروری کام ان وجوہات کی حقیقی نشان دہی ہے جن کے تحت عین مطابق حالات قائم رکھنے کے لیے اس طرح کی تباہی کے کام انجام دیے گئے۔ متھرا کا مشہور کیشورائے مندر اس طرح کے مندروں میں سے ایک ہے، لیکن یہاں اورنگ زیب کی مسمارانہ پالیسی انتقامی کارروائی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، جہاں سے اس علاقے میں جاٹوں کو بغاوت کے لیے شہہ مل رہی تھی۔ اپنے پیش روؤں کی طرح اورنگ زیب نے بھی ہندو مندروں، جیسے کہ الہ آباد میں سومیشور ناتھ مہادیو مندر، بنارس میں جنگم باڑی شیو مندر اور گوہاٹی میں اما نند مندر کو جاگیریں عطا کرنے کی پالیسی برقرار رکھی۔ اگر کوئی بھی شخص حکمراں کے اس عمل کو صرف مصلحت قرار دیتا ہے تو ٹھیک اسی طرح سے مندروں کی مسماری کے معاملے کو حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی کے بجائے مصلحت کا معاملہ کیوں نہیں تصور کیا جا سکتا؟ مزید برآں موجودہ تاریخی ماخذ اس بات کے شاہد ہیں کہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندو منصب داروں، عدالتی حکام، ریاستی منتظمین اور دوسرے سرکاری عہدے داروں کی تعداد 24.5 فیصد تھی، جب کہ اورنگ زیب کے عہد کی چوتھی دہائی میں یہ تعداد بڑھ کر 33 فیصد ہو گئی تھی۔ اسی طرح یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ ایک راسخ العقیدہ سنی کے طور پر اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا، جس طرح اس نے ہندو اور دوسری غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔ کوئی بھی آدمی بآسانی اس بات پر زور دے سکتا ہے اور یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی مسلم قوم کے مفادات کو محفوظ کرنے، ان میں اضافہ کرنے اور سنی علما کی مراعات کو بحال کرنے کے لیے کام کیا، لیکن ہندوؤں، شیعوں اور دوسرے لوگوں سے متعلق اورنگ زیب کے فرامین اور کارنامے اتنے واضح ہیں کہ ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر ستیش چندرا کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو اس وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشی سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔

18.5.3 اورنگ زیب کی دکنی پالیسی

اورنگ زیب کی دکنی پالیسی بھی مغل حکومت کے زوال کے لیے کچھ حد تک ذمہ دار ہے۔ اورنگ زیب مراٹھوں کی طاقت کو پوری طرح

سے ختم کرنے میں مصروف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں مراٹھوں کے لیے امداد کا ماخذ ہیں، جہاں پر وہ بڑے پیمانے پر ملازم تھے۔ ان دونوں ریاستوں میں مراٹھے شہری اور انتظامی امور کے اہم عہدوں پر فائز تھے اور ان ریاستوں کی فوجوں میں بھی ان کی بڑے پیمانے پر بھرتی ہوتی تھی۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر ان دونوں ریاستوں کا صفایا کر دیا جائے تو مراٹھوں کو حاصل ہونے والے تعاون کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مزید برآں یہ دونوں ریاستیں شیعی مسلک کی پیروکار تھیں، اس کے مقابلے میں مغل حکومت سنی مسلک کی سربراہی کر رہی تھی۔ ان دونوں ریاستوں سے مغل حکومت کی دشمنی کی ایک اہم وجہ مسلکی منافرت بھی تھی۔ اس وجہ سے اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر یہ دونوں ریاستیں ختم ہو جائیں تو مراٹھوں کو سیدھا مغل حکومت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور اس کی ان کے پاس طاقت نہیں ہے۔ اپنے ان مقاصد کے تحت اورنگ زیب خود دکن پہنچا اور اس نے بالترتیب 1686ء اور 1687ء میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا۔ بجا طور پر دکن کی دونوں شیعہ ریاستوں کے خاتمے کا سہرا اورنگ زیب کے سر جاتا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے اس کام کو انجام دے کر بہت بڑی بھول کی تھی کیوں کہ اگر وہ مراٹھوں کے خلاف ان دونوں ریاستوں کو تعاون دیتا اور پھر بعد کے ادوار میں ان سے نبرد آزما ہوتا تو اس میں مغل حکومت کو کم نقصان اٹھانا پڑتا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو ختم کرنے کے بعد اورنگ زیب نے مراٹھوں کی طاقت کو کچلنے کی کوشش کی۔ شیواجی کا بیٹا سمبھاجی پکڑا گیا اور اسے مار دیا گیا۔ اسی طرح سے اس کا پوتا شاہو بھی پکڑا گیا اور وہ 1707ء تک مغلوں کی قید میں رہا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مراٹھوں نے شیواجی کے دوسرے بیٹے راجہ رام اور اس کی بیوہ تارا بائی کی سرکردگی میں مغلوں کے خلاف اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ 1707ء میں جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا اس وقت تک مراٹھوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔ اورنگ زیب کی دکنی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے وی، اے، اسمتھ لکھتا ہے کہ "دکن اورنگ زیب کی شہرت اور اس کے جسم دونوں کا مرقد بن گیا۔"

18.5.4 اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین

مغل سلطنت کے زوال کی ایک اور اہم وجہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی اور کمزوری ہے۔ اگر وہ اہل، ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے تو وہ مغل حکومت کے زوال کو روک سکتے تھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان جانشینوں میں سے اکثر نااہل تھے، وہ صرف اپنی عیش پرستی اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مشغول رہے اور مغل سلطنت کی سیاست میں ابھرنے والی بیماری کے لیے کسی طرح کا کوئی علاج نہ کر سکے۔ 1707ء میں بہادر شاہ اول جب تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس وقت اس کی عمر 63 سال تھی۔ اس کے پاس اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ حکومتی ذمے داریوں کو انجام دے سکے۔ اسی طرح جہاں دار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، اکبر شاہ دوم اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ بھی اچھے حکمراں ثابت نہیں ہو سکے۔ ان میں سے زیادہ تر امراء اور وزراء کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھے۔

18.5.5 مغل حکمرانوں اور امراء کی بتدریج اخلاقی گراوٹ

مغل سلطنت کے زوال کی ایک اور وجہ مغل حکمرانوں کی اخلاقی گراوٹ بھی شمار کی جاتی ہے۔ مؤرخین اور سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو کابل سے نکلنے کے بعد دہلی کے راستے میں پڑھنے والی تمام ندیوں اور رکاوٹوں کو پار کیا اور دہلی کے قریب

پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کو شکست دی۔ وہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بہت مضبوط انسان تھا۔ وہ اپنے بغل میں ایک انسان کو دبا کر قلعے کی دیوار پر دوڑ سکتا تھا۔ ہمایوں کی قوت ارادی اتنی مضبوط تھی کہ سامنے پڑنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں سے بے پرواہو کر اس نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر لی۔ اسی طرح کی مضبوط قوت ارادی اور جاں فشانی اکبر کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے کہ اپنی انھیں خوبیوں کے نتیجے میں اس نے نہ صرف پورے شمال ہندوستان بلکہ دکن کے بھی ایک حصے پر اپنی مضبوط حکومت قائم کی۔ گھوڑے کی کتنی بھی لمبی سواری اسے تھکاتی نہیں تھی۔ وہ میلوں پیدل چل سکتا تھا۔ مغل سلطنت میں اورنگ زیب کے عہد تک یہ تمام خوبیاں حکمرانوں کے اندر پائی جاتی تھیں، لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکمرانوں میں سہل پسندی اور بزدلی در آئی۔ ان کے حرم، غلاموں، باندیوں اور خداموں سے پر رہنے لگے۔ وہ تقریباً مدہوشی میں چلے گئے اور ایک ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت مغل حکومت سے نفرت کرنے لگی ہو بمشکل ہی حکمرانی کے قابل رہے۔ یہ بعد کے ادوار میں مغل حکمرانوں کی اخلاقی گراوٹ ہی کا نتیجہ تھا کہ انھیں لوگوں نے رنگیلا جیسے خطاب سے نوازا اور آج بھی تاریخ میں انھیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

حکمرانوں ہی کی طرح مغل امراء اور رؤساء کی اخلاقی گراوٹ اور نااہلی نے بھی مغل سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو وہ اخلاق و کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہے تھے۔ لیکن دولت وثروت کی افراط اور عیش وعشرت نے ان کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا کیں۔ ان کے اندر تمام طرح کی اخلاقی وسماجی برائیاں پیدا ہونے لگیں، جس کے سبب اب وہ میدان جنگ میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ رہ سکے۔ ان برائیوں نے ان کے اندر کم ہمتی اور بزدلی کو بھی جنم دیا اور اب وہ مراٹھوں، راجپوتوں اور سکھوں کے مقابلے سے گھبرانے لگے۔ سر جادوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک یا دو پشتوں سے زیادہ کسی بھی مغل امیر خاندان کی اہمیت قائم نہ رہتی تھی۔ اگر کسی امیر کے کارنامے تین صفحات میں بیان کیے جائیں تو اس کے بیٹے کے کارناموں کے لیے صرف ایک صفحہ کافی ہوگا اور اس کے پوتے کے کارناموں کے لیے صرف ایک سطر جیسے کہ اس نے کوئی بھی ایسا قابل ذکر کام انجام نہیں دیا جس کو یہاں پر بیان کیا جا سکے۔"

18.5.6 جدید اسلحوں اور فوجیوں کی عدم فراہمی

مغل حکومت کے زوال کا ایک سبب مغل فوجوں میں کمی اور ان کی اخلاقی گراوٹ بھی شمار کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں دولت وثروت کی افراط، آرام دہ زندگی اور شراب کے استعمال نے مغل فوج پر اپنے برے اثرات ڈالے اور ساتھ ہی فوجیوں کی کمی کی روک تھام کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا گیا۔ فوجیوں نے میدان جنگ جیتنے کے بجائے ذاتی آرام وآسائش میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ دنیا کے سامنے مغل فوج کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو گیا تھا کہ جب مسلسل تین کوششوں کے باوجود بھی وہ قندھار کو دوبارہ فتح کرنے میں ناکام رہی۔ 1739ء میں نادر شاہ نے صرف پوری دہلی کو تباہ و برباد نہیں کیا بلکہ اس نے مکمل قتل عام کا حکم جاری کر دیا تھا۔ جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں اور ان کے روک تھام کے لیے حکمراں اور فوج کے اندر طاقت نہیں بچتی تو فوج اور عوام دونوں پست ہمتی اور بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عوام کے دلوں سے اپنی حکومت اور فوج سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ سر اوسلے ہیگ کے خیال میں "مغل حکومت کے انتشار وافتراق کی ایک اہم وجہ مغل فوج کی اخلاقی پستی اور ان کی پست ہمتی بھی تھی۔"

مغل حکومت کی فوجی کمزوری کی سب سے اہم بنیاد اس کی تنظیم تھی جو بنیادی طور پر بڑے امراء اور جاگیرداروں کے ذریعہ تیار کیے گئے

دستوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان امراء کو حکومت کی طرف سے یہ حکم ہوتا تھا کہ وہ بڑی جاگیروں اور منصبوں کے بدلے حکومت کو ضرورت پڑنے پر فوجی مہیا کریں۔ اس طرح کی فوجی تنظیم میں ترتیب و تنظیم کی کمی پوری فوج کو ایک بھیڑ کی شکل دے دیتی تھی۔ ان میں فوجی تربیت کی بھی کمی تھی، بمشکل ہی ایک فوجی اپنے ان ہتھیاروں سے مشق کرتا تھا، جن سے عام طور پر وہ لیس ہوتا تھا۔ فوجی جرائم کے لیے کوئی مستقبل سزا بھی نہیں تھی۔

مغلوں کے طریقۂ جنگ اور ان کے اسلحوں کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ جدید تقاضوں اور طریقوں سے ہم آہنگ نہیں تھے بلکہ قدیم ہو چکے تھے۔ مغل فوج توپ خانوں (Artillery) اور گھڑسوار تیراندازوں (Cavalry) پر زیادہ منحصر تھے۔ جب کہ عملاً توپ خانے کی مار زیادہ دور تک نہیں تھی اور اسے حرکت دینے میں بھی زیادہ طاقت اور وقت برباد ہوتا تھا۔ اس طرح کے طریقۂ جنگ کے لیے کیمپ کی شکل میں لازمی اشیاء اور معاونین کی ایک لمبی فہرست درکار ہوتی تھی، جو دیکھنے میں اپنی لوازمات کے ساتھ پورا ایک شہر معلوم پڑتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ، مرد و عورتیں، نوجوان و بوڑھے، فوجی و غیر فوجی، ہاتھی، گھوڑے اور بوجھ اٹھانے والے جانور، غرض مغل فوج کے ساتھ انسانوں، جانوروں اور اشیاء کا ایک بڑا کارواں ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں دشمنوں کی فوج کم بوجھل اور سریع الحرکت ہوتی تھی، جو آندھی کی طرح مغل فوج پر حملہ آور ہوتے اور جب تک مغلوں کو سنبھلنے کا موقع ملتا دشمن اپنا کام پورا کر کے آگے بڑھ چکا ہوتا۔ بارتھولڈ کا یہ خیال درست ہے کہ ''ہندوستان میں مغلوں کا عروج بارود کے استعمال کا نتیجہ تھا تو بجا طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آتشیں ہتھیاروں یعنی توپ اور بندوق کے استعمال کا بڑھنا اور گھڑسواروں کی جنگی افادیت کم ہونے کے نتیجے میں مغل فوجوں کا دبدبہ کم ہو گیا تھا۔''

18.5.7 بحری فوج کی جانب سے عدم توجہی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغلوں نے بحری فوج کی جانب کوئی توجہ نہیں دی، اس وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے خودکشی کو دعوت دی۔ مغل حکمرانوں خاص طور سے بعد کے دور کے حکمرانوں نے سمندری طاقت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور تمام ساحلی علاقوں کو غیر مسلح اور غیر محفوظ حالت میں چھوڑ دیا۔ یوروپی قوموں نے اپنے نوآبادیاتی دور میں مغلوں کی اس کمزوری کا پورا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام میں اس بات کا بڑا اہم رول رہا ہے کہ مغلوں کے یہاں بحری فوج نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور انھوں نے اس کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔

18.5.8 معاشی بدحالی اور مغل خزانے کا دیوالیہ پن

عام طور پر مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا اورنگ کی وفات سے متصور ہے، جب کہ اس کی علامتیں خاص طور پر زرعی بدعملی اور جاگیری نظام کی بڑھتی ہوئی دقتوں کی صورت میں بہت پہلے ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ مغل سلطنت میں معاشی بدحالی کی اہم وجہ سیاسی اور سماجی اداروں میں گہرے تضادات کو شمار کیا جاسکتا ہے، جن کے زیر اثر جب ایک بار مغل سلطنت منتشر ہونا شروع ہو گئی تو پھر اس عمل کو روکنا مشکل ہو گیا۔ مغل حکومت میں سب سے اہم سماجی تضاد مغل حکمراں طبقہ یعنی امراء اور زمین داروں کے درمیان تھا۔ مغل امراء ایک طرف مطلق العنان حکومتی نظام کا حصہ تھے اور دوسری طرف اصل محصول کے بڑے حصے پر ان کا دعویٰ بھی تھا۔ جب کہ زمین دار موروثی حقوق رکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ تھا جن کو زرعی پیداوار کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ملتا تھا، اس کے علاوہ ان کو زرعی محصول ادا کرنے اور مدد کے عوض بھی ایک مخصوص ادائیگی کرنا پڑتی

تھی۔ جہاں ایک طرف مغل امراء کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی تو زیادہ تر زمین دار ہندو تھے۔ ان دونوں طبقات کے پاس اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ہتھیار بند لوگوں کی فوج موجود رہتی تھی۔ مغل حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ زمیندار طبقے کو اپنے چھوٹے حلیف کی طرح ساتھ رکھیں، کیوں کہ ان دونوں کا کسانوں کو دبائے رکھنے اور ان کے معاشی استحصال میں ہی فائدہ تھا۔ زمینداروں کو زرعی ٹیکس جمع کرنے کے ایک کارآمد آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کو رعایتیں بھی دی جاتی تھیں، لیکن کبھی کبھی ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے سختی بھی کی جاتی تھی۔ زمیندار جن کے پاس ہتھیار بند ہم راہیوں کی ایک بڑی تعداد مہیا تھی، اپنے ذرائع آمدنی میں اضافے کی غرض سے ہر موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

مغلوں کی طاقت میں کسی بھی قسم کی کمزوری کا ایک مظہر زمین داروں کی بدلتی ہوئی وفاداریوں کی صورت میں ہی سامنے آتا تھا۔ ساتھ ہی اگر کوئی زرعی بحران پیدا ہوتا اور اس کی وجہ سے تباہ حال کسانوں سے زرعی ٹیکس کی وصول یابی مشکل ہو جاتی تو ایسی حالت میں زمین داروں کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ وہ حکومت کی طرف سے زرعی ٹیکس وصول کرنے کی غرض سے کارروائی کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے تھے کیونکہ ان حالات میں زرعی ٹیکس کی وصول یابی کے نتیجے میں زرعی پیداوار پر ان کا اپنا حق تلف ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں زمین داروں کی بغاوتیں زیادہ تواتر سے وقوع پذیر ہونے لگی تھیں۔

اس قسم کے زرعی بحران کے حالات اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی برسوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ برنیر نے یہ نوٹ کیا ہے کہ اس زمانے میں کاشت کاروں پر مالی دباؤ تواتر سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ صورت حال جاگیروں کے بدلنے کا براہِ راست نتیجہ تھی۔ یہ تشخیص صرف برنیر ہی کی نہیں تھی۔ اورنگ زیب نے رسک داس کے نام 1666ء کے ایک فرمان میں زراعت کی ابتری اور ٹیکسوں کے ناقابل برداشت بوجھ کا ذکر کیا ہے، ان حالات میں کاشت کار اپنی زمین چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس آخری صورت حال کی طرف اورنگ زیب نے محمد ہاشم کے نام 69-1668ء کے اپنے ایک فرمان میں خاص طور پر اشارہ کیا ہے، معاشی بدحالی کے ایسے حالات میں مختلف علاقوں میں کسان بغاوتیں بھی وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔

شاہ جہاں کی تعمیراتی دلچسپی نے مغل خزانے پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ ساتھ ہی دکن میں اورنگ زیب کی جنگوں کی وجہ سے خزانے پر مزید بوجھ پڑا اور حالت یہاں تک پہنچی کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغل خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ ان دونوں بنیادی وجوہات کے علاوہ مغل خزانہ خالی ہونے کے اور بھی بہت سارے اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم وجہ سرکاری عمال کا بے ایمان اور رشوت خور ہونا بھی شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے سرکاری آمدنی میں کمی واقع ہوئی۔ ولیم نورس کے مطابق ''اورنگ زیب کی حکومت کے آخری سالوں میں سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا، لڑائیاں مسلسل جاری تھیں، فوج غیر منظم ہو چکی تھی اور حکام ناخوش و غیر بھروسے مند ہو چکے تھے۔'' اسی طرح سے سرکاری خزانہ خالی ہونے اور مغل حکومت میں کمی واقع ہونے کی ایک دوسری وجہ علاقائی ریاستوں کا قیام بھی شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے حکومتی آمدنی میں بڑے پیمانے پر کمی واقع ہوئی اور اخراجات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ مستقل جنگوں نے ملکی معیشت پر بھی برے اثرات ڈالے، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت سبھی میں کمی واقع ہوتی گئی۔ نتیجتاً ایک وقت ایسا آیا کہ پوری ملکی معیشت کا ڈھانچہ چرمرا گیا، جو مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔ برنیر کے بقول ''مغل حکومت میں بڑے بڑے وزراء اور سپہ سالار موجود تھے، لیکن عوام الناس کی اکثریت انسانی بھیڑوں

کے مترادف ہو چکی تھی۔''

18.5.9 بیرونی حملے

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی بچی کھچی طاقت اور وقعت کو بھی ختم کر دیا، ساتھ ہی رو بہ زوال مغل سلطنت کی ابتری میں مزید اضافہ کر دیا۔ دہلی پر نادر شاہ کی بآسانی فتح اور احمد شاہ ابدالی کے مکرر حملوں نے دنیا کے سامنے مغل سلطنت کی فوجی کمزوریوں کو واضح کر دیا۔ بیرونی حملہ آوروں نے نہ صرف ملک میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری مچائی بلکہ وہ بہت سارا قیمتی مال غنیمت بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ساتھ ہی بیرونی حملوں کا ایک منفی اثر عوام الناس پر یہ پڑا کہ ان کے دلوں سے مغل حکومت کا رعب و دبدبہ اور بھروسہ جاتا رہا۔ اب وہ اس مغل سلطنت کو بچانے کے بجائے اس کے خاتمے اور زوال کی کوششوں میں حصہ لینے لگے۔

18.5.10 مغل حکومت کی بے جا وسعت

اورنگ زیب کے عہد میں مغل حکومت بہت زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ذرائع ابلاغ اور نقل و حمل کے ذرائع محدود تھے، کسی بھی حکمراں کے لیے ایک جگہ سے اتنی بڑی حکومت کو سنبھالنا مشکل تھا۔ ابتدائی عہد کے مغل حکمرانوں کا اپنے وزراء، امراء اور فوج پر مکمل اختیار اور کنٹرول حاصل تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں بعد کے ادوار کے حکمراں کمزور منتظم ثابت ہوئے، جو اپنے وزراء کے ساتھ ساتھ اپنی فوج پر مکمل اختیار قائم نہ رکھ سکے۔ نتیجتاً دور دراز کے صوبے خود مختار ہونے لگے اور اس طرح آزاد و خود مختار ریاستوں کے ظہور نے مغل سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر ستیش چندرا کا خیال ہے کہ ''اگر اورنگ زیب اپنے بڑے بیٹے شاہ عالم کا مشورہ قبول کر لیتا اور بیجاپور و گولکنڈہ کی ریاستوں کو پوری طرح سے ختم کرنے کے بجائے انھیں صرف کچھ علاقوں سے بے دخل کرتا اور کرناٹک کے علاقے پر ان کی حکمرانی تسلیم کر لیتا، جو مرکز سے نہ صرف بہت زیادہ دوری پر واقع تھا بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی مشکل تھا تو شاید مغل حکومت کے لیے بہتر ہوتا۔''

18.5.11 اندرونی بغاوتیں

مغل حکومت کے زوال کا ایک اور اہم سبب ملک کے مختلف صوبوں میں ابھرنے والی بغاوتیں ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد تک کسی بھی صوبائی امیر یا گورنر میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مرکزی حکومت کو چیلنج دے سکے یا مرکزی حکومت سے بغاوت کی سوچ سکے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ امراء یا صوبے دار اندرونی طور پر حکمرانوں سے دشمنی یا عناد رکھتے ہوں، لیکن اورنگ زیب کے عہد میں بھی کسی نے کھلے عام اس کی طاقت کو للکارنے کی ہمت نہیں کی۔ مزید برآں اس عہد میں بہت سے ایسے صوبے دار تھے جو اس سے اندرونی طور پر دشمنی رکھتے تھے، وہ تمام اپنی طاقتوں کو یکجا کرنے، حلیفوں کی تلاش اور اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس بات کے منتظر تھے کہ کب بوڑھا بادشاہ اس دنیا کو خیر آباد کہے۔

اورنگ زیب کے تمام بیٹے اس گروہ میں شامل تھے اور حکام میں سے بہادر خاں، دلیر خاں اور ذوالفقار خاں سبھی اس طرح کے مشتبہ خیالات اپنے دلوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت بکھرنے لگی اور بعد کے ادوار میں اس بکھراؤ اور زوال میں مزید اضافہ ہوا۔ پورے ملک میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، کہیں جاٹوں کی بغاوت تو کہیں راجپوتوں کی، کہیں افغانوں کی بغاوت تو کہیں سکھوں کی، کہیں روہیلوں کی بغاوت تو کہیں مراٹھوں کی۔

موجودہ تاریخی مآخذ اور شواہد کا باریکی سے جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بغاوتیں، جنھوں نے مغل سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دیا مختلف وجوہات کا نتیجہ تھیں۔ ان میں سے سب سے اہم ملک کی زرعی اور معاشی بدحالی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مراٹھا بغاوت نے بڑی حد تک ایک زمین دار بغاوت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس بغاوت کی رہنمائی زیادہ تر مقامی سرداروں اور موروثی حکمرانوں یعنی دیسائیوں اور دیش مکھوں کے ہاتھ میں تھی۔ مراٹھوں کے مرکزی اقتدار کا حامل کوئی ادارہ قائم نہ کر سکنے کی شاید وجہ بھی یہی تھی، لیکن جس طرح وہ 'بارگی' سپاہیوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرنے میں کامیاب رہے تھے یہ ظاہر کرتا ہے کہ عام زرعی تنگ دستی نے ان کا کام آسان کر دیا تھا۔ اسی عہد کے مصنف بھیم سین کے مطابق ''کسان ہتھیار اور گھوڑے حاصل کر کے مراٹھا باغیوں میں مل جاتے تھے۔'' مغل جاگیرداروں اور مراٹھا سرداروں کے حریفانہ مالی مطالبوں کے سبب زرعی تنگ دستی اور پریشانی اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اسی طرح شمالی ہندوستان میں بندیلہ بغاوت کو بھی زمین داروں کی بغاوت قرار دیا جا سکتا ہے، جہاں تک جاٹوں کی اس بغاوت کا تعلق ہے، جو آگرہ کے آس پاس بھڑک اٹھی تھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کسانوں کے ایک مخصوص گروہ کی ایسی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی، جس کی رہنمائی زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ اس بغاوت کے سب سے اہم رہ نما سورج مل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمینداروں کا لباس پہنا کرتے تھے۔

بعض دوسری بغاوتوں میں ذات پات یا زمیندارانہ اثرات کے بجائے مذہب نے لوگوں میں اسی طرح کا اتحاد پیدا کرنے میں مدد دی، جس کے بغیر کسی معمولی سی کامیابی کی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ 1672ء میں ہریانہ کے علاقے میں کاشت کاروں اور چھوٹے کاروباریوں پر مشتمل جن ست نامیوں نے ایک خاصی بڑی بغاوت شروع کی تھی، وہ وحدانیت پر یقین رکھنے والوں کا ایک گروہ تھا، جو کبیر داس کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ اسی طرح جن سکھوں نے پنجاب میں گرو گوبند سنگھ کی سرکردگی میں ایک بڑی بغاوت شروع کی، وہ جاٹ کسانوں کے وسیع تر حلقے کا ایک جزء تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ 1709ء میں ان باغیوں کے رہ نما بندہ بہادر نے اپنی کمان میں عام آدمیوں کی ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی تھی، یہ لوگ ہندو سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر چلتے۔ یہاں بھی وحدانیت میں یقین رکھنے والے ایسے مذہب کا اثر کارفرما تھا، جس نے گرو کی اطاعت کے گہرے جذبے کی بنیاد پر دبے کچلے باغیوں کو یکجا کر لیا تھا۔ ست نامیوں کو دبا دیا گیا تھا اور بعد میں تاریخ انھیں بھول سی گئی، سکھ فتح یاب ہوئے لیکن ان کی اس جیت نے ہی کسی معنی میں ان کے کسان ماضی کی نفی کر دی۔ ان کے رہ نما جو خود نچلے طبقوں سے ابھرے تھے، اپنے آپ کو زمین دارانہ درجہ دینے کے لیے کوشاں تھے۔ یہاں تک بالآخر پنجاب کے عظیم رہ نما رنجیت سنگھ نے مہاراجہ کا لقب اختیار کر لیا، جو بہت سے راج پوت سرداروں کی تمناؤں کا مرکز تھا۔

18.5.12 اٹھارہویں صدی میں خود مختار ریاستوں کا ظہور

مغل حکومت کے عہد زوال میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو مغل سلطنت سے الگ کر لیا اور بہت سی خود مختار ریاستیں ظہور پذیر ہو گئیں۔ ان آزاد اور خود مختار ریاستوں نے نہ صرف مغل حکومت کے لیے پریشانیاں کھڑی کیں بلکہ اس کے زوال کو مزید تیز کر دیا اور مغل حکومت سمٹتے سمٹتے دہلی تک محدود ہو گئی۔ ذیل میں ان آزاد ریاستوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو مغل حکومت کے عہد زوال میں ظہور میں آئیں۔

18.5.12.1 حیدرآباد کی ریاست

حیدرآباد ریاست کا قیام قمرالدین صدیقی کے ذریعہ عمل میں آیا، جنھیں 1712 میں فرخ سیر کے ذریعہ 'نظام الملک' کے خطاب کے ساتھ دکن کا وائس رائے متعین کیا گیا تھا۔ اس نے تقریباً ایک خودمختار ریاست قائم کی لیکن محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی واپس آیا۔ 1724ء میں 'آصف جاہ' کے خطاب کے ساتھ دوبارہ دکن کا وائس رائے متعین کیا گیا۔ اس نے آصف جاہی حکمراں خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشینوں کو حیدرآباد کے نظام کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مغل سلطنت کے عہد زوال میں ہندوستان میں جو خودمختار ریاستیں وجود میں آئیں، ان میں سب سے بڑی اور پائیدار ریاست حیدرآباد ہی کی تھی، آصف جاہ نے دکن میں مکمل آزادی اور خودمختاری کے ساتھ حکومت کی، بغاوتوں اور طاقت ور زمین داروں کا خاتمہ کیا اور اپنی حکومت میں ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ حیدرآباد کی اس آزاد ریاست کے حکمراں مغل بادشاہ کی بالادستی تسلیم کرتے رہے، انھیں کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری رکھا اور تخت نشینی کے وقت ان سے فرمان حاصل کرتے تھے۔

1748ء میں نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں کی آپسی لڑائی سے حیدرآباد کی اس ریاست کو بڑا نقصان پہنچا۔ آصف جاہ کے انتقال کے بعد پندرہ سال کے اندر ہی حیدرآباد ریاست کی حدود آدھی رہ گئیں۔ 1798ء میں حیدرآباد کے نظام نے انگریزوں کے فوجی امداد کے نظام یعنی Subsidiary System کو قبول کر کے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ اس طرح حیدرآباد کی آصف جاہی حکومت اپنے قیام کے 74 سال بعد انگریزوں کے ماتحت ریاست بن گئی۔ 1800ء میں انگریزوں نے حیدرآباد کی تمام آزادی سلب کر لی اور اب حیدرآباد برطانوی ہندوستان کی ایک محکوم ریاست بن گئی۔

18.5.12.2 بنگال کی ریاست

اٹھارہویں صدی کا بنگال بہت بڑے علاقے پر مشتمل تھا، اس میں بنگال کے ساتھ ساتھ بہار اور اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ مرشد قلی خاں اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے دیوان تھے، جب کہ فرخ سیر نے 1717ء میں انھیں بنگال کا صوبے دار مقرر کیا۔ انھوں نے مرشدآباد کا شہر آباد کر کے بنگال کا دارالسلطنت ڈھاکہ سے مرشدآباد منتقل کر دیا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرشد قلی خاں عملی طور پر خودمختار ہو گیا۔ مرشد قلی خاں (1727ء-1717ء) اور اس کے جانشینوں شجاع الدین خاں (1739ء-1727ء) اور علی وردی خاں (1756ء-1739ء) نے ایک لمبی مدت تک بنگال کی ریاست کو ایک مضبوط، مستحکم اور پرسکون نظم و انصرام فراہم کیا۔ ان تینوں حکمرانوں نے ریاست میں نظم و ضبط اور تجارت کو فروغ دیا لیکن باہری تجارتی کمپنیوں پر کڑی نگاہ رکھی۔ علی وردی خاں نے انگریزی اور فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کو بنگال میں اپنے علاقوں کو قلعہ بند کرنے کی اجازت نہیں دی، مگر بعد کے حکمراں ریاست کی اس مضبوطی کو قائم نہ رکھ سکے۔ انھوں نے ریاست کی بری اور بحری فوجوں پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نتیجتاً علی وردی خاں کے جانشین سراج الدولہ کے عہد میں انگریزوں نے صرف تین ہزار فوج کی مدد سے 1757ء میں مرشدآباد کے قریب پلاسی کے میدان میں بنگال کی فوج کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح بنگال ہندوستان اور مغلیہ سلطنت کا پہلا صوبہ تھا جو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں گیا۔

18.5.12.3 اودھ کی ریاست

مغل حکومت کے دورِ زوال میں جو آزاد ریاستیں قائم ہوئیں ان میں ایک اہم ریاست اودھ کی تھی۔ اس وقت اودھ کا صوبہ بنارس کے ساتھ ساتھ الہ آباد کے نزدیک چند ضلعوں کو بھی اپنے اندر شامل کیے ہوئے تھا۔ مغل حکمرانوں کے ذریعہ ایک ایرانی امیر سعادت خاں برہان الملک 1739ء-1722ء کو اودھ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا، لیکن جلد ہی وہ خود مختار ہو گئے۔ سعادت خاں نے ایک مضبوط اور مستحکم ریاست کی بنیاد ڈالی، علاقائی زمین داروں کی طاقت ختم کر کے ریاست میں نظم وضبط اور امن وسکون قائم کیا۔ سعادت خاں کے جانشینوں صفدر جنگ (1754ء-1739ء) اور شجاع الدولہ (1775ء-1754ء) کے زمانے میں اودھ کی ریاست کو مزید عروج واستحکام حاصل ہوا۔

1764ء میں بکسر کی جنگ میں انگریزوں سے شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کی ریاست انگریزوں کے زیر اثر آ گئی، لیکن انگریزوں نے اودھ ریاست کے وجود کو ختم نہیں کیا بلکہ اسے برقرار رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد یعنی 1774ء میں انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کے حکمراں رحمت خاں کو شکست دے کر اس علاقے کو بھی ریاست اودھ میں شامل کر لیا گیا۔

شجاع الدولہ کے بعد اودھ ریاست پر انگریزی دباؤ بڑھنے لگا اور اودھ کے نواب انگریزوں کے آگے بے بس ہو گئے۔ دھیرے دھیرے اودھ ریاست کا دائرہ سمٹنے لگا، یہاں تک کہ 1856ء میں اودھ کی ریاست کو ختم کر کے برطانوی ہندوستان میں ضم کر دیا گیا۔

18.5.12.4 میسور کی ریاست

اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں میسور پر ایک ہندو راجہ کی حکمرانی تھی۔ اس ہندو راجہ کی فوج میں حیدر علی نام کا ایک سپاہی تھا، وہ اپنی بہادری اور قابلیت کی بنیاد پر جلد ہی راجہ کی فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے راجہ اور اس کے وزراء نے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس کے بعد حیدر علی نے میسور کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ میسور کی ریاست پر حیدر علی کی حکمرانی کا آغاز 1761ء میں ہوا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی حیدر علی ایک زبردست اور کامیاب منتظم اور حکمراں ثابت ہوا۔

حیدر علی جس وقت ریاست کا حکمراں ہوا اس وقت تک میسور کی ریاست کمزور اور منقسم تھی۔ لیکن جلد ہی حیدر علی نے میسور کو ہندوستان کی بڑی طاقتوں میں شامل کر دیا۔ اس نے اپنی فوج کو جدید اسلحوں سے آراستہ کیا اور جدید تقاضوں کے مطابق ان کی تنظیم نو کی۔ اس نے اپنی ریاست کو نہ صرف بڑے پیمانے پر وسعت دی بلکہ انگریزوں کے ایک بڑے حریف کے طور پر ابھرا۔ 1782ء میں حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے جانشین فتح علی ٹیپو سلطان انگریزوں سے مستقبل نبرد آزما رہا۔ بالآخر 1799ء میں سرنگا پٹنم میں انگریزوں سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کے بعد میسور کی ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

18.5.12.5 راج پوت حکومتیں

مغل حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راج پوت علاقے عملی طور پر آزاد ہو گئے، لیکن راج پوت حکمراں اپنی پرانی روش کی طرح اب بھی منقسم ہی تھے۔ بہت سی راج پوت ریاستیں آپسی خانہ جنگیوں میں مشغول تھیں۔ لیکن ان تمام کے باوجود بھی انھوں نے مغل حکومت کو کمزور کرنے اور ان کے زوال میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آمیر کے راجہ سوائی جے سنگھ (1743-1681ء) ایک مشہور اور نامور راج پوت راجہ

رہے ہیں۔ انھوں نے جے پور شہر بسایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اچھے اور جدید آلہ جات کے ساتھ دہلی، جے پور، اجین، بنارس اور متھرا میں رصدگاہیں قائم کیں۔ مراٹھوں کے ظہور اور عروج کے ساتھ ہی راج پوت ریاستیں دھیرے دھیرے ختم ہونے لگیں۔

18.5.12.6 پنجاب کی حکومت

سکھ مذہب کے دسویں اور آخری گرو، گروگو بند سنگھ کی قیادت میں سکھ قوم ایک سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی تھی۔ ساتھ ہی نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں اور مغل حکومت کی مستقل کمزور پڑتی طاقت نے سکھوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ 1765ء سے 1800ء کے درمیان انھوں نے پنجاب اور جموں کے علاقوں پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں سکھ قوم کے ایک مشہور سردار راجہ رنجیت سنگھ نے تمام سکھ سرداروں کو اپنے ماتحت کرلیا اور پنجاب میں ایک مضبوط و مستحکم سکھ حکومت قائم کی۔

رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ ریاست اندرونی انتشار کا شکار ہوگئی۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت جو اس گھات میں لگی ہوئی تھی کہ کس طرح اپنی سرحدوں کو وسیع کیا جائے؟ اس نے سکھ ریاست کے انتشار کا فائدہ اٹھایا اور 40-1839ء میں پنجاب کی سکھ حکومت کو شکست دے کر اس کا خاتمہ کردیا۔

18.5.12.7 مراٹھوں کی حکومت

شیواجی کے بڑے بیٹے ساہوجی جنھیں اورنگ زیب نے قید کر کے جیل میں ڈال دیا تھا، 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول نے انھیں آزاد کردیا۔ اس عہد میں مراٹھا ریاست کی حکمرانی تارابائی کے ذریعہ انجام دی جارہی تھی۔ مغل قید سے رہائی کے بعد ساہوجی نے 1713ء میں بالاجی وشوناتھ کو اپنا پیشوا یعنی وزیراعظم نامزد کیا۔ بالاجی وشوناتھ نے اپنے عہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری طاقت اپنے گرد جمع کرلی اور مراٹھوں کا حقیقی حکمراں بن گیا۔ اصل حکمراں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ بالاجی وشوناتھ نے نہ صرف اپنی ریاست کو وسیع کیا بلکہ مراٹھا سرداروں کو چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کے لیے نئے اور علیحدہ علاقے فراہم کیے۔

بالاجی باجی راؤ (1761ء-1740ء) نے مراٹھوں کی ریاست کو مزید وسعت و استحکام بخشا۔ اس عہد میں مراٹھا حکومت اپنے عروج کو پہنچ گئی اور انھوں نے دہلی تک کا علاقہ فتح کرلیا اور مغلوں کو اپنی مدد کی پیش کش کی۔ مراٹھوں کے ذریعے پنجاب کے علاقے سے احمد شاہ ابدالی کے حاکموں کے نکالے جانے کے بعد مراٹھوں اور احمد شاہ ابدالی کا سیدھا ٹکراؤ ہوا۔ جنوری 1761ء میں پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کے بیچ فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں مراٹھوں کو بری طرح شکست ہوئی، تقریباً 28,000 مراٹھا فوجی مارے گئے، جون 1761ء میں بالاجی راؤ پیشوا کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس طرح پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی شکست سے ان تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ ہوگیا کہ ہندوستان میں مراٹھا قوم ایک بڑی اور مضبوط طاقت بن کر ابھرنے والی ہے۔ یہ جنگ انگریزوں کے لیے بھی بڑی مفید ثابت ہوئی اور مراٹھوں کی شکست نے ہندوستان میں برطانوی طاقت کے بڑھنے اور ان کی حکومت کے لیے راستہ صاف کردیا۔

18.5.13 برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام 31 دسمبر 1600ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ عمل میں آیا، جس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا میں

برطانوی تجارت کوفروغ دینا تھا۔شروع میں اس کمپنی نے ایک اجارہ دارانہ تجارتی کمپنی کی حیثیت سے کام کیا،لیکن اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں اس کمپنی نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ایک کارندے کےطور پر کام کرنا شروع کردیا۔ یہ کمپنی ہندوستان میں تجارت کی غرض سے داخل ہوئی تھی اور انھوں نے مغل بادشاہوں سے برصغیر میں تجارت کی اجازت لے رکھی تھی۔اس مقصد کے لیے انھوں نے ہندوستان میں مختلف مقامات پر زمینیں لےکر تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس قسم کی کوٹھیاں ممبئی، چنئی اور کولکاتہ میں بنا رکھی تھیں۔ بعد کے ادوار میں انھوں نے حفاظت کے بہانے ان کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کرلیا۔جب مغل حکومت زوال پذیر ہوئی تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان قلعوں اور بستیوں سے، جو فوجی چھاونیوں کی شکل اختیار کرچکی تھیں، ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کردی۔کمپنی نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستانی سیاسی حالات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے مغل حکومت کی نشاۃ ثانیہ کے تمام راستے مسدود کردیے۔انھوں نے 1757ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کوشکست دے کر بنگال کو برطانوی نوآبادی کا حصہ بنادیا۔اس کے بعد انھوں نے اپنی اس ریاست کو مزید وسعت دی، 1764ء میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ کوشکست دے دی۔ 1798ء میں حیدرآباد نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بالادستی قبول کرلی اور 1799ء میں انھوں نے میسور کی ریاست کا خاتمہ کرکے اسے اپنی حکومت میں ضم کردیا۔اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے پورے ہندوستان پر اپنا سکہ جمالیا اور اس طرح انھوں نے مغل حکومت کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی کوئی بھی گنجائش نہ چھوڑی۔

18.6 خلاصہ

ہندوستان میں مغل حکومت کی حکمرانی کا دور تقریباً تین صدیوں سے کچھ زیادہ عرصے 1526ء سے 1540ء اور 1555ء سے 1857ء پر محیط ہے اور اس میں ڈیڑھ سو سال 1707ء سے 1857ء عہد زوال کے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس دورزوال کی ابتدا 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے ہوتی ہے۔اورنگ زیب کی وفات کو جہاں ایک طرف مغل سلطنت کے عہد زرّیں کا خاتمہ شمار کیا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف اسے دور زوال کی ابتدا بھی مانا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مؤرخین اورنگ زیب کی وفات کو نہ صرف مغل تاریخ بلکہ ہندوستانی تاریخ کی بھی ایک حد فاصل شمار کرتے ہیں۔یہیں سے ہندوستانی تاریخ میں عہد جدید کا آغاز بھی تصور کیا جاتا ہے۔

اس اکائی کے خلاصے کےطور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغل سلطنت اپنی وسعت وجسامت کے بوجھ تلے دب گئی۔مغل حکومت کے زوال میں بہت سے اسباب وعوامل نے اپنے کردار ادا کیے، جن میں مغل حکمرانوں کے یہاں جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی، اورنگ زیب کی مذہبی ودکنی پالیسی، مرکز سے اس کا بہت دنوں تک دور رہنا، اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین، مغل حکمرانوں اور امراء کی اخلاقی پستی، مغل فوجیوں میں کمی اور ان کی اخلاقی پستی، مغل سلطنت کی معاشی بدحالی، بیرونی حملے، اندرونی بغاوتیں اور خودمختار ریاستوں کا ظہور کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔اس کے ساتھ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے تابوت میں آخری میخ کا کام کیا، جس کے بعد مغل سلطنت کا پورے طور سے خاتمہ ہوگیا۔

18.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. مغل دور کے اسباب زوال میں سے تین اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. مغل حکومت کے زوال میں اورنگ زیب کی پالیسیاں کس حد تک ذمے دار ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
3. مغل حکومت کے عہد زوال کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4. مغل حکومت کے زوال میں اندرونی بغاوتوں اور علاقائی حکومتوں کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
5. مغل حکومت کے زوال میں بیرونی حملوں کو کہاں تک ذمے دار قرار دیا جا سکتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

18.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، ڈاکٹر ستیش چندرا، اردو ترجمہ: محمد قاسم صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، طبع دوم، 2001ء

2۔ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، 1994ء

3۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

4۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

بلاک: 5 جدید ہندوستان

فہرست

اکائی 19 : برطانوی دور

اکائی کے اجزاء

19.1 مقصد

19.2 تمہید

19.3 ہندستان میں یورپی اقوام

19.4 ہندستان میں برطانوی قوت کا آغاز

19.5 پلاسی کی جنگ

19.6 جنوبی ہند کی قوتیں

19.7 انگریزوں کی استعماری پالیسی

19.8 پہلی جنگ آزادی

19.9 کانگریس کا قیام

19.10 تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون

19.11 نمک ستیہ گرہ

19.12 بھارت چھوڑو تحریک

19.13 انقلابی تحریک

19.14 برطانوی استبداد اور اس کا ردعمل

19.15 بنگال کی مسلم تحریک

19.16 شمالی ہندستان میں مسلم تحریک

19.17 ریشمی رومال تحریک

19.18 دیگر لوگ

19.19 آزاد ہند فوج

19.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہندوستان کے لئے مغربی اقوام نے بحری راستہ تلاش کرنے کے بعد اس ملک سے براہ راست تجارت کا آغاز کیا اور اس تجارت میں ان کے سامراجی عزائم پوشیدہ تھے جو بہت جلد سامنے آگئے اور انہوں نے جنوبی ہند میں اپنی قوت کا اظہار شروع کیا۔ رفتہ رفتہ برطانوی قوتیں سب پر غالب آگئیں اور انہوں نے ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد ہوئی اور ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد آخر ملک انگریزوں کے اقتدار سے آزاد ہوگیا۔

19.2 تمہید

اس اکائی میں ہندوستان کے اندر مغربی اقوام کی آمد ان کی باہمی رقابت اور انگریزوں کے اثر ونفوذ کا بیان ہوگا۔ اس کے بعد مغل سلطنت کے خاتمہ، پہلی جنگ آزادی اس کے اسباب اور ناکامی کی وجوہات کا بیان ہوگا، پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندستان میں بے شمار تحریکات اٹھیں اور متعدد بڑے لیڈر ملک کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، اس اکائی میں ان میں سے کچھ کا تعارف کرایا جائے گا۔

19.3 ہندوستان میں یورپی اقوام

ہندوستان یوروپی ممالک کے لئے اجنبی تو کبھی نہیں تھا۔ اہل یوروپ ہندستان سے واقف تھے اور ہندوستان سے ان کی تجارت بھی تھی، لیکن یہ تجارت عرب ممالک خاص طور پر مصر کے واسطے سے تھی۔ بعض یوروپی سیاح بھی اس میں ہندستان آئے تھے۔ ہندستان کے ساتھ براہ راست تجارت کے لئے یوروپ کے لوگ مسلسل اس تلاش میں تھے کہ ہندستان کے لئے کوئی ایسا راستہ تلاش کریں جو عرب ممالک کے ذریعے نہ ہو۔ اس کے لئے مسلسل کوششیں ہورہی تھیں۔ انہی کوششوں میں نئی دنیا یعنی امریکہ کی تلاش ہوئی اور یوروپی اقوام نے امریکہ میں بود و باش اختیار کرنی شروع کی، وہاں کے قدرتی وسائل سے استفادہ میں بڑی تعداد میں یوروپ کے مختلف ممالک کے لوگ وہاں گئے اور بہتر ہتھیاروں اور جنگی مہارت کی بنا پر وہاں کے مقامی باشندوں کو جلد ہی فتح کرلیا۔

1498 میں ایک پرتگالی جہاز راں واسکوڈی گاما نے افریقہ کا چکر لگا کر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرلیا۔ ایک عرب جغرافیہ داں ابن ماجد نے اس سلسلے میں اس کی بڑی مدد کی تھی۔ واسکوڈی گاما کالی کٹ آیا، شروع سے ہی ان کے عزائم سامراجی تھے۔ اس لئے دس سال کے قلیل عرصہ میں پرتگالیوں، مصریوں اور ہندستان کے مقامی تاجروں میں تجارت کے مفادات کو لے کر جنگ چھڑ گئی اور 1509 میں پرتگالیوں

نے دیو پر اور 1510 میں گوا پر قبضہ کر لیا۔

سولہویں صدی کے نصف آخر تک تین مزید طاقتیں ہندوستان کے ساتھ تجارت میں شامل ہو گئیں یعنی انگلینڈ، ہالینڈ اور فرانس، ان تینوں طاقتوں کے درمیان اپنی اپنی تجارت کو ترقی دینے کے لئے باہم شدید مقابلہ ہوا۔ جنگیں ہوئیں اور آخر پرتگالیوں کو شکست ہوئی۔ انگلینڈ اور ڈچ لوگ کامیاب رہے اور ہندوستان سمیت تمام مشرقی ممالک کی تجارت پر انہی کا قبضہ ہو گیا، بعد میں ان دونوں طاقتوں نے اپنے علاقے بانٹ لئے۔ انگلینڈ اور فرانس نے ہندوستان سے اپنی تجارت جاری رکھی اور ڈچ قوم نے ہندستان سے مزید مشرق میں جا کر ملیشیا اور انڈونیشیا میں اپنی کالونیاں قائم کیں۔

31 دسمبر 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی اور برطانوی حکومت کی طرف سے اس کو تجارت کا پروانہ مل گیا۔ 1608 میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول نے مغل حکمراں جہانگیر کے دربار میں کپتان ولیم ہاکنس کو بھیج کر تجارتی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی جو ایک سال کی جدوجہد کے بعد منظور ہو گئی اور انگریزوں کو سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مل گئی، اس کے بعد وہ مزید مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کو جنوبی ہند کے متعدد شہروں میں اپنی فیکٹریاں لگانے کی اجازت مل گئی۔

فرانسیسی کمپنی بھی تجارتی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کو مل گئیں، اس طرح فرانسیسی اور انگریز دونوں کو تجارتی مراعات مل گئیں تھیں۔ ہندوستان کے اپنے تجارتی مفاد کو لے کر دونوں ممالک کے لوگ باہم برسرپیکار بھی رہے بلکہ شروع میں فرانسیسیوں کا پلہ بھاری تھا۔ خاص طور پر ڈپلے نے فرانسیسی طاقت کو مضبوط کیا تھا۔ اس دوران دونوں قوتیں ہندوستان کی مقامی سیاست پر بھی اثر انداز ہونے کے لئے راہیں ڈھونڈ رہی تھیں، 1748 میں دونوں طاقتوں کو اس کا موقعہ مل گیا۔ نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور پوتے مظفر جنگ میں اقتدار کی جنگ ہوئی انگریزوں نے ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔ فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کا اور مظفر جنگ کامیاب رہا۔ اس طرح کرناٹک میں چندا صاحب نے اپنے باپ نواب انوارالدین کے خلاف بغاوت کی اس میں بھی فرانسیسیوں نے چندا صاحب کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے نواب محمد علی کا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ انگریزوں نے جن کی مدد کی تھی وہ دونوں ہار گئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پانسہ پلٹ گیا اور انگریزوں کے حامی جیت گئے۔ اس کے بعد فرانسیسیوں کو لگاتار شکست ہوتی رہی۔ چند سال کے عرصہ میں انگریزوں نے ہندوستان سے فرانسیسی قوت کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح وہ بلا شرکت کسی یورپین طاقت کے ہندوستان کے ساتھ تجارت کے میدان میں تنہا رہ گئے۔

19.4 ہندستان میں برطانوی قوت کا آغاز

انگریز چونکہ جنوب کی طرف سے آئے تھے۔ اس لئے جنوبی حکمرانوں کی فوجی قوت سے واقف تھے اور انہوں نے نہایت چالاکی سے ان کے اندر اثر و نفوذ کر کے ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مغل حکومت سے ان کا زیادہ سابقہ نہیں پڑا تھا، اس لئے ان کو مغل قوت کا اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے جنوبی ہندوستان کے حکمرانوں کی طرح مغلوں کو بھی سمجھا اور انہوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے شاہجہاں اور بعد میں اورنگ زیب نے ان پر حملہ کر کے انگریزی فوج کو پوری طرح کچل دیا اور مجبوراً انگریزوں کو سمندر میں پناہ لینی پڑی۔ اس کے بعد انگریزوں کی توجہات دہلی کی طرف بھی ہو گئیں اور ان کو اندازہ ہو گیا کہ مغل حکمراں کی مرضی کے بغیر

ہندستان میں قدم جمانا مشکل ہوگا، اس لئے انہوں نے دہلی کی طرف رخ کیا۔ 1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں کسی بادشاہ کو لمبے عرصہ تک حکومت کرنے کا موقعہ نہیں ملا، جانشینی کی جنگوں میں فوج اور امراء کی وفاداریاں بڑی تیزی سے بدلنے لگیں۔ ان حالات میں انگریزوں کو مغل حکمراں سے خصوصی مراعات حاصل کرنے کا موقعہ مل گیا اور انہوں نے 1717 میں انہوں نے مغل حکمران سے تجارتی مراعات حاصل کرلیں۔

بنگال اور کرناٹک کے مسلم نواب جو انگریزوں کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے تھے انہوں نے ان کو حاصل مراعات کو نہ صرف محدود کیا۔ بلکہ ان کی سرگرمیوں کو بھی صرف تجارت تک محدود کرنے کی کوشش کی۔ شروع میں ان کو کامیابی ملی۔ تقریباً نصف صدی کی کاوشوں کے بعد انگریزوں نے حالات کو اپنے لئے سازگار بنالیا۔

19.5 پلاسی کی جنگ

1756 میں نواب سراج الدولہ بنگال کا نواب بنا تو انگریزوں نے باضابطہ ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرلی۔ نواب کی فوجوں پر حملے شروع ہوئے اور آخر 1757 میں پلاسی کے میدان میں انگریزوں اور نواب کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ انگریزوں نے نواب کی فوج کے بڑے بڑے سرداروں کو خاص طور پر میر جعفر کو پہلے ہی اپنے ساتھ ملالیا تھا، اس لئے برائے نام جنگ ہوئی۔ نواب کو میدان سے فرار ہونا پڑا۔ بعد میں میر جعفر کے بیٹے میرن نے ان کو تعاقب کرکے گرفتار کیا اور قتل کردیا۔

پلاسی کی جنگ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس جنگ نے انگریزوں کے حوصلے بلند کردیے اور انہوں نے پہلے میر جعفر سے بڑی بڑی مراعات حاصل کیں، پھر ان کو معزول کرکے میر قاسم کو نواب بنایا، بعد میں ان کو بھی تنگ کرنا شروع کیا تو وہ مجبور ہوکر اودھ کی طرف فرار ہوگئے۔ اودھ کے حکمراں نواب شجاع الدولہ نے مغل حکمراں شاہ عالم کی مدد لے کر بکسر کے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ یہ جنگ 1764 میں ہوئی اور انگریزوں نے میر قاسم، نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ انگریزوں نے اس کے بعد شاہ عالم سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا حق لے لیا اور نواب شجاع الدولہ سے پچاس لاکھ تاوان وصول کیا اور مختلف قسم کے معاہدات کے ذریعہ اودھ کے معاملات میں دخیل ہوگئے۔

19.6 جنوبی ہند کی قوتیں

جنوبی ہند میں تین مقامی طاقتیں تھیں، ایک نظام حیدرآباد، دوسری مراٹھہ اور تیسری حیدر علی۔ پلاسی اور بکسر کی فتح سے انگریزوں کے عزائم بلند ہوگئے اور انہوں نے 1766 میں حیدر علی کی طاقت کو کچلنے کے لئے ان پر حملہ کردیا لیکن حیدر علی نے ان کو شکست دی اور امن کا معاہدہ کرنے پر مجبور کردیا۔

1779 میں مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل جنگی سلسلہ شروع ہوا وہ بھی بلانتیجہ رہا اور آخر دونوں کے درمیان صلح ہوگئی۔ مراٹھہ ایک بڑی طاقت تھے ان کے ساتھ صلح کے نتیجہ میں انگریزوں کی طاقت بڑھ گئی اور انہوں نے میسور کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ایک

بڑی فوج کے ساتھ حیدر علی پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں نظام نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ 1782 میں جنگ کے دوران ہی حیدر علی کی وفات ہوگئی۔ ان کے بیٹے ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی اور تین سال کے بعد 1784 میں انگریزوں کو پھر مصالحت پر مجبور ہونا پڑا۔ انگریزوں کی نظر میں اب صرف ٹیپو سلطان ہی واحد رکاوٹ تھی جو ان کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب پورا ہونے میں مانع تھی اس لئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر بڑی فوجی قوت جمع کی اور نظام اور مراٹھہ کا اتحاد کیا اور 1790 میں ٹیپو سلطان پر حملہ کر دیا، اس جنگ میں 1792 میں ٹیپو سلطان کی فوج کو شکست ہوئی اور ٹیپو سلطان کو اپنے آدھے مقبوضات بھی چھوڑنے پڑے۔ جنوب کی سب سے بڑی اور سب غیور شخصیت ٹیپو سلطان نے اس کے بعد ترکی کے خلیفہ، افغانستان اور عرب کے علاوہ فرانس سے بھی امداد کی درخواست کی لیکن اس کو کوئی مدد نہ مل سکی آخر 14 مئی 1799 میں میر صادق کی غداری سے ٹیپو سلطان شہید ہوگئے اور میسور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور پورے ملک میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی۔

19.7 انگریزوں کی استعماری پالیسی

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ہندستان میں ان کا مقابل کوئی نہیں رہا۔ اس لئے انگریزوں نے بتدریج اپنے دائرہ اختیارات کو وسعت دینی شروع کی اور مختلف طریقوں سے ہندستان کے سیاسی اور معاشی مفادات کا استحصال کرنے لگے۔ کمپنی کی طرف سے گورنر ہند لارڈ ویلزلی نے اس دوران ایک نئی پالیسی اختیار کی جس کے ذریعہ ہندوستان میں ان کے قدم اور مضبوط ہوگئے۔ یہ پالیسی تھی ثالثی، ذیلی اتحاد یا جنگ، جہاں جیسی سہولت ہوتی وہ ان کو اختیار کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں کمپنی کو اکثر ریاستوں میں اثر و نفوذ حاصل ہوگیا اور وہ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی پوری طرح دخل اندازی کرنے لگے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی مضبوط حریف باقی نہیں رہا۔ اس لئے اپنے استعماری منصوبوں کو بھی عملی شکل دینے کا موقعہ ملا۔ لارڈ ویلزلی سے پہلے کرناٹک تنجور اور سورت کے حکمرانوں کو پنشن کے عوض ریاست سے دستبردار کر دیا اور اس کے بعد مرہٹوں جو دو سال پہلے تک انگریزوں کے حلیف تھے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور ان کو شکست دے کر ان کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پیشوا کی حیثیت صرف کٹھ پتلی حکمراں کی رہ گئی۔

ویلزلی کی توسیع پسندانہ پالیسی کے نتیجہ میں ان کا سامراج تو پھیلا تھا لیکن تجارت کو نقصان ہوا اور جنگوں کے اخراجات بہت ہوگئے۔ اس لئے کمپنی نے لارڈ ویلزلی کو واپس بلا لیا اور ان کی جگہ وارن ہیسٹنگز کو گورنر جنرل مقرر کیا۔ اس کے دور میں پیشوا نے آخری مرتبہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کئی جنگوں کے بعد ناکام رہا اور انگریزوں نے پیشوا کو پنشن دے کر اقتدار سے بے دخل کر دیا، اب سندھ سے لے کر جنوب ہند تک صرف سکھوں کی طاقت تھی جو انگریزوں کے اقتدار سے آزاد تھی، باقی ہر جگہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریزوں کی عملداری قائم ہوگئی تھی۔ اتفاق سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان کے جیسے جانشیں نہیں ملے اس لئے 1939 میں ان کی وفات کے بعد افراتفری کا عالم ہوگیا۔ اوپر سے انگریزوں نے حملہ کر دیا۔ اگرچہ پنجاب کے لوگوں نے بلالحاظ مذہب زبردست مقابلہ کیا لیکن ہار گئے اور 1846 میں لاہور کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے پنجاب کے کئی حصہ کر دیے، جموں و کشمیر راجہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا۔ جالندھر پر براہ راست انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور بقیہ

پنجاب کو برٹش ریزیڈنٹ کے ماتحت کر دیا۔

1848 میں لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر آیا۔ اس کے لئے ہندوستان میں جنگ کرنے کا تو کوئی موقعہ ہی نہیں بچا تھا اس نے انگریزوں کے ماتحت جو نام کے راجہ یا نواب رہ گئے تھے ان کی ریاستوں کو بھی براہ راست انگریزی عملداری میں لانے کی کوششیں شروع کیں۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک قانون پاس کرایا جو Doctrine of Lapse کہلاتا ہے۔ اس قانون کے تحت وہ ریاستیں جن کے والی بغیر وارث کے مر گئے ان پر کمپنی نے قبضہ کر لیا، دوسرا کام یہ کیا، بعض حکمرانوں کی پنشن ضبط کر لی اور بعض کے خطاب واپس لے لئے۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ پر بد انتظامی کا الزام لگا کر اس کو بے دخل کر دیا اور نظام حیدر آباد سے بھی برابر کا علاقہ چھین لیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے چند سال کے عرصہ میں ہندوستانیوں کو پوری طرح مفلوج کر دیا اور ملک کے تمام مفادات کا کمپنی کے حق میں پوری طرح استحصال ہونے لگا۔ اس کے نتیجہ میں پورے ملک کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی اور ہندوستانی ذہن بلا لحاظ مذہب وملت ملکی مفاد میں سر گرم فکر ہوا اور آخر اس بارود کے ڈھیر کو میرٹھ چھاؤنی میں چنگاری مل گئی۔ جس کے نتیجہ میں پورا شمالی ہندوستان آزادی کی جنگ میں کود پڑا۔

19.8 پہلی جنگ آزادی

1857 کی بغاوت کے اسباب کئی تھے۔ سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب، ''اسباب بغاوت ہند'' میں ان اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ وہ سیاسی، معاشی اور مذہبی ہر قسم کے اسباب تھے، لیکن ان میں قدر مشترک یہ تھی کہ انگریز ہندوستان کا استحصال کر رہے تھے۔ ہر قسم کی آزادی پر پابندی لگا دی تھی اور رویہ اس طرح کا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنے آپ کو ذلیل اور کمتر سمجھیں۔ بغاوت کی ناگزیریت کو سمجھنے کے لئے ذیل میں تین اسباب کا مختصر بیان ہے۔

سیاسی اعتبار سے انگریزوں نے ملک کو مفلوج کر دیا تھا۔ زیادہ تر علاقوں پر براہ راست انگریزوں کی عملداری تھی اور جن ریاستوں میں براہ راست ان کی حکومت نہیں تھی ان کے حکمرانوں کو بھی بڑی حد تک بے دست و پا کر رکھا تھا، خود ان کی ریاستوں میں ان کے اختیارات کمپنی کے ماتحت ہو گئے تھے، آخری فیصلہ ہر حال میں کمپنی کا ہی مانا جاتا تھا۔

معاشی طور پر بھی انگریزوں نے ہندوستان کو بہت کمزور کر دیا تھا، صدیوں پرانی مقامی دستکاریاں دم توڑ رہی تھیں۔ خام مال کی سپلائی بڑے پیمانے پر برطانیہ کو ہوتی اور وہاں کی کمپنیوں میں تیار شدہ مال کئی گنی قیمت پر ہندوستان میں فروخت ہوتا۔ اس طرح پرانے دستکار اور ہنر مندوں کے مال کی کھپت بازار میں کم ہوگئی اور ان کو شدید بھکمری کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے مال پر محصول بھی زیادہ لگا دیا اور برطانوی مال کو ٹیکس فری کر کے اور سستا کر دیا۔

مذہبی اعتبار سے بھی انگریزوں کی پالیسیاں ہندوستانیوں کو ناپسند تھیں سر سید احمد خاں نے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے مذہبی منافرت کا وجود نہیں تھا۔ انگریز اپنے ساتھ مشنری لے کر آئے اور انہوں نے ہندوستانیوں میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی اور اس کے لئے ہر طرح کے وسائل بھی اختیار کئے، مثلاً بجائے مذہبی مقامات کے عام پبلک مقاموں میں مذہبی وعظ کہنے لگے اور اپنے وعظوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب پر سخت تنقیدیں کرتے تھے۔ ان پادریوں کے ساتھ پولیس کے آدمی ہوتے تھے اس لئے

عوام صرف غصہ پی کر بیٹھ جاتے تھے، مشنری اسکولوں میں چھوٹے بچوں کو عیسائیت کے فضائل اور اسلام اور ہندو مذہب کی برائیاں بتائی جاتی تھیں، عیسائی ہونے والوں کو بڑی مراعات دی جاتی تھیں اور حکومت ان کی امداد کرتی تھی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہی مذہبی اعتبار سے بھی برطانوی حکومت سے بدظن ہو گئے۔

انگریزی فوج میں دونوں مذاہب کی تحقیر و تذلیل کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کارتوس کے اوپر جو جھلی ہوتی تھی اس کو گائے اور خنزیر کی چربی سے بنایا گیا تھا اور اس کو ہٹانے کے لئے دانتوں سے اس کو کاٹنا پڑتا تھا بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی مجبور ہو کر عیسائی ہو جائیں۔ چونکہ عیسائی ان دونوں جانوروں کا استعمال جائز سمجھتے تھے۔

چربی کے کارتوسوں کے خلاف 29 مارچ 1857 کو میرٹھ چھاؤنی کے کچھ فوجیوں نے احتجاج کیا اور ان کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ میں وہ رجمنٹ برخاست کر دی گئی، منگل پانڈے نام کے ایک فوجی نے انگریز افسر پر گولی چلا دی اس کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ 24 اپریل کو بھی ایک رجمنٹ نے ان کے استعمال سے انکار کر دیا۔ 9 مئی کو ان میں سے بہت سے فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس طرح کے لگاتار واقعات سے میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی اور انہوں نے باضابطہ بغاوت کر کے متعدد انگریز افسروں کو گولی مار دی اور اپنے ساتھیوں کو رہا کر کے آزادی کا اعلان کر دیا۔ پھر یہ فوج دہلی کی طرف روانہ ہو گئی اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس تحریک کا مرکزی کردار بنا کر پورے ملک میں نقیب بھیجے اور یہ تحریک آناً فاناً پنجاب سے بنگال تک پھیل گئی، ہر جگہ فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ عوام نے بھی فوجیوں کا ساتھ دیا۔ متعدد امراء اور والیان ریاست بھی اس میں شریک ہو گئے۔ نواب جھجر نے باغیوں کا ساتھ دیا، رانی جھانسی نے تلوار اٹھائی۔ بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپے، جنرل بخت خاں جیسے لوگوں نے اس کی قیادت کی، عوامی سطح پر بہار میں کنور سنگھ، فیض آباد میں مولوی احمد اللہ، میوات میں چودھری الف خاں اور وسط ہند میں عظیم اللہ خاں جیسے لوگ اس تحریک کے قائد تھے۔ یہ تحریک اس زور سے اٹھی تھی کہ کسی بھی بڑی سے بڑی طاقت کے لئے اس کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہ تھا اور انگریزوں کا اقتدار بھی ان علاقوں سے ختم ہو گیا تھا۔ لیکن عملاً یہ بغاوت ختم کر دی گئی اور انگریزوں کا اقتدار چھ ماہ کے اندر اندر دوبارہ قائم ہو گیا۔

مؤرخین نے اس تحریک کی ناکامی کے اسباب بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ چند یہ ہیں اول یہ کہ بقول شاعر ۔ میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی۔ یہ تحریک اول دن سے ہی شکست کے عمل سے دوچار تھی، دراصل یہ کوئی باضابطہ پلاننگ یا سوچی سمجھی اسکیم نہیں تھی بلکہ مختلف طبقات میں مختلف طرح کے مظالم کے خلاف شدید غصہ تھا، وہ اچانک پھٹ پڑا، چونکہ انگریزوں نے بہت بڑی تعداد میں زمینداروں، راجاؤں اور نوابوں کو نوازا تھا اس لئے ہر جگہ اہم عہدوں پر ان کے حامی فائز رہے، جنہوں نے اس بغاوت کو اندرونی طور پر کچل دیا۔ حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کی فوجوں کا اسلحہ خانہ بھی کسی نے بارود سے اڑا دیا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ الگ الگ مقامات پر فسادات بھڑکے تھے۔ ان کا مرکزی اتحاد برائے نام تھا یعنی بہادر شاہ ظفر کو صرف برائے نام امیر مانا گیا، ورنہ جھانسی میں رانی لکشمی بائی اکیلے لڑی مہاراشٹر اور یوپی میں تانتیا ٹوپے، اودھ میں بیگم حضرت محل اور مختلف علاقوں میں چھوٹے زمیندار اور نواب لڑے پوری طاقت ایک ساتھ مجتمع نہیں ہو پائی۔ تیسری بات یہ ہے کہ انگریز بہتر اسلحہ اور مواصلات کے زیادہ بہتر انتظامات سے لیس تھے۔ انہوں نے اپنی فوجوں کو متحد کر کے ایک ایک مقام پر انتظام درست کرتے گئے اور آخر دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔

1857 کی سعی انقلاب ناکام ہوکر بھی بہت سے سبق دے گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کی شاندار روایت قائم ہوگئی اور یہاں کے لوگ اپنی ناکامی کا افسوس کرنے کے بجائے اسباب ناکامی کی تلاش میں لگ گئے، اس کے نتیجہ مختلف قسم کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ مثلاً دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مختلف تحریکات سرگرم عمل ہوئیں جن کا تذکرہ آگے رہا ہے۔ ان کے ذریعہ بالآخر ہندوستان میں ایک نئی بیداری آئی اور بے شمار بڑے بڑے لیڈر، دانشور اور علماء پیدا ہوئے انہوں نے قوم کی رہنمائی کی اور آخر کار 90 سال بعد ملک آزاد ہوگیا۔

19.9 کانگریس کا قیام

سعی انقلاب 1857 کی ناکامی نے ہندستان کے لوگوں نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ نئی امنگ کے ساتھ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں لگ گئے۔ اس سلسلہ میں کانگریس کا قیام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کانگریس ایک امریکی آئی سی ایس آفیسر آکٹیو بن ہیوم نے 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی، بعد میں یہ تنظیم تحریک آزادی ہند کے لئے روح رواں بن گئی۔

کانگریس کے قیام سے قبل ہندو مسلمانوں میں اپنی اپنی اور مشترکہ متعدد تنظیمیں قائم ہوچکی تھیں اور ملک میں بیداری کی جدوجہد جاری تھی۔ کانگریس نے سب کو مشترکہ پلیٹ فارم دیا۔ اس میں شروع سے ہی ہندو مسلم، عیسائی اور پارسی مذہب کے لوگ شریک رہے۔ 1905 تک 21 سال میں اس کے لگاتار 21 اجلاس ہوئے جن میں ملک کے اہم دانشور شریک ہوتے رہے۔ دادا بھائی نوروزی، بدرالدین طیب جی رحمت اللہ سیانی، فیروز شاہ مہتہ، وومیش چندر بنرجی وغیرہ نے شرکت کی اور حکومت برطانیہ کے سامنے ہندستانیوں کے مسائل رکھتے رہے۔ 1905 میں بنارس کانگریس کا اجلاس ہوا، اس اجلاس کی صدارت گوپال کرشن گوکھلے نے کی اور انہوں نے براہ انگریزوں سے ٹکراؤ کی پالیسی آغاز کیا اور برطانوی سامراجیت پر سخت تنقید کی۔ اس دوران برطانوی معاشی پالیسیوں سے تنگ آکر ملک میں سودیشی کی تحریک چلی یعنی ہندستان کی بنی ہوئی مصنوعات کا استعمال کیا جائے۔ اس سے ملکی معیشت کو بہت فائدہ ہوا۔

1906 میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہوئی، بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس ملک میں جس مذہبی اتحاد کی دعوت دے رہی ہے اس کو زک پہنچائی جائے۔ اس لئے بڑے بڑے مسلم رہنماؤں نے اس پر سخت تنقیدیں کیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر نے اس پر تنقید کی، بعد میں مسلم لیگ بھی تحریک آزادی میں شامل ہوگئی اور 1910 کے اجلاس میں مولانا مظہرالحق نے برطانوی سامراجیت پر تنقید کی۔

19.10 تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون

1919 میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کی شکست ہوگئی اور برطانوی سفارت خلافت کو ختم کرنے کے درپے ہوگئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے خلافت کے تحفظ کے لئے تحریک خلافت شروع کی، کانگریس نے اس کی پوری طرح تائید کی۔ اس وقت تک کانگریس کے افق پر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی آگئے تھے۔ وہ بھی اس تحریک میں شریک رہے، پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔

تحریک خلافت کے ذریعہ ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا جس نے برطانوی سامراجی عزائم کو بہت نقصان پہنچایا اور وہ تھی تحریک عدم

تعاون، مہاتما گاندھی اس کے رہنماؤں میں تھے۔ اس تحریک نے ہر سطح پر برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کیا، برطانوی حکومت نے تحریک خلافت کو دبانے کی کوشش کی۔ متعدد جگہ لوگوں کو مارا پیٹا گیا، سرعام ذلیل کیا گیا اور متعدد جگہ لوگوں کو گولی مار کر قتل بھی کیا۔ اس کے احتجاج میں پورے ملک میں جلسے ہوئے، ایسا ہی ایک جلسہ جلیانوالہ باغ میں ہوا جس میں جنرل ڈائر نے بغیر کسی انتباہ کے گولی چلادی، متعدد لوگ مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے، اس کے بعد اس تحریک میں اور شدت پیدا ہوگئی۔ ہر طبقہ کے لوگوں نے حکومت کا بائیکاٹ کیا، حکیم اجمل خاں نے قیصر ہند کا طلائی تمغہ واپس کر دیا اور بھی لوگوں نے اپنے خطابات اور تمغے واپس کئے، انگریزی طریقہ تعلیم کا بائیکاٹ کر کے، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کاشی ودیا پیٹھ جیسے قومی ادارے قائم ہوئے، یہ تحریک بڑی کامیابی سے چل رہی تھی کہ چوراچوری کے مقام پر ایک مشتعل ہجوم نے 22 پولیس والوں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد یہ تحریک واپس لے لی گئی۔

19.11 نمک ستیہ گرہ

برطانیہ کی استحصالی پالیسی کے نتیجہ میں پورے ملک میں غربت و افلاس کا عالم تھا کسانوں اور تاجروں سب کی حالت خراب تھی۔ مہاتما گاندھی نے 1930 میں وائسرائے کو خط لکھ کر اس اقتصادی بدحالی کی طرف توجہ دلائی اور کچھ مطالبات پیش کئے۔ لیکن وائسرائے نے ان کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے 12 مارچ 1930 کو مہاتما گاندھی نے نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا اور اپنے 89 ساتھیوں کو ساتھ لے کر سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف پیدل کوچ کیا جو وہاں 241 میل دور واقع ہے۔ گاندھی جی کا یہ سفر 24 دن تک جاری رہا اور اس کو پورے ملک میں زبردست مقبولیت ملی، ملک کے طول و عرض سے ہزاروں لوگ اس میں شریک ہونے کو چل دیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی ایک وفد اس میں شریک ہوا۔ 6 اپریل 1930 کو ڈانڈی کے مقام پر مہاتما گاندھی نے نمک بنا کر سرکار کا قانون نمک توڑ دیا، اس کے بعد پورے ملک میں سول نافرمانی شروع ہوگئی، پورے ملک میں مختلف ظالمانہ قوانین کی خلاف ورزی کی گئی۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک کروڑوں لوگوں نے اس میں حصہ لیا، صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں کی قیادت میں پٹھانوں نے زیادہ بے جگری دکھائی اور متعدد لوگ پولیس کی گولیوں سے مارے گئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد جیل گئے۔ کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اس موقعہ پر فوج نے بھی بڑی تعداد میں ستیہ گرہ کرنے والوں کا ساتھ دیا اور متعدد جگہ ان پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔

نمک ستیہ گرہ کی تحریک بہت کامیاب رہی۔ اس کے حل کے لئے گول میز کانفرنس ہوئی اور متعدد مذاکرات ہوئے آخر 25 جنوری 1931 کو وائسرائے نے کانگریس کے اوپر سے پابندی ختم کر دی گئی اور گاندھی جی کو مذاکرات کی دعوت دی۔ اس کے نتیجہ میں گاندھی ارون پیکٹ ہوا اور سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی گئی۔ اگرچہ اس معاہدہ کو پورے طور پر مقبولیت نہیں ملی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ گاندھی جی نے بھگت سنگھ کو پھانسی سے بچانے کے لئے کوئی گفتگو نہیں کی، تاہم مذاکرات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، دوسری گول میز کانفرنس ہوئی وہ بھی ناکامی پر ختم ہوئی اس کے بعد سول نافرمانی کا دوسرا دور شروع ہوا، لیکن اس دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔

19.12 بھارت چھوڑو تحریک

جنگ عظیم میں برطانیہ نے ہندستانی رہنماؤں سے مشورے کے بعد ہندستان کو بھی شریک کر دیا اور ہندستانی فوج متعدد مقامات پر جنگ میں

شریک ہوئی، ہندستانی رہنما اس کے خلاف تھے۔ آخر عین اس وقت جب جنگ اپنے عروج پر تھی 8 اگست 1942 کو مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور اس میں بھارت چھوڑو تحریک کا آغاز ہوا۔ اس دوران بنگال میں سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج قائم کی اور پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف ماحول بن گیا۔ آخر انگریزوں کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ جنگ کے بعد ملک کو آزاد کردیں گے، جنگ کا فیصلہ ہوجانے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آیا اور اس نے ملک کی آزادی کو نافذ کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس درمیان کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے اس لئے ملک آزاد تو ہوا لیکن دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ 15 اگست 1947 کو ملک کی باضابطہ آزادی کا اعلان کردیا گیا۔

19.13 انقلابی تحریک

1857 کے انقلاب کی ناکامی کے بعد دو محاذوں پر کام کئے گئے ایک تعلیمی محاذ تھا اور دوسرا کانگریس کا دور تھا۔ ان دونوں تحریکات کے ساتھ اول دن سے ہی انقلاب پسند لوگ سرگرم رہے۔ انہوں نے 1857 سے قبل برطانوی اقتدار کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کردیا تھا۔ مداری صوفیہ کی تحریک کا تذکرہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کے ضمن میں آگیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک زبردست تحریک شہیدین کی تھی یعنی شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید بریلوی نے آزادی کی مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ اگرچہ ان کا ابتدائی ہدف پنجاب کے سکھ اقتدار سے لڑنا تھا لیکن وہ اس پورے خطے میں آزادی کے داعی تھے اور اس تحریک نے بلاشبہ ہندستان کے طول وعرض میں ایک نئی بیداری پیدا کردی تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں کے درمیان اس تحریک کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے، ملک کے اندر پھیلی ہوئی بدعات وخرافات کا خاتمہ ہوا اور انھوں نے مسلمانوں میں قرآن وسنت سے وابستگی پر زور دیا، یہ تحریک شمالی ہند میں اٹھی اور اس کے بعد یہ پورا قافلہ حج کرنے گیا اور کابل کے راستہ ہندستان کا رخ کیا۔ اس تحریک نے افغانستان کو سکھوں کے قبضہ سے آزاد کرالیا تھا لیکن اس کے بعد حالات ایسے ہوگئے کہ ایک طرف تو افغانوں نے بغاوت کردی اور دوسری طرف سکھوں نے بڑی طاقت سے حملہ کیا۔ اس کشمکش میں یہ دونوں بزرگ بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوگئے اور یہ تحریک عملاً ختم ہوگئی۔ لیکن اس تحریک نے شمالی ہندستان میں جو بیداری پیدا کی تھی اس کے اثرات نے حالات کو بہت بہتر بنادیا اور پورے خطے میں دینی بیداری کی فضا عام ہوگئی۔

19.14 برطانوی استبداد اور اس کا ردعمل

برطانوی حکومت نے پوری طرح استبدادی طریقہ اختیار کیا۔ 1857 کے بعد ان کی مقابل کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی اس لئے انہوں نے ہر مسئلہ کا حل بندوق کی گولی یا پھانسی کی شکل میں نکالا۔ ہندستانی عوام جن کا ہر طرح استحصال کیا جارہا تھا بہت دن اس ظلم کو برداشت نہ کرسکے اور انہوں نے بھی مسلح بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ منڈا اور میزا قبائل نے بغاوت کی۔ منی پور میں وطن پرستی پر مبنی مسلح تحریک چلی، میوات میں متعدد مرتبہ مسلح بغاوتیں ہوئیں۔ انگریزوں نے ان حالات کے پیش نظر کانگریس سے گفت وشنید کرکے معاملات کو پرامن طریقے پر حل کرنے کی تجویز رکھی لیکن ان مذاکرات میں عملاً برطانوی مفادات کا تحفظ ہی ملحوظ رکھا گیا۔ اس لئے 1905 کے آتے آتے ملک میں گولوں اور بندوق کا کلچر عام ہوگیا اور کئی جگہ لوگ اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر انگریزوں سے مڈبھیڑ کرنے لگے۔

19.15 بنگال کی مسلح تحریک

بنگال میں اس مسلح تحریک کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہوئے، سب سے پہلے اروند گھوش کے چھوٹے بھائی برندر کمار گھوش اور سوامی وویکانند کے بھائی بھوپندر ناتھ نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا اور مذہبی کتابوں کا سہارا لے کر انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی تشہیر کی، انوشمن سمیتی نام کی ایک انجمن قائم کی اور یہ انجمن اتنی مقبول ہوئی کہ صرف ڈھاکہ میں اس کی پانچ سو شاخیں قائم ہوگئی، اس طرح کی اور بھی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں میں لوگوں کو ورزش کرائی جاتی، اسلحہ کی تربیت دی جاتی اور ان کو ہتھیار مہیا کرائے جاتے، اس طرح کی انجمنوں کے تربیت یافتہ نوجوانوں نے متعدد مقامات پر اس کا مظاہرہ بھی کیا۔ انہوں نے لیفٹیننٹ گورنر کی ٹرین کو بم سے اڑادیا اور ڈھاکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ایلن اور انڈریوز فریزر پر حملہ کیا۔

19.16 شمالی ہندستان میں مسلح تحریک

مسلح انقلابی تحریکات بنگال کے علاوہ شمالی ہندستان میں بھی بڑے پیمانے پر قائم ہوئیں۔ پنجاب میں امیر چندر، راس بہاری، دینا ناتھ، اودھ بہاری اور بسنت کمار بسواس نے انقلابی انجمن بنائی اور اس کو بنگال کی انقلابی تحریک سے وابستہ کیا۔ پنجاب میں ان انقلابیوں میں سے بہت سے لوگوں کو موت کی سزا ہوئی۔ امرتسر اور پنجاب میں بموں کے کارخانے قائم کئے گئے اور متعدد مقامات پر سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ اس طرح کی تحریکات سے یقیناً امر شہید سردار بھگت سنگھ بھی متاثر ہوئے ہوں گے جنہوں نے اسمبلی میں بم پھینک کر ہندستان میں انگریزوں کے راج کو غاصبانہ ثابت کر دیا۔

19.17 ریشمی رومال تحریک

دارالعلوم دیوبند جو تحریک آزادی ہند کا تعلیمی نقیب ہے اس کے استاذ مولانا محمود حسن نے ملک کی آزادی کے لئے ریشمی رومال تحریک چلائی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان اور ترکی کی مدد سے ہندستان پر باہر سے حملہ ہو اور ملک کے اندر نوجوان طبقہ انگریزوں کی مخالفت کرے اور اس طرح ترکی اور افغانستان ہندستانیوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے میں مدد کریں۔ اس تحریک کو روبکار لانے کے لئے افغانستان میں ہندستان کی ایک جلاوطن حکومت بھی قائم کی گئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ تھے اور وزیر اعظم برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی۔ تحریک آزادی کے دوران ہندستان کی جلاوطن قائم کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جو پوری طرح ہندو مسلم اتحاد کا مظہر تھی۔ اس تحریک کے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن نے مکہ مکرمہ کا سفر کیا تاکہ ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا سے مزید گفت وشنید کریں۔ لیکن اسی دوران اس تحریک کا راز فاش ہوگیا۔ اس تحریک میں خط وکتابت اور جنگ کے نقشوں کے لئے ریشمی رومال استعمال کئے جاتے تھے اس لئے اس کو تحریک ریشمی رومال کہا جاتا ہے۔ شیخ الہند اور ان کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، مولانا نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔

19.18 دیگر لوگ

میڈم بھیکا جی کاما نے لندن میں ہندستان کی آزادی کا جھنڈا لہرایا اور وہاں ہندستانی نوجوانوں کو منظم کر کے فری انڈیا سوسائٹی قائم کی، ان کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے حکومت نے ان کو لندن سے نکال دیا وہ پیرس چلی گئیں اور وہاں سے انقلابی تحریک چلائی۔

لوکمانیہ بال گنگادھر تلک نے کیسری نام سے ایک اخبار نکالا اور آزادی کا بگل بجایا، انگریزوں نے ان کا اخبار بند کر دیا اور ان کو چھ سال کی قید کی سزا دی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال، حسرت موہانی کے اردوئے معلٰی اور اس طرح کے بہت سے اخبارات کو بند کر دیا اور ان کے مدیروں کو قید یا نظر بند کر دیا۔

برکت اللہ بھوپالی عظیم انقلابی رہنما تھے انہوں نے ابتداء برطانیہ کے اندر رہ کر ہندستان کی آزادی کے لیے قوم پرستوں کو منظم کیا۔ پھر ہندوستان آنے کے بعد سودیشی تحریک میں شریک ہوئے 1909 میں ان کو جاپان جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں انہوں نے اسلام فریٹرنٹی کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ 1914 میں وہ امریکہ چلے گئے اور غدر پارٹی میں شمولیت اختیار کی پھر جرمنی اور ترکی گئے۔ اس کے بعد افغانستان میں ہندستان کی پہلی جلاوطن حکومت کے وزیر اعظم بنے اس کے بعد روس گئے جہاں لینن سے ملاقات کی، اس طرح انہوں نے پوری دنیا میں ہندستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے میں صرف کر دی اور آخر جلاوطنی میں ہی انتقال ہو گیا۔

سوہن لال بھاکنا، لالہ ہردیال اور کاشی رام نے امریکہ میں غدر پارٹی بنائی اور انہوں نے غدر کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا، جس کے ذریعہ انہوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف عوام کو بیدار کیا۔

ونا یک دامودر ویر ساورکر نے متر منڈل کے نام سے ایک تنظیم بنائی، انہوں نے ابھی نو بھارت اور فری انڈیا سوسائٹی بھی قائم کی، ان کے انقلابی خیالات کی وجہ سے ان کو گرفتار کر کے انڈمان بھیج دیا گیا، بعد میں رہا کر دیے گئے۔

رام پرساد بسمل اور شہید اشفاق اللہ خاں نے مسلح جدوجہد میں حصہ لیا۔ اس کی پاداش میں انگریزوں نے ان کو پھانسی کی سزا دی، اسی طرح چندر شیکھر آزاد ایک پولس مقابلے میں شہید ہوئے، سکھدیو اور ادھم سنگھ کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔

19.19 آزاد ہند فوج

بنگال کے ایک انقلابی رہنما سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج قائم کی اور 1943 میں اس فوج کے ذریعہ انڈمان اور نکوبار میں آزاد ہند حکومت قائم کر لی۔ آزاد ہند فوج نے جے ہند کا نعرہ دیا تھا اور ان کا ارادہ بذریعہ طاقت دہلی پر قبضہ کرنے کا تھا۔ اس سلسلے مین جاپان نے ان کی مدد کی تھی، لیکن 1945 میں جاپان کی شکست کے بعد ان کے عزائم سرد ہو گئے۔ سبھاش چندر ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہو گئے، لیکن ان کے قریبی ساتھی جنرل شاہنواز، کرنل گرو پال سنگھ ڈھلوں اور میجر سہگل پر مقدمہ چلا۔ پنڈت جواہر نہرو اور آصف علی نے ان کی وکالت کی۔ ان کو سزا ہوئی لیکن بعد میں رہا کر دیئے گئے۔

اس طرح ملک کی تحریک کے نرم رخ یعنی کانگریس، گرم رخ یعنی مسلح تحریک اور تعلیمی اداروں کی مشترکہ کوششوں سے ہندستان کو آزادی کا سورج دیکھنے کا موقعہ ملا۔

19.20 تعلیمی ادارے

1857 کی سعی انقلاب اگر چہ ناکام ہوگئی۔ لیکن اس ناکامی کے جلو سے ایک نئے ہندستان کا جنم ہوا، ہندو اور مسلمانوں نے باہم اتحاد کی اہمیت کا شدت سے احساس کیا اور شعوری طور پر ملک میں یکجہتی کی تحریک چلی، اگر چہ انگریزوں نے اس کو محسوس کرلیا تھا اور انہوں نے اس کو ختم کرنے کی کوشش بھی شروع کی۔ لیکن مجموعی طور پر ہندو مسلم اتحاد کی روایت باقی رہی اور اس انقلاب کے ناکام ہونے سے ایک نیا رخ یہ نکلا کہ ہندستانیوں نے اپنی قدیم روایات کے تحفظ کے لئے اپنے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ دراصل انقلاب کی ناکامی سے یہ احساس عام ہوگیا تھا کہ انگریزوں کو سیاسی قوت سے زیر نہیں کیا جاسکتا اور انگریز جس طرح کا تعلیمی نظام چلا رہے ہیں اس میں خطرہ یہ ہے کہ ہندستانی قوم بھی اپنی روایات اور اقدار سے بے گانہ ہوکر اس میں بہہ جائے گی، اس لئے اس وقت کے دانشوروں نے اس کی کوشش کی کہ اپنا تعلیمی نظام اپنے ہاتھ میں رہے۔ اس میں دو گروہ ہوگئے۔ ایک گروہ تو یہ سمجھتا تھا کہ انگریزوں کی کامیابی کے پیچھے ان کا تعلیمی معیار اور ان کی تعلیمی ترقی ہے۔ اس لئے اس نے عصری تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے قدیم علوم ہی ہماری ملی شناخت کو باقی رکھ سکتے ہیں اس لئے انہوں نے قدیم نصاب تعلیم پر مشتمل ادارے قائم کئے۔ اول الذکر کی نمائندگی سرسید احمد خاں کرتے ہیں اور ثانی الذکر کی نمائندگی مولانا محمد قاسم نانوتوی کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں، مغربی علوم کی ترقی سے بہت متاثر تھے انہوں نے لندن کا سفر بھی کیا تھا۔ وہاں براہ راست یوروپ کے طرز تعلیم اور ان کے مضامین کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد ہندستان آئے یہاں پہلے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ جس کا مقصد مغربی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا اور اردو میں ان موضوعات پر بحث وتحقیق کرنا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مغربی علوم کی تحصیل کے لیے ایک باضابطہ درسگاہ قائم کی جس کا نام پہلے مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ رکھا، بعد میں اینگلو محمڈن اورینٹل کالج رکھا۔ سرسید کے بعد 1920 میں یہ کالج یونیورسٹی بن گیا۔ ہندستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں اس ادارہ کا غیر معمولی کردار ہے اور آج بھی ہندستان کے بڑے تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔

مسلم دانشوروں کا ایک طبقہ وہ تھا جس نے مشرقی علوم کے تحفظ کو تحریک آزادی کی ریڑھ کی ہڈی قرار دیا اور انہوں نے حکومت کی ہر طرح کی مداخلت سے آزاد درس نظامی کے ادارے قائم کیے ان میں سب سے مشہور دارالعلوم دیوبند ہے جس کو مولانا محمد قاسم نانوتوی نے پروان چڑھایا دارالعلوم دیوبند ہندستان کی جنگ آزادی کے لیے اور مسلمانان ہند کی دینی بیداری کے لئے ایک سرچشمہ ثابت ہوا، اس کے طرز پر پورے ملک میں مدارس کا جال بچھا دیا گیا اور اس کے ذریعہ متعدد قومی ودینی تحریکات پیدا ہوئیں جنہوں نے نہ صرف ہندستان بلکہ پوری دنیا میں اسلام کا تعارف کرایا اور مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کی، قرآن وسنت کا تحفظ کیا اور دینی تعلیم کو عام کیا۔ سیاسی سطح پر تحریک ریشمی رومال، مجلس الاحرار، جمعیۃ علماء ہند اس ادارے کی دین ہیں اور دینی اعتبار پر تبلیغی جماعت جیسی عظیم جماعت اسی ادارے سے پیدا ہوئی۔ ہندستان کے اندر قومی تحریک کو زندہ رکھنے اور مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے میں دارالعلوم دیوبند کا بے مثال کردار ہے۔ بعد میں اسی تحریک سے متاثر

ہو کر ندوۃ العلماء قائم ہوا اور دیگر مدارس قائم ہوئے۔

19.21 خلاصہ

واسکوڈی گامانے 1498 میں یوروپ سے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا، اس کے ذریعے یوروپ کی قومیں تجارت کرنے کی غرض سے ہندوستان آنے لگیں اور بہت جلد ان کے عزائم سامراجی ہو گئے۔ انہوں نے یہاں کی سیاست پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اپنی فوجی قوت بڑھانے لگے۔ اسی دوران ان کی آپس میں بھی رقابت شروع ہو گئی اور آپسی جنگ میں میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ انگریزوں نے پہلے تجارتی معاہدات کے ذریعہ مراعات حاصل کیں بعد میں نوابوں کو قرض دے کر سود کے جال میں جکڑ لیا اور مختلف نوابوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ریاستوں میں اپنا اثر ڈالنا شروع کیا اور جب ان کو زیادہ قوت حاصل ہو گئی تو انہوں نے باضابطہ جنگیں شروع کر دیں، میسور کی ریاست پر قبضہ کیا، پلاسی کے میدان میں شاہ عالم اور نواب سراج الدولہ کو ہرایا۔ مراٹھوں کو شکست دے کر اپنی فوجی قوت کا لوہا منوالیا، ہندستان کے بیشتر حصوں پر بلاواسطہ اور کچھ حصوں پر بالواسطہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد زبردست استحصال شروع کیا اور خاص طور پر ہندستانیوں کی تحقیر و تذلیل شروع کی ہندستان میں مذہبی منافرت پیدا کرنے کے لئے مناظرے بازی کا بازار گرم کیا، فوجیوں کی مذہبی تذلیل کے لئے گائے اور خنزیر کی چربی کے کارتوس شروع کیے، رئیسوں اور نوابوں کی تذلیل کے لئے سرعام ان کی نیلامی شروع کی، تاجروں اور دستکاروں کو ناکارہ بنانے کے لئے ان کی مصنوعات پر بھاری ٹیکس لگا دیے اور برطانوی مصنوعات کو ٹیکس فری کر دیا، اس طرح ملک میں تاجر پیشہ طبقہ بے کار ہو گیا ان حالات میں ملک کے ہر طبقے میں انگریزوں کے خلاف منافرت کا ماحول پیدا ہو گیا اور پھر بتدریج پورے ملک میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اس کو پہلی جنگ آزادی بھی کہتے ہیں۔ 1857 میں ملک کے ہر طبقہ نے انگریزوں کے خلاف مسلح کارروائی میں حصہ لیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس تحریک کا قائد مقرر کیا گیا لیکن یہ تحریک ناکام ہو گئی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، اور دہلی پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔

پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد، ہندستانیوں نے مختلف طرح سے جنگ آزادی کو جاری رکھا، اس میں نمایاں کام تعلیمی اداروں کے قیام اور قومی رہنماؤں کا ہے۔ متعدد تعلیمی ادارے قائم کئے گئے جو انگریزوں کے اثر سے آزاد تھے، اسی طرح کانگریس کا قیام عمل میں آیا، اس نے 1885 سے 1947 تک ایک طبقہ کی نمائندگی کی، اس طرح مختلف سطح پر مسلح تحریکیں بھی چلتی رہیں۔ ریشمی رومال تحریک، تحریک خلافت، عدم تعاون اور سول نافرمانی کے ساتھ ساتھ آزاد ہند فوج اور انفرادی طور پر انقلابی مجاہدین کی سرگرمیوں سے یہ واضح ہو گیا کہ اب ہندستان میں برطانوی اقتدار دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور انگریزوں کو ملک کو آزاد کرنے کا وعدہ کرنا پڑا، اس طرح ایک طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد 1947 میں ملک آزاد ہو گیا۔

19.22 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1- ہندستان پر قبضہ کے لئے برطانوی طریقۂ کار پر روشنی ڈالئے۔

2- 1857 کی جنگ آزادی پر نوٹ لکھئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1- جنگ آزادی میں کانگریس کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

2- تحریک ریشمی رومال کیا ہے؟

3- سعی انقلاب 1857 کے اسباب بیان کیجئے۔

4- ہندستان کی جنگ آزادی میں انقلابی لیڈروں کی خدمات بیان کیجئے۔

19.23 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- تاریخ ہند عہد جدید، پروفیسر ظفر احمد نظامی

2- 1857، خورشید مصطفیٰ رضوی

3- انقلاب 1857، پی سی جوشی

اکائی-20: مسلم ریاستیں: بھوپال، حیدرآباد، رامپور، ٹونک میسور اور اودھ

اکائی کے اجزاء

20.1 مقصد

اس اکائی میں برطانوی ہندوستان کی چھ ریاستوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ برطانوی ہندوستان میں ریاستوں کے قیام واستحکام کو سمجھ سکیں گے، ان ریاستوں نے جن مشکل حالات میں اپنی شناخت بنائی اس سے واقف ہوں گے، برطانوی عہد میں متعدد ریاستیں قائم ہوئیں تھیں، لیکن اس اکائی میں مذکور چھ ریاستیں یعنی بھوپال، حیدرآباد، میسور، ٹونک، اودھ اور رامپور کے قیام میں بڑا تنوع ہے۔ اس کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ مختلف ریاستیں کس طرح قائم ہوئیں اور انہوں نے اپنے وجود اور اپنے تشخص کو باقی رکھنے کے لئے کیا جدوجہد کی۔ ساتھ ہی ان ریاستوں میں جو علمی، ادبی اور فنی ترقی ہوئی، طلبہ ان سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

20.2 تمہید

مغلوں کے منصب داری نظام کی وجہ سے، مغل عہد میں بڑے سرداروں کا عروج ہوتا رہا۔ جب تک مغلوں کی مرکزی طاقت مضبوط رہی اس وقت تک یہ سردار مرکز کے خادم رہے، لیکن جیسے ہی مغل حکومت میں مرکزی قوت کمزور ہونے لگی، ان سرداروں نے رفتہ رفتہ خودمختاری حاصل کرنی شروع کردی اور اس طرح ملک میں خودمختار ریاستوں کا فروغ شروع ہوا۔ اودھ کی ریاست، حیدرآباد کی ریاست، بنگال کی ریاست وغیرہ اسی طرح کی ریاستیں تھیں۔ ان ریاستوں کے قیام سے حوصلہ پاکر مقامی قوتوں نے بھی ترقی حاصل کر کے ریاستوں کا درجہ حاصل کیا اور بعض خارجی طالع آزما بھی حکومت حاصل کرنے کی امید میں اپنی صلاحیتوں اور قوت کا استعمال کرتے رہے اس طرح کی ریاستوں کے زمرے میں روہیل کھنڈ، ٹونک اور بھوپال کی ریاست مشہور ہیں اور اول الذکر زمرے میں جاٹ، مرہٹہ، سکھ اور حیدرعلی کی ریاست مشہور ہیں۔

ہندوستان کی یہ ریاستیں ابتداً خودمختار تھیں۔ مغل عہد تک بعض ریاستیں مغل حکمراں کی اخلاقی سرپرستی کو تسلیم کرتی تھی اور بعض ریاستیں اس سے بھی آزاد تھیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اثر ونفوذ کے ساتھ ہی انگریزوں کے ذریعے ان ریاستوں کی داخلی مختاری ختم ہونی شروع ہوگئی اور بعض ریاستیں تو ختم ہوگئیں اور بقیہ نے برطانوی سرپرستی میں اپنا وجود تو باقی رکھا لیکن مکمل طور پر انگریزوں کی ماتحتی قبول کرنی پڑی۔ وہ اپنی ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی برطانوی ریزیڈنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتے تھے۔ اس طرح ان ریاستوں کا بظاہر وجود تو تھا لیکن عملاً برطانوی عملداری تھی۔ ان ریاستوں میں اپنے اثرات اور اپنی خدمات کے اعتبار سے درج ذیل ریاستیں زیادہ اہم ہیں۔ بھوپال، حیدرآباد، رامپور، ٹونک، میسور اور اودھ، ذیل میں ان ریاستوں کا مختصر تعارف کرایا جارہا ہے۔

20.3 ریاست بھوپال

برطانوی عہد کی ریاستوں میں ایک مشہور ریاست بھوپال کی تھی، بھوپال کی ریاست اپنی وسعت کے اعتبار حیدرآباد کے علاوہ تمام ہندوستانی ریاستوں سے بڑی تھی اور اپنی علمی خدمات اور علماء نوازی کے اعتبار سے سب پر فائق تھی۔

20.3.1 ریاست بھوپال کے نوابین

ریاست بھوپال میں شروع سے آخر تک حسب ذیل حکمراں رہے۔

1- نواب دوست محمد خاں (1728-1723)

2- نواب یار محمد خاں (1742-1728)

3- نواب فیض محمد خاں (1777-1742)

4- نواب حیات محمد خاں (1807-1777)

5- نواب غوث محمد خاں (1826-1807)

6- نواب وزیر محمد خاں(1807-1816) نواب غوث محمد خاں کے بالمقابل

7- نواب نذر محمد خاں(1816-1819) نواب وزیر محمد خاں کے بیٹے

8- نواب سلطاں قدسیہ بیگم(1819-1837)

9- نواب جہانگیر محمد خاں(1837-1844) سکندر جہاں بیگم کے شوہر

10- نواب سکندر جہاں بیگم(1844-1868)

11- نواب شاہجہاں بیگم(1868-1901)

12- نواب سلطاں جہاں بیگم(1901-1926)

14- نواب حمیداللہ(1926-1969)(وفات 20/فروری 1960)

20.3.2 ریاست بھوپال کا قیام

بھوپال ریاست کے بانی نواب دوست محمد خاں تھے وہ ابتداً مغل فوج میں ملازم تھے، کچھ عرصہ کے بعد مغل فوج کی ملازمت ترک کر کے دیگر مختلف ریاستوں میں ملازمت کی۔ آخر میں مہارانی منگل گڑھ کے ملازم ہوئے اور بڑی دلجمعی سے ان کی خدمت کی، مہارانی نے ان کی وفاداری سے خوش ہوکر ان کو بیٹا بنالیا اور چونکہ مہارانی کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے یہی مہارانی کے وارث بنے۔ اگر چہ ان کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن ان کو وراثت میں بڑی دولت اور علاقہ مل گیا اس کے بعد ان کی طالع آزما طبیعت ان کو نئے میدانوں میں قسمت آزمائی کی طرف متوجہ کیا۔ بھیلسہ کے حاکم محمد فاروق کے دو بڑے سردار شمس خاں اور راجہ خاں میواتی کو قتل کر کے اس علاقہ پر اختیار حاصل کر لیا۔ مالوہ کے صوبہ دار بابو رائے کو شکست دینے کے صلہ میں مغل حکمراں فرخ سیر نے خاں کا خطاب عطا کیا اب تک ریاست کی راجدھانی اسلام نگر تھی، اسی اثناء میں نظام شاہ گونڈ کی بیوہ رانی کملاپتی کی مدد کے صلے میں موجودہ بھوپال کا خطہ مل گیا اور انہوں نے اس کو دارالحکومت بنالیا۔

دوست محمد خاں کی وفات کے بعد نواب یار محمد خاں کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ ان کو آصف جاہ والی حیدر آباد کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لئے انہوں نے زیادہ خطرات میں الجھے بغیر اپنا عہد آسانی سے گزار دیا۔ کچھ فتوحات بھی کیں، خاص طور پر رائسین کا قلعہ انہوں نے فتح کیا۔

20.3.3 ریاست بھوپال کا استحکام

نواب غوث محمد خاں کے عہد میں ریاست بھوپال پر بڑے خطرات آئے، خاص طور پر مرہٹہ سرداروں نے بڑی بڑی فوج لے کر سات مرتبہ بھوپال پر حملہ کیا، لیکن نواب صاحب کے حسن انتظام اور محنت و جفاکشی سے یہ حملے ناکام ہوگئے اور ریاست بھوپال کا انفرادی وجود باقی رہا، اس درمیاں ریاست بھوپال اور کمپنی کے درمیان معاہدہ ہوگیا، نواب وزیر الدولہ نے وہ معاہدہ جنرل آکٹرلونی کو بھیج کر مرہٹوں کے خلاف مدد مانگی، جنرل اکٹر نے سندھیا کو تنبیہ کی اور اس طرح ریاست بیرونی خطرات کے دائرے سے نکل آئی، لیکن انگریزوں کی طاقت کا سورج طلوع ہو رہا تھا اس لئے مجبوراً ان کی سرپرستی میں ہی ریاست کے تحفظ کی کوشش کی گئی۔

20.3.4 بیگمات بھوپال

نواب نظر محمد خاں نے کمپنی سے معاہدہ کرلیا تھا اور وہ یکسو ہو کر اپنی ریاست کی تعمیر وترقی میں لگنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ایک حادثے میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعد ان کی حسب وصیت نواب سکندر جہاں بیگم حکمراں ہوئیں۔ اگرچہ اس دوران ملک کے اندرونی حالات بہت خراب رہے۔ کچھ سرداروں نے سکندر جہاں بیگم کی تخت نشینی کی مخالفت کی، ان کے شوہر جہانگیر محمد خاں کو نوابی دی گئی، لیکن کچھ عرصہ بعد ہی میاں بیوی کے درمیان اختلافات ہوگئے اور نواب جہانگیر محمد خاں نے ان پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ جس سے وہ بمشکل جانبر ہوسکیں۔ اس کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی، نواب نظر محمد خاں کی وفات کے بعد سکندر جہاں کو باضابطہ حکمراں تسلیم کرلیا گیا اور اس طرح ریاست بھوپال میں یہ دور شروع ہوا کہ باضابطہ خواتین کی نوابی تسلیم کرلی گئی۔ جو یکے بعد دیگرے 1926 تک چلی۔

بیگمات بھوپال اعلیٰ درجہ کی منتظم اور مدبر خواتین تھیں۔ انہوں نے اپنے حسن تدبیر سے یہ ثابت کردیا کہ خواتین بھی انتظامی قابلیتوں اور نظم ونسق کو چلانے میں مردوں سے کس طرح کم نہیں۔ بیگمات بھوپال کی زندگی کا ایک خاص پہلو ان کی علمی سرپرستی ہے۔ ہندوستان کے تمام تعلیمی ادارے، علی گڑھ، دیو بند، جامعہ ملیہ اور دیگر بے شمار ادارے ان کے عطیات اور سرپرستی سے مستفید ہوتے رہے، دوسری طرف انہوں نے ریاست میں علم وادب کی بڑی سرپرستی کی ان کی علماء نوازی کی بدولت بھوپال میں بلاد وامصار کے بے شمار علماء جمع ہوگئے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی تو ریاست میں دخیل ہی تھے ان کے علاوہ ایسے علماء کی ایک طویل فہرست ہے جو اس دور میں ریاست کے اندر موجود تھے۔

بیگمات بھوپال خاص طور پر نواب شاہجہاں بیگم نے ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ جو علماء ملک کے اندر اور ملک کے باہر علم وفن سے وابستہ تھے ان کی سرپرستی کی، علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی لکھنے کا پروگرام بنایا تو اس کے کل مصارف کا اہتمام ریاست بھوپال سے ہوا تھا، اس کا تذکرہ علامہ شبلی نے بھی کیا ہے۔

بیگمات کے عہد میں خواتین کی تعلیم وتربیت اور ان کی ترقی کے لئے بھی بہت کوششیں ہوئیں خود بیگمات نے کتابیں بھی لکھیں اور تصنیف وتالیف کو فروغ دیا۔ بیگم سلطان جہاں نے خواتین کی تعلیم وتربیت کو سامنے رکھ کر متعدد کتابیں لکھیں۔

بیگمات بھوپال نے ریاست کے باہر بھی علمی وتعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان کے عطیات سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے۔ ہندوستان کے باہر بھی انہوں نے علمی کاموں کو فروغ دیا، مکہ معظمہ میں حاجیوں کے لئے رباط قائم کروائی، لندن میں جامع مسجد تعمیر کروائی اور اس کے علاوہ بے شمار علمی ودینی ورفاہی کام کئے۔

20.4 ریاست حیدرآباد

برطانوی عہد کی سب سے بڑی ریاست نظام حیدرآباد کی تھی۔ اپنے عروج کے زمانہ میں اس کا رقبہ تقریباً 3 لاکھ مربع میل تھا اور سقوط حیدرآباد تک برطانوی ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ بااثر ریاست شمار کی جاتی تھی۔

نظام حیدرآباد کی ریاست 1724 میں قائم ہوئی اور دوسو سال سے زائد عرصہ تک قائم رہ کر 1948 میں انڈین یونین کے اندر ضم ہوگئی۔

20.4.1 حیدرآباد کے نوابین

اس ریاست میں حسب ذیل حکمرانوں نے حکومت کی۔

1- نظام الملک آصف جاہ اول (اصل نام میر قمرالدین) 1724-1748

2- نصیر جنگ (1748-1750)

3- مظفر جنگ (1750-1751)

4- صلابت جنگ (1751-1762)

5- نظام الملک آصف جاہ دوم (1762-1803)

6- سکندر جاہ آصف جاہ سوم (1803-1829)

7- نصیر الدولہ آصف جاہ چہارم (1857-1869)

8- افضال الدولہ آصف جاہ پنجم (1829-1857)

9- آصف جاہ ششم میر محبوب علی خاں (1869-1911)

10- آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خاں (1911-1948)

20.4.2 ریاست حیدرآباد کا قیام

ریاست حیدرآباد کے بانی نظام الملک آصف جاہ اول کا اصل نام میر قمرالدین تھا، آبائی وطن ترکستان تھا، عہد عالمگیری کے بڑے امراء میں شمار ہوتے تھے، اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کے ذاتی جوہر مزید چمکے اور محمد شاہ کے عہد میں 1722 میں مغلیہ سلطنت کے وزیراعظم بنا دیے گئے۔لیکن اس وقت دربار میں نااہل مصاحبین کا بڑا غلبہ ہو چکا تھا۔انہوں نے مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کی کوشش کی تو ان کے خلاف دربار کے بہت سے امراء نے محاذ کھول دیا، آخر بددل ہو کر دکن چلے گئے۔یہاں ان کو چھ صوبوں کا گورنر بنا دیا گیا۔اگرچہ یہاں انہوں نے خودمختار حکمراں کی حیثیت اختیار کر لی تھی لیکن اپنے ولی نعمت مغل حکمرانوں کو ہمیشہ یاد رکھا اور جب ان کو ضرورت محسوس ہوئی اپنی طاقت کے ساتھ ان کی مدد کی۔

نظام الملک کے سامنے سب سے بڑا خطرہ مرہٹوں کا تھا، اور ان کے پورے عہد میں مراٹھوں سے مستقل جنگ وجدال رہی لیکن ان مشکل حالات میں اس نے نہ صرف اپنی ریاست کو باقی رکھا ہے بلکہ بعض نئے علاقے بھی فتح کیے اور دو دفعہ دہلی آکر مغل بادشاہ کی مدد کی۔

نظام الملک نے دریائے نربدا سے لے کر راس کماری تک بیشتر علاقے فتح کر لیے۔حیدرآباد، اورنگ آباد، احمد نگر، بیجاپور، تنجور، مدورائی اور ترچناپلی میں اس کی حکومت قائم ہوگئی، کیرالہ اور مہاراشٹر کے علاوہ پورا دکن ان کے زیر تصرف تھا۔ان کی زندگی میں ان کے ایک بیٹے

ناصر جنگ نے بغاوت کی لیکن وہ ناکام رہا، 1748 میں نظام الملک کی وفات ہوگئی۔

نظام الملک نہایت مدبر حکمراں تھا، بڑی انتظامی قابلیت تھی ذاتی طور پر وہ نہایت دیانتدار اور صاحب کردار حکمراں تھا، اس نے اپنے تدبر اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر یہ عظیم ریاست قائم کی اور اس کو مضبوط بنیادیں عطا کیں۔

نظام الملک آصف جاہ خود بڑے مدبر اور دانشمند تھے، لیکن ان کے جانشین اس تدبر کا مظاہرہ نہ کرسکے ان کے دو بیٹوں ناصر جنگ اور مظفر جنگ کے درمیان جانشینی کی جنگ شروع ہوئی اور اس جنگ میں مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کی مدد لی اور ناصر جنگ نے انگریزوں کا تعاون حاصل کیا۔ اس طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کو حیدرآباد میں براہ راست اور دیگر ریاستوں میں بھی عمل دخل شروع ہوگیا۔ شروع میں ناصر جنگ کو کامیابی ملی تھی لیکن جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ پھر مظفر جنگ حکمراں ہوئے ان کے بعد فرانسیسیوں نے صلابت جنگ کی حمایت کی، پیشوا نے اس کی مخالفت کی وہ غازی الدین کو حکمراں بنانا چاہتا تھا لیکن غازی الدین کی حادثاتی موت کے بعد صلابت جنگ حکمراں ہوگئے، لیکن ان کے بارہ سالہ دور میں وہ محض کٹھ پتلی حکمراں بنے رہے، بیرونی خطرات نے ریاست کو بہت کمزور کردیا۔ ریاست کا آدھا اقتدار بھی ختم ہوگیا۔

20.4.3 نظام علی خاں

صلابت جنگ کے بعد نظام علی خاں حکمراں بنا۔ ان کا تذکرہ خصوصیت سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس کو ریاست حیدرآباد کہتے ہیں اس کا صحیح معنوں میں مؤسس نظام علی خاں ہی ہے، نظام علی خاں نے فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی حمایت حاصل کی اور مختلف معاہدات کے ذریعہ اپنی آزادی تو کھوئی لیکن برطانوی فوج کے ایک بڑے حصہ کو اپنی حکومت اور اپنی حفاظت کے مختص کرالیا۔ نظام علی خاں نے ریاست کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کی کوشش کی اور ان کے سامنے جو نظام کے مقبوظات تھے ان کا بہتر انتظام کیا اور ملک میں ایک حد تک خوشحالی لوٹ کرآ گئی، نظام نے ہی ٹیپو سلطاں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی اور ٹیپو سلطان کی موت کے بعد اس کا علاقہ حیدرآباد اور انگریزوں نے اپنے درمیان بانٹ لیا، اس طرح نظام علی خاں کی مصلحت اندیشی اور مآل اندیشی نے ریاست حیدرآباد کو بھی محفوظ کردیا اور خود نظام علی خاں بھی محفوظ رہے۔

نظام علی خاں کے بعد ریاست پوری طرح انگریزوں کے زیر نگرانی رہی۔ 1857 کے خونیں ہنگاموں بھی ریاست حیدرآباد نے انگریزوں کی مدد کی، خاص طور پر اس وقت ریاست کے مختار یعنی میر منشی نواب سالار جنگ نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا، اس کے صلے میں، حیدرآباد کا مقام برطانوی حکومت کی نظر میں بہت بلند ہوگیا اور حیدرآباد کو خیرخواہ ریاست کا درجہ حاصل ہوگیا اور پھر انگریزوں نے بیرونی خطرات سے پوری طرح ریاست کی حفاظت میں تعاون دیا اور پھر ریاست کے لئے کوئی خطرہ باقی بھی نہیں رہ گیا تھا۔ نظام علی خاں کے بعد ریاست میں پانچ نواب گزرے جنھوں نے نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ آخر کے دو نواب میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے دور میں ریاست کے اندر علمی ادبی اور تاریخی ذوق بہت بلند ہوا۔ ریاست میں بہت سے معرکہ آراء علمی کام ہوئے اور اپنے عہد میں اسلامی علوم وفنون اور اسلامی کتابوں کی اشاعت کے لئے حیدرآباد سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ جس کے اثرات آج تک محسوس کئے جاتے ہیں۔

20.4.4 ریاست حیدرآباد کی علمی وادبی خدمات

ریاست حیدرآباد ایک طرح سے مغل عہد کا ضمنی توسیعہ ہے، نظام الملک دکن میں مغل حکمرانوں کے نائب کی حیثیت سے ہی گئے تھے۔اس لئے مغل دربار کی علم دوستی اور علماء کی سرپرستی کی روایت اس ریاست میں بھی برقرار رہی، شاہ نواز خاں اور غلام علی آزاد بلگرامی جیسے فضلاء روزگار اس دربار سے شروع میں ہی وابستہ ہوگئے۔شاہ نواز خاں جوعصام الدولہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ان کی کتاب مآثر الامراء، عہد عالمگیری کے بنیادی مراجع میں شمار کی جاتی ہے اور غلام علی آزاد بلگرامی کی کتابوں میں سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، مآثر الکرام، خزانہ عامرہ اور سرو آزاد بہت مشہور ہیں۔

بعد میں مغل دربار کے زوال کے ساتھ ساتھ علماء اور شعراء کا رخ بھی حیدرآباد کی طرف ہوتا گیا، مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی کی وابستگی سے ریاست کو اعتبار حاصل ہوگیا اور بعد میں مولانا شبلی نعمانی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے نامور علماء حیدرآباد سے وابستہ ہوگئے، جہاں استاد مرزا داغ دہلوی نے حیدرآباد کی محفلوں کو رونق بخشی اور بعد کے ادوار میں شعراء کی ایک بڑی جماعت نے حیدرآباد ہی کا رخ کیا اور اس سرزمین پر علم وادب کی سرپرستی ایسی ہوئی کہ پھر یہاں بڑے بڑے علماء اور ادباء پیدا ہوئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امجد حیدرآبادی اسی خاک نے پیدا کئے۔

خاص میر عثمان علی خاں کے دو کارنامے ایسے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ایک جامعہ عثمانیہ کا قیام، دوسرا دائرۃ المعارف کا قیام، اول الذکر اگرچہ ایک قدیم مدرسہ تھا جس کو میر عثمان علی خاں نے 1918 میں جدید طرز کی یونیورسٹی میں تبدیل کیا اور یہاں ذریعہ تعلیم اردو رکھا۔ یہ ہندوستان کی اولین یونیورسٹیوں میں سے ہے اور اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس یونیورسٹی میں تمام علوم کو اردو یعنی مقامی زبان میں پڑھانے کا تجربہ کیا اور مختلف علوم کی اصطلاحات کو سمجھنے کے لئے باضابطہ ایک محکمہ قائم کر کے مختلف علوم کی پانچ لاکھ سے زیادہ اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا۔

دوسرا کارنامہ دائرۃ المعارف حیدرآباد کا قیام ہے۔یہ ادارہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔اس کے تحت عربی زبان کی سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔ بہت سے متون اور مراجع جو مخطوطات کی شکل میں محفوظ تھے اور ان تک رسائی صرف چند لوگوں کی تھی ان کو ایڈٹ کر کے شائع کیا اور اس طرح ان کتابوں کے عام اسکالروں کی دسترس میں آجانے کی وجہ سے علمی کام میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

20.5 ریاست میسور

ہندوستان کی آخری آزاد ریاست میسور تھی، اس کا دارالحکومت پہلے میسور تھا پھر سرنگا پٹم بنایا گیا۔میسور کی ریاست کو سلطنت خداداد کہا جاتا ہے۔اس میں صرف دو حکمراں ہوئے، لیکن اپنی قابلیت شجاعت اور بہتر انتظامی صلاحیتوں کی بناپر تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کے حکمراں حسب ذیل تھے:

1- سلطان حیدر علی 1761-1783

2- سلطان فتح علی (ٹیپو سلطان) 1783-1799

20.5.1 ریاست میسور کا قیام

میسور ایک قدیم ریاست تھی جس پر ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی، لیکن راجہ برائے نام تھا عملاً سارے اختیارات وزیر نندراج کے ہاتھ میں تھے۔ اسی زمانے میں، سلطان حیدر علی نے نواب آرکاٹ کے یہاں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے نوکری شروع کی، بعد میں نواب آرکاٹ کی سفارش پر نندراج نے ان کو سرنگا پٹم میں ایک چھوٹے سے دستے کی کمان سپرد کی۔ اب حیدر علی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور اس کی انتظامی قابلیتوں اور سپاہیانہ بہادری کا سکہ جم گیا۔ 1755 میں حیدر علی نے مرہٹوں کو زبردست شکست دی، اس کے بعد ان کو میسور کی پوری فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا اور مختلف خطابات بھی دیے گئے۔

میسور کا راجہ کامل طور پر غیر مختار تھا، حکومت عملاً نندراج کے قبضہ میں تھی۔ راجہ نے حیدر علی سے گزارش کی کہ میرے اختیارات مجھے دلائے جائیں۔ نندراج بزرگ ہو چکے تھے اور حیدر علی کو اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے۔ ان کی فہمائش پر نندراج نے، وزارت کی سند واپس کر دی اور اپنی جاگیر پر چلے گئے، نندراج نے بعد میں حیدر علی کی بڑی مدد کی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض حیدر علی کی گزارش پر نندراج نے وزارت چھوڑ دی تھی۔

حیدر علی کے مشورے سے راجہ نے نیا وزیر کھنڈے راؤ کو بنایا۔ لیکن بعد میں راجہ نے احسان فراموشی کی اور نئے وزیر کے ساتھ مل کر خود حیدر علی کے خلاف سازش رچی اور انتہائی نازک وقت میں حیدر علی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ حیدر علی نہایت بہادری اور جانبازی سے نہایت مشکل راستوں سے ہوتا ہوا راتوں رات سرنگا پٹم سے نکل کر بنگلور پہنچ گیا اور وہاں اپنے وفاداروں کو جمع کر کے سرنگا پٹم پر حملہ کر کے کھنڈے راؤ کو گرفتار کر لیا اور راجہ کو نظر بند کر دیا، اس کے بعد راجہ سے اجازت لے کر اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا، اس طرح 1761 میں میسور کے اندر ایک نئی طاقت کا سورج طلوع ہوا۔

20.5.2 سلطان حیدر علی

حیدر علی 1761 میں خود مختار حکمراں بنے، میسور کے راجہ کو انہوں نے پنشن دے دی اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اس کے بعد اپنے علاقہ کی توسیع کی طرف توجہ دی اور بہت قلیل عرصہ میں تندی، بدنور، کوچین، گوا اور منگلور کے علاوہ جزائر مالدیپ کو بھی فتح کر لیا۔ ان جنگوں میں مراٹھوں اور پرتگالیوں کو پے در پے شکست ہوئی۔ جس کی وجہ سے حیدر علی کی دھاک بیٹھ گئی اور انگریز، نظام اور مراٹھے سب اس کی طاقت سے گھبرانے لگے اس کے بعد انگریزوں نے نظام، مراٹھہ اور آرکاٹ کے نواب کے ساتھ اتحاد قائم کیا اور سب کی متحدہ فوج نے بغیر کسی عذر کے میسور پر حملہ کر دیا۔ تاریخ میں اس حملہ کو میسور کی پہلی جنگ کہا جاتا ہے۔ یہ 1769-1767 تک چلی اور اس میں تمام اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی۔ نظام اور مراٹھوں نے معذرت کر کے جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی اور انگریز آخر صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

میسور کی پہلی جنگ کے بعد دس سال تک صلح باقی رہی، اگرچہ اس درمیان ناخوش گوار واقعات آتے رہے لیکن باضابطہ جنگ نہیں ہوئی۔ 1780 میں میسور کی دوسری لڑائی کا آغاز ہوا، اس کا اصل سبب تو معاہدہ مدراس کی انگریزوں کے ذریعہ خلاف ورزی تھی، دوسری وجہ یہ تھی

کہ انگریزوں کی غداری کی وجہ سے حیدرعلی نے فرانسیسیوں کا ساتھ لے لیا تھا اس لئے بھی اختلافات وسیع ہوگئے۔ اس جنگ میں بھی انگریزوں کو لگاتار شکست کا سامنا کرنا پڑا اور رفتہ رفتہ حیدرعلی نے انگریزوں کے زیادہ تر مقبوضات پر دوبارہ قبضہ کرلیا، اسی درمیان 6 دسمبر 1782 کو حیدر علی کی وفات ہوگئی۔

20.5.3 ٹیپوسلطان

ٹیپوسلطان کا اصل نام فتح علی تھا۔ شجاعت، بہادری، معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیتوں میں اپنے باپ کا صحیح جانشین ہونے کے ساتھ ان کو علم وادب کا بھی بڑا بالیدہ ذوق تھا، باپ کی وفات کے بعد ٹیپوسلطان میسور کا حکمراں بنا کر ٹیپوسلطان نے میسور کی دوسری لڑائی کو جاری رکھا اور مزید دو سال تک انگریزوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں آخر کار انگریزوں کو پھر صلح کرنی پڑی، 1784 میں صلح ہوئی اس کے ساتھ ہی میسور کی یہ لڑائی ختم ہوگئی۔

جنگ سے فارغ ہونے کے بعد ٹیپوسلطاں نے ریاست کی تعمیر وترقی کی طرف توجہ دی اور نہایت قلیل عرصہ میں ریاست پوری طرح خوشحال ہوگئی۔ ٹیپوسلطان نے زمینداری نظام ختم کردیا اور ساری زمینیں کاشتکاروں کے حوالہ کردیں، ریاست میں درآمدات کو کم کرنے اور برآمدات کو بڑھانے کے لئے متعدد کارخانے قائم کیے، تعلیم خاص طور پر اعلیٰ تعلیم کے لئے جوامع العلوم کے نام سے ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی قائم کی، فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کے ترجمہ کے لئے ایک دارالترجمہ قائم کیا، سرکاری بینک بنایا اور اسلحہ سازی کا کارخانہ بنایا۔

میسور کی تعمیر وترقی سب سے زیادہ انگریزوں کو ناپسند تھی اور وہ لگاتار اس کوشش میں تھے کہ اس کو ختم کردیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ پھر ایک بڑا اتحاد قائم کیا۔ نظام اور مراٹھوں کو اپنے ساتھ ملا کر میسور پر حملہ کردیا۔ تاریخ میں یہ میسور کی تیسری لڑائی کہلاتی ہے یہ جنگ 1790-1792 تک چلی اور اس جنگ میں ٹیپوسلطان کو مجبور ہوکر صلح کرنی پڑی اور اپنی ریاست کا آدھا حصہ بھی چھوڑنا پڑا۔

ٹیپوسلطان نے اس شکست کے بعد بیرونی امداد حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی، ترکی، ایران، افغانستان کے حکمرانوں سے امداد کی درخواست کی، لیکن کہیں سے امداد نہیں ملی اور اگر کہیں سے کوئی امید ہوتی بھی تو انگریز سازش کر کے اس کو ناکام بنادیتے۔ ٹیپوسلطاں کے لئے سارے راستے بند کردیئے اور ادھر اندرونی طور پر ٹیپوسلطاں کے خاص لوگوں کو انگریزوں نے سازش میں شریک کرلیا خاص طور پر میر صادق علی اور میر غلام علی نے غداری کر کے انگریزوں کو بڑی مدد دی اور 1799 میں میسور کی چوتھی لڑائی آغاز ہوا۔ جو اسی سال 6 مئی 1799 کو ٹیپوسلطاں کی شہادت پر ختم ہوگئی۔ انگریز فوج دھوکہ سے قلعہ میں داخل ہوئی تھی اور اس کی کمان لارڈ ویلزلی کررہا تھا۔

20.6 ریاست ٹونک

ہندوستان میں برطانوی عہد کی ریاستوں میں ٹونک کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ریاست ایک طالع آزما اور کسان کے بیٹے کے عزم وحوصلہ کا نمونہ ہے جس نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد شجاعت کے بل پر اٹھارہویں کے ربع آخر میں انگریز حکومت کا ناطقہ بند کردیا تھا اور جب انگریز اس جانباز کو طاقت سے ختم کرنے میں ناکام رہے تو پھر دام تزویری بچھا کر اس شہباز کو پابہ زنجیر ہونے اور طائر زیر پر منقار کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کردیا۔ ٹونک کی ریاست 1817 میں قائم ہوئی اور 1947 میں حکومت ہند کے اندر انضمام کے بعد ختم ہوگئی۔

20.6.1 ٹونک کے نوابین

ٹونک میں درج ذیل نواب گزرے ہیں:

1- نواب محمد امیر خاں بانی ریاست (1817-1834)

2- نواب محمد وزیر خاں (1834-1864)

3- نواب محمد علی خاں (1864-1867)

4- نواب محمد ابراہیم علی خاں (1867-1930)

5- نواب محمد سعادت خاں (1930-1947)

20.6.2 ریاست کا قیام

ریاست کے بانی نواب محمد امیر خاں کے دادا طالب خاں، محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور رامپور ریاست کے اجداد میں نواب علی محمد خاں کے یہاں ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے اپنی زندگی اسی ملازمت میں بسر کردی، ان کے بیٹے حیات محمد خاں نے نواب علی محمد خاں کے سپہ سالار دوندے خاں کی ملازمت اختیار کی اور ان کے مرنے کے بعد کچھ زمینیں حاصل کر کے کاشتکاری شروع کردی۔ وہ صوفی منش آدمی تھے۔ اپنی کاشتکاری میں لگے رہے، ان کے یہاں 1764 میں نواب محمد امیر خاں پیدا ہوئے۔

نواب امیر خاں ابتداء سے ہی بڑے طالع آزما تھے، معمولی کاموں اور چھوٹے علاقے میں انہیں محصور رہنا گوارہ نہیں تھا اور باہر جانے کی ان کو اجازت نہیں تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ بغیر بتائے گھر سے غائب ہو کر میرٹھ میں غلام قادر کی فوج میں ملازمت اختیار کرلی۔ کچھ عرصہ بعد واپس گھر آئے والدین سے اجازت لے کر صرف بیس سال کی عمر میں طالع آزمائی کے لئے نکل پڑے۔ شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کی متعدد ریاستوں مین ملازمت کی، آزاد بھی رہے۔ آخر میں جسونت رائے ہولکر سے دوستی ہوگئی اور پھر اسی دوستی میں اس کی زندگی مختلف نشیب وفراز سے گزری، نواب امیر خاں نے متعدد مرتبہ انگریزوں کو شکست دی۔ ایک مرتبہ پیشواء کو بھی شکست دے کر پونہ پر قبضہ کرلیا۔ لارڈ ویلزلی، جنرل مٹکاف، راجہ رنجیت سنگھ جیسے لوگ اس کی بہادری اور شجاعت کے بڑے قدرداں تھے اور انگریزوں نے ان کے دور عروج میں بڑی بڑی جاگیر اور نقد نذرانہ کے عوض ان سے مصالحت کرنی چاہی لیکن وہ تیار نہیں ہوئے، انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی، جو کامیاب نہ ہوسکی، 1805 میں ان کے دوست جسونت رائے ہولکر نے انگریزوں سے صلح کا معاہدہ کرلیا، اس کے بعد امیر خاں اکیلے رہ گئے، آخر دس سال کی مزید تگ وتاز کے بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ 1817 میں امیر خاں نے بھی انگریزوں سے صلح کرلی اور اس صلح کے نتیجہ میں ریاست ٹونک قائم ہوئی۔

20.6.3 ٹونک کے فرمانرواں

ریاست ٹونک قائم تو ہوگئی لیکن اول دن سے ہی انگریزوں کی نظر اس کو ختم کرنے یا بے اثر کرنے پر تھی۔ ٹونک کے پہلے نواب امیر

خاں کی جنگی مہارت اور ٹونک کے نواب کا سید احمد شہید بریلویؒ سے تعلق خاص طور پر نشانے پر تھے۔اس لئے انگریزوں نے اس ریاست کو بے اثر کرنے کی پوری کوشش کی۔نواب امیر خاں کی وفات کے بعد ان کو اس کا پورا موقعہ بھی مل گیا، وزیرالدولہ نواب وزیر محمد خاں نے اپنے باپ کی پالیسیوں کو جاری رکھا ان کے بعد ان کا بیٹا عین الدولہ نواب محمد علی خاں حکمراں ہوا۔ان کے زمانے میں لاوا کے ٹھاکروں نے سرکشی کی اور ان میں سے چند مارے گئے۔انگریزوں نے اس کو بہانہ بنا کر نواب کو معزول کر دیا، انہوں نے اپنی معزولی قبول اپنے بڑے بیٹے حافظ محمد ابراہیم کو مسند پر بٹھایا اور خود انگریزوں کی حسب منشا بنارس چلے گئے، جہاں بقیہ پوری عمر گزار دی۔

نواب محمد علی خاں علم دوست اور علماء نواز شخصیت کے مالک تھے۔ بنارس میں انہوں نے ایک کتب خانہ قائم کیا اور ساری عمر مطالعہ کتب اور علماء کی صحبت میں بسر کی۔خود بھی متعدد کتابیں لکھیں اور علماء کی ایک جماعت سے متعدد اہم کتابیں تصنیف کرائیں۔

نواب محمد ابراہیم خاں اور ان کے بعد نواب محمد سعادت خاں نے امن و عافیت کے ساتھ اپنی ریاست میں حکمرانی کی، ریاست کی فلاح و ترقی کے لئے کوشاں رہے اور علم و ادبی کی سرپرستی کرتے رہے۔ان کے عہد میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور 1947 میں ان کی وفات ہوگئی ان کے بعد چند ماہ کے عرصہ میں کئی نواب ہوئے اور آخر ریاست مختلف مراحل سے گزر انڈین یونین کا حصہ بن گئی۔

20.6.4 ٹونک کی علمی وادبی روایت

ٹونک ایک دور افتادہ اور علم و ادب کے مراکز سے دور ایک سنگلاخ زمین ہے۔لیکن نوابین کی یہاں آمد کے نتیجہ میں علم و ادب اور دین و دانش کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ٹونک بڑے بڑے مراکز کی ہمسری کرنے لگا۔

ٹونک کے اندر مختلف علوم وفنون کے متعدد ماہرین پیدا ہوئے۔فن طب میں حکیم برکات احمد اور ان کے خانوادے کو ید طولیٰ حاصل تھا اور بعد میں اس خاندان میں ہر طرح کے ماہرین فن اور علماء و حکماء پیدا ہوئے۔فن حدیث اور اسماء الرجال میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اپنے عہد کی نامور شخصیت تھے، لکھنؤ میں ایک عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں آپ کی متعدد کتابیں ہیں۔حدیث کے ایک اور بڑے عالم مولوی محمود حسن خاں تھے۔ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک مولوی سید نجف علی خاں جھجری بھی ایک طویل عرصہ تک ٹونک میں مقیم رہے، ان کو مختلف علوم اور متعدد زبانوں میں بڑی مہارت تھی اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ان کی سو کے قریب تصنیفات کا تذکرہ ملتا ہے۔حافظ محمود شیرانی کا تعلق بھی ٹونک سے ہی تھا، وہ دور آخر کے سب سے بڑے فارسی کے ماہر تھے۔فارسی مخطوطات پر ان کی وسیع نظر تھی۔ان کے علاوہ شعراء میں بسمل خیر آبادی، مضطر خیر آبادی، اسد لکھنؤ، اختر شیرانی جیسے نامور شعراء ٹونک سے وابستہ رہے۔

نوابین ٹونک کا ذوق کتاب داری بھی قابل ذکر ہے۔انہوں نے بڑی تعداد میں مخطوطات جمع کئے اور جو دستیاب نہ ہو سکتے تھے ان کو نقل کرایا، اس طرح ایک بڑا کتب خانہ ترتیب دیا۔اس کتب خانے کو بعد میں حکومت ہند نے مزید ترقی دے کر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنا دیا ہے۔ یہ کتب خانہ اب ہندستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے اہم کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔

20.7 ریاست اودھ

اودھ ایک خطہ کا نام ہے۔ یہ نام اودھ کے علاقہ میں واقع ایک شہر ایودھیا کی مناسبت سے پڑا ہے، اس پورے خطے کو اسی لئے اودھ کہا جاتا ہے۔ اودھ کا ترجمہ ہوگا دارالامن یعنی جہاں جنگ نہ ہو۔ یہ بڑا زرخیز خطہ ہے اور اس سے وابستہ متعدد تاریخی اور افسانوی روایات مشہور ہیں۔ مسلم عہد حکومت میں یہ خطہ تاریخ کی روشنی میں رہا۔ لیکن اس کو اصل شہرت جب ملنی شروع ہوئی جب برہان الملک سعادت خاں اس کے صوبے دار بنے اس کے بعد یہ علاقہ بتدریج، ایک ریاست میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

20.7.1 ریاست اودھ کے نوابین

اس ریاست میں حسب ذیل نواب ہوئے۔

1- سعادت خاں برہان الملک 1722-1739

2- صفدر جنگ 1739-1754

3- شجاع الدولہ 1753-1775

4- آصف الدولہ 1775-1797

5- آصف جاہ مرزا 1797-1798

6- یامین الدولہ (سعادت علی خاں) 1798-1814

7- رفاعت الدولہ (غازی الدین حیدر خاں) 1814-1827

8- ناصر الدین حیدر سلیمان جاہ 1827-1837

9- نجم الدولہ امجد علی شاہ 1842-1847

10- واجد علی شاہ 1847-1856

20.7.2 ریاست کا قیام

ریاست اودھ بنیادی طور پر مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور سعادت خاں برہان الملک کے عہد تک اس کی حیثیت صوبہ کی رہی۔ جب سعادت خاں اس صوبہ کا صوبہ دار ہوا تو چونکہ وہ خود ایک طاقتور سردار تھا اس لئے اس صوبہ کو بھی انفرادی تشخص ملنے لگا اور سعادت خاں کی طاقت کا احساس کرتے ہوئے مغل حکمراں نے بھی ان کی اہمیت تسلیم کرلی اور ان کو ''نواب وزیر'' کا خطاب دے کر ایک طرح کی خودمختاری عطا کردی۔ سعادت خاں برہان الملک نے اپنے عہد میں شاندار حکومت کی اور مغلوں کے بھی قابل اعتماد رہے۔ لیکن ادھر مغلیہ سلطنت لگاتار کمزور ہوتی جارہی تھی اور برطانوی قوم نہایت باریک بینی سے اس تاک میں تھی کہ ان کو کب موقع ملے اور کب وہ مداخلت کرکے صورت حال کا

استحصال کریں۔ اس دوران بکسر کی لڑائی پیش آ گئی اور 1764 میں پہلی مرتبہ انہوں نے شمالی ہند کے حکمرانوں کو باقاعدہ ٹکر دی۔ اس جنگ میں اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ مغل حکمراں شاہ عالم کے ساتھ تھے۔ شکست کا اثر شجاع الدولہ پر بھی پڑا، ایک تو اس کو تاوان جنگ دینا پڑا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ انگریزوں کو اودھ کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع مل گیا اور وہ نہایت چالاکی سے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگے۔ اس طرح یہ ریاست ابھی ٹھیک سے قائم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کو زوال شروع ہو گیا۔

20.7.3 استحکام اور مکمل خودمختاری

شجاع الدولہ بڑا جری اور باہمت نواب تھا۔ اس نے بکسر کی جنگ میں انگریزوں سے شکست کھانے کے باوجود اپنی فوجی طاقت مستحکم رکھی اور اس سال کے بعد خود انگریزوں سے فوجی مدد لے کر روہیل کھنڈ کے حکمراں حافظ رحمت کو شکست دی اور روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی اپنی ریاست میں شامل کر لیا، شجاع الدولہ کا عہد اودھ کی ریاست کے لئے سب سے زیادہ مستحکم تھا اور اسی عہد میں اس کی حدود سلطنت بھی سب سے زیادہ وسیع تھیں۔

شجاع الدولہ کے بعد اگرچہ ریاست کے استحکام میں کمی آئی، بعض علاقے بھی انگریزوں نے براہ راست اپنے قبضہ میں لے لئے لیکن 1814 میں غازی الدین حیدر خاں نے نواب وزیر کا لقب چھوڑ کر اپنے لئے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا، گویا اودھ کو خودمختاری جب ملی جب وہ اپنے زوال کے راستہ پر پابہ رکاب ہو گیا تھا۔

20.7.4 انگریزوں کی ریشہ دوانیاں

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ (1797-1775) حکمراں ہوا اس کے زمانے میں کمپنی نے نواب کا خراج دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار کر دیا اور نئے نواب کو مجبور کیا کہ وہ بنارس، جونپور اور غازی پور سے پوری طرح دستبردار ہو جائے۔ 1781 میں لکھنؤ کی فوج میں تخفیف کر دی گئی۔ اس کے بعد لارڈ ویلزلی نے 1801 میں آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں کو حکمراں بنایا اور اس سے روہیل کھنڈ اور دوآب کا علاقہ کمپنی کے لئے لے لیا۔ اس طرح لکھنؤ کے نواب انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔

20.7.5 ریاست کا خاتمہ

لارڈ ڈلہوزی ہندستان آیا تو اس کی الحاق کی پالیسی نے لکھنؤ کو بھی متاثر کیا۔ اس دور میں لکھنؤ کے نواب پوری طرح انگریزوں کے ماتحت ہو چکے تھے۔ فوجی قوت برائے نام رہ گئی تھی آخری نواب واجد علی شاہ کو حکومت کے اختیارات مطلق نہیں تھے۔ انگریزوں نے اس نام کی ریاست کو بھی ختم کرنے کے لئے نواب واجد علی شاہ کو مجبور کیا کہ وہ ریاست کے جملہ حقوق سے دستبردار ہو کر پنشن لے کر ریاست سے دور چلے جائیں۔ نواب واجد علی شاہ کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے پنشن قبول کر لی اور اودھ سے دور کلکتہ کے مٹیا برج علاقے میں رہنے لگے اس طرح 1856 میں یہ ریاست پوری طرح ختم ہو گئی۔ نواب واجد علی شاہ کا انتقال 1887 میں کلکتہ میں ہوا۔ انگریزوں نے ریاست کا انتظام پہلے ایک کمشنر کے سپرد کیا بعد میں آگرہ کے ساتھ اس کا الحاق کر دیا، اس کے سربراہ کو لیفٹیننٹ گورنر شمالی مغربی صوبہ جات کہا جاتا تھا۔

20.7.6 علمی وادبی ترقی

سعادت خاں اور شجاع الدولہ کے عہد حکومت تک فیض آباد دارالحکومت تھا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو ترقی دی اور اسے دارالحکومت بنایا۔ لکھنؤ اپنے عہد کا نہایت خوبصورت قصبہ تھا، شاہی عمارتیں، شاندار محلات، خوبصورت باغ، حویلیاں اور بے مثال امام باڑوں نے اس شہر کو پائیدار عظمت بخشی، دہلی اور آگرہ کے بعد اتنی شاندار عمارتیں ہندستان کے کسی اور شہر میں موجود نہیں ہیں۔ لکھنؤ کے نوابین شیعہ تھے۔ انہوں نے معاشرہ میں بہت سی رسومات اور تقریبات کا اضافہ کیا، خود نواب بھی بڑے باذوق تھے۔ واجد علی شاہ نے ایک خوبصورت پری خانہ اور چڑیا گھر تعمیر کرایا، لکھنؤ میں ہر شام علم وادب کی محفل آراستہ ہوتی تھی شعر و نغمہ کا دور شروع ہوتا تھا۔ لکھنؤ کی شام ضرب المثل بن گئی تھی۔

جہاں تک علم وادب کی سرپرستی کا سوال ہے تو لکھنؤ کے نوابوں نے اپنے نامساعد حالات کے باوجود علم وادب کی بڑی سرپرستی کی، مرثیہ کا فن لکھنؤ میں ہی اپنے بام عروج کو پہنچا اور میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن کو اپنے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

لکھنؤ کے دربار سے وابستہ دوسرے بڑے شعراء میں خاں آرزو، سودا، میر، مصحفی، جرأت، انشاء اور خواجہ حیدر علی آتش کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اردو کے متعدد شعراء کو ان درباروں سے فیض پہنچا۔ دیا شنکر نسیم اور مُیر حسن نے اپنی بے مثال مثنویاں لکھنؤ میں رہ کر اور یہاں کے معاشرے کو سامنے رکھ کر لکھیں۔ اسی طرح پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کے نام ایک نثری کتاب لکھی جو اردو کے کلاسیکی ادب کا حصہ ہے، اور اس میں لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے۔ لکھنؤ میں ہی مشہور نصاب تعلیم درس نظامی شروع ہوا اور لکھنؤ کے مضافات میں علم وادب کے متعدد مراکز اور متعدد عظیم شخصیات پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے علمی وادبی دنیا میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے اور نوابین اودھ کی قائم کردہ روایت ہنوز موجود ہے۔

20.8 رامپور

ریاست رامپور روہیلہ پٹھانوں کی طالع آزمائی کی داستان ہے۔ ایک روہیلہ غلام داؤد خاں اپنے مالک کی وفات کے بعد افغانستان سے ہندستان آیا اور یہاں مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد اس کو 14 لاکھ کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا اور اس کے بعد اس نے لگاتار ترقی کی، کولری کے راجپوتوں کو ہرا کر اس نے اپنی فوجی عظمت کا بھی سکہ بٹھا دیا حتیٰ کہ آنولہ کا راجہ جو اس کا سرپرست تھا وہ بھی در پردہ اس کی مقبولیت سے ڈرنے لگا اور اس نے ایک مرتبہ موقعہ پا کر داؤد خاں کو قتل کرا دیا۔ داؤد خاں کے متبنّیٰ علی محمد خاں نے راجہ پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور خود نواب بن گیا۔ اس میں داؤد خاں کے ایک قریبی حافظ رحمت خاں نے اس کی مدد کی، اس طرح روہیل کھنڈ کے علاقے میں ایک نئی طاقت کا ظہور ہوا۔

20.8.1 رامپور کے نواب

رامپور ریاست انگریزوں کی سرپرستی میں 1774 میں قائم ہوئی اور کم و بیش پونے دو سو سال تک قائم رہی۔ اس ریاست میں بڑے دور آئے اور متعدد مرتبہ اس کا اختیار انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ تاہم اس میں درج ذیل نواب گزرے ہیں۔

1- نواب فیض اللہ خاں 1793-1774

-2 محمد علی خاں بہادر 1793-1794

-3 احمد علی خاں بہادر 1794-1840

-4 محمد سعید خاں بہادر 1840-1855

-5 یوسف علی خاں بہادر 1855-1865

-6 کلب علی خاں بہادر 1865-1887

-7 محمد مشتاق علی خاں بہادر 1887-1889

-8 حامد علی خاں بہادر 1889-1930

-9 رضا علی خاں بہادر 1930-1947 (وفات 1966)

20.8.2 ریاست کا قیام

ریاست رامپور روہیلہ قوت کی باقیات میں سے ہے۔ 1772 میں روہیل کھنڈ پر مراٹھوں نے حملہ کیا تھا۔ روہیلوں نے چالیس لاکھ روپیہ کے عوض نواب شجاع الدولہ سے مدد مانگی، لیکن بظاہر شجاع الدولہ نے وعدہ تو کیا لیکن مدد پوری طرح نہیں کی۔ اس سے ناراض ہو کر روہیلوں نے رقم دینے سے انکار کر دیا اور بعد میں بات اتنی بڑھی کہ 1774 میں جنگ کی نوبت آگئی۔ نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں سے چالیس لاکھ روپیہ کے عوض مدد مانگی اور شاہ عالم کی اجازت سے روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ چونکہ اس جنگ میں انگریز بھی شریک تھے اور انگریزوں کا طریق جنگ یہ رہا ہے کہ وہ جنگ سے پہلے ہی جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے بعد جنگ میں شرکت کرتے تھے۔ پوری طرح سازشیں کی گئیں۔ روہیلہ سرداروں میں آپس میں نااتفاقی پیدا کر دی۔ خود علی محمد خاں کو بھی جنگ سے الگ رہنے کے حالات پیدا کر دیے نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلے ہار گئے۔ حافظ رحمت خاں شہید ہو گئے اور روہیلوں کو اپنے وجود کی بقاء کے لئے شجاع الدولہ اور انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا، لال ڈانگ کے مقام پر معاہدہ ہوا جس کی رو سے روہیلوں کو بریلی جوان کا پایہ تخت تھا خالی کرنا پڑا اور ان کو رامپور کے مقام پر ریاست دی گئی اور یہ ریاست اودھ کے لئے کوئی خطرہ نہ بنے اس کے لئے یہ پابندی لگا دی کہ نواب رامپور پانچ ہزار سے زیادہ فوج رکھنے کا مجاز نہیں ہوگا اور رامپور کے نواب زادے لکھنؤ میں پرورش پائیں گے۔ اس طرح 31 اکتوبر 1774 کو ریاست رامپور وجود میں آئی اور نواب فیض اللہ خاں نے ایک پرانے گاؤں رامپور کے قریب، مصطفیٰ آباد کے نام سے ایک شہر بسایا اور وہاں سے حکومت کرنے لگے۔

20.8.3 ریاست رامپور کی تاریخ

ریاست رامپور انگریزوں اور شجاع الدولہ کے زیر سایہ قائم ہوئی۔ ایک طرف انگریزوں نے ریاست کی ہر سرگرمی پر نظر رکھی اور اسے معاہدات میں قید رکھا، دوسری اودھ کے نواب بھی طرح طرح سے ان کو پابند کرتے رہے، رامپور کے نوابزادوں کی پرورش لکھنؤ میں ہوتی تھی اس لئے یہ نوابین بتدریج سنی مذہب چھوڑ کر شیعہ مذہب میں شامل ہوتے گئے اور رامپور ایک شیعہ ریاست بن گئی۔ اس کے باوجود رامپور کے

نوابوں نے علمی، ادبی اور فنی ترقی کے لئے بہت کوشش کی۔ رامپور کے بیشتر نواب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کا وسیع مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے شہر کی جامع مسجد تعمیر کروائی۔ نواب حامد علی خاں نے نہایت خوبصورت دربار ہال بنوایا اور قلعہ کے اندر ایک خوبصورت امام باڑہ بنوایا۔

1857 کی سعی انقلاب میں رامپور کے نوابوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا اور متعدد جگہ محصور انگریزوں خاص طور پر خواتین اور بچوں کی بڑی مدد کی۔

20.8.4 علمی وادبی ترقی

رامپور کا اصل کارنامہ رامپور کی علمی ادبی ترقی ہے۔ نواب فیض اللہ خاں نے اپنے دور میں ہی عربی، فارسی، ترکی اور مختلف زبانوں کے مخطوطات جمع کرنے شروع کردیے تھے اور انہوں نے ایک شاندار لائبریری مرتب کی، رامپور کے تمام نوابین بتدریج ان کتابوں میں اضافہ کرتے رہے اور آخری نواب رضا علی خاں کے دور تک اس کتب خانے میں مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ اس کے بعد جب یہ پبلک لائبریری بنی تو اس کا شمار دنیا کی چند لائبریریوں میں ہوتا ہے جہاں اتنی تعداد میں مخطوطات جمع ہیں۔

رامپور کی ادبی روایت بھی بہت شاندار رہی ہے۔ شروع سے ہی خود رامپور کے نوابوں کا ذوق ادبی تھا، ابتدائی دور کے نواب دہلی میں رہے وہاں کے ماحول میں اس کو اور جلا ملی، حکیم مومن خاں مومن اور مرزا غالب سے رشتہ تلمذ بھی تھا۔ مرزا غالب کی امداد بھی کرتے تھے اور ان کو باضابطہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر تھا، مرزا غالب اور نوابین رامپور کے مابین خطوط اردو ادب میں نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔

1857 میں دہلی دربار کے اجڑ جانے سے بہت سے شاعر، ادیب اور فنکار بے روز ہوگئے تھے۔ نواب رامپور نے بھی ان میں سے بہت لوگوں کو پناہ دی۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی، حیدرآباد جانے سے پہلے رامپور میں ہی رہے۔

رامپور اردو شاعری کا ایک باضابطہ دبستان ہے۔ اس کے نمائندہ شاعر نظام رامپوری ہیں۔ اس دبستان کو بوجوہ مطلوبہ شہرت نہ مل سکی لیکن اردو شاعری میں ایک نئے انداز کا رجحان پیدا کرگیا۔

رامپور میں مدرسہ عالیہ بھی ریاست کی شان تھی اور مدرسہ سے وابستہ بہت سے مشہور علماء تھے، خاص طور پر مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا عبدالسلام جیسے علماء وہاں سے وابستہ رہے اور مولانا محمد علی جوہر جیسے دریا یکتا کو رامپور کی خاک نے جنم دیا۔

20.9 خلاصہ

مغل سلطنت کی مرکزی قیادت میں کمزوری آئی تو ہندستان کے اندر مختلف مقامی اور خارجی قوتوں کا فروغ ہوا، مقامی قوتوں کے فروغ سے ملک میں طوائف الملوکی کی کیفیت پیدا ہوگئی اور اس کے نتیجہ میں متعدد ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان میں چھ مسلم ریاستوں کا مطالعہ اور پیش کیا گیا۔ پہلی ریاست بھوپال تھی یہ ریاست مغل فوج کے ایک ملازم نواب یار محمد خاں کی ذاتی کاوشوں سے قائم ہوئی، وسط ہند کا علاقہ اس ریاست کا مرکز تھا۔ مراٹھوں سے طویل جنگوں کے بعد اس ریاست کے نوابوں نے انگریزوں سے مصالحت کرلی اور اس کے بعد انگریزوں کی سرپرستی میں یہ ریاست 1947 تک قائم رہی۔ اس ریاست میں کل 14 نواب ہوئے، جن میں چار خواتین نواب بھی شامل ہیں، اس ریاست کی

وجہ سے وسط ہند کے علاقوں میں بڑی ترقی ہوئی، نئے شہر بسائے گئے، خوبصورت عمارتوں کی تعمیر نے اس علاقے کو رونق بخشی، مدرسہ قائم ہوئے جن کے ذریعہ لوگوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا گیا۔ اور یہاں کی خواتین نوابوں نے عورتوں کی تعلیم اور ترقی کے لئے خصوصی کام کیے۔

دوسری ریاست جس کا اوپر مطالعہ پیش کیا گیا وہ حیدرآباد ہے۔ یہ ریاست مغل دربار کے وزیر اعظم آصف جاہ اول نے قائم کی، مغل دربار کی سازشوں سے تنگ آ کر وہ حیدرآباد چلے گئے ابتداً صوبے دار تھے پھر خودمختار ہو گئے، ریاست حیدرآباد اپنے وقت میں جنوب ہند کی سب سے بڑی ریاست تھی آصف جاہ اول کے بعد اس ریاست میں جانشینی کو لے کر آپس میں جنگ ہوئی۔ اس کی وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس میں مداخلت کا موقعہ مل گیا اور آخر انگریز غالب آئے اور انہوں نے ریاست حیدرآباد کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ حیدرآباد نے ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔ اس طرح انگریزوں کے ساتھ دوستانہ روابط استوار کر کے اس ریاست نے اپنا وجود یقینی بنا لیا بعد میں انگریزوں کی مداخلت سے ہی جانشینی کے اختلافات بھی ختم ہو گئے۔

ریاست حیدرآباد کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں علمی اور ادبی ترقی بہت ہوئی۔ متعدد بڑے علماء اور دانشور اس ریاست سے وابستہ رہے۔ جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف جیسے پائیدار اہمیت اور دوررس اثرات کے حامل ادارے قائم ہوئے اردو زبان کو بڑی ترقی ملی۔ 1948 میں یہ ریاست بھی انڈین یونین کا حصہ بن گئی۔

تیسری ریاست میسور ہے۔ یہ ایک عام آدمی کی طالع آزمائی کی داستان ہے۔ حیدر علی ایک معمولی سپاہی سے ترقی کر کے نواب بنے اور انہوں نے اتنی طاقت ور فوج منظم کی کہ برطانوی افواج کو متعدد مرتبہ شکست دی اور یہ ثابت کر دیا کہ برطانوی اقتدار کا راز ان کی تکنیکی ترقی میں نہیں اور نہ ہی علوم وفنون میں برتری کی وجہ سے ہے ان چیزوں میں وہ برابر ہیں ان کے پاس اصل قوت کا سرچشمہ سازشیں ہیں اگر ان کی سازشوں سے بچا سکے تو ان کو شکست دینا مشکل نہیں۔ حیدر علی کے بعد ٹیپو سلطان نواب بنے تقریباً دس سال اسی شان سے حکومت کی، بعد میں مراٹھوں اور نظام حیدرآباد اور انگریزوں کی متحدہ قوت سے شکست کھائی اور پھر اپنوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ 1799 میں شہید ہو گئے۔ ٹیپو سلطان نے سرنگاپٹم میں ہندستان کی پہلی یونیورسٹی جوامع العلوم کے نام سے قائم کی تھی۔ انہوں نے انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجمہ کے لئے ایک مرکز بھی قائم کیا تھا اور خود بھی ایک بڑا کتب خانہ ترتیب دیا تھا۔

چوتھی ریاست ٹونک ہے۔ یہ ریاست ایک کسان کے بیٹے کے عزم وحوصلہ کی داستان ہے۔ یہ نوجوان بیس سال سے کم عمری میں طالع آزمائی کے لئے نکلا اور آخر ایک ریاست کا بانی بنا۔ نواب محمد امیر خاں اس کے بانی ہیں۔ انہوں نے شمالی ہندستان میں اپنی غیر معمولی جنگی مہارت کے جوہر دکھائے۔ آخر انگریزوں نے ان سے معاہدہ کر کے ان کو ٹونک اور سرونج کا نواب تسلیم کر لیا۔ ان کے اخلاف بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے، انہوں نے علم و دانش کی بڑی خدمت کی، ایک بڑا کتب خانہ بنایا۔ متعدد علماء کو ملازم رکھا۔ شرعی احکام کے مطابق عدالتی فیصلے کرنے کا اہتمام کیا اور ایک دور افتادہ مقام ٹونک کو شہرت دے کر مشہور مقامات میں شامل کر دیا۔

پانچویں ریاست اودھ ہے۔ یہ دراصل مغل عہد کی ریاست ہے۔ ایک مغل سردار سعادت خاں برہان الملک نے اس کو قائم کیا۔ بعد میں انگریزوں کو اس میں مداخلت میں موقعہ مل گیا اور ان کی ریشہ دوانیوں سے ریاست کی تعمیر وترقی بتدریج محدود ہوتی گئی، نوابوں کی حیثیت کٹھ پتلی رہ گئی اور لارڈ ڈلہوزی نے 1856 میں وہ حیثیت بھی ختم کر دی۔

ریاست اودھ نے دوشہر تعمیر کیے، فیض آباد اور لکھنؤ ان کے علاوہ کانپور کو بڑی ترقی دی اس کے علاوہ اس ریاست میں شعروشاعری کو بڑی ترقی ملی۔ اردو میں متعدد نامور شعراء اس خاک سے وابستہ رہے اور اردو کی بعض اصناف کو اس ریاست میں ترقی کا بام عروج ملا۔

چھٹی ریاست رامپور ہے۔ یہ داستان ہے ایک افغانی مہاجر داؤد خاں کی اس نے اپنی قابلیت سے روہیل کھنڈ میں بڑا مقام پیدا کیا اور اس کے جانشین نواب علی محمد نے باضابطہ ریاست قائم کرلی۔ حافظ رحمت خاں جیسا بہادر اس کے محافظوں میں سے تھا۔ بعد میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ روہیلوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد معاہدہ کی رو سے ریاست رامپور قائم ہوئی۔ ریاست رامپور میں علمی وادبی ترقی بہت ہوئی۔ متعدد شعراء اور عالم اس ریاست سے وابستہ رہے۔ مرزا غالب کی بھی سرپرستی کی گئی۔ ایک عظیم الشان مدرسہ اور ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا گیا۔ 1947 میں یہ ریاست بھی انڈین یونین میں ضم ہوگئی۔

20.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1- ریاست اودھ کے قیام اور عروج وزوال پر نوٹ لکھیے۔

2- ریاست میسور کی مختصر تاریخ بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1- ریاست حیدرآباد کی علمی وادبی ترقی پر مضمون لکھیے۔

2- بیگمات بھوپال کی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

3- ریاست رامپور کے قیام کا پس منظر بیان کیجیے۔

4- ریاست ٹونک پر ایک نوٹ لکھیے۔

20.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. سلطنت خداداد — محمود خاں بنگلوری

2. تاریخ ریاست ٹونک — ہنومان سنگھ

3. اخبار الصنادید — نجم الغنی خاں رامپوری

4. دائرۃ المعارف الاسلامیہ — متعلقہ ابواب

اکائی 21 : جنگ آزادی اور مسلمانوں کا کردار

اکائی کے اجزاء

21.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلباء کو یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں نے جنگ آزادی میں کیا قربانیاں دیں اور یہ کہ مسلمان اول دن سے جنگ آزادی میں شریک رہے۔ انہوں نے ہر موقع پر برادران وطن کے شانہ بشانہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے بے شمار قربانیاں دیں اور چند اہم مسلم مجاہدین آزادی کا تعارف بھی شامل ہے۔

21.2 تمہید

ہندوستان کی جنگ آزادی کسی ایک مذہب کے ماننے والوں یا کسی ایک جماعت کی جدوجہد نہیں تھی۔ بلکہ اس جنگ میں بلالحاظ مذہب وملت ہندستان کے سبھی طبقات نے حصہ لیا تھا اور نہایت خلوص اور لگن کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوئے۔ جنگ آزادی ہندستانیوں کے لئے ایک تربیت گاہ تھی ملک کو آزاد کرانے کی لگن نے یہاں کے لوگوں کی مخفی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ایسا لگتا ہے جیسے ہیروز کی ایک نرسری کھل گئی ہو۔ ہر مذہب میں اعلیٰ درجہ کے رہنما پیدا ہوئے۔

21.3 1857 سے قبل

جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اول دن سے مسلمان اس جدوجہد میں شریک رہے بلکہ مسلمانوں نے اس کی قیادت کی۔ اگر جنگ آزادی کا آغاز مانا جائے تو پلاسی کی جنگ سے ہوتا ہے جب انگریزوں نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کرلیا تھا۔ پلاسی کے میدان میں شکست کے بعد عام ہندستانیوں نے بھی یہ محسوس کرلیا تھا کہ اب ہندستان غلامی کی طرف گامزن ہے، ان حالات کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے مداری صوفیہ نے جنگ آزادی کا اعلان کیا۔ 1763 میں ڈھاکا سے اس تحریک کا آغاز ہوا اور بنگال کے بیشتر حصوں میں پھیل گئی۔ اس تحریک کی قیادت مجنوں شاہ مستانہ نے کی اور تقریباً بیس سال تک یہ لوگ لڑتے رہے، وارن ہسٹنگز نے اس تحریک کو سختی سے کچل دیا، مجنوں شاہ مستانہ اور ان کے کئی ساتھی مداری شاہ وغیرہ مارے گئے۔

مداری صوفیہ کی تحریک کے ساتھ پہلے کسان بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے اس تحریک کو کسانی ودروہ بھی کہا جاتا ہے اور سنیاسیوں کی بغاوت بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخی طور پر یہ پہلی جنگ آزادی تھی جس کی قیادت مسلمانوں نے کی تھی۔

آزادی کی جنگ میں دوسرا بڑا نام سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا ہے ان دونوں باپ بیٹوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور کم وبیش بیس سال تک مقابلہ کرتے رہے۔ آخر 1799 میں ٹیپو سلطان شہید ہوگئے، انگریز کمانڈر نے ٹیپو سلطان کی نعش پر کھڑے ہوکر کہا تھا کہ آج سے ہندستان ہمارا ہے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت نے انگریزوں کے لئے ہندستان پر اقتدار کے دروازے کھول دیے تھے، لیکن ابھی ان کو کافی سخت مقابلہ کرنا باقی تھا۔ میرٹھ چھاؤنی میں چربی کے کارتوسوں پر جو ہنگامے ہوئے ان میں بڑی تعداد میں مسلمان فوجیوں کو بھی سزا دی گئی اور بہت سوں کو قتل کر دیا، 10 مئی کو وہاں ہنگامہ ہوجانے کے بعد ان لوگوں نے دہلی کا رخ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا قائد مقرر کیا۔ ان کی قیادت میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ میں سب سے اہم کردار مسلمانوں نے ہی ادا کیا تھا۔ بعض ہندو حضرات نے مختلف مقامات پر جنگ آزادی کی قیادت کی۔ ان کے ساتھ بھی بہت سے مسلمان شریک تھے۔ رانی لکشمی بائی کا توپ خانہ مسلمانوں کے پاس تھا اور ان کے ساتھ ان کی ایک خاص سہیلی بھی مسلمان تھیں جو ان کے ساتھ ہی ماری گئیں۔

21.4 1857 کی سعی انقلاب

1857 کی سعی انقلاب میں مسلم علماء نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایک فتویٰ نے جو انہوں نے اس سے قبل دیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد ضروری ہے اور اس دور میں بھی بعض علماء نے ایسے فتاویٰ دیے۔ ان فتاویٰ نے اس تحریک کو عوامی بنا دیا تھا۔ مسلم عوام اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر اس تحریک میں شریک ہوئے اور بڑی سرفروشی کے ساتھ خاک وطن کو آزاد کرانے میں اپنی جانوں کی قربانی دی۔ دیگر علماء میں مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولانا سرفراز کے فتاویٰ جہاد خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور ان کے خاص رفیق کار مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ ضامن شہید نے تو باضابطہ انگریزوں کا مقابلہ کیا اور شاملی کے میدان مین باضابطہ جہاد کیا۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے اپنے بیٹے برجیس قدر کو تخت نشین کر کے لکھنؤ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن انگریزی فوج سے شکست کھائی اور مجبوراً نیپال میں پناہ لینی پڑی۔

ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں شریک ہونے والوں کے سامنے ایک دوسرے عظیم ہندستان کا خواب تھا جو ہندستان کو روایتی بادشاہت سے نکال کر عوامی حکمرانی کے دور میں داخل کرتا اور ملک غلامی کے کلنک سے بھی بچا رہتا۔ بہادر شاہ ظفر نے مختلف ریاستوں کو جو خطوط لکھے تھے ان خطوط سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بادشاہت کے لئے نہیں بلکہ ہندستان کی آزادی کے لئے جنگ آزادی کر رہے تھے۔ ان کا ایک خط اس طرح ہے:

''میری دلی خواہش ہے کہ ہر قیمت پر ہندستان سے فرنگیوں کو نکال باہر کیا جائے اور میری دلی خواہش یہی ہے کہ پورا ہندستان آزاد ہو جائے، لیکن یہ انقلابی جنگ جو اس مقصد سے لڑی جا رہی ہے اس وقت تک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی اہل شخص پوری تحریک کی قیادت نہ کرے اور قوم کے مختلف فرقوں کو اتحاد کی تسبیح میں نہ پرودے۔ میری خواہش ہندستان پر حکمرانی کرنے کی نہیں اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی میری کوئی تمنا ہندستان پر حکمراں رہنے کی نہیں ہے۔ اگر آپ تمام دیسی راجہ دشمن کو نکال باہر کرنے کی غرض سے اپنی تلوار کو بے نیام کر لیں تو میں اپنے تمام شاہی اختیارات کو ان دیسی راجاؤں کو منتقل کرنے کے لئے تیار ہوں جنہیں حکمرانی کے لئے منتخب کیا جائے۔''

بہادر شاہ ظفر کا یہ خواب ادھورا رہا اور ان کے وژن کا ہندستان تعمیر نہ ہو سکا۔ متعدد دیسی ریاستوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا اور دراصل مقامی راجاؤں نے ہی انگریزوں کی مدد کی تھی۔ جس کے نتیجے انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی اور وہاں سے گرفتار ہو گئے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو قتل نہیں کیا لیکن بڑی تعداد میں شہزادوں کو گولی ماردی اور بہادر شاہ پر مقدمہ دائر کر کے ان کو رنگون کی جلاوطنی کی سزا دی۔

دہلی پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا، ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قتل کیے گئے، پھانسیاں دی گئیں اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ مولانا فضل حق خیر آباد، مفتی عنایت علی کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی، مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ اور

مولانا محمد جعفر تھانیسری کو کالے پانی کی سزا دی گئی، جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے نوابوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ امام بخش صہبائی، میر پنجہ کش جیسے نامور علماء اور فن کاروں کو قتل کر دیا گیا۔ بقول مرزا غالب دہلی کے چوک مقتل یعنی قتل کرنے کی جگہ بن گئے تھے اور گھر قید خانے بن گئے تھے۔ انتقام کی یہ آگ دہلی کے باہر، کانپور، میرٹھ، مظفر نگر، مرادآباد، لکھنؤ، گڑگاؤں، میوات اور ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی جس میں ہزاروں لوگوں کو قتل کیا گیا۔

انگریزوں نے انسانوں کے قتل اور سزا دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی املاک اور مذہبی مقامات کی بے حرمتی میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی، دہلی کی متعدد عمارتوں کو منہدم کر دیا گیا۔ دہلی کی شاہی جامع مسجد کو فوجی بارک بنا دیا۔ فتحپوری کی مسجد کو نیلام کر کے گودام بنا دیا۔ اکبرآبادی مسجد کو شہید کر کے اس کی جگہ پارک بنا دیا، زینت المساجد میں فوجی رہنے لگے، نواب حامد علی خاں کی مسجد میں جانور باندھے جانے لگے، انگریزوں کا یہ قہر دہلی کے باہر بھی مسلمانوں پر جاری رہا، پٹنہ میں علماء صادق پور کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ان کے محلات کو مسمار کر کے ان کو کھیت بنا دیا، مرادآباد اور بجنور کے متعدد شرفاء کے خانوادوں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں، بدایوں میں متعدد علماء کو پھانسی دی اور ان کی جائدادیں ضبط کر لیں۔

1857 کی ناکامی نے ہندستانی مسلمانوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، ان کی ہزار سالہ خدمات اور ملک کے لئے ان کی قربانیاں داؤں پر لگ گئیں، انگریزوں نے ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کے لئے مسلم عہد کے مظالم کی فرضی داستاں پھیلانی شروع کی اور ہندوؤں میں ایسے لوگوں کو فروغ دیا جو ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ ان مشکل حالات میں مسلمانوں کے لئے جنگ آزادی کو میدان جنگ میں باقی رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے انہوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور آزادی کی جنگ کے لئے دوسرے راستہ اختیار کئے۔

21.5 فرائضی تحریک

آزادی کی ایک نئی حکمت عملی کا آغاز بنگال میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ جہاں مولوی شریعت اللہ نے انگریزوں کے خلاف سماجی سطح پر محاذ کھول رکھا تھا، انہوں نے انگریزوں کا بائیکاٹ کیا۔ ان کی مصنوعات حتیٰ کہ ان کی عدالتوں کا بھی بائیکاٹ کیا اور فیصلوں کے لئے پنچایتوں کے نظام کو مضبوط کیا، تاکہ لوگوں کے باہمی مسائل کو گفت وشنید کے ذریعہ حل کیا جا سکے اور لوگوں کو فوری انصاف مل سکے، مولوی شریعت اللہ (1840-1781) بلا لحاظ مذہب ہندو مسلم سب کے لیڈر تھے۔ انہوں نے انگریزوں کو ٹیکس نہ دینے کی بھی تحریک چلائی۔ انہوں نے مقامی زمینداروں کو بھی منظم کیا۔ زمین کی اصلاحات کیں اور ناقابل کاشت زمینوں کو قابل کاشت بنایا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے دودو میاں تو تو میر نے اس تحریک کو جاری رکھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اس تحریک کو طاقت کے ذریعہ کچلنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی رہے۔

21.6 دارالعلوم دیوبند

تحریک آزادی کے لئے نئے میدان تلاش کرنے کی جدوجہد شاملی کے مجاہدین کو مدارس کے قیام کی طرف لے گئی، مولانا محمد قاسم

نانوتوی نے دیوبند میں ایک دینی تعلیم کا مرکز قائم کیا جس کو حکومت کی ہر طرح کی مداخلت سے پاک رکھا۔ یہ مدرسہ مسلمانوں کے چندے سے چلتا تھا اور اس میں قوم پرست ہندوؤں کے عطیات بھی قبول کئے جاتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم مسلمانوں کا تعلیمی نظام استعماری قوتوں کی دست و برد سے بچا رہے تا کہ تحریک آزادی کو زندہ رکھنے کے لئے لوگ موجود رہیں۔ دارالعلوم دیوبند نے سماجی سطح پر مسلمانوں کے اندر بیداری پیدا کی اور آزادی کی شمع کو بھی جلائے رکھا، مولانا قاسم نانوتوی کے شاگردوں نے مختلف تحریکات کی شکل میں آزادی کی چنگاری کو باقی رکھا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام پوری طرح جنگ آزادی سے جڑا ہوا تھا۔ اس کا اقرار شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اپنے خطبہ صدارت میں کیا جو انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت دیا تھا، ایک اور دانشور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی کو جائز طور پر ان اغراض و مقاصد کی روشنی میں واضح کیا جا سکتا ہے جو ایام جنگ میں دارالعلوم کے بانیوں کے ذہنوں میں تھے۔ دراصل شاملی اور دیوبند ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ البتہ فرق صرف ان کے اسلحہ جات میں ہے۔ اب تلوار اور بھالے کی جگہ قلم اور زبان نے لے لی تھی، شاملی میں مذہبی اور سیاسی آزادی کے تشدد کا سہارا لیا گیا تھا۔ لیکن دیوبند میں اس حصول کی خاطر پر امن ذرائع پر اصرار کیا گیا۔ شاملی میں مذہبی اور سیاسی آزادی کے حصول کی خاطر افراد کو استعمال کیا گیا تھا جبکہ دیوبند میں افراد تیار کرنے کے لئے مقصد کو فوقیت دی گئی۔''

مولانا کے ایک شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ریشمی رومال تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے اندر علماء کی ایک بڑی تعداد انگریزوں کی مخالفت کرے اور بیرونی طور پر افغانستان اور ترکی کی مدد سے انگریزوں کا اقتدار ختم کر دیا جائے۔ یہ تحریک جب اپنے شباب پر پہنچی تو کسی عملی اقدام سے پہلے ہی اس کا راز طشت از بام ہو گیا اور اس کے متعدد رہنما گرفتار کر لئے گئے اور ان کو جلاوطن کر کے مالٹا میں قید کر دیا اور ہندوستان میں اس تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔

دیوبند کے ہی ایک فرزند رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے الاحرار کے نام سے ایک جمعیت قائم کی اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ ہندوستان انگریزوں سے اقتدار سے آزاد کرایا جائے۔ اس تحریک نے پنجاب میں خاص طور پر آزادی کا بگل بجایا۔

دیوبند کے ہی ایک اور فرزند مولانا عبیداللہ سندھی افغانستان گئے اور وہاں ہندستان کی عبوری حکومت قائم کی گئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ اور وزیر اعظم برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی کو بنایا گیا، یہ آزاد ہندستان کی جدوجہد میں پہلی خود مختار حکومت تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بیرونی طاقتوں کی مدد سے ہندستان سے انگریزوں کا سامراج ختم کیا جائے، لیکن جنگ عظیم کے آغاز نے اس تحریک کو ختم کر دیا۔

1919 میں مولانا محمود حسن کو خرابی صحت کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔ مولانا ہندستان تشریف لائے 1921 میں تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔ اس موقعہ پر ایک قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کا سنگ بنیاد شیخ الہند نے رکھا اور ایک نہایت فکر انگیز خطبہ بھی پیش کیا جس میں اپنے اکابر کی خدمات کی طرف توجہ دلائی اور دارالعلوم کا مقصد اساسی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کو قرار دیا۔

21.7 کانگریس اور مسلمان

کانگریس میں شروع سے ہی مسلمان شریک رہے اور اول درجے کے رہنماؤں کے طور پر شریک رہے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں بھی متعدد بڑے مسلمان شریک تھے۔ ان میں مسلم تاجر، صافی اور وکیل شریک تھے۔ اس موقعہ پر دادا بھائی نوروجی کانگریس کے صدر جلسہ تھے۔ ان کی صدارت کی تائید نواب رضا علی خاں نے کی اور اپنی تائیدی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور ان کوششوں کی مذمت کی جو اس اتحاد کو ختم کرنے کی بات کر رہے تھے۔

کانگریس کے ایک رہنما بدرالدین طیب جی نے تو کانگریس کی حمایت کو اپنا زندگی کا مقصد بنالیا اور وہ جگہ جگہ جا کر لوگوں کو کانگریس کی حمایت پر آمادہ کرتے تھے۔ 1896 میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت رحمت اللہ سیانی نے کی۔ اس سے پہلے 1888 میں پنجاب کے علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے کانگریس کی مدد مذہبی فریضہ ہے، دیگر مختلف علاقوں کے علماء نے بھی اس کی تائید میں فتویٰ دیے اور ان تمام فتاویٰ کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کا نام ''نصرة الابرار'' تھا۔ 1905 میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کیا۔ اس سے زیادہ فائدہ خود مسلمانوں کا تھا لیکن انہوں نے قومی مفاد کو سامنے رکھ کر اس کی شدید مخالفت کی، بیرسٹر عبدالرسول، لیاقت حسین، عبدالحلیم غزنوی یوسف اور چودھری محمد اسماعیل اس مخالفت میں سرفہرست تھے۔

بعد میں کانگریس کے بڑے رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین متحدہ ہندستان کی آزادی کو قرار دیا۔ وہ متعدد مرتبہ کانگریس کے صدر بھی رہے، ان کے علاوہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا حسین احمد مدنی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید ملیح آبادی اور متعدد قومی اور علاقائی قائدین نے ملک کی آزادی کے لئے کانگریس کے پہلو بہ پہلو قربانیاں دیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے اول دن سے کانگریس کی حمایت کی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنی جمعیت کے ساتھ کانگریس کی حمایت کی، حکیم اجمل خاں اپنے عہد کی عظیم شخصیت تھے، دہلی میں ان کا زبردست اثر تھا۔ ستیہ گرہ کا آغاز ہوا تو اس کی صدارت کے لئے حکیم اجمل خاں کا نام ہی سامنے آیا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

21.8 جمعیۃ علماء ہند

مولانا حسین احمد مدنی اور اس وقت سے دیگر رہنماؤں نے جنگ آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو متحد کر کے جنگ آزادی میں شریک کیا جائے۔ اس کے لئے جمعیۃ نے کانگریس کی حمایت کی۔ جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار کیا۔ اس جمعیۃ کے اسٹیج سے متعدد بڑے قومی رہنما پیدا ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد ابراہیم الوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی اور دیگر علماء اس سے وابستہ رہے، اس کے ترجمان ''الجمعیۃ'' نے بھی ملک کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

21.9 تحریک خلافت

1920 میں ہی ترکی شکست کے بعد انگریزوں نے اسلامی خلافت کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ مسلمانوں کا ایک جذباتی مسئلہ تھا اس لئے ہندستان کے مسلمانوں نے بھی خلافت کی بقاء کے لئے آواز اٹھائی۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد اس سطح پر تھا کہ ہندوستان کے ہندو و مسلمان دونوں نے خلافت اسلامی کے بقاء کے جدوجہد کی اور مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں تحریک خلافت شروع ہوئی۔ یہ تحریک بھی دراصل انگریزوں کے خلاف تھی، اس تحریک میں مہاتما گاندھی نے بھی اور متعدد ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری ڈاکٹر سیف الدین کچلو جیسے رہنماؤں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ تحریک خلافت کے دوران جس ہندو مسلم اتحاد کا مظاہرہ ہوا اس نے انگریز حکومت کے اوسان خطا کر دیے اور وہ مزید شدت کے ساتھ اس کوشش میں لگ گئے کہ ہندو مسلم اتحاد ختم ہو جائے چونکہ ہندستان میں انگریز حکومت کے قیام کا انحصار اسی پر تھا۔

21.10 1920 کے بعد

دسمبر 1921 میں مولانا حسرت موہانی نے ہندستان کی مکمل آزادی کو کانگریس کا نصب العین قرار دیا۔ اگر چہ اس وقت مہاتما گاندھی کی مداخلت سے یہ قرارداد منظور نہ ہوسکی۔ لیکن اس نے کانگریس کے اندر اس تحریک کے حامی پیدا کر دیے اور آخر 1927 میں ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں کانگریس نے اس قرارداد کو منظور کر لیا اور اس کے بعد کانگریس میں ملک کی مکمل آزادی کے لئے جدوجہد کرنے لگی۔

1930 میں 26 جنوری کو علامتی طور پر یوم آزادی منایا اور اس کے بعد ہر سال 26 جنوری کو اسی طرح علامتی طور پر یوم آزادی منایا جاتا رہا۔ بے شمار مسلمانوں نے اس میں اپنی جانوں کی قربانیاں دیں۔ سائمن کمیشن اور رولٹ ایکٹ آیا تو مسلمانوں نے ان کی مخالفت میں ہندو بھائیوں کے شانہ بشانہ قربانیاں دیں اور جب آزاد ہند فوج قائم ہوئی تو اس میں بھی بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے۔ اس فوج کے بڑے جرنلوں میں ایک جرنل شاہنواز بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد شروع سے ہی ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ الہلال کے ذریعہ انہوں نے قوم کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑ دیا اور بعد میں کانگریس میں شمولیت اختیار کر کے قومی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ متعدد مرتبہ کانگریس کے صدر بھی رہے۔ کئی بار جیل گئے، انہوں نے اپنے قلم کی طاقت کو اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو ملک کی آزادی کے لئے وقت کر دیا۔ مولانا وہ واحد عظیم شخصیت تھے جن کے پاس متحدہ ہندستان کا عظیم وژن تھا اور ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ وہ ملک کی تقسیم کو ہندستان ہی نہیں دنیائے انسانیت کے لئے ایک عظیم خسارہ سمجھتے تھے۔ مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کی قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جاؤ تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا اور اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

مسلم رہنماؤں نے اس مثبت فکر، ہندو مسلم اتحاد اور مادر وطن کی محبت میں جنگ آزادی کے اندر حصہ لیا تھا۔نواب سراج الدولہ کے عہد سے لے کر ملک کی آزادی تک لاکھوں لوگوں نے بے انتہا قربانی دی، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، جلاوطنی کی سزا بھی اٹھائی اور ایک بڑی تعداد کو پھانسی دی گئی ان بے شمار قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ ملک آزاد ہوا، پورے جنگ آزادی میں مسلمان ہندوؤں کے شانہ بشانہ رہے بلکہ تحریک آزادی کے اصل قائد اور محرک مسلمان ہی تھے۔مسلمانوں نے تمام ہندو لیڈروں کے ساتھ بھی جنگ آزادی میں شرکت کی اور انفرادی طور پر مسلم رہنماؤں نے بھی تحریکات چلائی۔ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ سب سے پہلے مسلمانوں نے کیا۔مولانا محمد علی جوہر نے تو لندن میں یہ اعلان کیا کہ میں غلام ہندستان میں واپس نہیں جاؤں گا یا تو مجھے آزادی دو یا پھر دو گز زمین دو اور آخر اس مرد مجاہد کو غلام ہندستان میں واپس آنا نصیب نہیں ہوا، لندن ہی میں ان کی وفات ہوگئی وار قبلہ اول کے جوار میں مدفون کئے گئے۔

21.11 جنگ آزادی کے نامور مسلم رہنما

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر آخری مغل حکمراں تھے، ذاتی طور پر نہایت متقی اور پرہیز گار تھے، بہترین خطاط تھے، اچھے شاعر تھے، اپنے والد اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد بادشاہ بنے۔1857 کی جنگ آزادی ان کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کئے گئے۔انگریزوں نے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ اور اہانت آمیز سلوک کیا۔کئی وقت کے فاقے کے بعد ان کے سامنے ان کے بیٹوں کے سر دستر خواں سے ڈھک کر پیش کئے تھے۔ان کے اوپر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور ان کو رنگون جلاوطن کر دیا جہاں وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں فوت ہو گئے۔

بیگم حضرت محل

واجد علی شاہ کی اہلیہ تھیں، اصل وطن فیض آباد تھا، 1857 کی سعی انقلاب میں اپنے بیٹے برجیس قدر کو اودھ میں تخت نشین کرایا اور جنگ آزادی میں شریک ہو گئیں۔ایک سال تک لکھنؤ میں انگریزوں کا مقابلہ کیا اس کے بعد سات سال تک نیپال کو مرکز بنا کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔آخر کار ان کو شکست ہوئی اور 1879 میں نیپال میں ان کی وفات ہوگئی۔نہایت بہادر اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔

مولوی احمد اللہ شاہ

مولوی احمد اللہ شاہ بڑے عالم فاضل اور درویش صفت انسان تھے انہوں نے انگلستان اور دوسرے ممالک کا سفر بھی کیا تھا۔انہوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لئے جمعیۃ العلماء کے نام سے ایک جمعیۃ بنائی تھی اور 1857 سے قبل آگرہ، لکھنؤ اور فیض آباد میں لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ کرتے رہے۔آخر گرفتار ہو گئے اور ان کو موت کی سزا سنائی گئی۔اسی درمیان جنگ آزادی شروع ہوگئی۔مجاہدین نے جیل پر حملہ کر کے ان کو رہا کرا لیا اور ان کی قیادت میں جنگ جاری رکھی۔ایک سال تک انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے بعد 1858 میں شاہ جہاں پور میں انگریز فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

بی اماں

علی برادران کی والدہ، اصل نام آبادی بیگم تھا، اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ آزادی کا زبردست جذبہ تھا، خلافت تحریک میں جان و مال اور خاندان کے ساتھ شریک ہوئیں۔ مسز اینی بیسینٹ کی رہائی کے لئے چندہ جمع کیا۔ 1917 کے کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں زبردست تقریر کی۔ انہوں نے ملک کے طول وعرض میں متعدد مقامات پر تقریریں کیں لوگوں کو آزادی کا سبق سکھایا اور قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق سے رہنے کی تلقین کی۔ 1924 میں وفات پائی۔

مولانا عبیداللہ سندھی

سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کسی عالم کی تلقین سے اسلام قبول کیا، دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور اپنے استاد مولانا محمود حسن کے ساتھ تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔ تحریک ریشمی رومال کے اہم رکن تھے، ریشمی رومال لے کر کابل گئے تھے۔ ریشمی رومال کی تحریک کے ختم ہوجانے کے بعد افغانستان میں مقیم ہوگئے اور وہاں ہندستان کی پہلی جلاوطن کے قیام میں شریک رہے۔ کئی ملکوں کا دورہ کیا اور ہندستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کی، آزادی سے کچھ قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ آگئے اور تعلیم وتعلم سے وابستہ ہوگئے۔ 1974 میں وفات پائی۔

مولانا حسین احمد مدنی

دارالعلوم دیوبند سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عرب چلے گئے وہاں درس حدیث دیتے رہے۔ ریشمی رومال کی تحریک میں شریک تھے۔ اسی جرم میں گرفتار کر کے مالٹا بھیجے گئے۔ جب شیخ الہند وہاں سے رہا ہو کر آئے تو ان کے ساتھ ان کو بھی رہا کر دیا گیا۔ ہندستان آنے کے بعد کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور مسلمانوں کو منظم کرنے کے لئے جمعیۃ علماء ہند قائم کی۔ ملک کے بڑے رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لئے اور ہندستان کی سالمیت کے لئے بے انتہا قربانیاں دیں۔ ساتھ ہی ساتھ دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث بھی دیتے رہے۔ 1958 میں وفات ہوئی۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی

حسرت موہانی جنگ آزادی کے بہت نامور سپاہی ہیں۔ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ حکومت مخالفت سرگرمیوں کی پاداش میں متعدد مرتبہ جیل گئے۔ تاریخ ہند میں مولانا حسرت موہانی کا نام اس لئے بھی یاد رکھا جائے گا کہ سب سے پہلے انہوں نے کانگریس کے اجلاس میں یہ اعلان کیا تھا کہ کانگریس کا نصب العین انگریزوں سے مکمل آزادی حاصل کرنا ہوگا۔ اگرچہ اس وقت یہ قرارداد منظوری نہ ہوسکی لیکن بعد میں کانگریس نے اس کو قبول کیا۔

مولانا حسرت سودیسی کے زبردست حامی تھے اور اپنی بیگم نشاۃ النساء بیگم کے ساتھ مل کر انہوں نے عوام میں ملکی مصنوعات کے استعمال اور غیر ملکی مصنوعات کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی۔ تقسیم ہند کے زبردست مخالف تھے۔ آزادی کے بعد آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب

ہوئے 1951 میں انتقال ہوا۔

حکیم اجمل خاں

مسیح الملک حکیم اجمل کا تعلق دلی کے ایک قدیم طبی گھرانے سے، دہلی میں انہوں نے اپنا دواخانہ قائم کیا۔ اعلیٰ درجہ کے طبیب تھے، جنگ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ہندو مسلمان دونوں قوموں میں یکساں مقبول تھے۔ مسلم لیگ، کانگریس، ہندو مہا سبھا اور تحریک خلافت میں نمایاں حصہ لیا، تحریک عدم تعاون میں بھی شریک رہے۔ حکومت برطانیہ کے دیے ہوئے اعزازات واپس کردیے اور سودیسی تحریک میں شامل ہوگئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ اس ادارے کی بڑی خدمت کی، فرقہ وارانہ اتحاد کے پر جوش حامی تھے۔

مولانا محمد علی جوہر

تحریک خلافت کے بانی تھے۔ علی گڑھ اور لندن میں تعلیم حاصل کی، دوران تعلیم ہی آزادی کی جدوجہد سے وابستہ ہوگئے۔ کامریڈ کے نام سے انگریزی میں اور ہمدرد کے نام سے اردو میں اخبار نکالتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کئے گئے۔ رہا ہونے کے بعد خلافت کمیٹی قائم کی اور تحریک عدم تعاون میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی تھے۔ لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے، وہیں انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر مختار انصاری

ڈاکٹر مختار انصاری کا تعلق یوپی کے ایک شہر غازی پور سے تھا۔ برطانیہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ واپس آکر پریکٹس شروع کی، 1912 میں ترکی گئے۔ 1918 میں ہوم رول کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ تحریک عدم تعاون میں بھرپور حصہ لیا، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر بھی رہے۔ ملک کے سیاسی خدوخال کو متعین کرنے کا اہم کردار ہے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو

امرتسر کے رہنے والے تھے۔ برطانیہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ ستیہ گرہ تحریک میں حصہ لیا۔ جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد ان کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ دراصل جلیانوالہ باغ کا جلسہ سیف الدین کچلو کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر ہی ہوا تھا۔ بعد میں ان کو رہا کردیا گیا۔ انہوں نے اپنی وکالت چھوڑ کر مکمل طور پر تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔ کراچی کیس کے مشہور مقدمہ میں ان کو جیل کی سزا ہوئی۔ انہوں نے مجموعی طور پر 14 سال جیل میں گزارے۔ انہوں نے "آل انڈیا پیس کونسل" قائم کی تھی۔ اس کے علاوہ تمام تحریکات میں مکمل شریک رہے۔ جنگ آزادی کے ایک سپاہی کی طرح ملک کو آزاد کرانے کے لئے لڑتے رہے۔

محمد برکت اللہ

تحریک آزادی کے صف اول کے رہنما تھے۔ برطانیہ میں انہوں نے قوم پرستوں کو جمع کرکے آزادی کی تحریک چلائی واپس آنے کے بعد سودیسی تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ 1909 میں جاپان گئے۔ وہاں سے ایک اخبار نکالا۔ 1914 میں امریکہ گئے اور غدر پارٹی میں شامل

ہوگئے، پہلی جنگ عظیم شروع ہونے پر یوروپ چلے گئے۔ جرمنی اور ترکی میں ہندستان کی آزادی کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، پھر افغانستان گئے وہاں راجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ مل کر ملک کی پہلی جلاوطن حکومت قائم کی۔ وہاں سے پھر جرمنی گئے اور ہندستانی جنگی قیدیوں کو آزادی کا درس دیتے رہے۔ یہاں بھی انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ 1921 میں روس گئے اور لینن سے ملاقات کی پھر واپس جرمنی آ گئے۔ اسی جلاوطنی میں ان کی وفات ہوگئی۔

مفتی کفایت اللہ

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور اسی دوران تحریک آزادی سے وابستہ ہوگئے۔ دہلی آ کر انجمن ہدایت الاسلام کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن رہے، سول نافرمانی کی تحریک کے دوران نگراں مقرر کئے گئے، نمک ستیہ گرہ میں خود شریک ہوئے۔ مدرسہ امینیہ میں استاد تھے۔ انگریزوں نے اس مدرسہ کو تعاون دینے کی پیشکش کی۔ لیکن مولانا نے جواب دیا کہ ہمارا مقصد وطن کی آزادی ہے اور یہ ہمارا دینی فریضہ ہے۔ ہم انگریزوں کی مدد لینے کے مقابلے میں اس مدرسہ کو بند کرنا زیادہ پسند کریں گے۔

مفتی صاحب ملک کے آزاد ہونے تک سیاست میں سرگرم رہے۔ لیکن آزادی حاصل ہوجانے کے بعد سیاست چھوڑ دی اور یکسوئی سے درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ 1952 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اوپر مذکور چند ناموں کے علاوہ مسلم رہنماؤں کے علاوہ مسلم رہنماؤں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے وطن کو آزاد کرانے کے لئے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور اس راستہ میں بے شمار قربانیاں دیں۔

21.12 اردو صحافت

ملک کی آزادی کے سلسلے میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کیا ہے وہ بھی اس جنگ کا اہم پہلو ہے۔ اردو اخبارات اول دن سے ہی آزادی کی جنگ میں شمولیت اختیار کی غالباً اس لئے اردو احتجاج کی زبان بن گئی، اردو کے اول اخبار نویسوں میں مولانا محمد باقر کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے 1857 میں آزادی کا بگل بجایا تھا اور اس انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ان کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ ایک دوسرے اخبار ''پیام آزادی'' کو بھی باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں بند کردیا اور اس کے ایڈیٹر بیدار بخت کو سولی پر لٹکا دیا۔

جنگ آزادی میں صحافت کے کردار کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے صحافت پر قدغن عائد کرنی شروع کی اور رفتہ رفتہ پرانے بیشتر اخبار بند کردیے۔ 1857 کے بعد اردو صحافت ایک نئی کروٹ کے شروع ہوئی۔ اس میں اجمیر سے شائع ہونے والا اخبار ''تاریخ بغاوت ہند'' اور لکھنؤ سے شائع ہونے والا اخبار اودھ پنچ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اخبارات نے مثبت طور پر ہندستانی ذہن کو آزادی کی اہمیت سمجھائی۔ سرسید احمد خاں کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔

20 ویں صدی میں اردو صحافت دوبارہ باغیانہ تیور کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی، مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی اور ظفر علی

خاں نے زمیندار، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ، مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد اور ان کے علاوہ، الجمعیۃ، مدینہ بجنور، ریاست، وندے ماترم، صبح وطن، قومی آواز، پرتاپ، ملاپ اور اس طرح کے تقریباً 2 ہزار سات سو پچاس اردو اخبارات تھے جنہوں نے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہندستانی کی جنگ آزادی کی تاریخ ایک خونچکاں داستان ہے اور اس داستان کا سب سے معتبر ماخذ اور تاریخی ریکارڈ اردو اخبارات ہیں۔

21.13 خلاصہ

ہندستان کی تحریک آزادی میں مسلمان ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔ 1757 میں پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد بعض مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ اور 1763 میں مجنون شاہ مستانہ کی قیادت میں تحریک آزادی شروع کردی۔ تقریباً 20 سال تک مداری صوفیہ جنگ کرتے رہے۔ لیکن مجنون شاہ کی وفات کے بعد یہ تحریک کمزور پڑ گئی۔ اسی دوران ٹیپو سلطان سامنے آئے اور انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان قربانی کردی۔ اس کے بعد حاجی شریعت اللہ نے بنگال میں اور شمالی ہندستان میں سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی نے تحریک کو سنبھالا یہ دونوں بزرگ بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوگئے۔

1857 میں تحریک آزادی کی جنگ بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر اس کے قائد تھے اور عوام کے ہر طبقے نے اس میں شرکت کی، لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ اس کی ناکامی کے بعد ہندستانیوں نے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص جنگ آزادی کے لئے نئے میدان تلاش کئے۔ مسلم جدوجہد بھی جاری رہی اس کے ساتھ مدارس کا قیام، مختلف تحریکات کا قیام اور اخبارات و رسائل کے ذریعہ اس تحریک کو نئے میدان فراہم کئے۔ انگریزوں نے ہر جگہ ظلم و جبر اور طاقت سے ان تحریکات کو کچلنے کی کوشش کی، ان میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگ جیل گئے، پھانسیاں ہوئیں، کالے پانی کی سزائیں دی گئیں۔ کانگریس کے قیام کے بعد مسلمانوں نے اس میں بھی پورے جوش و خروش سے شرکت کی، تحریک ریشمی رومال چلائی۔ خلافت تحریک، جمعیۃ علماء ہند اور الاحرار جیسی متعدد تنظیمیں قائم کیں، سول نافرمانی، سودیسی تحریک، تحریک عدم تعاون اور نمک ستیہ گرہ میں بھی مسلمان برابر سے شریک رہے اور ایک طویل جدوجہد کے بعد آخر ملک انگریزی اقتدار سے آزاد ہوگیا۔

21.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجئے۔

1- جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کے کردار پر روشنی ڈالئے۔

2- جنگ آزادی میں اردو صحافت کی خدمات بیان کیجئے۔

درج ذیل کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1- جنگ آزادی میں دارالعلوم دیو بند کا کردار بیان کیجیے۔

2- کانگریس اور مسلمان کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔

3- آزادی کی تحریک میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات بیان کیجیے۔

21.15 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- آزادی ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنعم القمر

2- ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، ڈاکٹر محمد مظفرالدین فاروقی

3- تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند

اکائی 22 : تحریکات اورادارے

اکائی کے اجزاء

22.1 مقصد

222 تمہید

22.3 تحریک مجاہدین

22.4 تحریک دیوبند

22.5 تحریک علی گڑھ

22.6 ندوۃ العلماء

22.7 جامعہ ملیہ اسلامیہ

22.8 سنی بریلوی جماعت

22.9 جمعیۃ علماء ہند

22.10 تبلیغی جماعت

22.11 جماعت اسلامی

22.12 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث

22.13 امارت شرعیہ

22.14 دارالمصنفین

22,15 دائرۃ المعارف

22.16 خلاصہ

22.17 نمونے کے امتحانی سوالات

22.18 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

22.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ جدید ہندوستان میں ابھرنے والی مسلم تحریکات اور اداروں سے نہ صرف واقف ہوسکیں بلکہ ان کا بخوبی تعارف حاصل کرلیں۔ ساتھ ہی وہ ان کے قیام، پس منظر اور اغراض ومقاصد سے بھی آگہ ہوسکیں اور کسی قدر ان کی خدمات اور کارناموں سے بھی متعارف ہوجائیں۔ اسی طرح اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ ان تحریکات اور اداروں کے باہمی فرق وامتیاز کو جاننے اور سمجھنے کے بھی اہل ہوسکیں۔

22.2 تمہید

اس اکائی میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندہ تحریکوں، تنظیموں، اداروں اور جماعتوں کا ایسا تعارف پیش کیا جائے جو ان کے قیام اور پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے اغراض ومقاصد، نصب العین، طریقہ کار، کارگزاریوں اور خدمات پر مشتمل ہو۔ مختلف تحریکوں اور اداروں کا تعاف پیش کرتے ہوئے اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے سماجی و معاشرتی اثرات پر بھی روشنی پڑے اور ان کے تعارف میں معروضی طریقہ کار کو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

22.3 تحریک مجاہدین

22.3.1 پس منظر اور قیام

اس تحریک کے محرک اور بانی سید احمد شہید بریلوی تھے جنھوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول میں اس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ معاشرہ سے جاہلانہ رسم ورواج، قبر پرستی، تعویذ گنڈے، شرک جلی اور خفی غیر اللہ سے توکل اور امیدیں، شفاعت کا غلط تصور، تنظیم وآداب کے جاہلی رسوم، نسل پرستی، کھیتی باڑی اور کاروبار میں جاہلانہ رسوم، نجومیوں اور ساحروں کا زور اور اس طرح کی دیگر خرابیاں کہ جس میں مسلمان معاشرہ اور حکومتیں گھری ہوتی تھیں کو ختم کرکے انھیں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے قریب لایا جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کرنا مقصود تھا۔ علاوہ ازیں جہاد فی سبیل اللہ جیسے عظیم کام کا احیاء بھی مقصود تھا کہ جس کے ترک کرنے سے ملت ذلیل ورسوا ہورہی تھی اور مسلم حکومتیں اور ریاستیں، نواب اور امرا کی جاگیروں پر غیروں کا قبضہ ہورہا تھا چنانچہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے تحریک دعوت وجہاد برپا کرکے نہ صرف مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال کرنے کی کوشش کی بلکہ انھیں اسلام کے صحیح راستہ پر عمل کرنے پر بھی اکسایا اور باعمل مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ اٹھارہویں صدی کے ابتداء میں جس تحریک کو شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے شروع کیا تھا اور تحریر وتقریر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اسی میں عملی شرکت کی دعوت دی تھی یہ تحریک اسی کا عملی اور حرکی نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

اس تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ یہ برصغیر کی پہلی اسلامی تحریک ہے جو دعوت وجہاد کے شکل میں منظر عام پر آئی اور ملت کی زبوں حالی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ نے تحریر وتقریر کے ساتھ احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے بقا وقیام کی کوشش کی تھی تو

سید صاحب اوران کے رفقاء نے بذات خود عملی کوشش کر کے اس عظیم فریضہ کو انجام دیا جس میں ملت کی بقا کا راز پوشیدہ تھا۔

22.3.2 تحریک مجاہدین کے اغراض ومقاصد

اس تحریک کے اغراض و مقاصد میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ مسلم معاشرہ سے بدعات وغیر اسلامی رسومات کو ختم کیا جائے۔ انگریزی حکومت کے قیام کو روکا جائے۔ مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی جائے۔ توحید خالص کی طرف انھیں راغب کیا جائے۔ ملت کی بقا اور مسلم حکومتوں کے تحفظ کے لئے اقدامات کئے جائیں اور تحریک دعوت و جہاد کی طرف حکمرانوں، امراء، نوابوں اور جاگیرداروں کو متوجہ کر کے انھیں اس میں شامل ہونے کی تحریک پیدا کی جائے اور تحریک دعوت واصلاح کے لئے مسلمان علماء اور صوفیاء کو متوجہ کیا جائے نیز خالص اسلامی معاشرہ کے قیام اور اسلامی حکومتوں کی بقاء کے لئے ہر طرح کے عملی اقدامات کئے جائیں وغیرہ۔ چنانچہ انھیں اغراض و مقاصد کے تحت سید صاحب اوران کے رفقاء نے اکناف ملک میں دعوتی و جہادی دورہ کیا، وعظ وارشاد کی محفلیں قائم کیں، حلقے اور زاویے بنائے۔ شہر شہر، قریہ قریہ اور قصبوں کا اصلاحی دورہ کیا۔ حکمرانوں، امراء ونوابوں سے ملاقات کر کے انھیں تحریک دعوت و اصلاح اور جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انھیں اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے کاموں کے لیے ابھارا۔

22.3.3 تحریک مجاہدین کا عملی میدان اور معرکۂ بالاکوٹ

سید صاحب اوران کے رفقاء نے تحریک دعوت و اصلاح و جہاد کا آغاز شمالی اور وسط ہند میں کیا تھا اور یہاں کے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی نیز یہاں کے حکمرانوں، امراء ونوابوں کے ساتھ عام مسلمانوں کا دعوتی وجہادی مزاج بنایا تھا مگر دعوت جہاد کا عملی دائرہ کار صوبہ سرحد کو بنایا جہاں اس تحریک کے اثرات نمایاں نہیں تھے اور نہ ہی یہاں کے مسلمان اور قبائلی سردار اس کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ ابتدائی چند سال میں یہاں پر انہوں نے مثالی حکومت قائم کر کے علاقہ واطراف میں کامیاب فوجی کامیابی حاصل کی۔ پشاور پر قبضہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ باوجود اس کے کہ ان افراد اور جماعت کا مقصد بہت عظیم تھا لیکن معرکۂ بالاکوٹ میں سکھوں کے خلاف قبائلی سرداروں کی عدم موافقت اور عین حالت جنگ میں مسلمانان ہند کی حمایت سے دست بردار ہونے کی وجہ سے ان کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور جماعت کے دونوں بڑے ذمہ دار جو اس تحریک کے روح رواں تھے یعنی سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی شہادت عمل میں آئی۔ گوکہ ان کی شہادت کے بعد بھی یہ تحریک جاری وساری رہی مگر اس میں پہلے جیسا جوش وجذبہ قائم نہ رہ سکا۔

22.3.4 تحریک مجاہدین اور اس کی کارکردگی کا جائزہ

یہ تحریک برصغیر کی پہلی باقاعدہ اسلامی تحریک تھی جس کا آغاز آخر مغلیہ دور میں ہوا۔ اس وقت اپنے عہد کی عظیم حکومت مرض الموت میں مبتلا تھی۔ حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم کے مصداق اس کے اثر ورسوخ صوبہ جات پر ختم ہو گئے تھے اور مغل جنرل اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر الگ سے ریاستیں بنا کر مختار کل تھے۔ حکومت دہلی سے واجبی اور کاغذی لگاؤ کے علاوہ کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت چھوڑ کر حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکمرانی کے عمل میں آ چکی تھی اور ملک کے مشرقی حصوں پر اس نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ حکومت دہلی کے بھی جملہ امور بعض خفیہ معاہدوں کے تحت انھیں کے قبضے میں تھے۔ فوج، عدلیہ، میونسپلٹی اور تجارت کے تو وہ مختار کل تھے۔ مسلمانوں اور مسلم معاشرہ کی

صورت حال جیسا کہ اوپر کی سطروں میں لکھا جا چکا ہے بہت خراب تھی۔ایسی ہی فضا، حالات اور ماحول میں دہلی کے درویش صفت علماء نے احیاء وتجدید دین وجہاد کی تحریک کا آغاز کیا۔دہلی سے شروع ہونے والی یہ تحریک آہستہ آہستہ وسط اور شمالی ہند میں کافی مقبول ہوئی۔علماء، صوفیاء، دعاۃ ومبلغین اور عوام الناس نے اس کا ساتھ دیا اور سید صاحب اوران کے رفقاء کے نہ صرف ہم نوا ہوئے بلکہ ان کی تحریک دعوت وجہاد کے لئے جینے ومرنے کی قسمیں بھی کھانے لگے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔منجمد معاشرہ میں تحریک پیدا کرنا اور عوام الناس کو روایتوں سے ہٹا کر دین اسلام کی طرف لانا، امراء وحکمرانوں کو اس تحریک کا ہمنوا بنانا غیر معمولی کام تھا اس کے لئے تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کیں۔اپنوں اور غیروں کی غداریوں کا سامنا کیا۔قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں مگر مقصد سے غافل نہیں ہوئے۔آج کل مسلم معاشرہ میں تجدید احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جو مزاج دکھائی دیتا ہے، وہ اسی تحریک کی برکتوں کا نتیجہ ہے۔یہ تحریک معرکۂ بالاکوٹ میں آخری سانس لے کر ختم ہوگئی مگر اس کے مقاصد جلیلہ ختم نہیں ہوئے امت نے مجاہدین اور شہیدوں کے خون کو دیگر اسلامی تحریکوں کی شکل میں باقی اور جاری وساری رکھا۔1857 کے بعد جتنی بھی اسلامی تحریکیں وجود میں آئیں سبھی کی کڑی اس تحریک سے ملتی ہے۔

22.4 تحریک دارالعلوم دیوبند

22.4.1 تحریک دیوبند کا پس منظر

تحریک دیوبند کا قیام بھی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت ہوا۔1857 میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا چراغ انگریزوں کے ذریعہ گل ہوا تو مسلمانان ہند یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ عظمت رفتہ کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ جس کی بنا پر ہندوستان سے مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ دور حکومت یک لخت ختم ہوگئی۔اس سوال کا جواب دینے اور مسئلے کا حل نکالنے کے لئے مسلمانوں میں دو مختلف جماعتوں کا وجود ہوا۔ایک سرسید کی جماعت۔دوسری علماء ہند کی جماعت۔دونوں جماعتوں نے ملت اسلامیہ ہند کے مسائل کے مختلف حل تجویز کئے۔ لیکن دونوں جماعتوں کے افراد ایک بات میں اشتراک رکھتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے زوال کا سبب مسلمانوں کی تعلیم سے دوری ہے۔سرسید اوران کے رفقاء کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمان جدید اور سائنسی تعلیم سے محروم ہیں اور دنیا میں ہو رہی سائنسی ایجادات اور اس کے انقلابات سے واقف نہیں ہیں اس لئے وہ جدید اور سائنسی تعلیم سے آراستہ اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس پر عزم قوم کا سامنا نہیں کر سکے جس کی وجہ سے انھیں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔علماء ہند کی جماعت ملت کے مسائل کے حل کے لئے اس سے بالکل مختلف نظریہ رکھتی تھی۔اس جماعت کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمان دینی اور دنیاوی دونوں علوم سے بے بہرہ ہوگئے تھے اور شعائر اسلام اور دین حنیف سے وابستگی بہت کم کردی تھی۔رسوم ورواج، میلے ٹھیلے، دکھاوے اور لہو ولعب میں مشغول ہوکر اخلاقی اقدار کی نچلی سطح پر چلے گئے تھے جس کی بنا پر ان کے ہاتھوں سے زمام حکومت چھین لی گئی اور وہ ذلیل ورسوا ہوگئے۔دونوں جماعتوں نے اپنے نظریات اور لائحہ عمل کے مطابق ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی اور مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔علماء ہند کا خیال یہ تھا کہ جب تک مسلمان اسلام اور اسلامی شعائر سے وابستہ نہیں ہوں گے۔اسلام سے محبت اور عمل میں عزم وحوصلہ صحابہ کرام کی روش، غیر اسلامی شعائر اور رسوم ورواج سے دوری اور بلند اخلاق کا مظاہرہ نہیں کریں گے اس وقت تک ہندوستان میں ان کی عظمت رفتہ بحال نہیں ہوسکتی۔اسی فکر وخیال کے تحت علماء کی جماعت نے تحریک دیوبند کی داغ بیل ڈالی اور اس کے دوام کی کوششیں کیں۔مدارس ومکاتب اور جامعات قائم کئے۔ان کی نیک نیتی اور کوششوں میں اللہ نے اتنی

برکت دی کہ آج برصغیر اور عالم اسلام میں سیکڑوں ہزاروں مدرسوں کا جال پھیل گیا، جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کی بنیادیں مستحکم ہوسکیں۔

تحریک دیوبند کا قیام 15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 30 مئی 1866 میں بروز جمعرات سہارن پور کے قصبہ دیوبند کی مسجد چھتہ کے صحن میں انار کے چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ بغیر کسی رسمی تقریب یا نمائش کے عمل میں آیا۔ اس درسگاہ کا آغاز ایک استاد اور ایک شاگرد کے ذریعہ ہوا۔ مسجد سے شروع ہونے والی اس درسگاہ نے بعد میں ترقی کرتے ہوئے ایشیا کی بڑی درسگاہوں میں اپنا مقام بنالیا، جسے آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے علمی حلقوں میں ازہر ہند بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بانیان دارالعلوم دیوبند کے خلوص نیت ہی کا ثمرہ تھا کہ ایک استاد اور ایک شاگرد کے ذریعہ شروع ہونے والی درسگاہ برصغیر ہند میں تحریک قیام مدارس کی محرک بن گئی۔ اس کے فارغین اور ذمہ داران و ہمدردان نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ ایشیا و افریقہ نیز یوروپی ملکوں میں بھی مدارس اسلامیہ کے قیام کا محرک بنے اور دینی درسگاہوں کو قائم کیا۔ اسلام کی نشر و اشاعت، مسلمانوں کی دینی و دنیاوی رہنمائی، مسلم آثار و معابد کی حفاظت اور اسلامی اقدار اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور ملک و ملت کے دفاع میں اس کے فارغین نے جس طرح نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے فارغ علما و اکابرین نے ملک کی آزادی میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف پرجوش عوامی تحریک چلائی ملک و ملت کو غلامی سے نجات دلانے کو یہاں کے علماء نے مذہبی فریضہ قرار دیا۔ غرض بانیان دارالعلوم دیوبند نے اس کے قیام کے وقت جس خواب اور غرض و غایت کے تحت اس ادارے کو قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے فارغین نے ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ اس ضمن میں اسیر مالٹا مولانا محمود حسن کی سیرت و شخصیت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

تحریک دیوبند کسی ایک شخص کی انفرادی کوشش کا نام نہیں ہے بلکہ چند افراد کی اجتماعی کوششوں اور عزم و حوصلہ کا نام ہے تاہم کسی بھی جماعت، ادارہ اور قوم کو ایک ذمہ دار قائد کی ضرورت ہوتی ہے جس کی قیادت میں کل پرزے حرکت کرتے ہیں۔ تحریک دارالعلوم دیوبند کے بانیان نے بھی مولانا قاسم نانوتوی کی قیادت و رہنمائی میں اپنے خواب و خیال اور پلان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اس تحریک کے محرک مولانا قاسم نانوتوی ہی تھے۔ جیسا کہ لکھا ہے:

> ''ان دینی مدارس میں سب سے اہم اور مرکزی اہمیت کا حامل دینی مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ گو اس دارالعلوم کے قیام کا داعیہ کئی نیک نفس حضرات کے دلوں میں پیدا ہوا اور سب نے فرداً فرداً اس کا اظہار بھی کیا کہ اس ملک میں اب اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی واحد صورت ایک دینی مدرسہ کا قیام ہے لیکن ان سب حضرات میں پیش پیش مولانا محمد قاسم نانوتوی ہی تھے۔''

مولانا قاسم نانوتوی کے علاوہ جن لوگوں نے اس تحریک کے قیام و بقا میں سرگرم کردار ادا کیا ان کے نام یہ ہیں۔ سید عابد حسین دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمن عثمانی، مولانا یعقوب نانوتوی، مولانا رفیع الدین دیوبندی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہم۔

22.4.2 تحریک دیوبند کے اغراض و مقاصد

تحریک دارالعلوم دیوبند کے اغراض و مقاصد میں مسلمانوں اور ان کے بچوں کو قرآن مجید، تفسیر، حدیث و عقائد، کلام اور ان علوم سے متعلق ضروری اور معاون علوم و فنون کی تعلیم دینا شامل تھا، کہ ملت کو خیر القرون سے قریب تر کیا جاسکے۔ مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کی تربیت

کرنا اور مسلم بچوں اور طالب علموں میں اسلامی روح پھونکنا۔ ایسے افراد تیار کرنا جو بذریعہ تحریر وتقریر تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کے فرائض انجام دے سکیں۔ مسلمانوں کے اندر علم وفکر کی آزادی برقرار رکھتے ہوئے تعلیمی اداروں کو حکومت کے اثر سے محفوظ رکھنا۔ دین اسلام کی اشاعت کے لئے مدارس عربیہ کو قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق کرنا وغیرہ اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک عوامی تحریک کے طور پر عمل میں آیا۔ لہذا اس کے ذمہ داروں نے اسے حکومت اور جاگیرداروں کی اعانت سے دور رکھا اور عوامی چندے کے ذریعے اس ادارے کو چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی تحریک کے روح رواں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اصول ہشتگانہ (آٹھ بنیادی اصول) کے نام سے اس کا دستور العمل مرتب کیا جس پر عمل پیرا ہو کر دارالعلوم دیوبند نے بے مثال ترقی کی۔ مولانا نانوتوی کے مرتب کردہ اصول ہشتگانہ درج ذیل ہیں:

1۔ اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

2۔ ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

3۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔

4۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق مشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے لیے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانہ خواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

5۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازے و مشورے سے تجویز ہو تو پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

6۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا وارمداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

7۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

8۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا یہ جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

22.4.3 دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم

ابتداء میں دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق تھا مگر بعد میں اس کے ذمہ داروں نے حالات اور وقت کے تقاضے کے تحت نصاب میں حذف واضافہ کیا اور علوم کی درجہ بندی کردی۔ ابتداً علوم عالیہ کے تحت، قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ،

اصول فقہ،علم وعقائد،کلام،علم الاحسان (تصوف) اورعلم الفرائض کی تدریس ہوتی تھی،علوم آلیہ کے تحت صرف ونحومعانی و بیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ،عروض وقوافی، مناظرہ، ہیئت و ہندسہ،حساب،طب، تجوید وقرأت وغیرہ۔ان علوم کوعلوم عالیہ کے ممد ومعاون کی وجہ سے پڑھایا جاتا تھا۔ بعد میں جب علوم کی درجہ بندی کردی گئی تو ان علوم کو ابتدائی، متوسط، اعلیٰ اور تکمیل کے زمرے میں تقسیم کیا گیا اور درس نظامی کے دینی علوم کے ساتھ کچھ جدید علوم کوشامل کرکے تعلیم دی جانے لگی۔البتہ زیادہ زور دینی علوم کی تدریس پر رہا جو اس کا بنیادی مقصد تھا۔اس ادارے کے ذمہ داروں نے عوامی مسائل کے حل کے لیے ابتداء ہی سے افتاء کا شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ یہاں طلبہ کو اس کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔اسی طرح یہاں پر ایک زمانے تک طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی،صنعت وحرفت اور کتابت کے شعبے بھی قائم تھے۔اب ان کی جگہ کمپیوٹر کی تعلیم نے لے لی ہے۔

22.4.4 دارالعلوم دیوبند کے مختلف شعبہ جات

رفقاء دارالعلوم دیوبند نے ابتداء ہی سے مختلف کاموں کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کررکھا ہے تاکہ اس کے انتظام وانصرام اور دیکھ ریکھ میں آسانی ہو۔آزادیٔ ہند کے بعد ان شعبوں نے مزید ترقی کی۔وہ شعبے یہ ہیں:

1- شعبہ تعلیم
2- شعبہ دارالافتا
3- شعبۂ طب
4- شعبۂ تبلیغ
5- شعبۂ کتابت
6- شعبۂ صنعت وحرفت
7- شعبۂ نشریات
8- شعبۂ تنظیم وترقی
9- شعبہ اوقاف
10- کتب خانہ

شعبۂ کتابت کی جگہ اب کمپیوٹر نے لے لی ہے۔ان تمام شعبہ جات کے مختلف ذمہ دار منتخب کئے جاتے ہیں جو ادارہ کے ناظم اعلیٰ کو جوابدہ ہوتے ہیں۔

22.4.5 دارالعلوم دیوبند کا مقام ومرتبہ

برصغیر پاک وہند میں اسلامی مدارس کے قیام اور اس کے بقا وتحفظ کے لئے مسلمان ہمہ تن مشغول رہے ہیں۔حکومت کے علاوہ اپنی جیب خاص سے ادارے قائم کرنا۔جائیدادوں کو وقف کرنا علوم دینیہ کی تحصیل کے لئے آنے والے طلبہ کی خبرگیری کرنا مسلم معاشرہ کا جزءلاینفک تھا مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر پاک وہند میں مسلم حکمراں تھے۔وہ امراء، نواب اور جاگیردار ہوا کرتے تھے۔تجارت میں ان کی نمائندگی مسلم آبادی کے اعتبار سے زیادہ تھی۔پھر بھی کوئی ادارہ تحریک کی صورت میں تبدیل نہ ہوسکا۔قیام دارالعلوم کے وقت حالات یکسر مختلف ہونے کے باوجود یہ ادارہ برصغیر میں ایک تحریک بن کر ابھرا۔اس تحریک کے ثمرات اتنے بارآور ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے بے سروسامانی کے عالم میں سیکڑوں اور ہزاروں مدارس اسلامیہ قائم ہوگئے اور اس کے فارغین اور حسب توفیق مستفید ہونے والے طلبہ دنیا بھر کے گوشوں میں پھیل کر اس تحریک کو پروان چڑھانے میں معاون ومددگار رہے۔

اس تحریک کے پس منظر، قیام اور مقاصد کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک دینی تعلیمی تحریک نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے اندر مذہبی تعلیم کے فروغ، ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح اور ان کے اندر حریت و آزادی کی جلا اور نمو کی ایک تحریک تھی جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف میدانوں میں قابل رشک حد تک رہنمائی کی اور اب بھی اپنے مشن کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔

22.5 علی گڑھ تحریک

22.5.1 علی گڑھ تحریک کا قیام اور پس منظر:

یہ تحریک بھی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت شروع ہوئی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی حالات اور 1857 میں مسلم حکومت کا زوال اس کے قیام کا محرک بنے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اس کو قائم کیا تھا۔

1857 کی ناکام جنگ آزادی نے ہندوستان سے مسلمانوں کی سیاسی قیادت کو ختم کر دیا تھا۔ انگریز دہلی پر قابض ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے مآثر و معابد اور عظمت رفتہ کی دیگر یادگاریں حکومتی سرپرستی میں ختم کی جا رہی تھیں۔ جامع مسجد بند کر دی گئی تھی۔ علماء سے لے کر امراء و زعماء تک سبھی کے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پھانسیاں روزمرہ کا معمول تھیں۔ اسلامی تہذیب واقدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ دہلوی تہذیب کے پروردہ اور اس کی حفاظت کرنے والے لوگ عزت وآبرو کی حفاظت میں ملک سے ہجرت کر رہے تھے اور عالم یہ تھا کہ بقول غالب یہ جیتا جاگتا شہر نہیں بھائیں بھائیں کرتا ایک ویرانہ ہو گیا تھا۔ مسلمان محکوم و معتوب ہو چکے تھے اور ان کے ہاتھ سے ہر طرح کی ذمہ داری چھن لی گئی تھی۔ اس عہد میں مسلمان ہونا اور باغی ہونا مترادف سمجھا جانے لگا تھا۔ اس طرح کے ماحول میں دہلی ہی کے کچھ ارباب حل وعقد ملت اسلامیہ کی رہنمائی اور قیادت کے لئے اٹھے اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور وخوض کر کے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان جدید اور سائنسی علوم سے نہ صرف بے بہرہ ہیں بلکہ سائنسی انقلابات اور اس کی برکتوں سے ناواقف بھی ہیں چنانچہ ان لوگوں نے مسلمانوں کو سائنس اور جدید انقلابات سے فائدہ اٹھانے نیز روایتی تعلیم کے نصاب میں اصلاح کی کوشش کے لئے تحریک چلانے کی مہم شروع کی۔ اس تحریک کے روح رواں سرسید اور ان کے رفقاء تھے۔

سرسید احمد خاں نے اس تحریک کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے 24 مئی 1875ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کے نام سے ایک جدید تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی جسے دو سال بعد یعنی 1877ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم اے او کالج) کا نام دیا گیا، اس ادارے نے 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ اس طرح یہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا میں قائم ہونے والے جدید تعلیم کا پہلا ادارہ تھا۔ کیمبرج کی طرز پر اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ بچوں کی تعلیم تربیت کے لئے انگریز اتالیق مقرر کئے گئے۔ غرض تعلیم سے لے کر تربیت تک سبھی معاملوں میں انگریزی معاشرت کو اختیار کیا گیا۔ انگریزی وضع قطع کی پذیرائی کی گئی۔ انگریزی زبان کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کے بچے بدلتے ماحول میں نئے ابھرتے اعلیٰ طبقے میں شامل ہو سکیں اور خود کو اجنبی محسوس نہ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ اسلامیات اور اسلامی تہذیب وروایات اور اقدار کو بھی باقی رکھنے کی کوشش کی گئی۔ نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ تفسیر واحادیث کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ عربی زبان وادب کی تعلیم کے لئے الگ سے استاد کا تقرر کیا

گیا تھا۔علامہ شبلی نعمانی تقریباً سولہ سال تک یہاں عربی زبان وادب کی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔انھیں اس بات پر فخر تھا کہ یہاں کے بچوں میں اسلامی شعوراور دین سے رغبت پیدا کرنے میں انھوں نے اہم کردارادا کیا۔سرسیداس بات کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ ان کے طلبہ وضع قطع میں تو انگریزی معاشرت کا حصہ ہوں لیکن عملی زندگی میں وہ دینی اور اسلامی اقدار کے حامل ہوں۔اسی لئے ان کے عہد میں بچوں کو نماز کی پابندی کرائی جاتی تھی۔ایک دفعہ نماز میں طلبہ کی کم تعداد دیکھ کر علامہ شبلی سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ طلبہ نماز کی طرف سے غافل ہورہے ہیں۔سرسید نے عصری تعلیم کے ساتھ دینی علوم کی تدریس پر اظہار خیال کرتے ہوئے پنجاب کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان عصری تعلیم کی تحصیل کے ساتھ دینی علوم میں بھی ماہر ہوں۔ان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہواور دوسرے میں سائنس وٹیکنالوجی کا علم۔غرض سرسیداور ان کے رفقاء نے جدید عصری تعلیم کے ساتھ دینی علوم کی تدریس سے بے اعتنائی نہیں برتی۔آج بھی جب کہ یہ ادارہ یونیورسٹی بن چکا ہے یہاں اسلامیات کی تعلیم لازمی مضمون کے طور پر دی جاتی ہے علاوہ ازیں شعبۂ دینیات کا الگ سے شعبہ بھی قائم ہے۔ سرسید احمد خاں نے جس ادارے کی بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا اس کے استحکام اور ترقی میں ان کے نامور رفقاء محسن الملک، وقارالملک اور مولانا الطاف حسین حالی نے نمایاں اور اہم خدمات انجام دیں۔

22.5.2 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے اغراض ومقاصد:

اس ادارہ کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد میں یہ تھا کہ مسلمانوں کو جدید عصری تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کے بدلتے سیاسی حالات میں مسلم سماج سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے اس لئے ان کے وقار اور عزت وآبرو اور گزری عظمت رفتہ کی بحالی وقت کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت حکومت وقت سے قربت اور جدید عصری تعلیم کی تحصیل کے بغیر ممکن نہیں۔اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سرسیداور ان کے رفقا حکومت سے ٹکراؤ کی پالیسی کے مخالف تھے۔وہ چاہتے تھے کہ مسلمان حکومت مخالف نہ ہوکر موافقت کی پالیسی پر گامزن ہوں اور جدید تعلیم اور تہذیب کی برکتوں سے فائدہ اٹھائیں انھوں نے ٹکراؤ کی پالیسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی بربادی، اسلامی اقدار واقتدار اور مسلمانوں کے مآثر ومعابد کی تباہی کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا۔اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان مزید تباہی وبربادی کا شکار ہوں، لہٰذا انھوں نے اپنے کالج اور اس کے انگریز اساتذہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو حکومت سے قریب لانے کی عملی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے۔

22.5.3 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جات اور اس کے امتیازات

سرسیداور ان کے رفقاء نے ایم اے او کالج کے نام سے جس ادارے کی بنیاد رکھی تھی، ابتداً اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا۔اس کے بعد 1885ء میں اسے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق کردیا گیا اور ترقی کرتے کرتے اس ادارے نے 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا۔اس میں میں آج کل اکیس فیکلٹیوں کے تحت دوسو پچاس سے زائد کورسز کی تعلیم ہوتی ہے۔علاوہ ازیں خالص مطالعات (centers) کی شعبے الگ ہیں۔اس کا یہ امتیاز بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں گریجویشن کی سطح پر مخلوط تعلیم نہیں دی جاتی۔لڑکیوں کی تعلیم کے لئے علاحدہ کالج کی عمارت اور کیمپس ہے جو عبداللہ گرلس کالج کے نام سے معروف ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ بھی امتیاز ہے کہ یہاں نرسری تا پی ایچ ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔یہ ادارہ ہندوستان کی پہلی رہائشی یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ابتدا ہی سے اس ادارے کے بانیان نے اپنے آپ کو اور ادارے کو مسلکی

اختلافات سے الگ رکھا۔ یہاں شعبۂ دینیات سنی کے ساتھ ساتھ شعبۂ دینیات شیعہ بھی قائم ہے۔ آج کل اس ادارے میں تقریباً ایک لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ بیرون ملک کے طلبہ بھی بڑی تعداد میں یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس ادارے میں ملک کے تمام شہری داخلہ لے سکتے ہیں۔ قیام کے اول روز سے ہی اس ادارے نے ملک کے تمام شہریوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے۔ اس کے پہلے گریجویٹ ایک غیر مسلم ایشوری پرشاد تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ امتیاز بھی اہمیت کا حامل ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے قدیم وجدید کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور یہ پہلی یونیورسٹی ہے جس نے دینی مدارس کے فارغین کے لئے بھی اپنے دروازے کھولے اور کچھ پابندیوں کے ساتھ مختلف کورسیز میں داخلے دیے۔ یہ ہندوستان میں مسلم اقلیتی کردار کی حامل یونیورسٹی ہے جہاں مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

22.6 ندوۃ العلماء

22.6.1 پس منظر اور قیام

انیسویں صدی کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فکری اور سیاسی تبدیلی کی صدی شمار کیا جاتا ہے۔ اسی صدی میں مسلمانوں کے اندر بہت سے قائدین پیدا ہوئے، جنھوں نے ملت کی نیا پار لگانے کے لئے مختلف کام کئے۔ نہ صرف انہوں نے اسکول و کالج، مدارس و جامعات اور تکنیکی اداروں کی بنا ڈالی بلکہ، اقتصادی، معاشی اصلاحات، سماجی تبدیلیوں اور اصلاح معاشرہ کے لیے غیر سرکاری ادارے قائم کیے اور تحریکوں کی بنیاد ڈالی۔ اسی عہد میں مسلم قائدین اور علماء نے ملت کی رہنمائی اور ان کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے فکری کاوشیں کیں تحریک ندوۃ العلماء کا قیام بھی اسی فکری کاوش کی ایک کڑی ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام کے بعد مسلمان زعماء و قائدین اس بات کو شدت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ دین و دنیا کی خلیج مزید وسعت اختیار کر رہی ہے اور دونوں اداروں کے فارغین ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور نامانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ان اداروں کے فارغین ایک دوسرے کے لئے رقیب کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔ لہٰذا اس خلیج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلم قائدین کا خیال تھا کہ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے الگ سے ایک نئے ادارے کی ضرورت ہے جس میں ایک ایسے نصاب تعلیم کو رواج دیا جائے جس سے دین و دنیا کی خلیج اگر ختم نہ ہو سکے تو بہت حد تک کم ہو جائے۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کا محرک اول علماء ہی بنے۔ مولانا محمد علی مونگیری اس تحریک کے بانی اور روح رواں تھے۔ انھیں کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے مسلم قائدین اور ارباب حل وعقد نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام و بنا میں تعاون کیا اس طرح اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔

ندوۃ العلماء کے قیام اور اس کی ضرورت واہمیت کو نئے انداز میں مولانا محمد علی مونگیری نے پیش کیا تھا اور یہی اس کے محرک اول تھے لہٰذا انھوں نے ہی 1892 میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علماء کی ایک ایسی انجمن یا تحریک کی تجویز پیش کی جو قدیم وجدید کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو کم کرنے اور عصری تقاضوں کے مطابق مدارس اسلامیہ کا نصاب تیار کرنے میں معاون ہو۔ ان کی اس تجویز کو ارباب حل وعقد نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور تعاون کی پیش کش کی۔ اپریل 1894 میں کانپور کے اسی مدرسے کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر مولانا مونگیری کے تخیل نے عملی شکل اختیار کی اور ندوۃ العلماء نام کی ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس تھا جس میں علماء دین اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ امراء و رؤسا اور ماہرین تعلیم نے بلاتفریق مسلک شرکت کی۔ اس انجمن کے لوگوں نے

مدارس کے نصاب میں اصلاح کی سفارش کی اور علماء کو جدید نصاب تعلیم کی اہمیت وافادیت سے علماء کو آگاہ کیا مگر علماء نصاب میں تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انجمن کے کارکنان نے محسوس کیا کہ جب تک علماء کے سامنے کوئی متبادل پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی لہٰذا مولانا مونگیری کی قیادت میں 12 محرم الحرام 1313ھ میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز پیش کی گئی جو سبھی کے دل کی آواز تھی لہٰذا یہ تجویز منظور ہوئی۔ اس کے بعد اس کا مسودہ تیار کر کے ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین تعلیم کو بھیجا گیا اور ان سے رائیں طلب کی گئیں۔ اس تجویز کو علماء کے ایک بڑے طبقے نے انقلابی قدم قرار دیا۔ اب بانیان ندوۃ العلماء کے سامنے سوال یہ تھا کہ اس ادارے کو کہاں قائم کیا جائے چنانچہ میرٹھ میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے چوتھے اجلاس شوال 1314ھ میں اس پر اظہار خیال کیا گیا جس میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں میں سے کسی ایک جگہ پر ادارے کو قائم کرنے کی بات کہی گئی مگر 26 ستمبر 1898ء میں محلہ گولہ گنج میں واقع خاتون منزل نامی عمارت میں آخری فیصلہ لکھنؤ کے حق میں ہوا اور ابتدائی درجات شروع کیے گئے۔ 4 اکتوبر کو بانیان ندوۃ العلماء نے عظیم الشان جلسہ کی شکل میں اس کی افتتاحی تقریب منعقد کی جس میں ممتاز اہل علم اور سربرآوردہ حضرات نے شرکت کی۔ اس طرح سے اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن یا تحریک ندوۃ العلماء کے سامنے جو عظیم تعلیمی منصوبہ تھا وہ ایک عمارت سے پورا ہوتا نہیں دکھائی دے رہا تھا چنانچہ الگ اور باقاعدہ بڑی عمارت کے لئے سرمایہ جمع کیا گیا اور اس کے ذمہ داروں نے حکومت سے گومتی ندی کے کنارے لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق زمین حاصل کی اور 1908 میں گورنر یوپی کے ہاتھوں افتتاحی رسم کے ذریعہ ایک نئے کیمپس کا آغاز کیا گیا۔ جب سے آج تک یہ ادارہ وہیں قائم ہے۔

22.6.2 ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد

اس ادارے اور تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے جدید علوم کو بھی نصاب کا حصہ بنایا ہے۔ تاریخ ندوۃ العلماء کے مصنف نے اس کے چار بنیادی مقاصد بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

1- علوم دینیہ کے نصاب میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

2- ایسے علماء پیدا کرنا جو رفع نزاع اور اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دیں۔

3- علماء کو کتاب وسنت کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے واقف کرانا اور انھیں نبض شناس بنانا۔

4- اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

اس ادارے کی خاص بات یہ رہی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو مسلکی اختلافات سے الگ رکھا ہے۔ یہاں تمام مکتب فکر کے حامل طلبہ کو داخلہ کی اجازت ہے۔ ساتھ ہی یہاں پر اس طرح کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ہر مکتب فکر اور مسلک سے تعلق رکھنے والے طلبہ اپنی استعداد کے مطابق دینی وعصری علوم حاصل کرسکیں۔ اس ادارہ کے منتظمین نے اصلاح نصاب کی طرف خصوصی توجہ دی ہے جو اس ادارے کے قیام کا ایک بنیادی مقصد تھا۔ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو بھی شامل نصاب کیا ہے۔ عربی ادب پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس موضوع پر بعض اہم کتابیں نیز انگریزی، سیاسیات، معاشیات اور تاریخ وجغرافیہ حسب ضرورت یہاں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے بنیادی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے قدیم وجدید کا ایک ایسا نصاب تیار کرنے کی کوشش کی جس سے ایسے علماء تیار کیے جاسکیں جو دینی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ جدید ضروریات سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس کی وضاحت ان لفظوں

میں کی ہے:

1۔ علماء کے اندر ایثار نفس پیدا کرنا۔

2۔ انگریزی داں علماء پیدا کرنا۔

3۔ مذاق حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم پیدا کرنا۔

4۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کر سکیں۔

22.6.3 دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم:

ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کو جدید درجہ بندی کر کے اسے تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1- درجہ ادنیٰ یا ابتدائی۔ اس کی تعلیمی مدت تین سال کی ہوتی ہے۔ 2- درجہ متوسط۔ اس کی تعلیمی مدت پانچ سالوں پر محیط ہے۔ 3- درجہ اعلیٰ- اس کی مدت تعلیم دو سال کی ہے۔ کل مدت تعلیم دس سالوں پر مشتمل ہے۔ انھیں دس سالوں میں قرآن، حدیث، فقہ، عقائد اور کلام کے ساتھ ساتھ انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات و معاشیات کی بھی تعلیم دے دی جاتی ہے تاکہ اس کے فارغین معاشرے میں اجنبیت محسوس نہ کریں۔ اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے ذمہ داران بوقت ضرورت حالات کے تقاضے کے تحت اصلاح پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

22.6.4 دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مقام و مرتبہ:

ہندوستان کی دینی درسگاہوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مقام و مرتبہ کے تعین اور اس کے امتیازات کو بیان کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس ادارے میں دیگر جامعات کے مقابلے مختلف قسم کا نصاب تعلیم رائج ہے جو وقت اور حالات کے تقاضے کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ اپنے قیام کے اول روز سے اصلاح نصاب کے لئے کوشاں ہے۔ اس کے فارغینؔ نے برصغیر پاک و ہند میں اس مقصد کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ادارے کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ اس پر مسلک کا لیبل نہیں لگایا جا سکا۔ اس کے دروازے سبھی مکتب فکر کے حامل طالب علموں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کے تقرر میں مسلک سد راہ نہیں ہے۔

اس ادارے کے فارغین نے عصری جامعات کا رخ کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان کے اندر مقابلے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فارغین ندوۃ العلماء آج عصری جامعات میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر رہے ہیں جو بانیان دارالعلوم نے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر سید احتشام نے بہت ہی واضح انداز میں ندوہ کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ندوہ نے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلا۔ جدید علوم اسلامیہ کی نئی کتابوں کو درس میں شامل کیا اور ان فرسودہ کتابوں کو جو منطق اور فلسفۂ قدیم سے متعلق تھیں نصاب سے خارج کر دیا۔ انگریزی زبان معاشیات اور سیاسیات کے مضامین نصاب میں داخل کئے گئے اس طرح ندوہ نے روشن خیال علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا جس نے آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعمیری مقصد کا اسلامی لٹریچر فراہم کیا۔''

22.7 جامعہ ملیہ اسلامیہ

22.7.1 پس منظر اور قیام

یہ ادارہ بھی وقت اور حالات نیز انگریز حکومت مخالف تحریک کے نتیجہ میں قائم ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان میں تحریک آزادی شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی اور ملک کے عوام حکومتی ظلم و جور کے خلاف متحد ہو چکے تھے۔ موہن داس کرم چند گاندھی جی کی قیادت میں تحریک عدم تعاون شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کی بنیادی تعلیم یہ تھی کہ ملک کے عوام حکومت سے عدم تعاون کا برتاؤ کریں۔ سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کریں، ملازمت ترک کریں غرض ہر سطح پر حکومت مخالف رویہ اپنا کر یہ دباؤ بنائیں حکومت برطانیہ انھیں آزادی دے دے۔ علاوہ ازیں خلافت تحریک نے بھی عوامی تحریک چلا کر ملک کے عوام بالخصوص مسلم مزاج کو حکومت مخالف بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی تاکہ حکومت پر دباؤ بنا سکے کہ وہ خلافت ختم نہ کرے یا اس عمل کی معاون نہ ہو۔ اس ادارہ کے قیام کے محرک وہ طلبہ ہوئے جو خلافت کانفرنس اور تحریک عدم تعاون سے اتفاق رکھتے تھے۔ اس ادارے کے قیام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو اس وقت تک کالج کا درجہ رکھتی تھی کی فضا کا بہت عمل دخل رہا تھا۔ یہاں کے طلبہ یونین ہال میں جلسہ کر کے تحریک آزادی، خلافت کانفرنس اور تحریک عدم تعاون سے اتفاق کر کے کالج کے ذمہ داروں پر یہ دباؤ بنانے لگے کہ اس ادارے کو بھی سرکاری سرپرستی سے آزاد کیا جائے۔ چنانچہ ان کی آواز اور تحریک کا اثر اور کالج کے ذمہ داران پر تو نہیں ہوا البتہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے اس کی حمایت کی اور ادارہ کو خیر باد کہہ دیا۔ ایسے ہی طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں چوٹی کے سرکردہ رہنماؤں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی تھی۔

اس ادارہ کا قیام 29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ میں کھلے آسمان کے نیچے قومی ادارہ کی شکل میں عمل میں آیا تھا، شیخ الہند و اسیر مالٹا مولانا محمود حسن صاحب نے شدید علالت کے باوجود بذات خود علی گڑھ تشریف لا کر اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ جب کہ ان کا لکھا ہوا افتتاحی خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا۔

یہ ادارہ پانچ سال تک علی گڑھ میں قائم رہا۔ خیموں میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ شہر کے عوام اور قائدین و رہنماؤں نے اس کے اخراجات اور طعام کی ذمہ داری اٹھائی اور قومی رہنماؤں نے اس کی سرپرستی فرمائی۔ قومی رہنماؤں کے قید و بند ہونے اور دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے اس کے انتظام اور دیکھ ریکھ میں دقتیں آنے لگی تھیں لہٰذا حکیم اجمل خاں حاذق الملک کے مشورے پر پانچ سال بعد 7 جولائی 1925 کو اس ادارے کو قرول باغ میں کرائے کی عمارتوں میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح سے یہ ادارہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا۔ چھ سال تک یہ ادارہ کرائے کی عمارتوں میں چلتا رہا۔ 1931 میں اس کی پہلی عمارت اوکھلا گاؤں میں تعمیر ہوئی اور 1936 میں یہ ادارہ اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہوا۔ یہ عمارتیں آج کل جامعہ اسکول کے ہاسٹل کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔

1962ء میں جامعہ ملیہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی طرف سے ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور بالآخر آزادی کے بعد 1988 میں ہندوستانی پارلیامنٹ نے ایک ایکٹ کے ذریعہ اس کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ اس ادارے کے قیام میں جن قومی رہنماؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمود حسن شیخ الہند، موہن داس کرم چند گاندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا

ابوالکلام آزاد وغیرہم۔ دہلی میں اس ادارہ کو زندگی نو دینے والوں میں ویسے تو بہت سے نام ہیں لیکن سرفہرست ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالمجید خواجہ، پروفیسر محمد مجیب، سید عابد حسین اوران کے رفقاء کا کردار اہم رہا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں کا نام بھی بانیان جامعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

22.7.2 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے اغراض ومقاصد

بانیان جامعہ نے اپنی پہلی مجلس تاسیسی کے وقت اس کے اغراض ومقاصد اوراس کی تعلیمی پالیسی بنائی تھی جس کی خاص باتیں یہ تھیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سبھی مذاہب ومسالک کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ ہر طالب علم کو اس کے اپنے مذہب کی تعلیم دی جائے گی۔ مسلمان طلبہ کو عربی اور ہندو طلبہ کو سنسکرت سکھائی جائے گی۔ ذریعہ تعلیم اردو ہوگا اور انگریزی کی تعلیم ثانوی زبان کی حیثیت سے دی جائے گی۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ دیگر صوبوں کے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کی کوشش بھی کی جائے گی وغیرہ۔ جامعہ آج بھی بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ اپنی ابتدائی پالیسی پر گامزن ہے۔ یہاں جدید اور عصری تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے لئے تین مخصوص مضامین ہیں۔ 1-انڈین ریلیجن اینڈ کلچر (IRC) 2-اسلامیات 3۔ ہندو ریلیجس اسٹڈیز (HRS) ان مضامین میں سے کوئی ایک مضمون طلبہ کو پڑھنا لازمی ہے۔ اس ادارہ کا دوسرا انقلابی قدم ذریعہ تعلیم کا اردو ہونا ہے۔ یہاں طلبہ کو اختیار ہے کہ وہ اپنا امتحان اردو، ہندی یا انگریزی میں سے کسی بھی زبان میں دے سکتے ہیں۔ صنعت وحرفت کی تعلیم کے لئے تو اب باقاعدہ شعبہ قائم ہو چکا ہے جہاں طلبہ اپنے ذوق کے مطابق صنعت وحرفت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ ادارہ ایک طرح تعلیمی جامعہ نہ ہوکر ماڈل ادارہ کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مکمل قومی تعلیمی ادارہ ہے۔

22.7.3 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ جات:

اس ادارہ میں کل آٹھ فیکلٹیاں ہیں جن میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً قانون، تعلیم، سائنس، سوشل سائنس، انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز آرکیٹیکچر اور ڈینٹسٹری۔ ان فیکلٹیز کے مختلف شعبوں میں گریجویشن سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بیس سے زائد تعداد میں مطالعات کے مراکز (سینٹرس) قائم ہیں۔ ان میں ماس کمیونی کیشن سینٹر، ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز، ارجن سنگھ سینٹر فار ڈسٹینس اینڈ اوپن لرننگ، سینٹر فار کمپریٹو ریلیجس اینڈ سویلائزیشنز اور سنٹر فار یوروپین اینڈ لیٹن امیریکن اسٹڈیز خاص شہرت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ کا خاص امتیاز یہ ہے کہ یہاں نرسری وابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ تحقیق تک کی تعلیم وتدریس کا انتظام ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ امتیاز بھی قابل ذکر ہے کہ یہ ادارہ اپنے قیام سے لے کر تا حال قومی دھارے میں شامل رہا اور اپنی جمہوری اور سیکولر روایات کو نہ صرف برقرار رکھنے میں بلکہ اس کی نشر واشاعت میں معاون بھی ہوا۔ بانیان جامعہ نے جس خواب وخیال کے تحت اس ادارہ کو قائم کیا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام طرح کی ابتلاء ومصیبت کو برداشت کرتے ہوئے اس کو عملی جامہ کا روپ دینے میں لگا ہوا ہے۔ یہ ادارہ قومی رہنماؤں کی تحریک آزادی کا بین ثبوت ہے۔

22.8 سنی بریلوی جماعت

22.8.1 قیام اور پس منظر

سنی بریلوی جماعت کا قیام بھی آزادی سے قبل عمل میں آیا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1921-1856) اس مکتب فکری کی تشکیل میں معاون و مددگار رہوئے اور آگے چل یہ جماعت ان کے نام اور شہر سے منسوب ہو کر بریلوی کہلائی۔ دیگر جماعتوں اور ان کے معاونین و ہمدردان کی طرح اس جماعت کے افکار کے حاملین کی تعداد برصغیر میں پہلے سے موجود تھی، انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اس کی فکری و عملی تشکیل کر کے اسے الگ جماعت اور تحریک کا روپ دے دیا۔

اس کے قیام کا پس منظر بھی ہندوستان کے بدلے ہوئے سیاسی حالات ہیں۔ دیگر جماعتوں اور تحریکوں کے ارباب حل وعقد کی طرح اس جماعت اور فکر و خیال کے حامل علماء نے بھی ملت کی زبوں حالی دور کرنے اور مسلم عوام کو دین سے قریب کرنے نیز انھیں سیاسی وحدت میں پرونے کے لئے الگ جماعت کے قیام کو ضروری سمجھا اور اس کی تشکیل کی عملی کوشش کی۔ اس تحریک پر خاص فکر و رنگ کے غلبے کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے اس کی مخالفت کی لیکن علماء ہند کی یہ جماعت انگریز موافق پالیسی کے ضمن میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کے فکر و خیال سے بہت قریب تھی۔ چنانچہ دیگر جماعتوں نے اس پر مسلم مخالفت اور انگریز نواز ہونے کا الزام لگایا۔ باوجود اس کے کہ یہ جماعت بھی فقہ میں امام اعظم کی پیروکار رہے۔

بریلوی علماء کی جانب سے گرچہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا تک تمام ہندوستان میں اسی مکتب فکر کے پیروکار تھے اور 1825ء کے بعد مختلف مکاتب فکر اور مسالک نے جنم لینا شروع کیا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ سنی بریلوی جماعت یا مکتب فکر کی تشکیل میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا رول سب سے اہم اور نمایاں ہے اور ایک مکتب فکر کے طور پر اسے متعارف کرانے والے وہی ہیں۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سنی بریلوی جماعت کی فکری و عملی تشکیل انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں عمل میں آئی۔

22.8.2 اغراض ومقاصد

اس جماعت کے اغراض و مقاصد میں وہی ہیں جو دیگر اسلامی جماعتوں کے ہیں یعنی مسلمانوں کو دین کی طرف راغب کرنا، غیر اسلامی رسوم ورواج سے انھیں روکنا۔ ملت کو ایک وحدت میں پرونا اور اسلام کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کرنا اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے کوشش کرنا وغیرہ۔ اس جماعت کے علماء بھی مسلمانوں کے زوال کے انھیں اسباب تک پہنچے جن کی نشان دہی دوسری جماعتوں نے کی تھی۔ چنانچہ اس کے حل کے لئے انھوں نے مختلف شناخت کے ساتھ عملی کوششیں شروع کیں۔ اس جماعت کے حاملین نے عشق رسول کو محور بنایا اور اس کی نشر واشاعت میں مصروف ہوئے۔ باوجود دیگر مسلم جماعتوں کی مخالفت کے اس کے حاملین نے اپنے اغراض ومقاصد کو پیش نظر رکھا اور اس سے انحراف نہیں کیا۔

پروفیسر مسعود احمد نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے بعض امتیازات تحریر کیے ہیں جو آگے چل کر سنی بریلوی جماعت کے امتیازات

قرار پائے۔ وہ لکھتے ہیں: محدث بریلوی اس بات کے قائل تھے کہ نبی آخرالزماں محمدؐ کے جو محامد و محاسن قرآن وحدیث میں بیان کئے گئے ہیں انہیں من وعن بیان کیا جائے۔ وہ مجالس عید میلادالنبی کو جائز و مستحسن سمجھتے تھے اور محافل میلادالنبی میں قیام کو مستحب گردانتے تھے اور ان کے نزدیک فاتحہ خوانی جائز تھی بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو۔ اس جماعت کے حاملین نے قیام کے اول روز سے تاحال اپنی اس خصوصیت کو بحال رکھا۔

22.8.3 سنی بریلوی جماعت کے عقائد

اس جماعت کے متبعین کا کہنا ہے کہ ان کے وہی عقائد ہیں جو صحابہ وتابعین کے تھے اور جس کو اللہ کے رسولؐ نے انھیں سکھلایا تھا۔ یٰسین اختر مصباحی نے لکھا ہے کہ عہد رسالت اور صحابہ وتابعین سے منقول ومعمول جو عقائد واعمال قدیم کتب تفسیر وحدیث وفقہ تصوف وسیرت و تاریخ میں موجود ہیں اہل سنت والجماعت (سنی بریلوی جماعت) کے وہی عقائد ہیں۔ علماء فرنگی محل لکھنو، خیرآباد، بدایوں و بریلی نے تحریر وتقریر کے ذریعہ ان ہی کی دعوت دی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تعلیمات ونظریات کے صحیح داعی وترجمان بھی یہی ہیں۔ یہ جماعت کسی جدید نظریے اور غیر اسلامی خیال کو ایک لحہ بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنی قدیم وراثت کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور اسے ہی اپنے اور دیگر مسلمانان عالم کا سرمایۂ سعادت وذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔

الغرض اس جماعت کے متبعین اپنے فکر وخیال کی نشرواشاعت میں ہمہ تن مشغول ہیں۔

22.8.4 سنی بریلوی جماعت کی کارکردگی

سنی بریلوی جماعت نے اپنے عقائد اور عملی کارکردگی کی نشرواشاعت نہ صرف اپنے حلقوں میں بلکہ مسلمانوں کے دیگر مکتب فکر کے حلقوں میں بھی کی اور انھیں اپنی جماعت اور عقائد کا حصہ بنانے کے لئے ان لوگوں نے مدارس ومکاتیب اور دینی جامعات کے ساتھ عصری علوم کے ادارے اور تحقیقی مراکز قائم کئے۔ مسجدوں کی تعمیرات میں حصہ لیا، جہاں سے وہ اپنے افکار کی اشاعت کا کام لیتے ہیں۔ کتب خانوں اور اشاعتی اداروں کو قائم کیا۔ مختلف زبانوں میں رسائل وجرائد کو شائع کیا اور کررہے ہیں۔ علاوہ ازیں دینی مدارس کے فارغ طلبہ کی تحصیل کے لئے عصری تقاضوں کے مطابق تربیتی اداروں کا قیام بھی اس جماعت کا خاصہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس جماعت کے فکر کے حاملین رفاہی وسماجی کاموں میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ ملت کی بقا وتحفظ کے لئے بھی اس جماعت کے افراد حتی المقدور کوشش میں لگے دکھائی دیتے ہیں۔ دیگر جماعتوں کی طرح اس جماعت میں بھی شدت پسند اور معتدل افراد کی معتدبہ تعداد پائی جاتی ہے۔ اس جماعت کے مدارس میں جامعہ ملیہ مصباح العلوم اشرفیہ مبارک پور قابل ذکر ہے۔ علماء بریلوی نے کبھی بھی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی ایسے لوگوں سے اشتراک عمل کیا۔

22.9 جمعیۃ العلماء

22.9.1 جمعیۃ العلماء کا قیام اور پس منظر

بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے واقعات اس جماعت کے قیام کا اہم سبب ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان متحدہ ہندوستان میں

نہ صرف تحریک آزادی ہند میں شامل ہوکر قربانیاں پیش کررہے تھے اور انگریزوں کے ظلم وجور کے خلاف کلمۂ حق بلند کررہے تھے بلکہ خلافت عثمانیہ کی بقا کے لئے خلافت مومنٹ کی شکل میں ایک تحریک بھی چلا رہے تھے اور برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ ترکی میں خلافت کو ختم نہ کیا جائے گا۔ خلافت کے خاتمہ کے لئے برطانوی حکومت نے جو پالیسی اپنائی تھی وہ بہت ہی دلخراش تھی۔ اسی نے عرب وحجاز اور افریقہ کے خطوں میں بغاوت کروائی تو یوروپ کے علاقوں میں اتحادی فوجوں نے خود قبضہ کرلیا اور پہلی جنگ عظیم میں ایک وقت ایسا آیا کہ خود ترکی مرکز خلافت بھی دشمنوں کے قبضے میں آ گیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے حالات بھی کوئی بہت بہتر نہیں تھے۔ انگریزوں کی چکی میں برادران وطن کے ساتھ مسلمان بھی مشق ستم بنے ہوئے تھے اور سونے پہ سہاگا کہ اس حکومت نے ہندو مسلم مسئلہ بھی پیدا کردیا تھا جس کے تحت فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوچکے تھے۔ ہندوستان سے لے کر ترکی تک اور کاشغر سے لے کر اسپین کے ساحلوں تک تمام عالم اسلام دشمنوں کے مکر کی زد میں آ گیا اور یہ حالت ہوگئی کہ مسلمانوں کی نہ تو جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ تھی اور نہ ہی اسلامی آثار واقدار۔ ایسے ہی ماحول اور حالات میں ہندوستان کے علماء نے صرف علماء کی الگ جماعت کے قیام کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس کو قائم کیا تاکہ برصغیر میں مسلمانوں کے جان ومال، آثار واقدار کی حفاظت کے ساتھ دین وشریعت کا احیا کیا جاسکے۔

اس جماعت کا قیام 1919ء میں دہلی میں ہوا۔ 22/نومبر 1919ء کو خلافت کانفرس دہلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والے 25 چوٹی کے علماء اس جماعت کے قیام کا محرک بنے۔ اس کے قائم کرنے کی تجویز مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پیش کی اور دیگر علماء نے اس تجویز کی حمایت کی۔ چنانچہ اس طرح علماء کی ایک جماعت قائم ہوئی جس کے عارضی صدر مفتی کفایت اللہ صاحب ناظم مولانا احمد سعید دہلوی صاحب ہوئے۔ ایک سال بعد نومبر 1920ء امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا باقاعدہ اجلاس ہوا جس کا انتظام مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب نے کیا تھا۔ اس اجلاس میں ذمہ داران کا باقاعدہ انتخاب ہوا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب صدر، مفتی کفایت اللہ صاحب نائب صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی صاحب ناظم منتخب کئے گئے۔ لیکن شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے جلد ہی انتقال کے بعد مفتی کفایت اللہ نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے ایک سال کام کیا اور پھر 21/ستمبر 1921 مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر وہ مستقل صدر منتخب کئے گئے اور اندازاً بیس سال تک عہدۂ صدارت کی ذمہ داری نبھائی۔ مفتی صاحب کے بعد مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید فخرالدین احمد اور مولانا سید اسعد مدنی، جمعیۃ العلماء کے صدر منتخب ہوئے۔

22.9.2 جمعیۃ العلماء کے اغراض ومقاصد

کسی بھی تنظیم اور جماعت کا ایک دستور ہوتا ہے جو اس تنظیم کے اغراض ومقاصد اور طریقۂ کار کا تعین کرتا ہے۔ اس جماعت کا بھی دستور ہے جس کی دفعہ 3 کے مطابق اس کے اغراض ومقاصد یہ ہیں:

1- اسلام اور شعائر اسلام اور مسلمانوں کے مآثر ومعابد کی حفاظت
2۔ مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور شہری حقوق کی تحصیل وحفاظت۔
3- مسلمانوں کی مذہبی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح
4- ایسے اداروں کا قیام جو مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی ترقی واستحکام کا ذریعہ ہوں۔

5- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انڈین یونین کے مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پیدا کرنا اوراس کو مضبوط کرنا۔

6- علوم عربیہ کا احیا اور زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق نظام تعلیم کا اجرا۔

7- تعلیمات اسلامی کی نشر واشاعت

8- اسلامی اوقاف کی تنظیم وحفاظت

انھیں اغراض ومقاصد کے تحت اس کے ذمہ داران نے لائحہ عمل متعین کیا اور مختلف شعبہ جات قائم کئے جو درج ذیل ہیں:

1- دینی تعلیم کا شعبہ

2- دنیاوی تعلیم کا شعبہ

3- دینی حلقے

4- سماجی خدمات

5- اقتصادی حلقے

6- دارالمطالعہ وغیرہ

یہ چند شعبے ہیں جن کے تحت اس جماعت کے افراد نے کام کرنا شروع کیا تھا لیکن حالات وتقاضے کے تحت مزید اس میں وسعت دی گئی ہے جس کی گنجائش بہرحال دستور میں موجود ہے۔

22.9.3 جمعیۃ العلماء کا نظام

کوئی بھی جماعت یا تنظیم ایک نظام ترکیبی کے تحت چلتی ہے جو اس کے نصب العین کو بروئے کار لانے میں معاون ومددگار ہوتی ہے۔ اس جماعت کا بھی ایک نظام ترکیبی ہے۔ وہ یہ ہے:

1- ہر مسلمان بالغ (مردوعورت) اس کا ممبر بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس جماعت کے مقاصد سے پوری طرح اتفاق رکھتا ہو۔

2- اس جماعت کی بھی ممبر فیس ہوگی (وقت اور حالات کے تحت اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)

3- اس جماعت کی ہر یونٹ کا ٹرم اس تاریخ سے شروع ہوگا جب انتخاب کے بعد نیا صدر چارج لے گا۔ یہ ٹرم دوسال کا ہوگا۔ ممبر سازی ہر ٹرم کے بعد شروع ہوا کرے گی جس کی مدت مجلس عاملہ طے کرے گی۔

اس نظام ترکیبی میں مختلف یونٹیں اہمیت کی حامل ہیں، وہ یہ ہیں:

1- مقامی جمعیۃ

2- شہری جمعیۃ

3- ضلعی جمعیۃ

4- علاقائی جمعیۃ

5- ریاستی جمعیۃ

تمام جماعتوں یا یونٹوں کا انتخاب دو سالہ ہوتا ہے، یہ مقامی جماعتیں ر یونٹیں حسب ذیل طریقہ سے کام کرنے کی مجاز ہیں۔

صدر، نائب صدر، خازن، ناظم عمومی، علاوہ ازیں مجلس عاملہ اپنی ضرورت کے مطابق نظماء کی تعداد میں اضافہ کرنے کی مجاز ہے۔ تمام ذمے دار انتخاب کے ذریعہ منتخب کئے جاتے ہیں۔ ذمہ داران کا انتخاب مجلس منتظمہ میں سے ہی کیا جاتا ہے۔ مقامی جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ عہدیداران کے علاوہ چھ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور اگر ابتدائی ممبران کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے تو مجلس عاملہ آٹھ ارکان پر مشتمل ہوگی۔

22.9.4 جمعیۃ العلماء کی کارکردگی

ایسے تو جمعیۃ العلماء ہند علماء دین کی ایک جماعت کا نام ہے جنھوں نے اپنا دائرہ کار تعلیم و تعلم، دین کی نشر و اشاعت، اسلامی اقدار اور معابد و مآثر کی حفاظت نیز خدمت خلق کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا ہے لیکن یہ جماعت اور اس کے ارکان اور ہمدردان نے اپنے قیام کے اول دن سے سیاسی امور اور ملک و ملت کے دیگر معاملات سے دست کشی نہیں کی اور آگے بڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ اس جماعت کے سیاسی اغراض و مقاصد نہیں تھے لیکن حالات کے تقاضے کے تحت سیاست میں قدم رکھا اور برادران وطن کے ساتھ نہ صرف ملک کی خدمت کی بلکہ ملت کے دفاع کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس جماعت کے ذمہ داروں نے ترک موالات تحریک کی حمایت کی، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ آزادئ ہند کے لئے کانگریس کا ساتھ دیا۔ تقسیم کی مخالفت، ملکی دستور کو سیکولر بنانے کی حمایت کی۔ اردو زبان کے مسئلہ کو زور و شور سے اٹھایا، فرقہ وارانہ فسادات اور ان کی روک تھام، فسادات متاثرین کی مدد اور ان کی باز آبادکاری کے لئے کام کیا۔ مسلم پرسنل لاء کا دفاع اور دینی تعلیم کے فروغ کے لئے ادارے قائم کئے۔ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے کوششیں کیں۔ تعلیم و تبلیغ کے لئے اداروں کو قائم کرنا۔ نظام امارت شرعیہ کی تشکیل کرنا وغیرہ ایسے کام ہیں جس کو اس جماعت نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ آج کل یہ جماعت دہشت گردی کے فرضی مقدمات کا سامنا کرنے والے مسلم نوجوانوں کو قانونی امداد مہیا کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں دہلی اور اس کے نواح میں بند پڑی مساجد کی تحویل کی بھی ایک عوامی تحریک چلا رہی ہے۔ جدید تعلیم کی طرف بھی اس جماعت نے خصوصی توجہ دی ہے اور کئی ایک ادارے قائم کئے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ملی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔ اس جماعت نے نہ صرف ہندی مسلمانوں کے مسائل پر توجہ دی بلکہ عالم اسلام کے مسائل کو بھی سرفہرست رکھا اور جو کچھ بن پڑا اس کے حل کرنے میں معاون ہوئی۔ یہ بھی ایک بڑا کام ہے کہ عالم اسلام کے مسائل کو اپنے آرگن کے ذریعہ ہندی مسلمانوں تک پہنچایا۔

22.9.5 جمعیۃ العلماء کی انفرادیت

- اس جماعت کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ صرف علماء کی جماعت ہے۔
- دیگر مسلک کے علماء کے لئے بھی اس کے دروازے کھلے ہیں۔
- خالص دینی اور ملی جماعت ہونے کے باوجود اس جماعت نے ملت کی بقا، اس کے آثار و معابد کی حفاظت اور دین کی نشر و اشاعت کے لئے قومی سیاسی جماعتوں سے بھی ربط و ضبط رکھا۔
- یہ ہندی مسلمانوں کی واحد جماعت ہے جس نے آزادئ ہند کے لئے قومی جماعتوں کے ہم قدم فرائض انجام دیے۔

- یہ واحد جماعت ہے جس نے تقسیم ہند کی کھلی مخالفت کی۔
- اس جماعت نے دوقومی نظریہ کی سخت مخالف تھی۔
- اس جماعت نے متحدہ قومیت کی حمایت کی۔

جمعیۃ العلماء ہند اپنے قیام کے اول دور سے آج تک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کے فکر و منہج میں مسلک کا پہلو غالب ہو چکا ہے۔ جہاں تک قومیت اور متحدہ قومیت کا مسئلہ ہے تو اس پر بہت کچھ لکھا اور بہت نقد و تجزیہ ہو چکا ہے، باوجود اس کے یہ جماعت آج بھی اپنے موقف پر قائم ہے۔ دیگر مسلم جماعتوں کی طرح علماء ہند کی یہ جماعت قومی خدمت سے منحرف نہیں ہوئی اس وقت یہ جماعت اس وقت دو حصوں میں منقسم ہے۔

22.10 تبلیغی جماعت

22.10.1 تبلیغی جماعت کا قیام و پس منظر

تبلیغی جماعت اپنے آغاز سے لے کر اب تک آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس جماعت کے مشن میں نہ ہی کمی آتی ہے اور نہ ہی اجتماعی ولولہ کم ہوا ہے۔ بانی جماعت نے جس خلوص نیت سے تبلیغ دین کا کام شروع کیا تھا اللہ نے اس میں بہت برکت دی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے بستی حضرت نظام الدین سے جو کام شروع کیا گیا تھا وہ آج تمام دنیا میں مشن کی حیثیت سے مسلمانوں نے اختیار کر لیا ہے، جس میں خود کفالتی مدد کے ساتھ لوگ شامل ہیں۔ آج اس جماعت کی مختلف انفرادی پہچان ہے۔ لوگ اس پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نصاب کے حصہ کے طور پر اس کو پڑھا رہے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے وقت کی سب سے بڑی جماعت صرف ایک امیر کے ماتحت کیسے رواں دواں ہے۔ جس کا نہ تو کوئی باقاعدہ دفتر ہے اور نہ کوئی ممبر اور ممبر بننے کی فیس۔ پھر بھی اس جماعت کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

تبلیغی جماعت کے قیام کا حتمی تعین مشکل ہے کب اور کس تاریخ کو اور کہاں اس کا قیام ہوا تاریخ میں اس کی وضاحت نہیں ملتی اور نہ ہی جماعت کے ہمدردوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ یہ جماعت ایک خاص وقت اور مخصوص علاقے کے حالات کے تحت شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ پوری دنیا میں پھیل گئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دہے میں بستی حضرت نظام الدین میں کسی وقت اس جماعت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب تھے جو شمالی ہند کے مشہور اور تاریخی مدرسہ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں انھوں نے بحیثیت مدرس کچھ دنوں تک معلّمی کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کو تبلیغی جماعت کے قیام کا خیال اس وقت آیا جب وہ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ، جو بستی حضرت نظام الدین میں تھا، کے ذمہ دار ہوئے۔ اس کے ابتدائی محرک وہ لوگ بنے جو میواتی قوم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ بقول مولانا وحید الدین خان صاحب:

> ''بستی نظام الدین عین میوات کے دہانے پر واقع تھی اور یہاں کے مدرسے میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے اس کے ساتھ مولانا محمد الیاس صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند ہو گئے تھے وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی افسوس ناک حالت دیکھی تو ان کے اندر

اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ فطری طور پر آپ کا ذہن ابتداًاس طرف گیا کہ ان کی اصلاح کا حقیقی ذریعہ دینی تعلیم کا حصول ہے (اس سبب سے) آپ نے خود میوات کے اپنے علاقے میں دینی مکاتب ومدارس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔''

دینی مکاتب ومدارس بھی قائم کئے گئے جانباز مگر جاہل اور سرکش میوقوم میں دینی تبدیلی کے آثار نہ دیکھ کر ایک عوامی دینی تحریک کی ابتدا کی جو میوقوم کے لئے غیر مانوس تھی مگر مولانا الیاس کی محنت، لگن اور خلوص نیت نے میواتیوں کی قسمت بدل دی اور ان کے اندر دین کا ایسا جذبہ بھر دیا کہ لوگ تبلیغ دین میں جانباز اور سرکش قوم کی تقلید کرنے لگے۔

جس زمانے میں مولانا الیاس صاحب نے تبلیغی مشن تحریک کی صورت میں شروع کیا تھا اس وقت علاقہ میوات اور قوم میو، جو کہ مسلمان تھے، کی صورتحال بہت ابتر تھی۔ ان کے اندر نہ تو دینی تعلیم اور شعور تھا نہ ہی دنیاوی علم کے حصول کا جذبہ۔ وہ صرف نام کے مسلمان تھے اور سارے کے سارے کام ہندوانہ کرتے تھے۔ ان کو نماز روزہ سے غایت تھی اور نہ ہی کلمہ یاد تھا۔ چوری، ڈکیتی، رہزنی ان کے یہاں عام تھی۔ مسجدیں خال خال نظر آتی تھیں مگر پوجا کی رسم باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ بقول میجر پاولٹ:

> ''میو اپنے عقائد میں آدھے ہندو ہیں ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجد ہوتی ہے۔ تحصیل تجارہ میں میوؤں کے باون گاؤں ہیں جن میں صرف آٹھ مسجدیں ہیں البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں بنی ہوتی ہیں جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانچ پھیرا۔ بھینسا چاہنڈ اور چاہنڈ یا کھیڑا دیو مہادیوی کے نام سے ہوتا ہے۔ جس میں قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ شب برات میں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا بھی ہر گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔''

تعجب خیز بات یہ ہے کہ دہلی تعلیم وتربیت کا مرکز ہونے کے باوجود بھی اس کا نواحی علاقہ اور خطہ تعلیم اور دین اسلام کی منور شعاعوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اس سے اس زمانے کے علماء وصلحاء کی تبلیغی کاوشوں اور ان کی بے حسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے علاقہ وخطہ کے درمیان مولانا الیاس صاحب نے اپنے تبلیغی مشن کو تن تنہا شروع کیا تھا جو آگے چل تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔

اپنے کام کی ابتدا میں مولانا محمد الیاس نے مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کے فروغ کے ذریعے ان کے اصلاح کی کوشش کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے دہلی میں واقع اپنے مدرسے کے علاوہ میوات کے علاقے میں بہت سے دینی مکتب قائم کیے، لیکن وہ جس طرح کی ہمہ گیر تبدیلی اور اصلاح کے خواہاں تھے وہ ان مکاتب سے پوری نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا انہوں نے عام لوگوں کو ان کے اپنے ماحول اور گھروں سے دور لے جا کر خالص دینی ماحول میں ان کی تعلیم وتربیت کا بیڑہ اٹھایا۔ قصبہ نوح اور اطراف کے علاقے میں جمعہ کو اجتماع کر کے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں گشت اور دین کی تعلیم کے لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچنے لگے۔ مولانا کی یہ تدبیر بہت کامیاب رہی اور بہت جلد تبلیغ کا کام میوات کے علاقے سے نکل کر باہر بھی پھیلنے لگا۔ دہلی میں واقع مولانا الیاس کا مدرسہ اس تحریک کا مرکز بن گیا اور آج صورت حال یہ ہے کہ مدرسہ کے بجائے بنگلہ والی مسجد تبلیغی مرکز کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا الیاس کے بعد ان کے بیٹے مولانا محمد یوسف صاحب تبلیغی جماعت کے امیر ہوئے۔ انہیں کے زمانے میں تبلیغی جماعت کو ملک گیر بلکہ عالم گیر حیثیت حاصل ہوئی۔ تبلیغی جماعت کے تیسرے امیر مولانا انعام الحسن کاندھلوی ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد کسی ایک فرد کو تبلیغی جماعت کا امیر بنانے کے بجائے اس

کے کام کو تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا اور اب یہی کمیٹی تمام تر تبلیغی سرگرمیوں کی نگرانی اور سرپرستی کرتی ہے۔

22.10.2 تبلیغی جماعت کے اغراض و مقاصد

تبلیغی جماعت کے اغراض و مقاصد میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اندر صحیح دینی شعور اور جذبہ پیدا کیا جائے اور انھیں مکمل اسلامی نظام حیات کے تحت زندگی گزارنے والا مسلمان بنایا جائے۔ اس جماعت نے جن خطوط پر کام کیا وہ یہ تھا کہ مسلمان خواہشات نفسانی سے اجتناب کریں۔ اپنے مزاج کو اسلام کے مطابق بنائیں۔ اپنے اندرون میں تبدیلی لائیں۔ ایک امت کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ رہیں، ذات اور شخصیت کے بجائے اعمال و اخلاق کو بنیاد بنائیں۔ زندگی کے پورے نظام میں تبدیلی لائیں۔ کلمہ اسلام کو دلوں میں بٹھائیں۔ نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کریں۔ دین کا عمل سیکھیں اور سکھلائیں وغیرہ۔

اپنے ان بیان کردہ مقاصد کے حصول کے لیے تبلیغی جماعت کے رہنماؤں نے چھ بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جن پر گامزن رہ کر دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی مل سکتی ہے۔

1۔ کلمہ کی تصحیح و تلقین یعنی سب سے پہلے کلمہ کے الفاظ درست کیے جائیں اور ایمان باللہ والرسول کی حقیقت بتائی جائے۔

2۔ نماز کی تصحیح و ترقی یعنی نماز کو اللہ کے رسول اور صحابہ کرام جیسی نماز بنانے کی کوشش کی جائے اور اس کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔

3۔ علم کی تحصیل اور ذکر یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور پھر خود کو اس عمل میں لگا دیا جائے۔

4۔ اکرام مسلم یعنی اللہ کے رسول کا امتی ہونے کے ناطے ہر مسلمان ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے۔

5۔ اخلاص نیت یعنی ہر عمل کے پیش نظر اللہ کی رضا جوئی ہے۔

6۔ وقت کی تفریغ یعنی مذکورہ چیزیں دوسرے مسلمانوں کی بھی درست کی جائیں۔ اس کے لیے اپنا وقت نکالا جائے۔

22.10.3 جماعت کی انفرادیت

تبلیغی جماعت اپنے آغاز سے لے کر تا حال اپنے مقصد سے غافل نہیں ہوئی اور نہ ہی اس جماعت نے دنیاوی دستور کے اعتبار سے کاغذی اور دفتری کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کیا۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کا کوئی دستور نہیں ہے۔ اس جماعت کے لوگ قرآن و شریعت کو دستور مانتے ہیں۔ جماعت میں شامل افراد وقت کے ساتھ خود خرچ کرتے ہیں، جماعت اس کام میں ان کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی باقاعدہ ہیڈ آفس نہیں ہے۔ وہی بنگلہ والی مسجد جو حضرت نظام الدین میں واقع ہے ہیڈ آفس کہلاتا ہے۔ تبلیغی مشن منظم طور پر دنیا بھر میں جاری ہے اور وہ دہلی آفس اور امیر جماعت کے احکامات کا پابند ہے۔ پوری جماعت ایک امیر کے ماتحت کام کرتی ہے، اہم بات یہ ہے کہ تبلیغی مشن صرف دین و شریعت اور عبادات تک محدود ہے۔ جماعت کے اکابر فقہ میں حنفی مسلک کی پیروی کرنے کے باوجود بھی مسلکی تشدد سے دور ہیں۔ اس کے دروازے تمام مسلمانوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یہی انفرادیت اس کو دیگر جماعتوں سے ممتاز کرتی ہے۔

22.10.4 تبلیغی جماعت کی کارکردگی

تبلیغی جماعت کے افراد نے دعوت دین کے لئے مختلف طریقوں کو اپنایا ہے۔ ان لوگوں نے مسجدوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ گشت اور اجتماعات کا اہتمام کیا۔ چلے کے لئے خود کو وقف کیا۔ خواتین میں تبلیغی کام کیا، طلبہ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اجتماعات منعقد کئے، بیرون ممالک خاص کر حجاز اور اس کے نواح میں تبلیغی وفود بھیجے۔ اس طرح سے اس جماعت میں شامل افراد نے دین کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا اور کر رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے کام اور مشن کا غائر جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر فرد اور جماعت میں کچھ خوبیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ یہی بات تبلیغی جماعت کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس جماعت کے افراد خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنی نیتوں میں خالص ہیں۔ یہ ان کی خالص اور بے لوث نیت کا ہی ثمرہ ہے کہ اس کی آواز پر ہزاروں افراد تن من دھن سے اس کے مشن سے جڑ جاتے ہیں۔ اگر مابعد آنے والی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس جماعت کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔ اس جماعت کی سب سے بڑی کامیابی یہ کہ اس میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ جن کی بولیاں، لباس سبھی مختلف ہیں اور بوڑھے جوان، علماء صلحا، فضلا سبھی شامل ہیں، اس کے مشن اور کام سے اتفاق رکھتے ہیں۔

22.11 جماعت اسلامی

22.11.1 جماعت اسلامی کا قیام اور پس منظر

جماعت اسلامی کا قیام 25 اگست 1941 کو لاہور میں ہوا۔ اس جماعت یا تحریک کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ جس عہد میں اس جماعت کا قیام عمل میں آیا وہ ہندوستان کا پرآشوب عہد تھا۔ انگریز یہاں کے حکمراں تھے۔ ہندوستانیوں نے آزادی کی تحریک شروع کر رکھی تھی جس میں ہندو مسلم سبھی شامل تھے۔ دوسری عالمی جنگ بھی اپنے عروج پر تھی جس میں یہاں کی عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستان بھی شامل تھا۔ مغل حکومت کا خاتمہ قصہ پارینہ بن چلا تھا مگر ریاستوں کی شکل میں اس کے باقیات ابھی باقی تھے جس میں نہ کوئی دم خم تھا اور نہ ہی حکومتی شعور۔ یہ ریاستیں انگریزوں کے رحم و کرم پر باقی تھیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کی پستی اور زبوں حالی کا عالم یہ تھا کہ ان میں نہ تو دینی شعور باقی تھا اور نہ ہی دنیاوی جاہ و عظمت کے حصول کا عزم۔ یہ قوم بس زندگی جیسی تیسی گزار رہی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے بعد بھی مختلف مسلم ریاستوں نے کوئی قابل ذکر ایسا ادارہ نہیں قائم کیا جس کے فارغین کسی میدان میں ناموری پیدا کر سکتے جب کہ انگریز اسکول و کالج اور جامعات کو قائم کرنے میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے صرف چند انفرادی کوششیں کی گئی تھیں جن کے بارآور ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ مذہبی تعلیم کا معاملہ بھی روایتوں میں لپٹا ہوا تھا اور ان اداروں کے علماء اور اساتذہ جدید تبدیلیوں سے اس قدر بے خبر اور وحشت زدہ تھے کہ وہ اس بات کا تجزیہ نہیں کر سکتے تھے کہ کون سی شے قومی مفاد کے لئے بہتر ہے اور کس میں خرابی ہے۔ اس کے اثرات آج بھی ان تعلیمی اداروں میں باقی ہیں۔ ایسی ہی فضا میں اس جماعت کو قائم کیا گیا تھا۔

1941ء میں جماعت اسلامی کے قیام اور اس سے پہلے حالات کا اگر ہم جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہندوستان ہی نہیں دنیا

کے بیش تر علاقے انگریزوں کی سیاسی غلامی اور حکومت میں تھے۔ علمی اور فکری میدانوں پر بھی انہیں کی بالادستی قائم تھی، مسلم دنیا کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ 1924ء میں خلافت کا ادارہ بھی ختم ہو گیا تھا، مسلمان نہ صرف انتشار اور پریشان حالی سے دوچار تھے بلکہ وہ بھی پورے طور پر انگریزوں کی سیاسی وفکری غلامی کا حصہ بن چکے تھے۔ ان حالات میں ملت اسلامیہ کو جن لوگوں نے زوال سے نکالنے اور اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کی ان میں ایک اہم نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریک کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام 1932ء میں اپنے رسالے ترجمان القرآن کے ذریعہ شروع کیا اور ترجمان القرآن میں شائع ہونے والی تحریریں ہی آگے چل کر جماعت اسلامی کے قیام کی بنیاد بنیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یکم شعبان 1360 مطابق 25 اگست 1941 کو لاہور میں مختلف حلقوں کے نمائندوں کو جمع کیا اور انھیں جماعت اسلامی کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے ایک سنجیدہ جماعت کی تشکیل پر زور دیا۔ اس اجلاس میں نمائندوں کی کل تعداد پچھتّر تھی۔ ان نمائندوں نے مولانا کے خیال سے اتفاق کیا اور جماعت اسلامی کی تشکیل کی اور انھیں کو امیر جماعت منتخب کیا اور ساتھ ہی ایک تحریری دستور بھی اتفاق رائے سے منظور کیا۔ اس طرح سے جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی۔ پہلے اجلاس میں جماعت کی تشکیل کے سلسلے انھوں نے جو خطاب کیا وہ یہ تھا:

> ''میرا کام آپ کو جماعت بنا دینے کے بعد پورا ہو جاتا ہے میں صرف ایک داعی تھا۔ بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایک نظام جماعت بن جائے۔ جماعت بن جانے کے بعد میں آپ میں کا ایک فرد ہوں اب یہ جماعت کا کام ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے اور پھر یہ اس کا کام ہے کہ آئندہ تحریک کو چلانے کے لئے اپنے صواب دید کے مطابق ایک پروگرام بنائے اور اسے عمل میں لائے۔''

امیر جماعت منتخب ہونے کے بعد انھوں نے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''میں آپ کے درمیان نہ تو سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا، نہ سب سے زیادہ متقی، نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔ بہر حال آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کار عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔''

پچھتّر افراد کی یہ نفری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں امت کی رہنمائی کے لئے بے سروسامانی کے عالم میں کمربستہ ہوئی اور اپنے مشن پر رواں دواں ہوگئی۔ اللہ نے ان کی نیت میں اتنی برکت دی کہ یہ جماعت برصغیر کی مسلم جماعتوں میں سے ایک بڑی جماعت شمار ہونے لگی جس کے اثرات نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں پر پڑے بلکہ پوری دنیا اس سے متاثر ہوئی۔

جماعت اسلامی جب قائم ہوئی تو اس کا دائرہ کار (یعنی جن لوگوں کے درمیان یہ کام کرے گی) پوری دنیا کو قرار دیا گیا۔ البتہ بہت جلد اس کے رہنماؤں کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ چیزیں موجودہ حالات میں کسی بھی تنظیم کے لیے قابل عمل نہیں ہیں۔ چنانچہ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی جماعت اسلامی بھی دو تنظیمی ڈھانچوں میں تقسیم ہوگئی۔ پاکستان کا حصہ جماعت اسلامی پاکستان کہلایا اور مولانا مودودی اس

کے امیر رہے۔ ہندوستان میں رہ جانے والی جماعت اسلامی کے ارکان اپریل 1948ء میں اتر پردیش کے شہر الہ آباد میں یکجا ہوئے۔ انہوں نے اپنے تنظیمی ڈھانچہ کا نام جماعت اسلامی ہند رکھا اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کو اپنا امیر منتخب کیا۔ کچھ دنوں تک الہ آباد میں، پھر ملیح آباد میں اور بعد ازاں رامپور میں جماعت کے مرکزی دفاتر رہے۔ فی الحال جماعت اسلامی ہند کے مرکزی دفاتر ملک کی راج دھانی نئی دہلی میں ہیں۔ اور مولانا سید جلال الدین عمری اس کے امیر ہیں۔ ان سے پہلے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے علاوہ مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا سراج الحسن صاحب اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری جماعت اسلامی ہند کے امیر رہ چکے ہیں۔

22.11.2 جماعت اسلامی نصب العین اور طریق کار

جماعت اسلامی ہند کے دستور کی دفعہ 3 کے مطابق اسکا 'بنیادی عقیدہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ یعنی الہ صرف اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد (رسول اللہ صلی علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں'۔

دستور جماعت اسلامی ہند کی دفعہ 4 کے مطابق:

'جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔ دستور جماعت اسلامی ہند کی دفعہ 5 کے مطابق اس کا طریق کار یہ ہے۔

اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جماعت اسلامی ہند کا طریق کار حسب ذیل ہوگا:

1۔ قرآن وسنت جماعت کی اساس کار ہوں گی۔ دوسری ساری چیزیں ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھی جائیں گی جس حد تک قرآن وسنت کی رو سے ان کی گنجائش ہو۔

2۔ جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔

3۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیر اور پرامن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ وتلقین اور اشاعت افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی۔ اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔

22.11.3 جماعت اسلامی کے شعبہ جات

مذکورہ بالا اپنے مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لیے جماعت اسلامی نے اپنا ایک طریقہ کار ترتیب دیا تا کہ نہ صرف مسلم نوجوانوں کی تربیت اسلامی خطوط پر کی جاسکے بلکہ ان کے اندر اسلامی فکر کو پروان بھی چڑھایا جاسکے۔ اس کے لیے انہوں نے مختلف شعبہ جات قائم کیے جو حسب ذیل ہیں:

1- شعبۂ علمی وتعلیمی:

اس شعبہ کے تحت اسلام کے نظام فکر اور نظام حیات کا فلسفیانہ علمی و تاریخی پہلو سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے نظام فکر و عمل پر تنقیدی و تحقیقی نگاہ ڈالی جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایسا اسلامی لٹریچر تیار کیا جاتا ہے جو اسلامی اصول پر ذہنی و فکری انقلاب برپا کرنے والا ہو۔ اس شعبہ کے تحت اسکول و کالج کا قیام بھی ہے۔

2- شعبۂ نشر و اشاعت:

اس شعبہ کے تحت علمی و تعلیمی لٹریچر کو پھیلانے کا کام کیا جاتا ہے اور یہ شعبہ امیر جماعت کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔

3- شعبۂ تنظیم جماعت:

اس کے تحت کارکنوں کی رہنمائی کرنا۔ مقامی جماعتوں کی نگرانی کرنا۔ ذیلی مقامی جماعت قائم کرنا اور ہم خیال جماعتوں اور افراد سے ربط پیدا کرنا شامل ہے۔

4- شعبۂ مالیات:

اس کے تحت مرکزی بیت المال کا قیام ہے نیز مقامی جماعتوں کے ذریعہ بھی بیت المال کے نظام کو قائم اور رواج دینا ہے۔

5- شعبۂ دعوت و تبلیغ:

اس شعبہ کے ذریعہ مختلف میدانوں میں دعوت و تبلیغ دین کرنا ہے یہ جماعت کا سب سے اہم شعبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس شعبہ کے دائرہ کار کے تحت آٹھ حلقوں کا تعین کیا گیا ہے۔

1- کالجوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا حلقہ

2- علما اور مدارس عربیہ کا حلقہ

3- صوفیا اور مشائخ طریقت کا حلقہ

4- سیاسی جماعتوں کا حلقہ

5- شہری عوام کا حلقہ

6- دیہاتی عوام کا حلقہ

7- عورتوں کا حلقہ

8- غیر مسلموں کا حلقہ

یہ شعبہ جات جماعت اسلامی کی بنیاد ہیں۔ انھیں شعبوں کے ذریعہ سے مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے فکری انقلاب کا خواب دیکھا تھا۔

22.11.4 جماعت اسلامی کی کارکردگی

اپنے قیام کے وقت سے ہی جماعت اسلامی مذہبی و سماجی خدمات کے کاموں سے جڑی رہی ہے۔ و آزادی کے وقت اور آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا، اسمیں جماعت اسلامی نے متاثرین کی امداد اور بازآبادکاری کے لیے بڑے پیمانے پر کام کیا۔ اسی طرح قدرتی آفات جیسے کہ سیلاب، طوفان وار زلزلہ سے متاثر ہونے والوں کے لیے بھی جماعت اسلامی امدادی کام کرتی

ہے۔ جماعت اسلامی نے خدمت خلق کے شعبے کے تحت اپنی مقامی یونٹوں کے توسط سے بہت سارے رفاہی اور عاومی فلاح و بہبود کے کام بھی انجام دیے ہیں۔ان میں اسکولوں، اسپتالوں اور غیر سودی امدادی قرضوں کا نظام قابل ذکر ہے۔

مذہبی خدمات کے حوالے سے جماعت اسلامی ہند نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے مذہب اور ثقافت سے جوڑے رکھنے، ان میں صحیح اسلامی شعور بیدار کرنے اور مختلف قومی و ملی مسائل کو اسلامی تناظر میں دیکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر خدمات انجام دی ہیں۔ مرکزی اور علاقائی سطح پر جماعت اسلامی نے متعدد اشاعتی ادارے قائم کیے ہیں اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں کے ساتھ ساتھ مختلف علاقائی زبانوں میں بھی اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کا سب سے بڑا کارنامہ ملک میں مختلف علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجموں کی اشاعت ہے۔ قرآن مجید کے ترجموں کے علاوہ حدیث اور دیگر اسلامی ادب کے ترجمے بھی علاقائی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے اندر ملکی اور عالمی مسائل کا شعور پیدا کرنے، اپنے دعوتی کاموں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے جماعت اسلامی ہند ملک کی مختلف زبانوں میں اخبارات و رسائل کی اشاعت کا کام بھی کرتی ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے تحت ملک کے مختلف شہروں سے تقریباً بیس سے زائد اخبارات و رسائل مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی جماعت اسلامی ہند مختلف قسم کے ملکی و ملی خدمات کے کاموں میں تنہا یا دیگر رفاہی و مذہبی تنظیموں کے ساتھ مل کر حصہ لیتی ہے۔

جماعت اسلامی نے ہندوستان میں اسلامی فکر کی احیاء میں جس طرح کی پالیسی اپنائی اس میں انفرادی ربط و ملاقات، اجتماعات اور خطاب عام، دارالمطالعے کا قیام، اسلامی لٹریچر کی اشاعت، مکتب و مدارس کا قیام، خواتین کی تربیت و اصلاح، غیر مسلموں میں دعوت اسلامی کا فروغ، مقامی قائدین سے ربط و تعلق رکھنا، رفاہی کام کرنا یعنی خدمت خلق، کالج و جامعات کا قیام اور طلبہ کی تنظیموں کا احیا وغیرہ اہم ہیں۔ جماعت اسلامی ہند نے تقسیم ہند کے بعد خود کو سیاست سے علیحدہ کر لیا تھا اور اپنے آپ کو خالص دینی و ملی کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا مگر حالات اور وقت کے تقاضے کے تحت انھوں نے اس پالیسی پر نظر ثانی کی اور دوبارہ سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے لگی اور علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی جو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ ان تمام ذیلی شعبہ جات کے تحت بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز کام کئے گئے جن کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمان اس فکر کی حمایت کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی اپنے فکری منہج کے اعتبار سے مسلمانوں میں جس طرح کا کام کرنا چاہتی تھی اس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی جماعت کے ذریعہ اس حیثیت سے منفرد نظر آتے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اپنے اردگرد بلکہ برصغیر کے دور دراز علاقوں میں بھی ایسے لوگوں اور دانشوروں کو اکٹھا کر لیا تھا جن کی فکر میں نشو ونما کی صلاحیت باقی تھی اور جو ہر شے کو تنقید کی کسوٹی پر کستے تھے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دین اسلام کو جدید دنیا کے سامنے نمونہ حیات بنا کر پیش کیا۔ ان کی اس فکر کو تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔

جماعت اسلامی کی فکر اور اس کی کارکردگی کے اعتبار سے اگر مولانا مودودی کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محض ایک شخص نہیں بلکہ ایک عہد ایک تاریخ ساز تھے اور برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے معمار اول۔ کیوں کہ ان سے پہلے جن لوگوں نے اس سلسلے کی کوششیں

کی تھیں وہ انفرادی تھیں۔ جماعت اسلامی نے ان کی فکر کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ مستقل اپنے مشن میں رواں دواں ہے۔

22.12 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند

22.12.1 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کا قیام و پس منظر

یہ جماعت بیسویں صدی کے پہلے دہے میں قائم ہوئی۔ اس کے قیام کے محرکات میں جہاں مسلک اہل حدیث کے متبعین کی شیرازہ بندی مقصود تھی وہیں امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ ہند کے درمیان غیر اسلامی رسوم ورواج، بدعات اور مشرکانہ رسموں پر بند باندھنے اور انھیں ختم کرنے کا عزم بھی شامل تھا۔ تاریخ اہل حدیث ہند کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس فکر کے حاملین کی معتدبہ تعداد ہمیشہ سے ہندوستان میں رہی ہے ملک کے جنوبی حصوں میں علماء اہل حدیث نے دین کی نشر واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شمالی ہند میں بھی اہل حدیث علماء نے کافی دینی خدمات انجام دی ہیں مگر انھیں حکومت کی سرپرستی نصیب نہیں ہوئی اس لئے اس فکر کے حاملین کی کارکردگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس فکر کے حاملین علماء نے بکھرے شہ پاروں کو ایک پلیٹ فارم دینے اور انھیں نئے آب وتاب کے ساتھ میدان عمل میں آنے کا موقع فراہم کرنے کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس طرح ایک خاص فکر کے تحت اس جماعت کو قائم کیا۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں بیان کیا جاچکا ہے کہ فکری سطح پر حاملین اہل الحدیث کی معتدبہ تعداد برصغیر میں پائی جاتی تھی مگر شیرازہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بکھرے ہوئے تھے اور اپنی سطح پر ملت کی دینی ودنیاوی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جب بھی مکتب فکر کے علما نے اپنی اپنی جماعتیں اور پہچان بنالی تو اہل حدیث علماء نے بھی الگ جماعت کے قیام کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس کے قیام کی جدوجہد شروع کی۔ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے قیام کے محرک اول مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے جنھوں نے 5 اکتوبر 1906 میں اپنے ہفت روزہ اخبار اہل حدیث میں اس کے قیام پر روز دیتے ہوئے اس کو وقت کی اہم ضرورت بتایا اور علماء اہل حدیث سے مؤدبانہ اپیل کی کہ اگر ان کی یہ آواز اور تحریک صحیح ہے تو آپ تمام لوگ اپنی آرا سے مطلع فرمائیں۔ چنانچہ اکابرین اہل حدیث علماء نے جو خود بھی اس ضرورت کو محسوس کررہے تھے مولانا کی آواز پر لبیک کہا اور حمایت کا اعلان کیا چنانچہ دسمبر 1906 میں مدرسہ احمدیہ آرہ صوبہ بہار کے سالانہ جلسہ کے موقع پر اہل حدیث کانفرنس نام کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس اجلاس میں ذمہ داران کا انتخاب بھی عمل میں آیا اور محدث عبداللہ غازی پوری اس کے صدر منتخب کیے گئے اور نظامت کی ذمہ داری تحریک کے محرک اول مولانا ثناء اللہ امرتسری کو دی گئی۔ اس طرح جمعیۃ اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا۔ یہ جماعت اسی نام سے تقسیم ہند کے بعد بھی کام کرتی رہی۔ تقسیم ملک سے جب جماعتیں اور ادارے بھی تقسیم ہوگئے تو شناخت کے مسئلے نے سر ابھارا چنانچہ اکابرین جماعت نے 1977 میں دہلی اجلاس کے موقع پر اس کے نام کی تبدیلی کی تجویز پاس کی اور اس کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کا نام دیا۔ چنانچہ اس وقت سے تا حال اس نام سے یہ جماعت عملی میدان میں سرگرداں ہے۔

22.12.2 جمعیۃ اہل حدیث کے اغراض ومقاصد

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے اغراض ومقاصد ملت کی صحیح اسلامی خطوط پر دینی ودنیاوی رہنمائی مرکزی نقطہ کی حامل ہے۔ لیکن ان کے

یہاں توحید خالص پر زور دوسری جماعتوں سے انھیں ممتاز کرتا ہے۔ جمعیۃ کے دستور اساسی کو بیان کرتے ہوئے دفعہ نمبر 5 کے تحت اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں: 1-مسلمانوں کو توحید خالص کا شیدائی بنانے کے لئے تمام ممکنہ طریقہ اختیار کرنا۔ 2-بدعات اور رسوم قبیحہ کو حکمت کے ساتھ مٹانے اور سنتوں کو رائج کرنے اور باطل تحریکوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کرنا۔ 3-غیر مسلموں کے سامنے صحیح اسلامی تعلیمات پیش کرنا۔ 4-افراد اور ارکان جماعت کی صحیح اسلامی تربیت کرنا۔ 5-مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم کرنا۔ 6-قانونی دائرہ میں رہتے ہوئے شرعی عدالتوں کا قیام۔ 7-مسلمانوں کے عائلی مسائل کے حل کے لئے دارالافتا کا قیام۔ 8-کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی کتب و رسائل جاری کرنا۔ 9-کتاب و سنت اور مسلک اہل حدیث کے خلاف لکھی جانے والوں کتابوں اور تحریروں کا جائزہ لینا اور اس کی تردید کرنا اور اس مقصد کے لئے جماعت کے افراد کی تربیت کرنا۔ 10-جمعیۃ کے اغراض و مقاصد کے تعارف اور اس کے نصب العین کی تکمیل کے لئے اخبار و رسائل جاری کرنا اور جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال کرنا۔ 11-ہر سطح پر جماعتی مدارس قائم کرنا اور ان کی ترقی و اصلاح کی سعی کرنا۔ 12-مسلم طلبہ و طالبات کی تعلیمی رہنمائی کرنا اور بوقت ضرورت تعاون دینا۔ 13-جماعتی مدارس و مکاتب کے لئے اسلامی نظریہ تعلیم پر مبنی معیاری نصاب تیار کرنا جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ 14-نظام بیت المال کو فروغ دینا اور اس کے ذریعہ سے غریب اور مستحق افراد کی اعانت و امداد کرنا۔ 15-آمدنی کے وسائل کو بڑھانے کے لئے جدوجہد کرنا وغیرہ۔

22.12.3 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کا طریقہ کار

یہ جماعت اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ایک مخصوص لائحہ عمل بھی رکھتی ہے اور اس سے سرمو انحراف کو بھی جائز و درست نہیں سمجھتی۔ توحید خالص اور کتاب و سنت کے احکامات کے سلسلے میں اس کا موقف بہت سخت ہے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دستور اساسی کے دفعہ چھ کے تحت جمعیت کا طریقہ کار یہ ہے۔

1- ہر فیصلہ کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جائے گا اور اس کی افہام و تفہیم کے لئے طریقہ سلف اور ان کے مفاہیم کو مقدم رکھا جائے۔

2- ملکی و ملی مسائل میں اپنے اعتصام بالکتاب والسنہ کے امتیاز کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی، پالیسی اور طریقہ کار متعین کرنا یا معاصر مسلم تنظیموں کے ساتھ تعاون کرنا۔

3- جمعیت اپنے نصب العین اور اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے جو بھی ذرائع اور تدابیر اختیار کرے وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ہوں۔

علاوہ ازیں جماعت کا ایک تنظیمی ڈھانچہ بھی ہے جس کے مختلف مدارج ہیں۔ ان میں سے ایک مرحلہ رکنیت کا بھی ہے۔ اس کی رکنیت کے لئے شرط یہ ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی شہری جو عاقل بالغ اور مسلمان ہو اور جمعیۃ اہل حدیث کے عقیدے اور نصب العین سے اتفاق رکھتا ہو اس کا رکن بن سکتا ہے۔ رکن بننے کے بعد اس پر کئی طرح کی تنظیمی پابندیاں عائد ہوتی ہیں جس پر عمل درآمد اس شخص کے لئے ضروری ہے۔ تنظیمی امور کو چلانے کے لئے اس جماعت کے افراد نے شورائی نظام کو اخذ کیا ہے باہمی مشورے سے تمام امور انجام دئے جاتے ہیں۔ ذمہ داران جماعت صوبائی، ضلعی اور مقامی جماعتوں کے ساتھ طلبہ، خواتین اور نوجوانوں کی بھی ذیلی یونٹیں قائم کی ہیں تا کہ اغراض و مقاصد کی تکمیل میں سہولت ہو۔ تمام ذیلی جماعتیں مرکزی امیر اور ناظم عمومی کے ماتحت کام کرتی ہیں۔

22.12.4 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی کارکردگی

مرکزی جماعت اہل حدیث اپنے قیام کے اول روز سے ملت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگی ہوئی ہے چنانچہ جماعتی سطح سے لے کرانفرادی سطح تک خدمت خلق کا کام انجام دیا جارہا ہے۔ مثلاً دینی علوم کی ترویج واشاعت کے لئے مدارس اور جامعات قائم کرنا، اپنے فکرو منہج کی ترویج کے لئے اخبار ورسائل جاری کرنا۔ رفاہی کاموں میں اسپتال اور ذیلی ڈسپنسریاں قائم کرنا۔ قدرتی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات میں ریلیف کے کاموں میں جوش وجذبہ کے تحت حصہ لینا۔ نظام بیت المال قائم کر کے مستحقین کی مدد کرنا اور مسلم معاشرہ سے مشرکانہ رسوم ورواج کو ختم کرنے کے لئے اخبار ورسائل جاری کرنے کے ساتھ انفرادی اصلاح کی کوشش کرنا۔ کتاب وسنت کی روشنی میں مسلم فکر کو پروان چڑھانا اور دیگر ملی مسائل میں دوسری جماعتوں سے اشتراک عمل کرنا اور اس کے لئے سرمایہ صرف کرنا اس جماعت کا امتیاز رہا ہے۔

22.13 امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

22.13.1 امارت شرعیہ کا قیام وپس منظر

یہ تحریک بھی ماقبل آزادی کے اسی ماحول اور فضا میں وجود میں آئی جس میں دیگر مسلم جماعتیں اور ملی اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس تحریک کے پیش نظر بھی وہی مقاصد پوشیدہ تھے جو دیگر ملی اداروں کے ہیں یعنی تبلیغ دین، مسلمانوں کی دینی رہنمائی، اسلام اور مسلمانوں کا دفاع اور تحفظ شریعت، نیز ملت کی سماجی اور رفاہی خدمات وغیرہ۔ اس کی انوکھی بات یہ تھی کہ اس جماعت کے بانیان نے ملت اسلامیہ ہند کی شیرازہ بندی کے لئے امارت شرعیہ کی تجویز پیش کی تا کہ ملت ایک قائد کے ماتحت اپنا لائحہ عمل متعین کر کے دینی ودنیاوی زندگی گزار سکے اور مستقبل کا خاکہ مرتب کر سکے۔ مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب نے مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی اور مسلم معاشرہ پر رضا کارانہ شریعت کی تنفیذ کے لئے اس تحریک کی بنیاد ڈالی۔ جس کی حمایت میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ ابتداء میں اس کا دائرہ کار کل ہند سطح کا تھا لیکن ملک گیر سطح پر ان لوگوں کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی البتہ بہار واڑیسہ (جس میں جھارکھنڈ بھی شامل ہے) میں کامیابی کی سطح سے گزری بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا قیام عمل میں آیا۔

26 جون 1921 کو بانکی پورہ پٹنہ میں پتھر کی مسجد میں بہار واڑیسہ کے پانچ سو علما اور مشائخ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ اس اجلاس میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے پہلے امیر شاہ بدرالدین قادری سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ہوئے۔ اس تحریک کے محرک اول مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو نائب امیر منتخب کیا گیا۔ انھیں لوگوں کی رہنمائی اور قیادت میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ ان لوگوں کے بعد شاہ محی الدین، شاہ قمرالدین، مولانا سید منت اللہ رحمانی اور مولانا عبدالرحمان بھی امیر شریعت ہوئے نیز مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا مجاہدالاسلام قاسمی وغیرہم نے نائب امیر شریعت کے طور پر کام کیا ہے۔ یہ تحریک اپنے نام کے اعتبار سے بہار واڑیسہ تک ضرور محدود تھی مگر مجموعی اعتبار سے اس کا دائرہ عمل تمام ہندوستان تھا۔ اس تحریک یا جماعت کا نظم ونسق مجلس ارباب حل وعقد، مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے تحت چلتا ہے۔

22.13.2 امارت شرعیہ کے اغراض ومقاصد:

اس تحریک کا دائرہ عمل تو کافی وسیع ہے مگر جن نکات پر اس جماعت نے اپنے آپ کو منظم کیا تھا وہ یہ ہیں۔ 1-منہاج نبوت پر نظام شرعی کا قیام، 2-اس نظام شرعی کے ذریعہ اسلامی احکامات کو بروئے کار لانا اور اس کے اجرا اور تنفیذ کے مواقع پیدا کرنا۔ 3-قوانین شرعی کو نافذ اور اسلام کے نظام عدل کو جاری رکھنے کے لئے استعداد پیدا کرنا۔ 4-ملت اسلامیہ ہند کے اسلامی حقوق کا تحفظ اور نگہداشت، 5-مسلمانوں کو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد پر مجتمع کرنا۔ 6-تعلیم، معاش واقتصاد اور دیگر عملی میدان میں اسلامی نظام حیات کی روشنی میں رہنمائی کرنا۔ 7-رفاہی اور فلاحی اداروں کو قائم کرنا۔ 8-اسلام کی روشنی میں ہندوستان میں بسنے والے تمام مذہبی فرقوں کے ساتھ صلح وآتشی کا معاملہ کرنا۔ 9-ملک میں امن پسند قوتوں کو فروغ دینا۔ 10-ملک میں مختلف فرقوں کے درمیان احترام کا جذبہ پیدا کرنا۔ 11-فرقہ پرست تحریکوں اور ان کے اثرات کا سدباب کرنا۔ 12-ان تحریکات سے اشتراک کرنا جو ملک میں مختلف مذہبی اکائیوں کے درمیان میل محبت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جذبات کو فروغ دینے میں کوشاں ہوں، وغیرہ۔

22.13.3 امارت شرعیہ کی خدمات

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اپنے قیام کے اول روز سے ہی مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے فرائض انجام دے رہی ہے اور تاحال یہ سلسلہ بدستور قائم ہے۔ مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ان کی دینی ودنیاوی رہنمائی کے لئے ادارے کے ذمہ داروں نے مختلف شعبہ جات قائم کیے ہیں اور مستقل ملت کی خدمت کر رہے ہیں امارت شرعیہ کے قابل ذکر شعبے یہ ہیں۔ شعبۂ دعوت وتبلیغ، شعبۂ تنظیم، شعبۂ تعلیم مذہبی وعصری، شعبۂ افتاء، شعبۂ قضاء، شعبۂ امور مساجد، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، دارالعلوم اسلامیہ وغیرہ۔ امارت شرعیہ نے شعبۂ قضاء کے تحت تقریباً چالیس سے زائد دارالقضاۃ قائم کر کے مسلمانوں کے مختلف معاملات خاص کر کے عائلی معاملات کا تصفیہ کر کے ملت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ قضاۃ کی تربیت کے لئے الگ سے شعبہ بھی قائم کیا۔ اس شعبہ کا یہ بھی امتیاز ہے کہ یہاں غیر مسلم حضرات بھی اپنی مرضی سے اپنے معاملات تصفیہ کرانے آتے ہیں۔ شعبہ نشر واشاعت کے تحت موقع بہ موقع مختلف موضوعات پر کتابیں، پمفلٹ، کتابچے اور پوسٹر وغیرہ شائع کر کے ملت کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے جاتے ہیں۔ شعبۂ بیت المال کے تحت ضرورت مندوں کی بلا لحاظ مذہب وملت امداد کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس تحریک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کے ذمہ داران نے فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر پورے ملک میں ریلیف کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور فسادات کے سدباب کی کوشش کی۔ بہار اڑیسہ اور جھارکھنڈ میں فتنۂ قادیانیت کا بھی سامنا کیا اور شدھی تحریک کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ مرتد مسلمانوں کو دوبارہ دائرۂ اسلام میں لانے کا اہم کارنامہ بھی انجام دیا۔ اسی طرح مسلم پرسنل لا پر موقع بہ موقع اٹھنے والے اعتراضات کا دفاع کرنے میں اس جماعت کے افراد بھی سرفہرست رہے ہیں۔ یکساں سول کوڈ کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ مسلمانوں کو اس کے مضمرات سے واقف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ اس تحریک کا یہ امتیاز بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کی عصری اور دینی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کو قائم کر کے اس کے تحت ٹیکنیکل اداروں کو قائم کیا۔ علاوہ ازیں اسپتال اور صحت کے مراکز قائم کر کے ملت کی صحت کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ممد ومعاون ہوئی۔ علاوہ ان کاموں کے ملت کی فلاح وبہبود کی خاطر دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ الغرض اس جماعت کے قائدین اور ذمہ داروں نے محدود دائرہ کار میں

رہتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں اور بدستور یہ سلسلہ جاری ہے۔

22.14 دارالمصنّفین اعظم گڑھ

22.14.1 دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا قیام وپس منظر

اس ادارے کو بھی ماقبل آزادی ہندوستان قائم کیا گیا تھا مگر اس کے قیام کے محرکات بالکل مختلف تھے۔ اس ادارہ کو صرف تحقیق اور تصنیف تالیف کے لئے مخصوص کیا گیا۔ دراصل اس کو علامہ شبلی کی علمی تحقیق کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔

علامہ شبلی نے علوم شرقیہ کی تحقیق میں جس نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی تھی اور جس کے تحت انھوں نے معروف زمانہ کتابیں اور مضامین ومقالات لکھے تھے اس کو قائم ودائم رکھنے اور اس کو جلا بخشنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں مصنّفین کو تحقیق کے نئے انداز اور اسلوب کے تحت تربیت دے کر انھیں اسلام اور مسلمانوں کے دفاع جیسے عظیم مقصد پر لگایا جاسکے۔

شبلی کے علمی کارناموں اور کارگزاریوں پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حیات بخش افکار وخیالات نئی صدی میں اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کو حقیقت میں بدلنے کے آرزومند افراد اور اداروں کے لئے سرچشمہ تھے۔ ان کے کارناموں کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے انیسویں صدی کے آخری عشروں میں جب کہ ہندوستان غلام ہو چکا تھا اور مغرب سے ذہنی وفکری سیاہی ہر سو پھیلتی جاری تھی اپنی تحریروں سے پوری قوم کو بیدار کیا اور ذہنی مرعوبیت کے دلدل سے نئی نسلوں کو نجات دلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر تاریخی شعور اس وقت بیدار کیا جب مغرب مسلسل مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب کو داغدار بنانے کی کاوش کر رہا تھا۔ یہ کارنامہ انھوں نے ایسے وقت میں انجام دیا جب سرسید اور ان کے رفقاء مغرب پر مشرق کی برتری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہیروز آف اسلام سیریز کے تحت الفاروق، الغزالی، المامون، سیرہ نعمان، سیرۃ النبی، نیز علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، الجزیہ، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، موازنہ انیس ودبیر اور شعر العجم جیسی معرکتہ الآرا کتابیں لکھیں۔ مضامین ومقالات اس پر اضافہ ہیں۔ شبلی نے جو کام تنہا کیا وہ ایک ادارہ کا کام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسی طرح کی تحقیقی کتابیں لکھی اور پڑھی جائیں تا کہ ملت اسلامیہ اپنے عظمت رفتہ کو نہ صرف دریافت کر سکے بلکہ اس کی تاریخ کا اسے بخوبی علم بھی ہو جائے۔ چنانچہ اس کا ابتدائی خاکہ انھوں نے الہلال میں شائع بھی کیا تھا اور 1914 میں اس کا نام دارالمصنفین شبلی اکیڈمی تجویز کر کے منظوری حاصل کی، اس کے لئے اپنا باغ اور بنگلہ وقف کیا، قبل اس کے کہ مزید کام آگے بڑھتا، وقت موعود کے غلبہ نے اس کی تکمیل نہیں ہونے دی۔ بعد میں ان کے لائق شاگردوں نے انھیں خطوط پر ان کے انتقال کے بعد دارالمصنّفین کو قائم کیا۔

22.14.2 دارالمصنّفین کا قیام اور اغراض ومقاصد

اس ادارہ کی بنیاد تو 1914 میں شبلی نعمانی خود ڈال گئے تھے، لیکن اس کی تعمیر وترقی ان کے ہونہار شاگردوں کے ذریعہ شبلی کے انتقال کے بعد ان کے باغ وبنگلہ بمقام اعظم گڑھ میں عمل میں آئی۔ اس کے قیام وبقا اور تعمیر وترقی میں شبلی کے شاگردوں نے اہم رول نبھایا۔ مولانا حمیدالدین فراہی اور سید سلیمان ندوی نے اس ادارہ کو مجلس اخوان الصفا کے تحت رجسٹرڈ کرا کے اس کو عملی شکل دی۔ اس کے اصول وضابطہ میں

انھیں اصولوں کو مدنظر رکھا گیا تھا جس کا خاکہ شبلی پیش کر گئے تھے۔ انھوں نے الہلال میں دارالمصنّفین کے قیام کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ملک میں تصنیف وتالیف کا ذوق پھیلتا جارہا تھا اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف وتالیف کے لئے جس طرح کے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ مہیا نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی قومی کتب خانوں تک رسائی حاصل بھی کر لیتا ہے تو وہاں دلجمعی کے اسباب نہیں ہیں کہ اطمینان سے چند روزہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل وانتخاب کر سکیں۔ علاوہ ازیں ارباب اہل قلم کے ماحول میں کوئی ایسا علمی مجمع بھی نہیں جس سے وہ لوگ مشورہ وتبادلۂ خیال کر سکیں۔ ان مشکلات کے حل اور تصنیف وتالیف کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ایک وسیع دارالتصنیف قائم کیا جائے جس کی ایک مختلف عمارت ہو اور اس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لئے ہو اور اس کے پاس ہی محققین کے لئے کمرے ہوں تاکہ وہ دلجمعی سے تحقیق وتالیف میں مشغول رہیں۔ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مصنّفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی شاخ کے موجد ہوں۔ ایک عمدہ کتب خانہ ہو جس میں کثرت تعداد پر ہی نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو نادر یا کمیاب ہو۔ تصنیفی وظائف قائم کئے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے یہ وظائف ماہوار ہوں یا کسی تصنیف کے صلہ کے طور پر دیے جائیں وغیرہ۔ انھیں ضوابط واصولوں کے تحت اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

22.14.3 دارالمصنّفین کے شعبہ جات

دارالمصنّفین کے قیام کے بعد شبلی کے شاگردوں نے مصنّفین کے اس ادارے کو سہولت کی خاطر مختلف شعبوں میں تقسیم کیا تھا۔ وہ شعبہ جات یہ ہیں۔ شعبہ دارالتصنیف، شعبہ دارالاشاعت، شعبہ دارالطباعت، دارالکتب، شعبہ رسالہ معارف، شعبہ تعمیرات وغیرہ۔ انھیں شعبوں کے تحت اس ادارے کے تمام امور انجام پاتے ہیں۔ شعبۂ دارالتصنیف اس ادارہ کا سب سے اہم شعبہ ہے جس کے لئے تمام کل پرزے تیار کئے گئے ہیں۔ اس شعبہ سے منسلک افراد نے شبلی کی علمی روایت کو جلا بخشنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے علاوہ وہ علامہ حمید الدین فراہی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی وغیرہم نہ صرف شبلی کے شاگرد تھے بلکہ تصنیف وتالیف اور ذوق کے مطالعہ میں ان کے تربیت یافتہ بھی تھے۔ ان لوگوں کی تصنیفات شبلی کے فکر وخیال کی آئینہ دار ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے علماء اہل قلم حضرات نیز محققین اور علم وادب سے بھی لگاؤ رکھنے والوں کی علمی وتحقیقی تربیت کے لئے جولائی 1910 میں معارف کے نام سے ایک علمی رسالہ بھی جاری کیا گیا جو طویل العمری کے باوجود اپنے معیار کے مطابق ابھی تک شائع ہو رہا ہے۔ یہ تحقیقی رسالہ اس ادارہ کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے۔

22.14.4 دارالمصنّفین کی کارکردگی

اس ادارے کو قائم ہوئے تقریباً 99 سال ہو چکے ہیں۔ اپنے قیام کے اول روز سے ہی اس ادارہ کے ذمہ داران اور محققین نے خود کو تصنیف و تالیف اور تحقیق کے لئے وقف کر دیا اور شبلی کے خواب وخیال ہیروز آف اسلام کی سیریز کو مزید وسعت دی اور اس طرح کی سیکڑوں کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔ جن کی اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ مسلم تاریخ وآثار کے حوالے سے جس طرح کی تحقیق اس ادارے میں کی گئی اس کی مثال برصغیر میں نہیں ملتی۔ دفاع اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اسی ادارے کی خدمات بھی مسلم ہیں۔ مستشرقین کے ذریعہ پھیلائی جانے

والی غلط فہمیوں کا یہاں نہ صرف مطالعہ وتجزیہ کیا گیا بلکہ اس کے ازالہ کے لئے کانفرنسیں اور سمینار و لیکچرز کا اہتمام کر کے عملی کوششیں بھی کی گئیں۔ اس ادارے نے استشراق کے ضمن میں جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی اہمیت نہ صرف اس عہد میں تھی بلکہ آج بھی ہے۔ برصغیر کے کسی دیگر ادارے نے مطالعہ استشراق کا اس طرح اہتمام نہیں کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ادارے سے وابستہ حضرات نے قومی خدمت کو معاشی ضرورتوں پر مقدم رکھ کر قلیل مشاہرے پر کام کیا اور اسلام و مسلمانوں کے ضمن میں پھیلی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے بھرپور کوششیں کیں جس سے نہ صرف اس ادارے کے وقار میں اضافہ ہوا بلکہ ملت کی بعض علمی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں۔

22.15 دائرۃ المعارف عثمانیہ

22.15.1 دائرۃ المعارف کا قیام اور پس منظر:

اس ادارے کا قیام 1882 میں عمل میں آیا تھا۔ مہینہ اور دن کے تعین کی وضاحت تاریخ میں نہیں ملتی۔ مولانا انوار اللہ خاں فاروقی، مولانا عبدالقیوم اور نواب عماد الملک وغیرہم اس ادارے کے قیام کے محرک اول تھے۔ اس وقت نواب میر محبوب علی خاں ششم کی حکومت تھی۔ انھوں نے نہ صرف اس کے قیام کی تائید وحمایت کی بلکہ اس کی سرپرستی اور ریاستی سرمایہ کی مدد دے کر اس کے قیام واستحکام میں معاون ومددگار ہوئے۔ ان کے بعد نواب میر عثمان علی خان ہفتم نے اس کی سرپرستی فرمائی۔ ان کے زمانہ میں اس ادارے نے عالمی شہرت پائی۔

پہلے پہل اس ادارے کا نام دائرۃ المعارف نظامیہ تھا جو کہ ریاست حیدرآباد کا خاندانی لقب تھا۔ مگر 25-1923 کے درمیان ساتویں نظام میر عثمان علی خاں کے نام سے اس ادارے کو منسوب کر کے نظامیہ کے بجائے عثمانیہ کا لفظ شامل کیا گیا۔ اس وقت سے تا حال یہ اسی نام سے معروف ہے۔

اس کے قیام کے پس منظر کا واقعہ بھی بہت ہی عجیب وغریب بیان کیا جاتا ہے زبانی روایتوں پر اگر یقین کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا انوار اللہ خاں فاروقی صاحب نے اپنے خدمت گار کو بازار سے کھجور لانے کو کہا۔ تا کہ وہ اپنے عزیز کو دے سکیں اسپتال میں بھرتی تھے۔ خدمت گار کھجور لے کر آیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کیونکہ کھجوریں مشہور حدیث کی کتاب کنز العمال جو مخطوطہ کی شکل میں تھی کے ورق میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ذہن وقلب کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے ایک ایسے ادارے کے قیام کے ارادے کو جہاں مخطوطوں کی نشرواشاعت اور ان کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے، حقیقت میں بدلنے کا ارادہ کیا۔ تا کہ آئندہ اس طرح کا واقعہ نہ ہو۔ انھوں نے اس سلسلے میں متعدد اسکالروں سے گفتگو کی اور اس کے قیام کی تگ ودو میں لگ گئے۔ مولانا عبدالقیوم جو معروف اسکالر اور بہتر منتظم تھے اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی جو اس وقت ریاست کے ایجوکیشن سکریٹری تھے کے ساتھ مولانا فاروقی میر محبوب علی خاں سے ملے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس طرح سے ان کی حمایت اور تائید سے یہ ادارہ قائم ہوا۔ اس واقعہ کی جو بھی حقیقت ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ بھی اس کے قیام کے اسباب میں ایک سبب تھا۔

22.15.2 دائرۃ المعارف کے اغراض و مقاصد

دائرۃ المعارف کے اغراض و مقاصد میں درج ذیل باتوں کو اولیت کا مقام حاصل رہا ہے اور انہیں کے تحت اس ادارے کی کارگزاریاں سامنے آتی ہیں:

1- سائنس، آرٹ اور عربی کے مذہبی مخطوطوں کے حفاظت جو ختم ہو رہے ہیں یا ختم ہونے کے قریب ہیں۔

2- ان مخطوطوں کی نشر و اشاعت

3- نادر کلاسیکی مخطوطوں کی تحقیق و تدوین کے ساتھ ان کی طباعت کے ذریعہ ان کی حفاظت

4- دائرے کی مطبوعات کو مناسب قیمت پر فروخت کرنا۔

5- دائرے کی مطبوعات کو مفت یا معمولی قیمت پر مصنفوں، اساتذہ، اسکالرس اور معروف مدارس و جامعات کو دینا وغیرہ۔

22.15.3 دائرۃ المعارف کا نظام

دوسرے اداروں کی طرح یہ ادارہ بھی مختلف کمیٹیوں کی ماتحتی میں چلتا ہے۔ یہ ادارہ خود مختار ہے جس کا اپنا قانون بھی ہے۔ ایگزیکیوٹیو کمیٹی لٹریری کمیٹی اور ایڈوائزری کمیٹی کے ذریعہ حرکت پذیر ہے۔ اول الذکر دونوں کمیٹیوں کے کل سات سات ممبر ہوتے ہیں، دونوں کمیٹیوں کے صدر شیخ الجامعہ عثمانیہ ہوتے ہیں۔ ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر ملک و بیرون ملک کسی بھی جگہ کے ہوسکتے ہیں۔ یہ کمیٹی ادارہ کے استحکام و بقا میں معاون و مددگار رہوتی ہے اور اس کی وضع پالیسی میں اہم رول نبھاتی ہے۔ اس ضمن میں جرمن اسکالر سالم کرنکو (Salim Karanko) کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ جب تک ریاست حیدرآباد (ریاست نظام) قائم تھی اس وقت تک اس کی مالی ضرورتوں کو ریاست پوری کرتی تھی لیکن آزادی کے بعد اس کی مالی ضرورتیں مرکزی اور صوبائی حکومتیں پوری کرتی ہیں۔ 1996 میں اس وقت کی مرکزی حکومت نے اس ادارے کو انسانی فلاح و بہبود اور ترقی کی وزارت سے الگ کر کے وزارت اقلیتی بہبود اور ریاست آندھرا پردیش کے ماتحت کر دیا تھا اور مرکزی گرانٹ بھی ختم کر دی تھی اور اس کی مالی معاونت مذکورہ وزارت اور حکومت آندھرا پردیش کے سپرد کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ادارہ معاشی بحران کا شکار ہو گیا تھا۔

اس ادارہ کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی کو تمام طرح کے اقتصادی اور انتظامی اختیارات حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں ادارہ کا ناظم اعلیٰ ہی لٹریری کمیٹی کا سکریٹری ہوتا ہے اسی لئے اس کے ڈائریکٹر کی پوسٹ کا مکمل نام Director and Secretary ہے۔

22.15.4 دائرۃ المعارف کی کارکردگی

دائرۃ المعارف اپنے قیام کے اول روز سے ہی اپنے اغراض و مقاصد پر کاربند ہے چنانچہ اس وقت سے لے کر تا حال اس ادارہ سے ایسی سیکڑوں کتابیں اور مخطوطے شائع ہوئے ہیں جن کی مثال عالم عرب پیش نہیں کرسکتا۔ بنیادی طور پر اس ادارہ کا قیام تو عربی مخطوطوں کی حفاظت و بقا تھا لیکن اس کے بانیان اور ذمہ داران نے دوسرے موضوعات کو بھی شامل کیا اور اس ضمن میں تحقیق اور تصنیف کرا کر کتابیں طبع کیں مثلاً یہاں سے تفسیر قرآن، احادیث و اصول حدیث، رجال، سوانحی خاکے اور سوانح، قانون کی کتابیں، عقیدۂ اسلام اور تصوف، انسائیکلوپیڈیا،

تاریخ، ادب، فلسفہ، گرامر، ریاضی، تعلیم واصول تعلیم، زراعت، عہد وسطیٰ کی سائنس، جواہرات، طب یونانی اور اسلامی فقہ کی معتبر ومعروف کتابوں کی اشاعت کر کے پیش بہا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس ادارہ کی خوش بختی یہ تھی کہ اس کو جتنے بھی ذمہ دار ملے وہ یا تو اچھے منتظم تھے یا بہتر عربی داں اور محقق نیز ان میں بعض تو ایسے تھے کہ جو دونوں صفات سے معمور تھے۔ انھیں لوگوں کی کوششوں سے یہ ادارہ اپنے اغراض ومقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہوا۔ ادارے کی سرکاری ویب سائٹس پر اس کے ذمہ داران کی جو فہرست ہے اس میں کل اٹھارہ نام ہیں۔ وہ بھی 1926 سے تا حال۔ جہاں تک اس کی تصنیفات کا تعلق ہے تو اس کی فہرست طویل ہے اور اس کی تفصیلات بھی ادارہ کی ویب سائٹس پر موجود ہیں جو سیکڑوں میں پہنچتی ہیں۔

22.16 خلاصہ

جدید ہندوستان میں مسلم تحریکات اور اداروں کا قیام 1857ء کی جدوجہد آزادی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا مظہر ہے۔ ان حالات میں جب کہ ہندوستانی مسلمان نہ صرف سیاسی اقتدار سے بے دخل کر دیے گئے تھے بلکہ مختلف سطحوں پر ایسی کوششیں ہو رہی تھیں جن سے ان کی معاشی و تعلیمی پس ماندگی میں بھی اضافہ وہ رہا تھا اور وہ زندگی کی دوڑ میں مستقل پچھڑ رہے تھے۔ ان حالات نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے اصحاب نظر پیدا کیے جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو آگے لے جانے، ان کی تعلیمی ومعاشی پس ماندگی کو دور کرنے اور ان کی مذہبی شناخت کو بچانے کے لیے اپنے اپنے طور پر تدبیریں کیں اور پھر انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے ادارے اور تحریکیں شروع کیں۔ پھر ان تحریکوں اور اداروں نے اپنی اپنی سطح پر مختلف قسم کے کارنامے انجام دیے اور ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کی اور آج بھی کر رہے ہیں۔

بلاشبہ آج ہندوستانی مسلمان جس مقام پر ہیں انہیں اس مقام تک پہنچانے میں ان تحریکوں اور اداروں کا رول بہت ہی اہم ہے۔ ان میں تحریک مجاہدین، تحریک دیوبند، تحریک ندوہ، تحریک علی گڑھ، تبلیغی جماعت، سنی بریلوی جماعت، جمعیۃ علمائے ہند، جماعت اسلامی، مرکزی جمعیت اہل حدیث، جامعہ ملیہ اسلامیہ، امارت شرعیہ، دارالمصنفین اور دائرۃ المعارف اہم ہیں، جن کی کوششوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی، عملی، مذہبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی رہنمائی کا عمل انجام پایا۔ اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کا انہیں حوصلہ ملا۔

22.17 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ تحریک مجاہدین کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے ان کی کارگزاریوں کا احاطہ کریں۔

2۔ تحریک دیوبند کے قیام اور خدمات کا جائزہ پیش کریں۔

3۔ علی گڑھ تحریک کے قیام اور مقاصد پر ایک نوٹ لکھیں۔

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

4۔ تحریک ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے اس کی کارگزاریوں کا جائزہ لیں۔

5۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کیوں کر عمل میں آیا؟ وضاحت کریں۔

6۔ سنی بریلوی جماعت کے قیام اور خدمات کا جائزہ پیش کریں۔

22.18 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

1۔ عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں: ڈاکٹر احتشام احمد ندوی

2۔ 1947ء کے بعد ہندوستان میں اسلامی تحریکیں: پروفیسر اقتدار محمد خاں

3۔ ہندوستانی مسلمان: رحمانی

4۔ تاریخ دار العلوم دیوبند: سید محبوب رضوی

5۔ تاریخ ندوۃ العلماء: مولانا محمد اسحاق جلیس / مولانا شمس تبریز خاں

اکائی 23 : مسلم شخصیات

اکائی کے اجزا

23.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ان شخصیات کے احوال وکوائف اور کارناموں سے واقف کرانا ہے جو جدید ہندوستانی مسلم سماج ومعاشرے کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تاکہ طلبہ ان شخصیات، ان کے افکار وخیالات اور خدمات سے آگاہی حاصل کرسکیں اور انہیں اس بات کا علم ہوسکے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر وترقی میں کن مسلم شخصیات نے حصہ لیا اور مسلم معاشرے کی زبوں حالی کو دور کرنے میں انہوں نے کس طرح کا کردار نبھایا؟

23.2 تمہید

جدید ہندوستانی مسلم سماج ومعاشرے کی تعمیر وترقی میں جن اکابرین نے اہم کردار ادا کیا اور جن کی کوششوں سے نہ صرف مسلم معاشرے کی شیرازہ بندی ہوئی بلکہ ان کے افکار وخیالات نے مسلم معاشرے کو ترقی کی طرف گامزن کرنے میں بھی اہم کردار نبھایا، ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ البتہ ان میں چند نام ایسے ہیں، جن کی نمایاں خدمات اور کوششوں نے انہیں نہ صرف ہندوستان کے مسلم معاشرے کے معماروں میں شامل کردیا ہے بلکہ قومی وملکی ترقی میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔ مسلم معاشرے اور ملکی وقومی معماروں کے افکار وخیالات کے اثرات نہ صرف ملکی سطح پر دیکھے جاسکتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

23.3 شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے جو قدر ومنزلت عطا کی وہ اس خطہ ارض کی اسلامی ودینی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔

قرآن، حدیث، تفسیر، اصول، فقہ، تصوف، جہاد غرض ہر میدان علم وعمل میں اس خانوادہ عالی مرتبت کی معزز شخصیات پیش پیش رہیں، اسی خاندان کے ایک فرد جلیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تھے جن کے احسانات اسلامی ہند بلکہ اسلامی دنیا پر بے شمار ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ 25 رمضان المبارک 1159ء مطابق 12 اکتوبر 1776ء میں دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام حلیم رکھا گیا۔ آپ شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحبزادے تھے، شاہ عبدالعزیزؒ کا سلسلہ نسب چونتیس واسطوں سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب تک پہنچتا ہے۔

والد محترم کی سرپرستی میں تعلیم کا آغاز ہوا، ناظرہ قرآن وغیرہ کے بعد صرف پانچ سال کی عمر میں قرآن پاک کے حفظ کا آغاز کیا اور جلد ہی حفظ قرآن سے فراغت کے بعد فارسی زبان کی تعلیم شروع کردی اور چونکہ اس وقت فارسی زبان کا دور دورہ تھا لہٰذا تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف یہ کہ فارسی زبان سیکھ لی بلکہ ادب فارسی پر زبردست عبور حاصل کرکے فارسی زبان کے ایک ماہر اور قادرالکلام ادیب بن گئے، شاہ عبد العزیز نے اکثر وبیشتر علوم اپنے جلیل القدر والد ماجد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے حاصل کئے۔ ابھی شاہ صاحب کی عمر ۱۷ برس کی تھی کہ والد ماجد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد ان پر دوہری ذمہ داری آن پڑی، ایک تو آپ کے علوم وفنون تشنہ تکمیل ہی تھے، دوسرے یہ کہ آپ تمام بھائیوں میں بڑے تھے لہٰذا چھوٹے تین بھائیوں کی تربیت وپرورش کا بار بھی آپ پر آگیا، اس وقت شاہ رفیع الدین کی عمر 13 برس، شاہ عبدالقادر 9 برس اور شاہ عبدالغنی صرف 5 برس کے تھے۔

تیرہ سال کی عمر میں شاہ صاحب نے کتب درس، صرف ونحو، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، عقائد، ہندسہ، ہیئت اور ریاضی وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی، دو سال میں شاہ صاحب نے حدیث کی تمام کتابوں پر عبور حاصل کرلیا اور آپ کا شمار بہت بڑے بڑے علماء وفضلاء میں ہونے لگا۔

شاہ ولی اللہؒ کے انتقال کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ کی تعلیم وتربیت کا نظم اللہ تعالیٰ نے یوں کیا کہ اس زمانہ کے مایہ ناز علماء جن میں شیخ نور اللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیری اور شاہ محمد عاشق بن شاہ عبیداللہ پھلتی رحمہم اللہ شامل ہیں ان حضرات سے علوم نبوت کی تحصیل کی اور ان اکابر کے فیوض علمیہ وروحانیہ سے بھرپور استفادہ فرمایا اور حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، منطق، فلسفہ اور شعر وادب غرض کہ تمام علوم دینیہ وعصریہ میں ممتاز حیثیت پائی، اور فن حدیث میں خصوصی مہارت حاصل کرلی۔ مولانا سید عبدالحی مرحوم اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں۔ "مرحوم اپنے علم وفضل، آداب، ذکاوت، ذہانت، فہم وفراست اور سرعت حافظہ میں عالم کے اندر یگانہ روزگار علماء میں سے تھے، پندرہ برس کی عمر سے درس وتدریس میں مصروف ہوئے، درس دیا اور فیض پہونچایا، یہاں تک کہ ہندوستان میں یکتا عالم ہوگئے اور فضلاء نے ان سے اکتساب کمال کیا، بیشتر مقامات سے طلبہ محض ان سے پڑھنے کے لیے آئے اور ان پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے پیاسا پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے پندرہ برس کی عمر سے ہی مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کردیا تھا لیکن والد محترم کے انتقال کے چند سال بعد باضابطہ 25 سال کی عمر میں اپنے والد محترم کی مسند درس پر رونق جلوہ افروز ہوئے اور چونکہ آپ بھی والد محترم کی طرح جامع الحیثیات والجہات انسان تھے اس وجہ سے اپنے والد کے انداز درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کے طرز پر سلسلہ تدریس وتربیت اخلاق جاری فرما کر بڑی حد تک والد کی کمی کو پورا کردیا اور بہت جلد شاہ صاحب کی علمی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور اطراف عالم کے تشنگان علم وفن والہانہ انداز سے شاہ عبد العزیز صاحب کے درس میں حاضر ہوکر ولی اللہی علوم وفنون سے مستفیض ہونے لگے اور بہت ہی قلیل مدت میں شاہ صاحب کے علوم سے مستفیدین تلامذہ پورے عالم اسلام میں اور خصوصا برصغیر ہندوپاک میں پھیل گئے اور اس ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جو شاہ عبد العزیز کے شاگرد اور مرید سے خالی ہو۔

ان کے نامور تلامذہ میں سے چند کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، امام المفسرین شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی، امام العلماء مولانا رشید الدین دہلوی، مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، سید قمرالدین سونی پتی، حضرت شاہ غلام علی مجددی (خلیفہ مرزا مظہر جان جاناں شہید) مولانا سید قطب الدین بن مولانا محمد واضح رائے بریلوی، مولانا مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا امام الدین دہلوی، مولانا صدر علی رامپوری، مولانا حیدر علی فیض آبادی، اور حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی۔ یہ وہ علماء ومشائخ ہیں جن کے ذریعہ علوم دینیہ اور خصوصا علم حدیث پورے ہندوستان میں پھیلا، شاہ عبدالعزیز محدث اور عمدہ مفسر وماہر علوم عقلیہ ونقلیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ممتاز خطیب اور مقرر بھی تھے، شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں ہر مذہب وملت کے لوگ جوق درجوق شریک ہوتے۔ شاہ صاحب تمام علوم میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ موسیقی میں بھی یگانہء روزگار تھے، آپ کو یہ فن دوسرے علوم وفنون کی طرح اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں ملا تھا۔

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے، ۱۱ جنوری ۱۶۱۳ء میں مغل شہنشاہ جہانگیر نے فرمان شاہی کے ذریعہ انہیں صوبہ گجرات میں تجارتی مراکز قائم کرنے کی اجازت دی، عالمگیر کی وفات کے بعد انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی نام سے ایک تجارتی ادارہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے آڑ میں ملک کے مختلف حصوں پر اپنی حکومت قائم کرنی شروع کردی اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر قبضہ کرلیا اور اس کے ساتھ عیسائیت کی ترویج بھی شروع کردی اور دوسری طرف دینی مدارس کو تباہ وبرباد کرنے کی مہم تیز کرکے اپنے مشنری اسکول قائم کرنے شروع

کر دیئے، جب پانی سر سے اوپر ہوگیا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے انگریزوں کے خلاف شاہجہانی جامع مسجد دہلی سے آواز بلند کی کہ ''آج سے یہ ملک دارالحرب ہوگیا، ان غاصبوں کے خلاف جہاد کرنا ہمارا فریضہ ہے''

اس زمانے میں علماء سے عوام الناس کو متنفر کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈہ بڑے زور وشور سے پھیلایا گیا کہ علماء انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں، یہ پروپیگنڈہ اس شدت کے ساتھ کیا جاتا تھا کہ بہت سے بھولے بھالے مسلمان اس سے متاثر ہوکر علماء کرام کو برا بھلا کہنے لگتے، حالانکہ واقعہ بالکل برخلاف تھا، شاہ عبدالعزیزؒ انگریزی تعلیم کے حامی تھے دہلی میں جب انگریزی تعلیم کا انتظام ہوا تو مسلمانوں نے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق شاہ عبدالعزیز سے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے واضح لفظوں میں جائز قرار دیا۔ چنانچہ سرسید احمد خان نے اسباب بغاوت ہند کے صفحہ ۲۸ پر لکھتے ہیں ''شاہ عبدالعزیزؒ صاحب جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ انگریزی کالج میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے درست ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تصنیف وتالیف کے ذریعہ علوم حدیث کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ وہ کثیر التصانیف تھے ان میں سے چند کا ذیل میں تذکرہ کیا جارہا ہے۔

فتح العزیز (معروف بہ تفسیر عزیزی) یہ تفسیر کئی جلدوں میں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہوگئی اب صرف شروع اور آخیر کی دو جلدیں دستیاب ہیں۔

تحفہ اثنا عشریہ (فارسی) مذہب شیعہ کی تنقید وتردید میں شاہ صاحب کی شاہکار تصنیف ہے اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

بستان المحدثین (عربی) یہ کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست وتذکرہ اور تعارف ہے یہ اصلاً عربی میں ہے لیکن اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

العجالۃ النافعہ (فارسی) یہ اصول حدیث میں اہم فارسی رسالہ ہے۔

میزان البلاغۃ، یہ عربی زبان میں علم بلاغت پر ایک جامع مختصر متن ہے۔

السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، اس رسالہ میں شاہ صاحب نے خلفاء راشدین کے فرق مراتب پر نہایت محققانہ گفتگو کی ہے۔

میزان الکلام، یہ عربی میں علم کلام پر نہایت جامع ومانع مختصر رسالہ ہے۔

سر الشہادتین (عربی) ذکر حضرت حسنینؓ کے بارے میں یہ شاندار رسالہ ہے۔

مجموعہ فتاویٰ (فارسی) یہ آپ کے مختلف فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

اس کے علاوہ عربی میں عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس، تقریر دلپذیر فی شرح عدیم النظیر (فارسی)۔ ہدایۃ المومنین پر حاشیہ۔ سوالات عشرہ محرم (اردو) حواشی بدیع المیزان، (عربی) رسالہ تعبیر الرؤیا، میر زاہد رسالہ پر حاشیہ عربی میں، میر زاہد ملا جلال پر عربی میں حاشیہ، میر زاہد شرح مواقف پر عربی میں حاشیہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ وغیرہ مزید تفصیل کے لیے ڈاکٹر ثریا ڈار کی تالیف ''عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور

ان کی علمی خدمات'' دیکھا جاسکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز بڑے باغ وبہار، خوش طبع، خوش گفتار، ہشاش وبشاش اور حاضر جواب انسان تھے، آپ ذہانت وفطانت اور ذکاوت حس میں بے مثل تھے، آپ کی تبحر علمی اور عبقریت کے بے شمار واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز بڑے غیور انسان تھے آپ کی جلالت شان اور قدرتی ہیبت کی بنا پر بڑے بڑے امراء وسلاطین بھی مرعوب رہتے تھے، تاریخ شاہد ہے کہ خاندان ولی اللہی نے کبھی کوئی شاہی منصب یا جاگیر منظور نہیں کیا، جس طرح آپ کے دادا شاہ عبدالرحیم اور والد شاہ ولی اللہ نے اپنے عہد کے بے راہرو بادشاہوں اور وزیروں کو متنبہ کیا تھا اسی طرح شاہ عبدالعزیز نے بھی اس ولی اللہی سنت کو قائم رکھا۔ آپ کی قناعت کا یہ عالم تھا کہ کسی شاہی عطیہ کا قبول کرنا تو درکنار بادشاہوں اور امراء کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ کچھ پیش کریں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری پیش کش نظر حقارت سے مسترد کردی جائے گی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ عین جوانی میں ۲۵ برس کی عمر میں ہی کئی موذی امراض کے شکار ہوگئے جس کی وجہ سے آپ کی بصارت بھی جاتی رہی تھی، مخالفین نے آپ کو زہر دینے کی کوشش بھی کی تھی غرض ہندوستان کا یہ آفتاب علم وحکمت 7 شوال المکرّم 1239ھ مطابق 17 جولائی 1822ء میں 80 سال کی عمر میں بعد نماز فجر غروب ہوگیا، آپ کے نواسے شاہ محمد اسحاقؒ نے ترکمان دروازہ کے قریب آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور موجودہ آئی ٹی او دلی گیٹ کے درمیان واقع قبرستان مہندیان میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

23.4 علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی 1212ھ/1797ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب بتیس واسطوں سے حضرت عمر فاروق ص تک پہنچتا ہے۔ آپ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی (وفات 1829ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وفات 1824ء) کے ہم عصر اور اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے درسِ حدیث شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حاصل کیا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ہم سبق تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی، کم عمری ہی میں تمام علوم وفنون کے حصول سے فارغ ہوگئے، بعدازاں قرآن پاک حفظ کیا اور سلسلہ عالیہ چشتیہ میں حضرت دھومن شاہ دہلوی کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے۔ علامہ خیرآبادی نقلی اور عقلی علوم میں صف اول کے ممتاز عالم دین تھے۔ علم کلام، اصولِ فقہ اور علوم ادبیہ میں انہیں تخصص حاصل تھا۔ منطق وحکمت میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور کوئی ہم عصر ان کا ہم پلّہ نہ تھا۔ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> ''جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا اُنہی کی فکر عالی نے بناڈالی ہے۔ علمائے عصر بلکہ فضلائے دَہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا، دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔''

دینی علوم کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ شعروادب کا نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے چار ہزار سے زائد اشعار، عربی

ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر چہ خود اردو زبان میں طبع آزمائی نہیں فرماتے تھے تاہم بحیثیت نقاد کے آپ کی رائے سند کا درجہ رکھتی تھی۔ مرزا غالب ان کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، غالب کا موجودہ اردو دیوان، علامہ فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی کا انتخاب ہے۔

دینی علوم سے فراغت کے بعد وہ دہلی، جھجھر، ٹونک اور الور میں بلند مناصب پر فائز رہے۔ لکھنو اور رامپور میں منصب صدارت کو زینت بخشی، اس کے باوجود فارغ اوقات میں تشنگانِ علوم کو سیراب کرتے۔ آپ کے فیض یافتہ بے شمار علما آسمانِ علم وفضل پر مہر وماہ بن کر چمکے اور ایک عالم کو فیضیاب کیا۔ آج ہند و پاک کا شاید ہی کوئی مدرسہ ہوگا جہاں کسی نہ کسی شکل میں آپ کا فیض جاری نہ ہو۔ آپ کے چند معروف تلامذہ کے نام، درج ذیل ہیں:

علامہ عبدالحق خیر آبادی (فرزند)، علامہ ہدایت اللہ خاں جونپوری (استاذِ صدرالشریعہ مفتی امجد علی اعظمی، مصنف بہارِ شریعت)، تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا ہدایت علی بریلوی، مولانا سید محمد عبداللہ بلگرامی، مولانا عبدالعلی رامپوری (استاذِ امام احمد رضا بریلوی)، نواب یوسف علی خاں، والی ریاست رامپور اور نواب کلب علی خاں، والی ریاست رامپور۔

علامہ نے مختلف مناصب کی مصروفیات اور درس وتدریس میں مشغولیت کے باوجود تصانیف کا قابلِ ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ یہ تصانیف اپنے مصنف کے علمی تبحر، قوتِ استدلال، زورِ بیان اور کمالِ فصاحت وبلاغت پر شاہد وعادل ہیں۔ آپ کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں:

تاریخ فتنۃ الہند (فارسی)، جنگ آزادی 1857ء کے اسباب وواقعات پر عربی میں الثورۃ الہندیہ، نثر اور قصائد فتنۃ الہند، نظم میں ہیں، الجنس الغالی فی شرح الجوہر العالی، حاشیہ افق المبین، مصنفہ میر باقر داماد، حاشیہ تلخیص الشفاء لابن سینا، حاشیہ قاضی مبارک شرح سلم۔ مطبوعہ، رسالہ فی تحقیق الاجسام، رسالہ فی تحقیق الکلی الطبعی، الروض المجود (مسئلۂ وحدۃ الوجود کی معرکۃ الاراء کتاب، مطبوعہ)، الہدیہ السعیدیہ۔ (حکمت طبعیہ والٰہیہ پر مشتمل فلسفہ کی مبادیاتی کتاب ہے) تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ، فارسی، امتناع النظیر (فارسی) تحقیق الفتویٰ کا اردو ترجمہ سرگودھا ولاہور اور مبارک پور سے چھپ کر عام ہو چکا ہے۔ اسی طرح الثورۃ الہندیہ یعنی انقلاب ہند 1857ء مولانا عبدالشاہد شروانی علی گڑھی کے اردو ترجمہ اور سوانحی اضافہ کے ساتھ بنام "باغی ہندوستان" لاہور اور مبارک پور سے کئی بار چھپ چکا ہے۔

علامہ خیر آبادی ظاہری شان وشوکت اور علمی فضیلت کے ساتھ شریعت مطہرہ اور سنتِ مبارکہ پر عمل پیرا، عابد شب زندہ دار تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کو اللہ تعالیٰ نے دلِ دردمند اور عقل بیدار سے نوازا تھا، سرزمین ہند پر انگریز کے مکارانہ تسلط اور مسلمانوں کی شوکت وعظمت کے زوال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے اور اس امر کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ انگریز طرح طرح کے حیلے بہانے سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے درپے ہیں۔ علامہ نے الثورۃ الہندیہ (بغاوت ہندوستان) میں ان کی بعض سازشوں کی نشاندہی کی ہے مثلاً:

(1) انگریزوں نے مسلمان بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دینے کے لئے شہروں اور دیہاتوں میں اسکول کھولے اور اسلامی مدارس کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ (2) نقد قیمت ادا کر کے تمام غلہ اور اجناس خرید لیتے تاکہ لوگ ایک ایک دانے کے لئے ان کے محتاج ہو جائیں اور کسی کو مجالِ سرکشی نہ رہے۔ (3) بچوں کے ختنے پر پابندی عائد کر دی اور عورتوں کا پردہ ختم کرا دیا اور اس طرح اہل ایمان کو فتنہ میں ڈالنے اور احکامِ اسلامیہ کے مٹانے کی مذموم کوشش کی۔

(4) کارتوس استعمال کرتے وقت مسلمان فوجیوں کو سور کی چربی اور ہندوؤں کو گائے کی چربی چکھنے پر مجبور کیا۔

میرٹھ سے مئی 1857ء میں انقلاب کا آغاز ہوا۔ علامہ خیر آبادی اُس وقت ریاست اُلور میں تھے۔ وہاں سے دہلی پہنچے اور جہادِ آزادی میں قائدانہ شان سے حصہ لیا، بادشاہ سے سابقہ روابط کی بنا پر خصوصی مشوروں میں شریک ہوتے اور اپنی صواب دید کے مطابق راہنمائی کرتے۔ علامہ کی تجویز کے مطابق مختلف والیانِ ریاست کو خطوط لکھے گئے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی بلند شہر کے کلکٹر مقرر کیے گئے، بہت سے حکام علامہ خیر آبادی نے خود مقرر کیے، جس کی بہادر شاہ ظفر کی طرف سے اجازت تھی۔ آپ کے حکم وہدایت کے مطابق لال قلعہ کے دارالانشاء (سیکریٹریٹ) کی طرف سے احکام وفرامین جاری ہوتے رہے۔ بادشاہ نے ایک کنگ کونسل قائم کی جو تین ارکان پر مشتمل تھی، جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق۔ مختلف برطانوی جاسوسوں نے لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر سے علامہ خیر آبادی کی ملاقات وگفتگو اور آپ کی انقلابی سرگرمیوں کا اپنے اپنے روزناموں میں ذکر کیا ہے جن میں سے کئی ایک روزنامچے چھپ چکے ہیں۔

19 ستمبر 1857ء کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہوگیا تو علامہ خیر آبادی اپنے اہل وعیال کے ساتھ کسی طرح دہلی سے نکل کر اپنے آبائی وطن خیر آباد پہنچے۔ پھر خیر آباد سے سیتاپور (لکھنؤ) پہنچ گئے جہاں ملکۂ عالیہ ''حضرت محل'' انگریزی فوجوں سے نبرد آزما تھیں، یہاں بھی وہ انقلابیوں کی مجلس شوریٰ کے خصوصی رکن تھے، انقلابی آپ کے مدبرانہ مشوروں سے مستفید ہوتے رہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود انقلابیوں کو ہر محاذ پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور انگریز اپنا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ انہی دنوں ملکۂ برطانیہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ مولوی فضل حق اس اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے خیر آباد چلے گئے، ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ آپ کو گرفتار کر لیا گیا، مقدمہ چلا اور فیصلہ یہ دیا گیا کہ ان کی تمام جائداد ضبط اور انہیں تازیست جزیرۂ انڈمان (کالے پانی) بھیج دیا جائے۔ چنانچہ علامہ فضل حق نے 12 صفر 1278ھ۔ 20 اگست 1861ء کو انڈمان میں جامِ شہادت نوش کیا۔

علامہ خیر آبادی کو جہادِ حریت کا بطلِ جلیل اور انقلاب 1857ء کا قائد تسلیم کیا جاتا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی فاضلِ دیوبند سابق ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

> ''اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل ہے اس پر 38 دلّی کے علماء ومشائخ کے دستخط ہیں، مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس پر دستخط نہیں لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتویٰ جہاد تھا جس کا ذکر 1857ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مولانا بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت وجسارت اور دینی حمیت وغیرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلّی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی اور دوسرے علماء کے دستخط تھے۔''

انگریزی حکومت سے سرزمین ہند کو نجات دلانے کے جو جذبات علامہ خیر آبادی کے سینے میں موجزن تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کے فرزند علامہ عبدالحق خیر آبادی نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جب انگریز چلے جائیں تو میری قبر پر آ کر اطلاع دے دینا۔

چنانچہ 15 راگست 1947ء کو مولانا سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی نے مولانا عبدالحق خیر آبادی کے مدفن (درگاہ مخدومیہ خیر آباد) پر ایک جم غفیر کے ساتھ حاضر ہوکر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی اور اس طرح پورے پچاس سال کے بعد انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔

23.5 مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی

انیسوی صدی کے ہندوستان میں مسلم حکومت کی تباہی اور خاتمہ کے بعد جو نئی اسلامی تحریک اٹھی اس کے قبل از وقت زوال کی جو بھی تاویلیں کی جائیں حقیقت واقعہ یہ بھی ہے کہ اس کی باقیات کو بچانے اور خاص طور پر عمل بالحدیث کو رواج دینے والوں میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی نے کلیدی اور نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے مسند ولی اللہی کی شمع ایسے وقت میں جلائے رکھی جب کہ حالات ناگفتہ بہ تھے۔ انہوں نے تقریباً پچاس برس تک دہلی میں مسند درس وحدیث کا حلقہ قائم رکھا۔

سید نذیر حسین محدث دہلوی غالباً 1220ھ میں بمقام موضع بلتھوا، ضلع مونگیر بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی کے احوال کی تفصیلات نہیں ملتی۔ صرف اتنا بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا بچپن تابناک نہیں تھا۔ زمانہ طفولیت لہولعب میں گزرا۔ کبھی دریا میں تیراکی کی تو کبھی شہہ سواری۔ خاندانی عزت ووقار کے باوجود اس دوران علم وتعلیم سے بے بہرہ رہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اس وقت ان کے والد کے معاشی حالات زیادہ بہتر نہیں تھے جو ان کی تعلیم کے لیے باقاعدہ استاد کا انتظام کرتے یا کہیں اور بھیجتے۔ سید نذیر حسین محدث دہلوی نسباً سادات حسین سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلسلہ نسب 34 واسطوں سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔

سید صاحب کی تعلیم کے حوالے سے بھی روایتیں خاموش ہیں کہ کب انہوں نے باقاعدہ تعلیم شروع کی۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔ تراجم علماء حدیث ہند میں لکھا ہے کہ عہد طفولیت لہولعب میں گزر رہا تھا کہ اسی زمانے میں ان کے والد سید جواد علی کے ایک برہمن دوست ان سے ملنے ان کے گھر آئے تھے۔ وہ ان کو لہولعب میں مصروف دیکھتے۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ میاں تم اتنے بڑے ہوگئے ہو اور ابھی تک کچھ پڑھا نہیں۔ دیکھو تمہارے خاندان میں سب مولوی ہیں مگر تم جاہل ہو۔ یہ نصیحت کارگر ہوئی۔ والد سے عربی فارسی زبان کی تحصیل کی اور یہاں سے تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا تو وہ دہلی میں آ کر ختم ہوا۔

انہوں نے اپنے والد سے عربی فارسی کے مبادی تک ہی تعلیم حاصل کی کیوں کہ ان کی رسائی یہیں تک تھی۔ تشنگی علم کی برآوری کو نہ دیکھتے ہوئے اپنے دوست بشیر الدین عرف مولوی مراد علی کے ہمراہ والد کی اجازت کے بغیر رات کو گھر سے نکل کر صادق پور پٹنہ میں مولوی شاہ محمد حسین کی درس گاہ میں پہنچے۔ یہاں انہوں نے مشکوۃ شریف اور ترجمہ قرآن پڑھا۔ اس وقت ان کی عمر 17 سال تھی۔ یہاں وہ چھ مہینے ٹھہرے۔ اسی دوران سید احمد شہیدؒ کا قافلہ پٹنہ وارد ہوا۔ جہاں انہوں نے پہلی مرتبہ شاہ اسماعیل دہلوی کا وعظ سنا اور ان لوگوں سے ملتے رہے۔ یہاں سے ان کی طبیعت دہلی کی طرف مائل ہوئی جس کی اہمیت شیراز ہند کی تھی اور جہاں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مسند درس بچھی ہوئی تھی۔ ان سے استفادے کے شوق نے انہیں دہلی آنے پر مجبور کیا چنانچہ وہ اور ان کے دوست پٹنہ سے دہلی روانہ ہوئے۔ زادراہ کی قلتوں اور پیادہ پا مسافت کی صعوبتوں کی وجہ سے تشنگان علوم نبوت کئی سال بعد دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک شاہ عبدالعزیز دہلوی کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے خلیفہ ونواسے شاہ محمد اسحاق صاحب سے استفادہ کرنے سے پہلے دوسرے علماء سے ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اس طرح خود کو تیار کر کے شاہ محمد اسحاق کے درس میں شریک ہوئے۔ دہلی میں انہوں نے حدیث کے علاوہ فقہ وتفسیر کا علم بھی حاصل کیا۔ حدیث کے ساتھ تفسیر وفقہ

پر بھی ان کی گہری دست رس تھی۔ کثرت سے مطالعہ کی وجہ سے ان کے قلب وذہن میں وسعت تھی۔ مطالعہ کا شوق دوران تعلیم ہی پیدا ہو گیا تھا چنانچہ دہلی میں قیام کے دوران انہوں نے اپنے کتب خانہ کے علاوہ لال قلعہ کے شاہی کتب خانہ، شاہ عبدالعزیز کے کتب خانہ، لکھنؤ میں سید حامد حسین کے کتب خانہ وغیرہ سے بھر پور استفادہ کیا۔ مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ جب آپ راولپنڈی جیل میں بند تھے تو وہاں سرکاری کتب خانہ سے کتابیں منگا کر پڑھتے تھے۔

سید صاحب نے تعلیم کی تکمیل کے بعد دہلی ہی میں مسجد اورنگ آبادی حلقہ درس قائم کیا جو اگلے ساٹھ برس تک مسلسل قائم رہا۔ ابتداء کے بارہ برس جملہ علوم کی کتابیں کسی استثنا کے بغیر طالبین علم کو پڑھاتے رہے لیکن بعد میں خود کو صرف تفسیر، حدیث اور فقہ تک محدود کر لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ طالب علموں کو ان سے استفادہ کا خوب موقع میسر آیا۔ درس وتدریس کی مشغولیات کی وجہ سے انہیں تصنیف کے مواقع کم میسر ہوئے۔ پھر بھی ان کے فتاویٰ تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے فتاوے ''فتاویٰ نذیریہ'' کے نام سے شائع بھی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ردتقلید میں ''معیار حق'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

سید صاحب کا دہلی میں مسند درس قائم کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں طالبان علوم نبوت نے ان سے فیض حاصل کیا اور عالم میں پھیل گئے۔ ان کے حلقۂ درس میں ہند اور بیرون ہند کے طلبہ شامل تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایسے نام ملتے ہیں جن کا شمار اپنے وقت کے ائمہ فن میں ہوتا تھا۔ حافظ ابومحمد ابراہیم آروی (مؤسس مدرسہ احمدیہ آرہ بہار)، شاہ عین الحق پھلواری، علامہ شمس الحق ڈیانوی، (صاحب عون المعبود) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، حافظ عبداللہ غازیپوری، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری (صاحب تحفۃ الاحوذی) وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے سوانح نگار نے حیاۃ بعدالممات میں ان کے ہزاروں طلبہ میں سے پانچ سو کے نام لکھے ہیں۔

علاوہ ازیں سید صاحب کی اس خوبی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ خطابت کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے اس کو محض ہدایت انسانیت کے لیے اختیار کیا تھا۔ ان کا وعظ عام فہم اور سلیس وسادہ ہوتا تھا۔ بیان میں صفائی اور سادگی ہوتی تھی۔ آپ کی تقریر کا سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ سید صاحب درس وتدریس میں سیکھنے اور سکھانے کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ طلبہ میں یہ تأثر قائم رہے کہ سید صاحب صرف بولتے نہیں سنتے بھی ہیں۔ سید صاحب ہنگامہ غدر کے شکار بھی ہوئے اور قید وبند کی صعوبتوں میں گرفتار بھی۔ ان پر بھی وہابیت کا مقدمہ چلا۔ اس سلسلے میں راولپنڈی جیل میں ایک سال قید رہے۔ یہاں بھی تعلیم وتعلم کا مشغلہ جاری رکھا۔ ایک سال بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔ ان کے مخالفین نے انہیں غدار وطن کہا اور انگریز نوازی کے طعنے دیے مگر حمیدہ اوصاف کی وجہ سے صبر کا دامن تھامے رکھا۔

سید صاحب کو 1315ھ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا مگر اس پر انہوں نے کبھی فخر نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلماء کہے تو کیا۔ میں نہایت خوش ہوں کہ لوگ مجھے میاں صاحب کہتے ہیں۔ بھائی سادات کے لیے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔

سید صاحب نے 1300ھ میں حج بیت اللہ کا سفر بھی کیا تھا۔ میاں صاحب نے وہاں بھی مسند درس جمائے رکھی اور وعظ وارشاد کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ اپنے وعظ میں شرک وبدعت سے اجتناب، عمل بالحدیث اور غیر شرعی رسومات سے اجتناب کی ترغیب دیتے رہے۔ مخالفین نے وہاں بھی انہیں نہ چھوڑا اور رنج وغم کا باعث بنے۔

سید صاحب نے تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ دس رجب بروز دوشنبہ 1320ھ مطابق 13/اکتوبر 1902ء کو بعد نماز مغرب آپ فوت ہوئے۔ اگلے روز صبح میں جنازہ ہوا اور تدفین عمل میں آئی۔ دہلی و اطراف کے تمام اہل علم صوفیاء اور علماء دین نے شرکت کی۔

23.6 مولانا عبدالحئی فرنگی محلی

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی تاریخ علماء فرنگی محلی کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ اس خانوادے کے علماء نے علم دنیا کی جو خدمت کی ہے اور جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اس کا مقابلہ ہندوستان کا دوسرا خانوادہ نہیں کرسکتا۔ خاندانِ فرنگی محل لکھنؤ کی شہرت علمی بالخصوص مرکز علوم عقلی کے بانی و موسس، حضرت مولانا نظام الدین سہالوی (وفات 1161ھ/1848ء) ہیں۔ ان کے دور سے ہی یہ خانوادہ ہندوستان کا مرکز اور معروف علمی خانوادہ رہا ہے۔ یہی اُس درس نظامی کے بانی ہیں جو دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بطور آج بھی جزوی ترمیم کے ساتھ رائج ہے۔ معقولات، منطق اور فلسفہ میں اسی خاندان نے اپنے عہد میں عالمی سطح کے صاحبانِ فن پیدا کیے۔ حدیث، فقہ، دیگر عربی علوم وفنون میں بھی ہندوستان کا یہ بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ دہلی میں ولی الہٰی نظام تعلیم جس میں قرآن وحدیث کو نمایاں فوقیت حاصل تھی بلکہ قرآن وحدیث ہی کے لیے شہرۂ آفاق تھا، اس کی علمی شعاعوں میں بھی درس نظامی اور اساتذۂ فرنگی محل کی علمی تابناکیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس خانوادہ کے آخری عہد میں علامہ عبدالحئی فرنگی محلی کی ذات گرامی تھی جس نے دونوں مکتب فکر عقلی ونقلی کو ایک مرکز پر جمع کردیا۔ علماء فرنگی محل کی خوبی یہ ہے کہ فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے بھی تحقیق وتدقیق سے کام لیا اور بہت سے مسائل میں علماء حنفیہ سے الگ راہ اپنائی۔ خود مولانا عبدالحئی کا مزاج یہ تھا کہ انہیں جب صحیح احادیث ملتی تو وہ اس پر عمل پیرا ہوتے اور اس کی نشرواشاعت بھی کرتے۔ وہ تقلید جامد کے خلاف تھے۔ ان کی تحریں علماء تحقیق کے لیے مشعل راہیں۔

ابوالحسنات، مولانا عبدالحئی ابن مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی 26 ذی قعدہ بروز سہ شنبہ 1264ھ 1847ء کو باندہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ایوب انصاری سے آپ کا شجرۂ نسب ملتا ہے۔ والد گرامی، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 4 سال کی عمر میں باندہ سے لکھنؤ آگئے۔ یہاں آپ کی باضابطہ تعلیم شروع ہوئی۔ حافظ قاسم علی لکھنوی سے قرآن کریم کا حفظ شروع کیا اور دس برس کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا لیکن والد صاحب کی نقل مکانی کی وجہ سے یہ مبارک کام جونپور میں مکمل ہوا۔ یہاں انہوں نے سب سے پہلے جامع مسجد میں نماز تراویح میں قرآن مجید سنایا۔ والد کے اکلوتے فرزند تھے، ناز ونعم میں پرورش ہوئی اور بہت اہتمام سے تعلیم وتربیت کے مراحل طے ہوئے۔

عربی وفارسی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر تفسیر وحدیث، فقہ واصول وغیرہ تمام عقلی ونقلی علوم کی کتابیں والد گرامی سے پڑھیں۔ 17 سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ اور اپنی عملی زندگی کا آغاز شہر حیدرآباد سے شروع کیا جہاں وہ تعلیم کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ یہاں وہ ایک مدت تک رہے۔ اسی دوران آپ نے 1279ھ اور 1292ھ میں آپ نے دو حج کیے۔ دوسرے حج کے سفر میں تین ماہ مکہ معظمہ میں قیام کر کے عرب علما ومشائخ سے علم حدیث حاصل کیا، ان کے عرب شیوخ میں شیخ احمد بن زین دحلان شافعی، مفتی محمد بن عبداللہ بن حمید حنبلی، شیخ محمد بن محمد الغربی شافعی اور شیخ عبدالغنی بن ابی عبدالعمری الحنفی دہلوی وغیرہم ہیں۔ ان شیوخ سے انہوں نے سند حدیث کی اجازت حاصل کی۔ علم حدیث میں آپ کی مہارت وتحقیق کی تعریف آپ کے اساتذہ وشیوخ نے بھی اپنی اسناد میں کی ہے۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک صاحب زادی تھیں۔ بقیہ اولاد کا صغرسنی ہی میں انتقال ہوگیا۔ ریاست حیدرآباد نے 250 روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، اس پر قناعت تھی۔ دوسرا کوئی

ذریعہ معاش نہیں تھا۔

صرف 39 سال کی عمر میں متقدمین علمائے کرام اور محققین کے طرزِ تصنیف وتحقیق کے مطابق 114 ضخیم کتابیں تصنیف وتالیف کردیں۔ آپ خود بیان کرتے ہیں کہ بیک وقت کئی تصانیف میں مشغول ومصروف رہتے، سفر وحضر، صحت ومرض، موسم کی شدت اور حالات وماحول کی سردی گرمی کوئی بھی چیز آپ کے عزم واستقلال کو متاثر نہ کرسکی۔ البتہ بیک وقت کئی ایک تصانیف کی عادت نے یہ نقصان پہنچایا ہے کہ بہت سی تصانیف، ناتمام رہ گئیں اور کچھ تصانیف صرف مسودہ یا مخطوطہ کی شکل میں باقی ہے جن کی طباعت کی شکل نہ نکل سکی۔ ناتمام کتابوں کے مسودے اور دیگر مخطوطات جو ضائع ہونے سے بچ سکے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری ''عبدالحئی کلیکشن'' میں محفوظ ہیں۔

تصنیفات

(1) تبیان، تکملة المیزان، امتحان الطلبة ، شرح تکملة المیزان۔ عربی وفارسی زبان میں یہ علم صرف کے قواعد کی چار کتابیں ہیں (۲) النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر۔ امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب حدیث ''جامع صغیر'' پر نہایت بیش قیمت تعلیقات وحواشی ومفید اضافات، مطبوع ہوچکے ہیں۔

مقدمة الهداية ۔ مذيلة الدراية۔ یہ دونوں فقہ حنفی کی مشہور کتاب قدوری کی شرح ہے۔

مقدمة السعاية۔ شرح وقایہ کی عربی شرح۔ عمدة الرعاية۔ یہ بھی شرح وقایہ کے نصف اول کی شرح ہے۔

(1) الاجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة۔ فقہ اسلامی کے ائمۂ اربعہ کی تقلید کی حمایت میں دس اعتراضات کا عقلی ونقلی جواب ہے۔

(2) طبقات الحنفيه ، الفوائد البهية فى تراجم الحنفية۔ یہ دونوں علمائے احناف سے متعلق حوالہ جاتی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔

(3) الرفع والتكميل فى الجرح التعديل۔ ظفر الأماني ۔ علم حدیث سے متعلق یہ بنیادی کتابیں علمی حلقوں میں معروف ومقبول ہیں۔

حاشیہ حصن حصین ۔اقامة الحجة علىٰ أن الأكثار فى العبادة ليست ببدعة۔

آپ کی سب سے زیادہ کتابیں علم منطق وفلسفہ اور کلام سے متعلق ہیں جو مستقل تصنیف وتالیف، ترجمہ، تحشیہ، تعلیق اور تقدیمات وغیرہ کی شکل میں ہیں۔ خانوادۂ فرنگی محل کے علماء ومشائخ اور اساتذہ وطلبہ پر فلسفہ اور کلام کا رنگ غالب تھا جس کے اثرات ان کی تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس پر واضح شکل میں نظر آتے ہیں۔

مطالعہ بہت زیادہ کرتے تھے جس کا اثر آپ کے اعضاوجوارح پر بھی پڑتا تھا مگر مطالعہ میں آپ کوئی کمی نہ آنے دیتے۔ 20 ربیع الاول 1304ھ/ 1886ء بروز دوشنبہ آپ کا انتقال ہوا۔ فرنگی محل لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

23.7 سید امیر علی

سید امیر علی ایک مشہور قانون داں اور ایک مسلم قائد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کی خصوصیت واہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے سو عظیم مسلم شخصیات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے والد ماجد کا نام سید سعادت علی تھا جو اپنے عہد کے عالم وفاضل اور دانشور تھے۔ انہوں نے طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، ان کا آبائی وطن ایران کا شہر مشہد تھا۔ عہد قدیم سے ہی ان کا خاندان بادشاہوں کے یہاں ملازم تھا۔ چنانچہ 1739ء میں جب نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو سید امیر علی کے اجداد بھی نادر شاہ کی فوج کے ساتھ ایران کے شہر مشہد سے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کا خاندان ایک مشہور شیعہ خاندان تھا۔ سید امیر علی کا خاندان ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہونے کی وجہ سے ہندوستان آکر بھی حکومت مغلیہ اور نوابان ہند سے وابستہ رہا، مسلمانوں کے زوال کے بعد برطانوی حکومت سے تعلقات استوار ہو گئے۔

سید امیر علی کی پیدائش /6 اپریل 1849 کو بمقام کٹک اڑیسہ میں ہوئی، یہ پانچ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے، امیر علی کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد ان کے والد اپنے خاندان کے ساتھ اڑیسہ سے بنگال کے شہر کولکاتہ منتقل ہو گئے۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد مغربی بنگال کے شہر چن شورا آئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

پیشے کے اعتبار سے امیر علی ایک وکیل تھے جنہوں نے مسلم مسائل کو حل کرنے میں نہایت دلچسپی دکھائی، اور ساتھ ہی ساتھ برطانوی عہد حکومت میں مسلمانوں کے سیاسی مسائل کی طرف بھی توجہ دی اور انہوں نے مسلم تاریخ پر کئی کتابیں تصنیف کیں، ان کا شمار آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

سید امیر علی نے اپنی تعلیم کا آغاز بنگال کے شہر کولکاتہ سے کیا، حسب دستور سید امیر علی کے والد نے گھر پر ہی ایک عالم دین کے ذریعہ ان کو قرآن مجید اور عربی وفارسی کی تعلیم دلوائی، امیر علی کے والد نے اپنے تمام بچوں کو انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی اور عصری علوم کے مواقع سے مکمل فائدہ اٹھایا۔ ان کے تمام بھائیوں نے کولکاتہ کا مشہور ادارے مدرسہ عالیہ (جو برطانوی عہد میں مدرسہ کلکتہ کے نام سے جانا جاتا تھا) سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہگلی کالجیٹ اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ سید امیر علی نے کالج میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور اپنی علمی صلاحیت کی بناء پر دوران تعلیم حکومت برطانیہ سے بہت سارے مقابلہ جاتی وظائف حاصل کیے، حکومت برطانیہ نے ان کے خاندان کو تعلیمی سہولت فراہم کی جس سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کے والد کے اس اقدام سے مسلم سماج کو نہایت حیرانی ہوئی کیونکہ اس دور میں ہندوستانی مسلمانوں میں عام طور پر انگریزوں کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی اور برطانوی حکومت کے ذریعہ دی جانے والی کسی بھی طرح کی مراعات قبول نہیں کی جاتی تھیں۔

سید امیر علی نے 1867ء میں کولکاتہ یونیورسٹی سے گریجویشن اور 1868ء میں تاریخ کے مضمون میں ایم اے اور 1869ء میں قانون (LLB) کی ڈگری حاصل کی، اس کے معا بعد کولکاتہ میں ہی وکالت شروع کی اور اس میں انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے خوب نام کمایا، اپنی قابلیت کی بناء پر وہ اس وقت کے نامور مسلم وکیلوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ کولکاتہ میں کچھ عرصہ وکالت کے بعد وہ 1869ء میں ہی اعلیٰ تعلیم

کے لیے برطانیہ چلے گئے اور 1873ء تک وہاں مقیم رہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر ہونے والے مباحثوں میں شرکت کرتے رہے اور اس دوران انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر لکچر دیے نیز برطانیہ میں قیام کے دوران انہوں نے شرفاء سے تعلقات استوار کیا۔ وہاں رہ کر انہوں نے آزادی کے معنی و مفہوم سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کی، اسی دوران انہوں نے ہندوستان سے متعلق تمام اعلی عہدیداران وافسران سے تعلق پیدا کیے، جن میں جان برائٹ، ہنری اور ان کی اہلیہ سینٹ فاسٹ شامل ہیں۔ 1873ء میں برطانیہ سے واپسی کے بعد انہوں نے سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ساتھ ساتھ کولکاتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی، اس کے اگلے سال وہ کولکاتہ یونیورسٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ پریزیڈنسی کالج کولکاتہ میں اسلامی قانون کے لیکچرر ہو گئے۔

امیر علی نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا لہذا اس مقصد کے لیے انہوں نے کولکاتہ میں قیام کے دوران 1877ء میں ایک سیاسی تنظیم ''سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن'' کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا بلکہ فکر جدید کی تشکیل بھی ہوئی، اور اس تنظیم سے سید امیر علی 25 سال تک وابستہ رہے اور مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے کام کرتے رہے۔

1878ء وہ بنگال لجسلیٹیو کونسل کے ممبر چنے گئے، پھر 1880ء میں ایک سال کے لیے انہوں نے دوبارہ برطانیہ کا دورہ کیا۔ 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں وہ کولکاتہ یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر رہے، 1883ء میں وہ گورنر جنرل کونسل کے ممبر بنائے گئے، 1890ء سے 1904ء تک وہ کولکاتہ ہائی کورٹ کے جج رہے۔

1904ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر برطانیہ میں قیام کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران 1908ء میں مسلم لیگ کی لندن شاخ کی بنیاد رکھی اور اس کے صدر بنے، حالانکہ یہ تنظیم مسلم لیگ کی ایک شاخ کے طور پر جانی جاتی تھی لیکن حقیقتاً یہ آل انڈیا مسلم لیگ سے بالکل الگ تھی، 1909ء میں وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو Judicial committee of the Privy Council کے ممبر بنائے گئے۔ 1910ء میں انہوں نے برطانیہ میں پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کے لیے ایک مسجد فنڈ قائم کیا، برطانیہ میں مسجد کے قیام کے بعد سید امیر علی نے اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دی اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا شروع کیا۔

بعد میں جب خلافت تحریک چلی تو اس کی حمایت کی اور انہوں نے تحریک خلافت کو عالمی پیمانے پر متعارف کرایا اور جنوب ایشیاء کے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کے لیے اہم رول ادا کیا۔

سید امیر علی اگرچہ سیاسی انسان تھے لیکن ان کی اصل خدمت اور کارنامہ سیاسی نہیں بلکہ تصنیف و تالیف ہے۔ اپنی آخری عمر میں وہ سیاسی سرگرمیوں سے الگ ہو گئے اور اپنی تمام تر سرگرمیوں کا رخ اسلامی تصنیف و تالیف کی طرف موڑ دیا۔ اس کے ذریعہ انہوں نے اسلام کی روشن تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا، مسلم خواتین کی حقوق کے آواز بلند کی اور مسلم شخصی قانون (مسلم پرسنل لاء) کو عہد جدید کے اعتبار سے ترتیب دیا۔

برطانوی عہد کے مسلمانوں کے سیاسی قائد اور معروف اسلامی اسکالر سید امیر علی کا انتقال /4/ اگست 1928ء میں برطانیہ میں ہوا۔

انہوں نے کئی تصنیفات بطور یادگار چھوڑی ہیں، ان کی تمام تصنیفات اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہیں، انہوں نے سب سے پہلی کتاب 24 سال کی عمر میں تصنیف کی جب وہ برطانیہ میں مقیم تھے۔اس کا نام A Critical examination of the life and teaching of Mohammad (1873) ہے۔

ان کی مشہور کتابوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(1) The Personal law of Mohammadans (1880)

(2) The sprit of Islam (1891)

(3) Ethics of Islam (1893)

(4) Islam (1906)

(5) The legal position of women in Islam (1912)

(6) A Short history of saracens (1898)

23.8 اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی

10 شوال 1272ھ/14 جون 1856ء کو ہندوستان کے معروف شہر، بریلی میں مولانا احمد رضا بریلوی پیدا ہوئے۔آپ کا پیدائشی نام ''محمد'' رکھا گیا، تاریخی نام ''المختار'' (1272ھ) تجویز کیا گیا جب کہ آپ کے دادا، مولانا رضا علی خاں بریلوی نے ''احمد رضا'' نام تجویز فرمایا جس سے آپ مشہور ہوئے۔

مولانا احمد رضا بریلوی کے آبا وَ اجداد قندھاری پٹھان تھے۔عہد مغلیہ میں لاہور آ کر قیام پذیر ہوئے اور ایک مدت کے بعد دہلی آئے اور دونوں جگہ، معزز مناصب پر فائز رہے۔شجاعت جنگ جناب محمد سعید اللہ خاں اِس خانوادہ کے سب سے بڑے عہدے دار تھے۔ان کے صاحب زادے سعادت یار خاں مغل عہد حکومت میں روہیل کھنڈ ایک مہم پر روانہ کیے گئے اور فتح یابی کے بعد بریلی کے صوبے دار ہوئے۔ان کے تین صاحب زادگان تھے۔اعظم خاں، معظم خاں اور مکرم خاں اور یہ سب بڑے منصب دار تھے۔بڑے صاحب زادے محمد اعظم خاں خانوادۂ رضویہ بریلی کے مورث اعلیٰ ہیں۔ان کے صاحبزادے مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا احمد رضا بریلوی کے دادا اور مولانا نقی علی خاں قادری بریلوی آپ کے والد گرامی ہیں۔

مولانا احمد رضا بریلوی نے ابتدائی اور تمام درسی کتابوں کی تعلیم اپنے والد ماجد، مولانا نقی علی خاں بریلوی (وصال 1297ھ/1880ء) سے حاصل کی۔1869 میں کم عمری کے زمانے میں ہی تمام درسیات سے فراغت پائی۔آپ نے میزان ومنشعب وغیرہ جناب مرزا غلام قادر بیگ بریلوی سے پڑھیں۔آپ کے اساتذہ کی فہرست بہت مختصر ہے،جن میں چند نام یہ ہیں:

مرزا غلام قادر بیگ بریلوی، مولانا عبدالعلی ریاضی داں رامپوری، سید شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی، مولانا نقی علی بریلوی، سید آلِ

رسول قادری مارہروی۔

1877 میں مارہرہ ضلع ایٹہ، اتر پردیش میں اپنے والد اور مولانا عبدالقادر برکاتی کے ساتھ سید شاہ آل رسول مارہروی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں بیعت ہوئے۔ مرشد طریقت نے پہلی ہی ملاقات میں اجازت اور خلافت عطا کر دی۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے براہ راست علم حاصل کیا تھا، مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے 1878ء میں پہلی مرتبہ اور 1905ء میں دوسری مرتبہ حج و زیارت کا سفر کیا۔ ان دونوں سفروں کے دوران انہوں نے حرمین شریفین کے جید علماء سے ملاقاتی کیں اور ان سے استفادہ کیا۔ وہاں کے علماء کے ساتھ علمی مذاکرات میں حصہ لیا اور اپنی کلامی، فقہی و علمی بصیرت سے علمائے حجاز کو متاثر کیا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی ایک کامیاب معلم تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا، البتہ کسی مخصوص درس گاہ سے وابستہ نہ ہوئے۔ طلبہ علم حاصل کرنے کے لیے آتے انہیں اپنے گھر پر ہی پڑھاتے۔ اس طرح ہزاروں کی تعداد میں طالبان علم نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے علم و فضل سے استفادہ کیا اور اپنے اپنے علاقوں میں جا کر علم کے چراغ روشن کیے۔

آپ کے مشہور تلامذہ و خلفا میں درج شدہ حضرات سرِ فہرست ہیں: مفتی امجد علی اعظمی رضوی، مصنف بہارِ شریعت، مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، مولانا سید سلیمان اشرف علی گڑھی، مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، مولانا برہان الحق جبل پوری، مولانا ظفرالدین بہاری مصنف حیات اعلیٰ حضرت، مولانا حسن رضا خاں بریلوی، مولانا حامد رضا خاں بریلوی، مولانا مصطفےٰ رضا نوری بریلوی، مولانا سید محمد اشرفی محدث کچھوچھوی اور قاضی عبدالوحید فردوسی عظیم آبادی۔

آپ نے فتاویٰ کی شکل میں نقلی اور عقلی علوم و فنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ علم تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، تصوف، منطق و فلسفہ، نثر و نظم اور تاریخ و سیر سبھی علوم و فنون میں معیاری کتابیں آپ نے یادگار چھوڑی ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔

مولانا احمد رضا خاں علوم عالیہ اور علوم آلیہ دونوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ فقہ و فتاوی سے انہیں خاص شغف تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے مسلمانوں میں دینی تعلیم عام کرنے کے لیے 1904ء میں مدرسہ منظر الاسلام بریلی قائم کیا، جس کا علمی فیضان آج بھی جاری ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کامیاب مدرس اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مبلغ بھی تھے اور انہوں نے دین کی خدمت و تبلیغ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ اپنے زمانے کی روایت کے مطابق مباحثوں اور مناظروں میں بھی حصہ لیا۔ مولانا احمد رضا خاں کو مسلمانوں کے دین و ایمان کی بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ چناں چہ جب شدھی تحریک نے زور پکڑا تو انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے جماعت رضائے مصطفےٰ قائم کی، جس نے اس زمانے میں مسلمانوں کو ضلالت و گمراہی میں پڑنے سے بچانے کے لیے قابل ذکر کوششیں کیں۔

حضرت مولانا احمد رضا کی ذات اور شخصیت جس خاص خوبی کی وجہ سے معروف و مقبول ہے، وہ محبت و اطاعت رسول اور عشق و اتباع رسول ہے۔ آپ کی پوری زندگی شریعت محمدی و سنت نبوی کی پابندی میں گزری ہے جس پر عشق مصطفےٰ کا غلبہ رہا ہے۔ حدائق بخشش آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ اور آپ کے عشق رسالت کا نمونہ ہے۔ آپ کے دینی و علمی و فقہی کارنامے اور تجدیدی خدمات کی وجہ سے متحدہ ہندوستان کے جمہور علمائے اہل سنت نے آپ کو چودھویں صدی کا مجدد تسلیم کیا ہے اور ''امام اہل سنت'' کے خطاب سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے جب کہ اہل محبت

وعقیدت کے حلقے میں ''اعلیٰ حضرت'' سے آپ کو شہرت حاصل ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کثیر التصانیف شخصیت ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں۔

1۔ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں نے مختلف تفسیری حواشی بھی لکھے ہیں۔

2۔ فتاوی رضویہ 21 جلدوں میں مولانا احمد رضا خاں کے فتاوی کا مجموعہ۔ اس کے علاوہ انہوں نے فتاوی کے مختلف مجموعوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

3۔ الملفوظ: مولانا احمد رضا خاں کے ملفوظات کا مجموعہ (چار حصوں میں شائع ہوا ہے) کتابوں اور رسالوں کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بڑی تعداد میں اپنے خلفاء اور تلامذہ بھی چھوڑے ہیں، جنہوں نے ان کے بعد بھی ان کے مشن کو جاری رکھا۔ ان میں سے چند کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ 28 اکتوبر 1921ء کو بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کا انتقال ہوا اور وہیں پر محلّہ سوداگران میں مدفون ہوئے۔

23.9 علامہ شبلی نعمانی

شبلی ہندو پاک کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی علمی وقلمی رہنمائی کی وجہ سے مسلمانوں کو سمت راہ کے تعین میں آسانی ہوئی۔ رفقاء سرسید میں ان کا نام اس لیے معتزز ہے کہ انھوں نے بحیثیت عربی استاد طلبہ کے ذہن و دماغ کو اسلامی فکر کی طرف اس وقت موڑا جب مغربی افکار وخیالات ہندی معاشرہ پر اپنا اثر ورسوخ جما چکے تھے اور طلبہ کے کچے ذہن اس سے پراگندہ ہو رہے تھے۔

شبلی 3 جون 1857ء ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ سال ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کرب ناک تھا۔ اسی سال برصغیر ہندو پاک سے مسلم حکومت کا بدست انگریز خاتمہ ہوا۔ گھرانے میں ہر طرف تعلیم وتعلم کا چرچہ تھا۔ والد ماجد شہر کے نامور وکیلوں میں سے تھے۔ وکالت کے علاوہ تجارت بھی کرتے تھے۔ شکر کے کارخانے اور تیل کی کوٹھیوں کے مالک بھی تھے۔ ان کا شمار علاقہ کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی تیس ہزار سے زیادہ تھی۔ وہ سرکار کو چھ ہزار سالانہ مالگذاری دیتے تھے۔ ان کے گھرانے میں تعلیم وتعلم کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ ان کے جد اعلیٰ شیخ کریم الدین گورکھپور میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے تو دادا منشی حسن علی اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڈھ میں مختار تھے۔ اس روایت کو ان کے والد نے بھی برقرار رکھا اور اپنے سبھی بچوں کو عصری تعلیم کی تحصیل کا اس عہد میں موقع فراہم کیا جب کہ مسلمان نہ صرف انگریزوں سے نفرت کرتے تھے بلکہ انگریزی تعلیم کی حرمت کے قائل تھے۔ مولانا کے بھائی مہدی حسن نے علی گڑھ سے فراغت کے بعد انگلستان سے بیرسٹری کی۔ تیسرے بھائی اسحاق صاحب بھی الہ آباد میں وکیل تھے اور چوتھے بھائی مولوی محمد جنید صاحب نے بھی وکالت کی پڑھائی کی تھی اور منصفی کی نوکری پر فائز رہے۔

شبلی کی تعلیم چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی۔ قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابوں سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ حکیم عبداللہ جے راجپوری ان کے پہلے معلم مقرر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عربیہ اسلامیہ اعظم گڈھ میں مولوی فیض اللہ صاحب سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہاں سے وہ مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں تعلیم حاصل کرنے گئے جہاں مولانا فاروق چریا کوٹی صاحب کی

تدریس کا دور دور تک شہرہ تھا۔ یہاں پر انہوں نے روایتی تعلیم کا سلسلہ پورا کیا۔ اس کے بعد دستور زمانہ کے مطابق مشاہیر فن سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اسی سلسلے میں 1870ء میں لکھنؤ گئے اور عبدالحی فرنگی محلی سے کسب فیض کیا۔ رام پور میں انھوں نے مولانا ارشاد حسین صاحب سے فقہ اور اصول میں مہارت پیدا کی۔ 1876 میں سہارن پور میں مولانا احمد علی سہارن پوری سے علم حدیث میں گہرا درک حاصل کیا۔ لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنی پوری صاحب سے عربی ادب پڑھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے مطابق شبلی نے کچھ دنوں تک جون پور میں بھی تعلیم حاصل کی تھی مگر اس کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں اس کے علاوہ انھوں نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور کچھ دنوں تک ضلع بستی میں وکالت بھی کی تھی مگر مزاج کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے اس پیشہ کو خیرآباد کہہ دیا۔

شبلی کے علمی کارناموں کی جلا علی گڑھ میں سرسید اور ان کے رفقاء کی سرپرستی میں ہوئی۔ یہیں پر انھیں سمت راہ ملی اور ملت کی زبوں حالی کا احساس ہوا۔ مسلمانوں کی بے علمی اور جہالت کا ادراک بھی یہاں ہوا۔ غرض ملت کے درد کے مداوا کا جذبہ بھی انھیں علی گڑھ تحریک سے ہی ملا۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے اپنے لکھنے کی ابتدا علی گڑھ سے کی۔ وطن میں رہتے ہوئے انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ رسائل کی شکل میں ان کی بعض ابتدائی تحریروں کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے لیکن علی گڑھ آنے کے بعد انھیں مقصد مل گیا چنانچہ علی گڑھ کی سولہ سالہ پروفیسری کے دوران انھوں نے الفاروق، سیرت نعمان، الغزالی، المامون، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم اور سیرۃ النبی جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ مضامین و مقالات اس پر اضافہ ہیں جو کتابی شکل میں شائع بھی ہو گئے ہیں۔ سبھی کتابیں علی گڑھ میں تصنیف نہیں ہوئیں لیکن بیشتر کا تعلق وہیں سے ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اصلاح نصاب کے تعلق سے جو کچھ ریاست بھوپال اور ریاست حیدرآباد نیز ڈھاکہ یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں ان کی اہمیت و افادیت کسی بھی طرح کم نہیں۔ نصاب تعلیم میں اصلاح کی غرض سے ندوۃ العلماء میں جو کچھ خدمات انجام دیں وہ ہماری تاریخ کا نہ صرف روشن باب ہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں انقلابی قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزی، ہندی اور سنسکرت کو نصاب کا جز بنانا اس زمانے میں جرأت مندانہ قدم تھا۔ اس کے علاوہ ان کے علمی کارناموں میں شبلی نیشنل کالج اور دارالمصنفین کا قیام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ شبلی نیشنل ڈگری کالج شمالی ہند میں مسلمانوں کے بڑے اداروں میں شامل ہے، جہاں علم جدید کے امہات اور علم کے بیشتر شعبے قائم ہیں۔ دارالمصنفین کی اہمیت نہ صرف ہند و پاک میں ہے بلکہ اپنے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے دنیا جہان میں اس کی شہرت ہے۔ اس ادارے کو شبلی نے خود قائم نہیں کیا تھا لیکن انھوں نے اس کا نہ صرف خاکہ تیار کیا تھا بلکہ طریقۂ کار کا تعین بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے انتقال کے ایک سال بعد ان کے شاگردوں نے اس ادارے کو انھیں کے وقف کیے ہوئے باغ و بنگلہ بہ مقام اعظم گڈھ میں قائم کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس ادارہ سے اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن نیز اسلامیات و اخلاقیات پر مستقل تحقیقی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ سید سلیمان ندوی، علامہ حمید الدین فراہی، شاہ عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین ندوی وغیرہم اس ادارے کے آفتاب و ماہتاب تھے جنہوں نے شبلی کے مقاصد کو اپنے قلم کے ذریعہ آگے بڑھایا۔

شبلی نے 18 رنومبر 1914ء میں 57 سال کی عمر میں بمقام اعظم گڈھ میں وفات پائی اور دارالمصنفین کے احاطہ میں جو اس وقت ان کا باغ و بنگلہ تھا میں مدفون ہوئے۔ 57 سال کے قلیل عرصہ میں انھوں نے جس طرح کی علمی و قلمی خدمات انجام دی ہیں وہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اس طرح کی عبقری شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

23.10 مولانا اشرف علی تھانوی

برصغیر ہندوپاک میں جن علماء کو لازوال شہرت حاصل ہوئی ان میں مولانا اشرف علی تھانوی کا نام بھی نمایاں ہے۔انھوں نے تحریرو تقریر اور قلم وعمل کے ذریعہ کئی نسلوں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایسی راہ عمل چھوڑ گئے کہ جس پر چل کر انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔علم وحکمت کے ذریعہ سے انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور اخلاق کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ جو ان سے ملا ان کا ہوکر رہ گیا۔اصلاح امت کے حوالے سے انہیں حکیم الامت کا خطاب ملا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ضلع مظفر نگر اتر پردیش کے قصبہ تھانہ بھون میں 19 اگست 1863ء کو پیدا ہوئے۔معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔خاندان میں علم وعمل اور تعلیم وتعلم کا چرچا تھا۔ان کی ولادت کے بعد گھر والوں نے ان کا نام عبدالغنی رکھا۔نانیہالی رشتہ دار حافظ غلام مرتضی پانی پتی جو اہل تصوف سے تھے اور کافی شہرت کے حامل تھے، نے اشرف علی کا نام دیا۔مولانا آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہوئے۔والد ماجد کا نام عبدالحق فاروقی تھا۔ان کا شمار تھانہ بھون کے بڑے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔وہ فارسی زبان میں کافی استعداد رکھتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے ابتدائی تعلیم والد ماجد، ماموں جان واجد علی اور مولانا فتح محمد وغیرہم سے حاصل کی۔عربی فارسی کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ تھانہ بھون میں ہی حافظ حسین علی میرٹھی کی نگرانی میں قرآن مجید کم سنی میں حفظ کرلیا۔ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1295ھ میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا جہاں پر مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند محمود حسن، اور مولانا یعقوب نانوتوی کی مسند درس بچھی ہوئی تھی۔ان ائمہ کرام اور علماء عظام سے انہوں نے درس لیا جن کی تربیت کا ان کی زندگی پر خاص اثر تھا۔دیوبند میں تعلیم کے دوران انہوں نے راہ سلوک میں قدم رکھا اور مشہور صوفی بزرگ حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے بعض خلفا اور مریدوں سے تربیت حاصل کی۔1883 میں انھوں نے شریعت وطریقت کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور عملی میدان میں قدم رکھا۔

انہوں نے کانپور کے ایک مدرسہ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا جہاں 14 سال تعلیم وتعلم اور درس وتدریس میں گزارے۔جس سال انہوں نے تدریس کا کام شروع کیا اسی سال انہیں بیت اللہ کی زیارت کا موقع ملا اور خاندان کے بعض بزرگوں کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوگئے۔یہاں روحانی پیرومرشد حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے ملاقات کی اور بیعت کی تجدید کرکے باقاعدہ مریدین میں شامل ہوگئے۔1893 میں انہوں نے دوسرا حج کیا۔اس موقع پر انہوں نے تقریباً چھ مہینے وہاں گزارے۔اس دوران پیرومرشد حاجی صاحب کی خوب خدمت کی اور ان کی زیرسرپرستی ریاضت ومجاہدہ کرتے رہے۔اس کے بعد ہی ان کی زندگی میں تصوف کا ایسا رنگ چڑھا کہ فانی دنیا سے کچھ بھی رغبت نہ رہی۔پیغمبرانہ مشن کے فرائض کی ادائیگی میں انہوں نے اپنی تمام طاقت جھونک دی۔علم اور تعلیم سے لے کر بیعت وارشاد کے ذریعہ امت کی اصلاح کرتے رہے اور حکیم الامت کے لقب سے مشہور ہوئے۔اصلاح امت کے لئے تعلیم وتدریس کے ساتھ وعظ وتقریر کا ذریعہ اپنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں اور قصبوں میں گھوم پھر کر لوگوں کو صحیح اسلامی تعلیمات پر چلنے کی دعوت دی۔ان کا وعظ اور ان کی تقریریں موثر ہوتیں۔اور دلوں پر اثر کرتی تھیں، اس کے نتیجہ میں ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور غلط عمل سے توبہ کیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی زندگی بہت ہی مصروف تھی مگر ان میں ضبط کے ساتھ نظم بھی تھا۔تعلیم وتدریس، وعظ ونصیحت، اور تصنیف و

تالیف کا کام ایک ساتھ جاری رکھتے اور وقت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تحریروں اور تقریروں پر مشتمل کتابوں اور رسالوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو سے زیادہ ہے۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، منطق، کلام، عقائد اور تصوف کے موضوعات پر خوب لکھا اور ان میں علمی زبان استعمال کیا لیکن اصلاحی رسائل کی زبان سادہ آسان اور عام فہم ہے۔ اردو، فارسی اور عربی پر عبور ہونے کی وجہ سے وہ بنیادی ماخذ تک رسائی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں باوزن اور مدلل ہوتی تھیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی تعلیم و تدریس کا سلسلہ 98-1897 میں بند کر کے اپنے آبائی وطن تھانہ بھون لوٹ آئے اور اپنے مرشد کی خانقاہ کو آباد کر کے لوگوں کی دینی و روحانی تربیت میں مشغول ہو گئے انہوں نے سب سے زور زیادہ تعلیم اور اخلاقی تربیت پر دیا۔ قدرت نے انہیں جس علم نوازا تھا اور جس علم کی بدولت ان کی طبیعت میں کشادگی اور وسیع المشربی تھی اس کے قدرداں اپنے اور غیر بھی تھے۔ اختلاف رائے کی ان کے یہاں بہت اہمیت تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے جس طرح اپنے پیر و مرشد سے بعض تفسیری مباحث میں اختلاف کیا ہے اور مولانا نے نصیحت کے ساتھ پذیرائی کی اور برا نہ مانا وہ اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

1۔ **بیان القرآن:** یہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر 21 جلدوں پر مشتمل ہے تفسیر اردو زبان میں ہے۔

2۔ **بہشتی زیور:** اس کتاب میں انہوں نے معاشرتی برائیوں کو ذکر کر کے اس کا علاج اور طریقہ بتایا ہے۔ اس میں خواتین کے مسائل زیادہ ہیں۔ دراصل یہ کتاب آپ کے ایک متوسل کی لکھی ہوئی تھی جس پر انہوں نے نظر ثانی کی چنانچہ مؤلف نے از راہ عقیدت اس کتاب کو آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ کتاب بھی اردو زبان میں ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے سبھی گھروں میں اس کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

3۔ **امداد الفتاوی:** یہ کتاب آپ کے فتاوی کا مجموعہ ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کی وفات کے بعد اس کی ترتیب کا کام ہوا اور یہ کتاب شائع ہوئی۔ یہ بھی بزبان اردو ہے۔

ہندوستان کا بطل جلیل، حکیم الامت اور قوموں کے حیات کا نباض ملت کا بہی خواہ 9/جولائی 1943ء مطابق 6/رجب 1362ء کو اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔ آپ کے انتقال کی خبر لوگوں پر بجلی بن کر گری۔ عقیدت مندوں نے جنازے میں شرکت کی کوشش کی اور جو لوگ دور دراز مقامات پر تھے اور نہیں پہنچ سکتے تھے ان لوگوں نے جنازہ غائبانہ پڑھ کر عقیدت اور ملی بے داری کا ثبوت دیا۔ ان کے جنازہ میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

23.11 مولانا ابوالکلام آزاد

بیسوی صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں میں عبقری صلاحیتوں کی مالک شخصیات کا اگر تذکرہ کیا جائے تو ان میں ایک نمایاں نام مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہوگا۔ مولانا آزاد تحریک آزادی ہند کے نامور سپہ سالار، دور اندیش سیاست داں، عظیم صحافی، بہترین تذکرہ نگار، تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے دینی علوم کے ماہر اور جدید دنیا کے تقاضوں سے آشنا تھے۔ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

مولانا آزاد 22/اگست 1888ء مطابق 14/ذی الحجہ 1305 میں بروز بدھ مکہ معظمہ کے محلہ قدوہ متصل باب السلام میں پیدا

ہوئے۔ان کے والد کا نام خیر الدین تھا جو ان دنوں مکہ ہی میں سکونت پذیر تھے اور وہیں شادی کر لی تھی۔ والد ماجد نے ان کا نام محی الدین رکھا۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی رسم بسم اللہ کعبہ میں ادا کی گئی۔ وہاں انہوں نے دو یا تین سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے والد ماجد نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور کلکتہ میں مقیم ہو گئے۔ سعودی عرب سے واپسی کے بعد بھی آپ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ مولانا آزاد کے لیے ہندوستان میں صدمے کا جو پہلا سبب بنا وہ یہ تھا کہ 1898ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر تقریباً دس یا گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ ان کی والدہ کا تعلق مکہ کے معزز خاندان سے تھا۔

ہندوستان میں اقامت کے بعد مولانا آزاد نے اپنے والد ماجد سے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے اردو، فارسی اور عربی زبان کی تحصیل کی۔ علاوہ ازیں ان کی تعلیم کے لیے ایک اتالیق بھی مقرر کیا تھا، جن سے انہوں نے درس نظامی کا سبق لیا۔ آپ کے والد ماجد جید عالم تھے، ساتھ ہی صوفی و مرشد بھی تھے۔ انہوں نے اپنے لخت جگر کو دوسرے فقہی مسالک سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور مولانا آزاد نے والد کے طریقہ تصوف کو بالکل ترک کر دیا۔ 1904ء میں تعلیم کی رسم سے فراغت کے بعد گھر پر ہی درس دینا شروع کیا۔ طلبہ کو صرف ونحو، منطق وفلسفہ، فقہ وحدیث اور معقولات کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

مولانا آزاد کی خدمات وسیع و بسیط ہیں۔ ماہرین نے انہیں تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 1905ء سے لے کر 1920ء تک۔ دوسرا دور 1920ء سے لے کر 1923ء تک اور تیسرا دور 1923ء سے لے کر 1958ء تک ہے۔ پہلے دور میں وہ بطور صحافی مسلم محبّ وطن کے طور پر ابھرے۔ اس زمانے میں ان پر مغربی استعمار کی عالمگیر ریشہ دوانیوں کے خلاف اتحاد اسلامی کو مضبوط کرنے اور عالمی اسلامی برداری کے احیاء کی بنیاد کو روشن خیالی پر رکھنے کا جذبہ حاوی تھا۔ اس زمانے میں وہ تین مصلحین سے بہت متاثر ہوئے، جن میں سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سید رشید رضا مصری ہیں۔ سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی سے بھی انہوں نے فیض حاصل کیا۔ ان دونوں بزرگوں سے انہوں نے عقلیت پسندی اور جدیدیت، سیرت رسول، ممتاز اسلامی شخصیات کی سوانح، ادبی تنقید، انسان دوستی اور رومانی رجحان کا گر سیکھا۔

دوسرے دور میں وہ سیاست میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں وہ خلافت تحریک، سول نافرمانی تحریک اور ستیہ گرہ تحریک میں سرگرمی کے ساتھ شریک دکھائی دیتے ہیں۔

تیسرے دور میں انہوں نے قومی تحریک کے عظیم رہنما کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دور میں انہوں نے نہ صرف برادران وطن کے لیے اتحاد و اتفاق کی بات کی بلکہ علیحدہ تہذیب اور سیکولر قومیت کی اقدار کے زبردست مبلغ اور محافظ کی حیثیت سے نمایاں کارنامے انجام دیے۔

مولانا آزاد نے اپنی علمی زندگی کا آغاز تعلیم و تعلم اور صحافت سے کیا جس میں وہ تقریباً 27 برس تک مشغول رہے۔ صحافت میں انہوں نے خود اپنے اخبار نکالے اور بعض مجبوریوں کے تحت دوسرے اخبارات کی ادارتی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں، جن کی تعداد ایک درجن ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ نیرنگ عالم کلکتہ، المصباح کلکتہ، احسن الاخبار کلکتہ، لسان الصدق کلکتہ، خدنگ نظر لکھنؤ، الندوہ لکھنؤ، وکیل امرتسر، دار السلطنت کلکتہ، الہلال کلکتہ، البلاغ کلکتہ، پیغام کلکتہ، پیام کلکتہ، الجامعہ کلکتہ، الہلال کلکتہ (دور ثانی) وغیرہ۔

مولانا آزاد صحافت کے راستے سیاست میں آئے اور بعد میں سیاست کا رنگ ان پر کچھ ایسا چڑھا کہ وہ صرف اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس عہد کا شاید یہی تقاضا رہا ہو۔ میدان سیاست میں وہ آخر عمر تک رہے۔ 1947ء میں قومی

حکومت کے قیام کے بعد وہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کے محکموں کے وزیر رہے۔اس دوران انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں اور ہندوستان میں جدید تعلیم کے معمار اول قرار پائے۔ مولانا آزاد بطور وزیر تعلیم انڈین کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر)، انڈین کونسل آف ایگری کلچرل ریسرچ (آئی سی اے آر)، انڈین کونسل آف سوشل ریسرچ، انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے علاوہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (یو جی سی)، ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی جیسے شعبے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ہی انڈین کونسل ایجوکیشن کی بھی بنیاد رکھی تھی جس کے تحت انڈین انسٹیٹیوٹ آف کھڑک پور کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آگے چل کر اسی ادارے کی نگرانی میں آئی آئی ٹیز بامبے، مدراس، کانپور، دہلی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ووکیشنل ٹریننگ، تعلیم بالغان کی طرف خصوصی توجہ دی تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، سکنڈری ایجوکیشن کمیشن بھی مقرر کیا تھا تاکہ تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہ مولانا آزاد ہی تھے جنہوں نے 3+2+10 کے تعلیمی سلسلے کو رواج دیا تھا۔ اسکول آف پلاننگ اینڈ آرکیٹکچر کی بھی بنیاد رکھی تھی تاکہ شہروں کی ترقی میں اس ادارہ سے خصوصی کام لیا جاسکے۔

سیاست کی مشغول زندگی کی وجہ سے مولانا کو تصنیف و تالیف کا زیادہ موقع نہیں ملا لیکن پھر بھی مصروف زندگی میں انہوں نے بعض کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد بقول احمد سعید ملیح آبادی 33 سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں تذکرہ، غبار خاطر، تفسیر ترجمان القرآن کافی شہرت کی حامل ہیں۔ علاوہ ازیں میگزینوں اور اخبارات کے مضامین اس پر اضافہ ہیں جو بعد میں کتابی صورت میں مدون ہوئے۔ ماہرین نے ان کی تصنیفات کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ 13 سے 18 برس تک کی عمر کی تصنیفات کی تعداد چودہ ہے اور 18 برس کے بعد کی تصنیفات کی تعداد 19 سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر تحریریں دستیاب نہیں ہیں۔

مولانا آزاد نے قومی خدمات کے سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آزادئ ہند کے لیے انگریزوں سے اس وقت مذاکرات کیے جب تمام قومی رہنما نظر بند تھے۔ علاوہ ازیں یہ پہلے ایسے کانگریسی لیڈر تھے جو کم عمری کے باوجود کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے۔ انہیں کی صدارت کے زمانے میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بات چلی۔

مولانا آزاد علمی، قومی اور ملی خدمات انجام دیتے ہوئے 22/فروری 1958ء کو اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور قومی حکومت نے سوگ کا اعلان کیا۔

23.12 سید عابد حسین

سید عابد حسین کا شمار بھی مسلم دانشوروں میں ہوتا ہے۔ نہ صرف ماقبل آزادی بلکہ اس کے بعد بھی انہوں نے ملت کے لیے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ آ کر اس ادارے کے قیام و بقا میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ جنگ آزادی میں بھی وہ شریک رہے اور اس وقت کے قومی قائدین کے شانہ بشانہ حریت ملت کے لیے خدمات انجام دیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو، گاندھی جی، مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، سردار پٹیل، سروجنی نائیڈو اور اس عہد کے دیگر بڑے قائدین سے ان کے مراسم تھے۔ قومی قائدین سے ذاتی تعلق ہونے کے باوجود بھی انہوں نے عہدے کی خواہش نہیں کی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عسرت بھری زندگی پر قانع رہے۔ جامعہ کے استحکام و بقا میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

سید عابد حسین 25/جولائی 1896ء میں بروز ہفتہ بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد حامد حسین ملازم تھے اور دادا سید مہدی حسین تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا تاریخی نام منظور حسین تھا مگر والدین پیار سے انہیں چنو میاں کہتے تھے۔ ان کی تعلیم کا آغاز ناظرہ قرآن اور ابتدائی عربی و فارسی کی کتابوں سے ہوا۔ اس کے لیے ایک مولوی صاحب بطور اتالیق مقرر کیے گئے تھے۔ اس کے بعد جہانگیریہ اسکول بھوپال میں داخل کرائے گئے جہاں انہوں نے اردو قواعد اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد ان کا داخلہ آبائی وطن داعی پور قنوج کے پرائمری اسکول میں کرایا گیا جہاں وہ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ 1910ء میں باضابطہ ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اسکول میں تعلیم کے علاوہ ہاکی اور ٹینس کھیلنے کا شوق بھی تھا۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1916ء میں بیس برس کی عمر میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سال پانچ ہزار طلبہ میں سے سترہ سو طلبہ ہی کامیاب ہوسکے تھے اور ان میں بھی صرف سات طلبہ اول ڈویژن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، ان ہی میں ایک عابد صاحب بھی تھے۔ میٹریکولیشن کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد شمالی ہند کے مشہور میور سینٹرل کالج الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ انگریزی زبان وادب کے علاوہ کیمیا، طبعیات اور ریاضی کا مضمون اختیار کیا مگر اس امتحان میں انہیں دوسرے درجے کے نمبر ملے۔ بی اے کی تعلیم بھی انہوں نے الہ آباد سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے دوران انہیں ریاست بھوپال سے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی ملتا تھا جس کی وجہ سے انہیں کافی سہولت ہوئی، وہیں پر ان کے تعلقات پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی سے ہوئے جو آخر عمر تک قائم رہے۔

بی اے میں نمایاں کارکردگی کے بعد بھوپال کے پرنس حمید اللہ خاں کی تحریک اور مالی معاونت کی وجہ سے انہوں نے علی گڑھ کالج سے انگریزی میں ایم اے پاس کیا۔ اس دوران بھی انہیں ریاست کی طرف سے ساٹھ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا رہا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے ستمبر 1921ء میں لندن کا سفر کیا جہاں تاریخ پریوی کا امتحان پاس کر کے آکسفورڈ میں داخلہ لیا لیکن مالی تنگی اور عسرت کی وجہ سے جرمنی جانے کا فیصلہ کیا جہاں انہوں نے برلن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے استاد ڈاکٹر اشپرانگر تھے۔ ان کی نگرانی میں انہوں نے ہربرٹ اسپنسر کے فلسفۂ تعلیم پر مقالہ لکھا۔ دسمبر 1925ء کے آخر میں وہ ڈاکٹریٹ کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے پاس ہوئے۔ اس دوران انہوں نے کافی دقتوں کا سامنا کیا اور احباب سے قرض لے کر تعلیم کو جاری رکھی۔ بعد ازاں ان کے لیے ریاست بھوپال سے دوبارہ وظیفہ جاری ہوگیا جس سے کافی سہولت ملی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے جہاں انہوں نے تاعمر ملت کے نونہالوں کی تربیت کی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی علمی اور قومی و ملی خدمات کا دائرہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ہمراہ فروری 1926ء میں پیرس سے دہلی آئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام کیا۔ یہاں ان تینوں حضرات کا ایک ساتھ تقرر ہوا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین رجسٹرار بنائے گئے اور ساتھ ہی وہ رسالہ جامعہ کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔ اپنی آمد کے تیسرے مہینہ یعنی اپریل 1926ء میں انہوں نے ''پیام تعلیم'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے ذریعہ جامعہ کے کاموں کی تفصیل اور اس ادارہ کے مقاصد لوگوں تک پہنچائے جانے لگے۔ بعد ازاں وہ شعبۂ تصنیف و تالیف کے ناظم بھی مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے رفقاء عبدالعلیم اور سعید انصاری کی مدد سے ایک ایسی تجویز پر عمل کیا جس سے ہر سال نئی کتابیں پڑھنے اور رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوسکے۔ اس سلسلے میں ترغیب دلانے کی غرض سے یہ اعلان کیا کہ جو شخص سال میں چوبیس روپیہ جمع کرائے گا اسے ہر تیسرے مہینہ اس کی پسند کی نئی کتابیں دی جائیں گی۔ رسالہ

جامعہ مفت دیا جائے گا اور پیام تعلیم کی خریداری میں بھی رعایت دی جائے گی۔ ان کی حسن کارکردگی سے جامعہ کے ذمہ داران بہت متاثر ہوئے۔

جامعہ میں انہیں فلسفہ پڑھانے پر معمور کیا گیا۔ انہوں نے دلجمعی سے اس مضمون کی تدریس کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ''مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ'' جیسے شہرہ آفاق مضامین کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم کو اہم ترین قومی مسئلہ سے تعبیر کیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی نسلوں کو اسلامی روایات پر مبنی زیور تعلیم سے آراستہ کریں۔ اردو اکادمی دہلی کے قیام و بقا میں بھی سید عابد حسین کی محنت اور کوشش کا بڑا دخل ہے۔ انہوں نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تصنیف و تالیف کے لیے اس طرح کے مستقل ادارے کی ضرورت ہے جہاں اساتذہ چند رہنما طلبہ اور بیرونی علماء کے ساتھ مل کر تحقیقی کام کریں۔ اس ادارہ کا نام اردو اکادمی ہو۔ بعد میں جب اس ادارہ کا قیام جامعہ میں عمل میں آیا تو وہ اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔

سید عابد حسین صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ جب جامعہ کو مالی مشکلات پیش آنے لگیں تو انھوں نے بھی ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ساتھ اپنے مشاہرہ میں سے سو روپیہ کم کر دیا لیکن پھر بھی جامعہ کو استحکام نہیں ملا تو مذکورہ دونوں بزرگوں کی طرح انہوں نے بھی بیس برس تک ماہانہ ڈیڑھ سو روپیہ پر جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔ ڈیڑھ سو روپیہ کے بجائے مجیب صاحب اور عابد صاحب سو سو روپیہ پر خدمت کرنے لگے اور ذاکر صاحب پچھتر روپیہ مشاہرہ لینے لگے۔ گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے عابد صاحب کا خرچ سو روپیہ میں پورا نہیں ہوتا تھا اس کے لیے وہ قرض لیتے تھے، اس طرح وہ قرض کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے۔ چنانچہ مالی دشواریوں کی وجہ سے 1930ء میں جامعہ سے رخصت لے کر اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے جہاں انہوں نے دو سو روپیہ ماہوار گوئٹے کی شاہکار فاوسٹ کا اردو میں ترجمہ کیا اور مولوی عبدالحق کے زیر تربیت انگریزی اردو لغت کی تیاری میں مدد دی۔

ان کا یہ کارنامہ بھی قابل ذکر ہے کہ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے وقت جب مسلمانوں کے جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ ناممکن ہو گیا اور بیشتر جگہوں پر مسلمانوں نے پاکستان جانے کو ترجیح دی تو انہوں نے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی کا احساس جگانے اور انہیں نئے حالات سے روشناس کرانے کی غرض سے ''نئی روشنی'' کے نام سے ایک ہفت روزہ پرچہ نکالا۔ یہ رسالہ 15/جون 1948ء کو پہلی دفعہ منظر عام پر آیا اور دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور مسلمانوں میں قومی حکومت کے تئیں اعتماد بحال ہوا۔

19/جون 1962ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو Deemed University کا درجہ دیا گیا اور 1975ء میں جب یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے ترمیم شدہ تنخواہیں سینٹرل یونیورسٹیوں میں نافذ ہو گئیں اور انہیں جامعہ میں لاگو نہیں کیا گیا تو سید عابد حسین صاحب نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے اس سلسلے میں عملی اقدام کرنے کی درخواست کی۔

سید عابد حسین صاحب مختلف اداروں اور تنظیموں سے وابستہ رہے۔ وہ گاندھی اسمارک ندھی کے ٹرسٹی اور اس کے اگزیکیوٹیو کونسل کے ممبر تھے۔ ترقی اردو بورڈ کے رکن تھے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا اور اردو انگریزی لغت کے بورڈ کے چیئرمین بھی تھے۔ 1967ء میں انہوں نے اسلام اینڈ ماڈرن ایج انگریزی اور اسلام اور عصر جدید کے نام سے اردو میں جامعہ میں الگ سے ادارہ قائم کیا۔ امریکہ کی راک فیلر فاؤنڈیشن کی جانب سے 1953ء میں ان کی اپنی اردو تصنیف ''ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب'' کو انگریزی کا قالب بخشنے کے لیے اور ''گاندھی اور نہرو کی راہ'' کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنے کی غرض سے مدعو کیا جسے انہوں نے منظور کر لیا۔

سید عابد حسین صاحب ایک ادیب، زود گو شاعر اور ممتاز مترجم تھے۔ ان کی تصانیف اور تراجم کی تعداد چالیس سے زائد ہے۔ اردو میں ان کی تقریباً دس تصنیفات پائی جاتی ہے اور انگریزی میں نو اور ان کے تراجم کی تعداد 23 ہے۔ اردو میں ان کی تصنیف میں 'بزم بے تکلف' ہندوستانی قوم پروری اور ہندوستانی ثقافت، ہندوستانی قومی ثقافت، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، مسلمان اور عصری مسائل بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی انہیں خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے 1976ء میں انھیں پدم بھوشن کا ایوارڈ دیا۔

سید عابد حسین قومی وملی خدمات ادا کرتے ہوئے تقریباً 82 سال کی عمر میں کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر 13 / دسمبر 1978ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح ملت کا یہ بطل جلیل ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ ان کی بیوی مصداق بیگم دنیائے ادب میں صالحہ عابد حسین کے نام سے مشہور ہوئیں۔

23.13 خلاصہ

اس اکائی کے خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا مسلم شخصیات نے اپنی سکت بھر مسلم سماج اور معاشرے کی رہنمائی کی اور اس کی تعمیر وترقی میں شامل رہے۔ انہوں نے نہ صرف مسلم معاشرے کے فکری دھارے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا بلکہ ان کے اندر مثبت افکار بھی پیدا کیے اور مختلف شعبوں میں ان کی رہنمائی فرمائی۔ مسلم معاشرے پر مذکورہ بالا شخصیت کے اثرات واضح طور پر دیکھ جا سکتے ہیں اور یہ اثرات صرف کسی ایک خاص شعبے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ کار مذہبی زندگی سے لے کر سیاسی، سماجی اور معاشی سطحوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ان شخصیات کو نہ صرف جدید مسلم معاشرے کی تشکیل کا معمار شمار کیا جاتا ہے بلکہ قومی اور ملکی معماروں میں بھی انہیں گنا جاتا ہے۔

23.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1۔ شاہ عبدالعزیز کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کیجئے۔

2۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے کردار کی وضاحت کیجئے۔

3۔ سید نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمات کا تذکرہ کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجئے۔

4۔ سید امیر علی کی سماجی وسیاسی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

5۔ مولانا احمد رضا خاں کی زندگی اور ان کی کارگزاریوں سے بحث کیجئے۔

6۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات کے حوالے سے ان کی زندگی کا جائزہ پیش کیجئے۔

23.15 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ حیاتِ شبلی: سید سلیمان ندوی

2۔ نقوش: (شخصیات نمبر)

3۔ پرانے چراغ (تین جلدیں): ابوالحسن علی ندوی

4۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ: متعلقہ شخصیات

اکائی۔ 24 : موجودہ صورت حال

اکائی کے اجزاء

24.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی حالات سے آگاہ کرانا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں عام ہیں اور اکثر میڈیا (media) بھی مسلمانوں کی ایک مفروضہ (Stereotyped) شبیہ کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔

اس اکائی کا مقصد ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں ٹھوس معلومات فراہم کر کے ان کے متعلق رائج غیر حقیقی تصورات ومفروضات کو دور کرنا ہے۔

24.2 تمہید

اس اکائی میں جو معلومات ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق فراہم کی گئی ہیں وہ بڑے پیمانے پر اور منظم انداز میں کئے گئے جائزوں اور

مردم شماری کے اعداد وشمار کے تجزیوں پر مبنی ہیں۔ جن اداروں وتنظیموں کے جائزوں کا استعمال کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن (NSSO)

☆ نیشنل فیملی ہیلتھ سرویز (NFHS)

☆ نیشنل کاؤنسل آف اپلائیڈ اکنامک ریسرچ (NCAER)

☆ اپریشنز ریسرچ گروپ (ORG)

لیکن مسلمانوں کا مطالعہ کرتے وقت ایک دشواری یہ پیش آتی ہے کہ کسی بھی بڑے فرقے کی طرح ہندوستانی مسلمان بھی ہم جنس، ہم رنگ، یا یکساں گروہ نہیں ہیں۔ کسی بھی دوسرے مذہبی گروہ کی طرح ہندوستانی مسلمانوں میں بھی معاشی، سماجی، لسانی، نسلی، علاقائی اور ذات برادری کا فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کے اندرونی فرق اور اختلافات کو دیکھتے ہوئے انہیں ایک یک رنگ جماعت تصور کرنا غلط ہوگا۔ اس کے باوجود مطالعہ اور جائزے کی خاطر یہ ممکن اور ضروری ہے کہ مجموعی طور پر ان کے متعلق کچھ عمومی باتیں کہی جاسکیں۔

24.3 آزادئ ہند کے بعد مسلمانوں کے حالات کا اجمالی تعارف

ملک کے دستور کے مطابق آزاد ہندوستان کو ایک سیکولر اور جمہوری ملک قرار دیا گیا۔ یعنی حکومت ہند مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے اور لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ساتھ ہی ملک کے تمام باشندوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ انتخابات کے ذریعہ حکومت کرنے والے نمائندے چنیں۔ آزاد ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کی حیثیت ملک کی سب سے کثیر التعداد اقلیت کی ہے۔ دستور ہند نے انہیں ہندوستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے برابر کے حقوق اور ترقی کے مساوی مواقع فراہم کئے۔

لیکن بظاہر خوشگوار معلوم ہونے والے حالات ہندوستان کی مسلم قوم کے لئے زیادہ سازگار ثابت نہیں ہوئے۔

اول یہ کہ آزادئ ہند کے خوشگوار واقعہ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے تقسیم ہند کی تلخ حقیقت جو کہ دنگے، فسادات اور خون خرابے کی ہولناکیوں کے زیر سایہ واقع ہوئی۔ یہ بات بھی باعث افسوس ہے کہ اکثر مسلمانوں کو ہی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور 67 سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی انہیں وقتاً فوقتاً اس کا احساس دلایا جاتا ہے۔

بظاہر ہندوستانی مسلمانوں نے ترقی کی نئی منزلیں چومی ہیں، اعلیٰ عہدوں اور نمایاں شخصیتوں میں بے شمار مسلمان نظر آتے ہیں مگر بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان آج بھی بے شمار مسائل سے دوچار ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائل کے کئی پہلو ہیں جن کے تین اہم حصے ہیں۔ تشخص، تحفظ اور مساویانہ سلوک۔ یعنی اپنی مذہبی، ملی اور دیگر شناختوں میں توازن بنائے رکھتے ہوئے دوسرے فرقوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنا، عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے اپنی جان، مال وسلامتی کی فکر اور تیسرے غیر منصفانہ سلوک کا احساس جو اقتصادی ترقی سے پیدا ہونے والے مواقع کے ثمرات سے محرومی پر منتج ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو بیک وقت وطن دشمن ہونے اور ناز برداری کا دہرا الزام سہنا پڑتا ہے۔ ایک طرف انہیں بار بار اپنی حب الوطنی اور ملک

دشمنی میں ملوث نہ ہونے کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ دوسری طرف اس بات پر بھی غور نہیں کیا جاتا کہ جس ناز برداری کا ان پر الزام ہے اس کے نتیجہ میں انہیں کوئی ترقی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اکثر انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے جس کا احساس نوکری اور مکان ڈھونڈنے میں اور اسکولوں میں داخلہ کے وقت زیادہ ہوتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ مسلم خواتین کے مسائل ہوں یا مسلم قوم کی پسماندگی، ان سب کے لیے مذہب اسلام، اسلامی شریعت یا پھر خود مسلم قوم کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

سیاسی امور میں بھی مسلمانوں کو اکثر امتیازات سے گذرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اکثر ووٹر فہرستوں (Voters' lists) سے مسلمانوں کے نام غائب رہتے ہے نیز مسلم اکثریتی اسمبلی حلقوں کو مخصوص (Reserved) حلقہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ووٹ دینے اور اپنے علاقوں سے منتخب ہونے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

تمام مذہبی فرقوں اور سماجی طبقوں (جنہیں اب سماجی و مذہبی طبقے یا SRC یعنی (Socio-Religious Community) کہا جائے گا کے سماجی و معاشی حالات کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ (General) یا عمومی زمرے کے مسلمانوں کے سماجی اور معاشی حالات ہندو OBC (دیگر پسماندہ طبقوں) سے ابتر ہیں۔ اور مسلم OBC کے حالات تو عمومی زمرہ (General) کے مسلم طبقے سے بھی بدتر ہے۔

24.4 مسلم آبادی

24.4.1 تعارف

2011ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 14.2 فیصد تھا۔ 2001ء کی مردم شماری کے اعتبار سے مسلمانوں کی کل تعداد 138 ملین (یعنی تیرہ کروڑ اسی لاکھ) سے زیادہ تھی۔ OBC میں ان کا تناسب 15.7 فیصد تھا۔

مسلمان ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہے اور انڈونیشیا کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی جو پاکستان اور بنگلادیش کی مسلم آبادی کے برابر اور دنیا کے دوسرے مسلم ممالک کی آبادی سے زیادہ ہیں۔

24.4.2 علاقائی تقسیم

ہندوستان میں مسلم آبادی کا پھیلاؤ یکساں نہیں ہے۔ چار ریاستوں یعنی اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور مہاراشٹر میں ہندوستان کے آدھے سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔

2001ء کی مردم شماری کے مطابق مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد کچھ اس طرح تھی۔

ریاستیں	مسلمانوں کی آبادی
اترپردیش	31 ملین (تین کروڑ دس لاکھ)
مغربی بنگال، بہار، مہاراشٹر	10 ملین (ایک کروڑ) سے زیادہ
جموں وکشمیر، کیرل، کرناٹک، آندھراپردیش	5-10 ملین (پچاس لاکھ سے ایک کروڑ) کے درمیان
گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، جھارکھنڈ، تمل ناڈو	3-5 ملین (تیس سے پچاس لاکھ) کے درمیان
دہلی، اترا کھنڈ، ہریانہ	1-2 ملین (دس سے بیس لاکھ) کے درمیان
پنجاب، اڑیسہ	1 ملین (دس لاکھ) سے کم

لکشدیپ کی تقریباً تمام آبادی مسلم ہے لیکن اس علاقہ کی آبادی بہت کم ہے۔ جموں وکشمیر واحد ریاست ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب:

ریاستیں	مسلم آبادی کا تناسب (%)
جموں وکشمیر	67 فیصد
آسام، مغربی بنگال، کیرل	20 فیصد سے زیادہ
اترپردیش، بہار، جھارکھنڈ، کرناٹک، اترا کھنڈ، دہلی، مہاراشٹر	10-20 فیصد
آندھراپردیش، گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، ہریانہ، تمل ناڈو، منی پور، تریپور، گوا، پانڈیچری، دمن اور دیو، انڈمان نکوبار	5-10 فیصد
اڑیسہ، پنجاب، چھتیس گڑھ، ہماچل پردیش	5 فیصد سے کم

1961 اور 2001ء کے درمیان زیادہ تر ریاستوں کی مسلم آبادی کے تناسب میں معمولی اضافہ ہوا ہے۔ صرف کیرل، آسام، مغربی بنگال اور دہلی میں یہ اضافہ کچھ زیادہ ہے یعنی 5 فیصد۔ جموں وکشمیر واحد ریاست ہے جہاں اس دوران مسلم آبادی کا تناسب 68.3 فیصد سے گھٹ کر 67 فیصد ہوگیا۔

2001 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کے 594 اضلاع میں سے 20 میں مسلم اکثریت ہے جن میں سے 10 میں مسلم آبادی 75 فیصد سے زیادہ ہے۔ 75 فیصد سے زیادہ آبادی والے ضلعوں میں لکشدیپ، آسام کا دوبری ضلع اور جموں وکشمیر کے 8 اضلاع ہیں۔ اکثریت

والے 10 اضلاع میں آسام کے 5، جموں وکشمیر کے 2، کیرل، بہار اور مغربی بنگال کا ایک ایک ضلع ہے۔

38 ضلعوں میں مسلم آبادی 25 فیصد سے زیادہ لیکن 50 فیصد سے کم ہے۔ 224 ضلعوں میں مسلم آبادی بہت معمولی ہے یعنی 5 فیصد سے بھی کم۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عام طور پر ہندوستان کی ریاستوں اور ضلعوں میں مسلم ارتکاز، اجتماع یا یکجائی (Concentration) زیادہ نہیں ہے۔

24.4.3 حجم اور اضافہ

1961 اور 1991 کے درمیان شرح اموات کی بہت زیادہ گراوٹ کے باعث ہندوستان کی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا یعنی 134 فیصد ۔ مسلم آبادی میں 194 فیصد اضافہ ہوا جو اوسط سے کافی زیادہ تھا لیکن مسلم آبادی میں ہوا یہ اضافہ تمام ریاستوں میں یکساں نہیں تھا۔

پنجاب اور ہریانہ کی مسلم آبادی تقسیم ہند کے بعد چوں کہ بہت کم ہوگئی تھی اس لئے یہاں اضافہ بہت زیادہ نظر آتا ہے یعنی 300 فیصد۔ آندھرا پردیش، کیرل اور گجرات میں تقریباً 150 فیصد اور تمل ناڈو میں 122 فیصد اضافہ رہا۔ جموں وکشمیر جو مسلم اکثریت کا واحد صوبہ ہے اس رجحان سے مستثنٰی ہے۔ یہاں مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح 179 فیصد تھی جو عام آبادی کے اضافہ کی شرح 185 فیصد سے کم تھی۔ اکثر ریاستوں میں مسلم اور عام آبادی کی شرح نمو میں تقریباً وہی فرق رہا جو اوسطاً ملکی سطح پر رہا۔

پچھلی دہائی کی بہ نسبت 2001-1991 کی دہائی میں ہندوستان کی عام اور مسلم دونوں آبادیوں کی شرح نمو میں گراوٹ نظر آتی ہے البتہ مسلم آبادی کی بڑھوتری کی رفتار میں آئی گراوٹ عام آبادی سے زیادہ ہے۔ مسلم اور عام آبادی کے بڑھنے کی رفتار میں جو فرق تھا وہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا ہے۔

24.4.4 شہری آبادی

ہندوستان کی عام آبادی کی طرح بیشتر مسلمان بھی دیہاتوں میں رہتے ہیں البتہ 1961 سے یہ دیکھا گیا ہے کہ مسلم شہری آبادی کا تناسب دیگر لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ رہا ہے۔ 2001 میں 28 فیصد ہندوستانیوں کے مقابلہ میں 36 فیصد مسلمان شہروں میں رہتے تھے۔

ہندوستان کی عام آبادی کے مقابلہ میں مسلمان کاشتکاری پر کم منحصر ہیں۔ 2001 میں 75 فیصد دیہی کارکن زراعت سے جڑے تھے (کاشتکار یا زرعی مزدوروں کی حیثیت سے) لیکن مسلم دیہی کارکنندگان میں یہ تناسب صرف 60 فیصد تھا۔

24.4.5 شرح پیدائش

مسلمانوں کی شرح پیدائش اوسط سے زیادہ ہے لیکن اس میں گراوٹ آرہی ہے اور یہ گراوٹ اوسط شرح پیدائش میں آنے والی گراوٹ سے زیادہ ہے۔

مسلم شرح پیدائش سماجی اور معاشی خصوصیات اور علاقہ کے ساتھ بدلتی نظر آتی ہے۔

کیرل، تمل ناڈو، کرناٹک، جموں وکشمیر اور آندھرا پردیش میں مسلم شرح پیدائش کچھ شمالی ریاستوں کی نہ صرف مسلم بلکہ دیگر سماجی

ومذہبی طبقوں (SRCs) کی شرح پیدائش سے بھی کم ہے۔ان صوبوں میں مسلم اور اوسط شرح پیدائش کے درمیان فرق بھی کم ہے۔

مطالعہ کی بنا پر یہ مانا جاتا ہے کہ تعلیم، آمدنی اور صحت کی سہولیات کی فراہمی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شرح پیدائش گھٹتی جارہی ہے۔

24.4.6 ضبط تولید

اکثر یہ مانا جاتا ہے کہ اسلام مانع حمل طریقوں کا مخالف ہے اس لئے مسلمان ان کا استعمال نہیں کرتے جب کہ ایسا نہیں ہے اور جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک تہائی (1/3) سے زیادہ مسلم جوڑے ان طریقوں کا استعمال کرتے ہیں۔اگر چہ یہ اوسط سے کم ہے۔

مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ضبط تولید کے طریقوں کے استعمال میں فرق کی بڑی وجہ تعلیم کا فرق ہے۔لیکن مسلمانوں میں ان کا استعمال عام لوگوں کے مقابلہ میں کم ہے۔اور مسلم شرح پیدائش اوسط سے زیادہ ہونے کی ایک اہم وجہ یہی ہے۔وقت اور ترقی بالخصوص تعلیمی ترقی کے ساتھ مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان فرق کم ہوتا نظر آتا ہے۔

تجزیہ سے مسلم شرح پیدائش کے زیادہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی پتہ چلتی ہے کہ مسلم معاشرہ میں بھی ہندوؤں کی طرح لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے البتہ لڑکیوں سے بے رغبتی ہندو سماج کے مقابلہ میں کم پائی جاتی ہے۔جس کے سبب لڑکیوں کی پیدائش کو روکا نہیں جاتا اور ایسے خاندان بڑا ہو جاتا ہے۔

24.4.7 شرح اموات

مطالعہ وتجزیہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ 1981 سے 2006 تک لگاتار دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں مسلمانوں میں نوزائندوں اور بچوں کی شرح اموات نہ صرف قدرے کم ہے بلکہ اس میں گراوٹ بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے ہورہی ہے۔

ان دونوں وجوہات یعنی لڑکیوں سے کم بے رغبتی اور شرح اموات کی کمی کے سبب مسلم بچوں کا صنفی تناسب (Child sex ratio) بھی ہندوؤں سے بہتر ہے اور پچھلے کچھ سالوں میں بڑھا بھی ہے۔بچوں کے صنفی تناسب سے مراد ہے کسی ایک عمر کے ہر 1000 بچوں پر اسی عمر کی بچیوں کی تعداد۔

حالاں کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش سیاسی اور علمی حلقوں میں کافی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے لیکن اس کے برعکس ان کی گھٹتی ہوئی شرح اموات پر زیادہ غور نہیں کیا گیا جو مسلمانوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے کافی تعجب خیز امر ہے۔

مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ مسلم بچوں کی شرح اموات دوسروں کے مقابلہ میں اور زیادہ ہوگی۔

1) ان کی سماجی اور معاشی حیثیت دوسری قوموں سے کم ہے۔

2) مسلمانوں میں غربت دوسری قوموں سے زیادہ اور تعلیم ان سے کم ہے۔

3) ان کے رہائشی علاقوں میں اکثر عوامی سہولیات کا فقدان ہے۔

4) بچے جننے اور علاج کی دوسری سہولیات تک ان کی رسائی کم ہے۔

5) مسلمانوں کی شرح پیدائش بڑھی ہوئی ہے۔

6) بچوں میں وقفہ کم ہوتا ہے۔

7) مسلم بچوں کے لئے غذائیت سے محروم ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔

تحقیق کے ذریعہ مسلم بچوں کی بہتر شرح اموات کی یہ امکانی وجوہات نکالی گئی ہیں۔

1۔ مسلم مائیں اکثر لمبی ہوتی ہیں جو کہ بہتر صحت کی نشانی مانی جاتی ہے۔

2۔ اس بات کا امکان کم ہوتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کے وقت انہیں ضرورت سے کم غذا ملتی ہو۔

3۔ ان کی غذا میں گوشت شامل ہوتا ہے۔

4۔ ان کے نوکری کرنے کے امکان کم ہوتے ہیں۔

5۔ مسلمان شہری علاقوں اور بڑے گاؤں میں زیادہ آباد ہیں جہاں بہتر طبی سہولیات ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

6۔ مسلم مائیں اسہال (diarrhea) کا علاج زیادہ کراتی ہیں جو بچوں کی موت کی بڑی وجہ ہے۔

7۔ ہندوؤں میں لڑکوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے جس کی وجہ سے دونوں گروہوں کی لڑکیوں کی شرح اموات میں زیادہ فرق ہے۔

8۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ غالباً مسلمانوں کے حفظان صحت کے طریقوں کا بھی دخل ہوسکتا ہے۔

9۔ غالباً مسلم گھرانوں میں صنفی تعصب کم ہونے کی وجہ سے عورتوں اور بچیوں کی غذا اور صحت بہتر رہتی ہے۔

مسلمانوں میں متوقع عمر (life expectancy) اوسط سے تقریباً ایک سال زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں ماؤں کی شرح اموات بھی اوسط سے کم ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی گھٹتی شرح اموات کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عام آبادی کے مقابلہ میں وہ شہروں میں زیادہ رہتے ہیں اور شہری آبادی کی شرح اموات دیہی کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے۔

24.4.8 صنف کا تناسب

1961-2001 کے درمیان ہندوستان کا صنفی تناسب 930 کے آس پاس رہا ہے یعنی 1000 مردوں پر اتنی عورتیں۔ مسلم آبادی اس سے الگ نہیں ہے۔ لیکن حال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ چھوٹی عمر میں صنفی تناسب کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی اہم وجہ نسوانی جنین کشی بتائی جاتی ہے۔ 2001 میں 0-6 عمر کے بچوں کا صنفی تناسب 927 تھا جو بہت کم ہے البتہ مسلم آبادی میں یہ 950 تھا جس میں کوئی عدم توازن نہیں ہے یعنی یہ زیادہ تر آبادیوں کے برابر ہے۔ بہرحال کچھ ایسے صوبے بھی ہیں جہاں چھوٹی عمر میں مسلمانوں کا صنفی تناسب بھی کم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً کچھ صوبوں میں مسلم معاشرہ میں بھی کسی حد تک نسوانی جنین کشی پائی جاتی ہے لیکن یہ عام آبادی کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

24.4.9 عمر کا تناسب

عمر کے لحاظ سے مسلم آبادی کی تقسیم ہندوستان کی عام آبادی سے کافی مختلف ہے۔ مسلمانوں میں نوجوانوں کی تعداد عام آبادی سے کافی زیادہ ہے۔ خاص طور پر 15 سال سے کم عمر کی جماعت میں کم عمروں کی تعداد کا زیادہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ مسلم آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن کسی آبادی میں کم عمروں کی تعداد کے زیادہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کام کرنے کے لائق لوگوں کی تعداد کم ہے جس سے گھروں، سماج اور معیشت پر زیادہ جوجھ پڑتا ہے۔ لہٰذا بڑی تعداد میں کم عمروں کی کفالت کا مسئلہ مسلم سماج کے لئے نقصاندہ ہے۔

حال میں کچھ ریاستوں میں شرح پیدائش کے کم ہونے سے نوعمروں کا تناسب کم ہوا ہے۔ جیسے تمل ناڈو، کیرل، آندھرا پردیش، گجرات اور چھتیس گڑھ۔ ان صوبوں میں کام کرنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

24.4.10 ازدواجی حیثیت

مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اوسطاً شادی کے وقت مسلم لڑکیوں کی عمر بقیہ اقوام کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہوتی ہے یا ان کی شادیاں تھوڑی بڑی عمر پر ہوتی ہیں۔ جموں و کشمیر، اڑیسہ، چھتیس گڑھ، دہلی، اتراکھنڈ اور گجرات میں 19-15 عمر کی 15 فیصد سے کم لڑکیاں شادی شدہ ہیں۔ ہریانہ، آسام، مغربی بنگال اور جھارکھنڈ میں یہ تناسب 30 فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔

اکثر یہ مانا جاتا ہے کہ بیواؤں کی شادی ہندو سماج میں نایاب ہے لیکن مسلمانوں میں یہ عام ہے اور مسلمانوں کی اوسط سے زیادہ شرح پیدائش کی ایک وجہ یہ بھی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مردم شماری کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مسلم آبادی میں بیواؤں کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا کہ عام آبادی میں ہے۔ اکثر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں طلاق زیادہ عام ہے لیکن عملی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کس طرح کے مسائل درپیش ہیں؟

2۔ ایسی کون سی ریاستیں ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی پانچ سے دس ملین کے درمیان ہے اور کون سی ریاستیں ہیں جن میں مسلم آبادی پانچ ملین سے کم ہے؟

3۔ کن اسباب کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ مسلم بچوں کی شرح اموات دوسروں کے مقابلہ میں اور زیادہ ہوگی؟

4۔ مسلم بچوں کی بہتر شرح اموات کی کیا امکانی وجوہات نکالی گئی ہیں؟

24.5 تعلیمی صورت حال

24.5.1 تعارف

مسلم گروہ کے سامنے بہت بڑا مسئلہ تعلیمی پچھڑے پن کا ہے۔کئی جائزوں بالخصوص سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمان تعلیم کے میدان میں دیگر سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں کافی پسماندہ ہیں۔

تعلیم کے میدان میں مسلمان دوسرے گروہوں سے لگاتار پچھڑتے جا رہے ہیں اور دونوں کے درمیان کا تعلیمی فرق بڑھتا جا رہا ہے۔مزید یہ کہ تعلیم کے معاملے میں SRCs میں جو فرق ہے وہ لڑکیوں کے معاملے میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ملک کی تعلیمی حالت سدھرنے کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی محرومی لگاتار باقی ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جب کہ دلتوں اور آدیواسیوں اور قبائلی جن جاتیوں کی تعلیمی محرومی کو دور کرنے کی باقاعدہ کوششیں کی گئیں مسلمانوں کی تعلیمی محرومی میں کمی لانے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

یہ تاثر غلط ہے کہ مسلمانوں میں پائی جانے والی مذہبی قدامت پسندی ان کے تعلیم حاصل نہ کرنے کا بڑا سبب ہے۔مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میں اپنے تعلیمی پسماندگی کا شدید احساس پایا جاتا ہے اور وہ اس صورت حال کو جلد از جلد درست کرنا چاہتے ہیں۔

24.5.2 مسائل

اسکولوں تک محدود رسائی

مسلم تعلیمی بدحالی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اچھے اور معیاری اسکولوں تک قوم کے بچوں کی رسائی محدود ہے اور اس سے طالبات زیادہ متاثر ہوئی ہیں۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے اور مسلمانوں کی طرف سے بھی یہ شکایت ملتی ہے کہ ان کی آبادی والے علاقوں میں یا ان کے آس پاس اسکولوں کی خاص طور پر سرکاری اسکولوں کی خاصی کمی رہتی ہے۔ یہ بھی مسلم تعلیمی محرومی کی ایک بڑی وجہ ہوسکتی ہے۔سچر کمیٹی نے یہ بھی پایا کہ عام طور پر گھنی مسلم آبادی والے چھوٹے گاؤں میں اسکول کم پائے جاتے ہیں۔

تعلیم نسواں

بچیوں کے اسکولوں کی تعداد بھی کم ہے اور اکثر یہ مسلم بستیوں سے خاصے فاصلے پر ہوتے ہیں۔اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ تناؤ کے زمانہ میں والدین اپنی بچیوں کے تحفظ کے اندیشے سے انہیں اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔خاص طور پر جب وہ پرائمری اور مڈل اسکول میں ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس عمر کی مسلم لڑکیوں میں تعلیم چھوڑنے کی شرح زیادہ پائی جاتی ہے۔اکثر گھر کے آس پاس اسکول نہ ہونے کے سبب والدین کو اپنے بچوں کو نجی اسکولوں یا مدرسوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔

تمام سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) میں سماجی سطح پر منفی صنفی امتیازات کا عمومی ماحول پایا جاتا ہے۔اس کے پیش نظر مسلم لڑکیوں کی تعلیم حد درجہ متاثر ہوئی ہے۔کیوں کہ غریب مسلم والدین اکثر و بیشتر صرف بیٹوں کو ہی نجی اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔لہٰذا یہ تاثر بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی قدامت پسندی لڑکیوں کی تعلیم کے بیچ حائل ہے۔

حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل غریبی اور مالی دشواریاں مسلم لڑکیوں کو جدید یا سیکولر تعلیم سے محروم رکھنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔کیوں کہ لڑکیوں یا خواتین کو روایت کا امین سمجھا جاتا ہے نا کہ روزی کمانے والیاں یا ملازمت کی خواہشمند۔اس لئے بعض لوگ اردو کی تعلیم کو لڑکیوں کے لئے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔چوں کہ اردو اب بیشتر سرکاری اسکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی ہے اس لئے بعض والدین اپنی لڑکیوں

کومدارس میں بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ہاسٹلوں کی کمی بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے خصوصاً لڑکیوں کے سلسلہ میں۔

لیکن سچر کمیٹی کو اس تاریک منظرنامہ میں بھی امید کی کرن نظر آئی۔کمیٹی کا کہنا ہے کہ گو تعلیمی نظام مسلم لڑکیوں سے دستبردار ہو گیا ہو مگر خود لڑکیوں نے تعلیم کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔مختلف ریاستوں میں ملاقاتوں اور بات چیت کے دوران کمیٹی نے محسوس کیا کہ ہر طبقہ کی مسلم خواتین اور لڑکیوں میں تعلیم کے لئے زبردست جوش اور خواہش پائی جاتی ہے۔

درسی کتابوں اور اسکول کے ماحول میں اکثر فرقہ واریت کے پائے جانے کی وجہ سے بھی بہت سے والدین بچوں کو اسکول بھیجنا پسند نہیں کرتے۔

نجی ادارے

تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ غالباً اپنی پسند کے سرکاری اداروں کی غیر موجودگی یا ان تک رسائی نہ ہونے کے سبب دوسری سماجی ومذہبی قوموں (SRCs) کے مقابلہ میں مسلمان نجی شعبہ کے تعلیمی اداروں کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں۔دوران تحقیق والدین سے ہوئی بات چیت سے اخذ ہوتا ہے کہ تعلیم کے سرکاری نظام سے ان کی بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں دن بدن ہندی وسنسکرت زبان اور ہندوتہذیب ومذہب کا رنگ غالب ہوتا جارہا ہے جب کہ دوسری طرف اردو زبان اور ملی جلی تہذیب کو کھلم کھلا درکنار کیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے مذہبی،تہذیبی اور سیاسی شناخت کا تعلیم سے گہرا تعلق ہے۔

اردو

اکثر اردو بولنے والے علاقوں کے مسلمان اسی زبان میں بچوں کو بنیادی تعلیم دلانا پسند کرتے ہیں۔لہٰذا ایسے علاقوں میں ان اسکولوں کی بڑی اہمیت ہے۔لیکن ان کی تعداد ضرورت سے بہت کم ہے۔ابتداءً اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ اسے اس قوم سے جوڑ دیا گیا۔ہندی اور اردو کے مسئلہ نے جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا اس سے بھی اس زبان کا اور اس سے جڑے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔بالخصوص آزاد ہندوستان میں۔

آئین کی دفعہ 351 نے مسئلہ کو شدید تر کر دیا جب یہ کہا گیا کہ ہندی کو زیادہ سے زیادہ سنسکرت سے الفاظ لینے چاہئیں۔کئی ہندی بولنے والی ریاستوں میں ہندی کی سنسکرت کاری اور سہ لسانی فارمولے کے مسخ کئے جانے سے (صرف ہندی،سنسکرت اور انگریزی کی تعلیم کی فراہمی) بیشتر سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ عموماً بالکل ختم ہو گیا جس سے مسلمانوں کی تعلیم متاثر ہوئی۔

اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے کیوں کہ اردو کے ذریعہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم دینے والے اسکول زیادہ نہیں ہیں۔سہ لسانی فارمولے پر مناسب عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ ہائر سکینڈری اسکول کا امتحان اردو میں نہیں دے پاتے کیوں کہ اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔لہٰذا انہیں ہندی میں امتحان دینا پڑتا ہے۔نیز اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزگار کا فراہم نہ ہو پانا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

غربت

1993/4 میں کیئے گئے سروے کے مطابق 26 فیصد مسلم کنبوں میں بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دینے کی بڑی وجہ شدید غریبی ہے۔ دوسرے بہت سے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا خاص سبب بھی یہی ہے۔اس کے سبب بچے ابتدائی چند درجات کے بعد تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ یہ بات مسلم بچوں کے معاملہ میں زیادہ نمایاں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کارخانوں یا گھروں وغیرہ میں کام کر کے گھر کی آمدنی میں ہاتھ بٹائیں یا ان کی مائیں کام کرنے گئی ہوں تو گھر میں بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کریں۔مزدوری کرنے والے بچوں کا تناسب بھی ملکی اوسط (2.4%) کے مقابلہ میں مسلمانوں میں زیادہ ہے یعنی (3%)۔

غریب اور ناخواندہ والدین اپنے بچوں کے لیے ٹیوشن کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا پاتے، نہ وہ گھر پر ان کی تعلیم میں وہ مدد دے سکتے ہیں جو آج کے تعلیمی نظام کا لازمی جز بن گئی ہے۔

1993/4 میں کیئے گئے سروے میں 10-9 فیصد مسلم والدین نے کہا کہ وہ روایت کے دباؤ یا بچوں کی شادی کرانے کی وجہ سے انہیں نہیں پڑھا پاتے۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم اور انسانی ترقی کے دوسرے پیمانوں پر علاقے کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی بہت اثر پڑتا ہے۔کئی پیمانوں پر SC/ST گروہوں کے مقابلہ میں مثبت خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود مسلمانوں کے تعلیمی پچھڑے پن کا مطلب یہ ہے کہ یا تو تعلیم کے متعلق مسلمانوں کا رویہ مثبت نہیں ہے یا اسکول جانے کے لئے ان کے پاس مواقع کم ہیں۔

اس کے بھی کئی اسباب ہوسکتے ہیں:۔

1۔ مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک جس کی ان کی طرف سے اکثر شکایت ملتی ہے۔

2۔ مسلمانوں کی اپنی پسند اور معیار کے مطابق مناسب اسکولوں تک عدم رسائی۔

3۔ تعلیم کے نتیجہ میں پہنچنے والے فوائد کا انہیں احساس نہیں ہے۔

جائزوں میں 18-17 فیصد مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم اہم نہیں تھی۔

تعلیمی فوائد کا ناکافی احساس

تعلیم سے جڑے ہوئے فائدے اس کے نتیجہ میں ملنے والی ملازمت کے امکانات سے جڑے ہوئے ہیں۔اس لئے یہ مانا جاتا ہے کہ لوگوں کو ملازمت ملنے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا اتنا ہی وہ تعلیم کی طرف راغب ہوں گے۔ چوں کہ بنیادی دھارے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کے لئے روزگار ملنا عموماً نہایت مشکل ہوتا ہے اس لئے اسے غیر سودمند سرمایہ کاری سمجھا جاتا ہے۔

کیوں کہ اکثر روزگار اور نوکریوں کی فراہمی میں مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں اپنی اہلیت کے مطابق نوکریاں نہیں ملتیں، اس وجہ سے بھی مسلم قوم تعلیم سے حاصل ہونے والے فوائد کے احساس سے محروم رہ جاتی ہے۔

سرکاری ونجی زمرہ کے روزگار میں مسلمانوں کی کم نمائندگی اور باتنخواہ ملازمتیں حاصل کرنے میں امتیازات برتے جانے کے خیال کے تحت مسلمان سیکولر تعلیم کو دیگر سماجی و مذہبی قوموں کے مقابلہ میں کم اہمیت دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی مسلم قوم خاص طور سے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ انتظام وانصرام، پالیسی سازی اور سیاسی اداروں میں اپنی عدم موجودگی اور کم مواقع دیکھ کر بھی مایوسی کا شکار ہو رہا ہے اور خود کو الگ تھلگ محسوس کر رہا ہے۔

24.5.3 مدارس

مدارس ور ہائشی مذہبی تعلیم گاہیں ہیں جن کا انتظام مسلم قوم خود اپنے طور پر کرتی ہے۔ مدارس کا مسلم معاشرہ میں بہت اہم کردار ہے۔ اول تو یہ کہ ان کے ذریعہ مذہبی تعلیم کی روایت زندہ ہے۔ دوسرے ان کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوتے ہیں جو معاشرہ کے اندر مذہبی فرائض ادا کرنے اور مسلمانوں کے مذہبی وملی تشخص کو برقرار رکھنے کا کام کرتے ہیں۔ تیسرے یہ مدارس غریب ونادار بچوں کی کفالت کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ کبھی کبھی مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسہ بھیجیں البتہ عموماً مسلمان مدرسہ کی روایتی تعلیم کے مقابلہ میں رائج الوقت سیکولر تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں کیوں اس میں ملازمت کے بہتر مواقع ہیں۔

مدارس مسلم قوم کی جانب سے ایک اہم کوشش ہے لیکن ان کی رسائی نہایت محدود ہے۔ 16-7 سال (اسکول جانے کی عمر) کے صرف 4 فیصد مسلم بچے ہی مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی دھارے کے اسکول ہی اکثر مسلمانوں کی پہلی ترجیح ہیں۔

24.5.4 مسائل کے حل

مدارس کی تجدید

مدارس کی تجدید ہونی چاہئے لیکن اس سے مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوگا کیوں کہ ان کا دائرہ بہت محدود ہے۔ ہاں اگر مدارس اسلامیہ میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا بھی معقول انتظام ہو جائے اور ایسے ہی پیشہ وارانہ تعلیم پر بھی محنت کرائی جائے تو ان کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ کچھ مدارس نے اس طرح کی کوششیں کی ہیں لیکن وہ سطحی اور ناکافی ہیں۔

حکومت کی طرف سے بھی مدارس کی جدید کاری کی منصوبہ بندی ہوتی رہتی ہے لیکن وہ مسلم قوم کا اعتماد حاصل نہیں کر پا رہی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ حکومت کے یہ منصوبہ صرف کاغذی زینت ہوتے ہیں اور عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا۔ مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ حکومت کی تجدیدی کوششوں کا اس لئے بھی مخالف ہے کہ انہیں خوف ہے کہ حکومتی مداخلت بڑھتی رہے گی اور اس سے مدارس کی آزادی اور افادیت جاتی رہے گی۔

مدارس کے اساتذہ کی جدید طرز کی تربیت بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایسے قدم اٹھائے جانے چاہئے جن سے مدارس کے فارغین بنیادی دھارے (mainstream) میں داخل ہو سکیں۔ جہاں تک ممکن ہو انہیں جدید تعلیم کے اداروں میں داخلہ کا اہل مانا جائے۔ کچھ یونیورسٹیز نے ان مدارس کی اسناد کو اپنے یہاں تعلیم کے الگ الگ سطحوں کے مساوی مانا ہے۔ ایسے ہی علی گڑھ یونیورسٹی نے برج کورس بھی شروع کیا ہے جس کو پاس کرنے کے بعد یہ فارغین یونیورسٹیوں کے کورسز میں داخلہ لینے کے اہل ہوں گے۔ اس عمل کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدارس کے فارغین کو بنیادی دھارے کے اداروں میں داخلہ لینے میں کسی امتیاز کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

24.5.5 تعلیم یابی کے اشاریے

شرح خواندگی

مسلم شرح خواندگی SC/ST کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی وسماجی گروہوں سے کم ہے۔اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں مسلم خواندگی کی صورت حال سب سے بدتر ہے۔مسلم شرح خواندگی میں اضافہ سست روی کا شکار ہے جس کے سبب وہ ملک کے دوسرے گروہوں کی شرح خواندگی کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔

دراصل پچھلے کچھ سالوں میں مسلمانوں کے مقابلے SC/ST کی خواندگی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ایسے مسلم بچوں کی فی صد شرح بہت زیادہ ہے جو کبھی اسکول ہی نہیں گئے اور یہ SC/ST بچوں سے صرف تھوڑی ہی کم ہے۔

ترک تعلیم

مسلمانوں میں ترک تعلیم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور مڈل اسکول کے بعد اس میں نمایاں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ مسئلہ پریشان کن ہے۔

شرح داخلہ

مسلمانوں میں داخلوں کا تناسب بھی بہت کم ہے البتہ پچھلے کچھ سالوں میں اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے اور یہ اس بات کا غماز ہے کہ مسلمان اب اپنی سماجی ومعاشی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے تعلیم کی اہمیت کو جاننے لگے ہیں۔

شرح داخلہ میں مختلف سماجی فرقوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ لڑکیوں کے معاملہ میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مختلف سماجی ومذہبی گروہوں کے درمیان شرح داخلہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ تاریخی محرومی یا پھر مساوی مواقع فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔لیکن کسی ایک گروہ کے اندر جو صنفی فرق نظر آتا ہے وہ لڑکے اور لڑکیوں کے متعلق والدین کے مختلف رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔

سطح تعلیم یابی

ابتدائی اور ہائر سکینڈری تعلیم یابی کی سطح بھی مسلمانوں میں بہت کم ہے۔مسلمانوں کی تعلیمی محرومی کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ بچے اسکولوں میں ٹکتے نہیں ہیں۔ترک تعلیم کی وجہ سے اسکولی تعلیم کے ایک مرحلہ سے دوسرے تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔2012 کے حکومت ہند کے اعداد وشمار کے مطابق ملکی سطح پر پہلی جماعت میں داخل بچوں میں مسلمانوں کا تناسب 16.6 فیصد تھا لیکن آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے یہ گھٹ کر 8.4 فیصد رہ گیا تھا۔اسکولی داخلہ اور پھر اسکولی تعلیم مکمل کرنے کی شرح میں اب جو بہتری آرہی ہے وہ بہت معمولی ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں SC/ST طبقوں کے مرد اسکولی تعلیم میں بہت پیچھے تھے لیکن پچھلی صدی کے دوران انہوں نے اس میں بہت ترقی کرلی۔اس کے برعکس مسلم مردوں نے دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں کے مقابلہ میں اسکول کی تعلیم یابی میں زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔یعنی SC/ST مردوں نے مسلمانوں سے زیادہ تیزی سے اپنی تعلیم

یابی میں اضافہ کیا ہے۔ البتہ مسلم خواتین وقت کے ساتھ اپنی اسکول کی تعلیم میں اضافہ کرنے میں SC/ST خواتین سے پیچھے نہیں رہی ہیں۔ لیکن یہ دونوں ابھی تک اس میدان میں اونچی ذات کی ہندو خواتین کا مقابلہ نہیں کر پائی ہیں۔

سبھی سماجی و مذہبی گروہوں میں اسکول کی تعلیم میں صنفی فرق وقت کے ساتھ کافی کم ہوا ہے اور مسلمانوں میں یہ فرق اور بھی تیزی سے کم ہوا ہے۔

پچھلی صدی کی پہلی تین دہائیوں میں پیدا ہوئی مسلم خواتین کی اسکولی تعلیم مردوں کے مقابلہ میں 14 فیصد تھی لیکن 1970 کی دہائی میں یہ بڑھ کر 63 فیصد ہوگئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی صدی میں مسلم مردوں وعورتوں کی اسکولی تعلیم کے حصول میں کافی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن اونچی ذات کے ہندوؤں کے مقابلہ میں یہ ابھی بھی بہت کم ہے۔ گو مسلم مرد بمشکل اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اسکولی تعلیم کی بڑھتی ہوئی رفتار کا مقابلہ کر پائے ہیں لیکن مسلم عورتوں نے اس معاملے میں ہندو اعلیٰ ذات کی خواتین اور اپنے درمیان پائے جانے والے فرق کو بہت حد تک کم کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی مسلمان ابھی ان سے کافی پیچھے ہیں۔ مسلم بچوں کی داخلہ کی شرح میں اگرچہ اضافہ ہوا ہے لیکن ترک تعلیم کی شرح میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آ رہا ہے۔

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کی سطح تک SRCs کے درمیان فرق بہت بڑھ جاتا ہے جس سے اعلیٰ تعلیم میں گراوٹ نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں گریجویٹ تعلیم یابی یا گریجویٹوں کی تعداد کا تناسب (GAR) بھی دوسری قوموں اور اوسط کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

اسکول اور کالج کی تعلیم یابی (GAR) میں دیہی وشہری مسلم الگ نظر آتے ہیں۔ دیہات میں مسلمان SC/ST کے برابر کھڑے ہیں جب کہ شہروں میں ان کی حالت بہت خراب ہے اور ان دونوں پیمانوں میں وہ سب سے نچلی سطح پر نظر آتے ہیں۔

والدین اگر تعلیم یافتہ ہوں تو ان کی اولاد کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے امکانات زیادہ رہتے ہیں اور اگر والدین گریجویٹ ہوں تو ان کے بچوں کے لئے اس کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس امکان پر آمدنی اور معاشی حیثیت کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ والدین کی تعلیم کا اثر سماجی و مذہبی حیثیت سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

یہ امر نہایت تشویشناک ہے کہ 2004 اور 2010 کے درمیان دوسرے تمام سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلہ میں میٹرک (دسویں جماعت) اور اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی شمولیت میں سب سے کم اضافہ ہوا ہے۔ شہری علاقوں میں جہاں مسلمانوں زیادہ آباد ہیں، اعلیٰ تعلیم میں ان کی شرکت پہلے کے مقابلہ میں کم ہوئی ہے۔

سچر کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بنیادی مسئلہ اسکول کی سطح پر ہے۔ محروم گروہوں کے افراد جب اس مرحلہ کو پار کر لیتے ہیں یعنی اسکول کی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں تو کالج جانے کے ان کے امکان بہت بڑھ جاتے ہیں اور مختلف سماجی و مذہبی گروہوں کے GARs میں زیادہ فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر محروم گروہوں کی اعلیٰ تعلیم میں شرکت بڑھانی ہے تو یہ سمجھنا ہوگا کہ اسکولی تعلیم کی راہ میں ان کے سامنے کیا رکاوٹیں ہیں اور انہیں کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے شعبوں کی طرح تکنیکی اور انجینئرنگ کی تعلیم بھی مسلمانوں کی شمولیت ناکافی ہے۔

24.5.6 مسائل کا حل

تعلیمی اداروں تک رسائی

یہ مانا جاتا ہے کہ تعلیمی اداروں کا مہیا ہونا اور ان تک رسائی اگر مسلمانوں کو حاصل ہو تو ان کی تعلیمی صورت حال میں نمایاں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ حکومت اور خود مسلم قوم کو ان کے لئے علیحدہ اسکول اور کالج قائم کرنے چاہئیں۔

شہروں اور قصبوں میں خاص طور سے لڑکیوں کے لئے ہاسٹل ہونے چاہئے۔

اسکولوں تک رسائی

سچر کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام سماجی ومذہبی گروہوں کے بچوں کی اچھے باضابطہ اسکولوں تک رسائی ہونی چاہئے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ بالخصوص محروم سماجی ومذہبی گروہوں کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کر کے ان کے بچوں کی اسکول تک رسائی کو ممکن بنائے۔

درسی کتابیں

اسکول کی درسی کتابوں میں تکثیریت (diversity) کا احترام کرتے ہوئے ایسے مواد کو ترجیحی طور پر شامل کیا جانا چاہئے جو تکثیریت کو بڑھاوا دینے والا ہو۔

جو بچے مڈل اسکول (آٹھویں جماعت) کے بعد تعلیم ترک کر دیتے ہیں ان کے لئے تکنیکی تعلیم کے مواقع فراہم ہوں۔

داخلہ کے معیار میں صرف قابلیت ہی نہیں بلکہ پسماندگی کو بھی بنیاد حاصل ہونی چاہئے اور یہ پسماندگی آمدنی، علاقہ، سماجی حیثیت (پیشہ اور ذات) پر مبنی ہونی چاہئے۔ اس سے تمام محروم طبقوں کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی میں اضافہ ہوگا۔

اردو

ایسے حکومتی اقدامات کی ضرورت ہے جن سے اردو کو اس کا درجہ مل سکے اور بالخصوص مسلم علاقوں میں موجود سرکاری اسکولوں کے اندر ابتدائی تعلیم اردو میں ہونی چاہئے۔

ملازمتوں میں ریزرویشن

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی ملازمتوں میں ریزرویشن ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے تعلیمی پچھڑے پن کی ایک بڑی وجہ ریزرویشن کا نہ ہونا ہے۔ محروم طبقوں کے تعلیم میں مسلمانوں سے آگے نکلنے کی ایک بڑی وجہ یہی ریزرویشن ہے۔ اس کی وجہ سے تعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے جس سے اس کی طرف ان طبقوں کی رغبت بڑھتی ہے۔

معلومات کی جانچ

1) مسلمانوں کے چند تعلیمی مسائل بیان کیجئے۔

2) مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے کی کچھ تدابیر بیان کیجئے۔

3) مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کچھ غلط فہمیاں بیان کیجئے۔

4) لڑکیوں کی تعلیم کے کچھ مسائل اوران کے حل بیان کیجئے۔

24.6 معاشی صورت حال

24.6.1 چند اقتصادی اشاریے

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے انسانی ترقی اور گزر بسر کے حالات کے لحاظ سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی محرومی کو اجاگر کیا ہے۔

غریبی

خوشحالی کے تعین کا ایک اشاریہ گھروں میں چیزوں کے استعمال پر ہونے والے اخراجات ہیں۔محروم طبقے اقتصادی لحاظ سے گزر بسر کے بدتر حالات سے دوچار رہتے ہیں۔اوسط فی کس اخراجات (MPCE) SC/ST کو چھوڑ کر بقیہ تمام سماجی ومذہبی گروہ(SRCs) میں مسلمانوں کے لئے سب سے کم ہے۔خط افلاس سے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد(HCR) بھی SC/ST کو چھوڑ کر بقیہ تمام گروہوں سے مسلمانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

شہری علاقوں میں مسلمان ہی غربت کا زیادہ شکار ہیں خاص طور سے چھوٹے قصبوں میں وہ سب سے زیادہ غریبی کی مار جھیل رہے ہیں۔البتہ دیہی علاقوں میں مسلمان SC/ST اور OBC کے مقابلہ میں غربت کے کم ستائے نظر آتے ہیں۔

دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں کی طرح مسلمانوں کی غربت کی شرح میں بھی سدھار آیا ہے لیکن اس کی رفتار دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں سست ہے، خاص طور سے شہری علاقوں میں اس سدھار کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

آمدنی

1987 اور 1999 کے درمیان اونچی ذات کے ہندوؤں اور SC/ST کی آمدنی میں فرق گھٹا ہے لیکن مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان آمدنی کا یہ فرق اور بڑھ گیا ہے جو کہ مسلمانوں کے لئے نقصاندہ ہے۔

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اوسط آمدنی ہندوؤں سے کم ہوتی ہے اور مختلف مذہبی فرقوں کے اعداد وشمار سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

مختلف ذاتی اور مذہبی فرقوں کی آمدنی کے درمیان فرق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آمدنی کے معاملہ میں اوسطاً ہندوؤں کی اونچی ذاتیں SC/ST اور OBC سے بہتر ہیں اور ہندو مسلمانوں سے۔

1987 اور 1999 کے درمیان تمام ذاتوں اور مذہبی گروہوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے لیکن مختلف گروہوں کی آمدنی میں ہوئے اضافہ میں واضح فرق بھی تھا جس کو ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

SC/ST کے لئے:	73 فیصد
غیر SC/ST ذاتوں کے لئے:	52 فیصد
ہندوؤں کے لئے:	54 فیصد
مسلمانوں کے لئے:	49 فیصد

24.6.2 معاشی بدحالی کے اسباب

عدم تحفظ

عدم تحفظ کا احساس خاص کر خواتین کی نقل وحرکت کو منفی طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس سے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اقتصادی مواقع سے پوری طرح سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

عالم گیریت اور آزاد تجارت

مسلمانوں کے روزگار کی صورت حال کے اور بدتر ہونے کا ایک سبب اقتصادی عالمگیریت (Globalisation) اور نرم روی (Liberalisation) کی حکومت کی پالیسیاں اور ان سے جڑی سرگرمیاں ہیں جنہوں نے محروم وپسماندہ (marginalised) طبقوں کی اقتصادی حالت پر زیادہ منفی اثر ڈالا ہے جیسے چھوٹے وغریب کسان، مزدور، دستکار اور ذاتی وگھریلو چھوٹی صنعتوں سے جڑے لوگ (Self-employed) اور ان لوگوں میں مسلمانوں کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ اس لئے دوسروں کے مقابلہ میں مسلم پیشوں اور بالخصوص خواتین پر اس کا زیادہ منفی اثر پڑا ہے۔

اس کے علاوہ چوں کہ مسلم کام کرنے والے اور خاص کر گھروں میں مرکوز (home based) کارکنوں کو کام کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کے مواقع مہیا نہیں ہیں اس وجہ سے بھی ان کی آمدنی کم ہوئی ہے۔

سرکاری پروگراموں تک کم رسائی

سرکاری پروگراموں کو بروئے کار لانے اور بنیادی ڈھانچے (infrastructure) کی فراہمی میں مسلمانوں کے ساتھ جو امتیاز برتا جاتا ہے اس سے ان کے اقتصادی مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ حکومت کے پروگراموں میں مسلمانوں کے استفادہ کی صورتحال عام طور پر محدود ہے۔ لیکن اکثر الگ الگ پروگراموں میں ان کی شراکت مختلف رہتی ہے۔ کچھ اقلیتی پروگراموں میں مسلمانوں کی شرکت اچھی ہے لیکن ان

پروگراموں کے لئے مختص رقم اتنی کم ہوتی ہے کہ اس کا کوئی قابل لحاظ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ کچھ دیگر پروگراموں سے مسلمانوں سے زیادہ فائدہ دوسری اقلیتوں کو ہوتا ہے۔

قرضوں کا ناقص نظام

خودروزگاروں کی آمدنی میں اضافہ کے لئے سرمایہ تک رسائی نہایت ضروری اور اہم ہے۔ خودروزگاری کی سرگرمیوں میں زیادہ شرکت کے پیش نظر قرضوں کی دستیابی مسلمانوں کے لیے دیگر سماجی و مذہبی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لیے قرضوں کی فراہمی کافی محدود ہے۔ بہت سے بینکوں نے مسلم اکثریتی علاقوں کو 'منفی' یا 'سرخ' علاقہ قرار دے رکھا ہے جہاں وہ قرضے نہیں دیتے۔ قرضوں کی عدم موجودگی مسلم قوم کے لیے ان کی اقتصادی حالت سدھارنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

بینکوں کے قرضوں میں مسلمانوں کی حصہ داری دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلے اور آبادی میں ان کے تناسب کے لحاظ سے بھی بہت کم ہے۔ لیکن جمع رقوم (deposits) میں کافی زیادہ ہے اور اکثر آبادی میں ان کے تناسب کے قریب تر۔ لہٰذا یہ عام تصور کہ مسلمان بینکنگ میں شریک نہیں ہوتے ایک وہم ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی شرکت دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں کم ہے۔

قرضوں کی تعداد اور رقم دونوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حصہ داری کم ہونے کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں غریبی زیادہ اور آمدنی کی سطحیں کم ہونے کی وجہ سے قرضوں کی طلب بھی کم ہے لیکن مسلمانوں کے لیے قرضوں کی بہتر فراہمی کا مسئلہ نہایت پریشان کن ہے کیوں کہ ان کی کثیر تعداد خودروزگاری میں سرگرم ہے۔ لہٰذا قرضوں کی ناکافی فراہمی مسلمانوں کے حالات کے لحاظ سے دوررس اثرات اور مضرات کی حامل ہے۔

تعلیم کی کمی

تعلیم کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ملازمت دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ پہلے دیکھا جا چکا ہے کہ تعلیم اور ملازمت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے فوائد مسلمانوں کو پہنچتے ہیں لیکن اس کے باوجود کم مسلم بچے ہی اسکول کی تعلیم کی چوکھٹ پار کر پاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ طلب کا بھی ہے (کیوں کہ مسلمانوں کو یہ احساس رہتا ہے کہ نوکری ملنے کے انکے امکانات کم ہیں) اور فراہمی کا بھی (کیوں کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے آس پاس اسکول موجود نہیں ہیں)۔

کچھ حد تک سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کمتر شرکت کے لئے ان کے خلاف برتا جانے والا امتیازی سلوک ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ دراصل بہت سے مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں ان کی اقتصادی کمزوری کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کی وجہ سے انہیں نوکریاں نہیں ملتیں۔

چوں کہ مسلم والدین کو اس بات کی امید نہیں ہوتی کہ ان کے بچوں کو نوکریاں ملیں گی تو وہ تعلیم کو اقتصادی ترقی کے ایک ذریعہ کے طور پر اہمیت بھی نہیں دیتے۔ مسلم آبادی میں تعلیم کی کمتر سطح پسندیدہ اور باضابطہ تنخواہ دار ملازمتیں حاصل کرنے میں بھی رکاوٹ بنی ہے۔

2001 میں مسلمانوں کی شرح خواندگی ملکی اوسط سے بہت کم تھی۔ اعلیٰ تعلیم میں حصہ داری بھی مسلمانوں میں کمتر تھی۔ 2001 میں

جب کہ بیس سال سے زیادہ عمر کے 6.7 فیصد لوگ گریجویٹ تھے تو مسلمانوں میں صرف 3.6 فیصد گریجویٹ تھے۔ 30-20 سال کی نوجوان آبادی میں یہ فرق اور زیادہ نمایاں ہے۔ اونچی ذات کے ہندو 19 فیصد گریجویٹ تھے جب کہ مسلمان صرف 4.5 فیصد تھے۔

1999 اور 2005 کے درمیان تمام سماجی طبقوں میں ناخواندگی میں سب سے زیادہ گراوٹ یعنی 9.6 فیصد SC/ST آبادی میں ہوئی۔ مسلمانوں میں یہ گراوٹ صرف 4.8 فیصد تھی۔ اس دوران اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالیہ زمانہ میں مسلمان دیگر سماجی طبقوں کی حد تک اپنی تعلیمی حیثیت میں بہتری نہیں لا پائے ہیں۔

تعلیم میں اتنی کم شرکت اور خاطر خواہ بہتری نہ آنے کے سبب مسلمانوں میں غریب کارکنوں کا بڑا تناسب متوقع ہے کیوں کہ حالیہ عرصہ میں مسلم قوم دوسری قوموں کی حد تک ناخواندگی میں کمی لانے یا اعلیٰ تعلیم میں دخول میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

معاشی مسائل اور اعداد و شمار کے تجزیہ میں شماریاتی (statistical) تکنیک کے استعمال (Econometric analysis) سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم کنبہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے باضابطہ تنخواہ دار ملازمت حاصل کرنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قوم غربت و افلاس سے باہر نکلنے کے لیے تعلیم کا راستہ نہیں اختیار کر پائی ہے۔

ثانوی یا دسویں جماعت (matric or 10th) سے زیادہ یا پیشہ وارانہ تعلیم کے پائے جانے کے امکانات مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں پائے گئے۔ فرق کچھ اس طرح ہے

میٹرک سے زیادہ یا پیشہ وارانہ تعلیم کے امکانات	1987 میں	1999 میں
ہندوؤں میں	21 فیصد	38 فیصد
مسلمانوں میں	10 فیصد	22 فیصد

دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کے کارکنوں کے مقابلہ میں مسلم کارکنوں کے کام کے حالات زیادہ غیر یقینی اور ابتر ہیں۔ مسلمانوں میں ایسے کارکنوں کی تعداد زیادہ ہے جو طویل مدتی یا تحریری معاہدوں کے بغیر کام کرتے ہیں۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوؤں میں غیر مستقل یا اتفاقی اجرت دار کام کے تعین میں ذات ایک اہم عنصر ہے اور یہ امکان کم ہوتا ہے کہ اونچی ذات کے ہندو ایسے کام میں لگے ہوں لیکن مسلمانوں میں ایسا نہیں ہے۔ اونچی ذات کے کہلائے جانے والے مسلمانوں کے لیے زراعتی یا غیر زراعتی اتفاقی کام میں لگے رہنے کے امکانات اتنے ہی ہیں جتنے کہ تمام مسلمانوں کے ہیں۔

23.6.3 خودروزگاری

خودروزگاری کے زمرہ میں زراعت سے وابستہ مسلم کارکنوں کی تعداد دیگر قوموں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دوسرے سماجی و مذہبی قوموں کے مقابلہ مسلمانوں میں بھومہینوں کی تعداد زیادہ ہے اور دوسرے یہ کہ دوسروں کے مقابلہ میں مسلم آبادی کا زیادہ بڑا حصہ شہری علاقوں میں رہتا ہے۔

دوسروں کے مقابلہ میں مسلم کارکن بالخصوص خواتین زیادہ تر خودروزگاری میں لگے ہوئے (self-employed) اور گھروں میں مرکوز (home-based) ہیں۔

5-2004 میں دیکھا گیا کہ شہری ہندوستان کے تقریباً نصف ہندو اور عام خواتین اپنے گھروں میں مرکوز رہ کر اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جب کہ مسلمانوں میں ایسی خواتین کا تناسب 70 فیصد پایا گیا۔ مسلم مردوں میں 14 فیصد ایسے تھے جو گھر میں رہ کر کام کر رہے تھے۔

آج بھی اکثر روایتی پابندیاں خواتین کے گھر سے باہر کام کرنے میں حائل ہیں۔ یہ مسلم خواتین کے لیے بطور خاص درست ہے اور ہندو اعلیٰ ذات کی خواتین کے لیے بھی ایسا ہی کچھ معاملہ ہے۔ مزید یہ کہ خواتین پر بچوں سمیت گھر کی دوسری ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اس لئے ان کے لیے گھر سے باہر جا کر کام کرنا دشوار ہوتا ہے۔

جب کہ مسلم خواتین زیادہ تر گھر میں کام کرتی ہیں، مسلم مردوں کے لئے کام کے خاص مقامات یعنی کارخانوں، دفاتر اور دکانوں میں کام کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

مسلم عورتوں کے مقابلہ میں مسلم مردوں کے سڑکوں پر کام کرنے کے امکان زیادہ ہیں۔ یعنی 8 فیصد ایسے مسلم مرد ہیں جو کسی مقررہ جگہ پر کام نہیں کرتے۔ یہ زیادہ تر ٹرانسپورٹ کے کارکن یا خوانچہ فروش ہیں۔ دوسروں کے مقابلہ میں خوانچہ فروشی میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے۔

تقریباً دیگر تمام سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلہ میں غیر مستقل زمرہ (informal sector) میں مسلمانوں کی شرکت کہیں زیادہ ہے۔ دیگر سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں مسلم کارکنوں کا زیادہ بڑا حصہ صنعتی پیداوار (manufacturing)، خردہ فروشی (retail trade) اور خود اپنے طور پر کی جانے والی تجارت (own account trade) میں لگا ہوا ہے۔

شہری علاقوں میں آدھے سے زیادہ مسلم کارکن بے ضابطہ (informal) غیر زراعتی خودروزگاری میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ یا تو خود اپنا کام کرتے ہیں یا بلا اجرت گھریلو مددگار کی حیثیت سے جبکہ قومی سطح پر ایسے کارکنوں کا تناسب 37 فیصد ہے۔

ذاتی کام یا کاروبار کے زمرے میں ایک چوتھائی (1/4) سے زیادہ مسلمان یا تو خود اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں یا پھر ایسی چھوٹی اکائیوں (units) میں جو صرف گھریلو کارکنوں کی مدد سے یا ایک شخص کی ملکیت میں چلتی ہیں۔

24.6.4 باضابطہ کام میں کم حصہ

دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلہ میں مسلم کارکنوں کا باضابطہ اور مستقل (regular) کام یا نوکریوں میں حصہ بہت کم ہے۔ اگر تعلیم اور دوسری خصوصیات کو بھی جوڑیں تب بھی یہ فرق بنا رہتا ہے مگر ان تخمینوں کی بنا پر امتیازی سلوک کا دعویٰ کرنا مشکل ہے۔

شہری علاقوں میں باضابطہ تنخواہ یا اجرت دار ملازمت میں سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کی آبادی کا تناسب کچھ اس طرح ہے۔

اونچی ذات کے ہندوؤں میں سے 49 فیصد

دوسرے مذہبی فرقوں میں سے 44 فیصد

مسلمانوں میں سے صرف 25 فیصد باضابطہ تنخواہ دار ملازمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اسی لئے دوسروں کے مقابلہ میں ایسے مسلم کارکنوں کا تناسب بہت زیادہ ہے جنھیں اجرت داروں کے فوائد حاصل نہیں ہیں۔ اپنی گھریلوں ذمہ داریوں کی وجہ سے خواتین کو زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ مقررہ وقت کی ملازمت نہیں کر پاتی ہیں اس وجہ سے مردوں کے مقابلہ میں وہ بے ضابطہ (irregular) کام میں زیادہ مصروف رہتی ہیں۔

دوسرے باضابطہ کارکنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی آمدنی بھی کم ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ باضابطہ تنخواہ یا اجرت دار ملازمتوں میں حکومت /سرکاری زمرے کی ایسی ملازمتوں میں مسلمان بہت کم پائے جاتے ہیں جن کی مانگ عموماً زیادہ ہے۔ یعنی ایسی نوکریاں جن میں اچھی تنخواہ کے ساتھ روزگار اور سماجی تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اونچی ذات کے شہری مسلمانوں میں سے بھی صرف 9 فیصد کے پاس ایسی نوکریاں ہیں۔

24.6.5 سرکاری ملازمتوں میں کم حصہ

حکومت کے /سرکاری زمرے میں بالخصوص اور بڑے نجی زمرے میں بھی مسلمانوں کی شراکت داری بہت کم ہے۔ حکومت کے جملہ شعبوں ومحکموں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے جملہ ملازمین میں مسلمانوں کا تناسب صرف 4.9 فیصد ہے۔ مرکزی سرکاری زمرے کے اداروں (PSUs) میں مسلمانوں کا تناسب 3.3 فیصد ہے جب کہ ریاستی سطح کے ایسے اداروں میں 10.8 فیصد ہے۔ IAS میں مسلم نمائندگی 3 فیصد، IPS اور ریلوے دونوں میں 4 فیصد اور قومی تحویل والے (nationalised) بینکوں میں 22 فیصد ہے۔ ریاستی محکموں میں سے عدلیہ میں مسلم نمائندگی صرف 5 فیصد ہے۔

24.6.6 اعلیٰ سرکاری عہدوں میں کم نمائندگی

حکومت کے مختلف شعبوں میں ملازمت کے متعلق تفصیلی جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے اور ان کے پاس زیادہ تر نچلی سطح کی نوکریاں ہیں۔

سرکاری نوکریوں سے متعلق اعداد وشمار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اعلیٰ منیجری سطحوں پر مسلم نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں زیادہ تر نچلی سطحوں پر، یونیورسٹیوں میں غیر تدریسی عملہ میں اور اس کے بعد ریلوے اور محکمۂ ڈاک وغیرہ میں کلرک جیسے عہدوں پر ملازم ہیں۔

مسلمانوں میں اکثر یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ سرکاری نوکریوں میں ان کی کمتر نمائندگی کی وجہ ان کے خلاف برتا جانے والا امتیازی سلوک ہے۔ کیوں کہ تقرر کرنے والی کمیٹیوں میں اقلیتوں کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ نیز اختیار واقتدار کے عہدوں پر بھی مسلمان نظر نہیں آتے ہیں۔

ایک طرف حکومت کی بے توجہی اور دوسری طرف تعصب وامتیازی سلوک کا نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ نچلے درجے یعنی درجہ چہارم (Class

IV) یا Grade D کی سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلم نمائندگی حددرجہ کم ہے حالاں کہ ان ملازمتوں کے لیے بہت زیادہ تعلیمی لیاقت درکار نہیں ہے۔

ایسی سرکاری نوکریوں میں مسلمان بہت کم ہے جو عوامی خدمات سے متعلق ہیں مثلاً صحت (Nursing)اور سیکورٹی(Police)وغیرہ۔ اس سے مسلمانوں کی خوداعتمادی بھی متاثر ہوتی ہے اور عدم تحفظ اور بنیادی دھارے سے علیحدگی کے احساس کو بڑھاوا ملتا ہے۔

شہری علاقوں میں مسلمانوں کی باضابطہ تنخواہ دار ملازمتیں زیادہ تر سرکاری نہیں بلکہ نجی تجارتی اداروں میں زیادہ ہیں اور یہ نوکریاں سرکاری نوکریوں کے مقابلہ میں کم معیار کی ہیں اسی وجہ سے ان سے ہونے والی آمدنی اورفوائد بھی کم ہیں نیز ان میں روزگار اور سماجی تحفظ بھی حاصل نہیں ہے۔

24.6.7 غریب کارکنان

غریب کارکنوں(working poor) کی تعداد مسلمانوں میں زیادہ ہے۔ مختلف سماجی ومذہبی گروہوں(SRCs) میں بے روزگاری کی شرح میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن ان کے درمیان غریبی کی سطحوں میں خاطرخواہ فرق پایا جاتا ہے۔ 5-2004 میں جب کہ ملکی سطح پر مجموعی غربت کی شرح 22 فیصد تھی لیکن مسلم آبادی میں یہ شرح 27 فیصد تھی۔

سرکاری اندازوں کے مطابق 1993 اور 2005 کے درمیان ہندوستان میں غربت میں کمی آئی لیکن یہ امر نہایت افسوس کن ہے کہ مسلم غربت میں گراوٹ بہت کم واقع ہوئی جو SC/ ST طبقے کی غربت میں آئی گراوٹ سے بھی کم ہے۔ مختلف سماجی ومذہبی گروہوں میں بے روزگاری کی شرح میں زیادہ فرق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں میں غریبی کی سطح زیادہ اور اس میں آنے والی کم گراوٹ کا یہ مطلب ہے کہ مسلم کارکنان ایسے کاموں سے جڑے ہوئے ہیں جن میں بہت کم آمدنی ہے۔ لہذا وہ 'غریب کارکنوں' میں شمار ہوتے ہیں یعنی وہ کارکن جو خط افلاس کے نیچے رہتے ہیں۔

شہری علاقوں میں باضابطہ سرکاری زمرے کی ملازمتوں میں بھی غریب کنبوں میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ یعنی 14 فیصد تھا جب کہ جملہ کارکنوں میں یہ تناسب 4 فیصد اور ہندؤوں میں 7 فیصد تھا۔ ایسے ہی نجی زمرے کے باضابطہ تنخواہ دار کارکنوں میں مسلم اور دوسرے کارکنوں میں غربت کا اور زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ مسلم غریب کنبوں کا تناسب 30 فیصد ہے جب کہ ہندوؤں میں یہ صرف 20 فیصد ہے۔

عمومی طور پر باضابطہ سرکاری اور نجی زمرے کے اداروں میں مسلم مرد وعورتیں کمتر کاموں سے وابستہ ہیں جیسے کلرک یا درجہ چہارم Class (IV) کے ملازمین جب کہ ہندوؤں کے منیجری اور پیشہ ورانہ عہدوں پر فائز ہونے کے امکان زیادہ ہیں۔

نجی زمرے میں ہندو ومسلم کارکنوں کی آمدنی کے درمیان فرق کے درج ذیل اسباب ہوسکتے ہیں:

- دونوں فرقوں کے ذریعہ کئے جانے والے کاموں کی نوعیت کا فرق
- خودنجی زمرے کے کاروباروں کی نوعیت

مسلمان چھوٹے، غیر باضابطہ اور کم پیداواریت والے کاروباروں میں زیادہ سرگرم ہیں جیسے چھوٹی ورکشاپ جہاں مسلم مردوں کی بڑی تعداد گیر یجوں میں میکینکوں کی طرح کے کام کرتی ہے۔ایسے ہی خواتین بھی چھوٹے پیداواری کاروباروں سے وابستہ ہوسکتی ہیں۔

نجی ملازمتوں میں مسلم کارکنوں کو ملنے والی کمتر تنخواہیں انکے کنبوں کی غربت کا سبب بنتی ہیں۔اس طرح سے غیر باضابطہ ملازمت اور غریبی کے درمیان واضح تعلق نظر آتا ہے۔اکثر کسی خاص سماجی و مذہبی گروہ سے وابستگی بھی حالات کو بدتر بنادیتی ہے۔مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں میں تھوڑی آمدنی والے طبقہ میں کم لوگوں کے رہنے کے امکان ہیں۔

غیر زراعتی خودکار طبقے میں بھی ہندو و مسلم غریب کارکنوں کے تناسب میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔مسلمانوں میں یہ تناسب 45 فیصد ہے جب کہ ہندوؤں میں صرف 26 فیصد ہے۔لیکن سب سے برے حالات خود اپنے لئے کام کرنے والی مسلم خواتین کے ہیں جن کا تناسب بھی بہت زیادہ ہے۔ان کی بظاہر اقتصادی آزادی کے پیچھے ان کی مجبوریاں کارفرما ہیں۔کم تعلیمی لیاقت، اساسوں تک عدم رسائی اور باہر نکلنے اور لوگوں سے روابط قائم کرنے پر پابندی کے سبب وہ اپنے کام سے ہونے والی کمائی سے بمشکل ہی گزر بسر کر پاتی ہیں۔کیوں کہ ایسی مسلم خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے جو گھروں میں ذیلی ٹھیکیداری کے تحت کام کرتی ہیں اس وجہ سے اپنے طور پر کام کرنے والے مسلم غریب کارکنوں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔

24.6.8 مسلم خواتین کا WPR

روزگار سے جڑے پیشوں میں مسلم خواتین کی شرکت بہت کم ہے اور ان کی بڑی تعداد غیر باضابطہ زمرے میں لگی ہوئی ہے۔عمومی طور پر بھی ہندوستان کے کارکنوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت معمولی ہے۔

کارکنوں میں خواتین کی شراکت ان کی اقتصادی حیثیت کے اشاریوں میں سے ایک ہے۔یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس سے انہیں اقتصادی آزادی حاصل ہوگی جس کے نتیجہ میں انہیں روزمرہ کی زندگی میں کچھ اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

کارکنوں کے آبادی تناسب یا کام میں شرکت یا حصہ داری کی شرح (WPR) یہ اندازہ لگانے میں مدد دیتی ہے کہ کوئی آبادی اقتصادی سرگرمی میں کس حد تک شریک ہے۔مسلم خواتین کا WPR یعنی کام میں شرکت کی ان کی شرح دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں کی خواتین سے کافی کم ہے۔اس سے ان کے اقتصادی طور پر اور زیادہ کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ہندوستان میں کام میں شرکت کا تناسب کچھ اس طرح ہے۔

مردوں میں	87 فیصد
خواتین میں	44 فیصد
مسلم خواتین میں	25 فیصد
دیہی ہندو خواتین	50 فیصد
دیہی مسلم خواتین	28 فیصد

دیہی مسلم خواتین کی کم شرکت کا ایک سبب یہ ہے کہ مسلم کنبوں کی زراعت سے وابستگی کم ہے۔ شہری علاقوں میں مجموعی طور پر کام میں خواتین کی شراکت کم ہے اوران میں مسلم اوراونچی ذات کی خواتین کی شرکت 15 فی صد ہے جو کہ سب سے کم ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے فرقوں کی خواتین کے مقابلہ میں مسلم عورتوں کے اجرت کمانے والے طبقے میں شامل ہونے کے امکان کم ہیں۔

24.6.9 خودروزگار مسلم خواتین کے مسائل

زیادہ تر ذاتی طور سے کام کرنے والی (self-employed) مسلم خواتین ٹھیکیداروں کے لیے کام کرتی ہیں اوران کے معاہدوں کی شرائط (contractual conditions) بھی ابتر ہوتی ہیں۔ شہری علاقوں میں گھر پر کام کرنے والی 56 فیصد مسلم خودروزگار خواتین ہیں اس کے برعکس شہروں میں معاہدہ پر کام کرنے والی ہندو خواتین کا تناسب 42 فیصد ہے۔

شہری مسلم خواتین کی ایک بڑی تعداد اپنے طور پر روزگار سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی اقتصادی سرگرمی ان کے اختیار میں ہے لیکن اصل میں ان کی ایک بڑی تعداد گھر پر رہ کر ذیلی ٹھیکیداروں کے لیے پیداواری (manufacturing) سے جڑے کام کرتی ہیں۔ باہر نکل کر دوڑ دھوپ کرنے اور برادری سے باہر لوگوں سے بات چیت کرنے پر ممانعت کے باعث یہ خواتین اکثر ایسے ٹھیکوں کے کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں جن میں زیادہ منافع نہیں ہے۔

اس قسم کے ذیلی ٹھیکیداروں کے کام کی اجرت زیادہ تر کام کے لحاظ سے (piece-rate) سے ادا ہوتی ہے اور یہ اکثر اتفاقی کام کی اجرت (casual wage rates) سے کم ہوتی ہے۔

اکثر مسلم خواتین کو کام فراہم کرنے والے ٹھیکیدار اور بچو لیے ان خواتین کے رشتہ دار یا پھر مسلمان ہوتے ہیں۔ مذہبی اور سماجی بندشوں کی وجہ سے خواتین کو کام کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔ کم اجرت کے باوجود مسلم خواتین اس قسم کا کام کرتی ہیں کیوں کہ پابندیوں، غربت اور تعلیم وتکنیکی مہارتوں کی کمی کے سبب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ سلائی، کڑھائی، کشیدہ کاری، زری اور چکن کا کام، تیار ملبوسات، اگربتی، بیڑی اور پتنگ سازی وغیرہ ایسے پیشے ہیں جن میں بیشتر مسلم خواتین کارکن برسرکار ہیں۔

24.6.10 حل

قرضوں کی فراہمی

- سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے لحاظ سے قرضوں کی فراہمی کے متعلق تفصیلی اعداد وشمار دستیاب ہونے چاہئیں۔
- بینکوں کے لئے کسی شہر وعلاقہ میں قرضوں کی علاقائی تقسیم کے متعلق معلومات فراہم کرنا ضروری ہونا چاہئے۔ اس سے مسلمانوں کو قرض نہ مل پانے کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔
- بینک کے باضابطہ قرضوں تک مسلمانوں کی رسائی بہتر ہونی چاہئے۔ کیوں کہ زیادہ تر قرضوں کی فراہمی ان ہی کے ذریعہ

ہوتی ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اکثریتی پروگراموں کے ذریعہ بڑے پیمانہ پر بھی مسلمانوں کی قرضوں تک رسائی ہو۔

خودامدادی گروپ (SHG)

- خودامدادی گروپوں (SHGs) اور دیگر مائکرو کریڈٹ پروگراموں میں مسلمانوں کی شرکت بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔مزید یہ کہ ان اسکیموں میں مسلمانوں کی حصہ داری سے متعلق اعداد وشمار مقامی سطح پر فراہم ہونے چاہئیں۔
- سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑھانے کی کوششیں ہونی چاہئیں۔

جو محدود اعداد وشمار اور معلومات دستیاب ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مسلمان نوکریوں کے لیے درخواست دیتے ہیں تو ان کی کامیابی کی شرح اوسط سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی لیکن بظاہر بہت کم مسلمان نوکریوں کے لیے درخواست دیتے ہیں۔اس کے دو سبب ہیں

1۔ ان کا یہ احساس کہ ان کا انتخاب نہیں ہوگا۔اس کا یہ مطلب ہوا کہ مطلوبہ اوصاف ہونے کے باوجود امتیازی سلوک کے احساس کی وجہ سے مسلمان باضابطہ نوکریاں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

2۔ تعلیمی کمی کے سبب بہت کم مسلم افراد ان ملازمتوں کے اہل ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر تعلیمی سطح کی بہتری تو وقت طلب مسئلہ ہے۔فی الحال مختلف طریقوں سے ایسی کوششیں کی جانی چاہئے کہ جو لوگ ملازمتیں پانے کے اہل ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو درخواستیں دینے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔خاص طور سے ایسی نوکریوں میں مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے جن میں عوام سے رابطے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں جیسے کہ محکمۂ تعلیم، صحت، پولیس وغیرہ۔اس سے قوم کے اندر خود اعتمادی اور بنیادی دھارے میں شمولیت کے احساس کو بڑھاوا ملے گا اور عدم تحفظ کا احساس دور ہوگا۔

ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جن کے تحت مسلم کارکنوں کی روایتی حرفتوں و دستکاریوں کو جدید مینجمنٹ کے طریقوں، نئی ٹکنالجی اور بازار کی ضرورتوں سے جوڑا جائے۔پالیسی کے لحاظ سے ان علاقوں، پیشوں اور کاروباروں پر زیادہ توجہ درکار ہے جن میں مسلمانوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے اور جن میں نمو کے امکانات بھی ہیں۔

چوں کہ مسلم کارکنان کی ایک بڑی تعداد غیر باضابطہ زمرے سے جڑی ہے لہٰذا ایسے کارکنوں کو سماجی تحفظ فراہم کرنے والا کوئی بھی قدم مسلمانوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔

مسلمانوں کی اقتصادی حیثیت بہتر بنانے، پسندیدہ باضابطہ ملازمتوں میں ان کے دخول اور خود روزگاری میں آمدنی اور پیداواریت (productivity) کو بہتر بنانے کے لئے ایک اہم عنصر بنیادی تعلیم اور نئی تکنیکی مہارتوں کا حصول ہے۔اس کے بغیر مسلم قوم ہندوستان کی بڑھتی ہوئی اقتصادی ترقی کے فوائد سے محروم ہوگی۔

معلومات کی جانچ

1۔ ایسے اسباب کی نشاندہی کریں جن کی وجہ سے مسلمان معاشی بدحالی کا شکار ہیں؟

2۔ مسلمانوں کو درپیش معاشی مسائل پر روشنی ڈالیں۔

3۔ مسلمانوں کی معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے کس طرح کے اقدامات اٹھائے جانے چاہئیں۔

24.7 سماجی صورت حال

24.7.1 تعارف

ہندوستانی مسلمان ذاتوں، ذیلی ذاتوں، اور سماجی طبقات کے علاوہ فرقہ ورانہ اور علاقائی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان پر ملک کی ثقافتی روایات اور سماجی ساخت کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔

24.7.2 سماجی ساخت

ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی ساخت سے متعلق ساجیاتی مطالعوں میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں نسب اور توارث پر مبنی سماجی تفریقات موجود ہیں۔

ہندو ذات کے نظام کی خصوصیات مثلاً سماجی طبقوں کی درجہ بندی، اندرونی سلسلہ ازدواج اور موروثی پیشے، ہندوستانی مسلمانوں میں بھی کافی حد تک پائے جاتے ہیں۔

اسلام کے تصور مساوات کے باوجود ہندوستان کے مسلم معاشرے میں درجہ بندی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ایسا نظام بھی جو ہندو ذات کے نظام کے مثل ہے۔

1901 کی ہندوستان کی مردم شماری میں 133 ایسے سماجی طبقوں کی فہرست تھی جو پوری طرح یا جزوی طور پر مسلمان تھے۔

24.7.3 سماجی طبقات

آج کا ہندوستانی مسلم معاشرہ 4 بڑے طبقوں میں منقسم ہے۔

(1) اشراف جو اپنی جڑیں عرب، ایران، ترکی یا افغانستان سے جوڑتے ہیں۔

(2) وہ جو اسلام قبول کرنے سے پہلے اعلیٰ ذات کے ہندو تھے۔

(3) اسلام قبول کرنے والے درمیانی ذاتوں کے لوگ جن کے پیشے مذہبی رسوم کے لحاظ سے صاف ستھرے ہیں۔

(4) اسلام قبول کرنے والے سابقہ اچھوت ذاتوں کے لوگ مثلاً بھنگی، مہتر، چمار، ڈوم وغیرہ۔

یہ چاروں طبقے عموماً دو عمومی زمروں میں رکھے جاتے ہیں۔ اشراف اور اجلاف

اشراف میں بیرونی خون والے اور اعلیٰ ذاتوں کے مسلمان ہو جانے والے لوگ شامل ہیں۔ اشراف کے معنی ہیں شریف، معزز

یا برتر۔

اجلاف کے معنی کم مرتبہ یا ناپاک کے ہیں، یہ صاف ستھرے پیشوں اور نچلی ذاتوں کے مسلمان ہونے والے لوگوں پر مشتمل ہیں۔

اتر پردیش، بہار اور بنگال میں سید، شیخ، مغل اور پٹھان اشراف میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اجلاف میں بڑھئی، دست کار، رنگریز، چرواہے، چمڑہ تیار کرنے والے، گھوسی وغیرہ شامل ہیں۔

1901 کی مردم شماری کے مطابق اجلاف میں مختلف طبقوں کے مذہب تبدیل کرنے والے لوگ شامل ہیں جنھیں بہار میں نو مسلم اور شمالی بنگال میں 'نیسیا' کہا جاتا ہے

ان میں مختلف پیشوں کے لوگ بھی شامل ہیں مثلاً جولاہے، دھنیے، کلو، کنجڑے، حجام، درزی وغیرہ۔

اکثر نو مسلم اپنے سابقہ سماجی رسوم و رواجوں پر قائم رہتے ہیں۔ کچھ نے تبدیلِ مذہب سے قبل کے اپنے خاندانی نام نہیں بدلے جیسے کہ ہریانا اور راجستھان کے میو جنھیں اپنے راجپوت ورثہ پر فخر ہے اور گجرات کے پٹیل، دیسائی اور شاہ

1901 کی مردم شماری میں ارزال نام کے ایک تیسرے زمرے کا بھی ذکر ہے جس کے معنیٰ ہیں نیچ۔

یہ کمترین ذاتوں مثلاً حلال خوروں، لال بیگوں، ابدالوں اور بیڈیوں پر مشتمل ہے۔

24.7.4 علاقائی سماجی تفریقات

وراثت پر مبنی سماجی تفریقات کا یہی قرینہ دیگر علاقوں میں بھی نظر آتا ہے۔

کیرل میں مالا بار کے موپلا مسلمانوں کو پانچ درجات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تھنگل، عربی، مالاباری، پوسالار اور اوسان۔ تھنگل اعلیٰ ترین درجہ رکھتے ہیں۔ یہ اپنا نسب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے جوڑتے ہیں۔

ان سے کمتر درجہ پر عربی ہیں جو خود کو عرب مردوں اور مقامی عورتوں کی اولادوں میں شمار کرتے ہیں اور اپنی عرب وراثت پر قائم ہیں۔

ان کے بعد مالاباری آتے ہیں۔ عرب کے ساتھ ان کا نسبی سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور وہ مادرانہ توریث کا نظام اختیار کر چکے ہیں۔

پوسالار، مکّووَن کہے جانے والے ان ہندو مچھیروں کی اولاد ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کی حیثیت کم ہے۔ اوسان حجام ہیں اور اپنے پیشے کے لحاظ سے کم ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

1987 میں آندھرا پردیش میں کی گئی ایک فیلڈ سٹڈی میں مسلمانوں میں ایسے گروہ پائے گئے جو درجہ بندی کے حامل ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔

اس درجہ بندی میں اعلیٰ ترین مقام ان کو حاصل اپنے جو باہر سے آئے ہوئے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یعنی سید شیخ، پٹھان اور لبّائی (مقامی خواتین سے شادی کرنے والے عرب تاجروں کی اولاد)

سب سے کم حیثیت ان کو حاصل ہے جن کے کام کو 'گندا' تصور کیا جاتا ہے مثلاً دودے کولا (دھنیا)، حجام اور فقیر۔ بڈبڈ کی۔

اتر پردیش کے ایک گاؤں کے مطالعے سے 18 غیر اشراف طبقوں کی نشاندہی کی گئی جو OBC میں شامل ہیں اور اپنے روایتی پیشوں سے جانے جاتے ہیں۔ مثلاً جولاہے، میراثی، درزی، حلوائی، منیہار وغیرہ۔

1911 کی مردم شماری میں اتر پردیش کے مسلمانوں سے متعلق 102 برادریوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن میں سے کم از کم 97 کا تعلق غیر اشراف سے تھا۔

بہت سی ایسی برادریاں تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں موجود تھیں جیسے راجپوت، کایستھ، کوئری، کوری، کمہار، کرمی، مالی، موچی وغیرہ۔

24.7.5 ذات۔ کٹر یا لچکدار؟

کچھ تحقیقات کی بنا پر یہ جتایا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ مسلم 'ذاتی' شناختیں وقت کے ساتھ بدلتی نہیں ہیں بلکہ ذات، مذہب اور معیشت سے جڑی شناختیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور کافی حد تک بدلتی رہتی ہیں۔ مزید یہ کہ وقت کے ساتھ ذات سے جڑی شناختوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے کیوں کہ ان سے کوئی خاص سیاسی اور معاشی فوائد حاصل نہیں۔ سماجی دائرے میں بھی محض اعلیٰ ذات اونچا مرتبہ فراہم نہیں کرتی ہے جب تک کہ تعلیم، پیشے یا آمدنی کے ذریعے اسے مزید تقویت نہ بخشی جائے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ اجلاف طبقے کے افراد کو سماجی برتری حاصل کرنے کے لئے اونچے طبقے میں داخل ہونے کے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اکثر یہ اپنے سے اعلیٰ طبقوں میں جذب بھی ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں میں مختلف ذاتوں میں آپس میں شادیاں کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ مسلمانوں میں بھی اس پر پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بلند رتبے کے لئے کوشاں مسلم خاندان کے لئے اپنے سے اعلیٰ سماجی حیثیت رکھنے والے گروہوں میں شادی کرنا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔

کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ مسلمانوں میں ان کی مذہبی پہچان ذات کے اختلافات پر غالب آجاتی ہے۔ اسی وجہ سے مسلم اشراف اور ان سے بڑھ کر ہندوستان کے حکمران اشرافیہ نے مسلم ذاتوں کے اختلافات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اکثر ان اختلافات کو نظر انداز کیا ہے۔

اس کے برعکس کچھ دیگر تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی حمایت حاصل کرنے کی کوشش نے ذات کی بنیادوں پر انہیں سیاسی طور پر متحرک اور منظم کر دیا ہے کیوں کہ اجلاف اشرافیہ کی سیاست سے اپنے آپ کو نہیں جوڑ پاتے۔

24.7.6 ذات اور سیاست

مسلم سماج میں پائے جانے والے اندرونی تفریقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی جماعتیں ان کا استعمال لوگوں کو سیاسی طور پر متحرک اور منظم کرنے کے لئے کرتی ہیں۔

مسلمانوں میں ذات کی بنیاد پر تفریقات سب سے زیادہ نمایاں طور پر بہار اور یو پی میں نظر آتی ہیں۔

ذات کی بنا پر مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحرک کرنے کی کوششوں نے ان تفریقات کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ بظاہر بہار میں مذہبی شناختوں کے مقابلے میں ذات کی شناختیں زیادہ اہم نظر آتی ہیں۔ یہ واضح نہیں ہے کہ یہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحرک کرنے کی کوششوں کا نتیجہ ہے یا اس کی وجوہات کچھ اور ہیں۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں تفریقات پائی جاتی ہیں اور اس بات کی عکاسی حکومت کی تمام پالیسی اقدامات میں ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر مسلم ارزال اور اجلاف کو ایک عمومی OBC زمرے میں یکجا کر کے، منڈل کمیشن نے ان دونوں طبقوں کو درپیش محرومیوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ ارزال سماجی درجہ بندی میں سب سے نیچے ہونے کی وجہ سے بدترین حالت میں ہیں اور ان کے ساتھ علاحدہ سلوک درکار ہے۔ زیادہ مناسب ہوگا اگر انہیں SC فہرست میں یا کم از کم OBC کے اندر بنائے گئے حد درجہ پسماندہ طبقوں میں شامل کر لیا جائے۔

24.7.7 مسلم OBC

اس وقت OBC میں شامل مسلم طبقوں کا تعلق مسلمانوں کے غیر اشراف طبقے سے ہے۔ یہ ان درمیانی اور چھوٹی ذاتوں کے ہندوؤں کی اولاد ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ انہیں ان کے روایتی پیشوں سے پہچانا جاتا ہے۔

آئینی (SC) حکم 1950 میں SC درجہ صرف 'غیر صاف ستھرے' کام کرنے والے ہندو طبقوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے (بعد میں 'مذہبی سکھوں'، اور نو بودھوں کے لئے ترمیمات کی گئیں) ان کے جیسے غیر ہندو طبقوں کو مذہب تبدیل کرنے والے درمیانی ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ یکجا کر کے OBC قرار دے دیا گیا۔

اس طرح مسلم OBC کے دو زمرے ہیں:

(1) ارزال سے متعلق 'اسلام قبول کرنے والے اچھوت' جو OBC فہرست میں شامل کر لئے گئے ہیں جیسے حلال خور، ہیلا، لال بیگی یا بھنگی، دھوبی، نائی، چکوے اور فقیر۔

(2) اجلاف یا مذہب تبدیل کرنے والے 'صاف ستھرے' پیشوں والی ذاتوں کے لوگ جیسے مومن یا جلاہے، درزی یا ادریسی اور راعین یا کنجڑے۔

اس طرح مسلمانوں میں 3 طبقے نظر آتے ہیں:

(1) اشراف جو کسی بھی سماجی محرومی کا شکار نہیں ہیں۔

(2) اجلاف جن کی حیثیت ہندو OBC جیسی ہے۔

(3) ارزال جو ہندو SC جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔

جنہیں مسلم OBC کہا جاتا ہے ان میں (2) اور (3) کے تحت طبقے شامل ہیں۔

2004-5 کے NSSO کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ 41% مسلمانوں نے خود کو OBC قرار دیا۔

1955 میں پہلے پسماندہ طبقات کمیشن نے پہلی بار مسلمانوں (اور دیگر مذہبی اقلیتوں) میں پسماندہ برادریوں کی موجودگی کو سرکاری طور پر تسلیم کیا۔ مگر کمیشن نے اس بنا پر ذات کے پیمانے کو منظوری نہیں دی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مفروضہ طور پر ذات پات نہیں ہے۔

1980 میں دوسرے کل ہند پسماندہ طبقات یا منڈل کمیشن نے اصولی طور پر تسلیم کیا کہ ذاتوں یا ذات جیسی خصوصیات کے اثرات مسلم اور دوسرے غیر ہندو فرقوں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن کمیشن نے غیر ہندو OBC کی نشاندہی کے لئے 'ذات' کا پیمانہ استعمال کرنے سے گریز کیا کیوں کہ یہ مذاہب مساوات اور انصاف پر مبنی ہیں۔

منڈل کمیشن نے مسلم ارزال اور اجلاف کو ایک عمومی زمرے میں یکجا کرتے ہوئے 82 سماجی گروپوں کو OBC قرار دیا۔

مسلم OBC کی ریاست وار آبادی

کیرل، تمل ناڈو اور ہریانہ میں تقریباً تمام تر مسلم آبادی OBC پر مشتمل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کیرل میں موپلا مسلمانوں کو جو ریاست کی مسلم آبادی کا تقریباً 90% حصہ ہیں، مرکزی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح ہریانا میں مسلم آبادی کا غالب حصہ میو مسلمانوں پر مشتمل ہے جو OBC ہیں۔

بہار، اتر پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش اور جھارکھنڈ کی ہندی۔ اردو بولنے والوں کی پٹی میں OBC قرار دیے گئے مسلمان اکثریت میں ہیں۔

دوسری جانب مغربی بنگال اور آسام میں جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے مسلم OBC کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اس لئے ان ریاستوں کے بیشتر مسلمانوں کو OBC حیثیت سے وابستہ فوائد حاصل نہیں ہیں۔

مسلم OBC اور ریاستوں میں مثبت اقدام

مسلم پسماندہ طبقوں سے متعلق مثبت اقدام کے 3 ماڈل مختصراً یوں ہیں:

(1) بالائی سطح (creamy layer) کو چھوڑ کر پورے مسلم فرقے کے لئے سیٹوں کا رزرویشن: کیرل اور کرناٹک

(2) پسماندہ ذاتوں / برادریوں کے لئے رزرویشن جس میں بیشتر مسلم برادریاں شامل ہیں۔ لہٰذا 95 فی صد مسلم آبادی رزرویشن کے دائرے میں شامل ہیں: تمل ناڈو

(3) OBC کی پسماندہ طبقوں (BC-Backward Classes) اور MBC (Most Backward Classes) یعنی سب سے پسماندہ طبقوں میں تقسیم۔ بیشتر مسلم پسماندہ طبقے MBC فہرست میں شامل: بہار

جیسا کہ دیکھا جاچکا ہے، سرکاری اور نجی زمرے کے روزگار میں مسلمانوں کی حددرجہ کم نمائندگی تشویشناک ہے۔ مسلم OBC کی نمائندگی اور بھی ابتر ہے۔

ملک کی کل OBC آبادی میں مسلم آبادی کا تناسب 15.7 فی صد ہے۔ لیکن اس کی عکاسی سرکاری ملازمتوں یا تعلیمی اداروں میں ان کی نمائندگی سے نہیں ہوتی۔ لہذا مرکزی حکومت کے ماتحت آنے والے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں منڈل کمیشن کی سفارشات نافذ کیے جانے کا مطالبہ بزور کیا جاتا ہے۔

پسماندہ مسلمانوں کے بچوں کے لئے وظائف، مفت یونیفارم اور ہاسٹلوں کی تعمیر کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

یہ بھی مانا جاتا ہے کہ تعلیم اور ملازمت میں مسلم OBC کی نمائندگی کو بہتر بنانے کے لئے OBC کوٹا میں مسلم OBC کے لئے ایک الگ کوٹا مقرر کرنا ضروری ہے۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اکثر ذات کی سند حاصل کرنے میں آنے والی نوکرشاہی کی روکاوٹوں کی شکایت ملتی ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے یہ مسئلہ بھی بار ہا اٹھایا جاتا ہے کہ بہت سی ایسی پچھڑی مسلم برادریاں ہیں جن کو مرکزی یا ریاستی یا دونوں ہی حکومتوں کی OBC فہرست میں اب تک شمولیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔

مسلم OBC اکثر روایتی پیشوں سے جڑے ہیں۔ لہٰذا عالمکاری کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال میں کاریگروں کی مہارتوں میں اضافہ اور ٹکنالجی کا معیار بلند کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

24.7.8 مسلم برادریوں کے لئے SC درجہ

مسلم سماجی ساخت میں اشراف اور اجلاف کو اعلیٰ ترین اور متوسط درجہ حاصل ہے۔ مگر ارزال کی کم ترین حیثیت ہے۔ یہ ان برادریوں پر مشتمل ہیں جن کے روایتی پیشے وہی ہیں جو درج فہرست ہندو ذاتوں (SC) کے ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ مسلم ارزال کی برادریاں اسلام قبول کر لینے والے ہندو 'اچھوتوں' پر مشتمل ہیں۔ مذہب کی تبدیلی سے ان کی سماجی یا اقتصادی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے روایتی پیشوں کی داغداری کے سبب وہ سماجی مقاطعہ کا شکار ہیں۔ اس کے باوجود انہیں اپنے ہندو ہم پیشہ لوگوں کی طرح SC کا درجہ نہیں دیا گیا۔

SC فہرست سے ان کا اخراج 1936 سے چلا آرہا ہے جب شاہی حکم (SC) کے تحت مسلمانوں کے محروم طبقے مثلا حلال خور SC فہرست میں شامل کیے گئے مگر انہیں اس کے فوائد سے محروم کر دیا گیا۔ نوآبادیاتی دور کے اس حکم کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کی حکومت نے اپنے آئینی حکم (SC) 1950 کے تحت ان برادریوں کو انہیں درپیش محرومیوں کے مطابق درجہ دینے سے محروم کر دیا۔ بعد میں ہوئی ترمیمات کے تحت سکھوں کی بعض برادریوں اور نو بودھوں کو SC میں شامل کیا گیا۔ اس طرح اب صرف یکساں اصل کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہی اس درجہ سے محروم رکھا گیا ہے اس کی وجہ سیگدھیری، گورکن، مہتر یا حلال خور، مسلم دھوبی، جاکھو، نٹ، پمریا، لال بیگی اور دیگر مسلم برادریاں حد درجہ

غریبی اور محرومی کی شکار اور الگ تھلگ پڑی ہوئی ہیں۔

OBC فہرست میں ان کی شمولیت سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے کیوں کہ انہیں زیادہ ترقی یافتہ متوسط ذاتوں کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ 1950 کا حکم آئین کی دفعات 14، 15، 16 اور 25 سے ہم آہنگ نہیں ہے جن میں مواقع کی برابری ضمیر کی آزادی اور شہریوں کو مذہب، ذات یا عقیدے کی بنا پر ریاست کے ذریعے امتیازات سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی گئی ہے۔لہٰذا مسلمانوں کی طرف سے اس بات پر زور دیا جاتا آیا ہے کہ ہندو SC جیسے کام کرنے والے مسلم طبقوں کو بھی SC فہرست میں شامل کیا جائے۔

SCs میں سے 1.7 فی صد خود کو مسلمان بتاتے ہیں۔

24.7.9 مسلم ST

ST آبادی میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔STs میں سے صرف 0.5 فی صد خود کو مسلمان بتاتے ہیں۔ST مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد لکش دویپ میں پائی جاتی ہے جہاں کی ساری ST آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ہماچل پردیش کی ST آبادی میں مسلمانوں کا تناسب (7 فی صد) خاصہ اہم ہے۔دیگر مقامات پر مسلم ST کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے بارہا ST حیثیت دئے جانے میں کارفرما امتیازات کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔مثلاً اتر پردیش میں ہندو بنجاروں کو ST فہرست میں رکھا گیا مگر ان کے مسلم ہم پیشہ لوگوں کو OBC فہرست میں ڈال دیا گیا۔

اگرچہ تمام ST لوگوں کو بلا لحاظ مذہب تمام فوائد حاصل ہیں مگر قبائلی پس منظر کے تمام مسلمانوں کو یہ فوائد فراہم نہیں ہیں۔ان فوائد سے محروم بہت سے مسلم طبقوں نے ST حیثیت دیئے جانے کا مطالبہ کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی سماجی ساخت کے لحاظ سے اشراف، اجلاف اور ارزال کے 3 طبقوں پر مشتمل ہیں۔ان تینوں کو مختلف قسم کے مثبت اقدام درکار ہیں۔دوسرے گروپ یعنی اجلاف / OBC کو مزید توجہ کی ضرورت ہے جو ہندو OBC جیسی ہی ہو سکتی ہے۔تیسرے گروپ کو جس کے روایتی پیشے ہندو SC جیسے ہی میں سب پسماندہ طبقوں (MBC) میں شامل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مجموعی طور پر مظالم کا شکار ہونے کی وجہ سے انہیں رزرویشن سمیت بہت سے فلاحی اقدامات کی ضرورت ہے۔

24.7.10 مسلم خواتین اور ان کے مسائل

اشراف میں عزت کا تصور بہت قوی ہے جو اکثر خواتین کی تعلیم اور ملازمت تک رسائی میں رکاوٹ بنتا ہے۔اس کی وجہ سے خواتین اقتصادی سرگرمیوں اور عوامی زندگی سے بھی دور رکھی جاتی ہیں کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے اور غیر مردوں سے ملنے جلنے سے خاندان کی عزت خطرے میں پڑ جائے گی اسی وجہ سے آج بھی جب کہ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کی مسلم خواتین زیادہ سے زیادہ تعلیم اور ملازمت کی طرف رجوع کر رہی ہیں پھر بھی عوامی زندگی میں ان کی شرکت محدود ہے۔

تقسیم ہند کے بعد روزگار کے بہتر مواقع کی تلاش میں بہت سے مسلم نوجوان پاکستان منتقل ہو گئے۔اس کے سبب کچھ عرصہ تک ہندوستان میں رکنے والی مسلم لڑکیوں کے لئے مناسب رشتے ملنا مشکل ہو گیا اور مجبوراً انہیں ملازمتیں اختیار کرنی پڑیں۔آزادی کے بعد ہونے

والے فسادات میں پہچانے جانے کے ڈر سے بہت سی مسلم خواتین نے برقعہ پہننا چھوڑ دیا۔ان اسباب کی بنا پر کچھ حد تک عزت کے تصور کی بنا پر عورتوں کے باہر نکلنے سے جڑی ناپسندیدگی کم ہوگئی ۔لیکن حال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عالمی اسلامی رجحانات سے متاثر ہو کر اور اپنی اسلامی شناخت کے اظہار کے طور پر مسلم خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد حجاب اختیار کر رہی ہے۔

پیشہ ورانہ ذاتوں میں عورتوں سے عزت کا تصور نہیں جڑا تھا کیوں کہ ان کی خواتین کو اکتسابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ان میں بھی ان ذاتوں کو اعلیٰ درجہ حاصل تھا جن کی عورتیں صرف اشراف گھروں کی خواتین کی خدمت کرتی تھیں اور مردوں سے ان کا سابقہ نہیں پڑتا تھا جیسے منہیر ،نائی اور میراسی ۔اس کے برعکس نیچی ذاتوں کی خواتین کو غریبی کے سبب کھیتیوں میں مزدوری یا اس قسم کے دوسرے کام کرنے پڑتے تھے۔

یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب نیچی ذات والے خاندانوں کی اقتصادی حیثیت بہتر ہوتی ہے تو وہ بھی اپنی خواتین کی اقتصادی سرگرمیوں پر پابندی لگا دیتے ہیں اور ان کو پردہ میں رکھنے لگتے ہیں۔یعنی ذات سے جڑی اپنی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے وہ اونچی ذاتوں کی تقلید کرتے ہیں۔

جہیز

جہیز کا جو نظام ہندوؤں میں رائج ہے اس پر ماضی میں شمالی ہندوستان کے مسلمان عمل نہیں کرتے تھے۔شادی سے قبل فریقین کے درمیان لین دین کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا تھا۔لڑکی کے والدین اپنی مرضی سے اور اپنی حیثیت کے مطابق بیٹی اور داماد کو تحفے دیتے تھے جو کپڑے اور زیورات کے علاوہ برتن اور گھر کے دیگر سامان پر مشتمل ہوتے تھے۔لیکن حال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ دولہے اور اس کے گھر والوں سے توقعات کم ہوتی جا رہی ہے اور لڑکی کے والدین سے بڑھتی جا رہی ہیں،زیادہ سے زیادہ لین دین اشراف اور غیر اشراف دونوں میں سماجی مرتبے کی علامت بنتا جا رہا ہے۔

خاص طور پر غیر اشرف طبقوں میں نہ صرف یہ کہ لین دین بڑھ رہا بلکہ یہ رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے کہ پہلے سے ہی طے کر لیا جاتا ہے کہ لڑکی کے والدین کو کیا سامان دینا ہوگا جس کے متعلق لڑکے اور اس کے گھر والوں کی طرف سے مطالبے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔مطالبے نہ پورے ہونے کی صورت میں شادی کے بعد لڑکی کے ساتھ بدسلوکی اور ازدواجی اختلاف کا پیدا ہونا عام ہے۔

یہ سب چیزیں اس بات کی علامت ہیں کہ بالخصوص غیر اشراف مسلم طبقوں میں باقاعدہ طور پر جہیز کے نظام کو اپنایا جا رہا ہے۔مزید افسوس کی بات ہے کہ اکثر بیٹی کی تعلیم پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے والدین اس رقم کو اس کے جہیز کے لئے بچا کر رکھتے ہیں دراصل جیسے جیسے شادیاں سماجی حیثیت کی علامت بنتی جا رہی ہیں اور ان میں دکھاوا اور زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔اس کے مضر اثرات لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کے گھر والوں پر کہیں زیادہ پڑ رہے ہیں۔

مسلم خواتین کی بااختیاری (Empowerment)

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ مسلم خواتین ہندو خواتین کے مقابلے میں کم 'بااختیار' ہیں لیکن اعداد و شمار سے اس رائے کی تصدیق نہیں

ہوتی۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کسی کنبہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ بالغ شخص کے عورت ہونے کا امکان سب سے کم اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں ہے اور مسلم اور نیچی ذات کے کنبوں کے لئے اس کا امکان یکساں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں ایسے گھرانوں کی زیادہ کثرت ہے جو خواتین کی سربراہی میں ہیں۔

لیکن ساتھ ہی جیسا کہ پہلے دیکھا جا چکا ہے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے مقابلے میں کام میں خواتین کی شرکت مسلم کنبوں میں کم اور نچلی ذات کے ہندوؤں میں زیادہ ہے۔

صنفی انصاف

مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے صنفی امور کو بھی مذہبی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ مسلم خواتین سے متعلق چند منتخب واقعات و معاملات پر جس طرح حد درجہ توجہ دی جاتی ہے اور انہیں میڈیا میں نہایت جوش و خروش سے بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ہی مسلمانوں میں موجود صنفی نا انصافی کا واحد سبب ہے۔ نتیجۃً سول سوسائٹی اور ریاست مسلم خواتین کی محرومیوں کے اسباب سماجی امتیازات اور غلط ترقیاتی پالیسیوں میں نہیں بلکہ فرقے کے مذہب اور اندرونی معاملات میں تلاش کرتے ہوئے سارا الزام انہیں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

عدم تحفظ کا مسئلہ

فرقہ وارانہ تصادم کے واقعات کے نتیجے میں (خاص طور پر وہ جن میں مسلم خواتین کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے) مسلمانوں میں گہرا خوف، کمزوری اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سے خصوصاً لڑکیوں کا ربط و تعلق (mobility) اور تعلیم بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

رہائشی علاحدگی (Ghettoisation)

ملک کے بعض حصوں میں مسلمانوں کے سماجی بائیکاٹ نے انہیں ان مقامات سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جہاں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ اس سے ان کے روزگار اور آمدنی پر منفی اثر پڑا ہے۔

خاص طور پر فرقہ وارانہ طور پر حساس علاقوں کے مسلمانوں میں اپنے تحفظ کے خیال سے علاحدہ بستیوں میں رہنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ میونسپل اور حکومت کے حکام مسلمانوں کے ان اکثریتی علاقوں کو آسانی نظر انداز کرنے لگتے ہیں۔ پانی، صفائی، بجلی، اسکول، صحت کی سرکاری سہولتیں اور، بینک، آنگنواڑی، راشن کی دکانیں، سڑکیں، ٹرانسپورٹ کی سہولتیں یہ مسلم علاقوں میں کم سے کم ہوتی ہیں۔ ان خدمات کی ناموجودگی سب سے زیادہ مسلم خواتین کو متاثر کرتی ہے کیوں کہ انہیں یہ سہولتیں اپنے 'محفوظ محلوں' کے باہر سے حاصل کرنے میں جھجھک ہوتی ہے۔

مسلم فرقے کی بڑھتی ہوئی رہائشی علاحدگی اجتماعی زندگی میں اس کی شرکت کے دائرے کو تنگ کر رہی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یہ ایک غیر صحتمند رجحان ہے جو بڑھ رہا ہے۔

معلومات کی جانچ

(1) ہندوستانی مسلم سماج میں پائے جانے والے طبقوں کی وضاحت کریے۔

(2) مسلم OBC میں کون سے طبقات شامل ہیں؟

(3) کیا ذات اور سیاست کا آپسی تعلق ہے؟ وضاحت کیجیے۔

(4) جہیز کے نقصانات بیان کیجیے۔

24.8 خلاصہ

آزادی کے بعد سے ہندوستان نے اہم پیش رفت کی ہے۔اس نے غریبی کم کرنے اور خواندگی، تعلیم اور صحت جیسے اہم انسانی ترقیاتی اشاریوں کو بہتر کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ تمام مذہبی وسماجی طبقوں کو ترقیاتی عمل کے ثمرات میں برابر کا حصہ نہیں ملا ہے۔

ان فرقوں (SRCs) میں مسلمان جو ملک کی سب سے بڑی اقلیت میں اور ملکی آبادی میں جن کا تناسب 14 فی صد ہے بیشتر انسانی ترقیاتی، اشاریوں کے لحاظ سے حد درجہ پیچھے ہیں۔لہٰذا مسلم صورت حال کو محض ایک اقلیتی مسئلہ نہیں بلکہ قومی مسئلہ سمجھا جانا چاہیے۔

اس کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر احساس محرومی پایا جاتا ہے۔مگر آزادی کے بعد سے مذہبی اقلیتوں کی سماجی واقتصادی حالت کا تجزیہ کرنے کی کوئی منظم اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔سماجی ومذہبی طبقوں سے متعلق اعداد وشمار کی فراہمی کے معاملے میں نمایاں تبدیلی 1990 کی دہائی میں ظاہر ہوئی۔اس کی بنیاد پر ہی 2006 میں سچر کمیٹی کی رپورٹ ممکن ہوسکی جو ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اعداد وشمار پر مبنی تحقیق کی اپنے طرز کی اولین کوشش تھی۔

مسلم آبادی اور صحت کے حالات کا تجزیہ کرنے سے بعض دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں:

☆ شرح پیدائش میں خاصی کمی ہونے سے مسلم آبادی میں اضافہ کا عمل ماند پڑا ہے۔آئندہ شرح افزائش اور بھی کم ہوگی۔

☆ عام خیال کے برعکس مسلمانوں میں بچوں کی پیدائش روکنے اور مانع حمل طریقوں کے استعمال کا سلسلہ خاصہ مضبوط ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ مسلم جوڑوں کو ان کی مرضی کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

☆ بچوں میں شرح اموات اور بچوں کی صحت کے معاملے میں مسلمانوں کی حالت اوسط سے قدرے بہتر ہے۔مگرچوں کہ صحت کے مجموعی حالات اطمینان بخش نہیں ہیں اس لئے انہیں بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔شہری غریبوں کو صحت کی سہولتیں فراہم کرنے سے غریب مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا کیوں کہ جنوبی اور مغربی ریاستوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہری علاقوں میں رہتی ہے۔

☆ مسلمانوں کی علاقہ وار آبادی کی صورت حال یکساں نہیں ہے کیوں کہ ان کی خاصی بڑی تعداد ایسی ریاستوں میں رہتی ہے جو ترقی

کے معاملے میں پچھڑی ہوئی ہیں۔

☆مسلم والدین جدید یا بنیادی دھارے کی تعلیم اور اپنے بچوں کو قابل برداشت مصارف والے سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے خلاف نہیں ہیں۔وہ اپنے بچوں کو لازمی طور پر مدارس بھیجنے کو ترجیح نہیں دیتے۔مسلمان بھی اسی باضابطہ تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں جو ملک کے بچوں کو دستیاب ہے۔مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریزی میں تعلیم کو ترجیح دیتا ہے جبکہ بعض لوگ اردو کو بطور ذریعہ تعلیم پسند کرتے ہیں۔سرکاری اسکولوں تک مسلم بچوں کی رسائی محدود ہے۔

☆عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلم والدین کے نزدیک لڑکیوں کی تعلیم ضروری نہیں ہے اور یہ کہ اس سے ان میں غلط خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔مزید یہ کہ اگر لڑکیوں کو اسکولوں میں داخل بھی کرایا جاتا ہے تو نوعمری ہی میں شادی کے لئے انہیں اسکول سے اٹھا لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسلم لڑکیوں میں ترک تعلیم کی شرح زیادہ ہے۔لیکن اصل مسئلہ ابتدائی تعلیم کی سطح پر ایسے اسکولوں کا نہ ہونا ہے جہاں لڑکیاں آسانی سے جا سکیں۔اس کے علاوہ لڑکیوں کے ہاسٹلوں،خاتون ٹیچروں اور تعلیم کے اگلے مرحلوں میں تعلیمی وظیفوں کی ناموجودگی بھی اہم رکاوٹیں ہیں۔

دیگر فرقوں کے مقابلے میں مسلم کارکن زیادہ بڑی تعداد میں خود اپنے طور پر پیداواری اور تجارتی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ باتنخواہ ملازمتوں (بطور خاص حکومت یا بڑے سرکاری اور نجی زمرے کے اداروں) میں ان کا حصہ دیگر فرقوں کے کارکنوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔روزگار کے حالات کے لحاظ سے وہ نسبتاً زیادہ بے حفاظت ہیں کیوں کہ ان کی زیادہ بڑی تعداد کا غیر باضابطہ زمرے کے کاموں سے واسطہ ہے۔کام کے حالات (ملازمت کی مدت،سماجی تحفظ وغیرہ) باضابطہ کارکنوں میں بھی دیگر فرقوں کے مقابلے میں مسلمانوں میں بدتر ہیں۔

تعلیم میں اضافے کے فوائد مسلمانوں کے لئے کافی رہے ہیں۔اس کے باوجود اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی شرکت بہت کم ہے۔اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی باضابطہ ملازمت حاصل کر پانے کا امکان مسلمانوں کے لئے زیادہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کو خاصی غریبی کا سامنا ہے بالخصوص شہری علاقوں میں ان کی حالت SC/ST سے بس کچھ ہی بہتر ہے۔مختلف ریاستوں اور طبقوں کے مسلمانوں کے حالات میں قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے۔مسلم فرقہ ترقی کے تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے۔مسلمانوں کی حالت کم و بیش SC/ST سے کچھ بہتر مگر ہندو OBC،دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں سے بدتر ہے۔کثیر مسلم آبادی والی ریاستوں میں یہ صورت حال مغربی بنگال،بہار،اتر پردیش اور آسام میں بطور خاص سنگین ہے۔لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان خساروں اور محرومیوں کے باوجود مسلمانوں میں نوزائندوں کی شرح اموات اور صنفی تناسب بہتر ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے حالات میں نمایاں علاقائی فرق نظر آتا ہے۔جنوبی علاقہ کی کارکردگی بہتر ہے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حالات علاقہ کی اقتصادی ترقی سے جڑے ہوئے ہیں۔دراصل یہ صرف کچھ حد تک صحیح ہے۔اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی ہیں جو مسلم صورت حال پر اثر انداز ہوتے ہیں جیسے مثبت اقدامات،سیاسی طور پر متحرک اور منظم ہونا،تاریخی پس منظر اور حکمرانی کی نوعیت۔

24.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

(1) ہندوستان کی مسلم آبادی کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

(2) مسلمانانِ ہند کی تعلیمی صورت حال مختصراً بیان کریے۔

(3) ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی صورت حال کا خاکہ پیش کریے۔

(4) مسلم سماج کی ساخت کی بنیادی خصوصیات بیان کریے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

(1) آزادیٔ ہند [illegible] تعارف پیش کریے۔

(2) مسلم [illegible] سبب ہیں؟

(3) کس سطح کی تعلیم کو سب سے اہم بتایا گیا ہے اور کیوں؟

(4) معاشی صورت حال کے کچھ اشاریے بیان کریے۔

(5) مسلم خواتین کے مسائل اور ان کے حل پر روشنی ڈالیے۔

24.10 مخففات

BC(s) Backward Class(es)	پسماندہ طبقہ (طبقے)
GAR Graduate Attainment Rate(s)	گریجویٹ تعلیم یابی
HCR Head Count Ratio	خطِ افلاس سے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد
IAS Indian Administrative Service	
IPS Indian Police Service	
MBC(s) Most backward Class(es)	سب سے پسماندہ طبقہ (طبقے)
MPCE Mean Per Capita Expenditure	اوسط فی کس اخراجات
OBC(s) Other backward Class(es)	دیگر پسماندہ طبقہ (طبقے)
PSU(s) Public Sector Undertaking(s)	سرکاری زمرے کا ادارہ (ادارے)
SC(s) Scheduled Caste(s)	درج فہرست ذات (ذاتیں)

SHG(s): Self-help Group(s)	مائکروفائننس کا طریقہ ،دیہی غریبوں کا گروہ جورضا کارانہ طور پر تشکیل دیاجاۓ۔ تمام اراکین پیسے بچا کرایک مشترکہ فنڈ میں جمع کرتے ہیں جس میں سے ان کو چھوٹے قرضے آسان شرائط پر ملتے ہیں۔
SRC(s) Socio-religious community(ies)	سماجی و مذہبی طبقہ،گروہ یازمرہ
ST(s) Scheduled Tribe(s)	درج فہرست قبیلہ(قبائل)
WPR Worker Population/ Work Participation Rate/ Ratio	کارکن آبادی تناسب/کام میں شرکت یا حصہ داری کی شرح۔ یہ اندازہ کرنے میں مدد دیتی ہے کہ کوئی آبادی اقتصادی سرگرمی میں کس حد تک شریک ہے۔

24.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

(1)ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت (سچر کمیٹی رپورٹ) حکومت ہند،نومبر 2006

http://www.zakatindia.org/images/Sachar%20Report%20Urdu%20-%201.pdf

2) Rakesh Basant and Abusaleh Shariff (ed.) (2010) *Oxford Handbook of Muslims in India: Empirical and Policy Perspectives. New Delhi: OUP.*